

گلے ترس

ڈھلے چاند کی یاد

PDFBOOKSFREE.PK

شرہ بخاری

پیش لفظ

ماہنامہ کرن ڈائجسٹ میں قسط دار چلنے والا ناول ”ڈھلے چاند دل کے پار“ اب کتابی صورت میں آپ لوگوں کے سامنے ہے معلوم نہیں پڑھتے ہوئے آپ کی ہمدردیاں کتنی کرداروں کے ساتھ ہوں گی اور کون سے کردار محبوب ٹھہریں گے۔ میں نے ہمیشہ افسانہ، ناول یا ناولٹ لکھتے ہوئے کرداروں کی نفسیات اور ماحول کو مد نظر رکھا ہے۔ اس ناول کا ایک مضبوط کردار کبریٰ خانم جسے نیکلیو رول بظاہر کہا جاسکتا ہے مگر میری سوچ کے مطابق وہی کہانی کی ہیروئن ہے۔

اگر ہم ناول کو پڑھتے پڑھتے کچھ دیر کے لئے کتاب بند کر دیں اور ایمانداری سے اس کردار کے بارے میں سوچیں پھر اس کی جگہ خود کو رکھیں تو میرا خیال ہے پھر ہم اسے حق بجانب پائیں گے۔ محبت اور نفرت کے بیچ بڑی نازک سی لکیر ہوا کرتی ہے اور محبت کرنے والی عورت کے دل کا شیشہ بھی اتنا ہی نازک ہوا کرتا ہے۔ شیشہ ٹوٹے گا تو کرچیاں بدن میں چھیں گی، تکلیف ہوگی تو بے اختیار ہاتھ تکلیف پہنچانے والے کے گریبان تک پہنچیں گے۔ مگر ہمارے ہاں عورت سے اس کی توقع نہیں کی جاتی اُسے خاموش رہنے اور صبر کرنے کا سبق دیا جاتا ہے جو بغاوت کر دے وہ قاتل نفرت ٹھہرتی ہے اس کے مرنے کے بعد بھی اس کا کردار خاندان کے لئے باعث شرم ٹھہرتا ہے۔

دوسرا بڑا کردار جمشید شاہ کا ہے جو میرا خیال ہے ہمارے ہاں کے نوے فیصد مردوں کے کرداروں کی عکاسی کرتا ہے۔ اس کردار کو لکھتے ہوئے مجھے زیادہ محنت نہیں کرنا پڑی کہ یہ تو اس پاس بڑی تعداد میں پایا جاتا ہے اور ان کرداروں کو دیکھتے ہوئے گہری نظر سے ان کا مشاہدہ کرتے ہوئے میں نے بار بار سوچا یہ عشق کیا چیز ہے اور یہ مرد کیا واقعی کسی عورت سے عشق کیا کرتے ہیں؟ اگر کرتے ہیں تو پھر عورت کو باتے ہی یہ عشق پانی کا بلبہ کیوں ثابت ہوتا ہے؟ بس میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ مرد عورت سے عشق نہیں کرتا وہ ضد کرتا ہے۔ جیسے ایک بچہ کسی کھلونے کے لئے نچل اُٹھتا ہے اور کھلونا پانے کے کچھ ہی دیر بعد اس سے غافل ہو جاتا ہے۔ تو میرا آپ سے سوال ہے۔

”کیا عورت واقعی کھلونا ہے.....؟“

تیسرا بڑا کردار ارشد شیر کا ہے اور یہ اس ناول کا سب سے پسندیدہ کردار ٹھہرا ہے۔ ایسا کیوں ہوا وجہ مجھے معلوم نہیں۔ مگر اس کی پسندیدگی ہماری عمومی سوچ کی عکاسی کرتی ہے۔ اب ہمارے ہاں سے نیک و بد کا وہ تصور ختم جا رہا ہے جو کبھی ہوا کرتا تھا اور برائی ہمیں اٹریکٹ کرنے لگی ہے۔ خاص کر ہم نے مرد کو اس کی اجازت دے دی ہے۔

اس ناول کو میں نے بہت توجہ اور اپنائیت سے لکھا اور مجھے اسے لکھتے ہوئے جس کردار سے محبت ہوئی وہ کردار..... کبریٰ خاتون کا ہی ہے..... یقیناً یہ پڑھ کر آپ کو دھچکا لگے گا اور شاید کچھ دیر کے لئے آپ مجھ سے اکتاہٹ محسوس کریں۔ مجھے معاشرے کی اقتدار سے باغی قرار دیں تو ہاں مجھے اعتراف ہے میں باغی ہوں۔

شمرہ بخاری

ایک سی عقل و ذہانت، ایک سی سوچ، زندگی کے ہر ڈکھ سکھ کی شریک، گرنے لگو تو بڑھ کر تھام لے، کچھ جو سارا زمانہ ساتھ چھوڑ دے تو یہ اپنے آنچل کی چھاؤں میں سمیٹنے کو تیار، تم مسکراہٹ نچھاور کر دو گے تو وہ تن من دھن واردے گی، تم خفگی کا اظہار کرو گے، وہ پیروں میں بکھر جائے گی۔

بس اُسے اتنا یقین ہونا چاہئے کہ تم اُس کے ہو، سر سے پاؤں تک اُس کے ہو، دل میں بھی وہ ہے اور ذہن بھی اسی کے بارے میں سوچتا ہے..... اور اگر ایسا نہ ہوا تو ابن آدم..... اگر تم نے زندگی کے ہر ڈکھ سکھ میں شریک ہونے والی سے منہ موڑ لیا، آنکھوں میں کسی اور کو بسا لیا۔ پھر کبھی سوچا ہے..... کہ وہ کیا کرے گی؟

جس بے چاری کی دُنیا تم سے شروع ہو کر تم پر ہی ختم بھی ہو جاتی ہے، وہ کیسے زندہ رہے گی.....؟ رہے گی بھی یا مر جائے گی.....؟ اگر زندہ رہ گئی تو کیا پھر بھی وہ تم سے محبت کرے گی، جب بھی اپنا آپ منائے گی تمہارے لئے، اس کے دل میں تب بھی تمہیں دیکھ کر گھٹکھرو سے بچنے لگیں گے، کیا پھر بھی وہ تمہاری زندگی کی خاطر مرنے کو تیار ہو جائے گی۔؟

ابن آدم! کبھی سوچا ہے تم نے.....؟ نہیں..... تو ٹھیک ہے، مت سوچو، تم ڈوبے رہو اپنی طاقت کے نشے میں..... تم بنے رہو حاکم اور کرتے رہو عورت پر حکمرانی..... مگر شکست تو عورت نے بھی بھی تسلیم نہیں کی، وہ اس بے وفائی کا انتقام ضرور لیتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ یہ انتقام بھی وہ اکثر اپنی ہی ذات سے لیتی ہے..... جب تم ڈکھ دیتے ہو اُسے تو وہ اپنے ہونٹ سی لیتی ہے، گرم گرم کھولتے ڈکھ ایک دم سے اپنے اندر اُنٹیل لیتی ہے۔ وہ جل جاتی ہے اندر سے، اور یہی کھولتے ڈکھ ایک روز اُسے اس دُنیا سے دُور لے جاتے ہیں، جس پر اس کا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا کہ تمہارا ہے۔ اس خاموشی، احتجاج اور خود کو دی جانے والی سزا کا کسی کو پتا بھی نہیں چلتا۔

اور کچھ ایسی بھی ہیں جو محبت کے لئے کا ماتم سر عام کرتی ہیں، نا انصافی کے نتیجے میں تند و تیز موج بن جاتی ہیں، زخم خوردہ شیرنی کی مانند جھپٹ پڑتی ہیں اور پہلے ہی حملے میں ڈھیر کر دی جاتی ہیں۔

”مگر میں..... کبریٰ خاتون، میں ان دونوں قسموں میں سے نہیں ہوں، میں نے زمانے کی چالوں کو بہت غور سے دیکھا ہے جمشید شاہ اور ان سے سبق حاصل کیا ہے۔ شاہ! تمہیں اب شاید یہ بھی یاد نہیں ہو گا کہ کبھی کبھی تمہاری محبت ہوا کرتی تھی، آنکھوں کی ٹھنڈک، دل کا قراتھی، ساری دُنیا سے چھپ کر تم اور تمہارا کرتے تھے اور آنے والے سنہری دور کے سپنے بُنا کرتے تھے..... تم نے تو مجھے فرش سے عرش پر

بٹھا دیا تھا، تمہارے دعوؤں نے مجھے مغرور کر دیا تھا اور تمہاری زبان سے ادا ہونے والی ایک ایک بات میں حفظ کر لیا کرتی تھی اور تمہارے جانے کے بعد سوچا کرتی تھی، کیا واقعی میں دنیا کی حسین ترین عورت ہوں یا یہ شاہ کی نظروں کا تصور ہے۔

تم کہتے تھے رات بستر پر لیٹ کر مجھے ہی سوچتے ہو اور تمہارے خوابوں میں بھی میں ہی ہوتی ہوں..... اور پھر ایک دن ہزاروں لوگوں کی موجودگی میں تم بڑی چاہ سے مجھے بیاہ کر لائے تھے، شب زفاف بہت سے وعدے ہوئے تھے مجھ سے، جو تم نے وفا نہیں کئے..... اور جشید شاہ! میں نے جتایا بھی نہیں..... اس لئے کہ میں عورتوں کی اس پہلی اور دوسری قسم سے نہیں ہوں، میں اندر ہی اندر گھٹ گھٹ کر مروں گی اور نہ تند و تیز موج بنوں گی۔ میں ایک ذہین عورت ہوں، میں جانتی ہوں شاہ کہ جب ایک بار عورت، مرد کے دل سے اتر جاتی ہے، پھر ہزار ہا جتن کے باوجود پہلے والا مقام حاصل نہیں کر سکتی۔

مرد اور عورت کی محبت دریا کے پانیوں کی طرح ہے، دریا کا پانی رکتا نہیں چلتا رہتا ہے، ایک موج جو چلی جاتی ہے، پھر نہیں آتی..... میں کیوں یاد دلاؤں.....؟ میں کیوں جتاؤں.....؟ جب تم بھول چکے ہو، ایک نہیں دو سوئیں مجھ پر لا چکے ہو، اس جرم میں کہ میں تمہیں بیٹا نہیں دے سکی۔ اوپر تلے دو بیٹیاں میری ٹوڈ میں آئی ہیں اور تم..... جشید شاہ، تم کیا سمجھتے ہو، اس ظلم کے باوجود میں وہ پہلی سی کبریٰ خاتون ہوں..... میرے دل میں آج بھی تمہارے نام سے چراغ جل اٹھتے ہیں تو یہ تمہاری بھول ہے جو مرد، عورت کو گھر کا سنگھ نہ دے سکے، پوری ایمانداری سے اپنا آپ نہ سوچ سکے، جو شرطوں کے ساتھ محبت کرے، بیٹا ہو تو دنیا جہاں کی نعمتیں قدموں میں اور بیٹی ہو تو گھر کا ایک کونا..... تو کیا ایسے مرد سے عورت محبت کر سکتی ہے.....؟

کم از کم میرے جیسی ذہین عورت ہرگز نہیں.....؟

”شاہ! تم تین بیٹیوں کے باپ ہو، دو میری اولاد ہیں..... ایک فاطمہ سے ہے، تم نے کبھی ان تینوں کو پیار کیا.....؟ کبھی ان سے پوچھا کہ تمہیں کسی شے کی ضرورت تو نہیں.....؟ یہ بھی تمہارا خون ہیں..... اور ارد شیر بھی..... مجھے یقین ہے ارد شیر کے لئے تم جان بھی دے سکتے ہو اور مجھے نفرت ہے تمہارے لاڈلے بیٹے سے..... مگر میرے انتقام کا طریقہ الگ ہے..... یہ ایک طویل اور صبر آزما طریقہ ہے مگر میں نے یہی طریقہ اپنایا ہے کہ اس میں ناکامی کا خوف نہیں۔“

جشید شاہ کے اکلوتے صاحبزادے ارد شیر کی ساتویں سالگرہ ہے۔ تقریب شام کو ہے۔ مگر کبریٰ خاتون نے صبح ہی تمام انتظامات ملازموں کے سر پر کھڑے ہو کر یوں مکمل کروائے ہیں، جیسے مہمان بس آیا ہی چاہتے ہیں۔ اس سے پہلے بھی چھ بار یہ دن آیا ہے مگر اس طرح وسیع پیمانے پر انتظام کبھی نہیں ہوا۔ جشید شاہ غریبوں میں خیرات تقسیم کروا دیتے تھے اور گھر میں..... سب لوگ ارد شیر کو تحائف دے دیتے تھے مگر اس بار کبریٰ خاتون نے کہہ دیا تھا کہ تقریب وسیع پیمانے پر ہوگی۔ سب عزیزوں کو بلایا جائے گا اور ارد شیر سب کی دعاؤں کے درمیان اپنی ساتویں سالگرہ کا کیک کاٹے گا۔

”کیا خیال ہے بڑی آیا، اب ارد شیر کی رسم بسم اللہ بھی ادا کر دی جائے تو کیسا رہے گا.....؟“

راحت تھی تو ارد شیر کی حقیقی والدہ مگر کبریٰ خاتم کی وہ زیادہ مانتی تھی..... اسی لئے اس نے پوچھا تھا۔

”دنہیں نہیں راحت بی بی، یہ کیا غضب کرتی ہو، ابھی ہمارے بیٹے کی عمر ہی کیا ہے، تم ابھی سے اس پر پڑھائی کا بوجھ مت ڈالو.....“

”مگر آپا.....! قینوں لڑکیوں نے تو ماشاء اللہ آٹھ برس کی عمر میں قرآن پاک ختم کر لیا تھا اور ارد شیر اب خیر سے سات برس کا ہونے کو آیا ہے۔ اب سے پڑھنا شروع کرے گا، تب ہی آٹھ برس تک.....“

”اوہو راحت بی بی، تم بھی مکمل کرتی ہو.....“ کبریٰ خاتون نے اُس کی بات کاٹ دی اور کہنے لگیں۔

”لڑکیوں کی بات اور تھی مگر ارد شیر جشید شاہ کا اکلوتا بیٹا ہے..... تمام جائیداد کا وارث..... اور وارث کی تربیت کس طرح کی جانی ہے، یہ تم نہیں جانتیں.....“

اور ان الفاظ کے آگے راحت کے پاس بولنے کے لئے ہمیشہ کی طرح آج بھی کچھ نہیں تھا، وہ سر جھکا کر رہ گئیں..... اور کبریٰ خاتون، ارد شیر کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے محبت سے کہنے لگیں۔

”ابھی اسے خوب کھیلنے کو دے دو، صحت بنانے دو، کھلی فضاؤں میں دوڑنے دو، اسے بہادر بنانے اور مضبوط بھی..... پڑھائی کا کیا ہے، ابھی پڑھنے کے لئے عمر پڑی ہے..... مگر صحت بنانے کی عمر ہیں..... ابھی اس پر بوجھ نہ ڈالو..... کیوں شاہ جی، ٹھیک کہہ رہی ہوں ناں میں.....؟“

اس نے جشید شاہ کو مخاطب کیا جو ابھی ابھی یہاں آئے تھے اور بڑے غور سے کبریٰ خاتون کی باتیں سن رہے تھے۔ اُن کی آنکھوں میں کبریٰ خاتون کے لئے محبت اور عقیدت کے جذبات تھے جو سون کے بیٹے کو اس لئے چاہتے تھے کہ وہ کبریٰ خاتون کی اپنی بیٹیوں پر فوقیت دیتی تھی کہ وہ صرف شاہ کا بیٹا تھا اور شاہ کے لئے کبریٰ کیا کچھ کر سکتی تھی، یہ کوئی ڈھکی چھپی بات تو نہ تھی۔

جشید شاہ کبریٰ خاتون کی قدر کرتے تھے بلکہ یہ کہنا مناسب ہو گا کہ کرنے لگے تھے۔

شادی سے پہلے اور شادی کے بعد دو سال تک تو یک جاں دو قالب تھے یہ دونوں، مگر اس کے بعد دونوں بیٹیوں ستارہ اور شیریں کی پیدائش نے شاہ کی محبت پر برف کی ریل رکھ دی۔ جس محبت اور چاہت سے وہ اسے اس آنگن میں لائے تھے، جس طرح پچھلے دو برسوں میں انہوں نے حوصلی اور شوہر کے دل پر راج کیا تھا، انہیں گمان بھی نہیں تھا کہ شاہ یوں بدل جائیں گے۔ وہ تو سمجھتی تھیں اُن کی گود میں دو بیٹیوں چار بھی بیٹیاں آجائیں تو شاہ کی محبت کا بھول یونہی تروتازہ رہے گا اور اُس کی مہک کبریٰ خاتون کو زندگی کی نوید دیتی رہے گی۔

”جشید اور شادی کی بات کریں..... ناممکن..... وہ دوسرا بیاہ نہیں کر سکتے..... وہ وعدے قسمیں جو..... شادی سے پہلے اُن کے درمیان ہوئے تھے، وہ شاہ کے پیروں کی زنجیر بن جائیں گے۔ شاہ ان کے ہیں اور اُن کے رہیں گے۔“

مگر شیریں کی پیدائش کے بعد تو حالات بالکل ہی بدل گئے۔ شاہ نے زنان خانے آنا بہت کم کر دیا تھا اور اُن کی والدہ کا رویہ سرد تر اور پھرتل ہونے لگا تھا۔ پھر ایک روز اماں بیگم نے جشید شاہ کو اپنے کمرے میں بلایا۔ دیر تک ماں بیٹے میں جانے کیا باتیں ہوتی رہیں۔ کبریٰ نے جاننے کی کوشش بھی نہیں کی۔ یہ تو اسے بعد میں ایک ملازمہ کے ذریعے پتا چلا، اماں بیگم نے اس کے سر تاج کو دوسری شادی کے لئے کہا ہے اور تم تو یہ کہ شاہ نے بلاچون و چرا سرائیات میں ہلا دیا کہ یہ بات تو اُن کے دل میں پہلے سے

تھی۔ دو بیٹیاں انہیں سینے پر دھرے ہو جی طرح محسوس ہوتی تھیں..... لوگ کیا کہتے ہوں گے اتنا بڑا زمیندار اور وارث کوئی بھی نہیں..... ”یہ دو بیٹیوں کا باپ ہے.....“ شاہ کو یہ جملہ گالی سے کم نہیں معلوم ہوتا تھا۔

کبریٰ کو ملازمہ کی بات پر یقین نہیں آیا تھا، اس کا خیال تھا اماں بیگم نے یہ بات کہی ہوگی مگر جشید اس سے اتنی جلدی مایوس نہیں ہوں گے۔ صرف دو ہی بیٹیاں ہیں ناں اور پھر شادی کو کوئی اتنا عرصہ بھی نہیں ہوا۔ آج نہیں تو کل دینے والا بیٹے سے بھی توازدے گا..... مگر جب ساس نے کمرے میں آکر کہا.....
”میں جشید کی دوسری شادی کر رہی ہوں.....“ تو بیروں سے زمین نکل گئی۔ وہ سہمی پر بیٹھی تھی، کھڑی ہوئی تو گونے والا ہنر دوپٹہ شانوں سے پھسل کر فرش پر آگرا۔

”محبوبوں میں شراکت مجھے منظور نہیں.....“ ساس کے کمرے سے جاتے ہی اُس نے مردانے میں پیغام بھجوا کر شاہ کو بلوایا..... جب تک وہ نہیں آئے، بے قراری کے عالم میں کمرے کی ایک دیوار سے دوسری دیوار تک چکر لگاتی رہی اور ہاتھ ملتی رہی..... دروازے پر پڑا بھاری پردہ ہٹا کر شاہ اندر آئے اور کبریٰ رُک کر ایک ٹک انہیں دیکھنے لگی..... بظاہر تو کچھ بھی نہیں بدلا۔ وہی آنکھیں ہیں جن میں کبریٰ کی محبت لود تھی..... وہی عتابی لب جن پر کبریٰ کا نام ہوا کرتا تھا اور وہی ہاتھ جو اُسے تمام تمام لیتے تھے۔

”تم نے بلایا تھا کبریٰ.....“ اُس کے یوں دیکھنے پر وہ کچھ حیران سے ہو کر پوچھ رہے تھے، اُن کی آواز اسے جگانے میں معاون ثابت ہوئی۔

”یہ میں کیساں رہی ہوں شاہ جی.....؟“ لہجے میں آنسوؤں کی گھلاوٹ تھی اور چہرے کا رنگ متغیر تھا۔

”ایسا کیساں لیا.....؟“ وہ سمجھ کر بھی انجان بن گئے تھے۔

”میری محبت پڑا کا بڑا رہا ہے..... آپ کسی اور کے ہور ہے ہیں اور پوچھ رہے ہیں، ایسا کیساں لیا میں نے..... مجھے بتائیے جو کچھ میں نے سنا، کیا واقعی وہ سچ ہے؟“ اب بھی شاید کبریٰ خاتون کو موہوم سی اُمید تھی کہ شاید وہ کہہ دیں، یہ صرف اماں بیگم کا فیصلہ ہے، جس پر عمل کرنا میرے لئے ناممکن ہے۔ مگر وہ کہہ رہے تھے۔

”ہاں یہ سچ ہے کیونکہ مجھے وارث چاہئے۔“

”تو کیا میں آپ کو وارث نہیں دے سکتی.....؟“ شاہ کا سپاٹ چہرہ اور ہر جذبے سے یکسر عاری آواز کبریٰ کے دل کی دُنیا بولہو کر گئی۔

”مونہ..... آٹھ سال تو ہو گئے ہیں شادی کو..... یہ دو بیٹیاں، آئندہ چند سالوں میں دو سے چار کر لوگی بیٹیاں دے سکوگی۔“

”یہ سب تو اللہ کے کام ہیں شاہ جی.....“ اُس کو خود اپنی ہی آواز اجنبی لگ رہی تھی۔

”ہاں، اور یہ یاد رہے کہ دوسری شادی گناہ نہیں ہے اجازت ہے مرد کو۔“

”میں نے کب انکار کیا ہے اس بات سے مگر..... مگر میں یہ برداشت نہیں کر سکوں گی۔ میں نے آپ کو صرف شوہر ہی نہیں سمجھا، آپ میرے محبوب ہیں، میں نے پوچھا ہے، آپ کو.....“ آنسو پلکوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے مگر مقابل کا دل اس کے لئے پتھر ہو چکا تھا۔ یہ آنسو..... نہیں صرف کوئت میں مبتلا

کر رہے تھے۔ کہا تو صرف اتنا.....

”کبریٰ خاتون..... تمہیں اور تمہاری بیٹیوں کو حق ملتا رہے گا، روپے پیسے کی طرف سے کبھی پریشانی نہیں ہوگی..... چاہو تو اسی حویلی میں رہو اور چاہو تو چھوٹی حویلی میں چلی جاؤ۔“

”واہ..... کیسا حق ملتا رہے گا.....! تم ہی اپنے نہیں ہو گے شاہ جی تو پھر یہ سونے چاندی کے زیور کینے لے کر کیا کرو گی میں.....؟“

مگر وہ چپکے تھے اور کبریٰ کے نصیب کا تارہ ڈوب چکا تھا۔

فاطمہ کبریٰ خاتون کے ماموں کی بیٹی تھی..... اس سے چند برس چھوٹی تھی، نازک سی، پیاری لڑکی اور کبریٰ کو کیا تھا کہ وہی فاطمہ جو اسے آپا آپا کہتے نہیں تھکتی، ایک روز سوکن کے روپ میں اُس کی بیج پر آ بیٹھنے لگی۔

کبریٰ نے اُس شادی میں شرکت نہیں کی۔ دُنیا دکھاوے کو بھی نہیں آئی..... الگ تھلک کمرے میں پڑی اپنی قسمت کا ماتم کرتی رہی..... ان دو معصوم بیٹیوں کا خیال نہ ہوتا تو خود کشی کر لیتی اپنا محبوب شوہر فاطمہ کے قریب دیکھنے کا حوصلہ اس میں نہیں تھا۔ اور ساس لوگوں کے سوالوں کے جواب دیتے دیتے تنگ آگئی تھیں۔ اور خود اس کے کمرے میں چلی آئیں۔ کبریٰ جو اُن کے احترام میں ہمیشہ کھڑی ہو جایا کرتی تھی..... آج کھڑے ہونا تو درکنار، وہ اُنھ کو بھی نہیں.....

”کیوں ماتم کر رہی ہو.....؟ ایسا کیا ظلم ٹوٹ پڑا ہے تم پر.....؟ کیا تم دُنیا سے زالی عورت ہو.....؟ آج سے پہلے کسی مرد نے پہلی بیوی کی موجودگی میں دوسری شادی نہیں کی.....؟ کیا صرف تم پر ہی سوکن آئی ہے.....؟ شکر نہیں کرتیں کہ وارث نہ دے کر بھی تم عزت کے ساتھ اس گھر میں ہو۔ میرے بیٹے نے نہ تو تم پر ہاتھ اٹھایا ہے اور نہ تمہیں طلاق دی ہے۔“

”تو دلو دو طلاق..... یہ دو روٹیوں اور گھر کی چھت کا احسان مت کرے وہ مجھ پر..... میرا تن ڈھانپنے والے، مجھے آسرا دینے والے میرے بھائی موجود ہیں۔ میں عزت دار گھرانے کی بیٹی ہوں، کسی شے کی کمی نہیں ہے میرے سینے میں..... تم لوگ کیا سمجھتے ہو، اگر مجھے گھر سے نکال دو گے تو میں دردِ بھیک مانگتی بھروں گی۔ اسے کہو نکال دے مجھے.....“ کبریٰ غصے سے پھٹ پڑی۔

”چپ ہو جاؤ بے وقوف لڑکی، اگر کسی نے سن لیا تو برا ہوگا۔ برادری جمع ہے اور لوگ آگ لگا کر تماشا دیکھنے کے شوہنیں ہوتے ہیں۔ کسی نے تمہاری یہ باتیں سن کر جشید تک پہنچا دیں تو اچھا نہیں ہوگا۔

مرد کا غصہ جڑ سے طوفان کی طرح ہوتا ہے، جو اُن کی آن میں سب کچھ بہا کر لے جاتا ہے اور عورت کے پاس کچھ بھی نہیں رہتا..... تم اسے مت لکارو، حزیلہ بدھیمی اپنی چھوٹی میں مت اٹھیلو، جو ہوا اُسے قسمت کا لکھا کچھ کر برداشت کر لو کہ تمہاری بیٹیوں کی بھلائی اسی میں ہے..... بے شک تمہارا میکہ مضبوط ہے مگر یہ تمہاری بیٹیوں کے باپ کا گھر ہے..... تم تو اپنے باپ کے گھر چلی جاؤ گی مگر یہ بے گھر ہو جائیں گی۔ ان کے لئے وہاں کبھی کوئی جگہ نہیں ہوگی۔“

ساس کا لہجہ سمجھانے والا تھا۔ وہ اپنی زندگی کے تجربات سامنے رکھنے سے نڈھال عورت کو صبر اور صرف صبر کی تلقین کر رہی تھیں۔ اُسے زمانے کی اونچ نیچ سمجھا رہی تھیں۔

بظاہر کبریٰ خاتون نے ساس کی تمام باتوں کو تسلیم کر کے غصہ تھوک دیا، مگر یہ کوئی نہیں جان سکا کہ وہ

اس وقت کبریٰ کی نگاہوں میں انہیں جتانے والے انداز کی ہلکی سی رمت بھی نہیں تھی۔ اُس نے بڑے ادب سے ساس کو سلام کیا، حال پوچھا اور پھر کہنے لگی.....
”میں نے سنا ہے بنی ہوئی ہے۔“

اماں بیگم کو جھوٹ تو بولنا نہیں تھا کہ یہ بات کوئی چھپنے والی تو نہ تھی، ہولے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔
”چلو..... خدا نصیب اچھے کرے“ کبریٰ نے شغزی سانس بھر کر ہولے سے کہا۔ اماں بیگم بس ہوں، کر کے رہ گئیں۔

”میں فاطمہ بہن سے مل کر آتی ہوں“ آج تو وہ بے چین تھی فاطمہ کے شکست خوردہ چہرہ دیکھنے کو۔
فاطمہ اُسے دیکھ کر گھبرا گئی اور سر جھکا لیا تھا۔

”کیا بات ہے بہت کمزور ہو گئی ہو، کچھ کھاتی چلتی نہیں ہو کیا.....؟“ اُس کے اندر ہی اندر سکون اور خوشی کے جتنے پھوٹ رہے تھے مگر بظاہر وہ بڑی ہمدردی اور اُداسی سے سوکن سے مخاطب تھی، جو گاؤں تکے سے ٹپک لگائے ہوئے اُداس اور محفلِ بیگمی تھی۔

”بنی کہاں ہے.....؟“

تب فاطمہ نے جمولے کی طرف اشارہ کر دیا۔ کبریٰ جمولے کے قریب چلی آئی بنی کا چہرہ دیکھا اور بولی.....

”ہاں کل ماں پر گئی ہے..... باپ کا تو ایک نقش بھی نہیں لیا اس نے.....“

”توری..... انوری، میں چند روز کے لئے گاؤں سے باہر جا رہا ہوں..... میرا سامان.....“ ملازمہ سے کہتے ہوئے شاہ اندر داخل ہوئے تھے اور کبریٰ کو دیکھ کر ٹھٹھک گئے۔ فقرہ مکمل کرنا ہی بھول گئے اور نہ قدم پیچھے ہٹے اور نہ ہی آگے بڑھا سکے۔

”سلام میرے شاہ جی.....“ وہ یوں ان کی جانب لپکی جیسے درمیان میں کوئی خلیج آئی ہی نہ تھی۔

”ولیکم السلام.....“ جمشید شاہ نظر نہیں ملا سکے۔

”میں ابھی فاطمہ سے کہہ رہی تھی..... بنی پیاری ہے اور اللہ نے چاہا تو اب کے اس کا بھائی آئے گا.....“

شاہ نے آنکھیں اٹھائیں تو کبریٰ نے دیکھا ان میں حیرت ہی حیرت تھی۔ یقیناً انہیں کبریٰ کی جانب سے اس فقرے کی توقع ہرگز نہیں تھی۔

”ہاں ہاں، میرے شاہ جی، جو بنی دیتا ہے، وہ بیٹا بھی تو دیتا ہے ناں“ (دل خدا نہ کرے، کبھی نہ کرے کی تکرار کئے جا رہا تھا اور وہ مسکرا کر یہ الفاظ کہہ رہی تھی)۔

میکے سے واپس آ کر وہ سب کو ایک بدلی ہوئی کبریٰ خاتون لگ رہی تھی..... فاطمہ کی بنی کو یوں گود میں اٹھائے پھرتی جیسے یہ اُس کی اپنی بنی ہو۔ اماں بیگم کا خیال رکھنے لگی اور جمشید شاہ کو بھی ایسا تاثر دینے لگی جیسے سارے گلے شکوے بھلا دیئے ہیں..... وہ پھر سے پہلے والی کبریٰ خاتون بن گئی۔ شاہ نے چاروں جانب قحط کی طرح رقص کرنے والی، فاطمہ دل سے اُتر گئی تھی، بنی اُس کا بہت بڑا جرم تھا۔ شاہ اس کی صورت دیکھنے کے بھی روادار نہ تھے۔

وہ ایک بار پھر کبریٰ کی جانب جھک گئے۔ مگر کبریٰ بے وقوف نہیں تھی۔ اُس نے مردکی آنکھوں کے

جو کل تک اس کا محبوب تھا، آج اس سے بڑھ کر قابلِ نفرت کہی نہ تھا۔

تم نے دل دکھایا ہے ناں میرا شاہ.....! تم بھی خوشی کو ترسو گے..... اور میں تمہاری اس پیاس پر قہقہے لگاؤں گی۔ تمہیں دُکھی دیکھنا اب میرے لئے سب سے بڑی خوشی ہوگی۔“

فاطمہ کو دیکھتے ہی کبریٰ کی آنکھوں میں خون اُتر آتا تھا..... سوکن سے مخاطب ہوتا تو درکنار اُس نے بت کرنے کی کوشش بھی کی تو منہ پھیر کر چل دی۔ فاطمہ دل کی بری نہیں تھی اور اُسے احساس تھا کہ اُس کی آمد کبریٰ کے لئے کس قدر اذیت ناک ہے مگر وہ خود مجبور لڑکی تھی، یہ رشتہ اس کے بزرگوں نے طے کیا تھا، اس بے چاری سے تو کسی نے پوچھا تک نہ تھا۔

پھر وہ وقت بھی آ گیا جب فاطمہ کا پاؤں بھاری ہوا اور نیند بس کبریٰ خاتون کی اُڑ گئیں۔ ان دنوں جمشید اور اماں بیگم کی خوشی دیکھنے کے قابل تھی۔ انہوں نے فاطمہ کو اٹھنے کا چھالایا تو بنا ڈالا تھا۔ اور یہ سب کبریٰ کی نظروں کے سامنے ہوتا تھا۔ غصے کی شدید لہر اس کے جسم میں دوڑ جاتی اور بس نہیں چلتا تھا کہ فاطمہ کا گلا گھونٹ دے۔

بیٹا نہیں ہونا چاہئے..... اُس کے اندر ہر وقت یہی تکرار ہوتی رہتی تھی۔

پھر پھر چمن کے مزار کی یاد آئی۔ یہ مزار اس کے میکے اور سسرال کی سرحد پر تھا۔ پھر چمن کے مرید دونوں گاؤں میں رہتے تھے اور کہا جاتا تھا کہ اس مزار پر مانی منت ضرور پوری ہوتی ہے۔ وہ بیٹیوں کو لے کر میکے چلی آئی اور منت مانی لی..... کہ مسلسل چالیس روز دیا جلاتا ہے اور خیرات کرنی ہے۔ ہر روز صبح سویرے ننگے پاؤں وہ اپنی میکے والی حوالی سے پھر چمن کے مزار تک جاتی اور خیرات کرنی اور پھر شام کو مغرب کے بعد دیا جلاتے کے لئے اور دُعا مانگنے کے لئے جاتی۔ ننگے پاؤں اتنا فاصلہ روزانہ طے کر کے اس کے پاؤں میں چھالے پڑ گئے مگر اس کو فکر تھی تو صرف اس بات کی کہ اگر بیٹا ہو گیا تو پھر کیا ہوگا.....؟

اور پھر جس روز بھابیوں نے پہلی بار اُس کے اتنے دن یہاں رہنے پر دبے دبے لہجے میں اعتراض کیا تو کبریٰ خاتون کو اندازہ ہوا کہ اگر وہ جمشید کے گھر سے نکال دی گئی تو کھانا کائیں پر بھی نہ ہوگا۔ وہ ہمیشہ رہنے کے ارادے سے نہیں آئی تھی مگر بھابی کی بکریاں.....

”اب واپس نہیں جائے گی۔“

کبریٰ نے بڑے ضبط اور صبر کے ساتھ یہ دن کاٹے کہ منت پوری کرنا ضروری تھا۔ اور جس روز فاطمہ کے ہاں بیٹی پیدا ہونے کی اطلاع ملی، کبریٰ کا جی چاہتا تھا، اُڑ کر سسرال پہنچ جائے اور اپنی آنکھوں سے ساس، فاطمہ اور شاہ کے شکست خوردہ چہرے دیکھے، بے اختیار مسکراہٹ کبریٰ کے ہون پر اُمنڈ آئی تھی۔

بنی کی اطلاع کے ساتھ ہی واپس جانے کی تیاری شروع کر دی۔

سرسام وہ جمشید شاہ کی اُوچی حویلی کے سامنے تھی..... یوں لگتا تھا جیسے اُس..... بنی کی آمد پر حویلی کے بے جان درود پوار بھی شرمندہ ہیں۔ کبریٰ مسکرا دی..... مگر جب وہ زنان خانے میں داخل ہوئی..... تو چہرے پر گہری سنجیدگی تھی، دکھ اور فکر مندی کے آثار تھے۔ اپنے کمرے میں جانے کے بجائے وہ ساس کے کمرے میں تکی۔ انہیں یقیناً بڑی بہو اور پوتیوں کی آمد کی اطلاع مل چکی تھی مگر یہ خیال نہیں تھا کہ کبریٰ خاتون سیدی اُن کے کمرے میں آئے گی۔ اُسے یوں اچانک سامنے دیکھ کر وہ نظریں نہیں ملا سکیں۔ جبکہ

رنگ بدلتے دیکھ لئے تھے سواب اعتبار حماقت ہی تو تھا۔
لفظوں سے بھرپور دل داری کرتی رہی مگر کبھی قریب آنے کی کوشش نہیں کی۔ ایک اُن دیکھی دیوار
اُس نے اپنے اور شاہ کے درمیان تعمیر کر لی تھی وہ کمرے میں ہوتے تو کبریٰ کی کام کے بہانے حویلی کے
مختلف حصوں سے چکر لگاتی رہتی۔ کبھی اماں کے پاس جا بیٹھتی تو کبھی ملازماؤں کے سر پر کھڑی ہو کر کام کی
نگرانی شروع کر دیتی۔ شاہ نے کئی بار کہا۔
”کبریٰ میں تمہاری ضرورت محسوس کرتا ہوں۔ تم مجھے وقت نہیں دیتیں۔“ (یہ تو شاہ کے گمان میں
بھی نہ تھا کہ خیال رکھنے والی بیوی دل میں کیسی جلن لئے پھرتی ہے۔)
”میں تو آپ کے پاس ہوتی ہوں شاہ جی، ہر لمحے، ہر وقت۔“
”کہاں کبریٰ، میں تو بات کرنے کو بھی ترستا ہوں۔“ انہوں نے بات کرتے کرتے اُس کا ہاتھ
پکڑ لیا۔

”شاہ جی جب آپ گھر پر نہیں ہوتے، تب بھی میرے ساتھ ہوتے ہیں، میرے تصور میں بے
رہتے ہیں۔ میری آنکھوں میں آپ کی ہی تصویر ہے۔ میں ہر دم آپ کو اپنے ساتھ ساتھ محسوس کرتی ہوں
شاہ جی.....“
بات کرتے کرتے وہ خوبصورتی سے ہاتھ جھڑا لیتی..... اور کسی کام کا بہانہ بنا کر ادھر ادھر ہو جاتی
تھی۔

کبریٰ کے دل میں یہ خیال پکا ہو چکا تھا کہ وہ جمشید شاہ کے بیٹے کی ماں کبھی نہیں بن سکے گی۔ اگر
ایک اور نفس اُس کی گود میں آیا تو وہ بھی بیٹی ہی ہوگی اور پھر وہ حویلی کے آخری کونے میں ڈال دی جائے
گی۔ شاہ کی دل داری کے لئے اس کے پاس الفاظ ہی نہیں رہیں گے..... اور اس کی حیثیت اس سے کہیں
زیادہ کمتر ہوگی جو بیٹی پیدا کرنے کے جرم میں فاطمہ کی ہے۔ وہ ستارہ اور شیریں کی ماں تھی اور بس ان ہی
دونوں کی ماں رہنا چاہتی تھی۔ اُسے کسی نغمہ، عذرا یا زبیدہ کے تصور سے بھی خوف آتا تھا۔ بس دو بیٹیاں ہی
کافی ہیں۔ بیٹیاں آئے گا اور مجھے ایک اور بیٹی نہیں چاہئے۔ وہ شاہ جی کی نظروں کی گرمی اور ان میں چھپے
پیام سے بچنے کے لئے فاطمہ کے کمرے میں آ جاتی۔

”بیٹی، اتنا بڑا جرم بھی ہو سکتا ہے آپا.....؟“ فاطمہ ڈکھ کے گھرے احساس تلے کراہ اٹھتی۔
”بیٹی بہت بڑا جرم ہے فاطمہ..... چاہے یہ امیر کے گھر پیدا ہو یا غریب کے، سرتو جھک جاتا ہے
ناں سینہ تان کر چلنے والے مرد کا.....“

”شاہ جی، مجھ سے بہت خفا ہیں.....“ فاطمہ رو پڑتی۔
”تم نے آس جو توڑ دی۔“ کبریٰ کی نظر جھولے میں ہر طوفان سے بے خبر سوئی ہوئی بیٹی پر جا کر
نظمبر گئی۔

”یہ تو خدا کی رضا ہے ہم عورتوں کا تو اس میں کوئی قصور نہیں۔“ فاطمہ احتجاج بھی کرتی تو ایک
عورت کے سامنے جو خود مجبور تھی اور جس پر فاطمہ سوکن بن کر آئی تھی مگر جب سے یہ بیٹی دنیا میں آئی تھی،
دونوں کی آپس میں دشمنی پر پانی بڑ گیا تھا۔ اب ان کے دکھ ایک ہو گئے تھے۔
”شاید ان مردوں کا خدا کوئی اور ہے۔“ وہ فاطمہ کے پلنگ سے اٹھ کر بیٹی کے قریب جھک گئی۔

اے اس بیٹی سے نفرت نہیں تھی۔ کبھی سوکن کی بیٹی کی حیثیت سے نہیں دیکھا اس کو..... اُسے یہ بیٹی بہت
معصوم اور مظلوم لگا کرتی تھی۔

”فاطمہ! تم نے کیا نام رکھا ہے بیٹی کا.....؟“ بیٹی کے گال نرم ہاتھ سے جھوکر اُس نے پوچھا۔
”ہونہ..... اس کا بھلا کیا نام ہو سکتا ہے آپا، باپ کو تو شکل دیکھنا بھی گوارا نہیں ہے۔ اس کی
پیدائش پر جیسے حویلی کی ہر شے نے سوگ منایا ہے۔ درو دیوار تک روئے ہیں، بھلا کیا نام ہو سکتا ہے اس
کا.....؟“ فاطمہ سننے لگی۔

”ایسے مت کہو فاطمہ، تم تو ماں ہو اس کی، تم ہی نفرت کرو گی تو پھر دُنیا میں کسی اور سے محبت کی توقع
رکھنا ہی فضول ہے۔ میں اس کا نام گل رُخ رکھتی ہوں۔ کہو کیسا نام ہے.....؟“ اُس نے بیٹی کو گود میں اٹھا
لیا۔

”آپ نے رکھا ہے تو اچھا ہی ہوگا۔“
”میں اندر آ سکتی ہوں بڑی آپا جان.....“ جب کبریٰ خاتون نعیمی بیٹی کو ہاتھوں پر اٹھائے اُسے گل
رُخ کا نام دے رہی تھی۔ تب ہی گاؤں کے پرائمری اسکول کے ماسٹر صاحب کی بیٹی راحت، فاطمہ بیگم
کے کمرے کے دروازے پر آ کر کبریٰ خاتون سے اندر آنے کی اجازت طلب کر رہی تھی۔
”ہاں آؤ، آؤ راحت.....“ وہ فوراً اس کی جانب متوجہ ہوئی۔

”بڑی آپا..... وہ میں یہ کہنے آئی تھی کہ ستارہ تو پڑھائی میں بہت اچھی ہے مگر یہ چھوٹی شیریں ذرا
بھی توجہ سے سبق یاد نہیں کرتی، اس کی ساری توجہ کھلونوں کی طرف ہی رہتی ہے۔ آپ ہی سمجھا میں ناں
اُسے۔“ راحت نے ڈرتے ڈرتے شیریں کی شکایت کی تھی۔

”میں پوچھتی ہوں شیریں سے، یہ لڑکی روز بروز شریر ہوتی جا رہی ہے اور راحت، تم بھی زیادہ لاؤ
مت اٹھایا کرو، ذرا سختی کر کے دیکھو، میرا خیال ہے سندرہ جائے گی۔“

”نہیں بڑی آپا، یہ کام مجھ سے نہیں ہوتا۔ اب بھلا اتنی سی بیٹی سے ڈانٹ ڈپٹ کیسے کر سکتی ہوں
میں.....؟“ وہ اپنی لمبی سیاہ بالوں کی موٹی سی چوٹی ہاتھ پر لپٹے اور کھولتے ہوئے کہہ رہی تھی، خوبصورت
چہرے پر تھکن کے آثار بہت نمایاں تھے، شاید شیریں نے بہت ستایا تھا آج۔

”تم چلو راحت میں آرہی ہوں۔“ کبریٰ خاتون نے ہاتھوں پر اٹھائی ہوئی گل رُخ کو دوبارہ
جھولے میں ڈالتے ہوئے کہا۔ راحت اثبات میں سر ہلا کر فاطمہ کے کمرے سے چلی آئی۔

”میں بتا کر آئی ہوں تمہاری ای کو، ابھی آ کر وہ خود پوچھ لیں گی تم سے۔“ وہ یہ کہتے ہوئے بچپوں
کے کمرے میں داخل ہوئی تھی مگر سامنے ہی کمرے کے عین وسط میں کمرے شاہ جی کو دیکھ کر اُس کے
پاؤں جیسے زمین نے جکڑ لئے تھے۔ اُس نے سر سے پھسل جانے والی جوجھنی کو سر پر ڈالنے کی کوشش کی۔
شاہ جی کی نظریں مسلسل راحت کی صبح چہرے پر تھیں، اور مارے گھبراہٹ کے اس سے اوڑھنی ٹھیک سے
سر پر ڈالی ہی نہیں جا رہی تھی۔ جی چاہتا تھا واپس منو جائے مگر نہ جانے کیسی نظر تھی وہ جس نے تمام ہمتیں
سلب کر لی تھیں۔ شاہ کا بے باک انداز اُسے سہائے جارہا تھا۔

ان ہی لمحوں میں جب راحت بے بس ہر پٹی کی طرح نظر نہ آنے والے جال کے حصار میں تھی
کبریٰ..... اندر چلی آئی..... اور جو کچھ اُس کی آنکھوں نے دیکھا، حیران کن تھا۔ شاہ کی آنکھوں میں یہ

شاہ کے قدموں میں آ بیٹھی تھی..... طرح طرح کے واسطے دیئے تھے جبکہ کبریٰ نے یہ سن کر کہا تھا۔
”آپ کا فیصلہ بہت مناسب ہے، میں خود بھی ایسا ہی سوچ رہی تھی۔ خیال تھا مناسب موقع دیکھ کر آپ سے بات کروں گی۔ یہ بات تو میرے بھی دل کی ہے میرے شاہ جی۔“
اور جشید شاہ نے بے حد قدر کی نگاہ سے کبریٰ کی جانب دیکھا تھا۔ بے شک وہ اب بیوی کے اس مقام پر نہیں تھی، جو اس کے لئے قابل فخر ہوتا لیکن شاہ اسے ہمدرد اور دوست تصور کرتے تھے، یہ کبریٰ کی بہت بڑی جیت تھی۔

اماں بیگم کے ساتھ کبریٰ بھی ماسٹر سراج الدین کے دو کمروں والے چھوٹے سے گھر میں رشتہ لے کر مئی تھی..... اور انکار بھلا ممکن ہی کہاں تھا علاقے کے بڑے زمیندار کی بات ٹالی نہیں جاسکتی تھی۔ پھر ماسٹر کی اس کے علاوہ دو بیٹیاں تھیں، تین چھوٹے بیٹے تھے، کم آمدنی اور فکر ہزار، بڑی کا رشتہ آیا تھا، مناسب تھا کہ ہاں کہہ دیں اور انہوں نے دیر نہیں لگائی۔

راحت تیسری بیوی بن کر آئی تھی۔ اس شادی پر زیادہ دھوم دھڑکا نہیں تھا۔ قریبی رشتہ داری شریک ہوئے تھے۔ برادری سے باہر اور وہ بھی مفلس گھرانے کی لڑکی..... سب نے دلہن کے جذبات کا خیال کئے بغیر خوب باتیں بنائی تھیں۔ کبریٰ دلہن کے قریب ہی موجود تھی اور بظاہر وہ راحت کو تسلیاں دے رہی تھی، مگر بہر بات کے آخر میں۔

”ہمارے اُونچے گھرانوں میں یہ رسم ہے..... بڑے گھرانوں کا یہ رواج ہے..... تم ایسی باتوں سے واقف نہیں..... یہ تمہارے جیسے گھرانوں میں ہوتا ہے..... خیر میں سمجھا دوں گی۔“ جیسے نعروں کی ٹکرار راحت کو اس کے چھوٹے خاندان اور مفلسی کا احساس دلا رہی تھی، وہ دل ہی دل میں سخت خوفزدہ ہو گئی تھی اور کبھی کھوکھٹ، کبھی ماتھے کا ٹیکہ، جھومر درست کرتی کبریٰ تصور میں جشید شاہ کو مخاطب کر کے کہہ رہی تھی۔

”تم دس شادیاں بھی کر لو شاہ..... مگر میرا دل کہتا ہے بیٹا نہیں آئے گا تم نامراد ہو گے۔“ لیکن اس مرتبہ کبریٰ کے دل نے جھوٹ بولا تھا۔ شادی کے ایک سال بعد راحت نے بیٹے کو جنم دیا تھا اور کبریٰ کو لگا تھا حویلی کی یہ اُونچی اُونچی دیواریں ایک دھماکے سے اس پر آن پڑی ہیں۔

یہ کیسے ہو گیا؟ میں نے تو پھر چن کے مزار پر منت مانی تھی..... پھر یہ کیسے ممکن ہو گیا..... اُس کے دل کو کسی پل قرائن میں آ رہا تھا..... کتنی دیر وہ کمرے سے باہر نہیں نکلی..... خود کو سنبھالنے میں کئی گھنٹے لگا دیئے۔ ہاں مگر جب..... باہر آئی تو پھر اسے دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ ابھی کس کیفیت سے دوچار ہوئی ہے۔

”تم کہاں تھیں بڑی بہو.....؟“ ساس نے دیکھتے ہی سوال کیا۔
اماں، میں خیر بات بانٹنے کے انتظامات دیکھنے میں لگی ہوئی تھی، بس اسی لئے دیر ہو گئی اور پھر نفل بھی تواوا کرنے تھے ناں۔“

شاہ نے ستائش بھری نگاہ سے کبریٰ کی جانب دیکھا اور راحت کے پہلو سے ننھے بچے کو اٹھا کر اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

”اس کو جنم تو راحت نے دیا ہے مگر تم بڑی بہو ہو اس حویلی کی، اس کی بڑی ماں ہو اور سب سے

تھا، کبریٰ کو پہچاننے میں دیر نہیں لگی۔ مگر وہ مجبور عورت تھی، اپنے مرد پر اتنا اختیار ہی کہاں تھا کہ ٹوک سکتی۔ وہ بس اتنا ہی کر سکتی کہ راحت کا ہاتھ پکڑا اور اسے وہاں سے باہر لے آئی۔

راحت، گاؤں کے غریب ماسٹر جی کی بیٹی، سیاہ چادر میں خود کو چھپا کر گھر سے نکلنے والی ڈرپوک لڑکی، جب کبریٰ..... نے پہلی بار بچپن کو پڑھانے کے لئے حویلی میں بلایا تھا، تو مارے گھبراہٹ کے اُس کا چہرہ بار بار پیسے میں بھیک جاتا تھا۔ اُسے حویلی کی آن بان اور یہاں کے کینوں نے خوفزدہ کر رکھا تھا۔ قدم قدم پر یہی خیال رہتا تھا، کہیں کوئی غلطی نہ کرے۔

اسے تین ماہ ہونے کو آئے تھے، صرف بچپن کے کمرے تک جاتی تھی، انہیں پڑھا کر لوٹ آتی، کبھی جشید شاہ سے سامنا نہیں ہوا تھا مگر آج وہ سامنے آئے تو ایسے وقت میں جب چادر اس کے سر سے پھسل گئی تھی اور شاہ نے جن نظروں سے دیکھا، اس کا بدن، اب تک کانپ رہا تھا اور یہ حالت کبریٰ سے چھپی نہ رہ سکی۔ وہ سمجھ گئی لڑکی بری طرح گھبرا رہی ہے۔ اُس کے مرد کی گہری بے باک نظر نے اُسے اندر تک ہلا ڈالا ہے۔ وہ سر نہیں اٹھا رہی تھی کبریٰ نے اُسے گھر جانے کی اجازت دے دی اور خود افسردہ سی اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی اور یہ دیکھ کر ٹھٹھک گئی..... شاہ جی اس کمرے میں موجود تھے اور شاید اسی کے انتظار میں تھے۔

”کون تھی وہ لڑکی.....؟“ ہنداز میں اشتیاق کی فراوانی تھی۔

”یہ ماسٹر سراج الدین کی بیٹی تھی۔“ ساری ناگواری کو اندر ہی اندر اتار کر بظاہر بڑے آرام اور معقولیت کے ساتھ جواب دیا تھا۔

”یہاں کیا کرنے آئی ہے.....؟“ شاہ جی نے پلنگ پر بیٹھ کر دُور سوال کیا..... اور انداز بتا رہے تھے۔ ابھی وہ دیر تک اسی موضوع پر بات کریں گے۔

”میری بیٹیوں کو پڑھانے آئی ہے۔“ کبریٰ خاتون نے بلا ارادہ ہی میری، پر زور دے کر کہا..... اگر جشید شاہ وہاں میں ہوتے تو شاید غور کرتے مگر ایسے وقت میں ممکن نہیں تھا، وہ سوالوں پر سوال کئے جا رہے تھے مگر نظری بیوی پر نہیں تھی..... آنکھوں میں وہ ایک منظر ٹھہر گیا تھا..... اور کچھ اور دیکھنے کی فی الحال خواہش نہیں تھی۔

”اماں..... میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔“ چند روز بعد انہوں نے فیصلہ کن انداز میں کہہ دیا تھا۔
”ٹھیک ہے تمہاری مرضی.....“ ماں کے انداز میں گرجوٹی نہ تھی..... شاید انہیں بھی ناامیدی ہو چلی تھی کہ بیٹا نہیں آئے گا۔

”آپ ماسٹر سراج الدین کے گھر رشتہ لے کر جائیں۔“

”کیا.....؟ ماسٹر سراج الدین.....؟ یعنی تم اس مرتبہ برادری سے باہر شادی کرو گے.....؟“ ماں کے لہجے میں حیرانی اور افسوس تھا۔

”..... اماں جان، دو بیویاں لا تو چکا ہوں برادری سے، اب تیسری باہر سے آئے گی، آپ.....“

”میرے رشتہ ڈال دیں۔“
خود مختار رہنے کا اٹل فیصلہ تھا، وہ اب مزید کیا کہتیں۔
یہ خبر کبریٰ اور فاطمہ تک بھی پہنچ گئی۔ دونوں کا رد عمل ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھا۔ فاطمہ تو

بڑھ کر یہ کہتم میرے لئے قابلِ فخر ہو، یہ بچہ تمہاری گود میں پروان چڑھے گا۔“
”بسم اللہ..... میرا بیٹا..... میرا لال.....“ انہوں نے بچے کو گود میں لے کر چوم لیا۔
”اس کا نام ارشد رکھا ہے میں نے۔“ شاہ نے اعلان کیا۔



”خالہ..... آپ کچھ دیر بیٹھ جائیں، میرا خیال ہے ناصر آفس سے آتے ہی ہوں گے۔“ جویریہ نے ننھے طلال کو بستر پر لٹاتے ہوئے کہا۔
”نہیں بیٹا..... اب چلتی ہوں۔ گھر میں بانو اکیلی ہے..... میں کب سے آئی بیٹھی ہوں، پریشان ہو رہی ہوں گی۔“ خالہ، میلی سی چادر سنجال کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔
”کھانا کھا کر جاتیں، اب تو وقت بھی ہو رہا ہے۔“
”ارے بیٹی، جب بھی آتی ہوں، کچھ نہ کچھ کھا کر ہی جاتی ہوں، آج ایسے ہی چلی جاؤں گی تو کیا ہوا بس تم ناصر بیٹے سے کہہ دینا، میرا یہ کام ضرور کروادے، ساری عمر ڈو عا میں دوں گی۔“
”کیوں نہیں خالہ بی..... ضرور کہہ دوں گی۔“ وہ خالہ کے ساتھ ساتھ چلتی چھوٹے سے آگن میں آئی اور ان کے جانے کے بعد، دروازے کی کنڈی لگا کر باورچی خانے میں آگئی۔
آٹا لٹکا ہوا تھا، خیال تھا ناصر آج توجہ گرم گرم پھلکے اُتار لے گی۔ مگر آج ناصر نے آنے میں دیر کر دی تھی۔ ڈھائی سالہ طلال بھی باپ کا انتظار کرتے کرتے تھک کر سو گیا تھا۔ جویریہ نے سوچا، اب پھلکے اُتار ہی لئے جائیں تو اچھا ہے۔ چوہا جلا کر تو اڑھا اور بیڑے بنائے گئے۔ ابھی پہلی روٹی ہی تو بے پروالی تھی کہ دروازہ بچ اٹھا۔ یقیناً ناصر آفس سے آگیا تھا۔ وہ روٹی یونہی چھوڑ کر دروازے کی جانب لپکی..... آنے والا واقعی ناصر تھا۔

”آج بہت دیر کر دی آپ نے۔“ ڈو عا سلام کے بعد اُس نے پوچھا۔
”جان بوجھ کے تھوڑی کی ہے دیر، بس ایک کام پڑ گیا تھا اور یقیناً کرو میں تو گھر سے نکلتے ہی گھر واپسی کے متعلق سوچنا شروع کر دیتا ہوں۔“

دونوں ساتھ ساتھ چل رہے تھے اور ناصر کا ہاتھ جویریہ کے شانے پر تھا۔
”بیٹا..... یاد آتا ہوگا.....“ وہ جھینپی سی شوخ مسکراہٹ کے ساتھ کہہ رہی تھی۔
”ہاں بیٹا بھی مگر بیٹے کی ماں زیادہ یاد آتی ہے۔“ وہ اس کی جانب جھک گیا۔
”ہائے اللہ..... میں نے تو روٹی تو بے پروا کر رکھی ہے۔“ جلتے کی بو پھیلی تو اُسے یاد آیا اور گھبرا کر باورچی خانے کی جانب لپکی۔

”روٹی جلتے کی بڑی فکر ہے اور تمہارے یوں بھاگنے سے ہمارا دل جو جل کر خاک ہو گیا ہے، اس کی پروا نہیں ہے۔“ وہ بھی کیچھے ہی چلا آیا تھا۔

”آپ چل کر کپڑے بدلیں..... باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔“
”کیا واقعی ہوں گی؟“ وہ شریہ ہوا اور جویریہ رُخ موڑ کر بس پڑی۔
”آج خالہ آئی تھیں۔“ کھانے کے دوران وہ ناصر کو بتا رہی تھی۔
”وہ تو آئی ہی رہتی ہیں، یہ کون سی نئی بات ہے۔“

”نہیں یہ بات نئی نہیں، میں تو یہ بتانے لگی تھی کہ انہوں نے آپ سے ایک کام کروانے کو کہا ہے، کہتی ہیں ناصر بیٹا، سارے محلے کے کام آتا ہے، اُسے کہنا میری مشکل بھی آسان کر دے ساری عمر ڈو عا میں دوں گی۔“

”وہی مالک مکان کے ساتھ جھگڑا ہے۔ ہر دوسرے ماہ کرایہ بڑھانے کے لئے کہنے لگتے ہیں، خالہ بے چاری کہاں سے لائیں اتنے پیسے۔ جو ان بچیوں کا ساتھ ہے، گھر میں مرد بھی کوئی نہیں اور مالک مکان کے بیٹے وقت بے وقت دروازے پر آن موجود ہوتے ہیں۔ کرائے میں اضافے کے لئے شور مچاتے ہیں۔“

”ہاں بھئی، کمزور کو دبانے کے لئے ہر کوئی تیار ہوتا ہے حالانکہ یہ بات تو وہ لوگ بھی جانتے ہی ہوں گے کہ خالہ میں اس سے زیادہ رقم کرائے کے نام پر دینے کی استطاعت ہی نہیں ہے۔“
”ہاں، اسی وجہ سے تو خالہ پریشان ہیں۔ کہتی تھیں، ناصر سے کہنا محلے کے معزز افراد کو درمیان میں ڈال کر معاملہ حل کروادے۔“

”ہاں ٹھیک ہے، اب خالہ آئیں تو میری طرف سے کہہ دینا، یہ معاملہ جلد سیٹ ہو جائے گا..... اور اب میرے پاس بھی تو تمہارے لئے ایک خبر ہے۔“ اُس نے جویریہ کے چہرے پر مسکراتی نظر ڈال کر کہا۔
”کیسی خبر.....؟“

”اچھی یا بری کے متعلق تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا البتہ تمہارے لئے اہمیت بہت رکھتی ہے۔“
”اوہو..... ایک تو آپ کو سسٹن پھیلائی کی بڑی عادت ہے، اب بتا بھی چکیں۔“
وہ جانتا تھا، جویریہ سے مبر ممکن نہیں، سو زیادہ ستایا نہیں..... جب سے پانی گلاس میں اٹھ پلٹے ہوئے بیوی سے نظر ملائے بغیر کہنے لگا۔

”آج بھائی جان سے ملاقات ہوئی تھی۔“
”اچھا، کیا واقعی.....؟“ جویریہ کی آواز مارے جوش کے خاصی بلند ہو گئی تھی۔
”ہوں۔“ اُس نے اثبات میں سر ہلادیا۔

”پھر کیا کہنے لگے.....؟ میرے بارے میں پوچھا تھا.....؟ آپ سے ملے تو ٹھیک سے تھے ناں.....؟“ وہ بہت بے صبر ہو رہی تھی۔
”باقاعدہ ملاقات تو نہیں ہوئی، بس سر راہ اتفاقاً ہی سامنا ہو گیا۔ میں نے سلام کیا، انہوں نے جواب دے دیا۔“

”پھر بھی آپ نے کچھ تو محسوس کیا ہوگا۔ آپ سے ملتے ہوئے ان کے چہرے کے تاثرات کیا تھے، وہ کس انداز سے آپ کو دیکھ رہے تھے اور ہاتھ ملاتے ہوئے انہوں نے گرجوٹی کا مظاہرہ کیا تھا یا نہیں۔“

”اوہ جویری..... اگر مجھے معلوم ہوتا تم اس قدر جرح کرو گی، تو میں تمہیں بتاتا ہی نہیں۔“ اُس کے انداز پر ناصر کو لپکی بھی آ رہی تھی اور ترس بھی آ رہا تھا اس لڑکی پر۔
جب سے ان دونوں کی شادی ہوئی تھی، وہ اپنے بھائی اکبر علی..... سے نہیں ملتی تھی کہ یہ اُن کا حکم تھا،

ناصر سے بیاہ تو دیا مگر کہہ دیا، اب میرے اور تمہارے درمیان کوئی تعلق باقی نہیں رہا مگر بہن کے دل سے بھائی کی محبت بھلا کیونکر جدا ہو سکتی ہے۔ اگر بھابھی عارفہ کا ڈرنہ ہوتا تو وہ خود اکبر علی سے ملنے اُن کے بچکے پر چل جاتی مگر بھابھی سے اُسے بہت ڈر لگتا تھا۔ اُس نے کتنی ڈعا کی تھیں کہ کبھی کہیں آتے جاتے کسی روڈ پر، شاہنگ سینٹر میں بھائی سے ملاقات ہو جائے۔

چار سال ہونے کو آئے تھے اور اُس کی یہ دُعا اب تک قبول نہیں ہوئی تھی۔ آج ناصر نے اکبر علی سے ملاقات کے بارے میں بتایا تو اس کا بے چین ہو جانا فطری سی بات تھی۔ وہ بار بار چھوٹے چھوٹے سوال کر رہی تھی، اندازہ لگانا چاہ رہی تھی کہ گزرے چار برسوں میں بھی بھابھی کے غصے کی وہی حالت ہے، یا کچھ دھیمپڑ گیا ہے۔ مگر ناصر بتا رہا تھا، ملاقات بالکل سرسری انداز میں ہوئی اور دورانہ بھی بے حد قلیل تھا۔

”آپ ہی روک لیتے انہیں، بتاتے تو سبکی بہن کتنا یاد کرتی ہے انہیں۔“ وہ اُداسی سے بولی۔
”وہ بہت جلدی میں معلوم ہوتے تھے اس لئے میں نے روکنا مناسب نہیں سمجھا، تم دل چھوٹا کیوں کرتی ہو۔ ہو سکتا ہے پھر کہیں ہم آپس میں ٹکرا جائیں اور تب میں انہیں ساری باتیں سنا کر ہی دم لوں گا۔“
”ہونہ۔۔۔۔۔ پھر کب ملیں گے۔۔۔۔۔ ایک شہر میں رہتے ہوئے چار سال بعد ملے ہیں، اب کیا چار سال تک مزید انتظار کروں۔“ وہ روہانسی ہو گئی۔

”تم کہو تو میں تمہیں اُن کے گھر لے جاؤں، مگر میں اندر نہیں جاؤں گا، تمہیں گیٹ پر چھوڑ کر واپس آ جاؤں گا۔“

”نہیں، میں بھائی جان کے گھر نہیں جاسکتی۔۔۔۔۔ بھائی تو شاید معاف کر دیں مگر بھابھی مرضی کے خلاف چلنے والوں کی صورت دیکھنا بھی پسند نہیں کرتیں۔ کس طرح شادی کے بعد بھائی کو اپنی مٹھی میں لیا۔ سبکی بہن تو بھول گئے ہیں وہ، اور میرا جرم کیا تھا، صرف یہ کہ میں نے والدین کے طے کئے ہوئے رشتے کو توڑنے سے انکار کر دیا تھا۔ میں نے بھابھی کے کزن سے شادی کرنے سے انکار کیا تھا، اور کیوں نہ کرتی، میری مٹھی تو بہت پہلے آپ کے ساتھ ہو چکی تھی مگر بھابھی کی بھابھی کے ہم نوا بن گئے۔“ جویریہ کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہونے لگیں۔

”چھوڑو بھابھی کو اور جلدی سے اچھی سی چائے بنا کر لاؤ، بہت موڈ ہو رہا ہے۔“ اُسے اُداس دیکھنا ناصر کے لئے ممکن ہی نہ تھا۔ وہ ہر صورت میں اسے بہلانا چاہ رہا تھا۔

”طلال بڑا ہو گا تو میں اسے اس کے ماموں کے بارے میں کیا بتاؤں گی۔۔۔۔۔؟“ آنسو گالوں پر آ گئے۔

”تم یہ کام مجھ پر چھوڑ دو، میں خود ہی بتا دوں گا، جاؤ اب چائے بناؤ، روتے ہوئے بالکل اچھی نہیں لگتیں۔“ ناصر نے اُس کے آنسو اپنی انگلیوں کی پوروں پر سیٹے ہوئے کہا۔

”بڑی بیگم صاحبہ۔۔۔۔۔ وہ ارد شیر گھوڑے پر سواری کی ضد کر رہے ہیں۔“ ملازم گھبرائے ہوئے انداز میں کبریٰ خاتون کی خدمت میں حاضر ہو کر کہہ رہا تھا۔
”ہاں تو ٹھیک ہے، تم منع کیوں کرتے ہو۔۔۔۔۔؟“ کچھ سوچ کر کبریٰ کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔

”ابھی تو وہ بہت چھوٹے ہیں جی، اگر گر پڑے تو۔۔۔۔۔؟“ ملازم بعد میں نازل ہونے والے عتاب کے ڈر سے جیل و محبت سے کام لے رہا تھا۔

”وہ ضد کر رہا ہے تو پھر ہم کیسے منع کر سکتے ہیں۔۔۔۔۔ جاؤ گھوڑے پر کاغھی ڈالو۔“
”بڑی ماں۔۔۔۔۔ بڑی ماں۔۔۔۔۔ یہ جامو مجھے گھوڑے پر نہیں بٹھا رہا۔“ سات سالہ ارد شیر ملازم کی شکایت لگانے خود چلا آیا۔

”میں نے کہہ دیا ہے جامو سے، اب وہ تمہیں منع نہیں کرے گا۔“ اس کے ساتھ ہی انہوں نے جامو کو اشارہ کیا کہ وہ ارد شیر کو یہاں سے لے جائے۔

ان دونوں کے جانے کے بعد وہ مونے پایوں والے پلنگ پر آ بیٹھی اور تصور کی آنکھ سے ایک منظر دیکھنے لگی۔۔۔۔۔ شاہ جی کا اکلوتا بیٹا گھوڑے سے گر کر بری طرح زخمی ہو گیا ہے، راحت کی حالت دیکھی نہیں جاتی اور شاہ جی ضبط سے کام لیتے لیتے اب کھرنے لگے ہیں۔ نذر و نیاز کا سلسلہ جاری ہے مگر یہ سب بھی کام نہیں آتا کہ ارد شیر عمری کم لکھوا کر لایا ہے۔ وہ چلا گیا ہے اور اس کے ساتھ ہی کبریٰ کی جیت ہو گئی ہے۔

یہ تصور اس قدر مضبوط تھا کہ وہ آنکھیں ایک ہی نکتے پر مرکوز کئے مسکرائے جاری تھی۔
”ارد شیر چاچا ہے۔ اب راحت کو بھی واپس اپنے باپ کے گھر جانا چاہئے۔ اچھا چلو مت کر رہی ہے تو رہنے دیتی ہوں۔ میرا بھلا کیا کیا کر سکتی ہے۔ ساس کے مرنے کے بعد گھر کی چابیاں میرے پاس ہی ہیں۔ میں بڑی بہو ہوں اور خاندانی ہوں، راحت اور فاطمہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔“
”بڑی بی بی صاحبہ۔۔۔۔۔ ملازمہ کی تیز آواز انہیں چونکا گئی۔ وہ یوں گھبرا کر اٹھیں جیسے ملازمہ اُن کے خیال پڑھ چکی ہے۔

”وہ جی۔۔۔۔۔ وہ جی۔۔۔۔۔“

”کیا کہنا چاہتی ہو، جلدی کہو۔۔۔۔۔“ انہوں نے بری طرح ڈانٹ دیا۔

”وہ جی ارد شیر۔۔۔۔۔ م۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے چھوٹے شاہ جی گھوڑے سے گر پڑے ہیں۔“

”ہیں۔۔۔۔۔؟ کیا واقعی۔۔۔۔۔؟“ انہوں نے سخت بے یقینی کے عالم میں اُس کی طرف دیکھا۔

”ہاں جی۔۔۔۔۔ وہ گر پڑے ہیں۔“

”زپادہ چوٹ تو نہیں آئی۔۔۔۔۔؟“ دل کی دھڑکن تیز ہونے لگی تھی۔

”ہاں نہیں، ابھی اندر نہیں آئے۔۔۔۔۔ مجھے میری بیٹی نے بتایا ہے، وہ باہر کھیل رہی تھی۔“

”اچھا اچھا ٹھیک ہے۔“

وہ کمرے سے باہر نکل آئیں۔

”کہاں ہے ارد شیر۔۔۔۔۔؟“ ادھر ادھر دیکھ کر پکارا۔

”آپا۔۔۔۔۔ بڑی آپا۔۔۔۔۔ میرا بیٹا، میرا لال گھوڑے سے گر پڑا ہے۔“ راحت تک خبر پہنچ گئی تھی۔ وہ

کمرے سے نکل کر ننگے پاؤں صحن میں آ گئی تھی اور۔۔۔۔۔ کبریٰ کے لئے یہ منظر نیا نہیں تھا۔ انہوں نے خیالوں ہی خیالوں میں کئی بار راحت کو اسی طرح دیکھا تھا۔

”میرا بیٹا..... میرا لال.....“ راحت نے بھاگ کر بیٹے سے لپٹ جانا چاہا کہ مامتا بے چین تھی۔ اُس کی پیشانی سے بہنے والا خون راحت کے دل میں ٹیس جگایا مگر کبریٰ نے جھپٹ کر راحت کا بازو پکڑ لیا اور گرفت ایسی سخت کہ راحت جنبش کرنے کے قابل نہیں رہی۔

”بڑی آپا..... میرا بچہ.....“ وہ بے بسی کے احساس تلے دب کر صرف اسی قدر کہہ سکی۔
”بیٹے کو سینے سے لگا کر رو دو گی.....؟ اُسے چوٹوں کا احساس دلاؤ گی.....؟ راحت بیگم کیا تم نہیں جانتیں اسے میں نے صرف اور صرف بہادری کا سبق دیا ہے، اسے بتایا ہے، مرد ذرا ذرا سی چوٹوں کی پروا نہیں کرتے، رونا دھونا، معمولی چوٹ پر ہائے واے کا شور مچانا ہم جیسے خاندانی لوگوں کا شیوہ نہیں، ہمیں یہ بات زیب ہی نہیں دیتی۔

اور تم راحت بیگم، چند لمحوں میں ہمارا اتنی محنت سے دیا گیا سبق بھلانے چلی ہو۔ حیرت ہے۔ افسوس ہے کہ تم اتنے برس اس اعلیٰ خاندان میں رہ کر بھی کچھ نہیں جان سکیں۔
کبریٰ کی آواز اتنی اونچی تھی کہ یہاں موجود دو درزدیک کھڑے تمام ملازمین بخوبی سن رہے تھے اور راحت سر جھکائے کھڑی تھی۔

جشید شاہ کو مروانے میں ارد شیر کی چوٹ کی اطلاع ملی تھی اور وہ خبر سننے ہی ادھر آئے تھے کہ بتانے والے نے یہی کہا تھا کہ چھوٹے شاہ جی کو اندر لے جایا جا چکا ہے..... انہوں نے بھی کبریٰ کے الفاظ سنے تھے اور سن کر قدم ٹک گئے تھے۔ فاطمہ اس سارے منظر کا حصہ ہونے کے باوجود خود کو اس کا حصہ محسوس نہیں کر رہی تھی۔ کبریٰ کا تقریر پر نما انداز شاہ جی کے اُٹھنے اور پھر رکتے قدم، مارے تکلیف کے ارد شیر کا پیلا پڑتا چہرہ، ملازماؤں کے بظاہر بند کاند اور آنکھیں..... فاطمہ کا ذہن اس وقت بالکل کورے کاغذ کی طرح ہو رہا تھا۔ وہ مغل رُخ کا ہاتھ پکڑے ایک طرف کسی مسافر کی طرح کھڑی تھی جسے راستے میں کچھ دیر کے لئے ایک منظر نے روک لیا تھا۔

”اب کیا ہوگا.....؟“ اُسے اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی..... وہ تو راحت کی چیخوں سے گھبرا کر بس یونہی اپنے کمرے سے نکل آئی تھی اور اب واپس جانا چاہ رہی تھی۔
جشید شاہ نے بیٹے کی طرف دیکھا اور اُس کی جانب بڑھے۔

”جامو..... ہمارے بیٹے کو ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ اور مرہم پٹی کرواؤ اس کی۔“ اس سے پہلے کہ وہ بیٹے تک پہنچتے، کبریٰ نے ملازم کو حکم دیا اور ہاتھ سے جانے کا اشارہ بھی کر دیا۔ جامو جو قصور وار نہ ہونے کے باوجود سخت سزا کا منظر تھا..... (کہا ارد شیر کو ساتھ لے جانے کا قصور تو اُس سے ہوا تھا) اور جیسے مرا جا رہا تھا، پھر سے زندہ ہو گیا۔

”تم گھبرو وٹک حرام، ارد شیر کو اللہ وسایا لے جائے گا۔“ ارد شیر کی آنکھوں میں ٹھہرے آنسو شاہ جی کو بے چین کر رہے تھے اور انہوں نے جامو کی جان ایک بار پھر نکال دی تھی۔
”سرکار..... میرا کوئی قصور نہیں.....“ جامو زمین پر گھٹنوں کے ٹل بیٹھ گیا..... اور شاہ جی کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔

”کبواس بند کرو، تمہیں اس لاپرواہی کی سزا مل کر رہے گی اور میں یہ بھی پسند نہیں کروں گا کہ سزا ملنے میں دیر ہو۔“

”بڑی آپا بڑی آپا.....“ راحت نے انہیں یوں گم صم نظریں دروازے پر جمائے کھڑے دیکھا تو کچھ اور پریشان ہو کر پھاٹک کی طرف جاتے جاتے پلٹ آئی اور کبریٰ کو آوازیں دینے کے ساتھ ساتھ ہاتھوں سے پکڑ کر ہلا ڈالا۔

اس کے ساتھ ہی کبریٰ کا ترتیب دیا منظر کھڑ گیا، وہ جیسے سوتے سے جاگ گئی اور دیکھا تو ابھی جامو ارد شیر کو لے کر اندر نہیں آیا تھا۔ یہاں صرف زنان خانے میں کام کرنے والی عورتیں جمع تھیں کہ ارد شیر کے گرنے کی اطلاع آگ کی طرح کونے کونے میں پھیل گئی تھی، باورچی خانے میں آٹا گوندھتی بیگان یونہی آٹے سے سننے ہاتھوں کے ساتھ اور جیراں سر پر جانوروں کے چارے والی ٹوکری اٹھائے ہوئے تھے۔

”آپا..... بڑی آپا۔“
کبریٰ کا انداز راحت کے دل کو دھلائے جا رہا تھا..... ”یا اللہ خیر کرنا۔“ وہ اُن کے انداز کو اچھا لگوان نہیں سمجھ رہی تھی، اسی لئے بار بار آوازیں دینے لگی تھی۔

”ہوں..... ہاں.....“ کبریٰ نے اُس کی جانب عجیب روکھے اور بیگانے انداز میں دیکھا۔
”ایسے مت دیکھو، آپا حوصلہ کرو..... وہ ٹھیک ہوگا..... وہ ٹھیک رہے گا..... اُسے جینا ہے، ہم سب کے لئے، اس حویلی کے لئے، اس خاندان کے نام کے لئے..... اور سب سے بڑھ کر اس ماں کے لئے، اُسے کچھ ہو گیا بڑی آیا تو میں بھی جی نہ سکوں گی، میری جان اُس میں ہے۔“ راحت اتنا کہہ کر چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر رونے لگی۔

”کیا ہوا ارد شیر کو.....؟“ الگ تھلگ کمرے میں بڑی رہنے والی فاطمہ بھی اپنی بیٹی مغل رُخ کا ہاتھ پکڑے تیز قدموں سے چلی آ رہی تھی۔

اس سے پہلے کہ ان دونوں میں سے یا پھر یہاں موجود سر جھکاے کھڑی ملازماؤں میں سے کوئی کچھ بولتی، جامو ارد شیر کے ساتھ ڈرے ڈرے انداز میں اندر داخل ہوا اور کبریٰ کا خواب ایک بار پھر اُدھورا رہ گیا۔ ارد شیر کو بالکل معمولی چوٹیں آئی تھیں، وہ جامو کی گود میں نہیں بلکہ اپنے قدموں پر کھڑا تھا اور یقیناً اس کے ساتھ چل کر یہاں حویلی کے زنان خانے تک آیا تھا۔

”کیا یہ میری نظر کا دھوکا ہے؟“ کبریٰ نے دو تین بار پلکیں جھپکیں مگر ہر بار کے بعد ارد شیر یونہی جیروں پر کھڑا نظر آیا۔

ہے اور پھر امتحان بھی پاس کیا ہے۔ جمشید شاہ! تمہاری نفرت اُسے قاتل بنا دے گی اور اس قتل کے ذمہ دار تم ہو گے۔

میں سوچا کرتی تھی کہ شاید کبھی ارد شیر کی بھولی بھالی معصوم صورت میرے دل میں اس کے لئے محبت پیدا کر دے گی مگر اب مجھے لگتا ہے کہ تم اور تمہارے رویے میرے اور ارد شیر کے درمیان، ہمیشہ دیوار بنے رہیں گے۔ وہ میرے بڑھے ہاتھوں کو روک دیں گے اور یہ بچہ ہمیشہ میری نفرتوں کا نشانہ بننا رہے گا۔ اور جمشید شاہ! میرا عہد ہے خود سے، ایک دن ایسا ضرور آئے گا جب میں اس لڑکے کو تمہارے لئے دروہنا دوں گی، تم بیٹے کی پیدائش کے نخوس دن پر روؤ گے، اس کے وجود پر لعنت بھیجو گے اور ایسا دن تب ہی آسکتا ہے، جب میں شاہ جی کے اس طنز، اس غصے اور بیگانگی کے زخم کو کھلا چھوڑ دوں، اسے خراب ہونے دوں اور جو درد اٹھے، اسے خاموشی سے دل میں اتار لوں اور ہمیشہ کے لئے دل میں بند کر لوں مگر بظاہر سرے سے بھول جاؤں، اُف یہ آنسو، یہ رکتے کیوں نہیں، بار بار پہننے لگتے ہیں۔“

”اماں..... کیا ہوا آپ کو؟“ ستارہ اور شیریں (کبریٰ کی دونوں بیٹیاں) اندر آئیں اور ماں کو یوں اُداس اور پراں سادیکہ کر گھبرا گئیں۔

”کہاں تھیں تم دونوں؟“ کبریٰ بیٹیوں کو دیکھ کر اٹھ بیٹھیں۔

”اماں جان..... ہم ادھر لیٹیں اُتار رہے تھے۔“ ستارہ نے بتایا۔

”ہاں..... بس تم لیٹیں اُتار رہنا۔ کچھ پتا بھی ہے، بھائی گھوڑی سے گر کر زخمی ہو گیا ہے۔“

”ہائے اللہ..... کہاں ہے وہ؟“ ”ہمیں تو کسی نے بتایا تک نہیں۔“ دونوں نے گھبرا کر پوچھا۔

”ابھی ابھی ڈاکٹر کے پاس لے کر گئے ہیں..... ویسے پریشانی کی کوئی بات نہیں..... معمولی چوٹیں آئیں ہیں۔“

”کیسے گرا وہ لاڈلا؟“ شیریں نے منہ بتایا۔

”گھوڑی پر سواری کی ضد کر رہا تھا..... کبریٰ نے مختصر آیتا دیا۔

”اچھا، اب والد صاحب کا کیا حال ہے؟ میرا خیال ہے ارد شیر کو چوٹوں سے اتنی تکلیف نہیں ہو رہی ہوگی جتنا درد اس کے گرنے کے خیال سے بابا صاحب کے دل میں اٹھا ہوگا، اُن کی تو جان سے پیارے بیٹے ہیں..... حویلی کی آن، خاندان کی شان، بابا صاحب کا مان..... ستارہ نے منہ بنا کر کھٹی سے کہا۔

”بیٹے سے ہی نسل چلتی ہے.....“ کبریٰ نے کہا۔

”اماں..... آپ تو ہم سے ایسی باتیں نہ کیا کریں۔“ دونوں جھلا کر بولیں۔

”میں نہیں چاہتی کہ ارد شیر کی نفرت تمہارے چہروں پر لکھی جائے..... میں نے کبھی تمہارے دلوں میں اُس کے خلاف کوئی سیل نہیں آنے دیا..... کبھی..... اس کے خلاف نہیں کہا، حالانکہ سب سے زیادہ ڈکھ تو مجھے ہونا چاہئے تھا کہ وہ مجھ پر سوکن بن کر آنے والی کی اولاد ہے مگر نفرت تم لوگ کرتی ہو، کیوں؟“ ”مجھے آج تک یہ سمجھ نہیں آسکی۔“ کبریٰ نے ملاعت سے پوچھا۔

”اماں، ارد شیر نے پیدا ہونے سے پہلے اور پیدائش کے بعد بھی ہمارا حق چھینا ہے، یہ وہ ہے جس کا انتظار بابا صاحب اور آپ کی شادی کے فوراً بعد سے ہونے لگا تھا۔ ہم تو یونہی آگئے تھے اور یونہی چلے آئے

”اس کا قصور نہیں ہے شاہ جی..... بے گناہ کو سزا مت دیں..... آپ اندر چلیں، میں ساری بات بتاتی ہوں آپ کو۔“ کبریٰ نے شاہ کے مارے غصے سے بند ہوتے اور کھلتے ہاتھوں پر ہاتھ رکھ کر سامان سے کہا۔

”بہت خوب، اب تم مجھے سمجھاؤ گی، ایسے وقت میں جب میرا بیٹا ایک ادنیٰ ملازم کی غلطی کی وجہ سے زخمی ہوا ہے..... تم مجھے سمجھانے کی سوچ رہی ہو اور غلطی کرنے والے کو پچانا چاہتی ہو۔ سب جانتے ہیں، یہ جامو ہی ارد شیر کو لے کر گیا تھا اور تم کہتی ہو یہ حرام خور قصور وار نہیں..... مجھے تو لگتا ہے کبریٰ، تم خود اس سازش میں شریک ہو..... کہ آخر ہوتو سوتیلی ماں۔“

”جمشید شاہ.....“ اور کبریٰ اتنی زور سے چلائی کہ شاہ کی آواز اور غصہ اس کے سامنے دب کر رہ گیا۔ راحت کے اشارے پر برکت ارد شیر کو لے کر چلا گیا..... باقی کے ملازم بھی آنے والے وقت کی گھن گرج محسوس کر کے کھسک گئے..... اب یہاں صرف جمشید شاہ کبریٰ اور راحت موجود تھے۔

کبریٰ خاتون کو اتنے برسوں میں پہلی بار حویلی کے درد یوار نے یوں انتہائی شدت کے عالم میں لال انگارہ ہوتے چہرے کے ساتھ شاہ جی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مقابل کھڑے دیکھا تھا، اُن کی آنکھوں سے جیسے شرارے نکل رہے تھے اور شاہ سے نظر ملانا دشوار ہو رہا تھا۔

کچھ دیر یونہی آنکھیں آگ برساتی رہیں، پھر دیکھتے ہی دیکھتے پانیوں سے بھر گئیں۔ غصے اور قہر کی جگہ بے یقینی اور شدید ڈکھ کی کیفیت نے لے لی..... اس کا وجود کا پھٹنے لگا۔

”آپ کو پتا ہے کیا کہا ہے آپ نے میرے بارے میں؟“ آواز جیسے ڈوب رہی تھی۔

”پھر تم بار بار جامو کی طرف داری کیوں کر رہی تھیں کبریٰ؟“ اس کے غصے اور دردِ عمل نے شاہ کو اپنے جملے کی غلطی کا شدت سے احساس دلایا تھا۔

”شاہ جی..... آپا تو جان دیتی ہیں ارد شیر پر۔“ راحت، شاہ کے غصے سے ڈرتے ہوئے آہستہ سے سوکن کے حق میں بولی تھی۔

”ہاں..... میں جانتا ہوں..... مجھے معلوم ہے، وہ تو بس غصے اور پریشانی کے عالم میں، میں۔“ جمشید شاہ نے تاسف سے پیشانی پر ہٹکا رسید کیا اور مردانے میں چلے گئے۔

کبریٰ تھکے تھکے انداز میں اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی جبکہ راحت وہیں ستون سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔

”جمشید شاہ.....“ کمرے میں آکر ضبط کا یا رانہ رہا، آنسو پلکوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگے اور دل کی حالت عجیب سی ہونے لگی۔

”ہاں، یہ ٹھیک ہے کہ میں ارد شیر سے محبت نہیں کرتی۔ میں اس سے محبت کر ہی نہیں سکتی۔ میں اس کی موت کی منتظر ہوں، مگر شاہ جی، تم نے ان ہی لوگوں کے درمیان کھڑے ہو کر مجھ پر ایسا شک کیا، جن کے سامنے مجھے عزت دیتے آئے ہو، آج اُن کے سامنے مجھے دو کوڑی کا کر کے رکھ دیا ہے۔ یقیناً جو کچھ تم نے کہا، وہ سچ ہے مگر شاہ، جس یہ سچ تمہارے منہ سے برداشت نہیں کر سکتی۔

میں جو اس برادری کی سب سے عقلمند لڑکی اور پھر عورت کہلائی..... جس کا دل لوگ کہتے ہیں، ہر کسی کے لئے نرم ہے، جو اس خاندان کی واحد لڑکی ہے جس نے مڈل تک اپنے بابا سائیں سے تعلیم حاصل کی

کی سزا بھی بہت بھگتی ہے ہم نے..... باپ نے کبھی ہماری طرف پیار سے نہیں دیکھا..... کبھی ہماری نعمی نعمی خواہشوں کے بارے میں جاننے کی ضرورت محسوس نہیں کی..... ہم تو ایک بوجھ ہیں..... شرمندگی جب باپ کے لئے اور وہ ارد شیر، اُس نے ہمیشہ محبتیں وصول کی ہیں، ڈاکا ڈالا ہے اُس نے ہمارے حق پر..... پھر ہم اس سے محبت کس طرح کر سکتے ہیں.....؟“ دونوں سچی سے بولیں۔

”یاد رکھو، کل اسے اس حویلی میں تمہارے باپ کی جگہ ملنی ہے..... تم سب کا محاف بننا ہے، اُسے خود سے دور مت کرو..... بے شک بھائی والی محبت تم اُسے نہیں دے سکتیں، تم دل سے مجبور ہو، بہنوں کی طرح ناز نہیں اٹھا سکتیں مگر اس سے بگاڑومت نقصان اٹھانا ہی ہوگا۔“ کبریٰ نے سمجھایا۔

”اماں، ہر تو ہمیشہ نقصان میں رہے ہیں، ایک نقصان اور کیسی۔“

راحت پھانک کے سامنے کچھ ہی فاصلے پر بنے لیے سرخ اینٹوں والے برآمدے کے مونے سے ستون سے ٹک لگائے کھڑی تھی اور کان آہٹوں پر تھے کہ کب ارد شیر آتا ہے۔ جمید شاہ مردانے میں تھے اور یقیناً انہیں بھی بیٹے کی واپسی کا انتظار تھا۔

راحت کو یہاں کھڑے زیادہ دیر نہیں گزری تھی، جب پناہ نکلا اور جمید شاہ اپنے لاڈلے بیٹے ارد شیر کے ساتھ اندر چلے آئے۔ وہ بے تاب ہو کر بیٹے کی جانب لپکی مگر اس سے پہلے کہ بیٹے کو سینے سے لگا کر ماتا قرار پاتی..... شاہ نے ہاتھ اٹھا کر اُسے کچھ فاصلے پر ہی رک جانے پر مجبور کر دیا، وہ کہہ رہے تھے۔

”راحت بیگم تم بھول گئیں، اُس کی بڑی ماں نے کہا تھا تمہیں، یہ شاہوں کا بیٹا ہے، اس کی تربیت ایک خاص انداز..... پر ہوگی کہ اسے کل حکمرانی کرنی ہے، مالک ہے یہ اس گاؤں کا اور تم اسے بزدلی کا سبق دینا چاہتی ہو، یہ احساس دلانا چاہتی ہو کہ یہ معمولی چوٹیں بھی اس کے لئے پریشانی کا سبب بن سکتی ہیں..... شکر ہے اس کی پرورش کا ذمہ میں نے کبریٰ خاتون کو سونپ دیا، وہ ذہین عورت ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ خاندانی ہے..... تم..... راحت بیگم، تم تو اسے کہیں کا نہ چھوڑتیں..... ہونہ، کہنے کو کبریٰ خاتون سے زیادہ بڑھی لکھی ہو، مگر تعلیم سے کیا ہوتا ہے، اصل چیز تو عقل ہے اور..... خاندان ہے..... تمہیں تو یہ بھی نہیں معلوم کہ بڑے گھروں کے بچے کس انداز میں پرورش پاتے ہیں۔“

اتنا کچھ سننے کے بعد راحت کے بیٹے کی جانب بڑھے ہوئے ہاتھ پھلو میں گر گئے تھے اور سر بھی جھک گیا تھا۔

”جاؤ بیٹے، اپنی بڑی ماں سے مل کر آؤ، وہ اپنے کمرے میں ہوں گی۔“ شاہ جی نے ارد شیر سے کہا اور وہ اثبات میں سر ہلا کر کبریٰ کے کمرے کی جانب چل پڑا۔

”بڑی ماں میں ڈاکٹر سے بچی کروا کر آ گیا ہوں۔“ کمرے میں داخل ہو کر اُس نے پھر کہا۔ مگر اُس کی اُمید کے برخلاف کبریٰ اُسے دیکھ کر بھی بستر سے اٹھی نہیں، گاؤں کیسے سے ٹیک لگائے، یونہی نیم دراز آنکھوں میں بے جا گنگی کے رنگ لئے بڑی خاموشی سے ارد شیر کی جانب دیکھتی رہی۔ وہ کچھ اور آگے بڑھا اور پھر سے بولا۔

”میں گھوڑی سے گر پڑا تھا ناں..... بہت چوٹ آئی تھی مجھے..... خون بھی نکلا تھا میرے ماتھے سے اب ٹھیک ہوں..... ڈاکٹر نے دوا لگا دی ہے مجھے..... بہت درد ہوا تھا اور چوٹ گہری بھی بہت تھی.....“

”مگر اس چوٹ سے گہری تو ہرگز نہیں ہو سکتی جو آج مجھے لگی ہے۔“ آج کبریٰ کا ڈکھ ارد شیر کے سامنے بھی بول اٹھا۔

”آپ کو بھی چوٹ لگی ہے، کب، مجھے کسی نے بتایا ہی نہیں۔“ بہت پریشان ہو کر اُس نے کبریٰ کے بازو پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا..... ”آپ بھی ڈاکٹر کے پاس چلیں..... وہ بہت اچھا ڈاکٹر ہے، آپ کی چوٹ کو بھی آرام آرام آ جائے گا..... انھیں..... انھیں ناں.....“ اُس نے ہاتھ پکڑ کر ہلکا سا کھینچتے ہوئے اُسے ڈاکٹر کے پاس جانے کے لئے منانا چاہا۔

”ارد شیر..... تم کتنے خوبصورت ہو، کتنے پیارے، تمہاری آنکھیں، تمہارے ہونٹ، تمہارے یہ مکھن بال، بہت خوبصورت ہو..... تمہارا ایک ایک نقش ہوتا ہے..... آہ! کیا یہ ممکن نہیں تھا کہ تم میرے ہوتے، میرے اپنے..... تم نے مجھے کیا سے کیا بنا دیا، اُس کبریٰ کو جو سب کے لئے محبت تھی، جسے نفرت کے معنی معلوم ہی نہ تھے..... جو دوسروں کو ڈکھ دینے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی..... تم نے اُسے کیا کیا سکھا دیا ارد شیر..... کاش..... اے کاش.....“

کبریٰ کی آنکھیں برسنے لگیں..... ارد شیر یہی سمجھا کہ ماں اُس کے گرنے کی وجہ سے پریشان ہے، اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر وہ اُسے گویا سلی دینے لگا۔ وہ آنسوؤں کی دھند میں اس کے چہرے کے نقوش دیکھتی رہی اور رونی رہی۔

جمید شاہ نے کمرے کے دروازے پر بڑا بھاری پردہ اٹھایا اور اندر کا منظر دیکھ کر رُک گئے۔

”بڑی ماں..... میری اچھی ماں، مجھے زیادہ چوٹ نہیں آئی..... وہ تو میں نے یونہی کہہ دیا تھا، اب چپ کر جاؤ ناں..... دیکھو، میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔“

”کبریٰ.....“ شاہ جی کمرے میں داخل ہو کر ہولے سے بولے۔

کبریٰ خاتون نے جواب میں کچھ نہیں کہا..... بس آنسو پونچھنے لگی۔ باپ کے اشارے پر، ارد شیر کمرے سے باہر چلا گیا، وہ ہنگامے سے قریب رکھی رنگین پاپوں والی کرسی پر آ بیٹھے اور بولے۔

”مجھے احساس ہے، میں اس وقت پریشانی کے عالم میں تم سے غلط بات کہہ گیا تھا۔“

وہ ابھی ابھی دیکھے جانے والے ماں بیٹے کی محبت کے منظر سے از حد متاثر ہوئے تھے اور اُن کا ہر انداز بتا رہا تھا کہ واقعی اپنے کبے پر سخت شرمندہ ہیں..... مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے..... کمان سے نکلا تیر اور زبان سے نکلی بات کبھی واپس نہیں ہوتی..... اتنے ملازموں کے سامنے وہ کبریٰ پر شک کا اظہار کر چکے تھے..... مگر کبریٰ خاتون بھی گہری عورت تھی..... انہوں نے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ ناراض ہیں یا اس فقرے نے بہت ڈکھ دیا ہے..... آنسو اچھی طرح پونچھنے کے بعد اُن کی جانب متوجہ ہوئی اور بولی۔

”میں آپ کی بہت عزت کرتی ہوں شاہ جی۔“

کبریٰ نے دانستہ محبت کا لفظ استعمال نہیں کیا، وہ یہ لفظ ادا کرتا تب سے چھوڑ چکی تھی..... جب سے جمید شاہ نے محبت کا جام توڑا تھا۔ کبریٰ نے دل میں اُٹھتے طوفان کو اندر ہی اندر دبا کر یہ کرچیاں بڑی

خاموشی سے جن لی تھیں اور پھر کبھی شاہ کے لئے محبت کا لفظ اپنی زبان پر نہ لاسکی۔ وہ جھوٹ موٹ ہی سہی، جشید شاہ سے محبت کا اظہار کر ہی نہیں سکی۔

”تم بہت اچھی ہو کبریٰ..... مجھے تم پر ہمیشہ فخر رہا ہے..... تم عام عورتوں سے مختلف، ذہین عورت ہو..... ہر قدم پر تم نے میرا ساتھ دیا ہے۔ بس اردو شیر کا زخمی ہونا، اُس کا ٹپکتا خون مجھ سے برداشت نہیں ہو سکا۔ مجھے یوں لگتا تھا میرے حواس جواب دے گئے ہیں۔ میں ہوش میں رہا ہی نہیں تھا..... اور ایسے میں تم سے بہت غلط بات کہہ گیا، مجھے اپنے کبے پر افسوس ہے، بے حد افسوس۔“

شاہ نے بے حد مغلوب ہو کر ہاتھ اُس کے شانوں پر رکھ دیئے تھے۔ جو کچھ کہا تھا لہجہ اور آنکھیں بتاتی تھیں، یقیناً سچ ہے..... اور انداز کہکتا تھا واقعی آج وہ اپنے کبے پر شرمندہ ہو کر اور دل میں خلش لئے ہی آئے ہیں، انہیں واقعی شدید چھٹتا ہوا ہے۔

سب سچ تھا..... اس وقت کھل کر سامنے تھا مگر اندر کی عورت بیدار تھی..... وہ کئی برسوں سے مسلسل جاگ رہی تھی..... اور اسی مسلسل جاگنے کے عمل نے اُسے بہت غصہ و رینا دیا تھا۔

کبریٰ نے بظاہر بے حد نرمی سے اپنا آپ یوں چھڑایا کہ شاہ کو اس عمل میں چھپی ناگواری کا ذرا بھی احساس نہیں ہو سکا..... شاہ جی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اُس نے انہیں ایک بار پھر یہ یقین دلایا کہ ”بہت عزت کرتی ہوں آپ کی اور میں آپ سے ناراض نہیں ہوں۔“

اور شاہ جی مطمئن ہو گئے جیسے سارا بوجھ سر سے اتر گیا کہ انہوں نے بھی تو برسوں پہلے سے اُسے صرف عزت کروانے کے لئے رکھ چھوڑا تھا۔ محبت کے لئے فاطمہ کو لائے پھر اس کے بعد راحت آگئی اور دل سے پرانی محبتوں کے نقش جو شاید پانی سے بنائے گئے تھے، وقت کی بے رحم دھوپ میں بھاپ بن کر یوں اُڑے کہ نشان بھی باقی نہیں رہا۔

”اوہو..... ہمارے قتل کا سامان کئے بیٹھی ہیں۔“ اندر داخل ہوتا نا صر شونی سے بولا۔

”اوہ ہوں..... بس آرام سے ادھر بیٹھ جائیں..... تیار ہونے دیں مجھے۔“ ناصر کو اپنی جانب بڑھتا دیکھ کر ڈرینگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی جویریہ اک ناز سے مسکرا کر بولی۔

”ویسے یہ کہاں کی تیاری ہے آج.....“ وہ چائے کا کپ سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر مسکراتا ہوا ہیڈ پر بیٹھ گیا۔

”ہمارے محلے میں جو خاں صاحب رہتے ہیں ناں، اُن کی بیٹی نسرین کی شادی ہے۔ ابھی کوکب آپا بس مجھے لینے کے لئے آتی ہی ہوں گی۔“

”یہ ہار سنگھار تو میرے لئے ہونے چاہئیں جناب..... اور تم مجھے ہی نظر انداز کر کے نسرین کی شادی میں جا رہی ہو، قریب آنے کی اجازت بھی نہیں، حکم دے دیا کہ ادھر بیٹھ پر بیٹھیں۔“

”تو یہ ہے ناصر، بھلا میں نے کب آپ کو نظر انداز کیا ہے اور آپ کیا چاہتے ہیں کہ میں تقریبات میں بس یونی سے کپڑے پہن کر، بتایا تو ہوئے ہی چلی جایا کروں..... دیکھ لیجئے گا، لوگ پھر آپ کو ہی الزام دیں گے کہ کیسا شوہر ہے، بیوی کو مناسب کپڑے تک نہیں لاکر دیتا۔“

”لوگوں کی زبان سے ایسا کہلوانا بھی منظور ہے مگر تم یوں ج سنور کر دوسروں کے سامنے جاؤ، یہ

مجھے اچھا نہیں لگتا.....“ ناصر والہانہ انداز میں اُسے دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا اور جویریہ دانستہ نظر نہیں ملتا رہی تھی، بس جلدی جلدی تیاری میں مصروف تھی۔

”خواتین کی محفل ہے اور سب ہی تیار ہو کر آئیں گی..... اب اتنے تنگ نظر تو نہ بنیں آپ۔“

”تمہارے معاملے میں، میں تنگ نظر بھی ہوں اور شکی بھی۔“

”ہائے اللہ..... شکی بھی.....“ وہ ایک دم سے اُس کی جانب بڑھی اور گھبرا کر اُس کی صورت دیکھنے لگی۔

”ہوں، سچ..... جویریہ دیوانہ ہوں میں تمہارا.....“ نگاہوں میں محبت کے خزانے لئے وہ ایک جذب کے عالم میں کہہ رہا تھا۔

”جانتی ہوں۔“ وہ فخر، طمانیت اور حیا آلود قسم کے ساتھ یہ کہتی ہوئی بہت پیاری لگ رہی تھی، خود پر قابو پانا مشکل تھا۔

”اب معذور نہ ہو جانا کہ مجھے کچھ سمجھنا ہی چھوڑ دو۔“ ناصر کو احساس تھا کہ اُسے جانا ہے، کوکب اب کسی بھی وقت بس آتی ہی ہوگی۔“

”معذور کیسے ہو سکتی ہوں میں جبکہ میں تو خود کو آپ کے بغیر کچھ بھی نہیں سمجھتی، یہ آپ کی محبت ہی ہے ناصر، جو میں اس روپ میں ہوں ورنہ بھائی اور بھائی کے گھر تو جانے اب تک میرا کیا حشر ہو چکا ہوتا۔ جتنا آپ مجھے چاہتے ہیں، اتنی ہی محبت میں بھی آپ سے کرتی ہوں۔ آپ میری رُوح ہیں، زندگی کی ہر خوشی آپ ہی کے دم سے ہے..... میرے روم روم میں آپ لپٹے ہیں اور سچ تو یہ کہ زندگی ہی آپ ہیں۔“ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ناصر کے قریب آ بیٹھی۔

”جویریہ..... میں سوچتا ہوں، کیا ہر محبت کرنے والے نے یونی محبت کی ہوگی۔ عاشق اور معشوق کا فرق مٹا کر دونوں رُوح..... کی گہرائیوں میں ایک دوسرے کو محسوس کرتے ہیں، جسم میں لہو بن کر دوڑتے ہیں، دل کی دھڑکن بن جاتے ہیں، چپ کی زبان میں ڈھیروں باتیں کرتے ہیں۔“ اُس نے جویریہ کو دیکھ کر پوچھا۔

”ناصر..... میں اکثر سوچا کرتی ہوں، زندگی کبھی بھی مکمل طور پر مطمئن نہیں ہوتی..... کہیں نہ کہیں، کوئی نہ کوئی کی، کوئی ہلکا سا ملال، چھوٹی سی خواہش ضرور حسرت کا روپ دھار لیتی ہے مگر ہماری زندگی تو ہر لحاظ سے مکمل ہے، ہم خوش ہیں، بے حد خوش، کوئی ملال ساتھ نہیں، کوئی خواہش حسرت نہیں بنی..... ہمیں تو بس ایک دوسرے کا ساتھ چاہئے تھا..... اور قدرت نے ہمیں ملا دیا اور اس ملن کا پیارا سا تحفہ طلال کی صورت میں ہمیں عطا کیا۔“ جویریہ نے سادگی سے کہا۔

”ہاں..... جویریہ، تم سچ کہتی ہو، کبھی کبھی تو مجھے یہ سب خواب سا لگنے لگتا ہے۔ کہاں تو وہ وقت تھا جب ہم چند لمحوں کی ملاقات کو بھی ترستے تھے۔ ملن کی خواہش دل میں لئے ہزاروں جنم کرتے تھے اور پھر چند لمحوں کے لئے ایک دوسرے کی صورت دیکھنا نصیب ہوتی تھی۔ تمہارے بھائی اس رشتے پر سرے سے راضی ہی نہیں تھے۔ انہوں نے صاف انکار کر دیا تھا اور اس انکار کے بعد مجھے تو اپنی زندگی سے نفرت ہو گئی مگر وہی زندگی اب پھولوں کی سج لگتی ہے۔ اب تو ہر شے جیسے مجھ سے محبت کرتی ہے..... تمہارے مل جانے سے میری زندگی میں بہار آگئی ہے جویریہ۔“

نہیں رکھ سکا۔
”یہ تم لوگوں کا ذرا امت دیا کرو مجھے، رکھ لیتا ہوں، تم بھی کیا یاد کرو گی..... اور ہاں، وہاں جا کر ہم باپ بیٹے کو بھول نہ جانا..... جلدی آنے کی کوشش کرنا، ہم راہ دیکھتے ہی ملیں گے۔“
”جی..... اور میں بھی روز آپ کو یہی کہہ کر بھیجتی ہوں کہ ناصر، جلدی گھر آجائے گا، مگر یہ دیکھتے، کتنی مرتبہ عمل کیا ہے میری بات پر۔“ وہ ان آپس کی باتوں کا مزہ لیتے ہوئے بار بار ناصر کو چھیڑ رہی تھی۔
”تو آج تم بدلہ لینا چاہ رہی ہو مجھ سے..... ہوں۔“

”نہیں تو، میں نے کیوں بدلہ لینا ہے آپ سے، میں جلدی آ جاؤں گی۔“
”کیوں.....؟“ ناصر کا انداز اور مسکراہٹ..... جو یہ نے میسر برش اس پر اچھال دیا جسے کچھ کرنے کے بعد وہ جو یہ یہ کو دیکھ کر ہنس چلا گیا۔

”شاید کوکب آپ آئیں گے۔“ دروازے پر ہونے والی دستک سنتے ہی جو یہ یہ اٹھ کھڑی ہوئی۔
”ہاں، تمہیں تو اب ہر آہٹ پر اپنی کوکب آپ کا گمان گزرے گا..... بیٹھی رہو، میں دیکھتا ہوں، یہ بھی تو ممکن ہے، کوئی میرا ملنے والا ہو۔“

ناصر نے جا کر دروازہ کھولا، آنے والی واقعی کوکب آپا تھیں۔
”آئیے بھابی..... جو یہ یہ تو کب سے آپ کی منتظر بیٹھی ہے۔“ ناصر نے دروازے کے سامنے سے ہٹ کر کوکب کو اندر آنے کا راستہ دیتے ہوئے کہا۔

”ہاں بھائی، بس مجھے دیر ہو گئی، اصل میں ہمارے گھر میں مہمان آ گئے تھے اور تھے بھی سسرالی عزیز..... ذرا جو خاطر مدارات میں کمی رہ جاتی تو ساری عمر میرے میاں نے طعنہ دیتے رہنا تھا۔ اب وہ لوگ اٹھ کر گئے تو میں جلدی جلدی تیار ہو کر ادھر آئی ہوں، کہاں ہے جو یہ یہ.....؟“ وہ جو یہ یہ کو پکارتے ہوئے آگے بڑھ گئیں..... ناصر وہیں کھڑا رہا۔

”اچھا ناصر، میں اور آپا جا رہے ہیں..... طلال اٹھ جائے تو اس کے رونے کا انتظار کئے بغیر ہی فیڈر بنا لیجئے گا۔“ وہ شری مسکراہٹ کے ساتھ نصیحت کر رہی تھی۔

”اے ہاں، یہ مرد لوگ گھر آ کر کوئی کام کرنا تو ہیں سمجھتے ہیں..... ویسے تو بچوں پر بڑا حق جتانیں گے مگر ذرا سا کام نہیں کر سکتے، موڈ خراب ہو جاتا ہے ان کا..... اب میں تمہیں کل کی بات سناتی ہوں۔“ کوکب اور جو یہ یہ باتیں کرتی گلی میں نکل گئیں۔

”کس قدر باتوں ہیں یہ کوکب بھابی بھی، اتنا اچھا شوہر ہے مگر دوسروں کے سامنے یوں نقشہ کھینچتی ہیں کہ جلاد لگنے لگتا ہے۔ یہ جو یہ یہ ان کے ساتھ چلی تو گئی ہے، واپسی پر سردرد کی شکایت ضرور کرے گی۔“ ناصر کمرے میں چلا آیا اور اخبار لے کر بیٹھ گیا۔

ارد شیر کے زخم مندمل ہو چکے تھے۔ حویلی کی زندگی ایک بار پھر معمول پر تھی۔ شاہ جی نے جامو کو سزا دی تھی، اس بارے میں کبریٰ کو پتا چل گیا تھا مگر اس نے نہ تو یہ بتانے والی رازداں ملازمہ کے سامنے سن کر کوئی تاثر دیا اور نہ ہی کسی اور کے سامنے اس سلسلے میں کوئی بات کی۔
جمشید شاہ صبح ناشتے کے بعد قریبی شہر کے لئے روانہ ہو رہے تھے۔ واپسی کے بارے میں راحت

”اسی لئے تو میں ڈرتی ہوں ناصر..... مجھے زندگی کے اس قدر مکمل پن سے خوف آتا ہے۔ میں وہم کا شکار ہونے لگتی ہوں.....“ وہ ناصر کے بازو سے چہرہ لٹکائے ہوئے ہوئے کہہ رہی تھی۔
”تم تو شروع سے ہی ڈر پوک ہو، وہی ہو.....“ ناصر نے ہنس کر اس کے گال کو ہلکا سا چھوئے ہوئے کہا۔

”نہیں ناصر، سوچو تو بھلا اتنی خوشی، اس قدر اطمینان بھی کبھی تم نے کسی کے پاس دیکھا ہے۔؟“
”پتا نہیں یار، مجھے لوگوں کی زندگی میں جھانکنے کی نہ عادت ہے، نہ ہی فرصت..... میں تو بس اپنی دنیا میں مگن ہوں۔“ ناصر نے اس کی بات مذاق میں اڑائی۔

”مگر میں تو چاہنے کے باوجود اس سوچ سے بچتا نہیں نہیں چھڑا سکتی۔“ وہ تنبیہ سے بولی۔
”کہہ تو رہا ہوں، تم وہی ہو..... اور غم پالنے کی شوقین بھی، اب اور کچھ نہیں تو یہ سوچ کر ہی دلہنا اور پریشان ہونا شروع کر دیا کہ زندگی اس قدر مطمئن کیوں ہے.....؟ واہ بھئی، واہ! جواب نہیں تمہارا بھی۔“ ناصر نے جا رہا تھا۔

”اچھا، اب یوں ہنس کر شرمندہ مت کریں مجھے۔“ جو یہ یہ کو اس کی باتوں سے اپنی حماقت کا ذرا سا احساس ہوا تھا سو شرمندہ ہو کر پھر سے ڈرینگ ٹیبل کے سامنے آ بیٹھی..... اور ہال بنانے لگی۔
”طلال کہا ہے.....؟“ ناصر نے پوچھا۔

”سورہا ہے ساتھ کے کمرے میں..... اور ہاں اسے میں گھر میں آپ کے پاس چھوڑے جا رہی ہوں۔“

”کیا.....؟ اور اگر وہ جاگ گیا تو پھر.....؟ صاف کہتا ہوں، مجھ سے نہیں سنبھالا جائے گا۔“
”ہوں..... بڑی محبت ہے بیٹے سے، تھوڑی دیر کے لئے سنبھالنا پڑ گیا تو کیسے منہ بتا رہے ہیں۔ جاگ بھی گیا تو کچھ نہیں ہوگا، فیڈر تیار کر لیجئے گا بس۔“

”افوہ..... فیڈر بھی تیار کرنا ہوگا۔“ اور ناصر کی کوفت زدہ صورت پر جو یہ یہ زور سے ہنس پڑی، پھر بولی۔

”کبھی کبھی منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے ایسے کام بھی کر لینے چاہئیں۔“
”اچھا چلو، فیڈر بھی تیار کروں گا مگر صاحب بہادر جب اپنی امی کی طرح ضد پر آ جائیں تو پھر پہلنے کا نام نہیں لیتے۔“

”کیا کہہ رہے ہیں آپ.....؟ میں اور ضدی.....؟ اس بات کا جواب میں واپس آ کر دوں گی، ابھی جلدی میں ہوں۔“ جو یہ یہ مصنوعی فحقی سے بولی۔

”ہوں، تمہاری واپسی کا انتظار مجھے بھی رہے گا۔“ انداز معنی خیز تھا، جو یہ یہ جھینب مٹی۔
”پھر تم لے جا رہی ہو طلال کو.....؟“ کچھ دیر اسے خاموشی کے ساتھ مسکراتی نظروں سے دیکھنے کے بعد ناصر نے کہا۔

”اللہ میری توبہ..... نہیں جاگتا اتنی جلدی، کیوں گھبرائے جا رہے ہیں آپ.....؟ اب میں سوئے ہوئے بچے کو ساتھ لے جانے کے لئے تیار کروں گی تو اس کا موڈ ضرور ہی خراب ہوگا۔ پھر وہاں میں سارا وقت اسے ہی بھلاتی رہوں گی اور لوگ بھی بار بار کہیں گے، کیسا باپ ہے، ذرا سی دیر کے لئے اپنے پاس

کے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ شام تک آ جاؤں گ۔

”ارد شیر پتر..... تمہارے لئے کیا لاؤں شہر سے.....؟“ اس وقت ناشتے کے لئے اُن کی تینوں بیٹیاں بھی موجود تھیں، مگر انہیں ہیوہ کی طرح آج بھی صرف بیٹا ہی نظر آیا تھا۔

ستارہ اور شیریں نے جیسے سنا ہی نہیں، وہ سر جھکائے ناشتا کرتی رہیں مگر ارد شیر سے صرف ایک سال اور چند ماہ بڑی کل رُخ اپنا دھیان ناشتے کی طرف نہیں رکھ سکی، وہ پوری توجہ سے ارد شیر کی جانب دیکھنے لگی کہ وہ بابا کی بات کا کیا جواب دیتا ہے۔

”میرے لئے بہت اچھی سی گاڑی لے کر آنا بابا سائیں۔“ آخر کچھ سوچ کر ارد شیر بول ہی پڑا۔
”ایک گڑیا بھی منگو اور ارد شیر۔“ گل رُخ کی معصومی خواہش لیوں پر آگئی مگر خود سے نہیں کہہ سکتی تھی، سو ارد شیر کو گڑیا منگوانے کا مشورہ دینے لگی۔

”کیا کہا، گڑیا.....؟ بے وقوف لڑکی، گڑیوں سے تو لڑکیاں کھلتی ہیں، میں تو لڑکا ہوں۔“ اُس نے منہ بنا کر نہ صرف گل رُخ کی بات کو رد کیا بلکہ بے وقوف کہہ کر مسخر بھی اُڑایا..... اور شاہ جی بیٹے کی بات پر مسکراتے رہے۔ گل رُخ نے اتنے لوگوں میں اپنی سبکی محسوس کی، کچھ بول نہیں سکتی تھی، سو خاموش بیٹھی تھی مگر ناشتا نہیں کر رہی تھی۔ اُسے یہ علم نہیں تھا کہ سامنے بیٹھی بڑی ماں بہت غور سے اُس کی ایک ایک حرکت دیکھ رہی ہیں۔

ناشتے کے بعد شاہ جی شہر کے لئے روانہ ہو گئے..... ستارہ اور شیریں راحت سے پڑھنے بیٹھ گئیں اور ارد شیر ملازم کے ساتھ باہر نکل گیا۔

راحت نے کئی بار کوشش کی کہ اب وہ پڑھنے کی طرف دھیان دینے لگے کہ وہ چاہتی تھی، چند ماہ بعد جب وہ انفقوں کی پہچان سیکھ لے تو اُسے اسکول میں داخل کر دیا جائے۔ راحت کی تعلیم میٹرک تھی..... وہ لڑکیوں کو پڑھا رہی تھی، مگر بیٹے پر بس نہیں چلتا تھا۔ وہ اُس کی سنتا نہیں تھا..... کچھ کبریٰ بھی اُس کا ساتھ دیتی تھی۔ جب بھی وہ بیٹے کو پڑھنے کے لئے بٹھاتا چاہتی، کبریٰ کہہ دیتی۔

”ابھی اسے کھینے کو دے دو، ابھی سے پڑھانی میں لگ گیا تو صحت نہیں بن سکے گی۔“
کبریٰ اپنے کمرے میں چلی آئی اور ملازمہ سے کہا کہ وہ گل رُخ کو بلالائے۔ کچھ ہی دیر بعد گل رُخ چلی آئی۔

”اُدھر آؤ، میرے پاس آکر بیٹھو گل رُخ۔“

”جی بڑی ماں۔“ وہ سعادت مندی سے قریب چلی آئی اور پٹنگ کے کنارے پرک گئی۔
”تمہیں گڑیا بہت اچھی لگتی ہے.....؟“ کبریٰ نے گلابی رنگت اور بڑی بڑی سیاہ آنکھوں والی اس بچی سے بہت پیار سے پوچھا۔

”ہاں بڑی بی بی، اپنی گل بی بی کو گڑیا بہت پسند ہے، اس نے سیانی سے کہہ کر ایک کپڑے کی گڑیا بنوا رکھی ہے۔“ کمرے میں موجود ایک ملازمہ نے گل کے بولنے سے پہلے بتا دیا۔

”نچھ سے کہا ہوتا، میں تمہیں گڑیا منگوادیتی۔“ کبریٰ نے ننھی گل کے بالوں کو ہاتھ سے سنوارتے ہوئے پیار سے کہا۔

”او گل رُخ..... تم یہاں ہو، میں کب سے تمہیں تلاش کر رہی ہوں۔“ تھکی تھکی، بیمار فاطمہ اُسے

دھونڈتی ہوئی چلی آئی۔
”آؤ فاطمہ، اُدھر آکر بیٹھو..... مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے اور بھگاں، تم اب جاؤ۔“ اُس نے ملازمہ کو باہر بھیج دیا۔

”جی آپ..... کچھ بات کرنا چاہ رہی تھیں.....؟“ ملازمہ کے جانے کے بعد فاطمہ نے پوچھا۔
”اپنا خیال رکھا کرو فاطمہ، ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے مگر چہرہ تو دیکھو کیسے مرجھا کر رہ گیا ہے، ذرا ساجیز چلتی ہو تو سانس ہموار نہیں رہتی..... خود پر یوں ظلم نہ توڑو، اپنا خیال رکھا کرو۔“
”کس لئے آپ.....؟ کس کے لئے جیوں.....؟ کیوں رکھوں اپنا خیال.....؟“

”فاطمہ! بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔ تمہارے سامنے تمہاری بیٹی ہے، اس کی ننھی ننھی خوشیاں ہیں، تم زندگی سے دامن چھڑانے کی تو سوچو بھی نہیں۔“ کبریٰ نے اُسے ڈانٹا۔

”آپ، میں تو اپنی بیٹی کے لئے کسی کام کی نہیں، میں تو وہ بد نصیب ماں ہوں جو اس کی ذرا سی خوشی بھی پوری نہیں کر سکتی..... ستارہ اور شیریں خوش نصیب ہیں کہ انہیں آپ جیسی ماں ملی ہے۔ باپ انہیں محبت نہ بھی دے تو بھی انہیں سر پر مضبوط سائبان کا احساس رہتا ہے مگر گل رُخ، اس کے لئے تو نہ باپ کی شفقت ہے، نہ ماں کی ٹھنڈی چھاد..... میں تو خزاں کا درخت ہوں آپا، اسے چھادوں نہیں دے سکتی۔ پتا نہیں کیا بنے گا میری بچی کا.....؟“ فاطمہ نے افسردگی سے کہا۔

”بڑی قسمت والی ہوگی ہماری بیٹی..... تمہیں یاد ہے فاطمہ، اس کا نام میں نے رکھا تھا، اسے گود میں اٹھا کر پیار کیا تھا، میرے دل میں اس کے لئے محبت نے جوش مارا تھا۔ مجھے یہاں بیٹی لگی تب بھی اور اب بھی.....“ یہ کہتے ہوئے کبریٰ خاتون نے گل رُخ کو گود میں اٹھالیا، اور بولی۔

”میں اپنی بیٹی کو گڑیا..... منگو کر دوں گی..... لمبے بالوں والی گڑیاں جس کا رنگ میری بیٹی کی طرح گلابی ہوگا، ہے ناں.....؟“ اُس نے بچی کو گود لگایا، وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

”آپا..... آپ انسان نہیں، فرشتہ ہیں، میں اور راحت مجرم ہیں آپ کی، ہم نے آپ کی دنیا میں آکر ظلم کیا ہے، آپ کے حق پر ڈاکا ڈالا ہے..... اور آپ کتنے اعلیٰ ظرف کی مالک ہیں، میرے اور راحت کے بچوں کے لئے آپ کی تحفیں بے مثال ہیں۔“ فاطمہ شکر سے بولی۔

بس مجھے اتنا کہنا ہے کہ ستارہ ہو، شیریں ہو یا گل رُخ، اس گھر میں کسی بیٹی کے ساتھ ہماری طرف سے زیادتی نہیں ہونی چاہئے، پتا نہیں کس کی قسمت میں کیا لکھا ہے مگر جب تک یہ ہمارے پاس ہیں، ہمیں ان کا خیال رکھنا ہے، اُن کی یہ چھوٹی چھوٹی معصوم خواہشوں کو پورا کرنا ہے۔“

”جی آپا.....“ فاطمہ نے ممنونیت کے ساتھ سر ہلایا۔

”تم نے گل کو پڑھانی پر نہیں لگایا۔“ کبریٰ کو یاد آیا تو پوچھنے لگی۔

”آپا، مجھے کبھی خیال ہی نہیں آیا۔“ فاطمہ شرمندہ تھی۔

”راحت، شیریں اور ستارہ کو پڑھا رہی ہے، اُسے بھی ساتھ بٹھایا کرو۔“

”آپا، میں آ جاؤں.....؟“ راحت نے اندر آنے کی اجازت طلب کی۔

”ہاں مجھی ہاں، رُک کیوں گئیں.....؟ ابھی تمہارا ہی ذکر کر رہے تھے۔“

”میرا ذکر.....؟“ اُس نے دونوں کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھا۔

”ہاں، میں فاطمہ سے کہہ رہی تھی کہ وہ گل رخ کو بھی تمہارے پاس پڑھنے کے لئے بٹھایا کرے۔“

”ہاں آپ ضرور، مجھے تو کوئی اعتراض نہیں اور میں اسی سلسلے میں ارد شیر کی بات کرنے آئی تھی آپا، وہ پڑھنے کی طرف بالکل دھیان نہیں دیتا، میں فکر مند ہوں اس کی طرف سے۔“

”تم تو بے وقوف ہو راحت، ارے میری چھوٹی بہن، کئی بار تمہیں کہا ہے ارد شیر کے سلسلے میں فکر کرنے کی کوئی بات نہیں، جب مناسب ہوگا، میں خود اسے پڑھنے کے لئے بٹھا دوں گی، ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے، اسے آزد پھرنے دو..... صحت بنانے دو، ابھی سے پڑھنے لکھنے کے چکر میں مت ڈالو۔“

”آپ، زیادہ نہ کہی مگر تھوڑا بہت پڑھنا لکھنا تو اسے سکھا دینا چاہئے۔ اگر چند سال اور یونہی ادھر ادھر بچھرنے لڑ گئے تو پھر اس کا جی پڑھائی کی طرف سے اٹھ جائے گا، تب ہم لاکھ کہیں گے تب بھی نہیں مانے گا وہ۔“

”میرا بیٹا ایسا نہیں ہے راحت، وہ بہت اچھا بچہ ہے اور ذہین بھی بہت ہے۔ میرا تو یقین ہے کہ ہمارا ارد شیر ایک، ایک سال میں دو، دو جماعتیں پاس کیا کرے گا۔“

”یہ سب تو درست ہے آپا، مگر وہ تھوڑا بہت دھیان دے۔“ راحت کا انداز صاف بتا رہا تھا کہ اسے کبریٰ خاتون سے بالکل بھی اتفاق نہیں ہے مگر ان کے سامنے زور دے کر بات کرنا بھی راحت کے بس میں نہیں تھا۔

اس ذرا سی تکرار میں ہی کبریٰ کا منہ بن گیا تھا..... بولی تو یہ کہ..... ”تم فکر مت کرو، میں اچھی طرح جانتی ہوں کب کیا کرنا ہے اور یہ اس خاندان کا پہلا لڑکا تو نہیں ہے۔ میرے بھائی، شاہ جی کے سگے چچا زاد ہوتے ہیں..... اور چھوٹے کو ہم نے بھی پڑھایا ہے..... مجھے اچھی طرح یاد ہے، گیارہ برس کی عمر میں قاعدہ پکڑا یا تھا اس کو اور اس نے چند ہی دنوں میں یاد کر لیا تھا..... لی بی یہ سید خاندان ہے، خاص رحمت ہے خدا کی اس پر، اسے پڑھائی پڑگا دوں گی، تم جاؤ لڑکیوں کو دیکھو۔“

راحت خاموشی سے پلٹ آئی۔ دونوں لڑکیاں پڑھائی میں مشغول تھیں..... راحت آکر بیٹھ گئی، اور دیر تک کچھ سوچتی رہی، چہرے پر چھائی تنیدگی اور ایک ہی جگہ پر جمی آنکھیں یہ بتا رہی تھیں کہ معاملہ سنجیدہ ہے۔ ایک مرتبہ ستارہ نے کوئی لفظ پوچھنے کے لئے بلایا تو وہ یونہی بیٹھی رہی۔

”چھوٹی امی، کیا سوچ رہی ہیں؟“ وہ قریب آکر کھڑی ہو گئی۔

”ہوں..... کچھ نہیں.....“ راحت نے اکتائے ہوئے انداز میں اس کی جانب دیکھ کر کہا، پھر اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ لڑکیوں کو اس کی یہ بات خاصی عجیب سی لگی تھی، کتا میں سمیٹ کر وہ بھی چلی آئیں۔

شام کو جب جمید شاہ واپس آئے تو ان کے پاس صرف ارد شیر کا مطلوبہ کھونا تھا۔ گل رخ کو تو ویسے بھی امید نہیں تھی البتہ کبریٰ نے پورا دھیان اس بات پر رکھا تھا اور جب صرف ارد شیر کے لئے کھلونا دیکھا تو بولی کچھ نہیں، بس سر ہلا کر رہ گئی۔

”یہ راحت کہاں ہے.....؟“ انہوں نے اس کی غیر موجودگی محسوس کر کے پوچھا۔

”فاطمہ بھی ہے، اپنے کمرے میں ہوگی۔“ کبریٰ کے انداز میں اچانک ہی کچھ ٹپ سی آگئی جیسے

راحت اس کی اور فاطمہ کی مشترکہ حریف ہو۔

”اوہو..... فاطمہ تو ہمیشہ اپنے کمرے میں بند رہتی ہے مگر راحت میرے استقبال کے لئے موجود ہوتی ہے، آج نہیں ہے تو پوچھ لیا۔“

”شاہ سائیں، چھوٹی بیگم کی طبیعت ٹھیک نہیں، وہ اپنے کمرے میں ہیں۔“ راحت کے ساتھ ساتھ رہنے والی ملازمہ بیگانے بتایا۔

”کیا ہوا اسے.....؟“ جمید شاہ نے سر کو ذرا اس اس کی جانب گھما کر عام سے انداز میں پوچھا۔

”پتا نہیں جی، دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا، کبھی جس طبیعت بہت خراب ہے۔“

”خیر استیاس جائے بیگانے، دیکھتی نہیں سائیں ابھی سفر سے لوٹے ہیں اور تو انہیں پریشانی والی بات بتانے لگی ہے۔ اری بے وقوف، تھوڑی دیر آرام تو کرنے دیا ہوتا، ابھی تو روٹی پانی بھی نہیں رکھا ہم نے ان کے سامنے۔“

کبریٰ کی ملازمہ کو ڈانٹنے کے بعد شاہ جی کی طرف متوجہ ہوئی اور کھانے کے متعلق پوچھنے لگی۔

”نہیں، میں شہر سے کھا کر چلا تھا۔“

”اچھا پھر، چائے بنوا دیتی ہوں، تمہکان اتر جائے گی آپ کی۔“

”اوہو، میں کون سا پیدل سفر کر کے آ رہا ہوں۔“ شاہ جی اٹھ کھڑے ہوئے۔

”اب کہاں چل دیئے آپ.....؟“

”کہیں نہیں، میں ذرا راحت کو دیکھ لوں۔“

”یہ بیگانے تو ہے ہی بے عقل، آپ اس کی بات پر اعتبار کر کے کیوں پریشان ہو گئے۔ بیٹھیں چائے پانی پیئیں، راحت کو میں دیکھتی ہوں، اور اتنا بتا دوں، ہے وہ خیریت کے ساتھ، ابھی دوپہر میں تو میرے اور فاطمہ کے ساتھ باتیں کر رہی تھی۔“

”مجھے پکڑے بدلے ہیں.....“ وہ اتنا کہہ کر آگے بڑھ گئے۔

راحت بستر پر لیٹی تھی مگر چہرے سے بیمار ہرگز نہیں لگ رہی تھی، انہیں آتا دیکھ اٹھ بیٹھی اور سلام کیا۔

”کیا بات ہے، بیگانے بتا رہی تھی تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ وہ اس کے قریب بیڈ پر آ بیٹھے اور ہر جوتوں سے آزاد کرنے سے لگا۔

”شاہ جی جسمانی بیماری تو کوئی نہیں ہے، بس ایک الجھن ہے اگر آپ ساتھ دیں تو وہ بھی سلجھ جائے۔“

”کہو، کیا بات ہے.....؟“ شاہ جی کا انداز شاہانہ تھا۔

”مجھے ارد شیر کی فکر ہے شاہ جی، اب اسے پڑھائی کی طرف ڈال دینا چاہئے، یہی عمر ہے اس کے پڑھنے کی۔ اگر اب نہیں پڑھے گا تو پھر کب پڑھے گا۔“

”ہاں تو پڑھاؤ اسے، میں نے کب روکا ہے.....؟“ شاہ جی نے کہا۔

”شاہ جی، آپا بہت پیار کرتی ہیں ارد شیر سے اور کبھی کبھی زیادہ پیار نقصان دہ ہو جاتا ہے جیسے اب وہ کہتی ہیں کہ ارد شیر کو ابھی پڑھائی میں نہیں ڈالنا۔“

”کیوں بھی، پڑھائی میں ڈالنے میں کیا برائی ہے؟“ شاہ جی کو کچھ نہیں آئی یہ بات۔
”بس کہاناں، پیار کے بھی انداز ہوتے ہیں مگر بچے کے لئے یہ چیز اچھی نہیں، کل کو لوگوں کے
بچوں کو دیکھے گا کہ ہیں تو اس کی عمر کے مگر اس سے اگلی جماعتوں میں ہیں۔ تو شرمندگی محسوس کرے گا اور
ہمیں الزام دے گا۔۔۔۔۔ میں چاہتی ہوں شاہ جی اسے شرمندگی نہ اٹھانی پڑے، وہ اپنی عمر کے لوگوں میں
شرمندہ نہ ہو۔“ اس کا انداز سمجھانے والا تھا۔

”ہوں، تم ٹھیک کہہ رہی ہو راحت۔۔۔۔۔ اور اچھا ہوا کہ تم نے مجھ سے بات کر لی۔ میں جلد ہی اس
کی پڑھائی کا بندوبست کرتا ہوں، میں اپنے بیٹے کو گاؤں میں نہیں بلکہ شہر کے کسی بہت اچھے اسکول
میں پڑھاؤں گا۔“

”شاہ جی۔۔۔۔۔ وہ بہت چھوٹا ہے، اکیلا کیسے رہے گا۔۔۔۔۔؟“ راحت گھبرا کر بولی۔

”پریشان کیوں ہوتی ہو؟۔۔۔۔۔؟ اُسے ہوش میں نہیں ڈالوں گا، اپنی گاڑی پر روز آیا جاکرے گا۔“
”ہاں، یہ ٹھیک ہے شاہ جی۔۔۔۔۔ پر آپ بڑی آپا کو بھی راضی کریں تب ناں، نہیں تو کچھ بھی نہیں ہو
سکے گا۔“

”اوہو۔۔۔۔۔ اس میں کبریٰ سے پوچھنے والی کون سی بات ہے۔ بیٹا میرا ہے اور میں اس کے بارے
میں کوئی بھی فیصلہ کر سکتا ہوں۔ ایک دو روز تک تو مجھے کچھ کام ہے مگر ادھر سے فارغ ہوتے ہیں پہلا کام
اردشیر کا اسکول میں داخلہ کروانے کا کروں گا۔“ وہ اتنا کہہ کر پکڑے تبدیل کرنے کے لئے اٹھ کھڑے
ہوئے اور راحت گہری سانس کھینچ کر آسودگی سے مسکرا دی۔

اُس نے کبریٰ کی بات کبھی نہیں مانی تھی، کبھی اُس کی مرضی کے خلاف کام نہیں کیا تھا مگر اب تو
معاملہ بیٹے کے مستقبل کا تھا اور اس کا خیال تھا کہ اپنی محبت میں کبریٰ اردشیر کو خراب کر رہی ہے، ہو اُس نے
بہت ہمت کر کے اور بہت ڈرتے ڈرتے یہ سب شاہ جی سے کہا تھا اور یہ اُمید تو بالکل نہیں تھی کہ شاہ جی بھی
اتنی جلدی راضی ہو جائیں گے۔ وہ خوش تھی اور ایک دھڑکا بھی لگا تھا کہ کبریٰ تک خبر پہنچے تو وہ پھر سے
مخالفت نہ کریں۔ اسی ڈر سے اُس نے یہ بات کسی کو بتائی ہی نہیں۔ سب کو پتا تب ہی چلا جب اردشیر
باپ کے ساتھ اسکول میں داخلے کے لئے جا رہا تھا۔

”مجھ سے پوچھا تک نہیں، مجھے بتایا تک نہیں۔“ کبریٰ کے۔۔۔۔۔ طوفان اٹھا تھا، آج پہلی
بار راحت نے بیٹے کی ماں ہونے کا احساس دلایا تھا۔

شاہ پر یہ ثابت کرنا ہے کہ تمہارا یہ بیٹا، میری بیٹیوں سے برتر تو کیا ہوگا، یہ تو اُن کے برابر کا بھی
نہیں۔۔۔۔۔ اور یہ سب ثابت کرنے کے لئے طویل مدت درکار ہے تو اپنے تم وغصے کو اپنے اندر ہی اتار لو،
ایک بار پھر پی جاؤ اور ٹھنڈے دل سے منصوبہ بندی میں لگ جاؤ۔“

وہ کمرے میں ٹپکتے ہوئے خود کو بہلانے میں لگی ہوئی تھی۔۔۔۔۔ خود سے کہتی تھی۔۔۔۔۔ ”آج اگر شاہ
نے راحت کی بات مان لی تو کیا ہوا۔۔۔۔۔؟ تم اپنی ذہانت سے کام لے کر ہر بات کا توڑ کرتی چلی جاؤ۔۔۔۔۔ تم
اُونچی ذات کی، تعلیم زیادہ نہ سہی مگر شعور تو ہے ناں۔۔۔۔۔ راحت کے مقابلے میں کہیں زیادہ تمہارا اس حویلی
میں حکم چلتا ہے، پھر کیوں ٹوٹنے لگی ہو کبریٰ خاتون۔۔۔۔۔؟ اُٹھو، ہمت پکڑو اور خود کو پھر سے جوڑ لو۔“
اور پھر واقعی کبریٰ نے خود کو دوبارہ سے جوڑ لیا، اُس نے جا کر شاہ جی اور راحت کو بیٹے کے اسکول
میں داخل ہونے پر انتہائی خوش دلی سے مبارک باد دی پھر بولی۔

”کوئی صدقہ بھی اتارا تمہارے بیٹے کے سر کا یا نہیں؟ سوچو تو سوچا سدا ہیں اُس کے۔“
داخلے والی بات کو سب سے چھپایا تھا کہ خطرہ تھا کبریٰ پھر درمیان میں آجائے گی اور اس بات کی
مخالفت کرے گی۔ مگر اب کبریٰ کا برتاؤ اُسے سخت شرمندہ کر رہا تھا۔ شاہ جی کے سامنے اُس نے اس
سلسلے میں کبریٰ کی شکایت بھی تو کی تھی۔ اُن سے کہا تھا، وہ نہیں چاہتیں، اردشیر اسکول جائے اور اب وہ
جسید شاہ کے سامنے سر نہیں اٹھا پارہی تھی۔

”کمال کرتی ہو تم بھی راحت بیگم۔۔۔۔۔ ہمارے بیٹے نے پہلی بار اسکول میں قدم رکھا ہے۔ وہ
پڑھنے کے لئے گھر سے نکلا ہے۔“۔۔۔۔۔ ماں ہو، اُس کے سر کا صدقہ بھی نہیں اتارا، حاسدوں کی نظر بڑی
خراب ہے اور ہم نے اپنے بیٹے کو ان نظروں سے بچا کر رکھا ہے۔۔۔۔۔ کیوں شاہ جی۔۔۔۔۔؟“ وہ راحت کو
سمجھاتے سمجھاتے اب انہیں مخاطب کرتی تھی۔

”تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو، اردشیر گھر آجا۔۔۔۔۔ صدقہ دے دینا۔ یہ راحت تو ہے ہی بے
وقوف، اُسے نہ تو ایسی باتوں کا خیال رہتا ہے اور نہ ہی پڑا ہے، یہ تمہارا ہی تو دم ہے جو زنان خانے کے
تمام معاملات بتوئی ادا ہو رہے ہیں ورنہ یہ دونوں عورتیں۔۔۔۔۔ ہونہ، ان سے تو مجھے کوئی اُمید نہیں۔

راحت کے سامنے شاہ نے نہ صرف اپنی بڑی بیگم کی خوب تعریف کی بلکہ راحت اور فائدہ کو در پر وہ
بہت سی سنا بھی دیں۔۔۔۔۔ اور اس وجہ سے راحت جو پہلے ہی کبریٰ کے اچھے رویے پر شرمندہ تھی، اب مزید
سر جھکائے بیٹھی تھی۔ جبکہ دوسری طرف کبریٰ نے اپنی اس قدر تعریف کا جیسے نوٹس ہی نہیں لیا، نہ تو اُس

کے چہرے پر فخر کا رنگ ابھرا اور نہ ہی ممنونیت کا وہ اطمینان، وہ ہر تاثر سے پاک چہرہ لئے بیٹھی تھی۔ یوں کہ شاہ جی اور راحت اس کے سامنے ایک پلنگ پر تھے اور وہ خود موڑھے پر بیٹھی کہہ رہی تھی۔
”آج شام کو بیٹھے کی دیک چڑھا میں گے اور گاؤں کے غریب بچوں میں تقسیم کریں گے۔ ہمارے چھوٹے شاہ کو بیٹھے چاول اور وہ بھی دیک کے بہت پسند ہیں، اسکول سے آکر جب یہ اطلاع ملے گی تو بہت خوش ہوگا۔“

کبریٰ دیکھ چکی تھی، وہ اب اپنی غیر موجودگی میں بھی دیر تک ان دونوں کے درمیان موجود رہے گی، ان کے حواسوں پر چھائی رہے گی، سو جانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔
”بھٹو آپا.....“ راحت نے کہا۔ شاہ جی نے بھی روکا کہ اب تنہائی میں راحت کے پاس بیٹھنے کی خواہش اس کی بے عقلی کی وجہ سے ٹھنڈی پڑ گئی تھی، وہ دل میں اس وقت راحت کے لئے اچھے جذبات ابھرتے محسوس نہیں کر رہے تھے۔ مگر کبریٰ بچوں کو دیکھنے کا بہانہ کر کے چلی آئی۔

صدقے کے لئے کالا بکرا منگوا لیا گیا اور بیٹھے کی دیک چڑھانے کے لئے بھی نائی کو پیغام بھیج دیا گیا۔

”یہ سب کس لئے امی جان.....؟“ ستارہ اور شیریں حیران ہو رہی تھیں۔
”آج تمہارا بھائی پہلے روز اسکول گیا ہے نا تو اس کا صدقہ اتاریں گے..... اور خوشی میں بیٹھے چاول بانٹیں گے۔“

”مگر ہم دونوں بھی تو اسکول جاتے ہیں، جب پہلے روز گئے تھے، تب بھی نہ تو کوئی دیک چڑھی تھی اور نہ ہی صدقہ دیا گیا تھا.....“ دونوں کے منہ بن گئے۔

”تمہاری بات دوسری تھی، وہ تو بیٹا ہے شاہ جی کا اور پھر وہ شہر کے بہت اعلیٰ اسکول میں پڑھنے کے لئے گیا ہے۔ تم تو یہیں گاؤں کے اسکول میں پڑھتی ہو۔“

دونوں عدم دلچسپی کا اظہار کر کے مزید کوئی بات کہنے اور سننے آگے بڑھ گئیں۔
”بڑی ماں، آج بیٹھے کی دیک چڑھے گی۔“ جب وہ گودام سے چاول نکھواری ہی تھی تو گل رخ چلی آئی۔

”ہاں، کیا تمہیں بھی بیٹھے چاول اچھے لگتے ہیں.....؟“
تب گل رخ نے تھوڑا سا شرمناک سر اثبات میں ہلادیا۔

”ٹھیک ہے پھر، ہم اپنی بیٹی کو بہت سارے چاول دیں گے۔“
”آپ نے مجھے گڑیا دلانے کا وعدہ بھی تو کیا تھا بڑی ماں۔“

”ہاں ماں بالکل کیا تھا، مجھے اپنا وعدہ یاد ہے بیٹی، جب بھی کرم دین شہر جائے گا، میں تمہارے لئے گڑیا منگوا دوں گی۔“ کبریٰ نے محبت سے کہا۔

”بڑی ماں.....“ کچھ دیر خاموش کھڑی رہنے کے بعد گل رخ نے پھر اُسے مخاطب کیا۔
”ہاں بیٹی، کہو، کیا بات ہے.....؟“

”کیا میرا اسکول نہیں چا سکتی.....؟“ دل کی خواہش غصہ بچی کے لبوں پر عینی تھی اور آہستہ۔ مدد

یوں کھڑی تھی جیسے بہت غلط خواہش کر دی ہو۔
”اوہ“ چاول کو نائی کبریٰ نے اُس کے چہرے کی جانب دیکھا۔

”ہاں واقعی، مجھے یہ خیال پہلے کیوں نہیں آیا.....؟ ستارہ اور شیریں بھی تو یہیں گاؤں کے اسکول جاتی ہیں۔“

یہ اور بات تھی کہ ان دونوں لڑکیوں کو پڑھائی میں ذرا بھر بھی دلچسپی نہ تھی۔ وہ بیٹھے میں ایک آدھ بار ہی اسکول جاتی تھیں..... اور چونکہ وہ گاؤں کے زمیندار شاہ جی کی بیٹیاں تھیں تو اس وجہ سے نیچر زبھی اُن کے ساتھ حد سے زیادہ نرمی برتی تھیں۔ وہ بڑھتی وڑھتی نہیں تھیں، بس کھیل کود کرواپس آ جاتیں۔ گھر میں کبریٰ کے کہنے پر راحت انہیں پڑھایا کرتی تھی اور ماں کے ڈر سے انہیں راحت سے پڑھنا پڑتا تھا۔

”واقعی مجھے گل رخ کو اسکول میں داخل کر دینا چاہئے۔ شیریں اور ستارہ تو ارد شیر سے کافی بڑی ہیں، اُس کے جوان ہونے تک خدا نے چاہا تو دونوں اپنے گھروں کی ہو چکی ہوں گی۔ اصل ٹکراؤ تو گل رخ کے ساتھ ہی ہوگا اور گل رخ کو اُس کے مقابلے میں کمزور نہیں ہونا چاہئے ورنہ یہ بے چاری تو ماری ہی جائے گی۔ یہ ذہین بچی ہے، مجھے یقین ہے، دل لگا کر تعلیم حاصل کرے گی۔“ یہ سوچ کبریٰ کو بڑی حد تک مطمئن کر گئی۔

ذرا نیور کرم دین کے ساتھ شاہ جی خود ارد شیر کو لینے اس کے اسکول گئے اور گھر میں استقبال کی یوں تیاریاں ہو رہی تھیں جیسے وہ کسی محاذ سے کامیاب لوٹ کر آ رہا ہو۔ راحت کو یہ سب کچھ اچھا تو نہیں لگ رہا تھا مگر کیا کہتی جب شاہ جی خود واپس آ جاتے تھے۔

ارد شیر، شاہ جی کے ساتھ زمان خانے میں آیا، تھکا تھکا کچھ ناراض سا..... اُس کے گلگلابی گال اس وقت مزید گلگلابی ہو رہے تھے۔ سر پر گھنے بال جن میں صبح راحت نے بڑے پیار سے کنگھا کیا تھا، اب بکھر کر اُس کی پیشانی پر آ گئے تھے۔ بڑی بڑی گھنی ہلکوں والی خوبصورت آنکھوں میں غفلت کی جھلک لئے نچلاب دانٹوں تلے دبائے چپ چاپ وہ چلا آ رہا تھا۔

”بسم اللہ..... آگیا میرا بیٹا.....“ راحت اُس کی جانب لپکی مگر جواب میں اُس نے کسی خوشی کا اظہار نہیں کیا۔

”توری، تم چھوٹے شاہ کے کپڑے بدلواؤ..... بہت تھکا ہوا لگ رہا ہے۔“ کبریٰ ملازمہ کو ہدایات جاری کرتے ہوئے ارد شیر کی طرف بڑھی۔

”بڑی ماں، میں کل سے اسکول نہیں جاؤں گا.....“ وہ یقیناً اسکول بھیجنے پر راحت سے ناراض تھا، اس لئے اُسے مخاطب نہیں کیا، بے اعتنائی کا مظاہرہ کیا اور کبریٰ کی جانب بڑھتے ہوئے کہا۔

”آؤ میرے بیٹے، کپڑے بدل لو، کھانا کھاؤ، دیکھو تو آج ہم نے بیٹھے چاولوں کی دیک چڑھائی ہے، صرف تمہارے لئے۔“ کبریٰ نے اُس کی بات کا جواب اس لئے نہیں دیا کہ اس معاملے میں شاہ جی اور راحت نے اسے شامل ہی نہیں کیا تھا۔

”بڑی ماں، میں سچ کہتا ہوں، میں اسکول نہیں جاؤں گا۔“

”کپڑے نکال دیئے ہیں جی۔“ توری نے آکر اطلاع دی۔

”ٹھیک ہے، بیٹے کا بستہ اندر رکھو، بات اتار دو اور وہ میں اٹھا کر اندر لے جاؤ۔“ کبریٰ نے اُس کی

بات سن کر سنجیدگی سے کہا۔

”ہم تھے ناصر، کوکب باجی یہاں سے شفقت ہو رہی ہیں۔“ جویریہ کھانے کے برتن میز سے اٹھاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”کیوں بھئی، اچھا بھلا تو مکان ہے اُن کا۔“ ناصر نے طلال کو گود میں لیتے ہوئے ایک نظر جویریہ پر ڈال کر پوچھا۔

”ہاں، ہے تو اچھا مگر کرائے پر ہے، اب انہوں نے اپنا مکان بنالیا ہے، وہاں جا رہے ہیں، کوکب باجی تو بہت خوش ہیں۔“

”ظاہر ہے بات ہی خوشی کی ہے۔۔۔۔۔ اپنا گھر بھی بڑی نعمت ہوتا ہے اور جویریہ ایک دن ہم بھی اپنا گھر ضرور بنائیں گے۔۔۔۔۔ اور اس میں تین بیڈرومز ہوں گے۔۔۔۔۔ ایک ہم دونوں کا، ایک طلال کا اور ایک اس کی بہن کا۔“ وہ شرارت سے بولا۔

”بہن۔۔۔۔۔؟“ جویریہ نے ایک دم سے کہا۔۔۔۔۔ پھر جلدی سے برتن اٹھا کر کچن کی طرف چل دی۔

”ہاں ہاں، بہت جلد اس کی ایک پیاری سی گڑیا سی بہن کو آتا ہے۔“ اُس کی آواز پیچھے پیچھے تھی اور جویریہ کے لب مسکرا رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد جویریہ بھی کچن کی صفائی کے بعد کمرے میں آکر اُس کے قریب بیٹھ گئی۔

”ہمارا گھر بہت پیارا سا ہوگا پھولوں اور محبت کی خوشبو سے مہکتا ہوا۔“ ناصر نے اُس کا نازک سا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔

”اور ناصر، کچن بہت اچھا سا ہونا چاہئے۔“ وہ معصومیت سے بولی۔

”کتنا اچھا سا۔۔۔۔۔“ ناصر نے اس کی فرمائش سن کر دلچسپی سے اُسے دیکھتے ہوئے پوچھا اور پھر دونوں ہنس پڑے۔

”زمین خریدنے کے لئے تو رقم ہے نہیں اور ہم کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔۔۔۔۔ مگر جویریہ ایک روز ہم بہت اچھا سا گھر بنائیں گے ضرور اور وہاں پر طلال کی بہن بھی ہوگی۔۔۔۔۔ ہمارے مجھ بیٹیاں بہت اچھی لگتی ہیں اور ہم اس کا نام رکھیں گے ”رائیہ“ اچھا نام ہے ناں۔۔۔۔۔؟“ وہ چمکتی آنکھوں سے اُسے دیکھتے ہوئے بولا۔

”آپ کو اچھا لگتا ہے تو مجھے بھی پسند ہے۔“

”یعنی جویریہ کی پسند، وہی تمہاری پسند۔۔۔۔۔؟“ وہ معنی خیزی سے بولا۔

”ہاں، اس میں کیا شک ہے، میرا سب کچھ آپ ہیں، میں نے آپ کو پا کر دنیا کا ہر سکھ پالیا ہے۔ آپ ساتھ ہوں تو جھوٹا بھی میرے لئے محل ہے کم نہیں۔ آپ جتنی دیر گھر سے باہر رہتے ہیں ناں، میرا دل آداس رہتا ہے، میں سارا وقت آپ کی۔۔۔۔۔ خیریت کے ساتھ واپسی کی دعا مانگتی رہتی ہوں۔ آپ کو آفس سے واپسی پر ڈرائی بھی دیر ہو جائے تو بری طرح پریشان ہونے لگتی ہوں۔“

”یوں پریشان مت ہوا کرو جویریہ، یہ بات تمہاری صحت کے لئے بھی اچھی نہیں اور پھر خدا پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ یوں خواہ مخواہ سو سے نہیں پالتے۔“ ناصر نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”یہ سب میرے اختیار میں کہاں ہے اصل میں، میں ایک عمر خوف کے سائے میں زندہ رہی ہوں، والدین کی وفات کے بعد میں نے بھائی کے گھر میں بھائی کی کی نگرانی میں جو وقت گزارا ہے، اب اس کے بارے میں سوچنا بھی مجھے اذیت دیتا ہے۔ اُن کے سلوک نے میرے اندر اعتماد پیدا ہونے ہی نہیں دیا۔ میں کوئی چھوٹا سا کام کرنے سے پہلے بھی اُن کی طرف دیکھا کرتی تھی کہ انہیں کوئی اعتراض تو نہیں۔ اُن سے بات کرتے ہوئے گھبراتی تھی کہ وہ خواہ مخواہ میں ڈانٹ کر رکھ دیتی تھیں۔ میرے برکام میں مین ٹیخ نکالتی تھیں۔۔۔۔۔ خود بھی برا بھلا کہتی تھیں اور بھیا سے شکایت بھی ضرور کر جاتی تھیں۔

مجھے تو یہ حکم تھا کہ جب بھیا گھر میں آئیں تو مجھے اپنے کمرے میں چلے جانا چاہئے۔ بھیا کے آگے پیچھے پھرنے کی کوئی ضرورت نہیں اور میں بھائی کے خوف کی وجہ سے بھیا سے بات تک نہیں کرتی تھی، وہ کبھی کوئی بات کرتے، کوئی بات پوچھتے تو میں مختصر جواب دینے کی کوشش کرتی۔۔۔۔۔ اور پھر جب بھیا نے بھائی کے بھائی کے ساتھ ل کر کوئی بزنس اشارت کیا تو راتوں رات امیر ہوتے چلے گئے، پھر تو وہ مجھے بالکل ہی بھول گئے۔۔۔۔۔ انہیں یاد ہی نہ رہا کہ اس گھر میں اُن کی چھوٹی بہن بھی رہتی ہے۔“ وہ پرانے وقت کو یاد کر کے حسرت و یاس سے بولی۔

”چھوڑو جویریہ، بھول جاؤ جیسا بھی وقت تھا، اب گزر گیا ہے۔“ ناصر نے اُس کے ہاتھ پر تھکی دے کر تلخ یادوں کے حصار سے نکالنا چاہا۔

”ہاں، میں خود بھی وہ سب کچھ بھول جانا چاہتی ہوں مگر برا وقت اپنے نشان ضرور چھوڑ جاتا ہے۔۔۔۔۔ جبکہ اچھا وقت دے دے قدم اٹھاتے ہوئے آتا ہے اور اسی طرح چلا جاتا ہے، پیچھے کچھ نہیں چھوڑتا۔۔۔۔۔ جب بیت جاتا ہے تو بس اک خواب کی طرح معلوم ہوتا ہے اور ہم سوچتے ہیں، حیران ہوتے ہیں کہ کبھی ہم ایسے بھی تھے۔

مگر ناصراذیت ناک لحوں کی ککب عمر بھر ساتھ ساتھ رہتی ہے، کوئی ٹھنک، کوئی نہ کوئی زخم جو باقی رہ جاتا ہے، رستا رہتا ہے جیسا کہ میرے ساتھ ہے۔۔۔۔۔ میں نے ان تنہا آداس لحوں کی نحوس زُت سے وہم اور خوف کا نہ ختم ہونے والا عذاب پایا تھا اور اس وہم اور خوف کے پھلنے پھولنے کے لئے میرا محروم دل اور میرے اندر کی آداس فضا بے حد سودمند تھے، جب ہی تو یہ بڑھتے بڑھتے تناور درخت بن گیا اور مجھے کسی کام کا نہیں چھوڑا۔

”مجھے احساس ہے ناصر کہ میری وجہ سے بعض اوقات آپ کو کس قدر پریشانی اٹھانا پڑتی ہے۔“

”کبھی باتیں کرتی ہوں تو۔۔۔۔۔؟“ ناصر نے اسے خود سے فریب کرتے ہوئے یقین دلانا چاہا مگر وہ کبھی چلی گئی۔

”میں شاید نفسیاتی کیس ہوں، کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے، میں پاگل ہو جاؤں گی، میرے وہم مجھے اس قدر پریشان کرتے ہیں کہ میں بے قرار ہو کر رونے لگتی ہوں۔ آپ نے مجھے اتنا پیارا دیا ہے، اتنی جاہت دی ہے مگر پھر بھی میں اندر سے خوفزدہ ہی رہتی ہوں۔“

”جب تمہیں بڑھ جائیں تو بھی ایسا ہوتا ہے جویریہ، تم اسے یوں مت لو، خود کو پریشان کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا تم بالکل ٹھیک ہو، وہم دل سے نکالو، خدا سے دعا کیا کرو، وہ ہمارے آشیانے کو خطرہ سے بچائے۔“ ناصر نے اسے رُسائیت سے سمجھایا۔

سب بچے یہ جانتے ہیں کہ وہ چھوٹا شاہ جی ہے..... اور بہت عزت کرتے ہیں اس کی، مگر تمہاری امی اور باپ نے تمہیں شہر کے اسکول میں داخل کرا دیا۔

”ایسے کیا دیکھ رہے ہو ارد شیر.....؟“ اُسے اپنی جانب نہایت غور سے دیکھتے پا کر کبریٰ نے پوچھا..... اُس نے فوراً جواب دینے کے بجائے سر اُس کے سینے پر رکھ کر بازو اس کی گردن میں جھانک کر دیئے، پھر کچھ دیر کے بعد سر اُپر اٹھا کر پیاری سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

”آپ مجھے بڑی اچھی لگتی ہیں بڑی ماں..... بہت اچھی..... بہت ہی اچھی کیونکہ آپ میری پیاری بڑی ماں ہیں ناں.....؟“

”ہاں ہاں، تم بھی تو میرے بہت اچھے، بہت پیارے بیٹے ہو، چلو شاباش، اب ادھر آ کر لیٹ جاؤ۔“ وہ اس سے یہ نہیں کہہ سکتی تھی.....

”تمہاری یہ باتیں جو تم نے انتہائی پیار اور محبت کے عالم میں میرے گلے میں ڈالی ہیں، مجھے کانٹوں کی طرح چبھ رہی ہیں، تمہاری محبت، مجھے نرم پھوار نہیں لگتی بلکہ اس کی تیش مجھے جھلسائے دے رہی ہے۔“

اُس کے کہنے پر بھی ارد شیر لگ ہو کر نہیں لیٹا..... یونہی لاڈ سے سر رکھے، آنکھیں اس کے چہرے پر جمائے مسکراتا رہا..... یہاں تک کہ کبریٰ خاتون نے بڑی نرم کے ساتھ اُسے خود سے الگ کر دیا اور پھر سے اپنے برابر میں لٹا دیا۔

”بڑی ماں، میں امی کا نہیں، صرف آپ کا بیٹا ہوں.....“ اُس کی بڑی بڑی چمکدار آنکھوں میں اس وقت اور بھی چمک آگئی تھی۔

اُس کی گھنی پلکیں، جنہیں وہ بار بار جھپک رہا تھا اور اُس کے لب جو اس وقت مسکرا رہے تھے سر کے گھنے براؤں بال جن میں اس وقت بھی کبریٰ کی انگلیاں سہلانے کے انداز میں رینگ رہی تھی اور اس کے ہر نقش، ہر انداز میں جیسے کبریٰ ایک ہی پکار سن رہی تھی۔ ایسی پکار جو ارد شیر کے کہے کی نفی کر رہی تھی..... ہر نقش پکارتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

”میں راحت کا بیٹا ہوں، میں جمشید شاہ کی وہ خواہش ہوں جس نے کبریٰ خاتون کی محبت کے تناور درخت کو شاہ جی کے دل سے ایک لمحے میں اکھاڑ کر پرے پھینک دیا۔“

کبریٰ خاتون جھٹکے سے پرے ہٹ گئیں اور بے اختیار نچلا لب دانتوں تلے دبایا، پیشانی پر بل پڑ گئے اور ارد شیر کے بالوں کو پیار سے سہلانے والا ہاتھ بستر پر آگیا۔

”بڑی ماں، کیا ہوا آپ کو.....؟“ ننھے ارد شیر نے اس کے انداز کو محسوس کیا اور پوچھا تھا۔

”سک..... کچھ نہیں..... کچھ بھی تو نہیں بچے..... تم لیٹ جاؤ، اسکول سے تھک کر آئے ہو، سو جاؤ، سونے کی کوشش کرو۔“

وہ یونہی اسے چھٹکتی رہی..... اُسے تو جمشید شاہ کے آنے کی بھی خبر نہیں ہوئی جو دروازے کا بھاری پردہ اٹھا کر اندر آ گئے تھے مگر دروازے کے قریب ہی رُک کر کبریٰ کو دیکھ رہے تھے، جو سوئے ہوئے بچے کو چمکے جا رہی تھی۔

”اب بس کرو کبریٰ، وہ تو سو چکا ہے.....“ منی کی آغوش لے لے ان کی آواز کبریٰ کو خیالات کی دنیا سے

”آپ کی باتیں مجھے حوصلہ دیتی ہیں۔“ وہ آنسو پونچھنے لگی۔

”اچھا تو بھران باتوں کو یاد بھی رکھا کرو، تم بار بار بھول جاتی ہو اور مجھے نئے سرے سے سب دہراتا پڑتا ہے، ہاں۔“

”کوشش تو کرتی ہوں مگر کبھی کبھی زیادہ ہی پریشان ہوں تو پھر آپ سے کہنے بیٹھ جاتی ہوں۔“

”اچھی بات ہے، جو کبھی دل میں ہو، کہہ دیا کرو۔ کہنے سے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے..... اور پھر سننے والا اگر مجھ جیسا ہو تو عقل کی کافی باتیں سمجھا دیتا ہے۔“ وہ شوخی سے بولا۔

”اوہ..... بے وقوف تو میں بھی نہیں۔“

”جی میں نے کب کہا آپ بے وقوف ہیں..... بس ذرا سی پاگل ہیں مگر مجھے اُمید ہے، جلد ٹھیک ہو جائیں گی۔“

وہ منہ پڑا..... جو یہ پہلے تو منہ بنا کر اُسے دیکھتی رہی، پھر اس منی میں شریک ہو گئی۔

”آج اسکول میں کیا پڑھا میرے بیٹے نے.....؟“ ارد شیر، کبریٰ خاتون کے بستر پر ان کے قریب لیٹا ہوا تھا اور وہ بڑے پیار سے اُس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

”بس جو ننچہ پڑھا، میں نے پڑھا لیا.....“ اُس نے منہ بنا کر بتا کر منی کی دیکھی کے بتایا۔

”کریسیوں پر بیٹھتے ہو کلاس میں۔“

”نہیں بڑی ماں، وہاں سب بچوں کے لئے ڈیسک اور بیچ ہیں۔“

”اچھا، تو تم وہاں سر..... بچوں کے ساتھ بیٹھتے ہو.....؟ جبکہ یہاں گاؤں کے اسکول میں ستارہ اور شیریں اُستانی جی کے قریب آرت پڑھ کر پڑھتی ہیں..... اور باقی سب بچے ننچے زمین پر بیٹھے ہوتے ہیں۔“

”مگر وہاں تو مجھے سب کے ساتھ بٹھا دیا جاتا ہے..... اور کسی کو پتا بھی نہیں تھا کہ میں شاہ جی کا بیٹا ہوں، کسی نے مجھ سے بات تک نہیں کی..... میں سارا دن چپ چاپ اکیلا بیٹھا رہا ہوں بڑی ماں۔“

”اوہ..... یہ تو بہت ہی بری بات ہوئی ہے تمہارے ساتھ..... خیر تمہیں بھی کسی سے بات کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور اگر کوئی بچہ تم سے بدتمیزی کرے تو بے شک اُس کی پٹائی کر دینا، میرے بیٹے سے کوئی اُوچی آواز میں بات کرے، یہ بیٹے کی بڑی ماں بھلا کیسے برداشت کر سکتی ہے..... وہاں رعب سے رہا کرو..... آخر تم چھوٹے شاہ جی ہو..... اُن بچوں کی تمہارے مقابلے میں حیثیت ہی کیا ہے۔ پتا نہیں تمہاری ننچہ نے تمہیں سب کے سامنے کیوں بٹھا دیا، مجھے تو کوئی بے وقوف معلوم ہوتی ہے وہ.....“

”بڑی ماں! اب کبھی ہیں ننچہ کی عزت کرنی چاہئے اور وہ جو سبق پڑھائے اُسے اچھی طرح یاد کرنا چاہئے۔“

”ہاں..... کر لیا کرو ننچہ کی عزت.....“ کبریٰ کے انداز میں تانیہ نہیں بلکہ لا پرواہی کا تاثر تھا۔

اور ارد شیر بھی اپنی بڑی ماں کے انداز کو بچا جاتا تھا۔

وہ کہنیوں کے بل اونچا ہو کر اپنے قریب کھینچ کر کبریٰ خاتون کے چہرے کی جانب دیکھنے لگا جو اُسے بتا رہی تھی کہ اُس کی خواہش تو یہ تھی، ارد شیر یہیں گاؤں کے اسکول میں پڑھنے کے لئے جایا کرے، جہاں

باہر لے آئی۔

”آپ کب آئے شاہ جی.....؟“ وہ اجترام میں کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔

”ابھی کچھ ہی دیر پہلے، کس سوچ میں گم تھیں تم جو ارد شیر کے سونے کا پتا ہی نہیں چلا.....؟“ وہ مسکرا رہے تھے، کبریٰ بھی ہنس پڑی۔

”پتا ہے راحت اسے ساری حویلی میں تلاش کروا رہی ہے، ملازما میں اسے تلاش کرتی ہر طرف بھگدیں پھر رہی ہیں..... اور راحت بیگم اس کی کتابیں سامنے رکھے، اس کے انتظار میں بیٹھی ہے۔“ وہ شوخی سے بولے۔

”یہ میرے پاس آیا تھا، باتیں کرتے کرتے میرے پاس ہی لیٹ گیا..... اصل میں تھا کوا بھی تھا..... اور کچھ اداس بھی۔“

”اداس.....؟ مگر کیوں.....؟“ جمشید شاہ نے فکر مندی کے عالم میں بے ساختہ پوچھا۔

”بتا رہا تھا اسکول میں سارا دن ایک چھوٹے سے بیچ پر بیٹھنا پڑا..... اور پھر کلاس کے دوسرے بیچ اس سے دوستی بھی نہیں کرتے..... گاؤں کے لوگوں کو شہر میں لوگ پنہندہ جو کہتے ہیں، چاہے کوئی کتنے بھی مربوں کا مالک کیوں نہ ہو۔ شہر والے تو ان سے بات کرنا اپنی توہین خیال کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے گاؤں کے لوگ جاہل اور گنوار ہوتے ہیں، انہیں کسی بات کا سلیقہ ہی نہیں ہے۔

بس یہی کچھ ہمارے بیٹے کے ساتھ بھی ہوا..... کسی بیٹے نے بات تک نہیں کی اس کے ساتھ، بہت دکھ سے بتا رہا تھا، سب سے الگ سارا دن چپ چاپ بیٹھا رہا..... بہت محسوس کیا ہے اس نے، حساس بھی تو بہت ہے۔ ذرا ذرا سی بات کو دل پر لے لیتا ہے..... یہی سب سناتے سناتے سو گیا ہے۔

میں تو پریشان ہو گئی ہوں..... اگر یونہی محسوس کرتا رہا تو کلاس کے بیچ کے رویے اسے بیمار نہ کر دیں..... ابھی جب آپ کمرے میں آئے تو میں اسی بارے میں سوچ رہی تھی۔ اسی لئے نہ تو مجھے اس کے سونے کا پتا چلا اور نہ ہی آپ کے آنے کی خبر ہوئی۔“ کبریٰ نے بڑے سلیقے سے بات آگے بڑھائی۔

جمشید شاہ کی پیشانی چمکن آلود ہو گئی تھی، یہ سن کر کہ شہر کے اسکول میں ان کے لاڈلے بیٹے کے ساتھ اچھا سلوک نہیں ہوا..... انہیں بے حد غصہ آ گیا تھا اور اس غصے کا اظہار چونکہ ان کے چہرے سے صاف ہو رہا تھا تو کبریٰ کو یہ سمجھنے میں مشکل پیش نہیں آئی کہ اس کی کئی بات اثر دکھا گئی ہے۔

”ان کی ایسی کی تھی، میرا بیٹا کسی سے کم نہیں ہے..... وہ جانتے نہیں ہیں، یہ کس کا بیٹا ہے، اس کا باپ کون ہے اور ایسے سلوک پر ان سے کیا کچھ کر سکتا ہے۔ میں چاہوں تو آج ہی اس پورے اسکول کو زبیلوں..... میں کسی شہر والے کے رعب میں نہیں آتا۔“ وہ غصے میں بول اٹھا۔

”وہیے شاہ جی، کیا بہت ہی اچھی پڑھائی ہوتی ہے شہری اسکول میں.....؟“ کبریٰ کو اسکول والوں سے تو کوئی دشمنی نہیں تھی کہ ان کے خلاف شاہ جی کو مزید بھڑکانی، اس کا مطلب تو کچھ اور تھا..... اور وہ آہستہ آہستہ شاہ جی کو اپنے مطلب کی طرف لا رہی تھی۔

”پتا نہیں.....“ شاہ جی نے بندھنی بانیں ہاتھ پر رسید کی، پھر بولے۔

”یہ راحت بیگم کے شوق ہیں کہ بچہ شہر میں پڑھے، شہری طور طریقے سیکھے، اس کا خیال ہے شہری اسکول میں پڑھ کر بچے میں زیادہ اعتماد آ جاتا ہے۔“

ڈھلے چاندل کے پار..... 45

یہ بات سن کر کبریٰ استہزاء انداز میں ہنسی، پھر بولی۔

”اعتماد کی ضرورت ان کو ہوتی ہے جو قدم قدم پر محرومیوں کا شکار ہوتے ہیں۔ راحت خود بھی ایسا عام سے گھرانے کی لڑکی ہے، وہ نہیں سمجھ سکتی کہ دولت مندوں کے بچے کسی محرومی کا شکار نہیں ہوتے۔ شاہ جی، سچ کہتی ہوں، آج پہلی بار میں نے ارد شیر کو اداس اور پریشان دیکھا ہے۔“ آخری جملہ خاص طور پر کہتے ہوئے انہوں نے ارد شیر کی طرف دیکھا۔

”میرے خیال میں کبریٰ، شہری اسکول صرف فنیسیں وصول کرتے ہیں، پڑھائی وہاں خاک نہیں ہوتی..... گاؤں کے اسکولوں میں محنت سے پڑھا یا جاتا ہے اور پھر یہاں کے ماسٹر تو ہمارے کہنے میں ہیں، سر نہیں اٹھا سکتے ہمارے آگے..... اگر میں اُسے علم دوں تو وہ گاؤں کے سارے بچوں کو چھوڑ کر صرف ہمارے بیٹے کو پڑھانے پر ہی لگ جائے گا اور کسی کی مجال ہے کہ میرے بیٹے سے بات نہ کرے..... اُسے گاؤں کا بچہ جان کر حقارت سے دیکھے..... میں آنکھیں نکال دوں اُس کی۔

ہونہ! رشوت خوروں کی اولادیں، باپ معمولی ملازم ہیں مگر حرام کے مال پر اپنے بیٹوں کو شہر کے اونچے اسکولوں میں پڑھنے کے لئے بھیج دیتے ہیں، خوب جانتا ہوں، ان شہریوں کو میں..... ہم جیسے لوگوں کی بخشش پر ہی تو گزر اوقات ہوتی ہے ان کی۔“ شاہ جی کا غصہ کم ہونے میں نہیں آ رہا تھا..... یوں لگتا تھا انہوں نے اسکول والوں سے اور اسکول میں پڑھنے والے بچوں سے انتقام لینے کی ٹھان لی ہے۔

”شاہ جی..... آپ نے راحت بیگم کے کہنے پر بچے کو شہر کے اسکول میں داخل کروا دیا، مجھ سے پوچھا تک نہیں اور میں نے بھی دخل دینا مناسب نہیں سمجھا کہ آخر وہ ماں ہے اور آپ باپ ہیں، مرد ہیں، مجھ سے زیادہ دنیا دیکھ رکھی ہے..... یہ فیصلہ سوچ سمجھ کر ہی کیا ہوگا۔

مگر اب میں ایک سوال کرتی ہوں آپ سے، ہمارا ارد شیر جسے کل کو سارے گاؤں پر حکمرانی کرنا ہے، جسے کل آپ کا بازو بننا ہے تو کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ وہ عام بچوں کے درمیان بیٹھ کر پڑھے، وہ بھول جائے کہ وہ کس حیثیت کا مالک ہے، شاہ جی اسے حکومت کرنا ہے، اُسے شہر جا کر کوئی نوکری تھوڑا کرنی ہے جو شہری ادب آداب سکھائے جا رہے ہیں۔

حکومت کرنے والے کے لئے کوئی ادب آداب نہیں ہوتے۔ اُس پر اُنکی اٹھانے کی بھلا کون جرات کر سکتا ہے، وہ اپنی مرضی کا آپ کا مالک ہوتا ہے، اُسے صرف یہ احساس دلانا ضروری ہوتا ہے کہ وہ ذاتی سب سے بہتر ہے، بس یہی اُس کی تربیت ہوتی ہے۔ اگر یہی سبق نہ دیا جائے تو کام نہیں چل سکتا..... کیوں ٹھیک کہہ رہی ہوں ناں میں.....؟“ انداز تو شاہ جی کے چہرے کو دیکھ کر ہو گیا تھا مگر پھر بھی پوچھ رہی تھی۔

”ہاں، تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو، اصل میں یہ باتیں راحت کے ذہن میں آ ہی نہیں سکتی تھیں، اُس کی سات بہنوں میں بھی کسی نے حکومت کا مزہ اچھا ہوتا تو سمجھے ناں اس بات کو۔

ملازمہ نوری، ارد شیر کی تلاش میں پوری حویلی میں گھومتی پھر رہی تھی، وہ مل کے نہیں دے رہا تھا۔ جب کبریٰ کے کمرے کا دروازہ کھٹکنا یا تو اُسے یقین یہی تھا کہ بچہ یہاں نہیں ہوگا۔ وجہ یہ کہ اس وقت کبریٰ آرام کیا کرتی تھی اور کسی کو کمرے میں شاہ جی بھی موجود تھے تو نوری نے بس یہی کہا کہ..... ”وہ چھوٹے شاہ جی کو دیکھنے آئی تھی۔“ اور مزید کچھ کہے یا بچے کو اٹھائے بغیر ہی باہر نکل گئی۔

کرتے سو گیا۔“ کبریٰ نے پیارے اُس کی طرف دیکھ کر راحت سے کہا۔
 ”ہاں، اسے ابھی پڑھنے کی عادت جو نہیں ہے مگر اب اسے جگا دینا چاہئے۔ ہوم ورک کرنا بھی تو ضروری ہے۔“
 ”ایک بات تو بتاؤ راحت بیگم۔“ حبشید شاہ بیڈ پر نیم دراز تھے، راحت کو گہری مگر سردی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولے۔
 ”جی پوچھئے شاہ جی۔“ ہمیشہ کی طرح راحت مودب تھی۔
 ”کیا تم سارا علم ایک ہی دن میں بیٹے کو پڑھادینے کا ارادہ کئے بیٹھی ہو.....؟“ لہجہ چبھتا ہوا سنا تھا۔

”میں سمجھی نہیں شاہ جی.....؟“ راحت، شوہر کے انداز سے یہ تو جان چکی تھی کہ وہ اُس سے متفق نہیں ہے، اکھڑا اکھڑا سا ہے، سوچتا ہو کر پوچھا تھا۔
 ”میں یہ کہہ رہا ہوں بے وقوف عورت، اس بچے پر اتنا ہی بوجھ ڈالو جتنا وہ سہار کے..... ابھی تو یہ اسکول سے پڑھ کر آیا ہے اور تم پھر کتابیں کا پیاں لے کر اس کے سر پر سوار ہونے کو تیار ہو۔“
 ”نہیں..... نہیں تو شاہ جی، میں تو صرف اس لئے چاہ رہی تھی کہ یہ اسکول کا کام ختم کر لے۔ اس کے علاوہ اور تو کچھ پڑھانے کا ارادہ نہیں ہے میرا..... اور یہ بھی میں صرف اس لئے کہہ رہی تھی۔ ہوم ورک کرنا تو ضروری ہے ورنہ پھر کل اسے کلاس میں کام نہ کرنے پر سزا بھی مل سکتی ہے۔“ راحت نے آنکلی سے کہا۔

”سزا..... کون دے گا میرے بیٹے کو سزا..... راحت خانم، تم نے اسے اپنی ضد کی خاطر شہر کے اسکول میں داخل تو کرادیا کہ بقول تمہارے تربیت صرف شہری اسکولوں میں ہو سکتی ہے..... مگر یاد رکھو، اگر کسی نے میرے بیٹے کو ہاتھ لگایا تو میں اُس کے ہاتھ توڑ دوں گا۔“
 شاہ جی کے غصے سے مغلوب ہو کر راحت نے مدد طلب نظروں سے اپنے قریب بیٹھی کبریٰ کی جانب دیکھا جو اس وقت اس سارے معاملے سے یکسر لاتعلقی نظر آرہی تھی۔

”نہیں چاہئے مجھے ایسا اسکول، میرا بیٹا عوام کے ساتھ مارکھانے اور سزائیں بھگتنے کے لئے اس دنیا میں نہیں آیا..... اور نہ ہی اُسے ایسی تعلیم کی ضرورت ہے کبریٰ، تم اس نادان عورت کو سمجھاؤ..... اسے بتاؤ کہ ہمارا خاندان کتنا عظیم ہے..... اور اس عظمت کو برقرار رکھنے کے لئے اردو شیر کو کس تعلیم کی ضرورت ہے.....؟ اسے کہہ دو، اپنی بے وقوفیوں کا سلسلہ بس اب یہیں روک دے ورنہ پھر نتائج کی ذمہ داریہ خود ہوگی۔“ وہ سخت غصے میں آگئے۔

”ہائے شاہ جی، یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ.....؟“ کبریٰ نے بڑھ کر راحت کو اپنے ساتھ لگالیا اور حیران لہجہ میں شاہ جی سے کہنے لگی۔

”اس دنیا میں اپنے بیٹے سے پیارا مجھے کوئی نہیں، کچھ بھی نہیں۔“ حبشید شاہ نے جھک کر سونے ہوئے بیٹے کی پیشانی پو بسا دیا اور ایک قہر بھری نظر راحت خانم پر ڈال کر کمرے سے نکل گئے۔

جا کر اُس نے راحت کو یہ نہیں بتایا کہ ”اردو شیر سو رہا ہے۔“ صرف اتنا ہی کہا کہ وہ بڑی بیگم کے کمرے میں موجود ہے۔“
 راحت نے یہ سوچ کر کچھ دیر کے بعد وہ خود ہی آجائے گا، اُس کی کتابیں اور کتابیں نہیں سمیٹیں بلکہ انہیں میز پر رکھے اس کا انتظار کرتی رہی کہ اسے ہوم ورک کروانا تھا۔
 وہ نہیں آ رہا تھا..... تنگ آ کر اُس نے دوبارہ ملازمہ کو کبریٰ کے کمرے میں بھیجا۔ شاہ جی اس وقت بھی کمرے میں موجود تھے اور بیڈ پر بیٹے کے قریب نیم دراز تھے۔ ملازمہ نے بتایا کہ ”راحت بیگم بیٹے بلارہی ہیں۔“

”اُن سے کہہ دو، سو رہا ہے۔“ شاہ جی نے اپنے مخصوص بارعب انداز میں کہا۔
 ”نہیں نوری، تم راحت بیگم کو یہیں بلا لاؤ۔“ کبریٰ کے کہنے پر ملازمہ نے سر اثبات میں ہلایا۔
 اور واپس چلی گئی۔

شاہ جی سمجھے نہیں کہ کبریٰ نے راحت کو یہاں کیوں بلایا ہے..... اُن کے استفسار سے پہلے ہی کبریٰ اُن کے چہرے سے سوال پڑھ چکی تھی لہذا بولی۔
 ”راحت یہ سمجھتی ہے کہ میں اردو شیر کی تعلیم کے حق میں نہیں ہوں..... میں نہیں چاہتی کہ وہ تعلیم حاصل کرے، اب ملازمہ کے ہاتھ پیغام بھیجنے پر بھی اردو شیر نہیں گیا، میں نے سوچا، کہیں راحت یہ نہ سمجھ لے کہ میں نے جان بوجھ کر بیٹے کو نہیں بھیجا بلکہ اپنے پاس روک رکھا ہے۔ سونے کا بہانہ بنا دیا ہے۔ اب میں نے اسی لئے بلوایا ہے کہ آکر دیکھ لے، وہ واقعی یہاں سو رہا ہے اور آپ بھی اپنے بیٹے کے پار کمرے میں موجود ہیں۔“

”اوہ کبریٰ تم..... تم ان ذرا ذرا سی باتوں کا بھی کس قدر خیال رکھتی ہو..... تمہیں دوسروں کے احساسات کا کتنا خیال رہتا ہے حالانکہ راحت یا فاطمہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں، تم اس گھر کی بڑی بیگم ہ، تمہارا ایک مقام ہے..... اس گھر میں بھی اور میری نظر میں بھی۔“

شاہ جی کے ان جملوں کا کبریٰ نے کوئی خاص نوٹس نہیں لیا، وہ بڑی بے چینی سے راحت کا انتظار کرتی دکھائی دیتی تھی۔ آنکھیں دروازے پر ہی مگراں تھیں۔ شاہ جی تو نہیں سمجھ سکے مگر حقیقت یہی تھی، وہ جملوں سے بچنے کے لئے اُس نے انتظار کی اداکاری کی تھی۔ اب شاہ جی کے منہ سے اپنی تعریف اُنہ خوشی نہیں دیتی تھی بلکہ دل میں ایسی ہی اُٹھنے لگی تھی۔

راحت نے کمرے میں بے تکلفی سے داخل ہونے کے بعد اب جو یہاں شاہ جی کو بھی موجود دیکھا تو ہنسی اور خفت آمیز لہجے میں کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ کبریٰ نے اسے آگے آنے کی دعوت دی۔
 ”مجھے اس وقت تیار آنا نہیں چاہئے تھا۔“ وہ شرمندہ تھی۔

مگر اُس کی شرمندگی اور اس سوچ کو کبریٰ نے یہ کہہ کر رفع کر دیا..... ”میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی، آؤ ادھر، میرے قریب بیٹھ جاؤ۔“

”وہ بڑی آپا، اصل میں یہ اردو شیر مل نہیں رہا تھا..... کب سے نوری اور کنیز اسے تلاش کرتی پھر رہی تھیں..... میں چاہ رہی تھی، اسے پڑھا دوں مگر یہ تو سو رہا ہے۔“ وہ کبریٰ کے قریب کرسی پر آکر بیٹھ گئی۔
 ”ہاں، ابھی کچھ دیر پہلے ہی سویا ہے، بہت تھک گیا تھا، میرے پاس آکر لیٹا اور باتیں کر

بھی کچھ نہیں کہا کہ وہ جس طرح روزانہ سختی کے ساتھ ہوم ورک کرواتی اور اسے اسکول بھیجتی تھی، اُسے اپنی دشمن لگنے لگی تھی۔

”تم گھبراؤ نہیں ارد شیر، تمہارے بابا چند روز کے لئے شہر گئے ہوئے ہیں..... وہ واپس آ جائیں گے، میں اُن سے ضروریات کروں گی۔“

”وہ کب آئیں گے؟ میرا جی نہیں چاہتا اسکول جانے کو۔“ وہ اکتا کر کہتا۔

”جلد ہی آ جائیں گے اور سنو جب تک اُن سے بات نہیں ہو جاتی، تم روزانہ اسکول جاؤ گے ورنہ تمہاری امی تم سے ناراض ہو جائیں گی۔“

جس روز جمشید شاہ شہر سے واپس آئے، بیٹے نے ملاقات ہونے پر سلام کے بعد پہلی بات یہ ہی کہی کہ ”اب میں اسکول نہیں جاؤں گا۔“

”مگر کیوں بیٹا؟“ اُسے بازوؤں کے حلقے میں لے کر انہوں نے بہت پیار سے پوچھا تھا۔

اور وہ یہی سمجھ رہے تھے کہ بچہ روزانہ کی روٹین سے گھبرا کر ایسی بات کر رہا ہے۔ جواب میں اُس نے بچوں اور ٹیچر کی طرف سے ہونے والی ہرزادی کے بارے میں تفصیل سے بتانا شروع کر دیا۔ راحت اُس وقت بیگانے کے سر پر موجود کھانا تیار کروانے میں مصروف تھی، کبریٰ یہاں شاہ جی کے قریب ہی موجود تھی اور شاہ جی کے بڑھتے ہوئے غصے اور چہرے کے اتار چڑھاؤ کو غور سے دیکھ رہی تھی۔

”میں ان سب کو دیکھ لوں گا، میرے بیٹے کے ساتھ ایسا سلوک کرتے ہیں۔ انہیں ابھی میرا پتا نہیں ہے..... ایک ایک سے نبت لوں گا، سیدھا کروں گا سب کو۔“

”آپ جوش سے نہیں، ہوش سے کام لیں..... یہ یاد رکھیں، وہ ہمارے علاقے کا اسکول نہیں ہے، بلکہ شہر کا مہنگا ترین اسکول ہے۔“

”تو کیا اپنے بیٹے کے معاملے میں، میں خاموش ہو کر بیٹھ جاؤں اور اپنے بیٹے کو اُن لوگوں کے درمیان بے بس ہونے کے لئے چھوڑ دوں۔“ وہ جھنجھلا کر بولے۔

”یہ میں نے کب کہا شاہ جی، میں تو ارد شیر کی زبانی بہت دنوں سے یہ سب قصے سن رہی ہوں، غصے سے میرا برا حال ہو جاتا ہے مگر مجبوز ہوں، کچھ نہیں کر سکتی، میں تو اتنا بھی نہیں کر سکتی کہ اسے ایک روز اسکول نہ جانے دوں، یہ روتا بلکتا رہتا ہے اور راحت اسی حالت میں اسے اسکول بھیجتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وہاں مجھے بچے مارتے ہیں، ٹیچر میری بات نہیں سننی مگر راحت کہتی ہے، تم خود ہی شرارتی ہو، تم ضرور دوسرے بچوں کے ساتھ جھگڑا بھی کرتے ہو گے۔“

”راحت تو کم عقل عورت ہے، اُسے میں نے یہ اختیار کبھی نہیں دیا کہ وہ حویلی یا ارد شیر کے متعلق فیصلے کرنے لگے، اُسے اتنی جرأت نہیں دی کہ وہ تمہارے سامنے آئے اور تمہاری بات ماننے سے انکار کرے۔“ جمشید شاہ نے تیوری چڑھا کر کہا۔

”مگر شاہ جی، آپ شاید یہ بھول رہے ہیں کہ ارد شیر کی ماں ہے وہ، اور اس ناتے وہ اس بچے پر مجھ سے کہیں زیادہ حق رکھتی ہے اور میں نہیں چاہوں گی کہ راحت کے دل میں میری طرف سے کبھی میل آئے۔ وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو کہ میں اس کے بچے کی تربیت میں خواہ مخواہ دخل اندازی کرتی ہوں اور اُسے خراب کر رہی ہوں۔“

ارد شیر روزانہ اسکول جا تو رہا تھا لیکن نہایت بے لٹی کے ساتھ..... اسکول میں اُس کا ذرا بھی دل نہیں لگتا تھا۔ اصل میں نہ صرف وہ گھر بھر کا لاڈلا تھا بلکہ اُس کے ساتھ ساتھ اُسے اہمیت بھی بہت دی جاتی تھی..... کھانے کے اوقات میں اگر وہ کہہ دیتا..... میں ستارہ باجی والی جگہ پر بیٹھ کر کھانا کھاؤں گا..... تو نہ صرف کبریٰ فوراً ستارہ کو وہ جگہ خالی کرنے کا حکم دے دیتی بلکہ راحت بھی منع نہیں کرتی تھی۔ وہ جو چیز کھانے کی فرمائش کرتا اور جس وقت بھی کرتا، کبریٰ کی کوشش ہوتی کہ اُس کے سامنے پیش کر دی جائے۔ وہ روزانہ لباس بھی اپنی پسند کا ہی پہنتا، ان حالات میں وہ خود کو باقی سب بچوں کے مقابلے میں اہم سمجھنے لگا تھا۔

اسکول میں اُسے سب بچوں کے ساتھ بٹھایا جاتا تھا۔ اکثر جگہ بھی اپنی پسند کے مطابق نہیں ملتی تھی۔ ایک دو بار اُس نے سیٹ کے لئے دوسرے بچوں سے جھگڑا بھی کیا اور اپنے باپ کی دولت اور طاقت کی شو بھی ماری۔ اس کے نتیجے میں سارے بچے اُس کے خلاف ہو گئے۔ انہیں ارد شیر کے ساتھ جیسے ضدی ہو گئی..... ذرا ذرا سی بات پر جھگڑا ہوتا، وہ اسے اپنے ساتھ کسی کھیل میں شریک نہیں کرتے تھے۔ نہ ہی اس سے بات کرتے تھے۔ اکثر اس کا مذاق اُڑاتے اور چند بچے تو نیچر سے اُس کی جھوٹی شکایتیں لگا کر سزا بھی دلوانے لگے۔

وہ معصوم سا بچہ تھا، اُس نے صرف محبتیں دیکھیں تھیں۔ بچوں کی ایسی سازشیں اُس کی سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ ایسی باتیں سن کر وہ غصے میں آ جاتا اور مار پٹائی پر اُتر آتا۔ ایسی ہی ایک بات پر ایک روز ایک بچے سے اُس کا جھگڑا ہو گیا۔ پھر دوسری طرف اس کے خلاف ایک پارٹی سی بن گئی۔ وہ اکیلا تھا مگر خوفزدہ نہیں تھا۔

”میرے بابا کے اتنے بہت سے ملازم ہیں، میں تم سب کی ٹانگیں تڑوا دوں گا۔“

بچوں نے یہ بات ٹیچر کو بتادی اور انہوں نے کہا۔

”ارد شیر! باپ کی دولت پر اترانا چھوڑ دو، پڑھائی کی طرف دھیان دیا کرو، باپ کے ملازم تمہیں پاس نہیں کروا سکتے۔“

وہ تو ذرا سا بچہ تھا، اگر ایسی بات کہتا تھا تو ضرورت اسے پیار سے سمجھانے کی تھی مگر اس کی کوشش ٹیچر نے نہیں کی۔

اسکول سے آ کر وہ یہ سب باتیں بہت ڈکھ کے ساتھ اپنی بڑی ماں کو بتاتا تھا، راحت سے اُس نے

”کبریٰ! تمہیں یہ حق میں نے دیا ہے کہ جو مناسب سمجھو، وہ کرو۔ کوئی تمہارے آگے بول نہیں سکتا، نہ فاطمہ شاہ اور نہ ہی راحت خانم تم حویلی کی بڑی مالکن ہو۔“

”مگر میں سوتیلی ماں بھی تو ہوں شاہ جی۔“ اُس نے ہنسیوں اچکا کر طنز کے ساتھ شاہ جی کو ان کا کہا جملہ بڑے موقع پر یاد دلایا تھا۔ وہ چونک کر اُس کی طرف دیکھنے لگے پھر ابھٹکی سے بولے۔

”تم بھولی نہیں اُس بات کو..... میں نے تو یونہی غصے کے عالم میں کہہ دیا تھا۔“

”اور اسی طرح غصے کے عالم میں اگر بھی راحت خانم نے بھی کہہ دیا تو پھر کیا ہوگا.....؟ میں بار بار یہ جملہ سننے کا حوصلہ خود میں نہیں پاتی۔“

شاہ جی شرمندگی کے احساس کے ساتھ خاموش بیٹھ رہے پھر اٹھ کر راحت کے کمرے کی طرف چلے گئے۔ ملازمہ سے کہا کہ راحت جہاں کہیں بھی ہو، اُسے کمرے میں بھیج دے۔

ڈراویر کے بعد راحت کمرے میں اُن کے سامنے تھی اور جسد شاہ کے گرجنے برسنے کی آواز بہت بلند تھی۔ وہ خود کو قن پر بیٹھنے کے باوجود اتنی جرأت خود میں نہیں پاتی تھی کہ اُن کے سامنے کچھ بول سکے، سو سر جھکائے بالکل خاموش کھڑی تھی۔

وہ گرج برس کر مردانے میں چلے گئے۔ راحت آنکھوں میں آنسوؤں کی برسات لئے کبریٰ کے پاس چلی آئی۔ اُس کے کمرے میں آکر دو پتہ منہ پر رکھ لیا اور سسکیاں بھر کر رونے لگی۔ کبریٰ اُس کے پاس بیٹھ کر ہولے ہولے ہٹکتی اور خاموش ہونے کو کہتی رہی۔

”آپا، میں ارد شیر کی ماں ہوں جو کچھ بھی کر رہی ہوں، اس کی بھلائی کے لئے کر رہی ہوں۔ میں اپنے ہی بیٹے سے دشمنی کرنے سے تو رہی..... مگر شاہ جی پتا نہیں کیوں میری ہر بات سے اختلاف ہے۔ میں بیٹے کو تعلیم دلانا چاہتی ہوں تاکہ وہ اچھا انسان بن سکے۔ مگر پتا نہیں کیوں شاہ جی کہ یہ سب گوارا نہیں۔ انہوں نے میرے کہنے پر جانے کس موڈ میں آکر اُسے شہر کے اسکول میں داخل کروا دیا تھا مگر اب کہہ رہے ہیں کہ بچہ وہاں مطمئن نہیں ہے..... اس کا وہاں پر دل نہیں لگتا، اس لئے میں اسے اس اسکول سے اٹھا رہا ہوں۔ آپ ہی بتائیں آپا، بھلا بچے کی باتوں میں آکر بھی فیصلے کئے جاتے ہیں۔ لاڈ پیار اپنی جگہ مگر ہمیں اُس کی تعلیم سے غافل نہیں ہونا چاہئے۔ یہ تو دشمنی والی بات ہے۔ بچہ تو ذرا سی بات پر گھبرا گیا ہے..... مگر چند روز میں نئے ماحول میں رچ بس جائے گا، سمجھوتا کر لے گا..... انہیں اتنی بنیدگی سے فیصلہ نہیں دینا چاہئے تھا۔“ وہ ہلکا سا شکوہ کر رہی تھی۔

”ارد شیر کہتا ہے، وہاں بچے میرا مذاق اڑاتے ہیں۔“ کبریٰ نے ساری بات سن کر کہا۔

”مگر آپا! وہ بے حد بڑبڑا رہے ہیں۔ اگر کوئی بات سمجھائی جائے تو سمجھ بھی جائے گا اور آپا مجھ سے تو کبھی نہیں کہا کہ بچے مجھے مارتے ہیں یا بچہ اچھا سلوک نہیں کرتیں۔“

”پتا نہیں اُس نے تم سے ذکر کیوں نہیں کیا جبکہ ابھی میرے سامنے شاہ جی کے گھر آتے ہی سلام کرنے کے فوراً بعد اُس نے انہیں بہت ڈکھ کے ساتھ یہ سب بتایا ہے۔“

کبریٰ نے راحت کو یہ نہیں بتایا کہ وہ اسے بھی اسکول سے واپسی پر ہر روز یہ سب بتاتا رہا ہے وہ نہیں چاہتی تھی کہ راحت یہ سوچے، اُس کا بیٹا، اُس کی نسبت اپنی سوتیلی ماں کبریٰ خاتون سے زیادہ محبت کرتا ہے۔ وہ راحت کا دل اپنی طرف سے ہمیشہ صاف دیکھنا چاہتی تھی۔ شوہر تو پوری ایمانداری کے ساتھ

اسے سوچ دیا تھا اور بیٹے کے سلسلے میں بھی یہی تاثر دینا چاہتی تھی کہ اُس سے محبت تو بے حد کرتی ہے مگر اس پر قابض ہرگز نہیں۔

”آپا..... شاہ جی میری تو کوئی بات نہیں سنیں گے مگر آپ انہیں سمجھائیں، انہیں کہیں ارد شیر کو اسی اسکول میں پڑھنے دیں۔ وہ چند دنوں میں خود ہی بہل جائے گا۔ اُس کا اسکول نہ بدلیں، یہی اس کے حق میں بہتر ہوگا۔ آپ شاہ جی سے کہیں ناں آپا، آپ کی تو وہ بہت سنتے ہیں، بہت مانتے ہیں وہ آپ کو۔“

”کیا سوچنے لگی ہو آپا.....؟“ راحت نے کم ہوتی کبریٰ کو آواز دے کر پھر سے متوجہ کیا۔

”ہوں، کچھ نہیں..... تم تو جانتی ہی ہو راحت کہ شاہ جی کا خاندان کتنا وسیع ہے۔ برادری اچھی خاصی ہے، ہماری دو چچا زاد اور ایک تایا زاد سے مقدمے بازی چلی رہی ہے..... اور یہ سب بیٹوں والے ہیں۔ کیا تم یہ چاہو گی راحت خانم کہ کل کو تمہارے بیٹے کے پاس تعلیم تو ہو مگر جائیداد، خاندانی حویلی اور عزت و وقار سے محروم ہو۔“

”نہیں نہیں، خدا نہ کرے۔ بھلا میں ایسا کیوں چاہوں گی.....؟ اور یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں..... ذرا کھل کر بات کریں۔“ وہ پریشانی سے اُن کی بات سن کر بولی۔

”میں سچ کہہ رہی ہوں راحت خانم! تم جو تہ بیت بیٹے کو دے رہی ہو، اسے ایک اچھا مگر مفلس انسان تو بنا سکتی ہے لیکن بڑا جاگیردار ہرگز نہیں..... یہاں زندہ رہنے کے لئے وہ ہمیں اپنا پڑتا ہے، جو یہاں کا ہے وہ نہ کچلے جاتے ہیں۔ ہمارا ارد شیر اکیلا ہے۔ اس کا تو کوئی بھائی بھی نہیں..... اُسے بہت مضبوط..... دل گردے کا مالک ہونا چاہئے۔ ایسا غرور اور دلیر کہ دشمن گھیر لیں تو بھی نہ گھبرائے بلکہ سب کو مار بھگائے۔“

”آپ مجھ سے کہیں زیادہ سمجھدار ہیں..... آپ مجھ سے زیادہ حالات کی سمجھ رکھتی ہیں آپا..... مگر میرے خیال میں ان سب باتوں کا ارد شیر کے اسکول جانے سے تو کوئی تعلق نہیں بنتا۔“

”تعلق بنتا ہے راحت کہ جس اسکول میں وہ پڑھ رہا ہے وہاں یہ سمجھا جاتا ہے، سب انسان برابر ہیں، دولت کی زیادتی سے کوئی بڑا نہیں بن جاتا، اصل چیز انسانیت ہے..... انسانوں کو ایک دوسرے کا حق نہیں مارنا چاہئے۔ سب کو مل جل کر، آپس میں پیار و محبت کے ساتھ رہنا چاہئے ظالم کو سزا مل کر رہتی ہے۔ یہ سب کچھ مجھے خود ارد شیر نے بتایا ہے اور میں دیکھ رہی ہوں کہ وہ ان باتوں کا بہت زیادہ اثر بھی قبول کر رہا ہے، تم خود ہی سوچ لو یہ سب کچھ پڑھنے والا اپنے ہی جیسے انسانوں پر حکمرانی کو کس طرح تیار ہوگا۔“

یہ تعلیم اور یہ برابری اور صلح صفائی کی باتیں اُسے کہیں کانہیں چھوڑیں گی۔ علاقے کو قبضے میں رکھنے کے کچھ اصول ہوتے ہیں۔ اگر حکمران کمزور ہو جائے تو رعایا سراسر اٹھانے لگتی ہے۔

جو مناسب سمجھیں کریں، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔

یقیناً کبریٰ ہی وہ ہستی ہو سکتی تھی جو اُس کے بیٹے کی تربیت اس بیچ پر کر سکتی تھی جو اُسے شاہ جی کی طرح باعزت رکھے، سو راحت نے دل ہی دل میں یہ تسلیم کر لیا کہ وہ ارد شیر کی تربیت کے سلسلے میں نااہل ہے، اسے تو بیٹے کی فکر لگ گئی تھی۔ وہ ہر طرف سے دشمنوں میں بھرا ہوا دکھائی دے رہا تھا، اور اُس کا دل کٹ رہا تھا۔

میں تو اُس دن ہار گئی تھی جب شاہ کے دل سے میری محبت اُترتی تھی۔ وہ کبریٰ کی موت کا دن تھا مگر اُس دن عورت اور ماں بیدار ہو گئی تھی اور آج تک بیدار ہے۔ تمہارے لئے اور ستارہ کے لئے میری جان، میں تمہارے باپ کو بتا دینا چاہتی ہوں کہ بیٹیاں اتنی بھی بری نہیں..... اور محبت ہر کسی کے بس کا روگ نہیں۔ وہ نہ تو بیٹیوں کا باپ بن سکا اور نہ ہی محبت کے دعویٰ کرنے کے باوجود محبت کے امتحان میں کامیاب ہو سکا۔

کبریٰ بیٹی کے سر پر چہرہ نکائے ایک ڈکھ کے عالم میں وہ سب کچھ کہتی چلی گئی جو آج سے پہلے اُس نے کبھی نہیں کہا تھا۔

”آپ کیا کہہ رہی ہیں اماں.....؟ مجھے آپ کی باتوں کی بالکل سمجھ نہیں آرہی۔“ شیریں نے حیران انداز لے کر ماں سے پوچھا۔

اور تب کبریٰ کو بھی خیال آیا، یہ سب کچھ اُسے کسی سے نہیں کہنا تھا۔ یہ بات تو یوں تک لانی ہی نہیں تھی۔ یہ رازِ زندگی سینے میں دفن رکھنا تھا مگر آج جذبات کے ریلے میں بہہ کر وہ بھول گئی تھی، اب جو بیٹی نے پوچھا تو گھبرا کر اپنی جگہ سے اٹھی اور تیز گردے قدموں کے ساتھ دروازے کی جانب بڑھی، باہر جھانک کر دیکھا اور اطمینان ہوا یہاں اُس پاس کوئی بھی نہیں تھا۔ راہداری سنسان تھی، جیسے جان میں جان آئی۔ وہ مطمئن ہو کر واپس پٹی اور بیٹی کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی، ذرا توقف کے بعد بولی۔

”میں نے جو کچھ کہا، اس پر غور کرنے کی ضرورت نہیں، وہ باتیں میں تم سے نہیں خود سے کر رہی تھی۔ ان میں سے کوئی بھی جملہ تمہارے لئے نہیں تھا کیونکہ ابھی تمہاری عمر بہت کم ہے۔ تمہاری سمجھ میں یہ سب نہیں آ سکتا البتہ جب بڑی ہو جاؤ گی تو پھر کسی کے سمجھائے بغیر ہی سمجھ جاؤ گی۔ ابھی تمہارے لئے صرف اتنی سی بات سمجھ لینا ہی کافی ہے کہ اگر شیر تمہارا چھوٹا بھائی ہے۔“

”بڑی بیگم صاحبہ، وہ جی ڈر پور (ڈرائیور) کرم دین شہر سے آگیا ہے اور کہتا ہے، آپ نے کچھ سامان منگوایا تھا۔“ ملازمہ نے اندر داخل ہو کر کہا۔

”ہاں ہاں بیگم، میں نے کچھ چیزیں منگوائی تھیں، جاؤ لے آؤ۔“

”اچھا جی.....“ ملازمہ ادب سے سر جھکا کر چلی گئی..... تھوڑی دیر بعد واپس آئی تو دو عدد بنڈل اٹھا رکھے تھے۔

”ہاں، یہ ادھر میز پر رکھ دو..... اور کرم دین کو اندر بلاؤ..... میں نے اس سے بات کرنی ہے۔“

ملازمہ بنڈل میز پر رکھ کر واپس چلی گئی اور کبریٰ کو دروازے کے قریب آکر کھڑی ہو گئی۔

مرد ملازموں کو کمروں میں نہیں بلایا جاتا تھا، نہ ہی انہیں زنانہ حصے میں اجازت کے بغیر آنے کی اجازت تھی۔ اگر کبھی ان تینوں میں سے کسی نے کوئی ضرورت بات کرنی ہوتی تھی تو انہیں اندر آنے کے لئے پیغام بھیج دیا جاتا تھا۔

کرم دین راہداری میں آکر ہلکا سا کھٹکارتا کہ اُس کی آمد کی اطلاع بیگم صاحبہ کو بھی ہو جائے۔

”ہاں کرم دین، آگئے تم؟“

”جی سلام بیگم صاحبہ۔“

”ولیکم السلام..... اچھا یہ بتاؤ، جو کتابیں میں نے منگوائی تھیں، ساری مل تو گئی ہیں ناں.....؟“

”اماں..... اماں، یہ دیکھیں، ارد شیر نے میری کتاب پھاڑ دی ہے۔“ شیریں غصے سے سرخ چہرہ اور ہاتھ میں پھٹی ہوئی کتاب کے ورق سنہالے، ماں کے پاس شکایت کرنے آئی تھی۔ کبریٰ سیدھی ہو بیٹھیں، ایک نظر بیٹی پر ڈالی پھر اطمینان سے بولیں۔

”کیا ہوتا ہے بیٹی تو پوچھتی ہے، کوئی سر تو نہیں پھاڑ دیا۔ اُس نے تمہارا، جو یوں شور مچا رہی ہو، میں خوب جانتی ہوں، پڑھائی سے تمہیں کچھ زیادہ دلچسپی نہیں ہے البتہ بھائی کے خلاف بہت غصہ رکھتی ہو تم، اسی لئے فوراً شکایت لگانے چلی آئی ہو۔ جاؤ نئی کتاب آجائے گی۔“

”مگر امی اسے کیا حق پہنچتا ہے کہ میری چیزیں خراب کرے اور آپ ہمیشہ اُس کی طرفداری کرتی ہیں، کیا ہم کچھ نہیں لگتے آپ کے.....؟“ شیریں کا لہجہ ٹوٹ رہا تھا۔

کبریٰ نے لباس سانس کھینچ کر بیٹی کی طرف دیکھا، اسے اشارے سے قریب بلا کر اپنے پاس بٹھایا اور ماتھے پر بوسہ دیا، پھر بولی۔

”دیکھو، میری بیٹی وہ تمہارے باپ کا لاڈلا بیٹا ہے، اگر ہم اُسے کچھ کہیں گے تو وہ شاہ جی سے شکایت کر دے گا اور شاہ جی، ہمارے خلاف ہو جائیں گے۔ تو کیا یہ بہتر نہیں کہ اُس کی چھوٹی سی زیادتی کو بھول جائیں۔ یہ ہمارے لئے بہتر ہے بیٹی۔“

”نہیں اماں، اُسے سزا ملنی چاہئے۔“ وہ ضدی لہجے میں بولی۔

”اوہو..... دیکھو ناں بیٹی، وہ تمہارا چھوٹا بھائی بھی تو ہوتا ہے ناں اور چھوٹے بھائیوں سے بھی کوئی لڑائی کرتا ہے بس یہ ورق رکھ دو ادھر ہی..... میں تمہیں نئی کتاب منگوادوں گی۔“

ارد شیر میرا بھائی نہیں ہے، آپ اسے مت کہا کریں ہمارا بھائی، وہ صرف بابا صاحب کا بیٹا ہے، لاڈلا ہے ان کا اور..... اور اماں، آپ بھی اُسے پیار کرتی ہیں، چھوٹی ماں بھی ہر معاملے میں اُس کی طرف داری کرتی ہیں..... ہم تو کسی کے بھی کچھ نہیں لگتے..... وہ جو جھوٹے ہیں، وہی کہہ کر بیٹی، اُس کا بابا روزانہ اسے اسکول چھوڑنے آتا ہے اور بیٹی کو بیٹی اپنے بات کی محبت کے قصے سناتے نہیں سکتی۔

اور سب ہی لڑکیاں اپنے گھر کے قصے سناتی ہیں اپنے باپ اور بھائیوں سے لاڈ اٹھواتی ہیں مگر ہم ایسی کوئی بات نہیں کر سکتے میں اور ستارہ چپ چاپ بیٹھی اُن کی باتیں دیکھتی رہتی ہیں..... اور باتیں سن رہی ہیں..... اماں جان وہ سب غریب لڑکیاں ہیں..... اُن کے پاس ہماری طرح اچھے کپڑے بھی نہیں ہوتے، اُن کے بستے اور کتابیں پھٹی ہوئی ہوتی ہیں۔

مگر اماں جان، مجھے تو وہ اپنے آپ سے زیادہ امیر لگتی ہیں..... اُن کی باتیں سننے ہوں اور سوچتی ہوں، اگر میں کبھی کسی غریب آدمی کی بیٹی ہوتی تو کتنا اچھا ہوتا..... پھر میرا باپ مجھ سے پیار تو کرتا، مجھے اسکول چھوڑ کر آتا اور میرے لئے شہر سے میٹھی گولیاں لے کر آتا..... سچ اماں جان میں اور ستارہ ایسا ہی سوچتے ہیں۔“ وہ معصومیت سے اپنے اندر کی حسرت باہر نکالتی رہی۔

”تم ایسا کیوں سوچتی ہو، میں جو ہوں شیریں، میری بیٹی میں ہوں ناں، میں تو تم سے پیار کرتی ہوں، تم نہیں جانتیں، تمہاری ذات کو بے قیمت ہوتے دیکھنا میرے بس میں نہیں تھا، اسی لئے تو کبریٰ جیسی صاف دل اور صاف ذہن والی عورت نے ایک طویل سازش کا آغاز کیا ہے۔ میں کیا سے کیا بن گئی ہوں۔“

”ناں جی..... وہ جو آپ نے کاغذ دیا تھا جی، کتابوں کے نام لکھ کر، میں نے وہ دکاندار کو دیا تھا، اُس نے وہی کتابیں دی ہیں جو آپ نے لکھ کر دی تھیں اور کبہر ہا تھا، دو کتابیں کم ہیں، دو تین روز تک مل سکیں گی اور جی میں نے وہ کاغذ ان کتابوں کے ساتھ رکھا ہے جو نہیں ملیں، اُن کے آئے اُس نے نشان لگا دیا تھا اور باقی کے پیسے بھی کتابوں کے ساتھ ہی ہیں، آپ حساب کر لیں۔“

”حساب کرنے کی مجھے ضرورت نہیں، تم اعتبار کے آدمی ہو..... یہ پیسے میں تمہیں دے دیتی ہوں اور وہ لست بھی، اب جب بھی شہر جانا تو کتابیں لیتے آنا۔“

”اپنی طرف سے تو سب کچھ لے آیا ہوں..... ویسے آپ ایک نظر دیکھ لیں..... ہو سکتا ہے کوئی چیز مجھے یاد نہ رہی ہو۔“

”ٹھیک ہے، میں دیکھ لوں گی، تم اب جاؤ۔“

کچھ عرصے سے کبریٰ نے کتابوں سے دوستی کر لی تھی..... اور کتاب کی دوستی نے اُسے نئی دنیا سے روشناس کرایا تھا۔ اگر وہ بیٹیوں کی محرومیوں اور اپنی چاہت کی بے قدری کے ڈکھ کو دل سے نہ لگائے بیٹھی ہوتی، اگر یہ زخم اس قدر گہرے نہ ہوتے تو بہت ممکن تھا، کتاب کی دوستی کبریٰ کی سوچ کو بدل دیتی۔ وہ جمشید شاہ کو معاف کر کے ارد شیر کو نشانہ بنانا چھوڑ دیتی مگر اب کتابیں اسے یہ تو بتا سکتی تھیں کہ وہ برا کر رہی ہے مگر اسے اپنے منصوبے سے ہرگز نہیں ہٹا سکتی تھیں۔

اُس نے کتابیں دیکھیں اور پھر انہیں بہت توجہ کے ساتھ الماری میں سیٹ کرنے لگی۔

اس کام سے فارغ ہو کر اُس نے دوسرے پلٹ سے گڑیا نکالی اور اُسے دیکھ کر مسکرا دی۔

”اوہ کتنی پیاری گڑیا ہے۔“ شیریں نے قریب آ کر گڑیا کو شوق سے دیکھا اور کہے بغیر نہ رہ سکی۔

”ہاں، واقعی بہت اچھی ہے۔ یہ تو میں نے گل رُخ کے لئے منگوائی ہے..... اگر تمہیں پسند ہے تو تمہارے لئے بھی منگوا لوں گی۔“

”نہیں، مجھے تو گڑیوں سے کھیلنے کا شوق کبھی بھی نہیں رہا۔ یہ اچھی لگی تھی اس لئے تعریف کر دی۔“

”اچھا ٹھیک ہے، جاؤ تم گل رُخ کو بلا کر لاؤ..... مگر نہیں، تم ٹھہرو میں خود اُسے دے کر آتی ہوں، میرا خیال ہے، وہ فاطمہ کے پاس اُس کے کمرے میں ہی ہوگی۔“

کبریٰ نے شیریں کو روک دیا اور خود گڑیا کو تھا میں لے کر فاطمہ کے کمرے میں آ گئی۔

اُس کا انداز درست تھا۔ گل رُخ کمرے میں موجود تھی اور فاطمہ کا سر دبا رہی تھی۔ کبریٰ اندر آئی تو دونوں ماں بیٹی نے اُس کی طرف دیکھا۔

”تتی پیاری سی گڑیا.....“ گل رُخ پلنگ سے اتر کر اک شوق کے عالم میں اُس کی جانب پلکی۔

”تمہیں اچھی لگی یہ گڑیا.....؟“ کبریٰ نے مسکرا کر پوچھا۔ اُس نے جھٹ اثبات میں سر ہلا دیا۔

”یہ تو بہت اچھی بات ہے کہ تمہیں پسند آ گئی۔ یہ میں نے شہر سے منگوائی ہے، اپنی پیاری سی گڑیا جیسی بیٹی گل کے لئے۔“

اُس نے یہ کہتے ہوئے گڑیا اسے تھما دی اور پھر فاطمہ کی جانب متوجہ ہوئی۔

”کیا بات ہے، تم اس وقت بستر میں لیٹی ہوئی ہو، طبیعت تو ٹھیک ہے ناں تمہاری.....؟ یہ گل بھی سرد باری تھی، کیا درد ہو رہا ہے.....؟“

”میری چھوڑیں آیا، میری طبیعت تو بس ایسی ہی ہے، روگی ہوں میں تو، آپ سنائیں آپ کیسی ہیں.....؟“ اُس نے پلنگ پر بیٹھتی کبریٰ کا ہاتھ عقیدت سے اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

”میں ٹھیک ہوں، ابھی ابھی کرم دین شہر سے یہ گڑیا لے کر آیا تھا، میں نے سوچا خود جا کر گل کو دے کر آتی ہوں۔“

”میں تم سے یہ کہنے کا ارادہ لے کر آئی تھی فاطمہ کہ ہمیں گل کو بھی اسکول میں داخل کروا دینا چاہئے۔ یہ بھی اپنی دونوں بہنوں کے ساتھ چلی جایا کرے گی۔“

”آپ جیسا مناسب سمجھیں کریں، آپ کو مکمل اختیار ہے مگر کیا شاہ صاحب مان جائیں گے.....؟“

”جب ستارہ اور شیریں اسکول جاتی ہیں تو گل کے جانے پر انہیں اعتراض کیوں ہوگا.....؟“

”ان کی اور بات ہے آپ..... وہ تو آپ جیسی ماں کی بیٹیاں ہیں جبکہ اس بے چاری کے لئے تو ماں کا ہونا، نہ ہونا دونوں برابر ہیں۔“ وہ ڈکھ سے بولی۔

”اوہو..... فاطمہ مت کیا کرو ایسی باتیں، بس آج سے فیصلہ ہو گیا ہے، اب گل بھی اسکول جائے گی۔ ارد شیر سے سال بھر بڑی ہے، مجھے تو افسوس ہے کہ ہم نے اُس کی پڑھائی کی جانب سے اتنی غفلت کیوں برتی.....؟“

”آپا بیٹیوں کو پڑھانے میں کون دلچسپی لیتا ہے یہاں.....؟“

”ہاں، مگر تعلیم ضروری ہے..... اس بات کا احساس مجھے اب چند سالوں سے ہوا ہے، ہم اپنی بیٹیوں کو پڑھا سکیں گے۔ ستارہ اور شیریں تو شاید زیادہ نہ پڑھ سکیں کیونکہ اُن کا زحمان ادھر نہیں ہے۔ ہفتے میں ایک آدھ بار ہی اسکول جاتی ہیں..... اور گھر میں راحت کے پاس بیٹھتی ہوں تب بھی دھیان سے نہیں پڑھتیں..... مگر گل رُخ ضرور پڑھے گی۔ کیوں بیٹی، اسکول جاؤ گی ناں.....؟“ وہ بات کرتے کرتے اُس کی جانب منہ موڑ کر پوچھنے لگی۔

”جی بڑی ماں، میں پڑھنے جایا کروں گی۔“ وہ گڑیا کو ساتھ لگائے مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے، پر جوش انداز میں سر اثبات میں ہلانے لگی، پھر بولی۔

”بڑی ماں..... میں گل ہی دونوں باجیوں کے ساتھ اسکول جایا کروں گی۔“

”اُتنا شوق ہے تمہیں پڑھنے کا..... میں اپنی بیٹی کو بہت سا پڑھاؤں گی..... یہ بیٹی، ہم سب کے لئے قابل فخر ہوگی فاطمہ.....“



ناصر کو آفس سے واپسی پر آج دیر ہو گئی تھی۔ پہلے پہل تو جو یہ یہ خود کو یہ کہہ کر تسلی دیتی رہی کہ جب بندہ گھر سے نکلتا ہے تو واپسی میں دیر سویر ہو ہی جاتی ہے..... آجائیں گے ممکن ہے کوئی دوست مل گیا ہو، اس کے ساتھ باتوں میں لگ گئے ہوں مگر جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا، دل پریشان ہونے لگا تھا، دوسرے سر اٹھا رہے تھے۔ وہ بار بار وال کلاک دیکھتی اور پہلے سے زیادہ پریشان ہو جاتی تھی۔

”امی..... بو نہیں آئے۔“ طلال نے باپ کی غیر معمولی دیر کو محسوس کر کے ماں سے پوچھا۔

”آجائیں گے میری جان، ابھی تو آفس سے چھٹی ہوئی ہے۔ بس آتے ہی ہوں گے۔“ وہ بیٹے کو گود میں بھر کر تسلی دینے لگی۔

آہستہ آہستہ سورج ڈوب گیا۔ پھر اندھیرا بڑھنے لگا۔ اب اس کی ہمت بالکل ہی جواب دے گئی۔ طلال کی انگلی پکڑ کر وہ پڑوس میں رہنے والی فریدہ کے پاس چلی آئی اور اسے اپنی پریشانی سے آگاہ کرتے ہوئے آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”آجائیں گے، اتنا گھبرا کیوں گئی ہو.....؟ جویریہ چلو آؤ، میں تمہارے ساتھ تمہارے گھر چلتی ہوں اور جب تک ناصر بھائی نہیں آ جاتے، وہیں رہوں گی تمہارے پاس، جلدی سے آ جاؤ، شاہاباش، اگر ناصر بھائی آئے تو خالی گھر دیکھ کر پریشان ہوں گے۔“

فریدہ اور جویریہ گھر آ کر پھر انتظار کرنے لگیں، اندر ہی اندر فریدہ پریشان ہو رہی تھی مگر وہ جویریہ پر اپنی فکر ظاہر نہیں کر رہی تھی، اسے تسلی دینے جارہی تھی۔

”اوہ..... شاید تیل ہو رہی ہے..... میں دیکھتی ہوں۔“ جویریہ تو سر پاپا کان بنی ہوئی تھی، آواز سننے ہی اٹھ کر بھاگی مگر دروازے میں ایک اجنبی صورت کو دیکھ کر کھٹک کر رک گئی۔

”آپ منر ناصر ہیں.....؟“ آنے والے نے پوچھا۔

”جی..... اور ناصر تو ابھی افس سے نہیں لوٹے، پلیز آپ ہی پتا کریں، میں بہت پریشان ہو رہی ہوں۔“

”بھابی..... میں جو کہنے آیا ہوں اسے حوصلے سے سنیں۔“

”خیریت تو ہے ناں.....؟“ جویریہ کو اپنے قدموں تلے سے زمین سرکتی ہوئی محسوس ہوئی۔

”اصل میں بات ہے کہ ناصر کا ایکسٹنڈ ہو گیا ہے۔ وہ اس وقت ہاسپٹل میں ہیں۔“

”یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ.....؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے.....؟“ جویریہ کو خود پر اکتیا رہیں رہا تھا۔ وہ چیخے جارہی تھی، آواز سن کر طلال کو گود میں اٹھائے فریدہ بھی آ گئی۔

”آپ انہیں سنبھالیں..... حوصلہ دیں۔ ناصر صاحب ٹھیک ہو جائیں گے..... ہم سب ہاسپٹل میں ان کے پاس ہیں.....“

”ہاسپٹل میں، اوہ زیادہ چوٹیں تو نہیں آئیں۔“ فریدہ نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا۔ جواب میں آنے والے نے ترحم بھری نگاہ سے جویریہ کو دیکھا اور خاموش رہا۔

جویریہ کی چیخوں اور رونے کی آوازیں کر پڑوس کی دوسری خواتین بھی اُن کے گھر چلی آئی تھیں۔ مرد ہاسپٹل جانے کی تیاریاں کرنے لگے۔ جویریہ ساتھ جانے کی ضد کر رہی تھی مگر اس کی اپنی حالت بہت خراب تھی۔ ہاتھ پاؤں شندلے اور چہرہ سفید ہو رہا تھا۔ بغیر ہمارے کہ وہ ایک قدم نہیں اٹھا پارہی تھی۔

ماں کو رو تا دیکھ کر طلال بھی رونے لگا۔ فریدہ اُسے بہلانے کی کوشش کر رہی تھی مگر ننھا بچہ بہت خوفزدہ دکھائی دیتا تھا۔



یہ کیسا امتحان ہے.....؟
یہ سزا کس جرم کی پاداس میں دی جا رہی ہے.....؟
نہیں..... یہ برداشت سے باہر ہے..... میرے خدا..... اے میرے خدا! میں بہت کمزور ہوں..... میں اس آزمائش کے قابل کہاں ہوں.....؟“

ہائے ناصر..... ہائے میرے ناصر! میرے سر کے سائیں..... میری چھاؤں کہاں ہو.....؟ آج تنہا کیوں کر رہے ہو مجھے.....؟ کیوں میرا ساتھ چھوڑ دیا.....؟ کیا تم نہیں جانتے تھے، تم میرے دل کی ہر خوشی ہو، تم سکون ہو، تم کو پا کر میں نے زندگی کا مفہوم سمجھا تھا، ابھی سے تنہا کر دیا.....؟ وعدہ کیوں بھلا دیا.....؟ کیوں کیا تم نے ایسا.....؟
میں نے تو کوئی ایسی بات نہیں کی جو تمہیں ناراض کر دے، پھر خفا کیوں ہو گئے.....؟ اپنی جویریہ کو کیوں چھوڑ دیا.....؟

لوٹ آؤ.....

خدا کے واسطے لوٹ آؤ.....

میں اس بھری دنیا میں اکیلی ہوں.....

تم جانتے ہو ناصر میں کتنی بزدل ہوں..... میں نہیں رہ سکتی تمہارے بغیر..... تمہیں آنا ہو گا میرے لئے اور اپنے طلال کے لئے.....

ابھی تو ہمارے بہت سے خواب اُدھورے ہیں..... ابھی تو زندگی کل کر مسکرائی بھی نہیں..... تم نے اتنی جلدی رنج سفر کیوں باندھ لیا ساسی.....

لوٹ آؤ..... لوٹ آؤ..... مت جاؤ.....

جویریہ کی چیخوں، اُس کے آنسوؤں پر ہر آنکھ نم تھی..... وہ اُس کی جواں بیوی پر افسردہ تھے۔ ناصر کی بے وقت موت پر درود ہے تھے مگر تقدیر سے کوئی نہیں لڑ سکا۔ وہ سب کے سب جویریہ کی طرح بے بس تھے۔ زندگی کی بے ثباتی پر چپ چاپ اور سرنگوں تھے۔ فریدہ اور کوکب جویریہ کو سنبھالنے کی کوشش میں لگی ہوئی تھیں۔ وہ بار بار اس سے پوچھ رہی تھیں۔ ”تمہارے کوئی عزیز رشتہ دار تو ہوں گے، ایڈریس یا فون نمبر بتاؤ تاکہ اطلاع دی جاسکے۔“ مگر جویریہ کی حالت بہت خراب تھی۔ اُس کا ذہن کام نہیں کر رہا تھا۔ اسے نل کی کوئی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

ایسبولینس آگئی اور ناصر کا بے جان وجود اُتار گیا۔ صبح کتنے وعدے کر کے گیا تھا۔ کسی شوخ شوخ نظروں سے دیکھا تھا اُس نے..... طلال کو سینے سے لگا کر پیار کیا تھا۔ اب وہ پیار ایک بے جان وجود کی صورت میں آیا تھا..... تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے؟

باپ کا لاڈلا..... اپنی چھوٹی سی جنت میں پیار کی بانہوں میں جھولنے والا بچہ اب یتیم تھا۔ کون پیار سے وہ میں بھر کر نھنی نھنی فرمائشیں سنے گا اور پوری کرنے کا وعدہ کرے گا۔ کون اب سر پر ہاتھ رکھے گا کس پر مان کرے گا یہ بچہ.....؟

بے نالہ چلا گیا اور اپنے پیچھے ایک کہانی چھوڑ گیا، جس کے دو کردار تھے اور دونوں ہی نھنے پردوں کی طرح کزور تھے، باغباں چلا گیا اور وقت تو ہمیشہ سے ظالم رہا ہے۔ اس کی آنکھوں میں اڑتے یہ سوکھے پتے طلال اور جویر یہ جیسے لوگ ہی تو ہوتے ہیں۔

جویر یہ کو فریدہ اور محلے کی چند دوسری خواتین اندر کمرے میں لے گئی تھیں کہ سب اُس کی حالت سے خوفزدہ تھے۔ انہیں خدشہ تھا، میت دیکھ کر وہ اپنے حواس نہ کھو دے۔ اسے بیڑ پر بٹھا کر فریدہ نے سائینڈ نمبل پر رکھی ناصر کی تصویر اُلٹ دی اور زندگی ہوئی آواز میں اسے حوصلہ دینے لگی۔

”حوصلہ کرو، کیسے اور کیوں کروں.....؟ سب کچھ ٹوٹ گیا ہے میرا..... میں برباد ہو گئی ہوں اور آپ لوگ کہتے ہیں حوصلہ کروں.....“ وہ اور بھی بکھرنے لگی تھی۔

”دیکھو تمہارا بیٹا روبرو ہے..... تمہیں یوں بے حال ہوتے دیکھ کر یہ پریشان ہونے لگا ہے۔ اسے سنبھالو، اب اس کے لئے باپ بھی تم ہو اور ماں بھی.....“ کوکب نے دھیان بٹانے کو طلال اس کی گود میں ڈال دیا۔ وہ واقعی روتے روتے ایک دم سے خاموش ہو گئی۔ طلال کی پیشانی پر بوسہ دیا اور پھر اسے سینے سے لگالیا۔ طلال ماں کی آغوش میں آکر چپ ہو گیا تھا مگر اس کے یوں بچنے اور پیار کرنے پر پریشان ہوا جاتا تھا۔

وہ رات قیامت کی رات تھی..... ناصر کے بے جان وجود کے قریب جویر یہ بیٹھی تھی، وہ جانتی تھی کہ یہ نئی رات ہے..... پھر تو یہ ہمد، ہمزاز چہرہ ہمیشہ کے لئے چھپ جائے گا..... آج کی رات اور بس..... آج کی رات..... وہ اس سے باتیں کرنا چاہتی تھی، اسے دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے اسے یہ احساس ہی نہیں کہ ناصر مر چکا ہے..... وہ یوں مخاطب بھی جیسے وہ اسے دیکھ رہا ہے، اُس کی سن رہا ہے اور ابھی بول بھی پڑے گا۔

کوکب، فریدہ اور محلے کی دوسری خواتین نے بہت کوشش کی کہ وہ اب اُٹھ جائے۔ تھوڑا آرام کر لے مگر وہ نہیں اُٹھتی تھی..... اُن کی منت کرنے لگتی کہ ان آخری لمحات میں اس پر یہ ظلم نہ کریں۔ اسے ناصر کے قریب بیٹھا رہنے دیں۔

رات دیر دیر دیر..... اپنا سفر طے کر رہی تھی..... نہ صرف جویر یہ کے اندر سنانے کو بخ رہے تھے بلکہ موت والے اس گھر میں بھی محسوس خاموشی اور سنانے کا راج تھا۔ بہت سے لوگ جمع تھے مگر پھر بھی چپ تھی..... اور یہ چپ بہت کربہ آواز میں بین کر رہی تھی۔

جویر یہ کو لگتا تھا، اس رات کی صبح کبھی نہیں ہوگی۔ اسی گھر کے درود یوار پر آج رات کی تاریکی ہمیشہ کے لئے ٹھہر جائے گی..... اور یہ احساس..... خدشہ نہیں تھا..... جویر یہ کی قسمت کا سورج ہمیشہ کے لئے غروب

ہو گیا تھا۔ اب اس کے نصیب میں تاریک اور کالی رات کے اندھیرے ہی لکھ دیئے گئے تھے۔
”اگر تمہیں اتنی جلدی چلے جانا تھا تو میری دنیا میں آئے کیوں تھے؟“ مجھے بہاروں سے آشنا کیوں کیا تھا.....؟“

اس نے تو بھائی جان کا ایڈریس کسی کو نہیں بتایا تھا..... اصل میں وہ جتنی حالت ہی ایسی ہو رہی تھی کہ اُسے یاد ہی نہیں آ رہا تھا..... کئی سال اُن کے گھر میں گزارے تھے مگر اب کوشش کے باوجود بتا نہیں پا رہی تھی۔

ناصر کا ایک کو لگ انہیں جانتا تھا اور اُس نے اکبر علی کو اطلاع دے دی تھی۔ چاہئے تو یہ تھا کہ وہ خبر سننے ہی چلے آتے مگر وہ رات کو نہیں آئے۔ اُن کی بیگم عارفہ اکبر اور وہ خود صبح ہونے پر آئے۔ جویر یہ انہیں دیکھتے ہی اپنی جگہ سے اُٹھی اور اُس سے لپٹ گئی۔ وہ پوری شدت سے رونے لگی۔

اُن کے گلے لگ کر بھول ہی گئی کہ یہ وہی بھائی ہیں جنہوں نے کبھی بہن کی خبر ہی نہیں رکھی۔ جب اُن کے گھر میں رہتی تھی، تب بھی پروا نہیں کی..... اور جب ناصر سے شادی ہو گئی تب تو تعلق ہی ختم کر لیا..... ملنے کا سوال ہی باقی نہ رہا۔ حالانکہ وہ یہ تصور تھی..... اُس نے ناصر سے شادی کی تھی تو یہ کوئی جرم نہ تھا۔ ناصر سے اس کا رشتہ والدین نے طے کیا تھا..... اگر عارفہ کا کزن امتیاز اس میں انٹرنلڈ نہ ہوتا..... تو اکبر علی بھی اس رشتے پر اعتراض نہ کرتے مگر وہ بیوی کے کہنے میں آکر بہن کی خوشیوں کے دشمن ہو گئے تھے۔

آج جویر یہ اُن کے گلے لگی کھڑی تھی..... اکبر علی نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور صبر کی تلقین کی..... وہاں موجود خواتین حیرت سے اس بھائی کو دیکھ رہی تھیں جو بہن کی بیوی کی پر ڈرا بھی افسردہ نہیں تھا۔ اُس کا لباس شاہانہ اور انداز روکھا سا تھا۔ عارفہ آگے بڑھ کر ملنے یا افسوس کرنے کے بجائے قیمتی ساری اک ادا سے سنبھالے کرسی پر جا بیٹھیں، گلے میں سونے کی چین، کانوں میں ٹاپس، بازو میں درجن بھر چوڑیاں وہ نگوں ہرے انداز میں ادھر ادھر دیکھ رہی تھیں۔

”کیا یہ جویر یہ کی سگی بھائی ہے..... اتنی لا تعلق اور جس ایسے موقعوں پر تو غیر بھی گلے لگ جاتے ہیں۔ اُن کی بھی آنکھیں بیگم جاتی ہیں..... یہ کیسی بھردل ہے.....؟“ ان سب کو عارفہ اکبر کے انداز اور رویے پر افسوس تھا اور جویر یہ سے ہمدردی کی شدت بڑھ گئی تھی۔

”ہائے کیا بے گاسا بے جاری کا ان سے تو کوئی امید نہیں رکھ جاسکتی۔“
بے شک اکبر نے بہن کو گلے لگایا تھا سلی دی تھی مگر پھر بھی چہرے پر وہ غم کی پرچھائیاں مفقود تھیں جو جوان، بہن کی بیوی پر ایک بھائی کے چہرے پر دیکھی جاسکتی ہیں۔

ناصر کل زندہ حقیقت تھا، آج خواب ہوا، وہ چلا گیا.....
اور میت کے اُٹھنے ہی لوگ بھی اپنے گھروں کو جانے لگے۔

”یہ تب چلے جائیں گے..... پھر میں اکیلی اس گھر میں کیسے رہوں گی.....؟“ وہ سوکھے پتے کی طرح تھی اور ہوائیں بڑی تیز تھیں۔

”تم میرے ساتھ میرے گھر چلو، عدت کی مدت تک وہیں رہنا۔“ فریدہ اس کی تنہائیوں اور اُس کے خوف کو اپنے دل میں دھڑکتا ہوا محسوس کر رہی تھی۔

ہیں.....؟“ طلال نے جویریہ کے چہرے کے دائیں بائیں اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھ رکھ کر یہ سب سوال ایک ساتھ کر دیئے تھے۔

”جویریہ حوصلہ پکڑو..... تمہارے یوں رونے سے بچے پر برا اثر پڑے گا۔“ اکبر علی نے بہن کو سمجھایا۔

جویریہ نے آنسو پونچھ ڈالے مگر دل بھر بھرتا تھا..... اُس نے طلال کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لئے اور انہیں دیکھتی ہوئی سوچ رہی تھی۔

”چند سالوں کی تو بات ہے..... پھر یہ ہاتھ، یہ بازو ماں کا سہارا بن جائیں گے..... ناصری کی یہ نشانی ہی میری امید ہے ناصر..... میں تمہارے دیئے اس تحفے کو جان سے عزیز رکھوں گی..... یہ اس دنیا میں تمہارا نشان ہے اور یہ نام و نشان زندہ رہے گا، جھگڑائے گا۔“ اُس نے بیٹے کے ہاتھ چوم لئے۔

”ہاں، میں بھی جویریہ کو یہی سمجھا رہی تھی، ٹھیک ہے صدمہ بہت بڑا ہے۔ مگر زندگی گزارنے کا بھی ایک ڈھنگ ہوتا ہے، جینا ہے تو پھر زندہ لوگوں کی طرح کیوں نہ جیا جائے۔“ عارفہ کو مطلوبہ چیز شاید ملی نہیں، اب وہ ہینڈ بیگ ایک طرف رکھ کر شوہر سے کہہ رہی تھیں۔

”اُن کی باتیں اُن کا انداز جویریہ کا دل کانپ جاتا تھا مگر وہ کہہ نہیں سکتی تھی۔“

”پلیز یوں بات مت کرو، میرے ٹوٹے دل پر یہ لہجہ، یہ انداز نمک کی طرف تکلیف دیتا ہے۔“

وہ سر جھکائے بیٹھی رہی..... گاڑی بھائی کی وسیع کوشی میں داخل ہو رہی تھی..... وہ نظریں، گود میں رکھے اپنے ہاتھوں پر جمائے بیٹھی تھی..... طلال اُس کے قریب سیٹ پر تھا۔ اُس کا سر ماں کے بازو سے ٹکا ہوا تھا..... گاڑی رُکی تو وہ سیدھا ہوبیٹھا اور بولا۔

”مما..... کیا اب ہم یہاں رہیں گے.....؟ ہیں ممما..... بولیں ناں، اب ہم یہاں رہیں گے.....؟“

”ہاں، اب تم یہاں رہو گے.....؟“ اکبر علی گاڑی کا دروازہ کھول کر نیچے اترے اور پھر جویریہ کے لئے دروازہ کھولا اور سہارا دے کر اُسے اترنے میں مدد دی جبکہ عارفہ اس عرصے میں ان میں سے کسی کی طرف دیکھے بغیر گاڑی سے اتر کر آگے بڑھ چکی تھیں۔

”ہم یہاں کیوں رہیں گے.....؟ ہم اپنے گھر کیوں نہیں رہیں گے ممما.....؟“ یہ اتنا خوبصورت بھولوں بھرا لالہ اور یہ گھر بھی طلال کی پسندیدگی کی سند حاصل نہ کر سکا۔ وہ تین سال کا بچہ یہاں رہنے کے خیال سے اُجھن محسوس کرتے ہوئے ماں سے سوال کر رہا تھا۔

اکبر علی نے ملازم سے سامان اُتارنے کو کہا، پھر جویریہ کو سہارا دیئے اور طلال کو ساتھ آنے کا کہہ کر چل پڑے۔ اسے اندر لا کر صوفے پر بٹھایا کہ وہ چند قدم چل کر ہی تھک گئی تھی۔

”یہ سامان کہاں رکھنا ہے صاحب.....؟“ ملازم نے پوچھا..... انہوں نے خود جواب نہیں دیا۔ بیگم کی طرف دیکھنے لگے۔

اور جوکرہ جویریہ اور طلال کے لئے عارفہ اکبر نے منتخب کیا تھا، اس پر اکبر علی کو کچھ اعتراض تو تھا مگر انہوں نے کہا کچھ نہیں..... یہ کمرہ ذرا لگ تھلگ سا تھا اور جویریہ کی حالت ان کے پیش نظر تھی، وہ اس بات کو مناسب خیال نہیں کرتے تھے کہ ایسی حالت میں اسے ڈور رکھا جائے۔ اسے جذباتی سہارے کی بھی

”یہ ہمارے ساتھ جائے گی، ہم اسے لینے ہی آئے تھے۔“ بیڈ پر نیم دراز عارفہ اکبر نے اطلاع دینے کے انداز میں کہا۔

”چلو..... یہ تو اچھا ہے، اپنے جیسے بھی ہوں، اپنے ہی ہوتے ہیں۔ وہ بھائی کا گھر ہے، سر تو ڈھکا رہے گا ناں۔“ یہاں موجود اکاڈک عورتوں کو یہ بات سن کر تسلی ہوئی..... جبکہ جویریہ نے جیسے خود کو وقت کے دھارے پر چھوڑ دیا تھا، نہ تو اُس نے فریاد کی بات کا جواب دیا اور نہ ہی عارفہ اکبر کی بات سن کر کوئی سانس دیا۔

”جویریہ کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ میرا خیال ہے اسے نیند کی دوا دے کر سلا دینا چاہئے۔ کوکب، فریدہ سے کہہ رہی تھی۔“



یہ گھر کتنے پیار سے دونوں نے بنایا تھا، یہاں پر موجود ایک ایک چیز ان دونوں کی مشترکہ پسند تھی۔ چھوٹا سا گھر جس کے در و دیوار پر محبت کی نیکیں چڑھی تھیں..... جہاں آنے والے لکل کی امید اگڑائی لیتی تھی..... دو محبت کرنے والے دل ایک ساتھ دھڑکتے تھے۔ آج وہ گھر اس سے چھٹ رہا تھا۔ اسے یہ گھر، جسے وہ اپنا گھر کہا کرتی تھی، آج چھوڑ کر جانا تھا۔

وہ جانا نہیں چاہتی تھی، بار بار پلٹی تھی مگر یہ بھی جانتی تھی، اسے جانا ہی پڑے گا۔ جب ناصر چلا گیا تو گھر کی یہ بے جان دیواریں کس کام کی.....

زندگی رُٹھ گئی تھی تو یہ سب کچھ بے کار تھا..... مگر یادیں..... یادیں تو نہیں مر سکتیں..... وہ یہ بھی جانتی تھی اس گھر میں اب وہ تمہارہ بھی نہیں پائے گی۔ یادوں کی آوازیں اسے پاگل کر چھوڑیں گی۔ اگر اسے طلال کا خیال نہ ہوتا تو وہ ناصر کے ساتھ ہی مرجاتی..... فنا کر ڈالتی خود کو مگر اب اس کے سامنے ناصر کی یہ نشانی تھی..... اور وہ اس کے لئے جینا چاہتی تھی، اس کی ڈھال بن جانا چاہتی تھی۔

وہ جو خود اتنی نازک سی تھی.....

اب اپنے بیٹے کے لئے چھپر چھاؤں بن جانے کا عزم کئے ہوئے تھی..... اکبر علی نے اسے اور طلال کو گاڑی میں بٹھایا اور مکان کے دروازے پر تالا ڈال کر چابی مالک مکان کے حوالے کر دی اور یوں محبتوں کی یہ کہانی اپنے انجام کو پہنچ گئی..... آخری باب بھی ختم ہوا۔

”اب یادوں کی تیز ہواؤں میں، میں آنسوؤں کے دیپ جلائے گزرے وقت کی تصویریں دیکھا کروں گی۔ ہائے میرے محبوب محبتوں کی یہ کہانی اتنی مختصر کیوں تھی..... تم میرے ساتھ ساتھ کیوں نہ چلتے رہے۔ تمہیں چھڑنے کی اتنی جلدی کیوں تھی.....؟“

وہ چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر سسکتی لگی..... فرنٹ سیٹ پر شوہر کے برابر بیٹھی عارفہ نے مڑ کر اُس کی جانب دیکھا اور ٹھنڈے لہجے میں کہا۔

”ممبر کرو..... جانے والے تو چلے گئے ہیں..... اب تم خود کو سنبھالو، اس طرح تو بڑی مشکل ہو جائے گی، اپنے لئے نہ سہی مگر اپنے بیٹے کی خاطر ہمت پکڑو..... کوئی کب تک کسی کا سہارا بن سکتا ہے۔ اپنا بوجھ تو آخر خود ہی اٹھانا ہوتا ہے۔“ پھر وہ اپنے ہیڈ بیگ میں کچھ تلاش کرنے لگیں۔

”مما..... ممما، ہم کہاں جا رہے ہیں.....؟ پیا کہاں چلے گئے ہیں۔ ممما آپ کیوں رو رہی

ضرورت تھی اور جسمانی طور پر بھی وہ کمزور ہو رہی تھی۔
مگر وہ بولے کچھ نہیں کہ عارفہ ہمیشہ اُن پر حاوی رہی تھی اور جب سے اُنہوں نے عارفہ کے بھائی کے ساتھ مل کر بزنس اشارت کیا تھا۔ تب سے مزید جھک گئے تھے۔ یہ لوگ جو یہ کہ صرف ضروری سامان ہی لے کر آئے تھے جس میں پہننے کے کپڑے شامل تھے، جبکہ فرنیچر، کراکری وغیرہ وہیں محلے میں فروخت کر دی تھی۔

اب یہاں جو کمرہ جویریہ کو دیا گیا، اس میں اب فرنیچر کی ضرورت بھی تھی اور عارفہ نے پوری طرح دیکھ بھال کر اس کے کمرے کے لئے وہ فرنیچر منتخب کیا جو اُس کے خیال میں اب پرانا اور بے کار ہو چکا تھا۔ دروازے اور کھڑکیوں پر پردے لگانے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی البتہ بیڈ کے لئے بستر ضرور دے دیا۔ اور یہ بھی عارفہ ٹیکم کی مہربانی ہی تھی۔ ملازمہ نے سامان سیٹ کر دیا اور آکر اطلاع بھی دے دی۔ اکبر نے اشارہ کیا کہ وہ (ملازمہ) جویریہ اور طلال کو ان کے کمرے میں لے جائے۔

عارفہ اور اکبر علی کی شادی کو کافی عرصہ گزر چکا تھا مگر اولاد نہیں تھی، اتنے بڑے گھر میں وہ دونوں ہی رہتے تھے۔ اب جویریہ اور طلال یہاں آگئے تو ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ بچے کی آوازوں کو ترستے اس گھر میں اس کی آمد کو بہار کا جھونکا سمجھ کر استقبال کیا جاتا۔ اور وہ اس بچے کو وہ پیار دے ڈالتیں جو کب سے دل میں چھپا رکھا تھا۔ مگر جانے وہ دل کس طرح کا تھا کہ بچے کو پیار کرنا تو درکنار آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی بھی روادار نہ تھیں۔ انہیں تو جویریہ پر بیٹنے والی قیامت کا بھی احساس نہیں تھا۔ ان کے خیال میں وہ اور اکبر، جویریہ کو اپنے گھر لاکر ہی اُس پر بہت بڑا احسان کر چکے تھے۔ اب مزید توجہ کی کوئی ضرورت نہیں رہی تھی۔

اکبر علی بے حد مصروف رہتے تھے۔ جانے کیا بزنس تھا اُن کا۔۔۔۔۔۔ جب بھی گھر آتے، جلدی میں ہی ہوتے اور عارفہ خود بھی گھر پر کم ہی ہوتی تھیں اور اگر ہوتیں بھی تو اپنے کمرے میں ہی رہتی تھیں۔ اتنا بڑا گھر اور اتنا خوبصورت لان۔۔۔۔۔۔ یہاں پھول کھلتے تھے اور مرجھا جاتے تھے، انہیں دیکھ کر خوش ہونے والا، اُن کے حسن کی داد دینے والا کوئی نہیں تھا۔۔۔۔۔۔ عارفہ کئی سوشل تنظیموں کی رکن تھی اور حلقہ احباب بھی خاصا وسیع تھا۔۔۔۔۔۔ کبھی کسی میٹنگ میں جانے کی تیاری ہوتی تو بھی پارٹی میں۔

گھر کے معاملات سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ سب کچھ ملازمین پر چھوڑ رکھا تھا اور وہ بھی مفت کا مال خوب اُڑا رہے تھے۔ گوشت بیزی لے کر آتے تھے تو قیمت سے کہیں زیادہ بتاتے، عارفہ نے کبھی اصل ریٹ جاننے کی ضرورت نہیں سمجھی، جو انہوں نے بتایا، پکڑا دیا مگر اس کے باوجود جویریہ کے معاملے میں پوری خبر رکھتی تھیں۔ خود اُس کے کمرے میں کبھی قدم نہیں رکھا مگر اس کو تین ٹائم کھانے میں کیا دینا ہے اور کتنی مقدار میں دینا ہے، اس کا خیال ضرور رہتا تھا۔

جویریہ اور طلال دن بھر اس گھر میں اکیلے ہی ہوتے تھے مگر جویریہ نے اپنے اس کمرے سے نکل کر، جو بھائی نے کمال مہربانی سے عنایت کیا تھا، کبھی ادھر ادھر جھانکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

چار برس پہلے وہ اس گھر میں رہا کرتی تھی مگر تب یہ عمارت اتنی عالی شان نہ تھی۔ ان دنوں بھائی نے اپنی محنت کی کمائی سے بہت تھوڑا سا حصہ ہی بنایا تھا۔ البتہ اُس کی شادی سے چند ماہ پہلے جب انہوں نے بھائی کے بھائی کے ساتھ مل کر کام شروع کیا تو ترقی کی رفتار حیران کن حد تک زیادہ تھی۔ یہ گھر اس کی شادی کے بعد ہی مکمل ہوا تھا مگر وہ یہ دیکھنے کی غرض سے بھی کبھی ادھر ادھر نہیں گئی کہ گھر

کیا ہے اور یہاں کیا کچھ ہے۔۔۔۔۔۔ وہ دن بھر کمرے میں رہتی۔ ملازمہ تین وقت کھانا دے جاتی مگر وہ ایک ٹائم ہی کھاتی تھی البتہ طلال کا پورا خیال رکھتی۔ وقت پر کھانا کھلاتی، نہلاتی اور صرف اس کا دل بہلانے کو اس سے ادھر ادھر کی چھوٹی چھوٹی باتیں بھی کرتی رہتی۔

وہ نہیں چاہتی تھی کہ بچہ باپ کو یاد کرے اور اس کی کمی کو شدت سے محسوس کر کے رونے لگے۔ وہ خوفزدہ تھی کہ جب طلال باپ کے بارے میں پوچھے گا تو کیا جواب دے گی اور اسے حیرت بھی تھی کہ طلال نے اتنا پیار کرنے والے باپ کو یاد نہیں کیا اور نہ ہی بار بار یہ سوال کیا کہ پاپا کہاں چلے گئے؟ وہ سننے کیوں نہیں آتے؟۔۔۔۔۔۔ حالانکہ جب ناصر زندہ تھا، تب یہ دونوں ہی ہر شام اُس کا انتظار کیا کرتے، اگر باصر کو اُس سے دیر ہو جاتی تو وہ بار بار ماماں سے کہتا۔۔۔۔۔۔ ”پاپا کیوں نہیں آئے؟“

اُسے یہاں آئے پورے بارہ روز ہوئے کو تھے، دل کی وہی حالت تھی اور سوچ ایک ہی جگہ۔ ”نہیں آئے گی تھی، آنکھوں سے نیند نہ گئی تھی مگر آج رات تو اُس کا بیٹا بھی نہیں سو رہا تھا۔ وہ اُسے سنانے کو لپٹاتی مگر وہ بار بار اُٹھ کر بیٹھ جاتا۔

”طلال سو جاؤ بیٹے، دیکھو ناں کتنی رات ہو گئی ہے۔“ اُس نے ایک بار پھر اسے اپنے برابر لٹاتے ہوئے سمجھانا چاہا۔

وہ لیٹ تو گیا مگر اس کے کہنے کے باوجود آنکھیں بند نہیں کیں۔

”کیا دیکھ رہے ہو، ہیں؟“ آج نیند کیوں نہیں آ رہی تھیں ماما کی جان۔۔۔۔۔۔“ اُس نے بیٹے کے سنہرے ہری براؤن بالوں کو ماتھے سے ہٹا کر پیار سے پوچھا۔

”ماما۔۔۔۔۔۔“ طلال نے اسی طرح نظریں سامنے جمائے اسے پکارا۔

”جی میری جان۔۔۔۔۔۔“ وہ اس پر جھک کر پیار کرتے ہوئی بولی۔

”ماما، پیادور چلے گئے؟ کیا وہ اب واپس نہیں آئیں گے۔“

”طلال۔۔۔۔۔۔“ اُس نے سسکی بھری اور بیٹے کو بازوؤں میں بھر لیا۔

”اوہ۔۔۔۔۔۔ تو تم جان گئے تھے میرے ننھے بیٹے۔ تم اس ڈھک کو محسوس کر چکے ہو۔۔۔۔۔۔“ آج سے پہلے وہ اکیلی رویا کرتی تھی مگر آج اس سیاہ رات کی تنہائی میں وہ دونوں رو رہے تھے۔

یہ اتنا سا بچہ بھی اس کی کوبری طرح محسوس کرتا ہے، وہ جانتا ہے باپ ہمیشہ کے لئے جا چکا ہے، اب وہ کبھی واپس نہیں آئے گا۔۔۔۔۔۔ اسے ماں کی بے بسی کا بھی احساس ہے، جب ہی تو ضد کرنا بھول گیا ہے۔

”میں جو ہوں۔۔۔۔۔۔ میں ہوں ناں تمہارے پاس میرے لال۔۔۔۔۔۔ میں اپنے بچے پر جان بھی وار دوں گی۔ مت روؤ تم مت روؤ، میرا دل کٹوے کٹوے ہوا جاتا ہے۔ میں تمہارے ساتھ ہوں، تمہارے ساتھ رہوں گی۔“ وہ اُسے چپ کراتے ہوئے خود بھی آنسوؤں کے خزانے لٹائے جا رہی تھی۔

طلال کچھ دیر کے لئے سو گیا مگر جویریہ ہر رات کی طرح آج بھی جاگتی رہی۔۔۔۔۔۔ یہ چھوٹا سا بچہ اس قدر حساس ہوگا، ہر بات کو اتنی گہرائی سے محسوس کرتا ہوگا۔ اس سے پہلے جویریہ کو کبھی اس بات کا خیال نہیں آیا تھا، اب جبکہ یہ احساس ہوا تو دل میں درد جیسے چکرانے لگا تھا اور وہ سمجھ نہیں پاتی تھی۔ ایسی خوشی کہاں سے لائے جو اس کے بیٹے کے معصوم دل کا ہر غم مٹا دے۔

اب وہ طلال کے سامنے رونے سے گریز کرنے لگی تھی۔ وہ اس کے ساتھ کھینٹی اور کبھی کوئی کہانی

خانے لگتی جب تک وہ ساتھ ساتھ ہوتا، مسکراتی رہتی مگر جب سو جاتا تو نامصر کی تصویر نکال کر بیٹھ جاتی اور دیر تک اس کے ساتھ باتیں کرتی رہتی۔

صبح وہ طلال کے جاگنے پر اسے تیار کر رہی تھی کہ اکبر علی اُس کے کمرے میں چلے آئے، اُن کی یہاں آمد حیران کن تھی، وہ ہاتھ روک کر اُن کی جانب دیکھنے لگی۔ یہ خیال بھی آیا شاید کسی کام سے آئے ہوں گے مگر مجھ سے بھائی جان کو بھلا کیا کام ہو سکتا ہے۔ وہ ہر آہٹ پر چونکنے لگی تھی۔ ذرا سی بات پر ہم جاتی، اب بھی خاموش کھڑی وسوسوں میں گھری ان کی صورت دیکھے جا رہی تھی۔

”کیا بات ہے جو یہ تم کچھ پریشان دکھائی دے رہی ہو.....؟“ اُس کی حالت کو اکبر علی نے بھی محسوس کر لیا تھا۔

”نہیں بھیا..... میں تو ٹھیک ہوں..... آپ شاید کچھ کہنے آئے ہیں..... آئیے ادھر بیٹھیں۔“ وہ خود پر قابو پا کر اُنہیں کرسی پریش کرنے لگی۔

”ہاں..... میں نے سوچا، آج چھٹی کا دن ہے اور میں بھی بہت دنوں کے بعد گھر ہوں تو بہن سے بھی مل لوں۔ اصل میں بہت مصروف رہتا ہوں..... اب تو تم نے بھی دیکھ لیا ہوگا، میں گھر ہوتا ہی نہیں۔“

”اوہ..... تو یہ بات ہے۔“ اُس نے سکون کا سانس لیا اور نہ تو پریشان ہوئی جا رہی تھی کہ بھائی جان کیا کہنے آئے ہیں۔

”تم یہاں ٹھیک تو ہو جو یہ میرا مطلب ہے، تمہیں کوئی براہم تو نہیں ہے یہاں۔“

”نہیں بھیا..... میں ٹھیک ہوں..... اور آپ کی بے حد شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے یہاں اپنے گھر میں رہنے کی اجازت دی ہے..... اس بھری دنیا میں آپ کے سوا میرا تھا ہی کون.....؟ اگر آپ سہارا نہ دیتے بھیا تو پتا نہیں میرا کیا بنتا.....؟“

”ہاں جو یہ، تمہیں یہاں اپنے گھر میں جگہ دینا میرے لئے آسان تو نہ تھا، تم جانتی ہی ہو کہ میں جو بزنس کر رہا ہوں، اس میں اصل سرمایہ عارفہ کے بھائی صاحب کا ہے اور تمہیں یہ بھی یاد ہوگا کہ نامصر کی وجہ سے تم نے عارفہ کے کزن کو ٹھکرا لیا تھا۔ امتیاز صرف عارفہ کا کزن ہوتا تو چلو پھر بھی کوئی بات نہیں تھی مگر وہ نہ صرف عارفہ کا کزن بلکہ اُس کی بڑی بہن گنبد کا دیور بھی ہوتا ہے۔ ان لوگوں نے امتیاز کی خواہش پر تمہیں مایا تھا مگر تم نے اس پیغام کو اہمیت ہی نہیں دی۔

گنبد باجی خود یہ رشتہ لے کر آئی تھیں مگر تم نے صاف انکار کر دیا..... مت پوچھو، تمہارے اس انکار کی وجہ سے مجھے اپنی سسرال میں کس قدر شرمندگی سے دوچار ہونا پڑا۔ صرف تمہاری ضد کی وجہ سے گنبد آبا اور عارفہ کے باقی سب عزیز مجھے سے ناراض ہوئے۔ میں نے عہد کیا تھا اب تمہاری صورت بھی نہ دیکھوں گا مگر قسمت کی باتیں عجیب ہوتی ہیں..... کون جانتا تھا، تم کو ایک بار جا کر پھر واپس آنا پڑے گا۔“

”بھیا، یوں نہ کہیں..... میں نامصر کو کیسے چھوڑ سکتی تھی، اُن کے ساتھ میرا رشتہ امی، ابا نے اپنی زندگی میں طے کیا تھا اور تب اس رشتے میں آپ کی مرضی بھی شامل تھی۔ پھر میں اس رشتے کو کیسے چھوڑ سکتی تھی اور نامصر میری پسند بھی تھی کہ وہ بہت اچھے انسان تھے۔“ جو یہ دُکھ سے بولی۔

”خیر خیر..... جو ہونا تھا، وہ تو ہو چکا، اب نامصر تو اس دنیا میں نہیں رہا اور گنبد آبا کے دیور امتیاز کی بھی شادی ہو چکی ہے..... میرے سسرال والے بھی کسی حد تک مجھے معاف کر ہی چکے تھے البتہ اب دوبارہ

تمہارے یہاں آ جانے کی وجہ سے کچھ کچھ کچھ سے رہنے لگے ہیں۔“

”تو پھر بھیا، کیا آپ مجھے اپنے گھر سے نکال دیں گے.....؟“ اُس نے ہم کرپوچھا۔

”نہیں خیر، ہم بھین بھیری، میں بھلا ایسا کیسے کر سکتا ہوں..... میں بس اتنا چاہوں گا کہ تم عارفہ کے ساتھ اپنا رویہ درست رکھنا، ابھی اس کے کسی کام میں مداخلت کی کوشش مت کرنا۔ عارفہ مرضی سے زندگی گزارنے کی عادی ہے۔ وہ اپنے معاملات میں کسی کو بولنے کی اجازت نہیں دیتی۔ تم کوشش کرنا کہ ایسا نہ ہونے پائے۔“

”بھائی جان..... میں اور طلال تو سارا دن کمرے میں رہتے ہیں..... ہم تو باہر نکلتے ہی نہیں۔“

بھائی کی باتوں نے اُسے رنجور کیا تھا اور وہ صفائیاں پیش کرنے لگی تھی۔

”میرا یہ مطلب ہرگز نہیں جو یہ کہ تم اور تمہارا بیٹا سارا دن کمرے میں بند رہ کر گزارو، اتنا بڑا گھر ہے میرا، اور کہیں نہیں تولان میں ہی چلی جایا کرو..... میں تو صرف یہ سمجھنا چاہ رہا تھا کہ اپنی بھابی سے بنا کر رکھنے میں تمہارا بھی فائدہ ہے، اس کی ہر بات مانو گی تو تمہارے لئے بھی اچھا ہوگا کہ وہ جینکس عورت ہے، جو کچھ بھی کرے گی تمہاری بھلائی کے لئے ہی کرے گی۔ وہ دل کی بری نہیں ہے۔“ بھیا نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”آپ دونوں جیسا کہیں گے، میں ویسا ہی کر دوں گی۔“ اُسے بھائی کی باتوں سے خوشی تو نہیں ہو سکتی تھی کہ جان لگی تھی بھائی اور بھائی نے صرف دنیا والوں کی باتوں کے خوف سے اسے اپنے گھر میں پناہ دے دی تھی..... ورنہ اُن کے دل میں اس کے لئے کوئی درد نہیں۔

”یہ کچھ رقم ہے رکھ لو، کام آئے گی۔“ انہوں نے لفافہ بند پر رکھ دیا۔

وہ خاموش رہی البتہ دل پر آنسو گرتے رہے۔

کاش میں اتنی مجبور نہ ہوتی..... یہ رقم بھائی کو واپس کر دیتی..... مگر زندگی کے ساتھ ساتھ زندگی کی ضروریات بھی تھیں۔ اپنے لئے نہ سہی، طلال کے لئے اس رقم کی ضرورت تھی۔

اکبر علی، طلال کی جانب دیکھے بغیر کمرے سے نکل گئے۔ بچہ کسی غیر کا ہو، تب بھی اس کی معصومیت پر بے ساختہ پیار آ جاتا ہے..... یہ تو اُن کا اپنا بھانجا تھا مگر شاید اسے اکبر علی، جو یہ کے بیٹے کی نظر سے نہیں بلکہ نامصر کا بیٹا ہونے کے حوالے سے دیکھتے تھے..... اور اسی بناء پر انہیں اُس کی بھولی بھالی صورت پر پیار نہیں آتا تھا۔

”یہ کون ہوتے ہیں ماما.....؟“ اکبر علی کے جانے کے بعد طلال ماں کی اتنی صورت سے پریشان ہو کر پوچھ رہا تھا۔

”یہ تمہارے ماموں ہیں میری جان.....“ بیٹے کی جانب دھیان ہوا تو خود کو سنبھال کر وہ مسکراتے ہوئے کہنے لگی۔

”یہ کیوں آئے تھے.....؟ یہ کیا کہتے تھے ماما.....؟“

”یہ میرے بیٹے کا حال پوچھ رہے تھے، یہ کہہ رہے تھے طلال کیسا ہے.....؟ اُس کی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے۔“

”ماموں اچھے ہوتے ہیں کیا.....؟“

”ہاں بیٹے، ماموں بہت اچھے ہوتے ہیں۔“

ملازمہ ناشتا لے آئی۔ وہ طلال کو ناشتا کرائے لگی۔ اُس کا اپنا دل نہیں چاہ رہا تھا، وہ اکبر کی گفتگو کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

”بھائی نے یہ سب کیوں کہا..... کہیں ایسا تو نہیں کہ بھابی نے ان سے میری کوئی شکایت کی ہو، اب تک مجھ سے ناراض تو ہیں، گھر پر ہوں، تب بھی نہ مجھ سے ملنے آتی ہیں اور نہ ہی کبھی مجھے اندر بلا رہے۔ وہ اگر بھائی سے میرے بارے میں کوئی بات کہہ چکی ہیں تو پھر آنے والا وقت میرے لئے بہت ہی مشکلات لے کر آئے گا۔“

پھر شاید میرے سر پر یہ چھت بھی نہ رہے، بھائی بھی تو دل میں خفا ہیں اور وہ بھابی کے سامنے بولنے کی جرات بھی نہیں رکھتے۔ وہ شروع ہی سے بھابی سے دبتے ہیں اور اب تو سسرال والوں کا بھی دباؤ ہے، وہ بیوی سے اختلاف نہیں کر سکیں گے۔ خدایا بھابی کے دل میں میرے لئے رحم ڈال دے، مجھ پر اپنا فضل رکھنا میرے اللہ، مجھے مزید کسی آزمائش میں مت ڈالنا، میں بہت کمزور ہوں، میں کم ہمت ہوں۔“

”مما..... آپ رورہی ہیں.....؟ آپ کیوں رورہی ہیں.....؟ کس نے مارا ہے آپ کو.....؟“

طلال اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے پاس آ بیٹھا۔

”..... میں تو نہیں رورہی۔“ اُسے پتا ہی نہیں چلا تھا، کب آنسو آنکھ سے گالوں پر پھسل آئے تھے۔

”رونا نہیں ممما.....“ طلال نے اس کے آنسو اپنے ننھے ہاتھوں میں سمیٹ لئے اور جویر یہ نے جھک کر اپنی امید کا منہ چوم لیا۔

”مجھے زندگی سے کوئی پرہیز نہیں مگر میں جینا چاہتی ہوں کہ مجھے تم سے پیار ہے، میں تمہارے راتے کے تمام کام..... نے اپنی پلکوں سے چٹنے چاہوں گی، میری دُعا ہے میرے لال، خدا تمہیں خوش رکھے، تمہیں زندگی کے ہر میدان میں کامیاب در سے نوازے، تم مٹی کو چھوؤ تو سونا ہو جائے۔“ وہ طلال کو گود میں لے

اس کی کامیابی..... کہ لئے دُعا کی..... لی رہی۔

شاہ جی نے گاؤں کے واحد اسکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب کو اپنی بیٹھک پر بلوایا تھا اور بتا دیا تھا کہ چھوٹے شاہ جی اب یہیں گاؤں کے اسکول میں پڑھیں گے..... ساتھ ہی اسکول کی امداد کے لئے دس ہزار کا چیک لکھ تھا اور ہیڈ ماسٹر صاحب کے لئے بھی چند تحفے تحائف آچکے تھے۔ انہوں نے بھلا کیا کہا تھا۔ اے یہ چیک اور تحفے تحائف نہ بھگو دیئے جاتے تو بھی اردشیر کی آمد پر خوشی کا اظہار اور اسے ”جی آبا“ نوا..... کہہ ان کی بجزوری تھی۔

اردشیر کو کبریٰ نے اپنے کمرے میں بلوایا اور اُسے کہا۔

”ار..... نے تمہارے بابا سے کہہ دیا ہے، اب میرا بیٹا شہر والے اسکول میں بالکل نہیں جائے گا۔

اگر آپ اسے پڑھانا چاہتے ہیں تو یہیں گاؤں کے اسکول میں داخل کرادیں جہاں سب جانتے ہیں کہ یہ

چھوٹے شاہ جی ہیں اور بہت پیسے والے ہیں۔“ کبریٰ خاتون نے صرف اس لئے کہ اردشیر یہ جان کر کہ

بڑی ماں نے اسے شہر کے اسکول..... سے نجات دلائی ہے، اس کے مزید قریب آجائے گا، اس کے دل میں بڑی

ماں کی محبت دوچند ہو جائے گی..... بشید شاہ کا نام نہیں لیا..... حالانکہ یہ فیصلہ تو بہر حال شاہ جی کا اپنا ہی تھا۔

”نہیں نہیں بڑی ماں، اب مجھے پڑھنا ہی نہیں، نہ میں شہر کے اسکول میں جاؤں گا اور نہ ہی گاؤں میں

پڑھوں گا۔ میں بابا سائیں کے ساتھ زمینوں پر جایا کروں گا، آخر میں بیٹا جو ہوا اُن کا، ہے ناں بڑی ماں.....“

”ارے گاؤں کے اسول میں پڑھنا تو کوئی مشکل بات ہی نہیں، یہ جو اپنا کرم دین ہے، یہ نہیں گاؤں پر اسکول چھوڑ کر آیا کرے گا اور پتا ہے یہاں اسکول میں پڑھنے والے کسی بچے کے پاس گاڑی تو کیا سائیکل بھی نہیں ہے، جب ہمارا شہزادہ گاڑی سے اترے گا تو سب رُک کر اسے دیکھیں گے اور پھر وہاں استاد جی کے ساتھ ہی تمہاری کرسی بھی رکھی ہوا کرے گی۔ مرضی ہوئی تو پڑھ لیا کرنا، نہ ہوئی تو نہ سمی۔

ماسٹر صاحب تمہیں سزا تھوڑی دیں گے۔ آخر وہ تمہارے بابا جان کو اچھی طرح جانتے ہیں۔

انہیں پتا ہے بابا سائیں تو اپنے بیٹے سے بدتمیزی کرنے والے ہاتھ تو زد دیتے ہیں۔ سارے لڑکے بھی تمہاری عزت کریں گے..... کسی کی محال نہیں ہوگی میرے بیٹے کو کچھ کہہ سکے۔ وہ سب تمہارے آگے پیچھے پھریں گے، احترام کریں گے تمہارا..... تم کسی سے بات نہیں بھی کرو گے ناں تو پھر بھی وہ سب تمہاری ہی طرف دیکھیں گے۔“ کبریٰ نے اُس کو تفصیل سے بتایا۔

”بچ بڑی ماں.....؟“ اردشیر کو یقین نہیں آیا مگر اسے یہ سب سن کر خوشی بہت ہو رہی تھی۔ کہاں تو اسکول میں سب بچے اس سے لڑتے تھے اور نیچر سے شکایت کرتے تو نیچر بھی اُسے ہی ٹوکتی اور سزا دیتی

تھی..... اور بڑی ماں کہہ رہی تھیں یہاں اس اسکول میں اسے کوئی بھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اُس کے لئے نیچر کے قریب جیڑ رکھی جائے گی۔ واہ اگر ایسا ہو جائے تو پھر کتنا مزہ آئے گا۔

”ہاں ہاں، میں سچ کہہ رہی ہوں..... تم کل سے خود اسکول جا کر دیکھ لو گے..... بالکل ایسا ہی ہوگا۔

پتا ہے شاہ جی کے پاس گاؤں کے سب لوگوں سے زیادہ پیسہ ہے۔ ہمارا گھر بھی سب سے بڑا ہے اور بہت

سے ملازم ہیں ہمارے پاس..... یہ سب لوگ تو بہت غریب ہیں..... اُن کے گھر کچی مٹی سے بنے ہوئے

ہیں۔ بارش ہوتی ہے تو یہ گھر گر جاتے ہیں، پھر یہ مدد مانگتے تمہارے بابا جان کے پاس ہی تو آتے ہیں۔“

”تو کیا بابا جان سب کی مدد کرتے ہیں.....؟“ وہ بہت توجہ سے اُن کی باتیں سن رہا تھا۔

”یہ تو شاہ جی کی مرضی ہے، جس کی چاہیں کر دیں اور جس کو چاہے یونہی واپس بھیج دیں۔“

”جن کی مدد نہیں کرتے، وہ بے چارے تو بہت روتے ہوں گے بڑی ماں، میں بابا جان سے کہوں گا،

وہ اپنے اتنے سارے پیسوں میں سے تھوڑے سے ان غریب لوگوں کو بھی دے دیں۔“ وہ ابھی بچہ تھا اور بچے

سب کے دوست ہوتے ہیں۔ اُس نے یہ بات پورے خلوص سے کہی تھی۔ اُس کی بات سن کر کبریٰ چند لمحوں

کے لئے چپ ہو گئی۔ وہ کیا سمجھانا چاہ رہی تھی اور یہ اردشیر کیا سوچ رہا تھا۔ ذرا توقف کے بعد کہنے لگی۔

”شاہ جی صرف اُن لوگوں کو پیسے دیتے ہیں جو ہمارے لئے اچھا سوچتے ہیں۔ جو لوگ ہمارے

خلاف ہیں، ہم بھلا اُن کی مدد کیوں کریں.....؟“

”ہاں..... یہ تو ہے، ایسے لوگوں کو تو خوب سزا دینی چاہئے، انہیں مار پڑتی چاہئے۔“

”تم بڑے ہو جاؤ، ایک ایک کو ٹھیک کر دینا۔“

”ہاں، میں جلد بڑا ہو جاؤں گا اور جو ہمارے دشمن ہیں ناں، انہیں بہت سزا دوں گا اور میں اب

اسکول بھی جاؤں گا۔“ اب ایک دم سے اُس کی گردن تن گئی تھی اور خود کو بہت کچھ سمجھنے کا رنگ اُس کے

نبھلے بھالے ہمارے سے چہرے پر بھی آ گیا تھا۔

”سنو، صبح اسکول جانے سے پہلے مجھ سے پیسے ضرور لے جانا.....“ شک وہاں خرچ مت کرنا مگر

سے پر اور جتانے والا تھا۔ کبری خاموش ہو گئی۔
”آہ ہا۔۔۔ بچیوں کو بھی گاڑی میں بٹھا دیں۔۔۔ سب اکٹھے چلے جائیں گے۔“ راحت نے شریں کی بات نہیں سنی تھی۔ اب وہ کبری سے کہہ رہی تھی۔

”وہ تو پیدل چلنے کی بی بی ہیں، انہیں گاڑی پر جانا اچھا نہیں لگ رہا۔“ بیٹیوں کی محرومیوں پر کبری کا دل جل اٹھا تھا۔ جب ہی تو نہ چاہتے ہوئے بھی بیٹھ ہو گئی تھی۔ مگر بے سود ہی گیا۔ شاہ جی اور راحت دونوں بیٹے کی جانب متوجہ تھے۔ لڑکیاں پیدل اور ارد شیر گاڑی میں اسکول چلا گیا۔
”بھائی بلارہا تھا، یہ بیٹوں بھی اُس کے ساتھ ہی چلی جاتیں۔“ بچوں کے جانے کے بعد راحت پھر کہہ رہی تھی۔

”وہ تو روز اسی طرح جاتی ہیں، آج بھی چلی جائیں گی۔“
”مگر اب تو ڈرائیور ارد شیر کو روزانہ ہی لے کر جائے گا۔ راستہ بھی ایک ہے بلکہ لڑکیاں تو پہلے اُتر جایا کریں گی۔۔۔ وہ آرام سے جاسکتی ہیں۔“
راحت کی بات کا کبری نے جواب نہیں دیا۔ ملازمہ کو صفائی کے متعلق ہدایات دینے لگی۔

شہر کے اسکول کے مقابلے میں گاؤں کا اسکول اگر دیکھا جائے تو کچھ بھی نہیں تھا۔۔۔ نہ عمارت، نہ فرنیچر، گندے مندرے بچے جن کے کپڑے بستے اور کتابیں پھٹی ہوئی تھیں۔۔۔ اور وہ سب کے سب شاہ جی کی آمد پر دوڑے چلے آئے تھے۔ ایک ایک اُن کے آگے جھٹکا اور سلام کرتا تھا۔ تمام اساتذہ بھی شاہ جی کو ادب سے سلام کرنے کے بعد بڑی محبت سے ارد شیر سے ہاتھ ملاتے۔

واقعی یہاں سب کچھ بالکل ویسا تھا جیسا بڑی ماں نے کہا تھا۔ گاؤں کے یہ بچے اُسے اپنے درمیان پا کر حیران ہو رہے تھے۔ اُن کے لئے یہ بات بڑی ہی حیران کن تھی کہ ارد شیر یہاں اُن کے درمیان بیٹھ کر پڑھے گا۔ اس سے پہلے چوہدری صاحب کے دونوں بیٹے بھی اس اسکول میں پڑھا کرتے تھے مگر انہیں پڑھائی سے دلچسپی کہاں تھی۔۔۔ وہ کبھی بھڑکی، کھلونوں کا چکر لگاتے، آکر کھیلتے رہتے تھے یا آپس میں لڑتے رہتے۔۔۔ اور وہ اتنے صاف ستھرے بھی نہیں ہوتے تھے۔ نہ ہی ارد شیر کی طرح خوبصورت تھے۔

پھر شاہ جی کے گھرانے کی تو بات ہی الگ تھی۔ پورے گاؤں میں انہیں عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ بے شک باقاعدہ جیری مریدی اُن کے خاندان میں نہیں تھی مگر پھر بھی لوگ انہیں بہت ماننے تھے اور اکثر عورتیں کبری خاتون، فاطمہ شاہ کے پاس دعا کی درخواست کے ساتھ آیا کرتی تھیں۔ خاص طور پر کبری خاتون سے تو بے حد عقیدت رکھتی تھیں کہ وہ نہ صرف ان کے لئے دعا کرنے کا وعدہ کرتی تھی بلکہ مالی امداد بھی کرتی اور اُن کے جھگڑے بھی نبٹاتا کرتی تھی۔

کلاس میں ارد شیر سب بچوں کے ساتھ نیچے ٹاٹ پر نہیں بیٹھا۔۔۔ بلکہ استاد صاحب کے ساتھ ہی اُس کے لئے گھر سے لائی گئی منٹش کرسی رکھی گئی جو استاد صاحب کی کرسی سے ہیں زیادہ خوبصورت تھی۔ آج کلاس کے بچوں کی توجہ پڑھائی کی جانب کم اور ارد شیر کی جانب زیادہ تھی۔ ارد شیر کو یہ سب اچھا لگ رہا تھا اور وہ استاد صاحب کا پڑھایا ہوا سبق پوری توجہ سے سن رہا تھا، آج اسے پڑھنے کا مزا آرہا تھا۔
آدھی چھٹی (بریک) کے دوران لڑکے اپنے ساتھ کھیل میں اسے بھی شامل کرنا چاہتے تھے مگر

تمہاری جیب میں پیسے ضرور ہونے چاہئیں۔۔۔ آخر سب بچوں کو یہ پتا تو ہو کہ جھوٹا شاہ بہت پیسے والا ہے۔ سب بچے چپکے چپکے تمہاری طرف لپٹائی ہوئی نظروں سے دیکھیں گے۔ اگر تمہارا دل چاہے تو ان بیٹیوں میں سے چھوڑے سے کسی بچے کو دے بھی سکتے ہو۔“

”نہیں وہ سارے پیسے میرے ہوں گے، میں کسی کو بھی نہیں دوں گا بڑی ماں۔“
”ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی، میں اپنے بیٹے کو کوئی روک ٹوک تھوڑا کرتی ہوں۔۔۔ جو میرا بیٹا چاہتا ہے، میں تو وہی کرتی ہوں۔“

”آپ کتنی اچھی ہیں میری پیاری بڑی ماں۔۔۔“ اُس نے اپنا سر اُن کے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔
”تم بھی تو بہت اچھے، بہت پیارے ہو۔ اپنی بڑی ماں کی ہر بات ماننے ہو اور پتا ہے، اگر کبھی تم نے اپنی بڑی ماں کی بات نہ مانی تو وہ بہت دکھ محسوس کرے گی، بہت روئے گی۔“

”میں وعدہ کرتا ہوں، میں آپ کی ہر بات مانوں گا۔“ اُس کے لہجے میں سچائی اور آنکھوں میں محبت ہی محبت تھی۔
”یہ وعدہ یاد رکھنا بچے۔“

اُس نے پورے زور سے اثبات میں سر ہلایا۔
صبح ارد شیر جب تیار ہو کر اسکول جا رہا تھا تو شاہ جی خود ساتھ تھے اور یہ بات کبری خاتون نے ہی اُن سے کہی تھی کہ آج بچے کا یہاں گاؤں کے اسکول میں پہلا دن ہے۔۔۔ اگر آپ فارغ ہیں اور مناسب خیال کرتے ہیں تو ساتھ چلے جائیں، اس سے اچھا اثر پڑے گا۔“

ایک ملازم اس کا بیک اٹھائے، گاڑی میں رکھنے جا رہا تھا جبکہ جامی نام کے ایک لڑکے کے لئے یہ حکم تھا کہ وہ دوپہر کا کھانا لے کر اسکول جائے گا اور ارد شیر کو کھانا کھلانے گا۔
”ہونہہ۔۔۔ کتنے غرے ہیں نواب صاحب کے۔“ اسکول جانے کی تیاری کرتے ہی ارد شیر نے منہ بنا کر اُسے دیکھ کر ہنس دیا اور جملے کے انداز میں اس کے خلاف باتیں بھی کر رہی تھیں۔

”بھائی اسکول جا رہا ہے۔؟“ گل رُخ نے اُن کے قریب آکر پوچھا۔
”اسکول نہیں، یہ تو جنگ پر جا رہا ہے اور ہمیں تو لگتا ہے، زندہ واپس بھی نہیں آئے گا۔ اسی لئے تو سب اس سے یوں مل رہے ہیں۔“ ستارہ کی بات پر شریں ہنسنے لگی۔

گل رُخ اُن کی بات کا مطلب تو نہیں سمجھی البتہ یہ ضرور جان گئی کہ بھائی کا مذاق اڑا رہی ہیں، کیوں؟ یہ وہ نہیں جانتی تھی۔
”تم بیٹوں کیوں ادھر کھڑی ہو گئی ہو؟ کیا آج پھر اسکول سے چھٹی کا ارادہ کر لیا ہے۔“ کبری نے لڑکیوں کے قریب آکر کہا۔

”جانا ہے، بس جا رہی رہے تھی۔“ شریں بولی اور گل رُخ اور ستارہ کو اُن کا اشارہ کر کے چل پڑی۔
”آ جاؤ۔۔۔ آ جاؤ نا، اُسکے جائیں گے۔“ ارد شیر نے بے حد دوستانہ انداز میں ہاتھ ہلا کر ان تینوں کو بلایا مگر وہ آواز سن کر بھی متوجہ نہیں ہوئیں۔

”چلی جاؤ ارد شیر کے ساتھ ہی۔“ کبری نے کہا۔
”نہیں امی، روزانہ پیدل ہی جاتے ہیں۔۔۔ اب بھی چلے جائیں گے۔“ شریں کا انداز محرومیوں

جھک رہے تھے۔ وہ خود بھی اُن کے ساتھ کھیلنا چاہتا تھا مگر خود سے کہنا نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ سب اُس کے گرد جمع تھے اور چھوٹے چھوٹے سوال پوچھ رہے تھے۔

”تمہارے بوٹ تو بہت مہنگے ہوں گے چھوٹے شاہ جی، ہے ناں؟“

”یہ کرسی تم اپنے گھر سے لے کر آئے ہو؟“

”چھوٹے شاہ جی، یہ چاٹ کھاؤ گے؟“ ایک بچہ اسکول کے باہر لگی چھاڑیوں میں سے، ایک سے

وہ چاٹ پیپل کے پتے پر ڈال کر صرف اسی کے لئے لایا تھا کہ اس پیارے سے بچے سے دوپٹی کرنا چاہتا تھا۔

اردشیر ابھی بچہ تھا۔ کیا گندا ہے، کیا اچھا ہے؟ اُسے اس بات کی گیز نہیں تھی۔ بس اُس کا دل

بھی یہ چاٹ کھانے کا چاہ رہا تھا۔ اُس نے اس بچے سے تو چاٹ نہیں لی، اپنے بیگ کی جیب سے بچاس کا

وہ نوٹ نکال لیا جو صبح بڑی ماں نے اُسے دیا تھا اور چاٹ خریدنے کے ارادے سے اُنھ کھڑا ہوا، راستے

سارے پیسے، بچوں کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اردشیر فخر کے عالم میں سر اونچا کئے چھاڑی والے

کی طرف چل پڑا۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ خریدتا مگر اس کا کھانا لے کر جا بیٹھا۔

”چھوٹے شاہ جی، یہ تو گندی چیزیں ہیں۔ دیکھیں تو ان پر کتنی کھیاں بیٹھ رہی ہیں۔ یہ تو گندے

لڑکے کھاتے ہیں۔ آپ کے لئے تو گھر سے اچھے والا کھانا آیا ہے۔“ جانی کے کہنے پر وہ نہ پلٹتا مگر یہ سن

کر یہ چیزیں گندے لڑکے کھاتے ہیں، اُسے پلٹنا پڑا کہ وہ گند لڑکا نہیں کہلاتا چاہتا تھا۔ گھر سے جو کھانا آیا

تھا، بہت اچھا تھا مگر اردشیر کا دل پیپل کے پتوں پر ڈال کر دی جانے والی چاٹ میں ہی اُنکا ہوا تھا۔

”بابا جان، وہاں سارے بچے چاٹ کھا رہے تھے مگر جانی نے مجھے نہیں کھانے دی۔“ گھر آتے

ہی اُس نے شاہ جی سے جانی کی شکایت لگائی۔

”چاٹ..... کیسی چاٹ.....؟“ وہ سمجھ نہیں۔

”وہی جو اسکول کے دروازے کے باہر ایک بوڑھا آدمی بیچتا ہے..... پیپل کے پتے پر ڈال کر دیتا

ہے۔ کیسی ہوتی ہے یہ چاٹ، آپ نے بھی کھائی ہے؟“ اس کے انداز پر شاہ جی کو ہنسی آگئی۔

جانی نے اچھا کیا جو تمہیں منع کر دیا بیٹا..... وہ تو گندے بچے کھاتے ہیں..... تم نے دیکھا نہیں ان

لوگوں کے ہاتھ کتنے میلے ہوتے ہیں..... تم ان سے لے کر کوئی چیز مت کھانا ورنہ لوگ کیا کہیں گے..... یہ

چھوٹے شاہ جی بھی ایسی گندی چیزیں کھاتے ہیں۔“

”نہیں بابا سائیں..... وہ تو بہت اچھی تھی۔“

”وہ دیکھنے میں اچھی لگ رہی تھی مگر جب تم جیسے صاف سترے بچے اُسے کھالیں تو بیمار پڑ جاتے

ہیں۔“ قریب ہی موجود راحت بھی سمجھانے لگی۔

”وہاں پر بیٹھی ٹافیاں بھی لی رہی تھیں۔ میں نے جانی سے کہا، مجھے لے دو، کہنے لگا، ان پر کھیاں بیٹھی

ہیں۔ کھا کر آپ بیمار ہو جائیں گے، بابا میں وہ ٹافیاں اور چاٹ ضرور کھانا چاہتا ہوں۔“ وہ ضدی لہجے میں بولا۔

”اب جب بچے کو ایسے اسکول میں داخل کر دیا ہے تو کب تک روکیں گے۔ وہ باقی بچوں کی دیکھا

دیکھی ایسی چیزیں تو کھائے گا ہی..... پتا نہیں کیا سوچھی ہے شاہ جی کو۔“

راحت خانم ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی۔

ایک اک بل اذیت بھرا، ہر سانس جیسے سینے میں اگتی ہے مگر زندگی کی ڈور نہ ہوتی نہیں..... اور.....

یادیں ہر سو بکھری ہوئی ہیں۔

وہ آخری منظر..... ناصر کی ہمیشہ کے لئے رخصتی کا منظر جب یاد آتا ہے تو سینے میں جیسے تیز دھار آلہ

اُتر جاتا ہے۔ شدید درد اور کرب کا احساس اسے بے اختیار ہونٹ بھینچنے پر مجبور کرتا ہے۔ یہ چند ماہ اُس کے

بدن سے سارا لہو نچوڑ کر لے گئے ہیں۔

عدت کی مدت کا آخری دن ہے..... ناصر کی تصویر پر سر رکھے وہ روئے چلی جاتی ہے..... مگر

بکھر نے کی اس ساعت میں بھی اتنا دھیان باقی ہے کہ آواز اتنی بلند نہ ہونے پائے، جس سے بھیا اور

بھابی ڈسٹرب ہو جائیں۔ چٹخیں دبانے کا منہ پر دوپٹہ رکھ لیا ہے۔

”ناصر..... ہائے ناصر، آج عدت کی مدت پوری ہوگئی ہے۔ یہ مدت جو دنیا والوں کی نظر میں

جانے والے سے ایک تعلق ہی تو تھا..... (یہ تو میں جانتی ہوں تم سے تعلق زندگی کی آخری سانس تک رہے

گا)۔ آج یہ ختم ہوا۔ ایک زنجیر جسے میں ہمیشہ کے لئے اپنے وجود کے ساتھ دیکھنا چاہتی تھی، آج ٹوٹ گئی

ہے۔ اب دنیا کی نظریں، میں آزاد ہوں۔ یہ کیسی آزادی ہے جو مجھے ہر اسان کر رہی ہے۔ مجھے یوں لگتا

ہے جیسے میرے سر پر دھری پھٹی ہوئی چادر بھی اب اُترنے کو ہے۔“

ملازمہ کھانا رکھ کر چلی گئی تھی..... اور طلال خاموش بیٹھا بھی کھانے کو اور کبھی ماں کو دیکھتا تھا۔ وہ

منتظر تھا کہ جو یہ روز کی طرح آج بھی اپنے ہاتھ سے اپنے کھانا کھائے گی مگر جو یہ آکھیں بند کئے فرش

پر نڈھال بیٹھی تھی۔

”مما.....“ آخر طلال کو اسے متوجہ کرنا پڑا۔

اُس کی آواز سن کر جو یہ نے آنکھیں کھول دیں۔ بھیکے چہرے کو دوپٹے سے صاف کیا اور بڑھ کر بیٹے کو

گود میں لے لیا۔ باوجود کوشش کے وہ منہ سے ایک لفظ بھی ادا نہیں کر سکی اور خاموشی سے اسے کھانا کھانے لگی۔

طلال کے ذہن میں کئی سوال تھے۔ وہ بہت سی باتیں ماں سے پوچھنا چاہتا تھا مگر پوچھ نہیں پاتا

تھا۔ جس روز سے طلال نے اس سے یہ سوال کیا تھا کہ پنا دور چلے گئے ہیں، اب کبھی نہیں آئیں

گے؟ وہ اس کے سامنے رونے سے اجتناب برتی تھی مگر آج خاموش رہنا اسے ناصر سے بے وفائی کے

متضاد لگتا تھا۔ وہ قسمت کے اس وار پر پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی۔ اسے کھانا کھلانے کے بعد بستر پر لٹا کر

وہ ہاتھ روم میں چلی گئی۔ منہ دھو کر واپس آئی تو طلال اُنھ کر بیٹھا ہوا تھا۔

”کیا بات ہے، میرے بیٹے کو آج نیند نہیں آ رہی۔“ رونے سے اُس کی آواز کچھ بھاری رہی تھی اور آنکھیں متورم ہو رہی تھیں۔

”مما۔۔۔۔۔“ طلال کے معصوم ذہن نے بہت سوچ بچار کے بعد سوال کے لئے مناسب الفاظ ترتیب دیئے تھے۔

”جی، میری جان۔۔۔۔۔ کیا بات ہے۔۔۔۔۔؟“

”مما۔۔۔۔۔ ہم اب کبھی بھی اپنے گھر نہیں جائیں گے۔؟“ جی ہاں، اب ہم یہیں رہ جائیں گے۔“ جویریہ کا ذہنی دل کٹ کے رہ گیا، اسے طلال سے اس سوال کی اُمید نہیں تھی۔ کتنی دیر اس سے بولنا نہیں گیا۔ بیٹے کو گود میں بٹھا کر اُس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ کچھ کہنے کی کوشش میں بہ حال ہوئی رہی اور جب بولی تو سنا ہی اُنسوؤں پر اختیار نہیں رہا۔

اُس نے گالوں پر آئے اُنسو اپنی انگلی کی پور سے صاف کئے کہ انہیں چھنے والا تواب جا چکا تھا، اب سارے غموں کی صلیب کسی سہارے کے بغیر خود ہی اٹھنا تھی۔

”یہ بھی تو میرے بیٹے کا گھر ہے۔“ اُس نے طلال کے نرم نرم گال پر بوسہ دے کر سمجھانے کے انداز میں کہا۔

”نہیں، یہ گھر اچھا نہیں ہے، اپنے گھر چلوں۔“ وہ رونے لگا۔

”شاید یہ اندر ہی اندر سہم کر رہ گیا ہے۔ باپ کے جانے کا دکھ اس کے دل کا بھی بوجھ بن گیا ہے۔ اسے رو لینا چاہئے تھا۔۔۔۔۔ مجھے روکنا نہیں چاہئے۔“ اسے ساتھ لگائے تھکتے ہوئے وہ اپنے پیار اور چاہت کا احساس اُس کے اندر اُتارتی رہی۔۔۔۔۔ مگر چپ ہوئے کو نہیں کہا۔

جویریہ نہیں جانتی تھی اُس کے اُنسو، اُس کی کمزوری، بچے کو پریشان کر دیتے ہیں۔۔۔۔۔ ماں اور باپ بچوں کے لئے طاقت اور بہادری کا نشان ہوتے ہیں۔ بچے انہیں ہمیشہ مضبوط اور ٹرڈ دیکھنا چاہتے ہیں۔۔۔۔۔ باپ دُور جا چکا ہے۔ اس حقیقت کو اس کے سینے سے ذہن نے بھی قبول کر لیا تھا مگر جویریہ کے اُنسو، اُس کی کمزوری، بچے کو ڈراتی تھی۔ وہ خود کو بے حد غیر محفوظ تصور کرتا تھا۔ جویریہ اُس کے سامنے رونے سے پرہیز کرتی تھی، مگر کئی بار ایسا ہوا، وہ کمرے سے باہر کھیلے کھیلے اندر آئی تو اُس نے ماں کو روکنے دیکھا۔ وہ ڈری ڈری رہتی تھی۔ خیالوں میں اُبھی ہوئی چپ چاپ، کھانا بھی کھاتی تھی۔

وہ بہت چھوٹا تھا مگر جو حادثہ اس پر گزرا تھا، اُس نے اسے چونکا کر رکھ دیا تھا۔ وہ بے حد خوفزدہ تھا اور اس کا جی چاہتا تھا، ماں پہلے کی طرح ہو جائے۔ ہنسی مکرانی، اُس کے ساتھ مختلف کھیل کھلاتی ہوئی۔

”بی بی! آپ کو تیکم صاحبہ بلاری ہیں۔“ ملازمہ جب عارفہ کا پیغام لے کر آئی تو وہ طلال کو نہار رہی تھی۔ ”اُن سے کہہ دو، میں ابھی آ رہی ہوں۔“ پیغام سن کر وہ اتنی پریشان ہوئی کہ صابن کی تکیہ ہاتھ سے پھسل گئی۔

”خدا خیر کرے۔۔۔۔۔ آج بھابی کو میری یاد کیونکر آگئی۔ اتنے روز ہو گئے مجھے یہاں آئے ہوئے اس سے پہلے تو کبھی یاد نہیں کیا۔“

نہ سر پر چھت تھی، نہ پیروں تلے زمین، اس کا کوئی سائبان نہیں تھا۔ وہ کڑی دھوپ میں حالت سفر میں تھی اور خوف اُس کے اندر ڈیرہ لگا چکا تھا۔ ذرا سی بات پر ہی سوکھے پتے کی طرح لرزے لگتی تھی۔

عارفہ سے تو یوں بھی بہت ڈر لگتا تھا ہے۔

طلال کو کپڑے پہنا کر اور یہ کہہ کر ”تم یہیں بیٹھو، میں ابھی آتی ہوں۔“ وہ تھکے تھکے انداز میں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ہزار و سوسوں میں گھری عارفہ بیگم کے بیڈروم تک چلی آئی اور ملازمہ سے کہا، اندر جا کر اطلاع دے دو کہ میں آگئی ہوں۔“

”آپ چلی جائیں جی، انہوں نے خود ہی تو بلایا تھا آپ کو۔“ ملازمہ اس کی جھجک اور پریشانی پر حیران ہوتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”نہیں پلیز تم پہلے جا کر اطلاع کر دو، میں کچھ لیٹ بھی تو ہو گئی ہوں۔۔۔۔۔ ممکن ہے اب وہ نہ ملنا چاہ رہی ہوں۔“

”اتنا ڈرتی ہیں جی آپ۔“ وہ شوخ سی لڑکی مسکرا کر بولی۔ جویریہ یہ خاموش کھڑی رہی۔

”اچھا جی، آپ کہہ رہی ہیں تو بتا دیتے ہیں۔“ وہ لاپرواہ انداز میں اندر چلی گئی۔ جویریہ باہر کھڑی اس کا انتظار کرنے لگی۔ اُس نے آنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی۔

”آجائیں جی۔۔۔۔۔ اجازت مل گئی ہے۔۔۔۔۔ اور میں ادھر ہوں طلال کے پاس۔۔۔۔۔ چھوٹا سا بچہ ہے، آپ اکیلا چھوڑ کے آگئی ہیں۔۔۔۔۔ وہ تو ڈر جائے گا۔“

اس ہمدردی پر جویریہ نے تشکر بھری نگاہ سے بھائی کے گھر کی ملازمہ کو دیکھا جو گھر کے کینوں سے زیادہ ہمدردی دکھا کر چلی گئی تھی۔

عارفہ نہا کر آئی تھی اور اب ڈرائیو پکڑے آئینے کے سامنے بیٹھی تھی۔ آئینے میں جویریہ کا عکس ابھرا تو بھی اُس نے غور کر اُس کی جانب نہیں دیکھا۔ بدستور اپنے کام میں مصروف رہی، ”یریرہ بے چاری حکم کی منتظر کھڑی رہی۔“

”آپ نے بلایا تھا بھابی۔“ آخر جویریہ کو خود ہی یاد دلانا پڑا۔

”ہاں بلایا تھا۔۔۔۔۔ مگر یہ ضروری تو نہیں کہ بات کھڑے کھڑے ہی سنی جائے۔“ عارفہ کا لہجہ ہمیشہ کی طرح کڑوا اور کڑخت تھا۔ جویریہ جلدی سے کرسی کی طرف بڑھی اور بہت احتیاط سے بالکل کنارے پر ٹپک گئی۔ عارفہ نے اسے یوں بیٹھے دیکھ کر بھی نہیں کہا کہ ٹھیک ہو کر بیٹھ جاؤ۔۔۔۔۔ حالانکہ اُس کی گھبراہٹ صاف محسوس کی جاسکتی تھی۔

”میں نے تمہیں اس لئے بلایا تھا کہ آج شاپنگ کے لئے جانے کا پروگرام ہے میرا، سوچا تمہیں بھی ساتھ لے چلوں۔“

”لیکن بھابی، میں جا کر کیا کروں گی۔۔۔۔۔؟“ بھابی بیگم کی یہ عنایت اُس کی سمجھ سے باہر تھی۔

”دیکھو، یہ ٹھیک ہے کہ تم سارا وقت اپنے کمرے میں گزارتی ہو۔۔۔۔۔ گھر میں کون آتا ہے، کون جاتا ہے، تمہیں اس سے کوئی غرض نہیں مگر ہم لوگوں کے علاوہ اس گھر میں کچھ ملازم بھی ہیں اور وہ کبھی اس بات سے اچھی طرح واقف ہیں کہ تم اُن کے مالک یعنی اکبر صاحب کی بہن ہو۔ اب پچھلے حالات کیا تھے، اتنے سال تم نے اس گھر میں جھانکنا تک نہیں تو اس کی کیا وجہ تھی، یہ بات یہ لوگ نہیں جانتے۔

اور یہ جو ملازم پیشہ چھوٹے چھوٹے لوگ ہیں ناں، یہ کوئی بات اپنے تک تو رکھ ہی نہیں سکتے۔ بیماری ہوتی ہے انہیں بات سننے ہی پھیلا دینے کی، اب یہ آس پاس کی دوسری کوٹھیوں کے ملازمین۔

”چلو اٹھو، میں زلیخا سے کہہ جاتی ہوں، وہ تمہارے بیٹے کا خیال رکھے گی۔“ عارفہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ساتھ ہی جویریہ نے بھی کرسی چھوڑ دی۔

”اگر اس سے بہتر لباس تمہارے پاس موجود ہے تو پہن لو، میں بھی تیار ہوتی ہوں۔“ وہ اثبات میں سر ہلا کر مزے مرے قدم اٹھاتی باہر آ گئی۔ کپڑے تبدیل کئے، بالوں میں بڑبڑ کرنے کے بعد انہیں ایک بار پھر سادہ چوٹی کے انداز میں باندھا اور شوز بدل کر جلدی جلدی عارفہ کی طرف آئی کہ یہ خطرہ بھرتہ تھا کہ لیٹ ہونے کی صورت میں ڈانٹ بھی سکتی ہیں مگر اسے کافی دیر انتظار کرنا پڑا۔ عارفہ بیگم کی تیاری اس کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھی اور اس حساب سے وقت بھی زیادہ لگتا یقینی بات تھی۔

شہر کی مہنگی ترین مارکیٹ تھی، اس سے پہلے جویریہ یہاں کبھی نہیں آئی تھی۔ وہ اور ناصرا کٹر اکٹھے شاپنگ کیا کرتے تھے مگر اپنی جیب کے مطابق ناصرتخواہ دار آدی تھا، محنت اور حلال کی آمدنی پر یقین رکھتا تھا۔ وہ ایسی جگہیں افورڈ نہیں کر سکتا تھا مگر پھر بھی دونوں کتنے خوش اور مطمئن تھے۔ ایک ایک چیز مشترکہ پسند سے خریدی جاتی اور پھر کھانا بھی باہر کھاتے۔ جب گھر لوٹتے تھے تو کتنے خوش ہوتے اور کیسے تھکن سے چور ہونے کے باوجود بھی اپنی چھوٹی سی جنت میں آکر خریدی ہوئی اشیاء دوبارہ سے دیکھتے، ایک ایک چیز پر تبصرہ کرتے اور دونوں کتنا ہنسا کرتے تھے۔

آج اتنی چمکتی دہشتی مارکیٹ اس کے سامنے تھی۔ بڑے بڑے اسٹورز..... آنے جانے والوں کے جھگڑے چہرے، قیمتی لباس اور میکیٹے وجود، ہر طرف پسندیدہ وضع جھلک دکھا رہا تھا۔ اسے یہ سب اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اُس پر اکتاہٹ سوار تھی۔ وہ یہی چاہ رہی تھی، بھابی جلدی سے شاپنگ مکمل کریں اور گھر کی راہ لیں۔ ایک تو اسے یہ رونق، یہ گہما گہما ویسے بھی اچھی نہیں لگ رہی تھی اور دوسرے طلال کا خیال بھی آ رہا تھا۔ ابھی تو زلیخا کے پاس بیٹھا کھیل رہا تھا مگر جلد ہی وہ ماں کی غیر موجودگی کو محسوس کر لے گا اور پریشان ہوگا۔

”جی بھابی، ٹھیک ہے، اچھا ہے۔“ اور کتنی بھی کیا۔
”اوہ نہیں..... میرا خیال ہے یہ مناسب نہیں۔“ انہوں نے خود ہی ریجیکٹ کر دیا۔ اُس نے بھی فوراً اثبات میں سر ہلا دیا۔ انہوں نے توجہ نہیں کی، دوسرا دیکھنے لگیں۔

”ہاں، یہ تمہارے لئے ٹھیک رہے گا۔“ اس مرتبہ تو سرے سے رائے ہی نہیں لی..... پھر اپنی پسند سے ہی جویریہ کے لئے چند جوڑے پیک کر والئے۔

بچوں کی شاپنگ کا انہیں کوئی تجربہ نہیں تھا..... اس لئے طلال کے لئے جویریہ نے اپنی مرضی سے صرف دس سوٹ خریدے۔ اصل میں وہ نہیں چاہتی تھی کہ بھابی اسے اور طلال کو بوجھ تصور کریں۔ بے شک بھیا بہت پیسے والے تھے، دونوں دس لوگوں کو گھر بٹھا کر کھلا سکتے تھے مگر اصل بات تو دل کی ہوتی ہے، وہ دل کے بادشاہ نہیں تھے۔ بہت چھوٹا دل تھا ان کا اور جویریہ یہ کہ یہ احساس بھی ڈھکی کئے ہوتے تھا کہ عارفہ یہ سب اُس کی ہمدردی اور محبت میں نہیں کر رہی ہیں، صرف دنیا دکھاوے کے لئے کر رہی ہیں۔ اگر لوگوں کی فکر انہیں نہ ہوتی تو آنکھ اٹھا کر دیکھتی بھی نہیں..... کہ دونوں ماں بیٹا جو اتفاق سے بے حد قریبی عزیز بھو ہوتے ہیں، اس بڑی سی کوشی کے سب سے چھوٹے اور اگت تھک کرے میں کس حال میں پڑے ہیں۔ جویریہ اور طلال کی خریداری تو بہت جلدی مکمل ہو گئی مگر اب بیگم عارفہ اکبر کی خریداری کو شروع

ماتے ہیں اور اپنے مالکوں کی ایک بات انہیں بتاتے ہیں اور پھر وہ اپنے صاحب لوگوں سے ذکر کر دیتے ہیں۔ یوں کسی بھی گھر کی کوئی بات چھپی رہ ہی نہیں سکتی۔

اور میرا خیال ہے تمہیں یہاں آئے ابھی چند روز ہی ہوئے تھے جب تمہاری آمد کی خبر اس ایریہ کے قریب بار گھر کو ہو گئی تھی۔ بہت سے لوگوں نے تمہارے بارے میں مجھ سے پوچھا۔ کئی خواتین تم سے ملنا چاہتی تھیں مگر میں بہانے سے ٹالتی رہی۔ وجہ یہ کہ تمہارا حلیہ ہمیشہ ہی اتنا خراب ہوتا ہے کہ تمہیں کسی کے سامنے اپنی رشتے داری حیثیت سے لاتے مجھے تو شرم آتی ہے۔

پہلے بھی کئی بار سوچا تھا کہ کچھ ڈھنگ کے کپڑے ہی دوا دوں مگر مصروفیت میں پھر بھول گئی۔ آج بازار جا رہی ہوں۔ بہتر ہے تم بھی میرے ساتھ ہی چلی چلو..... اور دو چار سوٹ خریدی لو.....“ انہوں نے تفصیل سے کہا۔

”آپ کا بہت شکریہ بھابی مگر کپڑے میرے پاس ہیں۔“ جویریہ نے بے حد مؤدب ہو کر کہا۔
”ہونہ..... جانتی ہوں کیسے کپڑے ہوں گے تمہارے پاس..... ارے وہ معمولی تنخواہ دار بھلا تمہیں دے ہی کیا سکا ہوگا۔“ عارفہ کے لہجے میں ناصر کے لئے طنز تھا۔ جویریہ بے حد مجبور تھی، اسے عارفہ کے سامنے بولنے کا حق نہیں تھا مگر اپنے محبوب شوہر کا اس انداز میں ذکر اس کا خون کھولا گیا۔ وہ یہ کہے بغیر بندہ سکی۔
”بھابی، میں اپنے گھر میں بہت خوش تھی ناصرا ایک آئیڈیل شوہر تھے۔“

”ہاں ہاں بھئی، تم جیسی کا آئیڈیل بھی کیا ہوگا۔ یقیناً تم خوش ہو گئی مگر ہمارا اسٹینڈرڈ کچھ اور ہے لی، بے دلی سے ہی کہی مگر تمہیں اب یہاں اسی طرح رہنا ہوگا جیسے میں چاہوں گی کیونکہ میں دنیا والوں کی باتیں سننا قطعاً پسند نہیں کرتی۔ لوگ تو یہی کہیں گے ناں کہ بھابی، بے چاری لڑکی پر ظلم توڑ رہی ہے۔ اتنی دولت ہونے کے باوجود ڈھنگ کا ایک جوڑا نہیں بنوا کر دیا تم کو..... اور میں کس کس کو بتاؤں گی کہ اچھا لباس پہننا تمہیں پسند ہی نہیں۔“

اب تم کوئی بے جان گڑیا تو ہو نہیں جسے میں الماری میں رکھ کر لاک لگا دوں اور یوں تم ساری دنیا سے چھپ جاؤ۔ دنیا میں رہنے ہوئے دنیا کے ساتھ ساتھ چلنا پڑتا ہے۔ میرے ساتھ چلو اور نہ صرف اپنے لئے بلکہ اپنے بچے کے لئے بھی کچھ کپڑے خرید لو۔“

اگر یہ سب باتیں عارفہ بیگم ہمدردانہ لہجے میں کہیں تو جویریہ کو بھی خوشی ہوتی یہ احساس ہوتا کہ بھابی کو اس کا خیال ہے مگر جو انداز عارفہ نے اپنا یا لاکھ مجبور اور تنہا ہونے کے باوجود جویریہ اپنی اسلٹ محسوس کئے بنانہ نہ سکی، جب ہی تو بہانہ بنایا۔

”ابھی میں کیسے جاسکتی ہوں، طلال جاگ رہا ہے، روئے گا۔“
”اوہو، پاگل پن کی بھی کوئی حد ہوتی ہے کیا دنیا کی ساری مائیں اپنے بچوں کو ہر وقت خود سے چھنائے رہتی ہیں اور پھر یہ کوئی جنگل بھی نہیں بلکہ گھر ہے اور یہاں نوکر چاکر بھی موجود ہیں، روئے گا تو وہ خود ہی بہلا لیں گے۔“

اب جویریہ چپ ہو گئی۔ اُس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ صاف صاف کہہ دے، ”مجھے نہیں جانا آپ کے ساتھ، مجھے نئے کپڑوں کی کوئی خواہش نہیں ہے۔ میں جس حال میں بھی ہوں، اسی میں رہنے دیں۔“
دنیا..... کے ذریعے مجھ پر یہ حسان نہ ہی کریں تو بہتر.....

ہوئی تو ختم ہونے میں نہیں آئی۔ انہوں نے اپنے لئے جس قیمت کے لباس خریدے، اس کے مقابلے میں جویریہ کے لئے خریدے گئے کپڑوں کی قیمت تو بے حد معمولی تھی۔
”انتا پیسہ ہے بھائی جان کے پاس۔“ جویریہ انہیں اتنی بے دردی سے اتنا بہت سا روپیہ لہاتے ہوئے دیکھ کر حیران ہو رہی تھی۔

عارفہ نے تمام پینٹکس جویریہ کو پکڑوا دیئے تھے اور خود ایک شان بے نیازی سے گردن اکڑائے آگے آگے ایک اسٹور سے دوسرے اسٹور میں گھسی چلی جاتی تھیں۔ دیکھنے والے تو یقیناً یہی سمجھ رہے ہوں گے کہ وہ ان کی ملازمہ ہے۔

”اب تو ہمیں گھر سے نکلے بہت نامم ہونے کو ہے۔ طلال یقیناً پریشان، دُعا ہوا۔ شاید رو بھی رہا ہو۔ اسے بھوک بھی لگ رہی ہوگی۔ زینچا بھی میری پوزیشن کو اچھی طرح سمجھتی ہے۔ وہ کہاں ایک بے کس ماں کے بیٹے پر توجہ دے گی۔ وہ رو رہا ہوگا۔“ ہائے میرا لال۔“ جویریہ کا دل اب دب رہا تھا۔
”بھابی پلینز، اب گھر چلیں، میں بہت تھک گئی ہوں۔“ آخر عازم جزی کے ساتھ اُس نے درخواست کر رہی دی۔

”نہنہ۔۔۔ تھک گئی ہو، جیسے شوہر کے گھر میں تو سارا وقت تم تخت پر بیٹھی رہتی تھیں ناں۔۔۔ جو ذرا سا سامان اٹھالینے سے تمہیں تھکن ہونے لگی ہے، صاف کہہ دو، یوں سامان اٹھا کر چلنا اچھا نہیں لگ رہا۔۔۔ ورنہ اتنے سے وزن سے تھکن کا کیا سوال ہو سکتا ہے بھلا۔“
”نہیں بھابی جان نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔۔۔ میرا یہ مطلب تو ہرگز نہیں تھا، اصل میں، میں طلال کے لئے سوچنے لگی تھی، اسے بھوک لگی ہوگی۔“

”خبردار جو میرے معاملے میں بولیں، میں جب تک چاہوں گی، شاپنگ کروں گی۔“
اتنے کڑے تیور، ایسا آگ برسا تا لہجہ۔۔۔ اس انداز پر جویریہ میں مزید کچھ کہنے کی ہمت ہی نہیں رہی۔ جھکا ہوا سر مزید جھک گیا۔ اک آہ یوں سے خارج ہوئی۔۔۔ وہ قسمت تو بھی کیا کیا رنگ دکھاتی ہے۔ آخر خدا خدا کر کے عارفہ بیگم کی خریداری مکمل ہوئی اور انہوں نے واپسی کا ارادہ باندھا۔۔۔ جویریہ نے تو سن کر خدا کا شکر ادا کیا اور دل میں یہ دُعا بھی کی، اب کہیں پھر بھابی کا ارادہ تبدیل نہ ہو جائے۔ قسمت کے سنگین مذاق نے اس کی صحت پر خاصا برا اثر ڈالا تھا۔ وہ بہت تھک گئی تھی مگر کون تھا جس سے کہتی۔ گاڑی میں بیٹھی شیشے کے پار سے بظاہر وہ روڈ کی رونق دیکھ رہی تھی۔ مگر ذہن کہیں دُور تھا۔ وہ یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی نہیں دیکھ رہی تھی۔

گاڑی پورچ میں رکی تو وہ فوراً دروازہ کھول کر اپنے کمرے کی جانب بھاگی۔ طلال اسے کمرے سے باہر ہی زینچا کی گود میں مل گیا۔۔۔ اور اسے دیکھتے ہی دونوں انہیں اُس کی جانب واکر کے پکارنے لگا۔ جویریہ نے اسے ملازمہ کی گود سے لے کر سینے سے لگا لیا پھر ماتھا چوما اور بولی۔

”کھانا کھالیا ہے میرے بیٹے۔۔۔؟“ اُس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
”نہ رو دیا تو نہیں تھا زینچا۔۔۔“ وہ قریب کھڑی الہڑی لڑکی سے مخاطب تھی جو ماں بیٹے کی محبت کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔

”پہلے تو کھیل رہا پھر تھوڑا پریشان ہو کر رونے لگا۔ آپ کو بار بار پوچھ رہا تھا مگر میں نے بھلائے

رکھا، ویسے بی بی بی، آپ کا بیٹا ہے بڑا پیارا اور اس نے مجھے جگ بھی بالکل نہیں کیا۔“
بیٹے کی تعریف پر فخر کے احساس میں گھر کو وہ دلکشی سے مسکرائی اور بچے کو سینے سے لگالیا۔
”آپ کہاں گئی تھیں بیگم صاحبہ کے ساتھ۔۔۔؟“ زینچا بے تکلفی سے پوچھ رہی تھی جو اب اُس نے بھی بتا دیا۔

”صاحب واقعی آپ کے گھرے بھائی ہیں۔۔۔؟“
تب وہ اثبات میں سر ہلا کر نظر نہیں ملا سکی۔
”حیرت ہے، ایسی بھی کیا زن مریدی (بیوی کی غلامی)“ زینچا نے افسوس کیا کہ جویریہ کے ساتھ ہونے والا سلوک اُس کے سامنے تھا۔

”ویسے آج کچھ نئی بات نہیں ہوگی کہ بیگم صاحبہ آپ کو اپنے ساتھ بازار لے گئیں ہیں۔۔۔ اتنے دنوں سے آپ یہاں ہیں۔۔۔ کبھی ادھر جھانکا نہیں، آج خیال کس طرح آ گیا۔۔۔؟“
جویریہ نے گھر آ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں خاموش رہنے کی التجا کی۔

”تو ہے، آپ تو بہت ہی ڈرتی ہیں بی بی، میں تو کہتی ہوں بندے کو بہادر ہونا چاہئے، جیسے میں بہادر ہوں، دیکھ لو کسی سے نہیں ڈرتی۔۔۔ اور تو اور بیگم صاحبہ کو بھی صاف اور سیدھی بات کہہ دیتی ہوں۔ ٹھیک ہی تو کرتی ہوں ناں، روزی دینے والا تو اللہ ہے پھر یہ بندے کس بات پر اکڑتے ہیں۔۔۔ کیا کر لیں گی میرا۔۔۔؟ زیادہ سے زیادہ تو کرسی سے جواب دیں گی تو دے دیں، میرے لئے تو کرسیوں کی کمی تو ہوتی ہے۔ بڑا ستھر کام کرتی ہوں، کہیں بھی ملازم ہو جاؤں گی۔“

”تم ایسا کر سکتی ہو مگر میرے لئے اس گھر سے باہر کچھ بھی نہیں ہے۔۔۔ اب یہی میری پناہ ہے، بری یا بھلی جیسی بھی گزرتی ہے، اب یہیں گزرتی ہے۔“ وہ سوچ کے رہ گئی۔

”چپ کیوں ہو گئیں بی بی، کیا میری بات غلط ہے۔۔۔؟“
اس سے پہلے کہ جویریہ یہ کچھ کہتی، مالی اس پیغام کے ساتھ چلا آیا کہ بی بی کو بیگم صاحبہ بلارہی ہیں۔
”جاؤ جی جن آؤ بات۔“ اُس نے کہے بغیر ہی آگے بڑھ کر طلال کو جویریہ کی گود میں سے لے لیا اور وہ ایک بار پھر بھابی کے سامنے حاضر ہو گئی۔

”تم بھی عجیب ہو، اچھی طرح جانتی تھیں کہ یہ کپڑے میں نے تمہارے لئے ہی خریدے ہیں مگر اس کے باوجود تم انہیں لئے بغیر ہی چلی گئیں۔ اب کیا یہ ضروری تھا کہ میں انہیں خود تمہاری خدمت میں پیش کروں اور قبول کرنے کی درخواست کروں، تب ہی مجھ پر احسان کر کے تم یہ سب لینے پر رضامند ہوگی۔؟“
عارفہ کا انداز دیکھ کر جویریہ کی توجان ہی نکل گئی۔ زبان پھیر کر خشک ہونٹوں کو تر کیا اور لالچا جت بھرے انداز میں بولی۔

”نہیں بھابی جان، ایسی تو کوئی بات نہیں، وہ میں تو بس طلال کی وجہ سے پریشان تھی، بس اسی لئے۔“
”کیا پریشانی تھی تمہیں۔۔۔؟“ انہوں نے ہاتھ میں پکڑا گلاس سائینڈ میل پر تقریباً جھٹکتے ہوئے کہا اور سیدھی ہو بیٹھیں۔ جویریہ خاموش ہی رہی تو بولیں۔

”مجھے بتاؤ کیا گھر میں وہ اکیلا تھا۔۔۔؟ اُس کے پاس اور کوئی موجود نہیں تھا، تمہارے سامنے میں نے زینچا کو سمجھایا تھا۔ مگر تمہاری عقل میں کوئی بات آتی ہی نہیں ہے اور ہاں آئندہ ایسے بے شکے بہانے

پیسے والے باپ کا لاڈلا بیٹا ہے مگر پیسہ ہی سب کچھ نہیں ہوتا، اصل چیز انسانیت اور شرافت ہے۔ اب وہ اس عمر میں ہے کہ اسے اچھی اور بری باتوں کی پہچان کروائی جاسکتی ہے۔ تم اس کی تربیت کی طرف سے غفلت مت کرنا۔“

اردشیر اسکول سے آنے کے بعد اب کبری کے کمرے میں موجود تھا اور انہیں سارے دن کی رپورٹ پیش کر رہا تھا۔

”ہاں بڑی ماں، یہاں اسکول کے سارے بچے میرے رعب میں ہیں۔ مجھ سے ڈرتے ہیں، سارے کے سارے اور جو ماسٹر صاحب ہیں ناں، وہ بھی بڑا پیار کرتے ہیں مجھ سے، وہ مجھے چھوٹے شاہ جی کہہ کر بلاتے ہیں، پر ایک بات ہے بڑی ماں۔“

”وہ کیا.....؟“ کبری نے اس کی پیشانی سے ہال ہٹا کر پوچھا۔

”وہ یہ ہے کہ جو ماسٹر صاحب ہیں ناں، وہ سارے بچوں سے روزانہ سبق سنتے ہیں، مجھ سے نہیں سنتے۔ میں تو روز یاد بھی کر کے جاتا ہوں۔“

”چلو یہ تو اچھی بات ہے، جب وہ تم سے نہیں سنتے تو پھر تم یاد بھی نہ کیا کرو۔ یہ مزے کی بات ہوگی۔ یوں تمہیں کہنے کو بہت سا وقت بھی مل جایا کرے گا۔ تمہاری شیریں اور ستارہ آپلی سے بھی ان کی نیچر سبق نہیں سنتیں۔ دیکھ لو وہ دونوں سارا دن مزے سے کھیلتی رہتی ہیں۔“ کبری بظاہر بڑے پیار سے اسے کہہ رہی تھیں۔

”نہیں، امی..... بھلا یوں چھوڑیں گی مجھے، وہ تو ضرور ہی پڑھائیں گی۔ اور، یہ بھی مجھے سبق پڑھ کر اسکول جانا اچھا لگتا ہے۔ مجھے سارے سوال امی کروا کر سمجھتی ہیں۔ دوسرے بچے تو اتنے تالاف ہیں، ماسٹر صاحب بار بار سوال کرواتے ہیں، اتنا سمجھاتے ہیں پھر بھی ان کی سمجھ میں پڑھ نہیں آتا۔ ماسٹر صاحب سے خوب مار پڑتی ہے انہیں..... میں تو بہت اچھا بچہ ہوں، روز اپنا ہوم ورک کر کے جاتا ہوں اور پتا ہے بڑی ماں، سب سے زیادہ پیسے بھی تو میرے ہی پاس ہوتے ہوں۔ میرے کپڑے، میرے جو جوتے اور میرا سب سے اچھا ہے۔ جب سارے لڑکے بڑی بے چاری سی شکل بنا کر میری چیزوں کو دیکھتے ہیں تو مجھے برا ہوا آتا ہے، آتا ہے ناں بڑی ماں۔“

”ہاں بھئی، بالکل آتا ہے..... اور میرے لال تم سے اچھے کپڑے کسی اور کے کیسے ہو سکتے ہیں، تم تو شاہ جی کے بیٹے ہو..... شاہ جی کے پاس سارے گاؤں والوں سے زیادہ پیسہ ہے۔“

”ہم بہت امیر ہیں ناں بڑی ماں۔“ اردشیر کی آنکھوں میں غرور در آیا اور غریب لوگوں کے لئے حقارت کا ذہن بدل میں ابھرا۔

”ہاں ہاں، ہم امیر ہیں جو کھانا ہم کھاتے ہیں، ایسے کھانے تو ان لوگوں نے کبھی خواب میں بھی نہیں کھائے ہوں گے۔“

”اگر بابا جان، انہیں روٹی کے لئے پیسے نہ دیں تو یہ بھوکے مر جائیں..... ہے ناں بڑی ماں.....؟“ اردشیر نے غریب لوگوں کا مذاق اڑایا۔ پھر بولا۔ ”بہت سے لڑکے مجھ سے دوستی کرنا چاہتے ہیں مگر اب تو میں کسی سے دوستی نہیں کروں گا۔“

”تمہیں کرنی بھی نہیں چاہیے، دیکھو کہاں وہ غریب پھٹے پرانے کپڑے پہننے والے لڑکے اور کہاں ہمارا لہجہ بیٹا.....“

میرے سامنے سب بنانا، بھئی بچہ نہ ہوا، مصیبت ہوگئی..... ایسی دنیا سے نرالی، انوکھی ماں نہ ہم نے کبھی دیکھی نہ سنی..... اٹھا ڈاپنے اور بچے کے کپڑوں والے پیکٹس اور آئینہ جب کبھی میں تمہیں بلواؤں تو یہی کہن کر آتا۔ میرے ملنے جلنے والوں میں ایک مقام ہے میرا..... کہیں ایسا نہ ہو کہ تم میری انسلٹ کرواؤ ان کے سامنے۔“ عارف کا لہجہ تیز سے تیز تر ہوتا جا رہا تھا۔

جو یہ یہ کا جی تو یہی چاہ رہا تھا کپڑے لئے بغیر ہی پلٹ جائے مگر سوچ اور عمل میں بہت فرق ہوتا ہے۔ وہ ایسی جرأت نہیں کر سکتی تھی۔ اپنی پوزیشن کو خوب اچھی طرح سمجھتی تھی۔ پیکٹس اٹھا کر چلی آئی۔ اپنے کمرے میں آتے ہی تمام کے تمام پیکٹس فرش پر دے مارے اور بیڈ پر گر کر رونے لگی۔

”مجھ سے تو زلیخا اچھی ہے، اُسے کسی کی پروا نہیں..... اُس کے لئے ایک در بند ہوتا ہے تو سوکھ بھی جاتے ہیں، وہ بھابی کے غصے سے نہیں ڈرتی..... ان کے منہ پر ج بات کہنے کا حوصلہ رکھتی ہے مگر میں کتنی مجبور، کس قدر بے بس ہوں..... میرے لئے اس چار دیواری کے باہر بھی جہنم ہے اور چار دیواری کے اندر بھی..... میں جاؤں تو جاؤں کہاں.....؟ خدایا! تو بھائی اور بھابی کے دل میں میرے اور میرے معصوم بچے کے لئے رحم ڈال دے۔“

جب راحت کی شادی ہوئی، تب اس کے والدین اسی گاؤں میں رہائش رکھتے تھے مگر اب تین سال سے وہ اس گاؤں سے جا چکے تھے۔ راحت میکے کم ہی جاتی تھی کہ اردشیر کا دل نانا کے چھوٹے سے گھر میں نہیں لگتا تھا۔ نانی، نانا، خالائیں اور ماموں اُسے بہت پیار کرتے تھے مگر وہ پھر بھی وہاں جاتے ہی وہاں ہی کے لئے ضد شروع کر دیتا تھا۔ اس کی وجہ سے راحت نے میکے جانا ہی کم کر دیا تھا۔

اُس کے والدین اور بھائی بہن بہت کم حویلی اس سے ملنے آتے تھے اور اس کی وجہ شاہ جی کا رویہ ہی تھا۔ انہوں نے کبھی اُن لوگوں کو اہمیت نہیں دی۔ راحت کے والد سے تو سرسری انداز میں ملنے اور وہ داماد کے ہاتھوں اپنی اس سبکی پر شرمندہ تو ہوتے مگر اتنے بڑے زمیندار کو کچھ کہنے کا حوصلہ ان میں نہیں تھا۔ وہ لوگ کبھی بکھاری چکر لگاتے۔ البتہ خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ جب اردشیر شہر کے اسکول میں داخل ہوا تب بھی راحت نے خط میں اپنے باپ سے ذکر کیا تھا..... اور جب شہر کا اسکول چھوڑ کر شاہ جی نے اُسے گاؤں کے اسکول میں ڈال دیا۔ تب بھی اُس نے یہ بات انہیں لکھ دی تھی۔

راحت نہیں جانتی تھی کہ شاہ جی نے یہ سب کبری خاتون کے کہنے پر کیا ہے اور نہ ہی اسے یہ علم تھا کہ کبری کی نیت کیا ہے۔ اُس نے صرف یہی لکھا تھا کہ شاہ جی نے اسے گاؤں کے اسکول میں داخل کروا دیا اور یہ بھی لکھا تھا کہ اردشیر اس اسکول میں خوش ہے۔

اردشیر کے نانا کو شاہ کے اس فیصلے پر اُچھن ہوئی تھی مگر انہوں نے صاف طور پر جی کو لکھا نہیں، جانتے تھے وہ شوہر کے سامنے بولنے کی جرأت نہیں کر سکتی۔ دل ہی دل میں کڑھتی رہے جی کو سہمتر ہے اُسے یہ نہ کہا جائے کہ یہ اُس کے ننھے بیٹے کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ انہوں نے اتنا ہی لکھا کہ:

”جو ہونا تھا، وہ ہو گیا..... تم اپنے شوہر کی مرضی کے خلاف نہیں چل سکتیں۔ مگر اتنا ضرور کرنا کہ بیٹے کی پڑھائی کی طرف سے خود بھی غافل مت ہونا، اسکول میں کیا پڑھایا جاتا ہے، اس کی پوری رپورٹ روزانہ لو اور اسے گھر پر بھی پڑھاؤ۔ بے شک میرا نواسا

تائیدی۔ تب اُسے جانا ہی پڑا..... مگر پیر شیخ کر چلتا وہ اپنے غصے کا برابر اظہار کرتا جا رہا تھا۔

”مگر میں سارا اون اکیلا بھی تو بیٹھا رہتا ہوں ناں۔“ وہ چہرے کے دائیں بائیں ہاتھ رکھ کر بھولپن سے اپنی مشکل بیان کرنے لگا۔

”تو بھلا، اکیلے کیوں بیٹھے رہتے ہو.....؟ جب جی چاہے ان سے بات کر لیا کرو اور جب نہ چاہے تو وہ بلا لیس تب بھی جواب نہ دیا کرو۔“

”بڑی ماں، وہ جو ماسٹر صاحب ہیں، وہ آج ہمیں پڑھا رہے تھے کہ.....“

”میں آسکتی ہوں آپا۔“ راحت دروازے پر دستک دے کر بھاری پردے کے دوسری طرف کھڑی اجازت طلب کر رہی تھی۔ ماں کی آواز ارد شیر نے بھی سن لی تھی..... اور سمجھ گیا یقیناً اُسے ہی ڈھونڈنی ہوئی اُدھر آئی ہوں گی کسی نئے حکم کے ساتھ اور اس خیال کے ساتھ ہی موڈ خراب ہو گیا۔ خود کو سو یا ہوا ظاہر کرنے کے لئے جھٹ سے آنکھیں بند کر کے کبرئی کے قریب لیٹ گیا۔

”آؤ راحت، بیٹھو..... کہو کیسے آتا ہوا.....؟“ کبرئی خاتون نے ہمیشہ کی طرح اخلاق برتا۔

”نہیں آپا، بیٹھوں گی نہیں، میں تو اسے دیکھنے آئی تھی اور خوب جانتی ہوں، میری آواز سن کر سوتا بن گیا ہے۔“

یہ بات سن کر ارد شیر نے آنکھیں کھول دیں اور بولا۔

”نیند تو مجھے اصل میں بھی آرہی ہے ناں۔“

”کوئی نیند ویند نہیں آرہی تمہیں، میں نے نماز پڑھنے کے لئے کہا تھا اور تم ادھر آگئے ہو..... وقت نکلا جا رہا ہے، فوراً اٹھ جاؤ۔“

”میں بس ابھی ہی آیا تھا۔“ ارد شیر نے مری مری آواز میں جھوٹ بولا۔

”جب بھی آئے تھے، نماز تو نہیں پڑھی تم نے۔“ اب وہ راحت کی بات کے جواب میں کیا کہتا..... وہ سچ ہی کہہ رہی تھیں۔

”بہت بگڑ گئے ہو تم، میری بات سننا تو بالکل ہی چھوڑ دیا ہے۔“

”یوں مت کہو راحت، ہر بات تو مانتا ہے تمہاری.....“ کبرئی نے ارد شیر کی سائیڈ لی۔

”اب اٹھو گے یا میں خود تمہیں بستر سے اتاروں.....؟“ راحت نے کڑے تیوروں کے ساتھ بیٹے کی طرف دیکھا۔

”بڑی ماں، بچائیں مجھے امی سے۔“ وہ اس سے لپٹ گیا۔

”ارد شیر..... کوئی رعایت نہیں برتوں گی۔“ راحت نے سخت لہجے میں کہا۔

”ہاں بیٹے، ماں کی بات مانتے ہیں..... دیکھو وہ خود تمہیں بلائے آئی ہیں۔ جاؤ شاباش کہیں، ویسا ہی کرو۔“

ارد شیر نے منہ بنایا اور ڈھیلے سے انداز میں کبرئی سے الگ ہو کر پاؤں میں چپل ڈالنے لگا۔ اتنی دیر اس کی سستی سے تنگ آ کر راحت نے ایک دم سے جھپٹنے کے انداز میں آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑ لیا اور اس کے چپٹنے کی پرواہ نہ کرتے ہوئے، یونہی پیچ کر کھڑا کر دیا۔

”چلو جلدی سے جوتے پہنو اور میرے آگے آگے چلو۔“

”بڑی ماں.....“ اُس نے ایک بار پھر کبرئی سے مدد چاہی مگر انہوں نے پھر راحت کے کہے کی

عارفہ بیگم صبح سے ہی تیاریوں میں مصروف تھیں۔ دن کے تین بجے وہ بیوٹی پارلر گئی تھیں..... اور جب شام کو ان کی واپسی ہوئی تو اس وقت تک اکبر علی بھی گھر آ چکے تھے۔ اکبر علی نے گھر آ کر کھانا نہیں کھایا۔ صرف چائے کے لئے زلیخا سے کہا تھا اور چائے پیتے ہی وہ بھی تیار ہونے لگے تھے۔ زلیخا نے آ کر جویریہ کو بتایا اور بولی۔

”معلوم ہوتا ہے آج اپنے صاحب اور بیگم صاحبہ پھر کسی پارٹی میں جا رہے ہیں، اب اُن کی واپسی تو رات گئے ہی ہوگی۔“ زلیخا زندہ دل اور بے فکری سی لڑکی تھی۔ جویریہ کے بارے میں اب تو سب جان چکی تھی کہ صاحب کی اکلوتی بہن ہے اور جو سلوک اس گھر میں بہن کے ساتھ ہو رہا تھا۔ وہ بھی اس کے سامنے تھا، اسی لئے اسے مالک کی بہن کے ساتھ ہمدردی ہو گئی تھی۔

اور سبک ناک نقشے والی گلانی سی رنگت کی مالک جویریہ سے اسے پیاری بھی بہت لگتی تھی۔ وہ اکثر کام کاج بننا کر اس کے پاس آ کر بیٹھنے لگتی تھی۔ کبھی طلال سے اور کبھی جویریہ سے باتیں کرتی رہتی۔ اس کی وجہ سے جویریہ کا دل بھی کچھ بھل جاتا اور طلال بھی اس کے ساتھ کھیل کر خوش ہوتا تھا۔ زلیخا نے جویریہ سے کہا تھا۔ ”ان دونوں کے جانے کے بعد ہم لان میں بیٹھیں گے اور خوب باتیں کریں گے۔“

جویریہ نے بھی مسکرا کر سرشات میں ہلا دیا۔

جویریہ کا کمرہ الگ تھلک تھا، کون کب آیا، کب گیا اسے تو خبر ہی نہیں ہو سکتی تھی البتہ زلیخا نے پورا خیال رکھا، ادھر وہ دونوں گھر سے نکلے اُٹھ رہے کتنی گئی۔ جویریہ کے پاس آتے ہی طلال کو گود میں اٹھالیا اور بولی۔

”چلیں جی، جلدی سے آ جا، میں وہ دونوں چلے گئے ہیں، اب دیر سے ہی واپس آئیں گے اور اتنی دیر میں ہم خوب مزے کریں گے۔ میں اور طلال گھاس پر دوڑ لگائیں گے اور تھوڑے سے پھول بھی توڑیں گے۔“ اُس کے انداز پر جویریہ بھی مسکرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ذرا دیکھیں جی، کتنے پھول کھلے ہیں، کیسے کیسے پیارے رنگ ہیں ان کے مگر کوئی ان بے چاروں کی طرف دیکھتا تک نہیں، میرا چھوٹا سا گھر ہے اور میں نے اپنے اتنے ذرا سے صحن میں بھی کیاری بنا کر اس میں ایک پودا لگا ہوا ہے اور میں صبح کام پر آنے سے پہلے اُسے دیکھتی ہوں۔ اگر پھول کھلے تو مجھے اتنی خوشی ہوتی ہے کہ بتائیں سکتی مگر یہ کٹھنوں والے، پتا نہیں کیسے دل ہوتے ہیں ان کے..... انہیں کوئی چیز خوشی نہیں دیتی۔“

یہ جو آپ کی بھابی جی ہیں ان کے پاس اتنا زیور، اتنا کپڑا ہے مگر پھر بھی میں نے اکثر انہیں یہ کہتے سنا ہے، شام کو پارٹی ہے اور میرے پاس کوئی ڈھنگ کا کپڑا بھی نہیں ہے۔ پریشان ہو رہی ہوں کہ کیا پہن کر جاؤں گی۔ سچ بڑے ناشکرے ہوتے ہیں یہ سارے پیسے والے اور وہاں اپنے اوپر تو اتنا خرچ کر لیتے ہیں مگر ہم غریبوں کو اگر دس روپے بھی تنخواہ کے علاوہ دینے پڑ جائیں تو مصیبت ہی آ جاتی ہے ان کی جان پر.....“ جویریہ کو اس کی ہر بات سے اتفاق تھا مگر مجبوری کی انتہائی کہ وہ ہاں میں ہاں ملانے کی جرات بھی خود میں نہیں پاتی تھی۔ یہ سب کہہ کر زلیخا اٹھ کھڑی ہوئی۔

”تم اب کہاں چل دیں، کیا کوئی کام یاد آ گیا ہے۔“

”اچھو زوجی، بی بی کام اگر یاد آ بھی جائے گا تو نہیں کروں گی..... ہم لوگ کام تب ہی کرتے ہیں

جب صاحب لوگ گھر پر ہوں۔ بعد میں چاہے کتنا بھی ضروری کیوں نہ ہو، ہاتھ نہیں لگاتے اور کمر لگائیں، یہ کیوں سا ہمارا خیال کرتے ہیں جو ہم کریں اور آپ بیٹھو، میں چائے لینے جا رہی ہوں۔ بھلا اے پیارے لان میں بیٹھ کر چائے بھی نہ پئیں۔ آپ کے لئے اور اپنے لئے بڑی اچھی سی چائے لے کر آؤ گی اور اپنے طلال کے لئے بسکت..... کھاؤ گے ناں بسکت۔“ اس نے جھک کر پیار سے پوچھا۔

”میں نہیں زلیخا، یہ سب کچھ تم رہنے دو، دیکھو اگر میری بھالی کو پتا چل گیا تو وہ تمہیں تو شاید پکڑ کہیں مگر میری تو شامت ہی آجائے گی۔ پلیز تم ادھر آ کر بیٹھ جاؤ، ویسے بھی مجھے چائے پینے کی کڑ خواہش نہیں ہو رہی۔“ وہ گھبرا کر بولی۔

”اوچھوڑو جی۔ اس گھر کے ملازم روزانہ پتا نہیں کتنے بسکت کھاتے ہیں اور کتنے کپ چائے لے جاتے ہیں، اگر صاحب کو پتا چلنا ہوتا تو اب تک چل چکا ہوتا۔ آپ کیوں گھبراتی ہیں؟ یہ بسکت لے چائے تو میں لے کر آ رہی ہوں، آپ پر تو کسی طرح سے کوئی الزام نہیں آسکتا اور جی اگر آپ کو یہ خیال ہے کہ آپ کے بھائی کا نقصان ہوگا تو مجھے فکر نہ کریں، بڑا پیسہ ہے آپ کے بھائی اور بھالی کے پاس ایسے چھوٹے موٹے نقصان کچھ نہیں بگاڑ سکتے ان کا۔“ زلیخا بڑی تفصیل سے تسلی دینے کے بعد اندر چلی گئی۔

طلال لان میں ادھر ادھر بھاگ رہا تھا، وہ کچھ دیر کرسی پر بیٹھی اس کی بھاگ دوڑ دیکھتی رہی خود بھی اٹھ کر پھولوں کو دیکھنے لگی۔ گاڑی گیٹ سے اندر داخل ہوئی۔ کون ہو سکتا ہے.....؟ وہ ان دونوں کے ملنے والوں سے نہ تو واقف تھی اور نہ ہی پہچانتی تھی مگر جس نے سر اٹھا کر اور وہ آنے والے کو دیکھنے کے لئے آگے آگئی۔

آنے والے نے پھر پور نظر لیسن کمر کے ساتھ لباس میں لمبوس اس سادہ سی لڑکی پر ڈالی جس نے بے بالوں کو سیدھے سادے انداز میں باندھ رکھا تھا اور جس کے چہرے پر اُداسی کی گہری چھاپ پکلی ہی نظر میں دکھائی دے جاتی تھی۔

”کس سے ملنا ہے آپ کو.....؟“ آواز میں ملائیت مگر لہجے میں واضح بے گانگی اور ہلکی سی بے زاری بھی تھی۔

”بنگم عارف اکبر سے، کیا وہ موجود ہیں.....؟“ کبیر حسن نے آج سے پہلے شاید کبھی کسی سے اتنے نرم اور دھیسے لہجے میں بات نہیں کی تھی..... وہ رعونت اور کھر دراپن جو ان کی شخصیت کا حصہ تھا، آج جانے کہاں گم ہو گیا تھا۔

”نہیں وہ گھر پر نہیں ہیں اور واپسی میں دیر ہوگی، آپ پھر تشریف لائیے گا۔“ اس نے مروت میں بھی بیٹھنے کو نہیں کہا۔

”اچھی بات ہے۔“ انہوں نے بھی اسے حسن کی ادا جانا اور برائیں مانا۔

ان کے جانے کے بعد وہ گیٹ تک آئی اور باہر بھی جھانکا۔ گیٹ میں کانیں پتا نہیں تھا۔

”مالکوں کے جاتے ہی ملازم بھی چھٹی کر جاتے ہیں۔“ وہ یہ سوچتی ہوئی دوبارہ چلی آئی۔ مگر تھوڑی دیر بعد اسے پھر کسی مہمان کو بھائی اور بھالی کی غیر حاضری کی اطلاع دینے کے لئے جانا پڑا کہ جانتی تھی اب پھر گیٹ پر کوئی موجود نہیں ہوگا۔

”اتنا.....؟“ گاڑی سے برآمد ہونے والی شخصیت کو دیکھ کر اس کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ خوفزدہ ہرنی کی مانند چاروں طرف دیکھا اور چھپنے کی جگہ تلاش کی۔ اس سے پہلے کہ وہ واپسی ہوئی اور اس کی

نظروں میں آئے بغیر چھپ جاتی، وہ نہ صرف اُسے بلکہ اس کی سرا سبکی کو بھی دیکھ چکا تھا۔ امتیاز نے سیٹی سے اپنی خوشی اور جراتی کا بیک وقت اظہار کیا اور اس کی جانب بڑھتے ہوئے بولا۔

”یہ تو سوچا بھی نہیں تھا کہ آج یہاں تم سے ملاقات ہو جائے گی۔ اگر پتا ہوتا تو ذرا اہتمام سے تیار ہو کر آتے۔“ وہ جتنا چپتا چاہ رہی تھی، وہ اسی قدر قریب آ رہا تھا اور جو یہ پر اس کی باتیں، اس کا انداز خوف طاری کر رہا تھا۔

”اف، یہ شخص اتنے سالوں میں بھی اتنا ہی گھٹیا ہے، ذرا بھی نہیں سنبھلا۔“

”کیسی ہو، سنا تھا جن کی خاطر آپ نے ہمیں ٹھکرایا تھا، اپنے بھائی اور بھالی کی بات رد کی تھی، وہی وفانہ کر سکے، زندگی دغا دے گئی ان کی چیخ..... بڑا افسوس ہوا تھا سن کر۔“ امتیاز کے انداز میں افسوس نہیں طنز ہی طنز تھا۔

جو یہ یہ کادل تیزی سے دھڑک رہا تھا..... وہ امتیاز کی طرف دیکھنے کی روادار نہ تھی..... مگر پھر بھی محسوس کر رہی تھی کہ اس وقت وہ کن نظروں سے اسے گھور رہا ہے..... اور گھبرائے ہوئے انداز میں دوپٹہ اپنے گرد اچھی طرح لپیٹے پریشان، بے بس کھڑی تھی۔

”تم تو پہلے سے بھی حسین ہو گئی ہو..... حالانکہ سنا تھا، ایک بیٹے کی ماں بن گئی ہو مگر سچ کہتا ہوں، حسن کا رنگ ہے کہ پہلے سے بھی نکھر پڑتا ہے۔ یاد ہے پہلے بھی نہیں دیکھتے ہی چھوٹے کو بے تاب ہونے لگتا تھا اور آج بھی دیکھتے ہی بے چین ہو گیا ہوں۔“

اس کی بات سن کر بت نی کھڑی جو یہ جیسے ہوش میں آگئی۔ نفرت سے اس کی طرف دیکھا اور بجلی کی تیزی سے پلٹ کر جانے لگی..... وہ تہتہ لگا کر بس پڑا اور بولا۔

”آہ..... تیری ہر ادا آج بھی ظالم ہے اور دیکھ تو میرا دل بھی وہی ہے، تیرے لئے میرے پاس پیاری پیار ہے..... محبت ہے..... عشق ہے..... جنون ہے..... مگر یہ کیا ظلم ہے کہ تم میری محبت کی قدر نہیں کرتیں..... تم مجھے ایک بار ٹھکرا چکی ہو، مگر اب ایسا نہ کرنا، ورنہ میں جی نہیں پاؤں گا..... مجھے پہچانو، مجھے سمجھنے کی کوشش کرو میری جان..... اور مجھے یقین ہے، اس بار تم دھوکا نہیں کھاؤ گی، مجھے سمجھ لو گی، میرا پیار تمہارے دل میں اپنل چمادے گا، کیونکہ تمک کہہ رہا ہوں ناں میں۔“ وہ از حد بے باکی سے کہہ رہا تھا۔

”دور رہو مجھ سے.....“ اس کی آنکھوں کی بے باکی، لہجے کی آوارگی، جو یہ پر دہشت سوار تھی، اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس طرح اس آوارہ مزاج شخص سے بچھا چھڑائے۔

”تم شاید خوفزدہ ہو مجھ سے..... حالانکہ میں برا آدمی نہ پہلے بھی تھا اور نہ اب ہوں..... تم بہت بھولی ہو، تم سمجھ ہی نہیں سکتی زندگی کے تقاضوں کو، آؤ میں سمجھاتا ہوں تمہیں۔“ اس نے ہاتھ جو یہ کی طرف بڑھایا۔

”میں نے تم سے کہا ہے کہ دور رہو مجھ سے۔“ وہ خطرے کو محسوس کر رہی تھی..... اور ساتھ ہی سوچ رہی تھی، ابھی تو امتیاز کو یہ علم نہیں کہ بھائی اور بھالی گھر پر نہیں تو بے باکی کا یہ عالم ہے، جب اُسے پتا چلے گا کہ میں گھر پر کیلی ہوں تو پھر کیا ہوگا.....؟“

وہ بھاگ کر کہیں چھپ جانا چاہتی تھی اور برابر اسی کوشش میں تھی مگر امتیاز بھی خوب سمجھ رہا تھا اور وہ اسے ایسا کوئی موقع دیتا نہیں چاہتا تھا۔

گئی۔ ”زیلخا، تم میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ تم بغیر کہے ہی دل کا حال جان لیتی ہو اور اس لئے آج میں تمہیں انعام دینا چاہتا ہوں۔ جاؤ پہلے یہ دیکھ کر آؤ کہ فرج میں کیا کچھ موجود ہے۔۔۔۔۔ اصل میں آج کھانا بھی ادھر ہی کھانے کا موڈ ہو رہا ہے ناں۔۔۔۔۔“ وہ زیلخا کو یہاں سے ٹالنا چاہ رہا تھا حالانکہ آج سے پہلے جب بھی عارفہ بیگم کی طرف آتا تو جو اس نوجوان ملازمہ پر ہی رہتی۔

جو یہ کہ چہرے پر چھائے بے بسی اور خوف کے سائے، امتیاز سے گریز اور آنکھوں میں زیلخا سے یہ التجا کہ یہیں رک جاؤ، مجھے اکیلا چھوڑ کر دوبارہ چکن میں مت جاؤ۔۔۔۔۔ یہ سب زیلخا کے سامنے ہی تو تھا۔ وہ کوئی دودھ پیتی بچی تو نہیں تھی۔ خوب سمجھ رہی تھی اور اسے ترس بھی آ رہا تھا اس پر۔۔۔۔۔ اُس نے چائے کے برتن لان میں کئی ٹیبل پر رکھ دیئے اور امتیاز سے بولی۔

”صاحب، آپ وہی ہیں ناں جن کی بیگم کچھ موٹی سی ہیں۔“
”ہاں ہاں مگر کیوں؟“ تمہیں اس وقت وہ کہاں سے یاد آگئی۔۔۔۔۔؟“ بیوی کا ذکر سن کر امتیاز نے تیوری چڑھا کر پوچھا۔

”وہ جی، کوئی خاص بات نہیں، آپ چائے پی لیں آرام سے، اگر میں نے پہلے بات بتادی تو پھر آپ چائے نہیں پی سکیں گے۔“
”ہیں، ایسی کیا بات ہے۔۔۔۔۔؟“ شوگر پاٹ دوبارہ میز پر رکھ کر وہ پوری طرح اُس کی جانب متوجہ تھا۔

”بات یوں ہے کہ جی ابھی ابھی جب میں اندر تھی تو فون آیا تھا آپ کی بیگم کا، آپ کا پوچھ رہی تھیں۔ اب مجھے تو اس وقت تک یہ پتا نہیں تھا کہ آپ ادھر ہی موجود ہیں تو میں نے یہ کہہ دیا کہ ادھر تو آئے ہی نہیں۔“

”ہاں، یہ تم نے اچھا کیا شاہاش۔۔۔۔۔“ امتیاز کے چہرے پر اطمینان اور مسکراہٹ دوڑ گئی۔
”آگے بھی تو سنیں جی، انہیں یقین ہی نہیں آیا، ایک دم سے اتنے غصے میں آ گئیں۔۔۔۔۔ مجھے بھی بڑا ڈانٹا کہنے لگیں، مجھے کسی پر اعتبار نہیں، میں خود ادھر آ کر دیکھتی ہوں۔“

”ایس۔۔۔۔۔ اچھا، یہ کہا اُس نے؟“ مگر اسے یہ پتا کیسے چلا کہ میں ادھر آیا ہوں۔“ اُس نے زیر لب کہا پھر دل میں سوچا۔

”مضروب۔۔۔۔۔ چند روز پہلے جب میں نے عارفہ آپا سے فون پر بات کی تھی اور ہماری گفتگو کے دوران بار بار جو یہی کا ذکر ہوا تھا، فرمانہ نے سن لیا ہوگا۔ عجیب گھمنڈی اور خطی عورت ہے، اس کا بس چلے تو میرے پاؤں میں زنجیر ڈال کر اپنے پٹنگ کے پائے کے ساتھ باندھ لے۔۔۔۔۔ اُف! یہ زمیندار تانپ لوگ بھی کس قدر جاہل و غور ہوتے ہیں، بات بات پر باپ بھائیوں سے پٹائی اور قتل کی دھمکیاں، اپنی زمینوں اور جائیدادوں کی شو۔۔۔۔۔ سوچا تھا دولت میں کھیلوں گا مگر یہاں تو شادی کروا کے جان عذاب میں آگئی ہے۔“

”ویسے جی، آپ کی بیگم ہیں بڑی چیز۔۔۔۔۔ بڑا رعب ہے جی آپ پر ان کا، جب وہ آپ کے ساتھ ادھر آتی ہیں تو آپ صاحب نہیں، کچھ اور ہی چیز لگتے ہو جی۔“ زیلخا نے عجیب الہڑپن سے بھر پور مذاق

”گزر رہے وقت میں تم نے تو کبھی مجھے یاد بھی نہیں کیا ہوگا۔۔۔۔۔ اور ہمارا یہ حال کہ ہم کبھی آپ کو بھول ہی نہیں سکے سرکار۔“

امتیاز کا جملہ تو عامیانہ تھا ہی مگر اس سے کہیں زیادہ گھٹیا بولنے کا انداز تھا۔۔۔۔۔ جو یہ کہ جو جھرجھری سی آگئی۔ وہ اب یہ تو سمجھ ہی چکی تھی کہ امتیاز جیسے شاطر کو چمکے دے کر نکل جانا اس کے لئے ممکن نہیں۔ لہذا اب ایک ہی جگہ قدم مضبوطی سے جمائے کھڑی تھی اور چہرے کا رخ امتیاز کی جانب سے پھیر رکھا تھا۔
”یقین مانو تمہارے شوہر کی وفات کا سن کر ہمیں تو دکھ ہوا ہی تھا مگر ہم سے کہیں زیادہ صدمہ ہماری بیگم کو تھا۔۔۔۔۔“ وہ قہقہہ لگا کر فٹس پڑا۔

”جو یہ کہ کمزور اور بے بس تھی، وہ اس بات پر اپنے غصے کا اظہار نہ تو لفظوں میں کر سکتی تھی اور نہ ہی طمانچوں سے اس کا منہ لال کرنے کی جرأت خود میں پاتی تھی مگر دلی نفرت اور خفگی کا رنگ چہرے پر واضح طور پر دیکھا جاسکتا تھا۔ امتیاز بھی ایک ہی ڈھٹ تھا۔ اس کی ناراضگی اور بیزاری کے باوجود وہ بلا کی طرح اُس کے سر پر موجود تھا اور نلنے کے ابھی کوئی آ جا نہیں تھے۔

”مما۔۔۔۔۔ یہ دیکھیں۔“ طلال ہاتھ میں ایک بھول پکڑے جو یہ کہ پاس چلا آیا۔
”اوہ۔۔۔۔۔ یہ بیٹا ہے تمہارا۔۔۔۔۔؟ تم پر ہی گیا ہے، اس لئے مجھے اچھا لگ رہا ہے۔“
”یہ کون ہیں ممما۔۔۔۔۔؟“ طلال نے امتیاز کی جانب اشارہ کیا۔

”آہ۔۔۔۔۔ ہمارا کیا پوچھتے ہو لعل بوائے، بڑی ٹریڈی ہوئی ہے ہمارے ساتھ۔۔۔۔۔ بھئی ہونا تو ہمیں تمہارا ڈیڈی تھا مگر ہائے قسمت کے کھیل، ڈیڈی بنتے بنتے ہم تمہارے انگل بن گئے۔“ جو یہ کہ نے جھک کر بیٹے کو اٹھایا اور قدم آگے بڑھانا چاہے۔

”لو جی، پی بی بی! چائے آگئی اور ساتھ میں بسکٹ بھی۔۔۔۔۔ میں جلدی آ جاتی پر ہوا یہ کہ ادھر کچن میں۔۔۔۔۔“ زیلخا اپنی رو میں بولنے بولنے ادھر آ رہی تھی۔ پھر اچانک نظر امتیاز پر پڑی تو بات درمیان میں چھوڑ دیں۔

”صاحب۔۔۔۔۔ تم کب آئے۔۔۔۔۔؟ سالانا لیکم۔۔۔۔۔“ امتیاز کو دیکھتے ہی جھٹ سے سلام جھاڑ دیا مگر اس کے انداز میں وہ اب نہیں تھا جو ملازم، مالک اور مالک کے ملنے والوں کا کرتے ہیں۔

”علیکم السلام۔۔۔۔۔ لاؤ بھئی، چائے لاؤ جلدی سے، ہمیں بھی طلب ہو رہی تھی اور جب ساتھ میں ان جیسے ہوں تو پھر تو لطف ہی دو بالا ہو جاتا ہے۔“ اُس نے جو یہ کہ پر جھٹکا جا ہا مگر وہ تیزی سے پیچھے ہٹ

ہی جانے، اب اس کو دیکھ لو، دو نکلے کا بھی نہیں مگر پیسہ بہت ہے اس کے پاس..... میں بی بی، تمہیں کیا ہوا، اتنی پہلی کیوں ہو رہی ہو.....؟“ اُس نے اب جا کر جویریہ کی جانب دیکھا اور پریشانی سے اس کی جانب لپکی، سہارا دے کر کرسی تک لائی اور اسے بٹھا کر خود نیچے بیٹھ گئی۔

بس ابھی چائے پی کر میں اس کی بیگم کوفون کرنی ہوں، اسے بتاؤں گی کہ ابھی ابھی تمہارا صاحب ادھر آیا تھا اور خواہ میں جویریہ بی بی سے باتیں کرنے کی کوشش میں لگا رہا، بس پھر گھر جاتے ہی شہت آ جائے گی اس کی، سنا ہے کسی وڈے زمیندار کی بیٹی ہے، پانچ بھائی ہیں، اور سارے کے سارے لڑاکو، غصے والے، امتیاز صاحب کا تو خون ہی خشک رہتا ہے۔ میں چائے بناتی ہوں آپ پریشان نہ ہوں، سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ اودھ، میں طلال کو بسکٹ دینا بھی بھول گئی.....“ اُس نے پلیٹ طلال کی جانب بڑھائی، پھر چائے بنانے لگی۔ اس کی باتوں سے جویریہ کو خاصا حوصلہ ہوا تھا اور وہ بھی اب سنبھل چکی تھی۔

”زیلچا تم بہت اچھی ہو.....“ چائے پینے کے دوران وہ بے حد ممنونیت کے ساتھ اس لڑکی سے کہہ رہی تھی جو تھی تو اس گھر کی ادنیٰ ملازمہ مگر اسے خود سے کہیں زیادہ با اختیار محسوس ہو رہی تھی۔

”رہنے دو چھوٹی بی بی، بھلا ہم کہاں کے اچھے ہیں..... بڑی گناہ گار ہوں جی میں، اس پیٹ کی خاطر بڑی بڑی مصیبتیں اٹھانی ہیں جی، ذرا ذرا سے پیسے کی خاطر کیا کیا جھوٹ بولے ہیں۔“

”اب جلدی جلدی چائے پیو، پھر ادھر ٹیلی فون کے پاس جا کر فون پر پڑی ہے، اس میں سے امتیاز صاحب کا فون نمبر تلاش کرو اور نمبر ملا دو پھر میں اُس کی بیگم کوفون کروں گی۔“

”چھوڑو بھی زیلچا، اب کیوں بات بڑھاتی ہو، دیکھو ناں، بلا تو ٹل گئی ہے، اب ہمیں اسے قہے کو بھول جانا چاہئے۔“

”وہ بڑا خراب آدمی ہے، بار بار ادھر آئے گا، تنگ کرے گا آپ کو، سوچ رہی ہوں، پکا بندوبست ہو جائے تاکہ اسے پھر دوبارہ سے ادھر آنے کی ہمت ہی نہ پڑے، اب تدبیر نکل رہی ہے تو کر لینی چاہئے..... ایسا موقع بار بار ہاتھ نہیں آئے گا۔“

”ٹھیک ہے، پھر جیسے تمہاری مرضی۔“ جویریہ نے اس کی بات مان لی کہ یوں بھی آج کل خود سے کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں رہی تھی، اسے خود پر اعتماد ہی نہیں تھا۔

چائے پینے کے بعد اُس نے نمبر ملا دیا اور زیلچا نے فون پر امتیاز کی بیوی فرحانہ سے کہہ دیا کہ ابھی ابھی صاحب یہاں سے گئے ہیں۔

جویریہ کو جھینے نے بلوایا تھا اور مارے گھبراہٹ کے اس کا برا حال ہو رہا تھا۔ کیوں بلایا ہے انہوں نے، جانے کیا کہیں گی..... کس طرح بات کر سکی گی؟..... وہ سب سبے انداز میں قدم اٹھانی کمرے میں آئی تھی اور دروازے سے ذرا آگے آکر رُک گئی تھی۔

”آؤ آؤ، رُک کیوں گئیں؟“ چیز پر ایک شان سے بیٹھی جھینے نے انگوٹھیوں سے سجا ہوا ہاتھ اٹھا کر گھر درے لچے میں کہا..... وہ اپنی گھراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کرتی آگے آئی اور ہاتھ اٹھا کر انہیں سلام کیا، انہوں نے جواب دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ بہت گہری نظر سے اس کا جائزہ لینے کے بعد معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ اپنی چھوٹی بہن عارفہ کی جانب دیکھا اور بولیں۔

اُڑایا اور ہنسنے لگی۔ امتیاز ذول بھیک اور ہلکی شخصیت کا مالک تھا، ہر حسین، جوان، عورت چاہے وہ گھر کی معمولی ملازمہ ہی کیوں نہ ہو..... اُس کی نظر کو بٹھا جاتی تھی..... عارفہ کے ہاں آتا تو اُس کی جوان اور نمکین حسن کی بالک الہری نوکرانی پر خاص عنایت ہوتی..... زیلچا کا بچپن ہی ان کوٹھیوں میں کام کرتے گزرا، یہیں جوان ہوئی، وہ ان نظروں کو اچھی طرح پہچانتی تھی اور غربت کہتی تھی، اگر تھوڑی بہت آمدنی ہو سکتی ہے تو چلو ہمارا کیا کام ہے، ہاں البتہ عزت، آبرو کے معاملے میں بڑی پکی تھی، اُس کے آگے بڑی سے بڑی دولت کو بھی گھرا سکتی تھی۔

جویریہ کی موجودگی میں زیلچا نے بیوی کے حوالے سے جس طرح مذاق اڑایا، امتیاز کو سبکی محسوس ہوئی اور اُس نے زیلچا کی طرف آج پہلی بار پیار بھری نظروں کے بجائے کھا جانے والے انداز میں دیکھا۔

”بیوی پر تو جی آپ کا زور چلتا نہیں اور اُس کا غصہ مجھ پر اتار رہے ہیں، سچ ہے جی غریب پر سب کا بس چلتا ہے، پر جی کچھ غلط میں نے بھی نہیں کہا، اسی کوٹھی میں کام کرتی ہوں، جو دیکھتی ہوں، سکتی ہوں، وہی کہتی ہوں۔ جب بھی بیگمات یہاں اکٹھی ہوتی ہیں، آپ کا مذاق اڑاتی ہیں۔ بڑے عجیب و غریب سے تو نام رکھے ہوئے ہیں انہوں نے آپ کے، میں تو سن کر بڑا ہنستی ہوں، اس وقت یاد نہیں آ رہے ہیں ورنہ ضرور آپ کو بھی بتاتی۔“

”بہت بولنے لگی ہو تم، لگتا ہے گھر والوں نے زیادہ سرچڑھا رکھا ہے۔ میں شکایت کروں گا آپ سے تمہاری، اب جاؤ اور آیا کو بتاؤ کہ میں آیا ہوا ہوں.....“ شرمندگی میں اسے فاصلے پر کھڑی جویریہ اب بالکل ہی نظر نہیں آ رہی تھی..... اور نہ ہی وہ طلال کو دیکھ رہا تھا جو ماں کی گود سے اُتر کر ایک بار پھر لان میں بھاگنے لگا تھا اور جویریہ بیٹے کی وجہ سے ہی جاتے جاتے رُک گئی تھی۔

”آپ کی آپا تو گھر پر نہیں ہیں۔“ زیلچا نے بتایا۔

”بھائی جان تو ہوں گے۔“

”نہیں، وہ بھی گھر پر نہیں ہیں، دونوں اکٹھے ہی صبح سویرے نکلے تھے، اب تک تو واپس آنے والے ہوں گے۔ اصل میں جی اب یہ صاحب کی بہن ادھر آگئی ہیں تو صاحب کو ان کا بڑا خیال رہتا ہے۔ وہ اب رات کو در تک گھر سے باہر نہیں رہتے جلدی گھر آ جاتے ہیں۔“

مگر وہ تو کچھ اور ہی کہہ رہی تھی اور بھلا ملازمہ کو خواہ جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے۔ عارفہ تیز عورت ہے، ضرور کوئی چال ہوگی جیسی غلط بیانی سے کام لیا۔ صورت حال مایوس کن تھی اور زیلچا بھی بتا رہی تھی کہ..... ”صاحب اور بیگم صاحبہ گھر لوٹنے ہی والے ہیں۔“ اُس نے بے حذر ہو کر چائے کپ میں چھوڑ دی اور اٹھ کھڑا ہوا..... یہ کہتا ہوا کہ ”پھر کسی روز آؤں گا۔“

”ہاں جی، چلنا ہی چاہئے آپ کو، کوئی بتائیں آپ کی بیگم واقعی ادھر پہنچ جائیں۔“ زیلچا نے جس انداز میں یہ بات کی، امتیاز کے پاس اسے سمجھنے کے لئے وقت نہیں تھا بلکہ خیال آ رہا تھا، ایسا ہونا ناممکن بھی نہیں۔

”ہونہہ.....“ اس کے جانے کے بعد زیلچا کی نفرت سے منہ سکیڑا، پھر بولی۔ ”رب سائیں کی رب

”تم تو کہتی تھیں، ایک بیٹا بھی ہے اس کا، مجھے تو یہ پہلے سے کہیں زیادہ تنگ اور اسرارٹ دکھائی دیتی ہے۔“

ہاں آپا، کہتی تو میں بھی جچ ہوں، واقعی ایک بچہ تو ہے اس کا۔“

”مگر میں ہی کیا اس بات کا تو کوئی بھی یقین نہیں کرے گا عارفہ۔“ وہ سر سے پاؤں تک بغور دیکھ رہی تھیں اور ذہن بھی تیزی سے کام کر رہا تھا۔

”آپا۔۔۔ اب تو یہ شادی شدہ زندگی بھی گزرا چکی ہے مگر پھر بھی انداز وہی ہیں، چار لوگوں میں سے نہیں سکتی، بات کرتے ہوئے بھی گھبراتی ہے، اُٹکتے لگتی ہے، اسی وجہ سے میں تو اُسے اپنے ملنے والوں کے سامنے لاتی ہی نہیں ہوں۔“

”اوہو۔۔۔ عارفہ۔۔۔ عارفہ کسی بات کرتی ہو بھی، تم دیکھو تو یہ بھلا کیسے بدل سکتی ہے۔۔۔ مڈل کلاس کے بندے سے یہاں رچا پاتا تھا اس سندری نے، میں تو شکر کرتی ہوں فکر ٹھیک ٹھاک رہا اس کا روزہ مڈل کلاس کی عورتیں تو بہ۔۔۔ بچہ تو دور کی بات، شادی ہوتے ہی اُن کے بوری ہو جاتی ہیں۔۔۔ ہونہر، نان سینس۔“ ہاتھ میں پکڑا میگزین سینئر نیل پر اُچھال کر انہوں نے ہونٹ سیڑھے پھر کچھ دیر بعد عارفہ سے بولیں۔

”تم اسے اپنے ساتھ ساتھ رکھا کرو۔۔۔ آنے جانے والوں سے ملوایا کرو۔۔۔ آخر تمہارے شوہر کی بہن ہوتی ہیں محترمہ۔۔۔ لوگ تو اس حوالے کو ہمیشہ یاد رکھیں گے، اپنی کیٹس سکھاؤ اسے روزہ بڑی لمبی اُڑوائے گی تمہاری ہائی سوسائٹی میں۔۔۔ لوگ سمجھ جائیں گے کہ اکبر صاحب جدی پشتی رئیس نہیں، نودد لیتے ہیں۔“

”اوہ آپا۔۔۔ میں اس کے ساتھ سر نہیں کھا سکتی۔۔۔ اس کو انسان بنانا کچھ آسان نہیں ہے، اس سے بہتر یہی ہے کہ لوگوں کے سامنے لاؤں ہی نہیں۔“

”تم جاؤ جویریہ۔۔۔“ گھینے نے تنگم بھرے انداز میں کہا، وہ جو ہاتھ باندھے، مودب سے انداز میں کھڑی خود پر ہونے والے تبصرے بڑے ضبط سے سن رہی تھی، فوراً واپس ہو گئی۔

”تم سے مجھے اس قدر حیا کی توقع ہرگز نہیں تھی عارفی۔“ اس کے جانے کے بعد گھینے نے کہا۔

”کیا مطلب، میں سمجھی نہیں۔“

”دیکھو، سیدی سی بات ہے، پیسہ کتنا بھی ہو مگر کسی دوسرے پر خرچ کرنا کچھ آسان نہیں اور یہاں تو معاملہ ایک کا نہیں، دو کا ہے، آج اس کا بچہ چھوٹا ہے مگر کل۔۔۔ اُس کا بڑا بھی تو ہوتا ہے، تمہارا اپنا کوئی بچہ نہیں ہے، اکبر بھائی اس بچے پر ہی خرچ کریں گے۔ سوچو کیا یہ سب کچھ تمہارے لئے قابل قبول ہوگا عارفی۔“

”نہیں، ہرگز نہیں۔۔۔ اور اسی لئے میں نے دونوں کو الگ تھلگ کر دیا ہے۔ ایک گھر میں رہنے ہوئے بھی دنوں تک آنا سامنا نہیں ہوتا بہن بھائی کا۔“

”مگر اس سے مسئلہ حل نہیں ہوتا۔۔۔ وہ جوان ہے اور بہت حسین بھی، میں تو کہتی ہوں چلتا کرو کسی کے ساتھ۔“

”بات تو آپ کی ٹھیک ہے آپا، مگر کس کے ساتھ، وہ ایک امتیاز ہی تھا مگر اس کی شادی تو جنات کی

فیملی میں ہو گئی ہے۔ سچ فرحانہ بیگم ذرا بھی ڈھیلی ہوتی تو میں فوراً امتیاز سے نکاح پر عہد دیتی جا۔ یہ کافر اب تو وہ سنتے ہی کانوں کو ہاتھ لگائے گا اور صاف انکار کر دے گا۔“

”چھوڑو تم امتیاز کو، ہمیں اور بہت سے مل جائیں گے۔ حسن میں بڑی طاقت ہوتی ہے سسر، اور یہ مرد لوگ، ان کا کوئی دین ایمان نہیں ہوتا، پھسلتے دیر نہیں لگاتے، کسی بھی عمر رسیدہ کو اس کی ایک جھب دھا دو اور اس کی شادی کا ارادہ بھی ظاہر کر دو، اپنی عمر اور بچوں کی تعداد بھول جائے گا۔ یاد رہے گا تو صرف اتنا کہ مذہب نے مرد کو چار شادیوں کی اجازت دی ہے۔ میں دعویٰ کرتی ہوں کہ کھنچا چلا آئے گا۔“ گھینے بیگم نے عجیب سے انداز میں کہا۔

”بس پھر آپا، آج سے میں یہ کام آپ کے ذمہ لگاتی ہوں۔۔۔ اس کی شادی آپ نے کروائی ہے جچ میں نے تو اس طرح سوچا ہی نہیں تھا، اچھا ہوا آج آپ آئیں اور اس کا مسئلہ بھی حل ہوا۔“

”ٹھیک ہے، اب یہ میرا مسئلہ ہے، تمہیں وہی کرنا ہوگا جو میں کہوں گی۔“

”میں تیار ہوں، آپ کہیں۔“ عارفہ قریب کھٹک آئی۔

”دیکھو، یہ تو سامنے کی بات ہے کہ جویریہ آسانی سے دوسری شادی کے لئے راضی نہیں ہوگی۔“

”ارے ہاں، اس طرف تو میں نے سوچا ہی نہیں۔“ عارفہ کچھ فکر مند نظر آنے لگی۔

”پریشان کیوں ہوتی ہو، سارے بندوبست کروں گی، تمہیں اب میرا ملے میں اس سے سختی برتا ہے، اتنی کہ وہ اس گھر سے فرار کے بارے میں سوچنے لگے۔ جبکہ تمہارے مقابلے میں میرا رو بہاب اس کے ساتھ بہت پیار بھرا اور ہمدردانہ ہوگا۔ یوں وہ میری ہر بات کو اپنے لئے درست سمجھنے لگے گی اور ہم دونوں مل کر اسے چاروں طرف سے گھیر لیں گے۔“

”آپا۔۔۔ میں تو صرف اتنا جانتی ہوں کہ آپ جو بھی فیصلہ کریں گی، وہ درست ہوگا مجھے آپ پر پورا بھروسہ ہے۔“

”ٹھیک ہے پھر تم یوں کرنا کہ پرسوں میرے ہاں باربی کیو پارٹی پر اپنے ساتھ اُسے بھی الٹی آنا اور سنو، اس کا بیٹا ساتھ نہیں ہونا چاہئے۔ لباس میک اپ بہت اچھا ہونا چاہئے۔“

”ان باتوں کی فکر مت کریں۔ میں سب سمجھتی ہوں بانی بیٹے کا یہ ہے کہ اُسے تو یہ اکیلا چھوڑتی ہی نہیں، ذرا سی دیر کے لئے بھی الگ ہو جائے تو گھبراتی ہے مگر خیر میرے آگے بول نہیں سکے گی۔ ساتھ لے آؤں گی۔“

”اچھا ٹھیک ہے، میں ذرا اس سے مل کر آتی ہوں، تم یہیں بیٹھو۔“ گھینے اٹھ کھڑی ہوئی۔

جب وہ جویریہ کے کمرے میں آئی تو وہ طلال کو سلا رہی تھی۔ اسے اب دیکھ کر اتنی حیران ہوئی کہ کچھ بول ہی نہ سکی۔

”یہ تمہارا بیٹا ہے۔۔۔؟ بہت پیارا ہے، نام کیا ہے اس کا۔۔۔؟“

”اس کا نام طلال ہے۔“ جویریہ کی آواز انک رہی تھی۔

”جویریہ، مجھے ناصر کی موت کا بے حد افسوس ہے۔۔۔ میں بھی بیوہ ہوں اور تمہارے اب ڈکھ کو

عارفہ سے کہیں زیادہ محسوس کر سکتی ہوں۔ عارفہ کے سامنے میرا جو بھی رویہ تھا، وہ جھوٹ تھا۔ اصل میں میری بہن تمہیں پسند نہیں کرتی۔ اپنے گھر میں رکھنے کو تیار نہیں ہے۔ میں نے بہت سمجھایا، نہیں بانی، اُلٹا مجھ پر بھڑنے لگی، جب ہی میں اُس کے سامنے تم سے کوئی بات نہ کر سکی۔“

اُسی ہی ہمدردی پا کر تنہا لوق ووق صحرا میں کھڑی جویریہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اُس نے اس فریب کو جھجکھکھایا اور دل کھٹکنے لگا۔

گنیمت دیر تک بیٹھی اسے تسلیاں دیتی رہی اور جویریہ کو یہ احساس نہیں ہوا کہ ہمدردی کی چادر میں لپٹ کر وہ ایسے فقرے اس کے کانوں میں اغذیل رہی ہے، جو تنہائی کے احساس کو مٹانے کے بجائے اس کو مزید بڑھا رہے ہیں جو خوف میں اضافہ کر رہے ہیں اور اسے مزید ہراساں کر رہے ہیں۔ جاتے جاتے وہ کہہ گئی کہ عارفہ اور اکبر کے ساتھ میرے ہاں پارٹی پر ضرور آنا، اتنے پیار سے کہنے پر جویریہ انکار نہ کر سکی اور دل نہ چاہنے کے باوجود اُس نے گنیمت کے ہاں آنے کا وعدہ کر لیا۔

گنیمت کی آمد کے دو روز بعد جب عارفہ نے دوپہر کے وقت اسے بلا بھیجا تو اسے بالکل یاد نہیں تھا کہ آج اُسے عارفہ کے ساتھ اُن کی بڑی بہن کے ہاں پارٹی پر جانا ہے۔ مجھے اس وقت کیوں بلالیا؟ یہ نائم تو ان کے آرام کا ہوتا ہے۔ وہ ہمیشہ کی طرح بھائی کا سامنا کرتے ہوئے گھبراہٹ میں تھی۔

”کہہ رہی تھیں جویریہ سے کہنا جلدی آئے۔“ زلیخا نے باقی کا پیغام بھی دے دیا۔

”اچھا۔ کیا بھائی جان بھی گھر پر ہیں؟“ اُس نے بے دلی سے دوپہر برابر کرتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں جی، وہ تو ابھی نہیں آئے۔“

”کیا کوئی ملنے والا آیا ہے؟“ میرا مطلب گنیمت آیا یا کوئی اور۔“

”اس وقت تو بیگم صاحبہ اکیلے ہیں۔“

”اچھا پھر میں جاتی ہوں، تم طلال کا خیال رکھنا، سو رہا ہے، سوتے میں ڈر جاتا ہے۔ میں زیادہ دیر نہیں لگاؤں گی۔“

”میں بیٹھ جاتی ہوں۔۔۔۔۔ جب تک آپ آنہیں جائیں گی، یہیں بیٹھوں گی۔“ جویریہ اس کا شکریہ ادا کر کے جب عارفہ کے پاس پہنچی تو عارفہ۔۔۔۔۔ ہلکے سے گولڈن کام والی سیاہ ساری سامنے پھیلائے تنقیدی نگاہ سے دیکھ رہی تھی۔

”بھابی، بلایا تھا آپ نے؟“

”ہاں، وہ ایسا ہے کہ آج شام کو آپا کے یہاں پارٹی ہے۔۔۔۔۔ ابھی کچھ دیر پہلے فون آیا تھا ان کا، کہہ رہی تھیں جویریہ سے بھی آئے کو کہا تھا۔“

”جی بھابی، انہوں نے کہا تو تھا لیکن میں سوچ رہی ہوں گھر پر ہی رُک جاؤں۔“

”کیوں؟“ گھر پر کیوں رُک جاؤ۔۔۔۔۔ انہوں نے اگر بلایا ہے تو تمہیں جانا چاہئے۔۔۔۔۔ لوگوں میں اُٹھو بیٹھو کی تو دنیا میں رہنے کا سلیقہ بھی آئے گا ورنہ اس طرح ہم کب تک تمہیں سنبھال کر رکھیں گے، ب تم پتی تو ہو نہیں، خود بھی سمجھ دار ہو مگر جانے کیوں اس طرح بی ہو کر تھی، میں نے کہہ دیا ہے، تم شام کو ضرور ہم دونوں کے ساتھ جاؤ گی، یہ ساری دیکھو، کیسی ہے؟“

”اچھی ہے، کہا میں طلال کو ساتھ لے جا سکتی ہوں۔۔۔۔۔؟“

”نہیں، ہرگز نہیں۔۔۔۔۔ کمال کرتی ہو تم بھی۔“ عارفہ نے غصے کے عالم میں ساری ایک طرف پھینکتے ہوئے اُونچی آواز میں کہا۔

جس وقت وہ اکبر علی اور عارفہ بیگم کے ساتھ گنیمت کے ہاں پہنچی، شام رات میں پوری طرح ڈھل چکی تھی۔ گنیمت کے ہاں اس کے اندازے سے کہیں زیادہ لوگ موجود تھے۔ جویریہ کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اور وہ خاصی گھبرائی ہوئی تھی۔

ستم یہ کہ سب سے پہلے ملاقات بھی امتیاز سے ہو گئی بلکہ وہ خود ہی ان لوگوں کو لان کی طرف بڑھتے دیکھ کر تیزی سے اُن کی جانب آ گیا تھا۔ اکبر سے ہاتھ ملاتے اور۔۔۔۔۔ عارفہ سے باتیں کرتے ہوئے اس کی بے باک نگاہیں جویریہ پر پڑی جی ہوئی تھیں۔ اُس نے جویریہ کو ہمیشہ سادہ لباس اور میک اپ سے بے نیاز چہرے کے ساتھ ہی دیکھا تھا مگر آج اُس کی اتنی ج دھج تھی۔

اس وقت وہ حور معلوم ہو رہی تھی۔۔۔۔۔ سیاہ ساری میں اُس کی سفید رنگت مزید اُٹھ آئی تھی، لمبے بال سادہ چوٹی کی شکل میں پشت پر لہرا رہے تھے۔۔۔۔۔ اور کانوں میں جھولتے ہوئے آؤ پڑے۔۔۔۔۔ وہ جویریہ کے قریب آ کر کھلے لفظوں میں تعریف کرنا چاہ رہا تھا مگر اس کی بیگم فرحانہ بھی اس پارٹی میں انوائٹ تھی۔ اس وقت نظر تو نہیں آ رہی تھی مگر یہیں آس پاس ہی اور وہ جویریہ کو مخاطب کرنے کا ریسک نہیں لے سکتا تھا۔ گنیمت آج بھی بہت محبت سے ملیں اور اس کی ج دھج کی تعریف بھی بہت کی۔

”تم تو کل میں ٹھٹ سے رہنے کے قابل ہو جویریہ یہ قسمت نے کیسا دھوکا کیا ہے تمہارے ساتھ۔۔۔۔۔ مگر امید کا دامن ہاتھ سے مت چھوڑو۔۔۔۔۔ ممکن ہے آئے والا وقت تمہاری سوچ سے بڑھ کر خوشیاں لائے۔“ وہ اس کا گال تھپک کر کسی اور مہمان کی جانب بڑھ گئیں۔

یہاں اکبر اور عارفہ کے بہت جاننے والے تھے اور ان سے ملنے کے بعد اگلا سوال جویریہ کے بارے میں ہی ہوتا تھا۔ تعریفی جملے، ناصری کے بے وقت موت کے بارے میں جو لوگ جانتا چاہتے تھے، ان کا مصنوعی سانسوں کا انداز اور پھر اس کی کم عمری، خوبصورتی اور بیوگی پر تبصرے، اس کا تو دم ٹھٹنے لگا تھا۔

”کیسے ہیں یہ سب لوگ۔۔۔۔۔ ایک خول میں بند ہر بات ہناوت سے پُر، ہر انداز سپاٹ اور بے رحم سا۔۔۔۔۔ وہ بھابی سے آنکھ پچا کر ذرا پرے ہٹ گئی اور کچھ دیر بعد خاصے فاصلے پر جا بیٹھی۔ ادھر لوگوں کی ایک محدود تعداد تھی۔ جو تھے وہ آپس کی گفتگو میں اُلجھے ہوئے اور بے حد سنجیدہ محسوس ہوتے تھے۔ اُس نے سوچا وہ یہیں بیٹھی رہے گی اور دوبارہ بھابی کے پاس نہیں جائے گی۔

جب وہ ادھر بیٹھی گھبراہٹ نظر لوگوں سے لوگوں کو دیکھ رہی تھی۔ اس وقت اُس سے کچھ ہی فاصلے پر بیٹھے گروپ میں موجود کبیر حسن نے ٹل اور شاہد ملک کی بات بغور سنتے ہوئے جب سگریٹ سلگانے کے بعد نگاہ اٹھائی تو وہ نظر کے سامنے تھی، پہلی ملاقات بہت مختصر سی رہی تھی اور اُس روز جب وہ اکبر علی کے ہاں اس سے ملے تھے، تب وہ بے حد سادہ سے لباس میں تھی جبکہ آج پارٹی میک اپ اور سجے سجائے لباس نے اسے خاصی حد تک بدل کر رکھا تھا مگر پھر بھی انہوں نے پہچانے میں دیر نہیں لگائی۔

اور دل نے بے اختیار کہا، چاہے بسین کمر کے سادہ سے لباس میں ہو چاہے بلیک کمر کی چمکتے دکتے کام والی ساڑی میں، تم ہر روپ میں ہی اچھی لگی ہو۔

”جی، بالکل وہی۔“

”وہ میری چھوٹی بہن عارفہ کبر علی کی نند ہے۔“

”کیا اکبر علی اور عارفہ بیگم بھی انوائیٹ ہیں؟“

”ہاں ہاں، میں ابھی ملوانی ہوں آپ سے، اُن کے ساتھ ہی آئی ہے۔ بہت اچھی نیچر کی مالک ہے۔ بے حد پیاری سی لڑکی ہے، سچ میں تو کہتی ہوں، میرا کوئی بھائی ہوتا تو اسے اپنی بھائی بنا لیتی۔ آج کل اکبر اور عارفہ اس کے لئے رشتے کی تلاش میں ہیں۔ ویسے تو بہت سے لوگ خواہش مند ہیں مگر جویریہ کو ذاتی طور پر سو بر شخصیت افریکٹ کرتی ہے۔ کبھی ہے کسی ہاؤ، ہو کرنے والے لڑکے سے تو ہرگز شادی نہیں کروں گی۔ اصل میں پہلے بھی ایک ٹریجڈی ہو چکی ہے اس کے ساتھ۔“

”یسی ٹریجڈی؟“ انہوں نے پوچھا۔

”بہت چھوٹی عمر میں شادی ہوئی تھی اس کی مگر بعد میں ہم بہت بچھتائے۔ اصل میں وہ لڑکا اس کے قابل ہی نہیں تھا۔ پھر وہ دنیا میں ہی نہیں رہا۔ جیسا تھا، شوہر تو تھا اس کا..... ہم سب کو وہ ہونا ایک لازمی بات ہے مگر خدا کی یہی مرضی تھی..... اور اب لوگ پھر سے رشتے لے کر آ رہے ہیں۔ ہم تو سب کو صاف بتا دیتے ہیں، دیکھیں ناں، اگر اب ہم یہ کہہ کر شادی کر دیں کہ لڑکی کنواری ہے اور شادی کے بعد جب شوہر کو پتا چلے تو کھٹ پٹ ہو، اس سے بہتر ہے، پہلے ہی بات کلیئر کر دی جائے اور آج کل کون کہہ سکتا ہے جو شادی شدہ نہیں ہے وہ.....“

”گنیمہ کا ارادہ ابھی بہت بولنے کا اور انہیں یہ سوچنے پر مجبور کرنے کا تھا کہ جویریہ کی پہلی شادی ایک معمولی سی بات ہے مگر اس سے پہلے کچھ لوگ ادھر چلے آئے اور بات ادھوری رہ گئی۔ کبیر حسن نے تو ایک معمولی سی بات پوچھی تھی کہ یہ لڑکی کون ہے؟ مگر اُن کے پوچھنے کی دیر ہی گنیمہ کا ذہن پوری طرح کام کرنے لگا تھا۔ کبیر حسن سے اچھے مراسم کی کوشش ایک عرصے سے کر رہی تھی، سوچا اگر وہ اس طرح دام میں آجائیں تو اس سے بہتر بات اور کیا ہو سکتی ہے؟“

”اب تو مجھے یہاں آئے ہوئے بہت دیر ہو گئی ہے، میرا بیٹا پریشان ہو رہا ہوگا، زلیخانے بھی اپنے گھر جانا ہوگا..... بھائی کو کسی کا احساس ہی کب ہوتا ہے، بس حکم چلانا جانتی ہیں..... امتیاز بھی یہاں موجود ہے، اگر اُسے میری تلاش کا خیال آ گیا تو بہت برا ہوگا۔“ ہاتھ میں کب سے مشروب کا گلاس تھا، وہ اپنی سوچوں میں الجھی ہوئی تھی۔ بار بار ٹائم دیکھتی اور جی چاہتا چیکے سے اٹھ کر بھاگ جائے۔ یہ گہما گہمی بے سنورے لوگ اور ان کی بے مزہ گفتگو مختلف مشروبات اور کھانوں کی خوشبو اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

پھر اُس نے جوس کا ایک بھی سپ لئے بغیر گلاس ایک جانب رکھ دیا اور بیزار کی پوری شدت کے ساتھ پکلیں اٹھا کر آس پاس نگاہ دوڑائی اور یہ دیکھ کر جمر جھری سی آگئی کہ سامنے کھڑے دو عمر رسیدہ مگر ضبیت چہروں والے مردوں کی گفتگو کا موضوع وہی تھی۔ جوں ہی اُس نے اُن کی جانب دیکھا، اُن کے چہروں پر مکررہ مسکراہٹ دوڑ گئی، جویریہ اُن کے انداز پر اپنا غصہ اور نفرت چھپا نہیں سکی۔ اُس نے بے اختیار ہونٹ سکپڑے اور ایک جھٹکے سے چہرہ دوسری جانب موڑ لیا۔

”بونہ..... یہ ہیں بھائی کی اعلیٰ سوسائٹی کے شرفاء جن کے چہرے ان کی خباثتوں کی کہانی

موجے کے سفید پھولوں کے عین سامنے وہ بیٹھی تھی اور آج بھی انہیں اُس کے چہرے پر اداسی کا چھاپ صاف محسوس ہو رہی تھی، وہ اس سارے ماحول کا حصہ ہو کر بھی اس سے الگ تھلگ دکھائی دے رہی تھی، کچھ دیر ایک ہی پوزیشن میں بیٹھے رہنے کے بعد اُس نے رُخ بدلا۔ گہری سانس لے کر واپس ہاتھ ٹھوڑی کے نیچے رکھا اور ذرا آگے کو جھکی تو لمبی چوٹی بائیں شانے سے ہوتی ہوئی اُس کی گود میں آکر گر گئی۔

جانے کیا بات تھی، اُس لڑکی کے انداز میں وہ پہلی بار اسے دیکھ کر ہی متاثر ہوئے تھے اور آج پھر جیسے ان پر اس کا طلسم چھا رہا تھا..... ہاتھ پر چہرہ نکائے وہ مومی مجسمہ معلوم ہوتی تھی۔ اب کبیر حسن کی توجہ شاہد ملک کی باتوں کی جانب نہیں تھی جبکہ شاہد ملک اپنی رو میں اب بھی پوری تفصیل کے ساتھ انہیں اپنی کاروباری انجمنوں کے بارے میں بتائے چلے جا رہے تھے۔

کبیر حسن کا تو جی چاہ رہا تھا کہ سامنے بیٹھے اس شاہکار کو ایک ٹک دیکھیں مگر وہ شاہد ملک کو اپنی غیر حاضر دماغی کامیوت بھی دینا نہیں چاہتے تھے۔ رُک رُک کر، ٹھہر ٹھہر کر گاہے گاہے وہ ایک لمحے کے لئے اُس کی طرف دیکھ لیتے اور پھر دوبارہ سے اپنے ساتھیوں کی جانب متوجہ ہو جاتے۔

اس وقت اُن کی ٹیبل پر چار لوگ موجود تھے، پھر تین رہ گئے، ایک ساتھی کسی اور شناسا کی آمد پر معذرت کر کے اٹھ گیا۔ پھر دوسرا بھی چلا گیا مگر یہ شاہد ملک صاحب شاید ساری کہانی آج ہی سنا دینا چاہتے تھے۔

”اچھا ملک صاحب، میں دیکھوں گا، کہاں کہاں آپ کی ہیلپ کر سکتا ہوں۔ ڈونٹ وری، کچھ نہ کچھ تو حل نکل ہی آئے گا۔“ انہوں نے خود ہی اُسے ٹالا اور ساتھ ہی اٹھ کھڑے ہوئے مگر اس سے پہلے کہ اس لڑکی کی جانب بڑھتے، انہیں آج کی اس پارٹی کی میزبان گنیمہ مل گئی۔

گنیمہ بے حد باتونی عورت تھی اور بے حد تیز طرار بھی، وہ ذاتی طور پر اسے پسند نہیں کرتے تھے مگر ان کے چند دوستوں کے گنیمہ کے ساتھ بہت اچھے تعلقات تھے اور گنیمہ کی کوشش یہی رہی تھی کہ کبیر حسن بھی اس کے حلقہ احباب میں شامل ہو جائیں۔ اصل میں جس قسم کے بزنس میں عارفہ کے خاندان کی اکثریت ملوث تھی، اس میں اعلیٰ سرکاری آفیسرز سے دوستی کچھ ضروری سی چیز بن جاتی ہے۔ گنیمہ سے زیادہ وہ اس کی چھوٹی بہن عارفہ کو پسند کرتے تھے اور اکبر اور عارفہ سے زیادہ قریب تھے۔ آج بھی گنیمہ کے اصرار کے باوجود یہاں آنے کا ارادہ نہیں تھا مگر چند دوستوں کے مجبور کرنے پر آگئے تھے اور اب یہاں آکر سوچا تھا، اچھا ہی کیا۔

گنیمہ آج بھی ہمیشہ کی طرح نان اسٹاپ بول رہی تھی اور بات بے بات تہقہ لگا رہی تھی اور کبیر حسن سوچ رہے تھے، کیا میڈم گنیمہ سے اس لڑکی کے بارے میں پوچھا جا سکتا ہے اور آخر کار انہوں نے پوچھنے کا فیصلہ کر ہی لیا۔

”میڈم، آپ کے اکثر مہمانوں کو میں ذاتی طور پر جانتا ہوں اور کچھ ایسے بھی ہیں جن سے آج تعارف ہو رہا ہے، لیکن ایک چہرہ..... میرے لئے بالکل انجینی ہے اور جی تو یہ ہے کہ یہ اس محفل میں فٹ بھی نہیں بیٹھ رہا۔“ انہوں نے مزاح کے رنگ میں اپنی بے چینی کو چھپایا۔

”اوہ، آپ اس کی بات کر رہے ہیں، وہ جو بلیک ساڑی میں ہے، ہے ناں؟“

برسر عام کہہ رہے ہیں۔ یہ قیمتی سے قیمتی لباس پہن کر بھی عریاں نظر آنے والی خواتین اور یہ پھٹی پھٹی آنکھوں والے مرد۔ ”وہ اس قدر اکتائی کہ اٹھ کھڑی ہوئی۔“

اسی وقت کھانا شروع ہو گیا اور مہذب لوگ خایے بے صبرے دکھائی دینے لگے۔ اب کسی کی توجہ اس کی جانب نہیں تھی۔ بھوک تو اسے بھی محسوس ہو رہی تھی مگر کچھ بھی کھانے کو اس کا دل نہیں مان رہا تھا، کچھ دیر وہ ان لوگوں کو بے حد مصروف دیکھتی رہی۔ پھر دوبارہ سے اپنی پہلی والی جگہ پر آکر بیٹھ گئی۔

”خدا یا..... بھائی اور بھائی کے دل میں گھر جلد واپسی کا خیال ڈال دے۔“

”ارے جویری ڈار لنگ..... تم یہاں بیٹھی ہو اور کچھ کھا بھی نہیں رہیں۔“ پلیٹ میں ایک مینار سا بنائے امتیاز جانے کہاں سے ٹپک پڑا تھا۔ وہ گھبرا کر فرار کی راہ تلاش کرنے لگی۔

”ہا، کاش چند سال پہلے تم نے ہماری چاہت پر اعتبار کر لیا ہوتا تو ہم دونوں کی زندگی سنور جاتی..... میں کب سے تمہیں تلاش کر رہا تھا اور دیکھ لو آخر کار ڈھونڈ ہی لیا۔“ وہ پیچھا چھوڑنے والوں میں سے نہیں تھا اور جویریہ کی نگاہیں برابر بھائی اور بھائی کی تلاش میں لگی ہوئی تھیں۔

”جویری، ان سے ملو..... یہ کبیر حسن ہیں۔“ کچھ دیر بعد نگینہ بیگم ایک شائستہ سے مرد کے ساتھ اس کے قریب کھڑی کہہ رہی تھیں۔

”کبیر حسن.....“ اُس نے پلکیں اٹھائیں..... یہ چہرہ پہلے بھی دیکھا ہوا مگر کہاں یہ یاد نہیں آیا۔

”میں کب سے آپ کو ماحول سے کٹ کر کسی گہری سوچ میں گم بیٹھے دیکھ رہا ہوں، کوئی پراہلم ہے آپ کے ساتھ.....؟“

”پراہلم کوئی نہیں..... اس کی عادت ہی ایسی ہے، زیادہ گھٹنا ملنا پسند نہیں کرتی۔“ جواب نگینہ نے دیا اور پھر دُور سے آئی عارفہ کو اشارے سے ادھر بلایا، وہ اسے بتانا چاہتی تھی کہ کام بننا دکھائی دے رہا ہے۔



قیمتی ڈز سوٹ میں ملبوس چالیس، پینتالیس سالہ کبیر حسن جن سے نگینہ نے جویریہ کا نعرہ بڑے پیار سے کروا دیا تھا، کوئی بہت خوب رو مرد نہیں تھے مگر شائستہ اور باوقار ضرور دکھائی دیتے تھے۔ کبیر حسن کی اصل طاقت اور..... خوب روئی اُن کا عہدہ تھا۔

کبیر حسن کا تعلق کسی رئیس فیملی سے نہیں تھا، وہ نڈل کلاس سے تعلق رکھتے تھے اور آج جس مقام پر تھے، یہ اُن کی ذاتی محنت کا نتیجہ تھا۔ انہیں اس بات کا احساس بھی بہت تھا کہ آج وہ جو کچھ بھی ہیں، اپنی لیاقت اور ہمت کی بدولت ہیں، انہیں خود پر فخر تھا..... اور یہ فخر بڑھتے بڑھتے اب گھمنڈ کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ بات کرنے کا اسٹائل، اٹھنے بیٹھنے کا انداز سب اس بات کو نمایاں کرتے تھے۔

جویریہ دُنیا کی حسین ترین عورت تو نہ تھی مگر جودل کو بھائے وہی حسین ترین دکھائی دیتی ہے۔ لمبے چوڑے انفر کے وہ قائل ہی نہ تھے۔ انہیں جویریہ اچھی لگی اور انہوں نے سیدھے طریقے سے نگینہ بیگم سے بات کی..... اور وہ تو انہیں ہی منتظر، بات کرنے کی دیر بھی، جھٹ ہاں کر دی۔

”آپ مس جویریہ کے بھائی اور بھائی سے تو بات کر لیں۔“ انہیں خود بھی ایک دم سے یوں ہاں کی توقع نہیں تھی اور وہ خود نگینہ کو سمجھا رہے تھے۔

”آپ سے اچھا رشتہ بھلا انہیں کوئی اور ملے گا.....؟ اور ویسے بھی عارفہ اکبر نے یہ کام مجھ پر چھوڑ رکھا ہے..... اور میں دل سے راضی ہوں۔ خدا آپ دونوں کا ساتھ ہم سب کے لئے مبارک کرے۔“

کبیر حسن کے جاتے ہی نگینہ نے لباس تبدیل کیا اور گاڑی نکال کر عارفہ کی طرف چلی آئی۔ عارفہ اکبر عام طور اس وقت گھر پر نہیں ہوتی تھی اور نگینہ کچھ اتنی زیادہ اکیسا بیٹھ تھی کہ یہ خیال ہی نہیں رہا تھا مگر آج عارفہ گھر پر ہی تھی۔ نگینہ نے جاتے ہی کبیر حسن کے پروپوزل کے بارے میں بتا دیا۔

”بڑی اچھی قسمت ہے اس لڑکی کی، دیکھو تو ایک عدم کو سدھارا تو جھٹ سے دُور ہاتھ تھائے کو سامنے آ گیا اور اُس پر مزید یہ کہ پہلا بھی عاشق تھا جویریہ بی بی کا اور یہ صاحب بھی حسن پر ہی فریفتہ ہوئے ہیں۔“ عارفہ خاصی جل کر بول رہی تھی۔

”چلو ہمیں کیا تمہارے سر سے تو نکلا مل جائے گی ناں۔“ نگینہ نے تسلی دی۔

”نگینہ آہا، وہ تو تب ہوگا جب شہزادی صاحبہ مان جائیں گی، مجھے تو ایک فیصد بھی امید نہیں کہ وہ یہ رشتہ قبول کرے گی، ساری عمر ناصبر کورونے کے ارادے سے بیٹھی ہے وہ احمق تو.....“

”ہاں، یہ تو میں بھی جانتی ہوں، قبول کرنے میں پس و پیش سے کام لے گی مگر قبول کروانا ہمیں بھی

تمہارے اور تمہارے بیٹے کی جانب ہو جائے گی، وہ اپنی دولت اس بچے پر لٹایا کریں گے اور اس کے سینے پر ابھی سے سائب لوٹ رہے ہیں۔“

”نہیں نہیں آپا..... میں بھیا سے کچھ بھی نہیں کہوں گی..... کچھ بھی نہیں مانگوں گی۔ آپ بھائی کو سمجھائیں۔ اُن کے یہ خدشے بے بنیاد ہیں۔ میں تو خود کہیں سردس کا سوچ رہی ہوں، سردس مل جائے تو پھر میں بھیا سے ایک پیسہ بھی نہیں لوں گی، کھانا پینا بھی الگ کر لوں گی۔“ جویرہ گھبرا کر بولی۔

”اس موضوع پر بھی بات کی تھی میں نے، عارفہ نے سنتے ہی انکار کر دیا کہ ہم جویرہ کو سردس نہیں کرنے دیں گے، لوگ باتیں بنائیں گے کہ کیا بھائی ہے، بیوہ بہن اور اُس کے بچے کو دو وقت کی روٹی اور تن کے کپڑے بھی نہ دے سکا جو بہن کو چند روپوں کی خاطر باہر لٹکنا پڑا۔“

”اُف آپا..... پھر میں کیا کروں، کہاں جاؤں.....؟“ وہ بے بسی سے بولی۔

”بس لی بی، یہ سچ ہی کہنا ہے سیانوں نے، عورت کے لئے مرد کا ساتھ بہت ہی ضروری ہے۔ چند سال پیشتر جب میرے شوہر کا انتقال ہوا تو مت پوچھو میں نے کیسے کیسے پتھر اپنی جانب آتے نہیں دیکھے۔ حالانکہ میری جوانی تو دھل چکی تھی اور میں خاصی دولت مند تھی۔ بھائی کے ساتھ کل بزنس کر رہی تھی مگر دیکھ لو پھر بھی نہیں بخشا..... مجھے جان کیسے کیسے نام دیئے..... دنیا کسی کو معاف نہیں کرتی بی بی۔“

”پھر میں کیا کروں آپا.....؟“ وہ اسے ہی سب کچھ جان کر مشورہ طلب کر رہی تھی۔

”میرا مشورہ تو یہی ہے ڈیر کہ تم طلال کو ایک گھر دے دو۔ ایسا گھر جو اس کا اپنا ہو جہاں اُسے کوئی روک ٹوک کرنے والا نہ ہو اور کوئی اسے اپنے احسانوں کا طعنہ نہ دے۔“

”میں اسے گھر کیسے دے سکتی ہوں آپا..... میں تو اتنی مجبور ہوں کہ ایک وقت کی روٹی نہیں کھلا سکتی اپنے بیٹے کو۔“

”تم اسے ایک باپ تو دے سکتی ہو۔“ گمبینہ نے بچے تلے انداز میں اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیا مطلب.....؟ میں سمجھتی نہیں۔“ اُس کی بات پر وہ چونکی اور کچھ ہراساں ہو کر اُس کی جانب دیکھنے لگی۔

”تم میری بات سمجھ تو گئی ہو جویرہ مگر سمجھ کر بھی سمجھنا نہیں چاہتیں۔ میں صاف لفظوں میں کہہ دیتی ہوں کہ تم صرف اور صرف اپنے بیٹے کی خاطر دوسری شادی کر لو۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے..... یہ بھلا کیونکر ممکن ہے.....؟ میں ناصر سے بے وفائی نہیں کر سکتی۔“

”اور بیٹے کو بھول رہی ہو، کیا ان حالات میں وہ زندہ رہ جائے گا۔ سوچو، کل کو اگر یہ بیمار ہو جاتا ہے اور تمہارے پاس علاج کے لئے پیسے بھی نہیں ہیں تو کیا کرو گی.....؟ اسے اسکول میں داخل کرانا چاہتی ہو مگر بھائی راضی نہیں ہیں، پھر کیا ہو گا.....؟ تمہارے بیٹے سے کوئی معمولی چیز نوٹ جاتی ہے، بھائی اسے بے دردی سے تمہارے سامنے مارتی ہیں اور تم روک بھی نہیں سکتی ہو..... اس گھر کے نوکر کوئی چیز چرا لیتے تباہ اور الزام طلال پر لگتا ہے تمہارے اپنے بھائی بھی اسے چور سمجھ کر سزا دیتے ہیں اور تم تو اتنی مجبور ہو کہ اس کی دھال بھی نہیں بن سکتیں۔“

”آپا..... آپا..... پلینز بس کریں..... ایسا مت کہیں۔“ وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رونے لگی۔

آتا ہے، یہ تو تم خیال ہی دل سے نکال دو کہ ہمیں کبیر حسن سے معذرت کرنا پڑے گی، جویرہ یہ کہنے لگی۔

”پھر گمبینہ اپنی چھوٹی بہن کے قریب آ بیٹھی اور اسے اپنے منصوبے سے آگاہ کرنے لگی۔

”یہ تو کچھ زیادہ ہی ظلم نہیں ہو جائے گا.....؟“ عارفہ جیسی سنگدل عورت بھی پوچھ رہی تھی۔

”مگر دیکھ لو، بھلا بھی تو ہم اُسی کا کر رہے ہیں، ہمیں کیا مل جائے گا، اتنے ٹھانڈے باٹ والے افسر کے گھر بیٹھ کر عیش تو وہی کرے گی۔“

”ہاں، یہ بھی ٹھیک ہی کہہ رہی ہیں آپ، پھر میں آج سے اپنا کام شروع کرتی ہوں۔“

”ٹھیک ہے، میں بھی تمہارے ساتھ ہی شروع کرتی ہوں، ابھی جانی ہوں اُس کی طرف۔“ گمبینہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

جب وہ جویرہ کی طرف آئی تو زلیخا بھی وہیں موجود تھی اور دونوں میں باتیں ہو رہی تھیں۔ زلیخا کی نظر جوئی اُس پر پڑی، مالکن کی بہن کو سلام کیا اور اٹھ کر چلی گئی۔

”کیسی ہو جویری اور بیٹا کیسا ہے تمہارا.....؟“ گمبینہ کا انداز آج بھی دوستانہ تھا۔

”میں تو ٹھیک ہوں گمبینہ آپا لیکن طلال کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ بہت نزلہ ہو رہا ہے اسے، میں سوچ رہی ہوں، زلیخا کام سے فارغ ہو جائے تو پھر ڈاکٹر کے پاس لے جاتی ہوں طلال کو۔“

”زلیخا کو ساتھ لے جانے کا کیا فائدہ، میں خود تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔“

”نہیں نہیں آپا..... آپ کیوں تکلیف کرتی ہیں.....؟ بہت بہت شکریہ آپ کا، میں چلی جاؤں گی۔“ وہ بے حد ممنونیت سے کہہ رہی تھی۔

”تکلیف کیسی بھئی.....؟ گاڑی ہے میرے پاس، کوئی پیدل تھوڑی جانا پڑے گا۔ تم فیروں والی باتیں مت کیا کرو میری چھوٹی بہن۔“

”آپا..... میں آپ کی بے حد شکر گزار ہوں، آپ کی محبت مجھے یہ احساس دلاتی ہے کہ میں اس بھری دنیا میں تنہا نہیں ہوں، کوئی تو ہے میرے ساتھ۔“

”ہاں جویری، تمہاری قسمت مجھے بہت دکھی کر دیتی ہے، عورت کے سر پر اپنے مرد کا سایہ ہونو سمجھ لو کہ سوکھے بچے سے بھی ہلکی ہے، وقت کی آندھیاں اُسے اڑا لیتی ہیں۔ لوگ تمہارا تماشا تو دیکھ سکتے ہیں، تم پر افسوس تو کر سکتے ہیں مگر ہیلپ بھی نہیں کریں گے۔ سارے رشتے بودے ثابت ہوتے ہیں۔“

ابھی میں عارفہ کے پاس بیٹھی ہوئی تھی، وہ ہے تو میری بہن مگر مجھے بہت دکھ سے کہنا پڑتا ہے کہ بہت سخت مزاج کی عورت ہے، تمہارا ذرا کراتی حقارت سے کرتی ہے کہ مجھ سے سنا نہیں جاتا۔ بار بار بیک روٹا روتی رہی کہ تم پر اور تمہارے بچے پر اُس کا بہت خرچہ اٹھ رہا ہے۔ جب سے تم آئی ہو، اس کے بجٹ میں گڑبڑ ہو گئی ہے۔ حالانکہ میں جانتی ہوں، وہ کبھی سوچ سمجھ کر خرچ کرتی ہی نہیں۔ نہایت فضول خرچ واقع ہوئی ہے۔“ گمبینہ نے تاسف سے کہا۔

”آپا..... میں نے تو کبھی اُن سے کچھ نہیں مانگا۔“ جویرہ یہ روہاںسی ہو رہی تھی۔

”میں جانتی ہوں تم بہت صابر لڑکی ہو مگر بی بی، دل تنگ ہوں تو پھر یہ تین وقت کی روٹی بھی تو بھاری لگتی ہے۔ عارفہ کے یہاں اولاد بھی کوئی نہیں۔ اُسے خدشہ ہے کہ کل کو اکبر بھائی کی ساری توجہ

”ہاں ہاں، میں تم سے زیادہ سمجھتی ہوں ہمارا اکبر کا بزنس ایک ہی تو ہے اور صرف اکبر بھائی ہی نہیں، میں اور بھائی بھی فکرمند ہیں۔“

”اسی لئے تو کہہ رہی ہوں جتنی جلدی کبیر حسن سے رشتہ داری ہو جائے، ہمارے لئے بہتر ہے۔“

”میری طرف سے تو بے فکر رہی ہو آ پاپا۔ ویسے یہ جویریہ بھی کتنی پاگل ہے، اُس کی بھلائی کے لئے ہی ہمیں اس پر سختی کرنا پڑ رہی ہے۔“

”اُوں ہوں، اُس کی نہیں اپنی بھلائی کے لئے ہم یہ سب کچھ کر رہے ہیں عارفی۔ اور اسی لئے تو میں نے اپنا رویہ اتنا دوستانہ رکھا ہے تاکہ کل کو یہ شوہر کو ہمارے کام کے لئے راضی تو کر سکے، بھائی کے لئے تو دل موم ہو جائے گا۔ تمہیں معاف کرے نہ کرے، کام تو ضرور کروائے گی مگر میرا دوستانہ انداز بے حد ضروری تھا ورنہ اگر مسئلہ شادی کروانا ہی ہوتا تو کچھ مشکل نہ تھی، کسی بھی دھمکی سے یہ کام باسانی کروایا جاسکتا تھا۔“

”دھمکی سے مجھے خیال آیا، کیوں نہ ہم امتیاز کو یہاں بلا لیں۔ جویریہ بہت چڑتی ہے اُس سے، میرا خیال ہے کبیر حسن کے بارے میں بھر فیصلہ کرنے میں دیر نہیں لگائے گی، فوراً ہاں کر دے گی۔“

”ہاں واقعی عارفی، تجویز تو تمہاری معقول ہے، اس طرف تو میرا دھیان ہی نہیں کیا تھا۔ تم فوراً اُس کو فون کرو اور کہو کہ اپنی بیوی سے تین چار روز کے لئے کسی دوسرے شہر جانے کا بہانہ کر کے ادھر ہماری طرف آ جائے۔“

”بیوی سے بہانہ بھلا کہاں بنا پائے گا وہ بزدل، ایسی بات تو سن کر ہی صاف انکار کر دے گا۔“

”نہیں انکار نہیں کرے گا، تم اسے بتانا جویریہ بھی یہیں ہوگی۔ اکبر بھائی شہر سے باہر ہیں اور ہماری طرف سے جویریہ کے سلسلے میں اُس پر کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں، میں لکھ کر دے سکتی ہوں، دوڑا چلا آئے گا، جویریہ کا تو اب بھی عاشق ہے وہ۔“

”ہائے وہ بے چارہ نا کام عاشق۔“ عارفہ ہنسنے لگی۔

”سنو، تمہاری وہ ملازمت اب تو نہیں جاتی جویریہ کی طرف۔“

”نہیں، میں نے سختی سے منع کیا ہے اُسے۔ اور دن میں کئی بار میں خود بھی جویریہ کے کمرے کا چکر لگاتی ہوں، مجھے وہ کبھی وہاں دکھائی نہیں دی۔ بس دونوں ماں بیٹا حیرت کی تصویر بنے بیٹھے ہوتے ہیں۔“ دونوں ہتھکڑی لگا کر ہنس پڑیں۔

صبح اُن کی آنکھ کھلی تو فاطمہ کے کمرے سے تلاوت کی آواز کھلی کھڑی کے ذریعے اُن کے کمرے تک آ رہی تھی۔ وہ بستر سے اٹھ بیٹھے اور آج سارے دن کے پروگرام کے بارے میں سوچنے لگے۔ جب وہ تیار ہو کر ناشتے کے لئے کمرے سے نکلے تھے تو فاطمہ کے کمرے کے باہر گاؤں کی چند عورتوں کو بیٹھے دیکھا تھا۔ ان سب کے ہاتھوں میں برتن تھے اور ہر برتن میں پانی تھا۔ شاہ جی کو دیکھ کر وہ سب اٹھ کھڑی ہوئیں اور سلام کرنے لگیں۔ اشارے سے جواب دے کر وہ کمرے کے کمرے میں آ گئے مگر یہ کمرہ اب بھی خالی ہی تھا۔

کبریٰ سے ملاقات کھانے کے کمرے میں ہی ہو سکی جہاں وہ اکیلی نہیں بلکہ تینوں بچے بھی موجود

”جویریہ! میں تمہیں حقیقتوں سے آگاہ کر رہی ہوں۔ کل ایسا ہی ہوگا، تم خود کو اور اپنے بچے آنے والے کل کی اذیتوں سے بچا سکتی ہو۔ بیٹے کو ایک اچھی زندگی دے سکتی ہو اور خود بھی باعزت زندگی گزار سکتی ہو۔ آج وقت تمہارا ہے، آج تمہیں جو بھی فیصلہ کرنا ہے، ابھی کرنا ہے۔ ابھی وہ وقت ہے کہ۔ کوئی بھی غلط شخص پورے خلوص سے تمہیں اپنا سکتا ہے، ہم اس پوزیشن میں ہیں کہ اس سے ہر شرط منوالیں مگر کل، آج سے مختلف ہوگا، جب کوئی تمہاری جانب نہیں بڑھے گا۔ حالات کی دلدل میں گھس کر سوچو گی کہ کاش میں نے وقت پر صحیح فیصلہ کر لیا ہوتا مگر پچھتاؤں کی فضا کاٹنے کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکو گی۔ تمہارا اپنا بچہ تم سے حساب مانگے گا۔ پھر تم کیا کرو گی۔ سوچو جویریہ پھر تمہارے پاس کیا رہ جائے گا۔؟“

”آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں آپا مگر میں نا صر سے بے دبائی نہیں کر سکتی، میں اُن کی تھی، اُن کی رہو گی، کسی اور کے بارے میں سوچنا بھی میرے لئے ممکن نہیں۔“

”اوہو۔۔۔ تو مت سوچو کسی اور کے لئے مگر کاغذوں کی حد تک شادی ہو سکتی ہے۔ محبت کا جہاز دل میں آباد ہوتا ہے، محبت تو رُوح ہوتی ہے جویریہ یہ دل اور رُوح کسی دوسرے کو مت سونپنا اس میں ہمیشہ نا صر کو آباد رکھنا مگر اتنی خود غرضی مت دکھاؤ۔۔۔ اولاد کی خاطر تو مائیں کانٹوں پر ننگے پاؤں چل پڑتی ہیں۔ آگ پر سے گزر جاتی ہیں۔ یہ شادی تم اپنے لئے نہیں نا صر کے بیٹے کے لئے ہی تو کرو گی۔

کبیر حسن سے تو تم ملی ہی نہیں، وہ بہت اچھے بے حد غلط انسان ہیں، ابھی تک شادی نہیں کی انہوں نے۔۔۔ شاید اینڈیل کی تلاش میں رہے ہوں گے۔ تمہیں دیکھا تو چونک اٹھے۔۔۔ مجھ سے رشتہ مانگا تھا، میں نے تمہارے بارے میں سب کچھ جچ بتا دیا ہے۔ یہ بھی کہہ دیا ہے کہ جویریہ کی محبت جب ہی حاصل کر سکیں گے جب اُس کے بیٹے کو باب بن کر چاہیں گے۔ انہوں نے میری بات مان لی ہے۔ وعدہ کیا ہے کہ کبھی شکایت کا موقع نہیں دیں گے۔

اب جویریہ تم خود کو ایک جانب رکھ کر صرف اور صرف طلال کے لئے سوچو۔“ انہوں نے نپے تلے انداز میں کہا۔

”نہیں آپا، میں یہ نہیں کر سکوں گی۔“

”اوہو۔۔۔ پھر وہی جذباتیت۔۔۔ کوئی جلدی نہیں، تم آرام سے سوچ کر جواب دو۔ اپنے ذہن میں اس بات کو بھی رکھو کہ آج تمہاری ضروریات محدود ہیں مگر کل طلال بڑا ہوگا تو یہ ہر سہولت مانگے گا اور تم اکیلی تو اسے کچھ بھی نہیں دے سکو گی۔“

ٹھیکہ اتنا کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی اور آ کر عارفہ کے پاس بیٹھ گئی۔

”کیا صاف صاف بات کر دی جویریہ سے۔۔۔؟“

”ہاں کبیر حسن کے پروپوزل کے بارے میں بتا دیا ہے میں نے۔۔۔؟“

”اچھا۔۔۔ پھر کیا کہا اُس نے۔۔۔؟“ عارفہ نے بے چینی سے پوچھا۔

”اتنی جلدی نہیں مان رہی، تم اپنی سختی برقرار رکھو، میں بھی سمجھاتی رہوں گی۔ یقیناً، سے کہتی ہوں

زیادہ دن نہیں ٹھہر سکے گی۔“

”مگر یہ سب جلدی ہو جانا چاہئے، اکبر آج کل کچھ پریشان ہیں۔“

ماتھے اچھے اسکول میں پڑھاؤ گی، اس کی چھوٹی چھوٹی آرزوئیں پوری کر دوں گی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تم خود بھی محفوظ ہو جاؤ گی ورنہ یہاں بے آسرا پڑی رہیں تو جانے کیسے کیسے الزام آتے تمہاری ذات پر اور اگر کل کو اپنا ہی بیٹا تنفر ہو جاتا تو کہیں کی نہ رائیں، آج تم نے خود پر جبر کر کے یہ فیصلہ کیا ہے، مگر کل اسے سرا ہوگی۔ شاباش اب چپ ہو جاؤ، ہم نے کبیر حسن کو شادی کی تاریخ دے دی ہے۔ اب تمہیں بھی کچھ تیاری کرنی ہے، اس لئے خود کو سنبھالو۔“

”آپا! اتنی جلدی.....؟“ وہ گھبرا کر عینہ کی شکل دیکھنے لگی۔

”یہ سب کچھ جلدی ہو جانا ہی بہتر ہے۔ ہم امتیاز کو روک نہیں سکتے اور اس سے پہلے کہ وہ تمہیں کوئی نقصان پہنچائے، تمہیں اپنے مضبوط گھر میں ہونا چاہئے۔ اب یہ رونادھونا بند کرو اور نئی زندگی کے بارے میں سوچو۔“ انہوں نے اس کے گال تھپتھا کر کہا۔

”آپا! آپ نے اُن سے بات تو کی ہے ناں.....“ وہ طلال کو اپنا بیٹا تو سمجھیں گے ناں.....؟ ایسا نہ ہو کہ جس کی خاطر میں دل پر جبر کر کے یہ سب کچھ کر رہی ہوں، وہی تمہارہ جائے۔“

”تمہیں نہیں جویرہ، وہ تو بہت اچھے انسان ہیں، بچوں سے تو بے حد پیار کرتے ہیں، انہیں جب میں نے طلال کے بارے میں بتایا کہ کس قدر سہم کر رہ گیا ہے اور اتنا چھوٹا ہونے کے باوجود ہر بات کو شدت سے محسوس کر رہا ہے تو بہت متاثر ہوئے تھے، وعدہ کیا ہے، اسے اپنا بیٹا سمجھیں گے۔“

”آپا! مجھے لگتا ہے میں کوئی جرم کر رہی ہوں۔“

”ایں جرم..... نہیں یہ جرم نہیں ہے ہاں اگر امتیاز کچھ کم بیٹھتا تو بے قصور ہونے کے باوجود تم بھی اُس کے جرم میں برابر کی شریک تھی جاؤ گی۔“

”خدا نہ کرے..... خدا نہ کرے.....“ جویرہ سوچ کر ہی کانپ گئی۔

”عینہ، عارفہ کے پاس چلی آئی اور بولی.....“ میں نے کبیر حسن کی شادی کی ڈیٹ دے کر غلطی نہیں کی۔ امتیاز بڑے کام آیا ہے، وہ اتنی خوفزدہ ہے، مان گئی ہے۔“

”جینک گاڈ..... اکبر تو اب خاصے پریشان رہنے لگے ہیں..... اور اُن کا بھی یہی کہنا تھا کہ جویرہ کو کبیر سے شادی پر راضی ہو جانا چاہئے.....“ عینہ ہی کراچی گئے ہیں۔ میں ابھی انہیں فون پر یہ خوشخبری سناتی ہوں.....“ عارفہ نے شکر ادا کیا۔

”اور سنو، عارفی! میں نے کبیر کو ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ جویرہ یہ بیگم خیر سے ایک بیٹے کی والدہ بھی ہوتی ہیں اور اب سوچ رہی ہوں، یہ بات جب تک پوشیدہ ہی رہی جائے، جب تک ہم کبیر حسن سے اپنا یہ پہلا کام نہ نکھولیں..... دیکھو ناں، اب اگر شادی کے فوراً بعد ہم انہیں یہ بات بتا دیں گے تو انہیں خاصا دھچکے لگے گا، ممکن ہے غصے میں آکر وہ ہمارے کسی بھی کام آئے سے ہی انکار کر دیں۔“

اس لئے اگر کچھ عرصے بعد بتایا جائے تو بہتر رہے گا۔ تب تک جویرہ یہ بھی شوہر پر پوری طرح چھا چکی ہوگی اور ہم بھی مراسم بڑھالیں..... اور پھر طریقے سے یہ بات انہیں بتائیں گے، کہہ دیں گے، شروع میں اس لئے ذکر نہیں کیا کہ ہم خوفزدہ تھے، آپ بتائیں بچے کو قبول کریں نہ کریں اور اب چونکہ آپ کی عادات کا پوری طرح انداز ہو چکا ہے، ہم جان گئے ہیں، آپ بے حد ہمدرد دل رکھتے ہیں تو اس حقیقت سے آگاہ کر دیا ہے۔“ عینہ نے تفصیل سے کہا۔

تھے۔ سب سے پہلے ارد شیران کی جانب متوجہ ہوا، مسکرا کر سلام کیا اور اپنی جگہ سے اُنھ کر اُن کے قریب آ بیٹھا۔

”بات تو تمہاری بالکل ٹھیک ہے کبری، تم میرا سامان تیار کر دو، میں ذرا بیشک تک جاؤں گا۔ پھر دوپہر کے کھانے کے بعد شجاع آباد کے لئے روانہ ہو جاؤں گا۔ اندازاً تین چار روز ہی لگیں گے، مٹھے وہاں، تم اس کے مطابق ہی سامان رکھنا۔“

”بڑی ماں، میں اندر آ جاؤں.....؟“ دروازے پر کھڑی گل رُخ پوچھ رہی تھی۔

”آ جاؤ، ابھی آ جاؤ.....“ کبری اُس کی جانب دیکھ کر مسکرا کر بولیں۔

”یہ گل مجھے بھی بھی اچھی نہیں لگی.....“ ارد شیر نے ناک چڑھا کر اپنی ناپسندیدگی کا برملا اظہار کیا..... اور گل کے بڑھتے قدم زک گئے۔ وہ گھبرائے ہوئے انداز میں بھائی کی طرف دیکھنے لگی۔

”تمہیں گل کیوں اچھی نہیں لگتی، بیٹا یہ تو بڑی پیاری معصوم سی بچی ہے.....؟“ کبری کے پوچھا۔

”آپ اس سے اتنا پیار جو کرتی ہیں، اس لئے یہ مجھے اچھی نہیں لگتی۔“

”پیار تو سب سے زیادہ تم سے کرتی ہوں، تم تو ہم سب کے لاڈلے ہو۔“

”مگر پھر بھی بس یہ مجھے اچھی نہیں لگتی.....“ شاہ جی بیٹے کی بات سن کر مسکراتے رہے۔ اسے روکا

نہیں اور نہ ہی گھبرائے ہوئے مجرمانہ انداز میں سر جھکا کر کھڑی بیٹی کو سلی دی۔ کبری نے اسے قریب بلایا اور ناشتا کرنے کے لئے کہا۔

”بڑی ماں، مجھے ناشتا نہیں کرنا۔“ وہ اسی جگہ کھڑی رہی جہاں ارد شیر کی بات سن کر زک گئی تھی۔

”مگر کیوں.....؟“

”مجھے بھوک نہیں ہے بڑی ماں.....“ وہ آئی تو یقیناً ناشتا کرنے ہی تھی مگر ارد شیر کی بات سن کر اب واپس جانا چاہ رہی تھی۔

”اچھا..... اگر ناشتا نہیں کرنا تھا تو پھر یہاں آئی کیوں تھیں.....؟“ وہ اس پر ہنس رہا تھا۔ گل کے اندر اُس کے لئے نفرت کا طوفان اٹھا مگر مجبور تھی وہ اسے کچھ نہیں کہہ سکتی تھی اس طوفان کو اپنے دل میں چھپائے وہ کمرے سے نکل گئی۔

وقت بہت ظالم ہے..... بے رحم..... وہ فیصلے بھی کروا لیتا ہے، جن کے بارے میں کبھی یقین سے کہا تھا، جان دے سکتے ہیں مگر ایسا نہیں کر سکتے۔

جویرہ یہ ہار گئی تھی، اُس نے عینہ کی بات مان لی تھی اور اب اُس کے گلے لگ کر زور زور سے رو رہی تھی، بار بار کہتی۔

”اگر میری عزت پر نہ بن آتی تو کبھی یہ بات گوارا نہ کرتی مگر امتیاز کے انداز نے مجھے مجبور کر دیا تھا اور بھائی کو میری قسموں پر بھی اعتبار نہیں تھا۔ وہ مجھے یہ قصور وار ٹھہرا رہی تھیں۔ میں نے بہت مشکل سے خود کو اس شیطان سے بچایا ہے اور اگر دوبارہ وہ اُن دھکے کا توشا بد میں اپنا دفاع نہیں کر پاؤں گی۔“

”اچھا اچھا..... جو کچھ ہوا اُسے بھول جاؤ، خود کو سنبھالو، یقین کرو یہ فیصلہ تمہارے اور تمہارے بچے کے حق میں بہت اچھا ثابت ہوگا..... اب اسے ایسا گھر تو میسر ہوگا جہاں وہ اپنی مرضی سے کھیل کود سکے

”جیسا آپ مناسب سمجھیں کریں ویسے مجھے یہ خطرہ ہے کہ کہیں وہ بچے کو قبول کرنے سے انکار نہ کر دیں اور یہ ڈھول ہمارے گلے پڑ جائے۔“ وہ بے زار انداز سے بولی۔

”اوہ نہیں..... جو یہ کہ کے معصوم حسن میں بڑی طاقت ہے کبیر صاحب چند دنوں میں ایسے اثر ہوں گے کہ سر نہیں اٹھائیں گے اس کے سامنے۔“

”پھر کیا بچہ ان کی شادی کے بعد اتنے دنوں تک یہیں رہے گا، دیکھیں ناں شادی کے بعد جو بڑا اور کبیر یہاں آئیں گے، اگر بچہ موجود ہوا تو بات بگڑ سکتی ہے۔“ عارفہ نے خدشہ ظاہر کیا۔

”یہ سب کچھ میں تمہارے سوچنے سے پہلے ہی سوچ چکی ہوں عارنی، اور نہ صرف سوچا ہے بلکہ عمل بھی نکال لیا ہے۔ میرے گھر میں ایک عورت آئی ہے کبھی کبھی، بیوہ ہے وہ، ایک ہی بچا تھا اس کا..... بچھے دنوں وہ بھی مر گیا۔ بہت ڈھکی اور غریب سی عورت ہے۔ میں نے اس سے بات کی تھی۔ چند پیسوں کے عوض وہ طلال کو بیس پچیس روز اپنے پاس رکھنے کو تیار ہے..... اور اگر بعد میں زیادہ دن تک رکھنے کی ضرورت پڑی تو وہ اس پر بھی راضی ہو جائے گی، میری بات میں ملتی۔“

”یہ تو بہت ہی اچھا ہو گیا گلینہ آپ.....“
 ”ہاں، اب تم اکبر بھائی کو فون کر کے ساری صورت حال سمجھا دو۔“

”ٹھیک ہے، میں بات کر لوں گی اُن سے مگر ایک خیال ابھی ابھی میرے ذہن میں آیا ہے، کیا جو یہ بان جائے گی، وہ تو اپنے بچے کی کھنٹوں کی جدائی برداشت کرنے پر بھی راضی نہیں ہوتی۔“

”بھئی یہ بات ابھی جویریہ سے نہیں کرنی، اکبر بھائی کے آنے کا انتظار کرو اور انہیں کہو کہ وہی اس سلسلے میں اپنی بہن کو سمجھائیں..... چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی یوں روٹنا شروع کرتی ہے کہ مجھے غصہ آنے لگتا ہے، جی چاہتا ہے ساری ہمدردی و خوش اخلاقی ایک طرف رکھ کر بری طرح جھاڑ دوں اس کو، اکبر بھائی سمجھائیں گے تو آگے سے بحث کی ہمت نہیں کرے گی۔ چپ چاپ ساری بات مان لے گی۔“

عارفہ نے فون پر اکبر علی کو جلد آنے کی تاکید کی تھی مگر وہ اپنے بزنس کی انجمنوں میں بری طرح گرفتار تھے۔ جلد آ نہیں سکے۔ جب آئے تو بھی بے حد اُچھے ہوئے تھے۔ عارفہ کو بات کرنے کا موقع نہیں ملا۔ وہ عارفہ کے بھائی اور اپنے بزنس پارٹنر کی طرف چلے آئے۔ نگینہ کو بھی بلا لیا کہ ان کے بزنس میں وہ بھی شامل تھی۔ دیر تک میٹنگ کے بعد بھی کوئی سلی بخش صورت حال نہیں تھی..... دونوں حضرات کی نسبت نگینہ بہت مطمئن تھی اور انہیں بھی تسلی دے رہی تھی۔

اگلے روز نگینہ، بہن کی طرف آئی اور دونوں بہنیں مل کر اکبر کو جویریہ کے بارے میں بتانے لگیں۔ لیر حسن سے انہیں بھی بہت توقعات تھیں اور واقعی کبیر انہیں پوری کرنے کی پوزیشن میں بھی تھے۔ جو کچھ انہوں نے کہا۔ انہوں نے توجہ سے سنا اور اختلاف نہیں کیا۔ شادی کی شاپنگ عارفہ اور نگینہ نے مل کر ہی کی۔ اگر کبھی جویریہ سے ساتھ چلنے کو کہا بھی تو اُس نے سننے ہی انکار کر دیا۔

شادی سے ایک روز پہلے گنیمہ کی لائی ہوئی عورت جس کا نام زیتون بی بی تھا جویریہ کے کمرے کے کھرکڑی تھی جبکہ اکبر، عارفہ اور گنیمہ اس کے پاس اندر چلے آئے تھے۔

”جویریہ..... تم بچے کا سامان تیار کر دو، یہ چند روز کے لئے زیتون بی بی کے پاس رہے گا۔“
 ”کون زیتون بی بی.....؟ اور طلال اُس کے پاس کیوں رہے گا.....؟“ جویریہ گھبرا کر کہہ رہی تھی۔

”مرا دی کے شروع دنوں میں بچے کو ساتھ رکھنا مناسب نہیں.....“ اکبر بھائی کا انداز اٹل اور سپاٹ تھا۔
 ”یہ میرے بغیر نہیں رہ سکتا۔“ خشک لبوں پر زبان پھیر کر جو یہ نے سمجھانا چاہا۔
 ”رہ لے گا، رزیتون بہت محبت کرنے والی عورت ہے۔“ عثمینہ نے آگے آکر پیار سے سمجھایا۔
 ”ہاں بیٹے کی تو تم فکر ہی نہ کرو، رزیتون پیار کرنے والی عورت ہے۔“ آج عارفہ کا انداز بھی بدلا
 ہوا، دوستانہ سا تھا۔

”زوجین بی بی، اندر آ جاؤ۔“ اکبر نے اُس کی کیفیت کو سرے سے نظر انداز کرتے ہوئے اُس عورت کو آواز دے کر اندر بلا لیا۔۔۔۔۔ اب ایک ساتوئی سی رنگت والی عورت جس کا چہرہ نہ صرف اُس کی غربت بلکہ شرافت اور مسکینی کی کہانی سنارہا تھا اُن کے سامنے تھی۔

”بچے کھ لے جاؤ۔“

زیتون نے لمحہ بھر کو اس عورت کی طرف دیکھا۔ کیسی ماں تھی دوسری شادی کے شوق میں بچے کو خود سے جدا کر رہی تھی مگر اس کے چہرے پر دکھ اور بے بسی کے سائے کیوں.....؟

”اٹھالو بچے کو۔“ گمبیر کی آواز نے اُسے زیادہ دیر تک سوچنے اور نتیجہ قائم کرنے سے روک دیا۔
طلال سہمے ہوئے انداز میں ٹکڑے ٹکڑے کر رہا تھا۔ اس وقت یہاں عارفہ اور سپاٹ
چہرے والے اکبر موجود تھے، وہ ان دونوں سے بہت ڈرتا تھا۔ آسنو اندر رہی اندر گر رہے تھے۔ آنکھیں
خٹک تھیں، اس کا ہنسا سادل بری طرح سہا ہوا تھا۔ زیتون نے اسے گود میں اٹھالیا اور کمرے سے باہر لے
چلی۔ وہ مڑ مڑ کر ماں کی طرف دیکھتا اور اس کی خوفزدہ آنکھیں ماں ماں پکارتی تھیں جبکہ جویریہ سر
جھکائے کھڑی تھی۔ اس میں بیٹے کو یوں جاتے ہوئے دیکھنے کی ہمت نہ تھی مگر جوہی وہ کمرے سے نکلا،
نہ نہ لڑکی۔

”طلال“ اُس نے پوری آواز میں پکارا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ رونے کی آواز پر زہتان کے بوٹے قدم رک گئے۔ اُس نے پلٹ کر دیکھنا چاہا مگر نگینہ کمرے سے باہر آچکی تھی..... اور سے اپنے ساتھ جینے کا اشارہ کر رہی تھی۔

”رتھون خود بھی ایک بیوہ عورت ہے اور اس کا کلوتا بچہ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ وہ بچوں سے چار رتن ہے تمہارے بچے کو سینے سے لگا کر رکھے گا۔“ جویریہ کی دیرانی اور بے بسی عارفہ کو سلی دینے پر مجبور کر رہی تھی۔

اگلے روز اُسے ایک بار پھر ذہن بنایا گیا مگر اب کی بار دل جیسے بین کر رہا تھا، نہ آنکھ میں کوئی خواب
نہ پریشانی مسکراہٹ..... وہ ہر اسال بھی اور کسی حسین مجسمے کی مانند دکھائی دے رہی تھی۔

”جو یہ ہمیں تم سے ایک بات کرنا تھی۔“ رخصتی سے پہلے اکبر علی اور عارف اُس کے پاس چلے آئے، اُس نے ٹپکیں اٹھا کر سوالیہ انداز میں اُن کی جانب دیکھا۔ پھر دوبارہ ٹپکیں گرالیں۔

”کبیر حسن اچھا آدمی ہے..... پوسٹ بھی اچھی ہے اور خاندانی بھی ہے۔ ہاں مزاج کا ذرا مگر مہجور ہے مگر خیر یہ ضروری نہیں کہ گھر میں بھی وہ اس مزاج کے ساتھ رہتا ہو، بعض لوگ گھر سے باہر

بہت سخت گیر اور جھگڑالو دکھائی دیتے ہیں مگر گھر میں ان کی ایک بالکل ہی مختلف شخصیت دکھائی دیتی ہے اور ویسے بھی کبیر نے تمہیں خود پسند کیا ہے یقیناً وہ تم سے محبت کرے گا۔“

”اوہو..... اکبر آپ بھی کیا باتیں لے کر بیٹھ گئے ہیں..... اصل بات کی طرف آئیے، زیادہ وقار نہیں ہے ہمارے پاس۔“ عارفہ نے ٹوک دیا کہ وہ اس لمبی تمہید سے بور ہو رہی تھی۔

”ہاں ہاں، میں اسی طرف آ رہا تھا، بات یہ ہے جو یہ کہ ہم نے تمہاری یہ شادی سراسر تمہارا بہتری کے خیال سے کروائی ہے۔ ایک بیوہ اور وہ بھی ایسی جو بچے کی ماں بھی ہو، اس کی شادی کی انجہ جگہ پر ہو جانا خاصا مشکل ہو جاتا ہے۔ جب کبیر حسن نے تمہارا رشتہ مانگا تو ہم نے یہ بتا دیا تھا کہ تم پہلے سے شادی شدہ ہو مگر یہ نہیں بتایا کہ تم ایک بیٹے کی ماں بھی ہو۔“

”بھائی جان.....“ مجھ سے تپ کر پکارا اٹھا تھا۔

”سنو میری بات سنو جو یہ، ہم نے کچھ غلط نہیں کیا۔ دیکھو اگر ہم یہ بات پہلے بتا دیتے تو ممکن تو وہ تم سے شادی کرنے سے ہی انکار کر دیتا مگر اب جبکہ تم اس کے نکاح میں آ چکی ہو۔“

”مگر اب بھی تم جاتے ہی اسے بچے کے بارے میں مت بتا دینا۔“ عارفہ نے درمیان میں مداخلت کی۔

”ہاں بیگم ٹھیک کہہ رہی ہیں، ایسا کر کے تم اپنا ہی نقصان کرو گی، تم پہلے اس کے مزاج کو سمجھو، پھر اس وقت یہ بات کرنا جب یہ محسوس کر دو کہ اب وہ پوری طرح تمہارے حصار میں ہے، دوسری صورت میں یہ بھی ممکن ہے کہ تم اپنی جلد بازی میں معاملہ خراب کر لو، وہ برہم ہو جائے اور پھر بچے کو اپنانے سے ہی انکار کر دے۔“

”بھائی جان، مجھے صرف اتنا بتا دیجئے کہ میں نے آپ کا کیا بگاڑا تھا.....؟ آپ لوگوں نے میرے ساتھ یہ دُشمنی کیوں کی.....؟ اگر میرا وجود اتنا ہی بھاری تھا تو مجھے کہہ دیا ہوتا، میں آپ کا گھر چھوڑ کر چلی جاتی مگر آپ لوگوں نے جانے کس بات کا بدلہ لیا ہے، ظلم کیا ہے مجھ پر اور مجھ سے کہیں زیادہ میرے معصوم بچے پر..... پہلے تو وہ صرف باپ کے سائے سے محروم تھا مگر آپ نے تو ماں کو بھی اس سے چھین لیا ہے۔ ناصبر کو تو موت نے جدا کیا، وہ خدا کا فیصلہ تھا اور اس کی رضا کے آگے میں نے اور میرے بچے نے سر جھکا دیا تھا مگر مجھے تو جیتے جی آپ نے اس کے لئے مار دیا ہے، اُسے تنہا کر دیا ہے آپ لوگوں نے۔“ وہ روئے جا رہی تھی اور کتنی جا رہی تھی۔

”خدا نہ کرے، کیسی باتیں کرتی ہو.....؟ نکاح معمولی بندھن نہیں..... اب جب تم کبیر کی بیوی بن چکی ہو تو اُسے طلال کو قبول کرنا ہی پڑے گا۔“ عارفہ نے سمجھایا۔

”اگر وہ قبول کر بھی لے تو بھی میرا بیٹا ساری عمر سوتیلے باپ کی نفرت کا شکار رہے گا، وہ بڑا ہو کر مجھے اپنا مجرم سمجھے گا..... وہ نہیں جانتا، میں نے آگ کے اس سمندر میں چھلانگ صرف اسی کے لئے لگائی تھی۔ مگر وائے ری قسمت، میری یہ قربانی بھی رایگان گئی۔ آپ لوگوں نے بہت برا کیا ہے ہم دونوں کے ساتھ..... میں آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔“

”اب تو جو ہوتا تھا ہو چکا، یہ مت بھولو کہ اس وقت تم صرف طلال کی ماں ہی نہیں، کبیر حسن کی بیوی بھی ہو، آنسو پونچھو اور چلنے کی تیاری کرو..... تمہیں سمجھانا ہمارا فرض تھا، باقی اب تمہاری مرضی۔“ اکبر اتنا

کہہ کر چلے گئے۔ ہوں سے کبیر حسن کے گھر کا فاصلہ اُس نے جیسے نیم بے ہوشی کی حالت میں طے کیا تھا۔

آگے کیا ہوگا.....؟

اُس کے پیارے بیٹے کا کیا ہے.....؟

یہ سوال اُسے اس قدر پریشان کر رہے تھے کہ وہ ہوش کھو رہی تھی..... جانے کس نے سہارا دے کر انہارا، کیا کبیرا کہیں ادا ہوئیں، اور کب اُسے ایک سادہ مگر قیمتی فرنیچر سے بچے کرے میں بٹھا دیا گیا۔

سرکاری کوٹھی کا یہ کمرہ جو کشادہ اور صاف ستھرا تو تھا مگر یہاں کوئی بھی ایسی آرائش نہیں تھی جس سے وہ دلہن کا کمرہ نظر آ سکے۔ جو یہ یہ میں ادھر ادھر دیکھنے اور جائزہ لینے کی سکت نہ تھی اور نہ ہی خواہش..... لانے والوں نے جہاں لاکر بٹھا دیا، وہ سر جھکا کر وہیں بیٹھ گئی۔

”دلہن آئی تو بہت پیاری ہیں۔“ اس کے گرد بچوں کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ وہ بار بار اسے دیکھتے تھے اور پھر ایک دوسرے سے کہتے تھے۔

”میں تمہاری بڑی نند ہوتی ہوں..... میرا نام دلشاد ہے اور مجھ سے چھوٹی بہن کا نام واجدہ ہے۔ ہم دونوں کو پتا ہی نہیں تھا، اچانک ہی اطلاع ملی کہ کبیر شادی کر رہا ہے۔ بڑے حیران ہوئے ہم، مگر پھر سوچا کہ چلو اچھا ہی کیا اُس نے، مگر بس گیا ہے، تنہا زندگی گزارنا کوئی آسان تو نہیں ہوتا مرد کے لئے..... اور میرے بھائی کے لئے تو رشتوں کی، تم یوں سمجھو کہ قطار میں لگی ہوئی تھیں، اپنے ہی خاندان میں کئی گھر ایسے تھے جو رشتے کے خواہاں تھے مگر کبیر ماننا ہی نہیں تھا۔

خیر ہمیں کیا پتا تھا..... کیا بات ہے.....؟

خاتون کو یقیناً بولنے کا خطا تھا، ایک سے دوسری بات نکال کر بولے چلی جا رہی تھیں۔ اُنہیں اس سے دلچسپی نہیں تھی کہ مخاطب ان کی بات کس حد تک سن رہا ہے، اُنہیں صرف بولنے سے غرض تھی۔

”اوہو آپا..... آپ ادھر بیٹھی ہیں..... میں سارے گھر میں آپ کو ڈھونڈ رہی تھی.....“ ایک اور خاتون نے دروازہ کھول کر کمرے میں جھانکا، دلشاد کو موجود پایا تو دروازے سے ہی بولنا شروع ہوئی اور بولتے بولتے قریب آ گئی۔

”ہاں بھئی، میں تو ادھر دلہن کے پاس بیٹھ گئی تھی اور ساری فیملی کا تعارف کر رہی تھی..... دلہن، میں نے بتایا تھا ناں، مجھ سے چھوٹی واجدہ ہے تو یہی ہے وہ واجدہ بیگم، بڑی پیاری بہن ہے ہماری..... اس کے تین بچے ہیں..... بڑی بیٹی کا نام زہمت ہے..... اے زہی سلام کر آئی کو۔“ انہوں نے ایک بچی کو پکڑ کر اس کے سامنے کیا۔

”دلہن سو گئی ہو.....“ واجدہ جو کب سے بہن کی باتیں سن کر ہاں میں ہاں ملائے چلی جا رہی تھی۔ اب ذرا آگے ہوئی اور جھک کر اس کا شانہ ہلاتے ہوئے بولی..... جو یہ یہ بہت ہمت سے کام لے کر آنکھیں کھولیں اور پکارتے سرکٹتی میں ہلا کر ذرا سا مسکرانے کی ناکام کوشش کر ڈالی۔

کیسے ہوتے ہیں یہ نکاح کے لفظ..... عورت جب ان لفظوں کے حصار میں آ جاتی ہے تو خود بخود وہی سمجھوتے کر لیتی ہے۔ کل تک اُس نے کبیر حسن کو بھی اس قابل نہیں سمجھا تھا کہ انہیں اپنی سوچ میں غور کی بھی جگہ دے دیتی مگر آج جب اس رشتے میں بندھ چکی تھی تو نندوں کی خوشنودی کی خاطر چہرے

پرسکراہٹ جانے کے حقن کر رہی تھی۔ اُس نے نہ چاہتے ہوئے بھی ان تمام رشتوں کو قبول کر لیا تھا۔
”میرا خیال ہے آیا، اب ہم لوگوں کو کمرے سے چلنا چاہئے۔ کبیر کے موڈ کا بھی پتا نہیں چلتا، کبیر ہم پر ناراض ہی نہ ہونے لگیں..... دیکھو ناں، دیر بھی کافی ہو گئی ہے۔“ واجدہ کو خیال آیا اور وہ اٹھ کھڑی ہوئی پھر دونوں بہنوں نے بچوں کو کچھ ڈانٹ ڈپٹ کر، کچھ سمجھا بجا کر کمرے سے نکالا اور نہ وہ تو ذہن آئی کے پاس ہی بیٹھے رہنا چاہتے تھے۔

اور جویریہ پر آپ ہی آپ انتظار کی کیفیت طاری ہو گئی۔ اب آ کیوں نہیں جاتے، یہ لمحے بہت مشکل ہیں، یوں لگتا ہے تختہ دار پر کھڑی ہوں۔ اسی وقت دروازہ کھلا اور درد کی شدید عیسیں جویریہ نے اپنے سارے جسم میں محسوس کیں۔

”آؤ آؤ، اندر آ جاؤ۔“ آنے والا یقیناً اکیلا نہیں تھا۔

ویز قائلین پر چلتے چلتے وہ اس کے قریب آ کر رُک گئے..... خوبصورت بریسلٹ اُس کے قریب رکھا..... اور اس کے قریب بیٹھ گئے۔

اور اُس کا گھونگھٹ اُلٹ کر اپنی بھاری اور بارعب آواز میں بولے۔

”اِس سے ملو جویریہ، یہ میرا بیٹا ہے۔ مزرب حسن۔“



”مزرب دو برس کا تھا جب اس کی والدہ کا انتقال ہو گیا تھا، میں نے دوسری شادی نہیں کی، اپنی مصروفیات کی وجہ سے، شاید میں نے اس طرف دھیان نہیں دیا یا پھر یہ کہ قسمت میں شاید تم لکھی تھیں، تو جب نظر آئیں، تب ہی شادی ممکن ہو سکی..... مجھے امید ہے جویریہ، تم مزرب کو صرف میرا ہی نہیں، اپنا بھی بیٹا سمجھو گی۔“

یہ سب کچھ کہتے ہوئے کسی بھی جگہ کبیر حسن کے لہجے میں کھردراہٹ کم نہیں ہوئی..... مگر جویریہ نے یہ بات محسوس ہی نہیں کی کہ اُن کا انداز کیا ہے، وہ یہ بات دوستانہ نہیں، حکمیہ..... لہجے میں کر رہے ہیں۔ وہ سر اٹھا کر مزرب حسن کی جانب دیکھ رہی تھی۔ وہ پانچ، چھ سال کا ہو گا۔ صحت مند اور بلا کا اعتماد اس کے چہرے پر دکھائی دیتا تھا۔ اُس کے ہونٹوں پر شریر سی دوستانہ مسکراہٹ تھی اور سیاہ چمکدار آنکھوں میں جھنڈوں کی سی چمک، سیاہ سوٹ میں سلیقے سے بال بنائے، وہ بہت شوق بھرے انداز میں جویریہ کی جانب دیکھ رہا تھا۔

”یہ دو برس کا تھا جب اس کی والدہ کا انتقال ہوا۔“

جویریہ کو کبیر حسن کے ادا کئے گئے جملوں میں سے بس یہی یاد رہ گیا تھا، اُس نے بے اختیار دونوں ہاتھیں مزرب کے لئے پھیلا دیں..... اور وہ ان میں آسایا۔

اُسے وہ طلال کی طرح ہی لگا۔

اور اک بے خودی کے عالم میں وہ اس کا منہ بے تماشا چومتے ہوئے طلال کے لئے تڑپ اٹھی تھی۔ اگر کبیر حسن خود آگے بڑھ کر بیٹے کا بازو تھام کر اسے باہر جانے کو نہ کہتے تو شاید وہ ساری رات اسے لپٹا کر خود سے لپٹائے ہوئے گزار دیتی۔

صبح اُس کا دل خالی تھا..... وہ سہاگن تھی مگر اس کے احساسات پر برف جمی ہوئی تھی، خاموش اُلجھی اُلجھی ہی، اگر کبیر حسن کو ذرا بھی گہرائی میں اترنے کی عادت ہوتی تو وہ ضرور اُس چپ کی وجہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے۔

کبیر کی بہن واجدہ صبح ناشتا دینے کے لئے کمرے میں آئیں اور جب ناشتے کے بعد کبیر کمرے سے باہر نکل گئے تو اچانک ہی بچوں نے کمرے پر جیسے دھاوا بول دیا۔ شاید وہ کبیر کے کمرے سے باہر آنے کے ہی منتظر تھے۔

”ذہن آئی، آپ کتنی پیاری ہیں۔“ ایک بچی بہت شوق سے اس کے بیڈ پر آ بیٹھی اور اس کے

”میں تھوڑے دنوں کے بعد واپس آ جاؤں گی، پھر یہیں رہوں گی، آپ کے پاس۔“ اُس نے

اُسے سمجھانا چاہا۔

”سارے بچوں کو ان کی ماما ساتھ لے کر جاتی ہیں، پھر آپ مجھے چھوڑ کر کیوں جا رہی ہیں؟“

”نہیں..... سارے بچے ساتھ تھوڑی جاتے ہیں، کچھ تو بہت چھوٹے ہوتے ہیں مگر بڑا ماؤں سے

جدا کر دیئے جاتے ہیں۔“ طلال کو یاد کر کے اس کا جی بھرا آیا۔

”پتا نہیں کیا ہوگا..... بہت اُداس ہوگا میرے بغیر، گھٹ گھٹ کر روتا بھی ہوگا۔ بہت حساس

ہے میرا بچہ اور جانے کیسی کیسی آزمائش لکھ دی گئی ہے اُس کے لئے۔“ کبیر صاحب کو جب میں یہ بتاؤں

گی کہ میں ایک بیٹے کی ماں ہوں تو اُن کا رد عمل کیا ہوگا.....؟ ان چند روز میں جہاں تک میں نہیں سمجھ سکی

ہوں، یہی اندازہ ہوا ہے کہ وہ بہت سخت مزاج کے مالک ہیں اور اپنے موڈ کے مطابق چلنے والوں میں

سے ہیں۔ میں نے تو انہیں کبھی مزید کے ساتھ بھی بہت پیار سے بات کرتے نہیں دیکھا اور طلال سے تو

ان کا کوئی رشتہ بھی نہیں بنتا، کیا وہ اسے قبول کر لیں گے۔“



حالات اچانک ہی اُن کے حق میں بہت خراب ہو گئے تھے۔ عارفہ بیگم بھی مشورہ دے رہی تھیں

کہ آپ کبیر حسن سے بات کریں، آ خراب وہ بہنوئی ہیں آپ کے، رشتہ داری بنتی ہے۔ انہیں بھاری مدد

کرنا ہوگی جبکہ اکبر علی کچھ کچھ چٹپٹا ہٹ کا شکار تھے..... اصل میں ابھی رشتہ داری نئی بنی تھی اور یہ بھی نہیں

بجھتے تھے، کبیر حسن کس مزاج کے آدمی ہیں مگر خراب کچھ مجبوری بھی تھی کہ مسئلہ ہی ایسا آن پڑا تھا۔

انہوں نے کبیر کے ہاں فون کیا تو پتا چلا کہ وہ اور جویریہ شہر میں نہیں ہیں..... ملازم سے بات ہوئی

تھی، وہ کب تک شہر سے واپس آئیں گے ملازم کو کچھ پتا نہیں تھا اور وقت تھا کہ تنگ سے تنگ ہوا جاتا تھا۔

انہیں اب ملک سے فرار ہونے میں ہی اپنی عافیت دکھائی دیتی تھی۔ گمینے سے رابطہ کیا تاکہ اسے اطلاع دی

جاسکے۔ (کہ برنس سانجھا ہی تو تھا) مگر وہ بھی شہر میں نہیں تھی اور انہیں یونہی جانا پڑا۔

گمینہ کو اطلاع تب ملی جب انہیں پلین میں بیٹھے بھی کئی گھنٹے گزر چکے تھے، گمینے کے ہاں تو اب

ایئر پورٹ تک بھی جانے کا ٹائم نہیں تھا اور وہ ایسا رسک لے بھی نہیں سکتی تھی۔ اُس نے صرف ضروری

اشیاء ہی اکٹھی کیں، ملازموں کی چھٹی کی اور یہی فیصلہ کیا کہ فی الحال یہیں کہیں روپوش ہو جائے گی اور

پھر مناسب موقع دیکھتے ہی نکل جائے گی۔ اُس کی گاڑی ابھی گھر کا گیٹ کراس نہیں کر پائی تھی کہ طلال کو

گودیں اٹھائے تینوں سامنے آ گئی۔

”سلام بی بی۔“

”ولیکم.....“ گمینہ پر جلت اور گھبراہٹ سوار تھی۔

”میں جی یہ بچہ واپس کرنے آئی ہوں، آپ نے اتنے دنوں کے لئے ہی کہا تھا ناں جی۔“

”اوہو بھتیجی.....“ اُس نے زچ ہو کر اپنے ماتھے پر ہاتھ مارا، پھر بولی۔ ”ایسا کرواے تم ہی رکھ

لو جسے بھی تو بڑھا پے کے لئے سہارا چاہئے۔“

”مگر بیگم جی، یہ تو اُس بی بی کا بیٹا ہے، وہ اس کے بغیر کیسے رہے گی؟“

”ہونہہ..... اُس کی کیا بات کرتی ہو، تم نے دیکھا نہیں، اُس نے دوسری شادی رچا لی ہے بہت

چہرے کو بخور دیکھ کر سچائی سے کہنے لگی۔ اس کی دیکھا دیکھی باتی بچے بھی بیڈ پر چڑھنے لگے۔

”اترو..... فوراً نیچے اترو.....“ مزید نے آتے ہی بڑی سنجیدگی سے سب بچوں کو ڈانٹنے کے انداز

میں کہا۔

”کیوں اترو.....؟ میں تو یہیں بیٹھوں گی، اپنی دلہن آنی کے پاس۔“ وہ بچی جویریہ کے اور بچ

قریب ہو گئی۔

”واہ..... ایسے ہی بیٹھو گی..... تمہیں پتا نہیں یہ میری ماما ہوتی ہیں۔“ مزید نے اک نخر کے مار

میں جویریہ کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر سب بچوں کو بتایا۔

”جھوٹ.....“ کوئی بچہ اس کی بات ماننے کو تیار نہیں تھا۔

”جھوٹے ہو گئے تم سب کے سب، میں تو جھوٹ نہیں بولتا اور اب نکل جاؤ کمرے سے، ماما کو بچ

مت کرو۔“

”مزید چاند، بہن بھائی ہیں یہ آپ کے..... اور کوئی بہن بھائیوں سے بھی یوں بات کرنا

نہ۔“ جویریہ کو خود ہی مزید سے اپنائیت سے ہو گئی تھی۔ وہ بہت پیار سے اسے سمجھا رہی تھی۔

”بہن بھائی.....“ اُس نے پلکیں اٹھائیں، پھر ذرا توقف کے بعد بولا۔ ”آپ انہیں نہیں جانتی

مما، یہ سب بہت برے ہیں۔ اب میری ماما آئی ہیں تو یہاں اکٹھے ہو گئے ہیں اور جب آپ نہیں تھیں اور

میں بھی جب ان کی ماما کے پاس جاتا تھا تو یہ مجھ سے لڑا کرتے تھے۔ قریب نہیں آنے دیتے تھے..... اگر

کبھی مجھے پھوپھو پیار کر لیتیں تو انہیں اچھا نہیں لگتا تھا..... مجھے کہتے تھے، ہماری ماما کے پاس کیا کرنے

..... تر جاپانی ماما کے پاس۔“

مزید کی بات یقیناً سچی تھی، جب ہی تو سارے بچے خاموش ہو گئے تھے۔ جویریہ کو مزید پر بہت

تس آیا..... ماں کے پیار کو ترستا یہ بچہ کتنا حساس تھا..... اُس نے پیار سے اُس کے بال سہلائے اور

بولی۔

”اب تو میں آگئی ہوں ناں اپنے بیٹے کے پاس، آپ کو اب کسی کی ماما کے پاس جانے کی ضرورت

نہیں۔“

”آپ مجھ سے وعدہ کریں ماما، آپ مجھ سے یونہی پیار کریں گی اور آپ مجھے کبھی چھوڑ کر نہیں

جا میں گی۔“

”ہاں بھئی، کیوں پیار نہیں کروں گی..... مائیں تو اپنے بچوں سے ہمیشہ پیار کرتی ہیں اور میں بھی

آپ و مجھ کو بھی نہیں جاؤں گی۔“

شادی دو دوسرا روز تھا کبیر حسن نے اس سے کوئی مشورہ نہیں لیا، بس خود ہی پروگرام سیٹ کر لیا کہ آگے

صبح انہیں اپنے آبائی گاؤں جانا ہے جہاں ان کے بزرگوں کی قبریں ہیں۔ وہاں سے حاضری کے بعد

انہیں شادی عداقت جات کو لکھنا تھا۔ جویریہ کو کسی سیر و تفریح کا کوئی ارمان نہیں ہو رہا تھا..... مگر وہ ایسی بات ان

سے کہہ تو نہیں سکتی تھی۔ جب مزید کو یہ پتا چلا کہ وہ پندرہ بیس روز کے لئے جا رہی ہے تو اسے بہت ڈک

”آپ نہ جائیں، یہیں رہیں میرے پاس۔“ وہ اسے کہہ رہا تھا۔

سوچا۔ کیا وہ واقعی ایسی ماں تھی جو اپنے چاند سے بیٹے کو چھوڑ کر بی شادی چلے چلی ہو؟
نہیں۔ وہ ایسی لگتی تو نہیں تھی، اس کے چہرے پر تو دکھ اور بے بسی کے سائے تھے۔ وہ بہت
اُداس اور چپ چاپ سی تھی۔ پھر جب میں بچے کو لے کر کمرے سے نکلی تھی، تب وہ کتنا رونے لگی تھی۔
نہیں۔ اُس نے اپنے کو اپنی مرضی سے نہیں چھوڑا، وہ ضرور مجبور تھی۔
مگر کیا مجبور ہی اُس کے ساتھ۔۔۔۔۔ بیگم نے بتایا تھا، وہ اپنے بھائی کے گھر میں رہتی تھی۔ پھر اس
کے ساتھ ایسا کیا ہوا کہ بچے کو الگ کرنا پڑا۔۔۔۔۔؟

سوچ سوچ کر وہ صرف اسی نتیجے پر پہنچ سکی کہ جو یہ یہ نے بچے کو اپنی خوشی سے خود سے الگ نہیں کیا۔
باقی یہ کہ ایسا کیا ہوا تھا اس کے ساتھ جودل پر جبر کر کے جگر کا ٹکڑا اسے سوپ دیا۔ بہت سوپنے کے
بعد بھی وہ کڑی سے کڑی ملانے میں ناکام رہی۔ ہاں اس کے سادہ اور نرم و گداز دل میں یہ بات ضرور
آگئی کہ جو کچھ بھی اس کے ساتھ ہوا سوہوا، وہ اُس عورت پر جو اس بچے کی اصل ماں ہے، ظلم نہیں کرے
گی۔ اُس کے گھر کا چراغ جھین کر اپنے گھر میں آجالا نہیں کرے گی۔

”میں اُس کا بچہ اسے واپس کر دوں گی، میں یہ سمجھ لوں گی، عمر ایک بار پھر آکر چلا گیا اور یہ بچہ بے
چارہ دل میں یاد تو کرتا ہی ہوگا۔۔۔۔۔ ماں تو ماں ہی ہوتی ہے۔“
زیتون طلال کے واپس چلے جانے کے خیال سے ہی رونے لگی مگر ارادہ مضبوط نہیں ہوا۔
صبح کام پر جانے سے پہلے اُس نے طلال کو ساتھ لیا اور ایک بار پھر گیمین کی کوٹھی پر چلی آئی مگر وہاں
تالا پڑا ہوا تھا۔

اب کیا کروں۔۔۔۔۔؟ وہ کچھ دیر وہیں کھڑی سوچتی رہی، ذہن میں یہ خیال اُبھرا کہ اسے اس کوٹھی پر
جانا چاہئے جو اس بچے کے کاموں کی ہے۔ وہ علی اکبر کے ہاں ایک بار طلال کو لینے ہی گئی تھی۔ راستوں
سے اچھی طرح واقف نہیں تھی مگر اندازہ تو کچھ نہ کچھ تھا ہی اور آخر وہ پہنچ ہی گئی مگر وہاں آکر بھی مایوسی
ہوئی، کہ یہاں پر بھی گیٹ پڑا تھا۔

اب کیا کیا جائے۔۔۔۔۔؟ وہ خاصی تھک گئی تھی۔ کچھ دیر بند گیٹ کے سامنے فرش پر بیٹھی رہی۔ پھر
یہ سوچ کر اُنھ کھڑی ہوئی کہ چلو پھر کبھی دوبارہ چکر لگا لوں گی۔۔۔۔۔ طلال کو گود میں اٹھایا اور واپس چل
پڑی۔

اکبر علی اور گیمین تو گرفتاری سے بچ گئے مگر عارفہ کا بھائی جس کے ساتھ مل کر اکبر علی نے یہ بزنس
شروع کیا تھا، وہ گرفتار ہو چکا تھا اور پولیس کی تحویل میں تھا۔۔۔۔۔ اخبارات میں ساری کہانی خاصی تفصیل
کے ساتھ شائع ہو رہی تھی۔ اس کہانی میں اکبر اور گیمین کا نام بھی شامل تھا۔

”اوہ۔۔۔۔۔ تو یہ ہے تمہاری فیملی۔۔۔۔۔ بظاہر تو بڑے معزز بننے ہو تم لوگ۔۔۔۔۔“ اخبار پڑھ کر کبیر حسن
نے عمارت سے جویریہ کی جانب دیکھا اور تسخرانہ انداز میں کہہ کر اخبار اُس کی جانب اُچھال دیا۔ وہ
ان کی بات سمجھی نہیں، اخبار اُٹھا کر دیکھا اور جیسے زمین میں گر گئی۔

”اگر پہلے یہ بات میرے علم میں آ جاتی تو تم سے ہرگز شادی نہیں کرتا۔۔۔۔۔ ہونہ، متمول طر حدار

بر آؤ۔۔۔۔۔ اُسے ساتھ اور اس کے شوہر کو تو پتا ہی نہیں کہ محترمہ ایک عدد بچے کی والدہ بھی ہوتی ہیں۔ اسے لڑ
نہی رہا۔۔۔۔۔ گیمین نے جتنی انداز میں کہہ کر گاڑی آگے بڑھا دی۔

عجیب عورت ہے اُس کی ماں بھی، اپنے دل کا ٹکڑا ایوں دوسروں کو دے دیا۔۔۔۔۔ اگر میرا عمر زندہ
ہوتا تو میں تو اسے کیلچے سے لگا کر رکھتی۔۔۔۔۔ ہانسی ہوتی ہیں یہ امیر ماںیں، اولاد کی محبت ہی نہیں ہوتی، اُن
کے دل میں، بس اپنے ارمانوں کی پڑی رہتی ہے۔۔۔۔۔ میں بھی تو بیوہ ہوتی تھی مگر دوسری شادی کا تو خیال
بھی نہیں آیا دل میں۔“

اسے رہ رہ کر جویریہ پر غصہ آ رہا تھا جس نے اتنے پیارے بچے کو یوں خود سے الگ کر دیا تھا۔ بلکہ
ایک طرح سے بوجھ سمجھ کر پھینک ہی دیا تھا۔۔۔۔۔ وہ طلال کو یونہی گود میں اٹھائے دوبارہ اپنے نونے پھونے
گھر میں چلی آئی۔۔۔۔۔ اسے بستر پر لٹا کر وہ بغور اُس کی صورت دیکھنے لگی، سوچا ہوا طلال بھی ویسا ہی معصوم
تھا جیسا اُس کا عمر۔۔۔۔۔

وہ طلال سے بہت پیار کرتی تھی۔۔۔۔۔ اُس کے آنے سے اس کے دیران گھر میں رونق سی آگئی
تھی۔۔۔۔۔

کیا یہ اب میرا بیٹا ہے۔۔۔۔۔؟ یہ میرا عمر ہے۔۔۔۔۔؟ اس کا دل خوشی سے ہلکنے لگا۔

جس روز وہ طلال کو اپنے گھر لے کر آئی تھی، اُسی روز سے اسے اپنا عمر بہت یاد آنے لگا تھا۔۔۔۔۔
طلال سے۔۔۔۔۔ بہت پیار کرتی تھی مگر یہ خیال کہ یہ بچہ صرف چند روز کے لئے اس کے پاس آیا ہے۔ پھر
واپس اپنی ماں کے پاس چلا جائے گا۔۔۔۔۔ زیتون بی بی کو اُداس کر دیتا تھا، وہ سوچتی، کیسی قسمت ہے زیتون،
تیری خوشی چند روز کے لئے تیرے پاس آتی ہے، پھر ان ہی قدموں پر واپس لوٹ جاتی ہے۔

تیرے میرے گھروں میں کام بننا کہ جب رات کو وہ گھر واپس آتی تو باوجود شدید تھکن کے اسے
نیند نہیں آتی تھی۔ یادوں کی بارات پورے جوش و خروش کے ساتھ اس دیران گھر میں اُتر آتی تھی اور اسے
خون کے آنسو لاتی تھی مگر جب سے طلال آیا تھا جیسے زندگی سانس لینے لگی تھی۔ اب گیمین نے کہا تھا وہ ان
بچے کو ہمیشہ کے لئے اپنے پاس رکھ سکتی ہے۔ اُس نے خوشی سے بے قابو ہو کر طلال کا ہاتھ چوم لیا۔

شروع شروع میں طلال بہت اُداس اور پریشان رہا تھا، وہ گھٹ گھٹ کر رویا کرتا تھا۔۔۔۔۔ اور
ڈری ڈری آواز میں ماں کو پکارتا تھا۔ مگر اب زیتون کی محبت نے اسے کسی حد تک بہلا لیا تھا۔ وہ اس
سے مانوس ہو گیا تھا۔ وہ بانہیں پھیلاتی تو دو دو کر ان میں سا جاتا۔

آج زیتون سوچ رہی تھی ”جب چند دنوں میں اس حد تک بہل سکتا ہے تو پھر تھوڑی سی مدت اور
گزر جانے کے بعد تو یہ سر سے پاؤں تک میرا ہوگا۔۔۔۔۔ سگی ماں کو تو بالکل ہی بھول جائے گا۔ مجھے ہی اپنی
ماں سمجھا کرے گا اور اب میں اسے عمر کہہ کر بلاؤں گی۔ اس کی ماں نے تو قدر نہیں کی اس کی، مگر میں اسے
شہزادہ بنا کر رکھوں گی، خود دیکھی سوکھی کھالوں کی مگر عمر کی خواہش ضرور پوری کروں گی، اسے پڑھا لکھا کر
بڑا افسر بناؤں گی۔“

آنے والے تین چار روز تک تو مکمل طور پر اسی سرشاری کے زیر اثر رہی کہ اللہ سائیں کو اس کی شہ
اُداس زندگی پر رحم آگیا ہے اور انہوں نے طلال کی صورت میں اُسے پھر سے نوازا دیا ہے۔ مگر پھر ایک
رات جب طلال اُس کے پہلو میں سو رہا تھا، اُس نے اپنی خوشی کو ایک جانب رکھ کر جویریہ کے بارے میں

تھی..... مزید اس کی حالت سے پریشان ہو کر بار بار وجہ پوچھتا تھا، کبھی پانی پلانے کی کوشش کرتا تو کبھی پیشانی پر آئے بال ہٹا کر آنسو پونچھتا۔
”مہا..... کسی نے مارا ہے آپ کو؟“ بیانے کچھ کہہ دیا کیا.....؟“ وہ پوچھ رہا تھا مگر جویریہ جواب دینے سے قاصر تھی۔ مسلسل رونے اور پریشانی نے اس کی حالت خراب کر دی تھی۔
”میں ڈاکٹر انکل کو فون کرتا ہوں۔“



وقت کب رکتا ہے، اس کا پتہ اپنی مخصوص رفتار کے ساتھ چلتا رہتا ہے..... کیسے کیسے ارادے، کیا کیا خواب اور کیسی کیسی امیدیں اس کے پاؤں تلے آکر چلی جاتی ہیں..... رفتار تو بہت تیز ہے اس کی مگر پاؤں بہت ہی دبا کر رکھتا ہے، یوں کہ کسی کو آہٹ بھی محسوس نہیں ہوتی..... ہاں نشان چھوڑ جاتا ہے، چہروں پر، یادوں پر اور آنکھوں میں۔

کھلی جس آئینہ میں ننھے قدموں کے نشان تھے، آج وہاں شہنائی کی گونج ہے۔ ستارہ کی شادی ہے، کبریٰ نے یہ رشتہ اپنی مرضی سے کیا ہے، اپنے نئے بھانجے کے ساتھ..... شاہجی نے اعتراض بھی نہیں کیا اور کبریٰ نے بیٹی کی ڈولی ایک شان سے رخصت کی ہے۔

ستارہ کی شادی تو شاید صرف اور صرف کبریٰ خاتون کے لئے اہم رہی ہوگی مگر ارد شیر کاٹل کے امتحان میں پاس ہو جانا تو سب کے لئے اہم ہے۔ راحت کہتی ہے سارے گاؤں میں مٹھائی بانٹوں گی، پھر اپنے بیٹے کی نظر اتاروں گی، صدقے خیرات کروں گی..... ارد شیر کرسی پر ایک شان سے براجمان ماں کی خوشی کو شکر اکر دیکھ رہا تھا۔

راحت نے قریب آکر اس کی پیشانی پر ایک بار پھر بوسہ دیا..... اور بولی۔
”کل ہی کی تو بات لگتی ہے، جب ہم نے تمہیں اسکول میں داخل کروایا تھا..... وقت کیسے گزر گیا۔ ہاتھی نہیں چلا اور میرا بیٹا جوان ہو کر میرا مان، میرا فخر اور میری ڈھال بن گیا ہے۔“

پندرہ سالہ ارد شیر ہنس پڑا اور بولا..... ”آپ کو کس سے خطرہ ہے جو ڈھال کی ضرورت ہے۔“
”خطرے تو ہوتے ہیں بیٹا مگر خیر تم چھوڑو ان باتوں کو، یہ بتاؤ آج کھانے پر کیا بناؤ اپنے بیٹے کے لئے.....؟“

”چھوٹے سرکار، مجھے آم کا مربہ بنانا آتا ہے بناؤں آپ کے لئے.....؟“ ایک نوجوان تیزی ملازمہ بڑی شوقی سے پوچھ رہی تھی۔

وہ تھا تو ابھی صرف پندرہ سال کا لیکن صحت اور قد کاٹھ کی وجہ سے اپنی عمر سے خاصا بڑا بڑا اور بھرپور دکھائی دیتا تھا اور اسی وجہ سے اب کچھ نوجوان ملازموں کے دل حویلی میں زیادہ کھنکھنے لگے تھے حالانکہ وہ ڈانٹ ڈپٹ کر ہی بات کرتا تھا، ان بچہ ذات کے لوگوں کو نہیں لگتا تھا مگر وہ منتظر تھے کہ ابھی چھوٹا بھی تو تھا مگر وہ دن دور نہیں تھے۔ جب اسے کورس کی کتابوں کے علاوہ آنکھوں کے سوال اور چہرے پر لکھی آن کئی کہانیاں بھی پڑھنی آ جانی تھیں۔

کھل رخ نے بھی ہڈل کا امتحان ارد شیر کے ساتھ ہی دیا تھا اور اس سے کہیں زیادہ نمبر لے کر کامیابی حاصل کی تھی۔ مگر اس بات کی خبر کسی کو بھی نہیں تھی۔

فیملی..... ان کا انداز ہنک آمیز تھا..... جویریہ سر جھکائے یہ سب سننے پر مجبور تھی..... اپنی صفائی میں کب کہنا بات گمانے کے مترادف تھا..... اتنا تو انکس اب وہ جاننے ہی لگی تھی، وہ رائے قائم کرنے اور پھر ہار پڑٹ جانے کے عادی تھے۔

بھائی کا بزنس کیا ہے، یہ بات تو اسے خود بھی آج کا اخبار دیکھنے کے بعد ہی معلوم ہوئی تھی مگر ایسے مرد سے کیا کہنا جو رائے قائم کرنے میں بہت جلدی کرتا تھا۔

وہ یہ بھی جان چکی تھی کہ اس کا یہ شوہر کسی کو زیادہ دیر تک اہمیت دینے کا قائل بھی نہیں، اسے اپنی ذات سے بے حد لگاؤ ہے اور خود پر خطرناک حد تک مان ہے، وہ خود کو بے حد ذہین اور باخبر تصور کرتا ہے۔ باقی کے لوگ اس کے لئے ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔

جویریہ اور کبیر حسن آج ہی شہر سے واپس آئے تھے۔ جویریہ طلال کے لئے بہت اُداس ہو رہی تھی، وہ سوچ رہی تھی کہ جیسے ہی کبیر آفس جائیں گے، وہ گاڑی لے کر گنبدنہ آ پا کی طرف چلی جائے گی، طلال سے مل کر آئے گی اور آپا سے مشورہ لے گی کہ اُسے کن الفاظ میں اور کس طریقے سے یہ سب کچھ کبیر کو بتا چاہئے، بے شک وہ ان سب لوگوں سے دل ہی دل میں ناراض تھی کہ انہوں نے کبیر سے شادی کر کے اور بچے کے بارے میں اسے کچھ نہ بتا کر جویریہ کے ساتھ بہت زیادتی کی تھی مگر ان چند دنوں میں جو اُس نے کبیر کے ساتھ گزارے اسے احساس ہو گیا تھا کہ یہ مرد دل کی جگہ سینے میں پھر رکھتا ہے۔

اور وہ کبیر حسن سے کچھ خوفزدہ بھی ہو گئی تھی۔ اب وہ کسی ہمدرد اور ننگسار دوست کی آرزو رکھتی تھی۔ بھائی سے اُسے کسی ہمدردی کی توقع نہیں تھی ہاں البتہ گنبدنہ شاید کچھ رہنمائی کر سکے۔ اسے یہ خیال بھی تھا کہ ممکن ہے وہ عورت طلال کو گنبدنہ یا بھائی جان کی طرف چھوڑ کر چلی گئی ہو کہ دن بھی تو بہت ہو گئے تھے مگر اب ناشتے کی فیل پراخبار ایک پریشان کن خبر کے ساتھ موجود تھا اور وہ سوچ رہی تھی، طلال اب کہاں ہوگا اور کس حال میں ہوگا.....؟

کبیر حسن بٹو بٹاتے رہے اور ناشتا کرتے رہے جبکہ وہ دونوں ہاتھ گود میں رکھے خاموش بیٹھی رہی۔

ناشتے کے بعد وہ آفس کے لئے روانہ ہوئے تو وہ بھی عجلت..... میں باہر آگئی..... ڈرائیور کو بھائی کے گھر کا ایڈریس (جس سے وہ خود بھی پوری طرح واقف نہ تھی) سمجھانے لگی۔ خاصی دیر کے بعد جا کر وہ مطلوبہ مقام تک پہنچ گئی، یہاں تالا تھا۔ جبکہ وہ اس خیال سے آئی تھی کہ شاید ملازم موجود ہوں گے، اب اُس نے ڈرائیور سے گنبدنہ کے ہاں چلنے کو کہا..... ایڈریس وہ نہیں جانتی تھی مگر ڈرائیور خود گنبدنہ بیگم کی کوئی سے واقف تھا۔

شاید وہاں کوئی موجود ہو..... ممکن ہے طلال سے وہاں ملاقات ہو جائے، وہ دیکھ بھی مانگ رہی تھی اور امید بھی کر رہی تھی مگر اس کے باوجود دل گھبرا رہا تھا اور وہ اگر طلال وہاں نہ ہوا تو، کی گردان سے خفت پریشان بھی ہو رہی تھی، یہاں بھی گیٹ پرتالا تھا۔ اس کا دھک سے رہ گیا۔

”میرا بچہ..... اگر یہ لوگ واقعی ملک سے فرار ہو گئے ہیں تو پھر میں اس عورت کو کیسے تلاش کروں گی.....؟“ اس کا ذہن تاریکیوں میں ڈوبنے کو تھا اور آنکھوں میں پانیوں کا سمندر تھا..... گھر آتے ہی ”بیڈ پر گر پڑی..... اور ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے۔ وہ بے قراری کے عالم میں زور زور سے رو رہی

لو کی تھی اور گر بھی خوب جانتی تھی۔ بے شک ارد شیر ابھی چھوٹا تھا مگر بچہ تو نہیں تھا اور پھر کبریٰ تو..... ارد شیر سے اکثر کام نو جوان ملازماؤں سے ہی کرواتی تھیں، یہاں تک کہ سر میں تیل ڈالنا ہوتا تو بھی مہراں یا شاداں کو ہی آواز دیتی تھیں۔

جبکہ راحت بیگم نو جوان ملازماؤں کو ارد شیر کے قریب دیکھ کر جھڑک دیتی تھیں اور ان کی کوشش ہوتی تھی کہ یہ لڑکیاں زیادہ تر باورچی خانے کا کام ہی بنائیں۔ ادھر ادھر چٹکتی مٹکتی، مسکراتی شرماتی..... اور ارد شیر کو غیر ارادی طور پر ہی دیکھتی ہوئی نہ نظر آئیں۔

وہ بے وفا نہیں تھی، اسے زمانے نے ستایا تھا..... اُس کے بُت کو کسی اور کے حوالے کر دیا تھا مگر دل جہاں تھا، وہیں رہ گیا۔ کتنے جگ بیٹے، کیسے کیسے موسم آئے مگر دل میں ایک ہی موسم ٹھہرا..... یاد کا موسم..... وہ ناصر کو کبھی نہیں بھول سکی۔ جب کبیر حسن قریب ہوتے تب بھی وہ ناصر کو محسوس کرتی اور ایسا کرتے اُسے کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ وہ کبیر حسن کے ساتھ بددیانتی کر رہی ہے، وہ خود کو حق بجانب سمجھتی تھی۔

اگر یہاں اس کے گھر میں یہ بچہ مزید نہ ہوتا تو جویریہ کے لئے ایک ایک دن کا ٹاپا پھاڑ کے برابر ہو جاتا۔

اور جب شادی کے ایک برس بعد لیڈی ڈاکٹر نے ایک نئے وجود کی آمد کی خبر دی تھی..... تو اُس کی پلکوں پر ستارے چمکنے لگے تھے۔ اسے ناصر سے انتہا یاد آیا۔ اس کے کہے الفاظ کانوں میں گونجنے لگے۔ جیسے کل ہی تو ناصر نے کہا تھا، ہم اپنی بیٹی کا نام رانچہ رکھیں گے۔

اور جب بیٹی ہوئی تو اُس نے واقعی اس کا نام رانچہ رکھ دیا..... وہ ناصر کی بیٹی تو نہیں تھی مگر پھر بھی جویریہ نے اسے یہ نام دے دیا اور بازو آنکھوں پر رکھے بے آواز روتی چلی گئی۔

مزید سمجھی سی بہن باکر بہت خوش تھا، جبکہ جویریہ خاموش اور آداس، آج بھی اپنی سوچوں میں اُبھی ہوئی تھی، دل کا ایک ٹکڑا تو اس کے برابر میں پڑا تھا مگر دوسرا کہاں ہوگا اور کس حال میں ہوگا..... طلال، میرے لال، میرے چاند.....

جب رانچہ تین سال کی تھی، تب کبیر کی بہن واجدہ اپنی فیملی کے ساتھ مستقل قیام کے لئے اُن کے ہاں آگئیں کہ ان کے شوہر نے اس شہر میں ایک ٹھیکہ لیا تھا۔ جویریہ کو ان کی آمد پر خوشی ہوئی کہ چلو کوئی بات کرنے والا تو ہوگا۔ اُس نے خود اپنی گھرانی میں ملازموں سے اُپر والا پورشن سیٹ کر دیا۔ مگر واجدہ کی آمد کے چند روز بعد ہی اسے اندازہ ہو گیا تھا، واجدہ صرف روایتی نند تھیں۔ جویریہ کے ساتھ کبھی زیادہ بات نہیں کرتی تھیں۔ اگر وہ اوپر اُن کے پاس آتی تو ادھر ادھر کی فضول کاموں میں اُبھی خود کو بہت مصروف ظاہر کرتی تھیں، وہ بھی سمجھ گئی اور ان کے پاس جانا کم کر دیا۔

ہاں اپنے بھائی کے ساتھ واجدہ خوب باتیں کرتی تھیں۔ اگر وہ گھر پر ہوتے تو نیچے آتیں، رانچہ سے پیار کرتیں اور جویریہ سے بھی خوب فہم فہم باتیں ہوتیں..... وہ ان کی دوغلی قالین پر حیران تھیں مگر کچھ کہنے سے قاصر تھی کہ کبیر بہن کے ساتھ کافی نرم اور سادہ رویے سے مخاطب ہوتے تھے۔ واجدہ کے متعلق مزید بتاتا تھا کہ وہ اس سے بالکل پیار نہیں کیا کرتیں۔ جویریہ کی شادی سے پہلے دونوں

”میں کچھ کہنا چاہتا تھا آپ سے بابا جان۔“
”ہاں ہاں، کہو پتر.....“ اُن کی آنکھوں میں، اُن کے چہرے پر، اُس کے لئے شفقت ہی شفقت تھی۔

”میں اب شہر کے کسی اچھے اسکول میں ایڈمیشن لوں گا..... گاؤں کے اسکول سے میٹرک کرنے کی جی نہیں چاہتا.....“ اُس کا انداز اطلاع دینے والا تھا، اجازت طلب کرنے والا ہرگز نہیں تھا۔

”جیسے میرے شہزادے کی مرضی..... شہر میں بھی رہائش کا کوئی مسئلہ نہیں، تین کوٹھیاں ہیں وہاں اپنی، اور تینوں ہی میں نے تمہارے نام کی ہوئی ہیں۔“

”اچھا بابا، یہ تو آپ نے کبھی مجھے بتایا ہی نہیں۔“
”بتانے والی کیا بات ہے پتر، ساری جائیداد ہی تمہاری ہے۔“

”مگر وہ کوٹھیاں آپ نے میرے نام کیوں کر دیں۔“
”بس ایسے ہی..... جب بخوائی تھیں، تب ہی اس ارادے سے بخوائی تھیں..... تم شہر کے اسکول

میں ضرور داخلہ لے لو..... ہاسٹل میں نہیں رہنا پڑے گا۔ جس کو بھی کو پسند کرو گے، میں وہیں رہائش کا پورا بندوبست کروادوں گا..... جتنے چاہو نوکر چاکر یہاں گاؤں سے اپنے ساتھ لے جاتا۔“

”ٹھیک ہے بابا جان..... اور ذرا چانی دیجئے گا، انہوں نے چانی اسے تمہادی، اس ہدایت کے ساتھ کہ گاڑی تیز نہ چلانا..... وہ ہمیشہ ایسا ہی کہتے تھے۔ باقی بات ماننا یا نہ ماننا، یہ تو ارد شیر کی اپنی مرضی پر تھا۔

ارد شیر چابی ہاتھ میں پکڑے زنا نہ حصہ کر اس کر کے باہر کے احاطے میں آیا..... اور سامنے سے آتی مہراں کی آنکھیں، اس پر نظر پڑے ہی جھک گئیں۔ سانولی رنگت میں چمک آمگنی..... سر پر رکھا ٹکڑا اُس نے نیچے پھینک دیا اور بظاہر دوپٹہ درست کرتی اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔

”سلام چھوٹے شاہجی۔“ ماتھے تک ہاتھ لے کر اُس نے نکلتے ہوئے لہجہ میں سلام کیا۔
”ولیکم.....“ ارد شیر نے خاص نوٹس نہیں لیا۔

”میں نے سنا ہے سرکار استخوانوں میں پاس ہو گئے ہیں جی۔“
”ہاں.....“ ارد شیر اب چلتے چلتے رک گیا اور جیب میں ہاتھ ڈال کر پیسے نکالنے لگا۔ وہ مہراں کی

بات سمجھ جو گیا تھا..... پیسے نکال کر اس کی جانب بڑھائے..... اُس نے جھٹ پکڑ لئے۔ پھر بولی۔
”میرے سرکار، میں نے اس لئے تو مبارکباد نہیں دی تھی۔ میڈاسو ہنا جن داٹوٹا ہے (میرا سوہنا

چاند کا ٹکڑا ہے) ایسا گھبرو ہوگا کوئی پورے پنڈ میں۔“
ارد شیر اس خوشامد انداز سے کیا پھلتا کہ یہ سب بچپن سے سنتا آرہا تھا..... اب تو عادی ہو گیا تھا

اور یقین بھی تھا کہ ہاں میں واقعی اس قابل ہوں کہ یہ سب کہلا سکوں۔ اب تو کوئی اگر سر ہے بغیر گزر جاتا تو حیرت ہو سکتی تھی۔

وہ اپنے مخصوص انداز میں سر کو بائیں شانے کی جانب تھوڑا سا خم دیئے پاؤں زمین پر پوری طاقت سے جما کر رکھتا گاڑی تک آ گیا۔

مہراں نے ٹکڑا ایک بار پھر سر پر رکھا اور زنانے کی طرف چل دی۔ وہ بیس اکیس برس کی بڑی تیز

تہیں بھی تو کام ہیں بس۔“
”اکیلی کھلیوں۔۔۔۔۔؟“ وہ منہ بنا کر بولی۔

”اس سے پہلے بھی تو اکیلی ہی کھیتی رہی ہو، آج زیادہ احساس کیوں ہو رہا ہے۔۔۔؟ چلو میں تمہارے ساتھ کھیتا ہوں۔“
”آپ سے۔۔۔“ وہ کھٹکھٹائی۔

”اگلے لڑکی، اس میں اتنا ہنسنے کی کیا بات ہے۔۔۔؟“ وہ خود بھی مسکرا دیا۔
”آپ تو لڑکے ہیں اور مجھ سے اتنے بڑے بھی ہیں۔۔۔ آپ کے ساتھ میں بھلا کیا کھیلوں گی۔۔۔؟“

”میں تمہاری خاطر بور سے بور کھیلنے کو بھی تیار ہوں۔۔۔ ہاں بس ایک درخواست ہے گڑیا کے کپڑے مت سلوانے لگنا، یہ کام مجھے نہیں آتا۔“

”تمہیں کچھ بھی نہیں آتا سوائے باتیں بنانے کے۔“ جویریہ نے چھیڑا۔
”ہاں تو کوئی شک ہے۔“ جویریہ نے ہنسی دہائی۔

”وہ جی چھوٹے صاحب، آپ کو پھوپھو بیگم صاحبہ بلا رہی ہیں۔“ ملازمہ نے آکر پیغام دیا
(مزید اور رانچہ کی دیکھا دیکھی گھر کے ملازم بھی انہیں پھوپھو کہنے لگے تھے۔)
”ہوں۔۔۔۔۔ اب کوئی ندرہ کے، اس لڑکے کو پیاری پھوپھو نے بلایا ہے۔“

”صرف پیاری نہیں، راج ڈلاری بھی کہیں۔“ اس نے جاتے جاتے مڑ کر جویریہ کی طرف دیکھا۔

”پتا نہیں تمہاری پھوپھو کو تم سے کیا باتیں کرنی ہوتی ہیں جودن میں کئی کئی بار بلاتی ہیں اور تم بھی دوڑے دوڑے جاتے ہو۔“ اب وہ سنجیدہ ہو گئیں۔

”میں پھوپھو سے ملنے تھوڑی جاتا ہوں۔۔۔۔۔ میری دوستی تو ان کی ساس سے ہے۔“
”جھوٹ ممّا، بھائی جھوٹ بول رہے ہیں، دادی تو اپنے کمرے میں ہوتی ہیں، یہ پھوپھو اور ان کے بچوں کے پاس بیٹھے رہتے ہیں۔“ رانچہ بول اٹھی۔

”ہاں۔۔۔۔۔ کاش جتنا ناگم تم ہماری جاسوسی پر ضائع کرتی ہو، اتنا اپنی پڑھائی کو دیا کر دیتا نہیں کہاں سے کہاں پہنچ جاؤ، کیوں ممّا، ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں میں۔“

”میرا خیال ہے تم نے آج تک کبھی کوئی غلط بات نہیں کی۔“
”شکر بہ شکر یہ، ذرہ نوازی ہے آپ کی۔۔۔۔۔ اچھا اب میں چلوں۔۔۔۔۔ وہ بے چاری راہوں میں پلکیں بچھائے بیٹھی ہوں گی۔“

وہ دروازے تک گیا پھر رُک کر ماں کی طرف دیکھا اور وہیں سے بولا۔
”انتظار کرتا، واپسی پر چھوٹی بھر کر مزے مزے کی خبریں لے کر آؤں گا۔“
”اگر جو تمہاری پھوپھو کو کلم ہو جائے کہ تم ایک ایک بات نیچے آکر مجھے بتاتے ہو تو سوچو ذرا، کیا حال گا ان کا۔“

ماں کی بات پر وہ قہقہہ لگا کر ہنسا اور بولا۔

پھوپھو کی کارویہ اس بچے کے ساتھ اچھا نہیں تھا مگر اب وہ مزید بہت پیار جتاتی تھیں۔ جب اوپر جاتا، اسے پیار سے پاس بٹھا لیتیں اور جویریہ کے متعلق کرید کرید کر سوال کرتیں اور اسے جویریہ کے خلاف بھڑکانے کی بھی کوشش کرتیں۔

ایک تو یہ کہ مزید نے ماں کی وفات کے بعد پھوپھو کی کارویہ اپنے ساتھ دیکھا تھا، اس سے وہ انہیں ناپسند کرتا تھا اور دوسری بات جو جویریہ کے حق میں جاتی تھی، وہ یہ تھی کہ واجدہ شادی کے شروع دن سے ان کے ساتھ نہیں رہیں بلکہ چار سال بعد آئی تھیں۔ تب تک مزید جویریہ کے بہت قریب آچکا تھا اور سمجھدار بھی ہو گیا تھا۔ ایسی باتیں اسے ماں سے بدظن نہیں کر سکتی تھیں۔ واجدہ پھوپھو جو جو باتیں کرتیں وہ سب آکر جویریہ کو بتا دیتا۔

”تم مجھے اچھی طرح جانتے ہو، میں کوئی ایسی ہوں بھلا۔“ وہ گھبرا کر مزید سے کہتی۔

”آپ تو میری ماما ہیں۔۔۔۔۔ بھلا بچے دوسروں کی باتوں میں آکر اپنی ماما کو چھوڑ سکتے ہیں۔۔۔۔۔؟“ وہ سراسر کے بازو رنکا کر برابر میں بیٹھ جاتا۔

”تم ان کی باتوں میں کبھی نہ آتا۔۔۔۔۔“ وہ پھر کہتی۔

تب مزید جلدی سے اثبات میں سر ہلا دیتا۔

اور واقعی اس نے اپنا وعدہ بچ کر دکھایا تھا۔۔۔۔۔ اب عمر کے پندرہویں برس میں وہ میٹرک کا اسٹوڈنٹ تھا اور ماں اور بہن سے پیار کا وہی عالم آج بھی تھا۔ جبکہ واجدہ نے روزاؤل والا فاصلہ اب بھی برقرار رکھا تھا۔ رانچہ کہتی۔۔۔۔۔

”میرا کنٹادل چاہتا ہے، میری بھی کوئی بہن ہوتی۔۔۔۔۔ مگر میں مہناز باجی ہیں، نزہت باجی ہیں مگر وہ تو مجھ سے بات بھی نہیں کرتیں۔“ وہ واجدہ کی دونوں بیٹیوں کی بات کرتی۔

”وہ تم سے بڑی ہیں، تم سے کیا بات کریں۔۔۔۔۔؟“ جویریہ سمجھاتی۔

”چلیں نزہت آپنی تو بہت بڑی ہیں مجھ سے، وہ تو بھائی سے بھی بہت بڑی ہیں مگر مہناز باجی تو کچھ زیادہ بڑی نہیں مجھ سے اور بھائی سے تو بہت دوستی ہے ان کی، بس مجھ سے بات کرنا پسند نہیں۔“

”اچھا۔۔۔۔۔ اب سمجھا، اصل تکلیف تو یہ ہے کہ مجھ سے اتنی دوستی کیوں ہے۔۔۔۔۔؟“ مزید کتاب بند کر کے بظاہر لڑنے کے انداز میں بولا۔

”دیکھ لیں ممّا، اب بھائی خود لڑائی کرنا چاہ رہے ہیں، میں کچھ کہوں گی تو آپ ڈانٹیں گی کہ بڑا بھائی ہے، ادب سے بات کیا کرو۔“

”ہاں بھئی بڑے بھائی، تمہیں خود اپنی بزرگی کا خیال کرنا چاہئے۔“ جویریہ ہنس کر مزید سے کہنے لگی۔

”ممّا۔۔۔۔۔ آپ بھی بھیا کی سائیڈ لے رہی ہیں۔“ رانچہ نے شور مچایا۔

”ہاں لے رہی ہیں میری سائیڈ۔۔۔۔۔ چلو تم جا کر نماز پڑھو۔“ پھر جویریہ سے بولا۔ ”اسے تو آپ نے کئی مٹائی بنادیا ہے، نماز قرآن، روزے وغیرہ وغیرہ۔“

”اور آپ کو تو یہ بھی نہیں پتا کہ اس وقت کوئی نماز نہیں پڑھی جاتی۔“

”ہیں۔۔۔۔۔ تم ابھی تک بیٹھیں کھڑی ہو، گئی نہیں۔۔۔۔۔ اگر نماز کا وقت نہیں ہے تو گزروں سے کھلیو،

”ہاں ہمارے پاس تو کم ہی بیٹھنا پسند کرتی ہیں بھائی بیگم، چلو کوئی بات نہیں، اللہ خوش رکھے، سدا سہاگن رکھے۔“ واجدہ نے جتنا کر بھی جیسے کچھ بھی نہیں بتایا۔
”وہ نماز پڑھ رہی ہیں۔“ ملازم لوگ بھی گھر کے افراد کو پہچانتے ہیں۔ جویریہ کی عادات و اخلاق سے سب ہی متاثر تھے، ملازمہ سچی بات کہہ کر چلی گئی۔
”کچھ دیر دونوں خاموشی سے چائے پیتے رہے پھر واجدہ بولیں۔
”میں تمہارے پاس ایک کام سے آئی تھی کبیر۔“
”جی حکم کریں آپا۔“

”کیسا حکم بھائی، میں تو تم سے سخت شرمندہ ہوں۔ بیاہ ہونے کے باوجود تم پر بوجھ ہوں مگر کیا کہوں، کس سے کہوں.....؟ ایک تم ہی تو ہواں بھی، باپ بھی اور بھائی بھی، میرا ایکہ تمہارے ہی دم سے آباد ہے، فریاد لے کر یہیں تو آؤں گی میں، سچ تو یہ کہ میرے بچوں کو ان کا باپ نہیں پال رہا، تم پال رہے ہو۔“

”آپا..... آپ کہیں تو.....“ واجدہ کی محبتوں کا اظہار، اس کے احسانوں کا اتنی درد مندی سے ذکر، وہ تو بہن اور اس کے بچوں کے لئے جیسے سب کچھ لانے پر تیار ہو گئے تھے۔

”پانچ ہزار روپے کی ضرورت آن بڑی ہے..... اچانک ہی، تمہارے لئے تو معمولی رقم ہے مگر غریب بہن کے لئے کسی بڑے خزانے سے کم نہیں..... سخت مشکل ہے، کئی دن سوچتی رہی نکلتی رہی کہ تم سے مانگنا بھی تو اچھا نہیں لگتا مگر بہت ہی مجبوری کے عالم میں آج آئی گئی ہوں۔“

”اوہو..... آپا، آپ کا حق بنتا ہے مجھ پر، جب بھی ضرورت ہو بلا جھجک کہا کریں مجھ سے۔“ وہ اٹھے اور رقم نکال کر انہیں تمھادی۔ پھر بولے۔

”آپ کی ساس صاحبہ کا کیا حال ہے.....؟ مزید بتا رہا تھا چند روز پہلے کہ ریحان کی دادی بیمار ہیں، میں مصروفیت میں گھر آ رہا، حال پوچھنے نہیں آسکا۔“

”ارے چھوڑو کبیر، اُن کی کیا پوچھتے ہو، اچھی بھلی صحت مند ہیں، اس بڑھاپے میں بھی ہم سے زیادہ طاقت ہے، ان کے جسم میں۔ بس ذرا بخار کیا ہوا، شور مچا چکا کہ گھر سے پر اٹھا لیا بڑی بی نے اور دیکھ لو، یہ صحت مندی ہی تو ہے کہ دروازے میں بخار کو مار بھگا یا اور تیسرے روز بھلی چٹکی ہو گئیں بڑی بی.....

اور وہ جو ہمارے میاں صاحب ہیں، بس بھائی قسمت ہی کی خرابی کہوں گی میں اسے، انہیں نہ تو میری کوئی پروا..... ہے اور نہ ہی اپنے بچوں کی فکر ہے۔ بس ہر دم ماں کا خیال ہی رہتا ہے، ان میں ہی دم انکار ہوتا ہے، بیوی بچے چاہے بھوکو مریں، بس ماں کو پھل فروٹ سب ملنا چاہئے۔ میں تو کہتی ہوں، یہ تمہارا دم ہی ہے جو میرے بچے پل رہے ہیں ورنہ ان معصوموں کو تو کوئی پوچھنے والا نہیں تھا۔ میں تو بچوں کو کبھی سمجھاتی ہوں، ماموں کی ہمیشہ عزت کرنا، ان کے اس احسان کو کبھی نہ بھلا نا۔“

”اوہو..... آپا احسان کیسا، وہ آپ کے بچے ہیں، اس تعلق کی بناء پر میرا بہت قریبی رشتہ ہے، ان کا حق ہے میرے گھر پر۔“

”اچھا بھائی، میں چلتی ہوں..... تم بھی آرام کرو..... کسی پاگل ہوں میں، تمہاری تحن کا بھی احساس نہیں کیا اور اپنی کہانی لے بیٹھی۔“ مقصد تو پورا ہو گیا تھا، روپے ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں

”ہاں چویشن تو شاندار ہوگی.....“ پھر وہ ہاتھ ہلا کر چلا گیا، جویریہ بعد میں بھی بیٹھی اُس کی باتوں پر ہنستی رہی۔

اُسے گئے ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ کبیر حسن گھر آ گئے۔ جویریہ ان کے آتے پہ پوری طرح الرٹ دکھائی دینے لگی۔ پہلے بریف کیس اور کوٹ لے کر رکھا پھر ادب کے ساتھ چائے پانی کے بارے میں پوچھا۔

”مزید کہاں ہے.....؟“ اُس کی بات نظر انداز کر کے بیٹے کے بارے میں پوچھا۔
”ابھی ابھی آپا جان کی طرف گیا ہے، بلوایا تھا انہوں نے، آپ کہیں تو بلا لیتی ہوں۔“
”نہیں رہنے دو۔“

”چائے منگو آؤں آپ کے لئے.....؟“ جویریہ نے دوبارہ پوچھا۔
”ہوں.....“ مختصر اکہہ کر وہ صوفے پر آ بیٹھے۔

رائحہ اب تک خاموش بیٹھی باپ کو دیکھ رہی تھی..... انہوں نے بیٹی کی طرف دیکھا اور جانے کیے شفقت سے مسکرا دیئے۔

”کیا حال ہے بیٹی کا.....؟“ رائحہ کے حصے میں ان کی اتنی توجہ کم ہی آتی تھی، انہیں متوجہ پا کر کھل سی گئی۔

”آگئے کبیر تم، میں نے اوپر سے گاڑی دیکھ لی تھی۔“ وہ مسکراتی ہوئی بھائی سے مخاطب تھیں۔
”آؤ آپا، بیٹھو۔“ اپنے موڈ پر قابو پا کر وہ بولے۔

”اے بھائی، ہمیں بھی چائے پلا دو، عنایت ہوگی۔“ واجدہ کی ہمیشہ سے یہ کوشش رہی تھی کہ جب وہ بھائی کے پاس بیٹھی ہوں تو جویریہ وہاں موجود نہ ہو، جویریہ بھی سمجھتی تو تھی مگر پھر بھی خاموشی سے ہٹ جاتی اور کبھی جتنی بھی نہیں تھی۔

”کیا بات ہے، طبیعت تو ٹھیک ہے ناں تمہاری بہت تھکے تھکے سے لگ رہے ہو.....؟“
”ہاں بس ٹھیک ہی ہوں۔“

”ایسے نہیں، اپنی صحت کا خیال رکھا کرو، بیوی کو فکر ہو یا نہ ہو، ہم بہنوں کو تو ہر دم خیال رہتا ہے تمہارا، دُعا کے لئے ہاتھ اٹھاتی ہوں تو بچی بات ہے، اپنے بچوں اور میاں کے لئے بعد میں، پہلے تمہارے لئے دُعا کرتی ہوں، تم ہم بہنوں کے لئے ٹھنڈی چھائوں ہو، ہمیں دیکھو دیکھو کچھ جیتی ہیں، ہم تو۔“

”میں سمجھتا ہوں آپا.....“ اتنی محبت کا اظہار انہیں ممنون کر رہا تھا اور لہجہ بے حد نرم اور محبت بھرا تھا۔
”بڑی دیر ہوگئی ہماری بھائی صاحبہ چائے لے کر نہیں آئیں شاید ہمیشہ کی طرح بھول گئی ہوں گی، خیر کوئی بات نہیں.....“ آواز میں اچانک ہی مظلومیت کھل گئی..... کبیر حسن تو پہلے ہی بغیر کسی وجہ کے جویریہ سے ناراض بیٹھے تھے، اب تو ایک معقول وجہ بن گئی تھی۔ غصے کے عالم میں دروازے کی جانب دیکھ اور شکر ہوا کہ اُسی وقت ملازمہ ٹرے میں چائے کے برتن سجائے ہلکا سا ناک کرنے کے بعد اندر آ گئی۔

”بیگم صاحبہ کہاں ہیں تمہاری.....؟“ کبیر نے پوچھا۔
”وہ بے بی (رائحہ) کے بیڈروم میں ہیں جی۔“

”تھیں کیا دکھ ہے بی بی.....؟“ آخر فاطمہ کو خود پوچھنا پڑا۔
 ”شاہ بی بی.....“ اُس نے چونک کر سر اٹھایا۔ پھر اپنی جگہ سے اٹھ کر فاطمہ کے پلنگ کے پاس فرش پر بھی در پڑ بیٹھی اور بولی۔ ”مجھے بیٹا چاہئے شاہ بی بی، دُعا کریں آپ میرے حق میں۔“
 ”بیٹا چاہئے.....؟ فاطمہ نے بغور اُس کی جانب دیکھا۔
 اُس نے اثبات میں سر ہلادیا۔
 ”کیوں.....؟“ فاطمہ کے لہجہ میں اچانک ہی سختی آگئی۔

”شاہ بی بی، اگر بیٹا نہ ہوا تو میرا شوہر دوسری عورت لے آئے گا۔ میری تین بیٹیاں ہیں، میں تو اُن کے ساتھ ردِ بد رہ جاؤں گی۔“

”جاؤ، چلی جاؤ..... میں یہ دُعا نہیں کر سکتی۔“ لگتا تھا اس کی فریاد کا فاطمہ پر رتی برابر اثر نہیں ہوا۔
 ”رخ کریں شاہ بی بی، میں تو بڑی اُس امید کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی ہوں۔ آپ بھی سر سے ہاتھ اٹھالیں گی تو ہم جیسی دُکھوں کی ماریاں پھر کہاں جائیں گی.....؟“ وہ اُس کے سامنے ہاتھ جوڑنے لگی۔

”کہاں ناں، یہ دُعا نہیں کروں گی میں..... بے وقوف عورت، تم ڈرتی کس بات سے ہو.....
 زبرد رہنا تو مقدر میں لکھا گیا ہے، عورت کی تقدیر ہے یہ، مرد دعویٰ تو کرتا ہے مگر کسی بھی رشتے میں ہو، عورت کے لئے کرتا کچھ نہیں..... یہ رشتے دھوکا ہیں، فریب ہیں۔ جاؤ چلی جاؤ، بس اتنا یاد رکھو، مرد کے رشتے مرد کے ساتھ ہوتے ہیں، عورت ہر حال میں دُکھاٹھاٹی ہے۔“ فاطمہ سختی سے کہہ کر خاموش ہوگئی۔

”اردشیر..... تمہیں شہر جا کر کوٹھی میں رہنے کے بجائے ہوشل میں رہنا چاہئے۔“ راحت اسے کہہ رہی تھی۔

”ہوشل میں.....؟ نہیں امی جان، مجھے پتا ہے وہاں پر کھانا بہت برا بنتا ہے۔“ اُس نے منہ بتایا۔
 ”مگر میں یہ بھی جانتی ہوں کہ اگر تم شہر جا کر کوٹھی میں رہو گے تو پڑھو گے بالکل نہیں..... سارا وقت فضول کھیل تماشوں میں گنواؤ گے..... میں تو سوچ رہی ہوں خود تمہارے بابا سے بات کروں اور انہیں کہوں کہ تمہیں ہوشل میں ہی داخل کرائیں۔“

”اوہو..... امی، ایک تو پتا نہیں کیوں آپ کو ہمیشہ سے میری بات زبرد کرنا ہی اچھا لگتا ہے۔“ اردشیر کا مزاج بری طرح بگڑ گیا۔

”اچھا..... تو میں دشمن ہوں تمہاری۔“ راحت کو بھی غصہ آ گیا اور وہ خاصی اُونچی آواز میں بولی۔
 ”یہ میں نے کب کہا..... میں تو اتنا کہہ رہا ہوں کہ مجھ سے نہیں رہا جائے گا ہوشل میں..... ہوشل کی پابندیاں اور جو کھانا وہاں پکتا ہے وہ، سب ہی تو میرے لئے ناقابلِ قبول ہے..... اور میں اگر آپ سے زیادہ زور دیا تو پھر میں شہر جاؤں گی نہیں..... یہاں گاؤں میں ہی رہ جاؤں گا۔“

”جانتی ہوں اچھی طرح، ضدی ہو بہت، وہی کرو گے جو تمہارے دل میں سما جائے گا۔ میری تو نہ کبھی تم نے مانی ہے، نہ اب مانو گے۔“

”اب الزام تو نہ دیں، کب نہیں سنی میں نے آپ کی، اکلوتا بیٹا ہوں آپ کا مگر پھر بھی مجھ میں کتنی

منتقل کئے اور جانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئیں۔
 ”کیا بات ہے پھوپھو، بڑی جلدی واپسی ہوگئی آپ کی، کیا پاپا گھر پر نہیں ملے.....؟“ جب اُوپر جا رہی تھیں، مزید نیچے اتر رہا تھا۔ سیز جیوں میں دونوں کی ملاقات ہوگئی تو وہ پوچھنے لگا۔
 ”مجھے کوئی زیادہ بات تو کرنی نہیں تھی تمہارے پاپا سے..... اصل میں کئی روز سے دیکھا نہیں تھا۔
 دل اُداس ہو رہا تھا میرا، سوچا بھائی کو دیکھ آؤں، زیادہ دیر بیٹھی اس لئے نہیں کہ وہ ابھی تھکا ہوا گھر آیا ہے۔“

”مما کیا کر رہی ہیں.....؟“
 ”مجھے کیا پتا، میرے پاس تھوڑی بیٹھتی ہے وہ، ادھر میں آئی اور وہ اٹھ کر دوسرے کمرے میں چل گئی۔ پوری پوری کوشش ہے اس کی کہ میں نیچے جانا چھوڑ دوں مگر وہ میرے بھائی کو مجھ سے جدا نہیں کر سکتی۔“

”ہاتھ میں کیا ہے.....؟“ مزید نے ان کی بات سنی ان سنی کر کے پوچھا۔
 ”کچھ نہیں، کچھ نہیں.....“ وہ اتنا کہہ کر تیزی سے سیز حیاں چڑھ کر اُوپر چلی گئیں۔
 مزید نیچے چلا آیا اور رُخ رانچ کے کمرے کی جانب تھا، جو یہ بھی یہیں موجود تھیں مگر وہ پھوپھو کی کبھی باتیں اس وقت بتا نہیں سکتا تھا کہ پاپا گھر پر تھے اور کسی وقت بھی ممّا کو اپنے حضور طلب کر سکتے تھے، یوں پھر بات ادھوری رہ جاتی اور مزا کر اکر رہا ہو جاتا۔

فاطمہ کے کمرے کے باہر دُعا کروانے والیوں کا ہجوم تھا..... اس وقت اس کے کمرے کا دروازہ بند تھا اور اُونچی آواز میں قرآن پاک کی تلاوت کی آواز باہر تک آرہی تھی۔ گاؤں کی یہ غریب اور دُکھیا دی عورتیں اس آواز کو سن کر عقیدت س آتسو بہا رہی تھیں..... اس وقت صبح ہو رہی تھی۔ سورج ابھی پوری طرح طلوع نہیں ہوا تھا۔ ہوا میں صبح کی خوشگوار خشکی تھی۔ پرندوں کی چہچہاہٹ اور فصلوں کی باس ہوا کو مست اور شوقِ بہار ہی تھی، ساتھ میں فاطمہ کی پرسوز آواز، سنسنے والیوں پر وجد کا عالم طاری تھا۔

کبھی فاطمہ کے مقابلے میں عورتیں اپنی فریاد لے کر کبریٰ کے پاس زیادہ جایا کرتی تھیں اور دُعا کی درخواست کرتی تھیں مگر اب اُن کا ہجوم اس دروازے کے سامنے زیادہ ہونے لگا تھا کہ لوگ کہتے تھے۔

”یہ بی بی بہت اللہ والی ہے، اس کی دُعا میں قبول ہوتی ہیں۔“

دروازہ کھلا تو عورتیں جو تے باہر اتار کر سر جھکائے کمرے میں داخل ہونے لگیں۔ فاطمہ اپنے پلنگ پر بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے پر کسی قسم کے تاثرات نظر نہیں آتے تھے۔ وہ آنے والیوں کو خالی خالی سے انداز میں دیکھ رہی تھی..... اور سر کے اشارے سے اُن کے سلام کا جواب دے رہی تھی۔

عورتیں باری باری پلنگ کے قریب جاتی اور اپنی مراد بتا کر دُعا کے لئے کہتیں۔ پھر اس کے بعد کمرے سے نکل جاتیں۔ وہ آخری عورت تھی جو سر جھکائے کمرے کے ایک کونے میں بیٹھی تھی۔ سب جا چکی تھیں۔ کمرے میں وہ اور شاہ بی بی ہی موجود تھیں۔ فاطمہ شاہ منتظر تھی کہ وہ اٹھ کر پلنگ کے قریب آئے گی۔ اپنا دُک بتا کر دُعا کی درخواست کرے گی..... مگر لگتا تھا وہ کسی گہری سوچ میں گم ہے اور اسے پتہ ہی نہیں کہ کمرہ خالی ہو چکا ہے۔

بریاں نظر آتی ہیں آپ کو۔“

”برائیاں ہیں تو نظر آتی ہیں ناں..... میں یقین سے کہہ سکتی ہوں، اگر بڑی آپا نے تمہیں ہر
میں رہنے کو کہا ہوتا تو کبھی اُن کی بات رد نہ کرتے، فوراً مان جاتے۔“

”اوہو..... ایک تو آپ ہر بات پر بڑی ماں سے مقابلہ کرنے لگتی ہیں..... اگر وہ اتنی ہی بڑی
ہیں آپ کو تو بچپن میں ہی مجھے اُن کے پاس جانے سے روکا ہوتا، دُور رکھا ہوتا اُن سے۔“

”میرا بس چلتا تو ضرور ایسا کرتی.....“

اس سے پہلے کہ ارد شیر جواب میں کچھ کہتا، دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔

”میرا خیال ہے بڑی ماں ہیں.....“

اور یوں دستک کے انداز ہی سے پہچان لینے پر راحت نے ایک غصہ ور نظر بیٹے پر ڈالی اور منہ بڑھ
لیا۔

”آج اپنے بڑی ماں.....“ اُس نے راحت کے انداز کا نوٹس لئے بغیر کہا۔

”کیا باتیں ہو رہی تھیں ماں بیٹے میں.....؟“ کبریٰ نے مسکرا کر ارد شیر کی جانب دیکھا اور غائب
دونوں کو کیا۔

”کچھ نہیں، بس ایسے ہی.....“ راحت نے سوچا، ماں بیٹے کی آپس کی بات ہے، یہ کون ہوتی ہیں،
پوچھنے والی اور ٹال مٹائی۔

”امی مجھے کہہ رہی ہیں، شہر میں کوٹھی میں رہنے کے بجائے مجھے ہوٹل میں رہنا چاہئے۔“ ارد شیر
نے جج بات کہہ دی۔

کبریٰ نے راحت کے سامنے اس بات پر کسی بھی قسم کے تبصرے سے گریز کیا اور معمول کی گفتگو
کرتی رہیں۔ پھر کچھ دیر کے بعد انہوں نے راحت کی غیر معمولی خاموشی کو محسوس کیا تو پوچھنے لگیں۔

”کیا بات ہے آج بہت چپ چپ ہو تم۔“

”بس آپا طبیعت ٹھیک نہیں ہے میری.....“

”لو ابھی تو مجھے اتنا ڈانٹ رہی تھیں..... اب اچانک آپ کی طبیعت کو کیا ہو گیا ہے.....؟“ ارد شیر
نے تو یونہی مذاق میں کہا تھا مگر راحت بھی کہ وہ بڑی ماں کے سامنے اسے جھوٹا بتا رہا ہے، کہنے لگی۔

”تمہارا کیا خیال ہے، میں جھوٹ موٹ کی بیمار بن رہی ہوں.....؟“

”اوہ..... تو بے بسی.....“ اُس نے پیشانی پر ہاتھ مار کر اُن کے شک پر افسوس اور الجھن کا اظہار کیا،
پھر کبریٰ سے بولا..... ”یہ مجھ سے بہت ناراض ہیں۔“

”ضرورتاً نے کوئی ایسی ویسی حرکت کی ہوگی۔“

”نہیں بڑی ماں، میں نے بھلا کیا کرتا تھا..... بس امی کہتی ہیں، تم مجھے کم اور بڑی ماں کو زیادہ
اہمیت دیتے ہو۔“ اُسے نہ تو خاندانی سیاست سے واقفیت تھی اور نہ ہی وہ وقت کے تقاضوں اور مصلحت کو

سمجھتا تھا۔ وہ تو لاڈلا بیٹا تھا..... اس حوالی کا مڈرے باک اور بے دھڑک بات کرنے والا اُس نے تو یونہی
رواداری میں یہ بات کہہ دی تھی، سنتے ہی کبریٰ اٹھ کھڑی ہوئیں، سسکتی سی نگاہ راحت پر ڈالی اور بولیں۔

”ہاں بھئی، اپنی چیز پر کسی دوسرے کا اختیار ردل گردے والے ہی برداشت کر سکتے ہیں..... اور ایسا

دل کوئی سب کے پاس تھوڑی ہوتا ہے۔“ وہ تیزی سے کمرے سے نکل گئیں۔

”بڑی ماں..... بڑی ماں.....“ ارد شیر پیچھے چلا آیا..... اور انہیں راستے میں روک گیا..... ”آپ تو
بیمار ہو گئیں..... میں نے تو یونہی کہا تھا، آپ ناراض نہ ہوں بڑی ماں۔“ ارد شیر اُن کی ناراضگی بھلا کہاں

برداشت کر سکتا تھا، اُن کے ہاتھ ہاتھوں میں لے کر التجا کر رہا تھا۔
وہ اس کے چہرے اور لفظوں میں ڈر آئی پریشانی کو کچھ دیر خاموشی سے محسوس کرتی رہیں پھر مسکرا کر

بولیں۔

”میں اپنے بیٹے سے کیسے ناراض ہو سکتی ہوں، بس دکھ تو یہ ہے تم پر جتنا اختیار میرا ہے، اتنا ہی کسی
اور کا کیوں ہے.....؟ تم بس میرے ہی کیوں نہیں.....؟“

”میں آپ کا ہوں..... صرف آپ کا..... جتنی محبت آپ سے کرتا ہوں، کسی سے نہیں کرتا، شاید بابا
جان سے بھی نہیں۔“

”ارد شیر.....“ کبریٰ نے اس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں تمام لیا اور وہ اُن کے سامنے ذرا سا
جک گیا، کبریٰ نے اُس کی پیشانی چوم لی۔

”آپ ایک عظیم عورت ہیں اور مجھے فخر ہے کہ آپ میری ماں ہیں، اب ایسے کیا دیکھ رہی ہیں
ہاں.....“ کبریٰ کے یوں بغور دیکھنے پر وہ تھوڑی سی حیرت اور ہنسی کے درمیان پوچھنے لگا۔

”تم ایک دم سے ہی بڑے بڑے کتنے لگے ہو، میرے اندازوں سے بھی پہلے نہ صرف جوان
ہو گئے ہو بلکہ مجھدار بھی بہت ہو۔“

”لگتا ہے آپ کو میرے جوان ہونے کا بہت انتظار تھا۔“ وہ شرارت سے اُن کے بازوؤں پر اپنے
ہاتھوں کا دباؤ بڑھا کر بولا۔ ذرا سی شوخی پر ہی اس کی کھنی ہلکوں والی براؤن آنکھیں جھمکے لگی تھیں اور

چہرے پر ہلکی سی سرخی جھلکنے لگی تھی۔

”بہت بہت انتظار کیا ہے میں نے، یوں سمجھ لو کہ دن گن گن کر گزارے ہیں اور ہاں بھئی، میں تم
سے یہ ضرور کہوں گی، تم تعلیم کے لئے شہر ضرور جاؤ اور وہاں جا کر ہوٹل میں رہنے کی بجائے کوٹھی پر ہی

رہو..... نئی دنیا کو دیکھو، دوست بناؤ اور اسکول کی پڑھائی کے ساتھ لوگوں کو بھی پڑھنا سیکھو، یہ علم بھی آگے
چل کر تمہارے بہت کام آئے گا۔“

”جی بڑی ماں، میں تو خود بھی ہوٹل میں رہنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا..... ویسے بڑی ماں میں سوچ
رہا تھا، اپنی عمر کے لحاظ سے میں کلاس میں پیچھے ہوں، پھر میں لمبا چوڑا ابھی ہوں، کلاس کے سارے لڑکے

مجھے حیرت سے نہیں دیکھیں گے کیا.....؟“

”اوہو..... اچھا قد کاٹھ فخر کا باعث ہوتا ہے..... یہ تو دین ہے اللہ کی اور تم ہو کہ شرمندہ ہو رہے
ہو..... اس پر بھی، جواب نہیں تمہارا ابھی۔“

”شرمندہ تو نہیں ہو رہا..... بس یہی سوچ رہا تھا، کلاس میں سب سے بڑا لگوں گا۔“

”میرا خیال ہے تمہاری عمر کے اور لڑکے بھی ہوں گے، اب تم اتنے بھی پیچھے نہیں ہو، ہاں اگر قد
میں تم سے کم ہوں تو اور بات ہے۔“

گاؤں میں لڑکوں کا تو اسکول میٹرک تک تھا جبکہ لڑکیوں کا تھا ہی مڈل تک..... گل رخ نے ارد شیر

تمہارے شہر کی طرح بے تکلفی سے ہانپیں اُن کے گلے میں ڈال سکی اور نہ سر اُن کے شانے پر رکھ سکی۔
 ”مجھے اپنی خیتوں ہی بیٹیاں پیاری ہیں..... میں تم سب کی بھلائی چاہتی ہوں بیٹی..... اور ہاں سنو
 مگر میں اس بات کا ذکر اپنی امی کے علاوہ اور کسی سے مت کرنا..... مجھے یہ یقین ہے کہ اگر تمہاری چھوٹی
 بیٹی کو خبر ہوگی تو وہ فوراً شاہ جی کو بتا دیں گی اور پھر مجھے تمہارے لئے شاہ جی سے بہت بحث کرنا پڑے گی اور
 منہ سے کچھ بھی بات تمہارے حق میں نہ جاسکے۔“

”نیک ہے بڑی ماں، میں پوری احتیاط کروں گی اور امی سے بھی کہہ دوں گی کہ وہ کسی سے ذکر نہ کریں۔“

”ہاں شہاباش..... بس تم اسکول میں داخل ہو جاؤ، پھر اس کے بعد اگر کسی کو چتا چل بھی جائے تو فکر کی کوئی بات نہیں۔“

”جی ہوی ماں.....؟“ اُس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔
 ”کل..... آج تم نے ارد شیر کو پلٹ کر جواب دیا اور مجھے حیران کر دیا۔“ وہ اس کا نازک سا ہاتھ،
 ہاتھ میں لے کر پیار سے سہلاتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

”بس بڑی ماں، غصہ آ گیا تھا..... پتا نہیں وہ کھتا کیا ہے خود کو..... ہم بیٹیوں ہمیں اُسے پسند نہیں کرتیں مگر آپ بہت پیار کرتی ہیں اس سے۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے لہجے میں شکایت در آئی۔
کبریٰ ہنس پڑیں اور بولیں۔

”میں تم سب سے پیار کرتی ہوں، تم سب بچے مجھے اچھے لگتے ہو..... وہ بھی شہر پڑھنے کے لئے جا رہے مگر میں اُسے یہ نہیں کہہ سکتی کہ وہ تم سے ملتا رہے، تمہارا خیال رکھے..... تم دونوں کی تو آپس میں بالکل نہیں فہمی۔“

”ہاں نہیں کیوں وہ شروع سے ہی مجھ سے نفرت کرتا ہے..... حالانکہ میں نے کبھی زیادہ بات بھی نہیں کی اُس کے ساتھ.....“

ابھی باتیں ہو رہی تھیں کہ شیریں چلی آئی اور آتے ہی بولی۔

”امی جان، بیٹے کی شادی کی تیاری شروع کر دیں۔“

”کیا مطلب.....؟“ نہ صرف کبریٰ بلکہ گل بھی سوالیہ انداز میں اُس کی جانب دیکھنے لگی۔

”مجھے لگتا ہے بابا صاحب کی اگلی بی بی کا نام مہراں ہوگا، وہی جو ہمارے گھر میں کام کرتی ہے کم ڈالوں کی بی بی..... ویسے ارد شیر کے لئے وہی ٹھیک ہے۔ آخر اس کی یاں بھی تو خاندان سے باہر کی ہے۔“

شیریں کی تیزی اب بھی ویسی کی ویسی تھی۔ ارد شیر کو سخت ناپسند کرتی تھی اور مہراں کے ساتھ اس کا نام جوڑ کر اب خود ہی مزے لے کر ہنس رہی تھی۔

”اول ہوں..... کسی باتیں کرتی ہوں، ابھی تو وہ بہت چھوٹا ہے۔ اگر گھر کی ملازمہ سے بات کر لی تو اس کا یہ مطلب تو نہیں جو تم نکال رہی ہو۔“ کبریٰ نے اس کی بات کو پوری سنجیدگی سے سنا مگر تنبیہی انداز اپنایا۔

”چلو ابھی چھوٹا ہے..... کل بڑا ہو گا..... پھر بڑے بڑے کام کرے گا۔ کیوں گل رُخ، کیا خیال ہے تمہارا.....؟“

کے ساتھ ہی امتحان دیا تھا اور اس سے کہیں زیادہ اچھے نمبر لے کر پاس بھی کیا تھا، یہ اور بات کہ صرف اردو کے ہی پاس ہونے کی باخفی گئی تھی، صدقہ صرف اُس کا اتنا رگیا تھا۔

گل نے تو گھر آ کر ماں کو بس اتنا بتا دیا تھا کہ پاس ہو گئی ہوں۔ اسے مزید تعلیم کا شوق تھا، گاؤں میں اسکول ہی نہیں تھا تو پھر یہ کیسے ممکن ہو سکے گا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اور وہ حل پونچھنے بڑی ماں کے پاس چلی آئی تھی، وہاں اس وقت تک نہیں تھیں، ان کے پاس ارد شیر بھی موجود تھا، ارد شیر اسے پسند نہیں کرتا تھا حالانکہ ان دونوں درمیان لڑائی تو کبھی نہیں ہوئی تھی مگر بھی نہیں ارد شیر اس کے لئے اچھے جذبات رکھتا تھا اور نہ ہی مگر وہ اچھے متہ تھا۔ اسے یہاں موجود پایا تو اُس نے دروازے سے ہی پلٹ جانا چاہا مگر کبری اسے روک کر کہا کہ یہاں آ جا۔

”بڑی، میں پھر آ جاؤں گی۔“ اُس نے پوری سنجیدگی سے کہا۔
ارشاد نے دہلی پستی گل کو سترخانہ سے انداز میں سر سے پاؤں تک دیکھا اور کرسی پر ڈرامہ پھیل کر
ہوئے جو۔

”نہن ہے اُس وقت بھی میں یہیں موجود ہوں۔“
گل نے سر اُپر اٹھایا اور بولی۔ ”میں تم سے ڈرتی نہیں ہوں۔“
آج گل کے لہجے میں بے خوفی محسوس کر کے کبریٰ کو جہاں حیرت ہوئی تھی، وہاں خوشی بھی تھی۔
گل اتنا کہہ کر کمرے سے چلی گئی اور ملازمہ سے کہہ کر اپنے کمرے میں چلی آئی کہ جب اب
ان کے کمرے سے اُٹھ کر جائے تو مجھے فوراً اطلاع دے دینا۔

ملازمہ نظر ہا رہے کام میں مصروف تھی مگر توجہ اب کبریٰ کے کمرے کی طرف ہی پھر جونی کر گیا اُس نے گل رخ کو اطلاع دے دی اور اب وہ ایک بار پھر کبریٰ کے پاس موجود تھی۔

”کیا تم کوئی اہم بات کرنا چاہتی ہو مجھ سے.....؟“ ہمیشہ کی طرح بڑی ماں کے انداز میں آغا اس کے لئے چاہت تھی اور بلا کی نرمی تھی۔ اُس نے آگے پڑھنے کی خواہش کا اظہار کر دیا۔

”میں بھی یہی چاہتی ہوں کہ تمہاری تعلیم جاری رہے۔“
 ”میرے ذہن میں میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ یہ کیسے طرح ممکن ہو سکے گا۔ یہاں اسکول تو صرف ایک ہے۔“

”تو کیا ہوا، ہم اپنی گل بیٹی کو شہر کے کسی اچھے اسکول میں داخل کروادیں گے۔“
 ”کیا یہ ممکن ہوگا بڑی ماں؟“ مارے خوشی کے اس کا لہجہ کانپ گیا۔
 ”کیوں ممکن نہیں.....؟“

”مگر بڑی ماں، یہ بھی تو سوچیں، بابا صاحب کبھی نہیں مانیں گے۔“

”ہم انہیں بتائیں گے ہی نہیں..... انہیں تو یہ پتا ہی کب ہوتا ہے کہ بیٹیاں کدھر ہیں، کیا کر ہیں..... اگر تم نظر نہیں آؤ گی، تب بھی نہیں پوچھیں گے..... میں تمہارے اسکول کی ہیڈ مسٹر میں بات کروں گی..... کہ وہ جتنہیں شہر کے کسی اچھے اسکول میں داخلہ لوادیں۔“

”آپ بہت بہت اچھی ہیں بڑی ماں۔“ وہ اُن کے قریب بیٹھتے ہوئے عقیدت سے کہہ رہی تھی۔

”آپ اندر چل کر آرام کرتیں امی۔“ اردو شیر ماں کی حالت کے پیش نظر کہہ رہا تھا۔
 ”نیکس تم ادھر آؤ میرے پاس۔“ راحت نے اسے قریب بلایا اور اس کے ہاتھ کو پکڑ کر اُٹھنے کی
 کوشش کی۔ اُس نے خود سہارا دے کر ماں کو کھڑا کر دیا۔ راحت نے ہاتھ میں پکڑا اُس کا ہاتھ چوم لیا۔ وہ
 بے قراری کے عالم میں بار بار اُسے ساتھ لگاتی اور روتی جاتی تھی۔
 ”امی..... امی جان کیا ہو گیا ہے آپ کو.....؟ ادھر بڑی ماں کی طرف دیکھیں کتنے حوصلے

”اوہو..... میں وہاں پر اکیلا کھڑی ہوں گا، یہ اتنے سارے ملازم بھی تو میرے ساتھ جائیں۔“

”ہونہہ..... یہ مہراں.....؟ یہ ساتھ جا کر کیا کرے گی.....؟ شاہ جی نے مسخر بھرے انداز میں اس لڑکی کی طرف دیکھا جس کے چہرے پر شہر جانے کا شوق نمایاں ہو رہا تھا مگر اُن کی اس طرح کہنے پر اُس نے سر جھکا لیا، اور پاؤں کے انگوٹھے سے فرش پر کچھ نہ نظر آنے والی لکیریں کھینچنے لگی۔“

”تم لوگ فکر کیوں کرتی ہو.....؟ وہاں میرا شیرا کیلا تھوڑی ہوگا۔ بہت سے مجھدار ملازم ہیں وہاں پر..... اور پھر میرا بیٹا بھی اب بڑا ہو گیا ہے۔“ فخر کے عالم میں اُنہوں نے ارد شیر کی طرف دیکھا اور وہ مسکرا دیا۔

شاہ جی کو خود بھی شہر میں اپنے وکیل سے ملنا تھا۔ وہ ساتھ ہی جا رہے تھے اور واپسی کی اُمید دو تین روز بعد ہی تھی۔ دونوں باپ بیٹا چلے گئے۔

اور اُن کے جاتے ہی جیسے ایک سناٹا اُتر آیا۔ اتنے دنوں سے ارد شیر کے شہر جانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ گہما گہما کا احساس تھا اور ہر طرف یہی باتیں تھیں۔ اب ایک دم سے موضوع ختم ہو گیا۔ راحت کی طبیعت بہت خراب ہو رہی تھی، وہ بیٹے کے جانے ہی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

ارد شیر اور شاہ جی کی روائی کو ایک ٹھنڈے ہونے کو تھا اور راحت کی طبیعت بگڑتی جا رہی تھی۔ اُس نے باہر سے آتی آوازوں کو بغور سننے کی کوشش کی، اس خیال سے کہ اگر کوئی کمرے کے نزدیک ہے تو بلائے اور کہے کہ آ پاؤ بلا لاؤ..... مگر نزدیک تو شاید کوئی بھی نہیں تھا، آوازیں دُور سے آرہی تھیں۔ بمشکل اُنھ کر اُس نے قریب ہی میز پر رکھے جگ سے پانی گلاس میں اٹھایا اور چکراتے سرور ڈھیلے پڑتے ہاتھوں کو قابو میں کر کے پانی منہ سے لگا لیا۔

”یہ کیا ہو رہا ہے مجھے.....؟“ خوف کی ایک شدید لہر اس کے اندر اُبھری اور اسے مزید کمزور کر گئی۔ وہ تنہائی میں ڈر رہی تھی اور چاہتی تھی جلد از جلد کوئی ادھر آ جائے مگر اتنی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ آواز دے کر کسی کو اندر بلا لے۔

پھر اُس نے سنا برآمدے میں کوئی چل رہا تھا، پھر گل رُخ کی آواز اُبھری اور اس کے ساتھ ساتھ ایک دو ملازموں کی آوازیں بھی آنے لگیں۔ وہ کان لگا کر سننے لگی۔ شاید کوئی ادھر آ جائے لیکن گل کبرئی کے کمرے میں چلی گئی۔ تب ہمت کر کے اُس نے اپنے کمرے کے باہر سے دُور ہوئی ان آوازوں کو پکار لیا۔

”نئی بی بی جی..... حکم.....؟“ آواز سننے ہی مہراں پر وہ اُٹھا کر اندر چلی آئی اور اس کی حالت دیکھ

کھڑی ہیں..... اور پھر میں کوئی جنگ پر تھوڑی جا رہا ہوں۔“ ارد شیر نے پھر کبرئی خاتون سے مڑا ڈالا۔ وہ اسے کیسے بتاتی کہ تیری ماں صرف میں ہوں اور تمہارے لئے جو جذبات میرے دل میں ہیں، وہ کسی اور کے دل میں نہیں ہو سکتے۔

”اپنی صحت کا خیال رکھئے گا۔“

”میرے بیٹے نے کہہ دیا ہے، اب تو ضرور رکھوں گی۔“ آنسو پھر تو اترے سے پہنے لگے۔

”اوہو..... پھر رونے لگی ہیں..... دیکھیں اس طرح تو میں وہاں جا کر بھی آپ کی طرز فکر مند ہی رہوں گا..... بڑی ماں سنبھالیں ناں امی کو.....“

تب کبرئی جو خاموش کھڑی راحت کو ہی دیکھ رہی تھیں، آگے بڑھیں اور اپنے ساتھ لگا کر تسلی لگیں۔ پھر ارد شیر سے بولیں۔

”تم اپنا خیال رکھنا، کھانے پینے کی طرف سے غفلت مت برتنا۔“

”بڑی بیگم صاحبہ..... اگر آپ کہیں تو میں چھوٹے شاہ جی کے ساتھ شہر چلی جاتی ہوں، خیال رکھنا“

گی جی ان کا.....؟“ مہراں نے آگے بڑھ کر اپنی خدمات پیش کیں۔

کبرئی نے سوالیہ انداز میں اب تک کا سارا منظر خاموشی سے دیکھتے شاہ جی کی جانب دیکھا اور کی رائے جاننا چاہی۔



کرٹھنگ گئی۔

”جاؤ مہراں، بڑی بیگم کو بلا لاؤ۔“ اُس نے نقاہت بھرے انداز میں بمشکل جملہ مکمل کیا۔ مہراں سننے ہی اُلٹے قدموں پلٹ گئی۔

وہ کبریٰ کے کمرے میں آئی مگر وہاں موجود نہیں تھیں اور انہیں تلاش کرتے ہوئے مہراں کو دیر بھی لگی۔ وہ ابھی تک پچھواڑے میں تھیں جا کر انہیں بتایا کہ ”چھوٹی بی بی کی طبیعت بہت خراب ہے۔ دھیان سے کام کرنا تم لوگ، میں ابھی آتی ہوں۔“ ڈانٹ کے انداز میں کام کرنے والی لڑکی حکم دے کر وہ راحت کے کمرے کی طرف آ گئیں۔ بجلت کے عالم میں اس کے کمرے میں آ کر پکارا پھر خاموش پا کر ماتھا جھوا۔

”راحت.....“ جلتی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر وہ گہرا گھبراہٹ اور بے اختیار پکارا بیٹھیں۔

”چھوٹی بی بی کو بہت تیز بخار ہے اور مصیبت یہ ہے کہ نہ تو شاہ جی یہاں پر ہیں اور نہ ہی ڈراپ گاؤں میں موجود ہے کہ میں شہر بھیج کر دو ایسے منگوا لوں، تم ایسا کرو مہراں! جاتی کو بلاؤ، میں اُس سے باز کرتی ہوں۔“

”آیا..... کچھ کریں، میں..... میں بہت تکلیف محسوس کر رہی ہوں۔“ راحت کے ہونٹ واہوا اور اُس نے سر مٹوٹی کی۔

”تم پریشان نہ ہو راحت..... میں نے جاتی کو اسی لئے بلوایا ہے، ابھی بھیجتی ہوں حکیم صاحب طرف۔“ وہ ہلکی بھرے انداز میں کہہ کر راحت کے قریب آ بیٹھیں..... اور ہلکے ہلکے دباؤ سے اس کی پیشانی پر ہاتھ پھیرنے لگیں۔

”تمہیں صبح ہی اپنی کیفیت شاہ جی سے کہہ دینی چاہئے تھی، ہم تو یہی سمجھے کہ بیٹے کے جانے کی وجہ سے پریشان ہو۔“ وہ ساتھ ساتھ اس سے باتیں بھی کئے جا رہی تھیں، اتنے میں مہراں اس اطلاع کے ساتھ آئی کہ جاتی آ گیا ہے۔

کبریٰ اٹھ کر دروازے کے پاس چلی آئیں اور جاتی کو راحت کی ساری کیفیت بتانے کے بعد حکیم جی سے دوا لانے کو کہا۔

جاتی دوا لے کر آیا تو بھی راحت کی یہی کیفیت تھی۔ کبریٰ اور دو ملازماں کمرے میں اس کے پاس موجود تھیں۔ کبریٰ نے اپنے ہاتھ سے اسے دوا کھلائی۔ دن اسی طرح ڈھل گیا اور شام ہونے لگا۔ مگر راحت کے بخار میں ڈرا بھی کمی نہیں ہوئی۔ شام کو ایک بار پھر ملازم کو حکیم کی طرف بھیجا کہ احساسِ فراق میں طبیعت بگڑ گئی تو مشکل ہوگی۔

ساری رات وہ راحت بیگم کے سر ہانے بیٹھی رہیں اور اس کی حالت دیکھ کر پریشان ہوتی رہیں۔ ”خدا کرے صبح شاہ جی شہر سے واپس آ جائیں اور پھر اس کے لئے شہر کے کسی اچھے ڈاکٹر سے“ منگوا لی جائے۔“

ساری رات جاگ کر صبح کبریٰ خود بھی بہت تھکی تھکی سی تھیں اور پریشان الگ تھیں، ان کی سمجھ نہ نہیں آ رہا تھا کہ ان حالات میں کیا کرنا چاہئے۔ صبح ہوتے ہی پھر ملازم کو حکیم کی طرف دوڑا دیا۔ ملازموں نے گل رخ سے راحت کی خرابی صحت کی بات کی تھی۔ اُس نے جا کر فاطمہ کو بھی بتا دیا۔

جب وہ راحت خانم کو دیکھنے کمرے میں آئی تو کبریٰ بچھے سے دودھ راحت کے منہ میں ڈال رہی تھیں۔ فاطمہ نے رُک کر بخور یہ منظر دیکھا، بولی کچھ نہیں، کبریٰ کی نظر دروازے سے کچھ ہی آگے آ کر کھڑی فاطمہ پر پڑی تو بولیں۔

”اس کی حالت بہت خراب ہے فاطمہ، دُعا کرو اس کے لئے۔“

فاطمہ نے کبریٰ کی جانب دیکھا، منہ ہی منہ میں کچھ کہا بھی جو کبریٰ نہیں سن سکیں، کچھ دیر وہ یونہی کھڑی ان دونوں کو دیکھتی رہی، پھر جس طرح خاموشی کے ساتھ آئی تھی..... اسی طرح دبے قدموں اور بند ہونٹوں کے ساتھ واپس چلی گئی۔

”اے میرے مالک! اپنا فضل فرما، اے صحت عطا فرما۔“ کبریٰ نے صدقِ دل سے دُعا مانگی۔ بے شک راحت اُن کی سوکن تھی مگر ایک عورت بھی تھی اور پھر کئی سال دونوں نے ایک گھر میں گزارے تھے۔ وہ ایک دوسرے کی شکل کی عادی تھیں جو کچھ کبریٰ کے ساتھ ہوا، اس سلسلے میں انہوں نے بھی فاطمہ یا راحت کو قصور وار نہیں سمجھا تھا۔ گلہ تو انہیں شاہ جی سے تھا۔ اس کا غصہ ان کے لئے تھا اور ارد شیر کو بگاڑ کر انتقام بھی وہ ان ہی سے لے رہی تھیں۔ یہ بات کبریٰ خاتون کے ذہن میں کبھی نہیں آئی کہ وہ راحت کے بیٹے کو بگاڑ رہی ہیں۔ انہوں نے آج تک جو کچھ کیا، وہ جوشید شاہ کے بیٹے کے ساتھ کیا۔

”آپا، شاہ جی نہیں آئے۔“ راحت نے اس نقاہت کے عالم میں بھی جتنی بار ہمت کر کے آنکھیں کھولیں، انہیں ہی تلاش کیا اور گہری آواز اسی اور انتظار کی شدید کیفیت میں ڈوب کر جوشید شاہ کے بارے میں پوچھا..... اور کبریٰ کو ہر بار نفی میں جواب دینا پڑا۔ وہ اُن کا جواب سن کر پھر آنکھیں موند لیتی اور کبریٰ تسلی دیتیں۔

”وہ آجائیں گے..... بس آنے ہی والے ہوں گے، انہیں شہر میں کچھ زیادہ کام تو نہیں تھا، بس ارد شیر کی وجہ سے رُک گئے ہوں گے۔“ جبکہ انتظار وہ خود بھی کر رہی تھیں اور دُعا میں مانگ رہی تھیں کہ شاہ جی جلد گاؤں لوٹ آئیں۔

”ای جان! میں اندر آ جاؤں۔“ شیریں پردہ ہٹا کر ہلکی سی آواز میں اندر آنے کی اجازت طلب کر رہی تھی۔

کبریٰ نے راحت کے چہرے سے نظر ہٹا کر بیٹی کی طرف دیکھا اور اشاثات میں سر ہلا دیا۔ راحت شیریں کی بے آرامی کے خیال سے دبے دبے قدم اٹھائی کبریٰ کے قریب چلی آئی۔

”خیریت.....؟ کوئی کام تھا کیا.....؟“ کبریٰ نے پوچھا۔

”ای..... میں تو یہ کہنے آئی تھی کہ آپ کب سے یونہی ان کے پاس بیٹھی ہیں، کچھ دیر آرام کر لیں۔ میں چھوٹی امی کے کمرے میں موجود رہوں گی۔“

”نہیں بیٹی، اس وقت شاہ جی حویلی میں موجود نہیں ہیں اور اُن کی عدم موجودگی میں تم سب میری ذمہ داری بن جاتے ہو اور میں اس ذمہ داری سے غفلت ہرگز نہیں برتنوں گی..... تم جاؤ شاپاش۔“

”ای یہ سب تو تمہیک ہے مگر آپ بھی تو تھک گئی ہوں گی۔“

”نہیں، میں ٹھیک ہوں، تم جاؤ۔“ انہوں نے شیریں کے اصرار کے باوجود اسے واپس بھیج دیا اور خود راحت کے بستر کے قریب رکھی کرسی پر آ بیٹھیں۔

بائٹ بلب کی روشنی میں اسے اپنے قریب صرف کبیر حسن ہی سوئے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ طلال تو کہیں بھی نہیں ہے مگر ایسا لگتا ہے، وہ بھی موجود ہے۔ اس کی سانسوں کی آواز اس کے نرم نرم ہاتھوں کا پس اور اس کی آواز جو یہ سب کچھ محسوس کرتی ہے اور بے بسی کے عالم میں رونے لگتی ہے۔

”اتنے سال سوچو تو یک طویل عرصہ میں نے تمہارے بغیر گزار لیا ہے۔ میں تمہارے بغیر زندہ ہوں۔ طلال.....“ کبھی کبھی اسے خود سے شدید نفرت محسوس ہونے لگتی تھی۔ زندگی ایک ناقابل برداشت بوجھ کی طرح لگتی۔ مگر وہ کیا کرتی، اسے جتنا تھا کہ رات کو اس کی بہت ضرورت تھی۔ رات بھی اُس نے طلال کو اپنے آس پاس محسوس کیا تھا۔ پھر وہ سونیں سکی۔ صبح بھی بہت اپ بیٹ دکھائی دے رہی تھی مگر کبیر حسن کو اتنی فرصت نہیں تھی کہ بغور اس کی جانب دیکھ لیتے اور اُداس دیکھ کر بچہ جانتے، دلجوئی کرتے۔ اُنہوں نے ناشنا کیا، تیار ہوئے اور اُفس کی راہ لی۔ ہاں مزید، جو یہ یہ کو دیکھ رہا تھا اور اس کی ایک ایک حرکت نوٹ کر رہا تھا۔

کبیر حسن ناشتے کی ٹیبل سے اُٹھے تو وہ بھی اُٹھ کھڑی ہوئی اور اُکرا اپنے کمرے میں بیٹھ گئی۔ کبیر حسن کے جانے کے بعد مزید چلا آیا۔ وہ قریب آکر بیٹھ گیا جو یہ یہ کو خبر ہی نہ ہوئی۔ یہاں تک کہ اُس نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا اور پکارا۔

”ہاں..... آؤ مزید تم.....“ جو یہ نے مسکرانے کی کوشش کی۔

”مما ایک بات کرتی ہے آپ سے۔“ وہ بخیدہ دکھائی دے رہا تھا۔

”ہاں بیٹا کہو، میں سن رہی ہوں۔“

”مما..... میں نے کئی بار نوٹ کیا ہے، آپ ایک دم سے بہت اُداس ہو جاتی ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے آپ میرے قریب رہ کر بھی قریب نہیں ہیں۔“ اُس نے ایک نفراس پر ڈالی، پھر سر جھکا لیا۔

”کوئی پرالیم ہے آپ کے ساتھ؟“ جین ماما میں ناں مجھے۔“ وہ اس کے ہاتھ پر اپنے ہاتھ کا دباؤ ڈال کر اپنا بیت اور محبت کا اظہار کرتے ہوئے اصرار کر رہا تھا۔

”مجھے بھلا کیا دکھ ہو سکتا ہے چاند.....؟“ اسے پھینکی سی ہنسی ہنس کر اپنے خوش ہونے کا یقین دلانا پڑا۔

”نہیں..... میں نہیں مانتا..... میں نے اکثر دیکھا ہے..... آپ بیٹھے بیٹھے اُداس ہو جاتی ہیں، مجھ سے باتیں کرتے کرتے چپ ہو جاتی ہیں اور بتائیں کیا سوچنے لگتی ہیں، آج پوچھ کر ہی رہوں گا۔ دیکھیں اب تو میں بڑا ہو گیا ہوں۔ آپ کہہ کر دیکھیں، ہو سکتا ہے میں آپ کے کسی کام آؤں۔“

”یقین کرو، کچھ بھی نہیں ہے۔“ جو یہ اس کا گال تھپک کر بولی۔

”یہ تو خیر ماننے والی بات ہی نہیں..... کیوں چھپا رہی ہیں؟ کیا میں بیٹا نہیں ہوں آپا۔“

”مزید چاند..... تم میرے بیٹے ہو۔ میرے اپنے بیٹے..... اور میرے دوست بھی ہو..... اس بھری دنیا میں صرف تم ہو جو مجھے سمجھ سکتے ہو۔“ جو یہ کی آواز بھر اُٹھی۔

”چھو بھونے کچھ کہہ دیا ہے آپ کو.....؟“

”نہیں مجھے کسی نے کچھ نہیں کہا..... بس قسمت ہی خراب ہے میری۔“

”ارے ہم جیسے جینس بچے کے ہوتے ہوئے بھی آپ قسمت کو الزام دے رہی ہیں۔“ اس کی

”میری بیٹی، تم کہتی ہو، میں تھک گئی ہوں گی۔“ شیریں کے جانے کے بعد سرکری کی بیک سر کرا انہوں نے تھکی تھکی سانس کھینچ کر شیریں کو مخاطب کیا۔

”نہیں، میں ابھی نہیں تھکی، میرا سفر بہت لمبا ہے..... میں ایک دیوانی عورت ہوں اور دیوانے بھلا تھکن محسوس کرتے ہیں۔“

باہر سے کچھ ہلچل، شور کی آوازیں ابھری تھیں مگر کبری خاتون خیالوں میں نہیں سن سکیں یہاں پر کہ ملازمہ نے اندر آکر کہا۔

”شاہ سائیں آگئے ہیں بی بی صاحب۔“

تب وہ سیدھی ہو بیٹھیں اور سکھ کا سانس لیا۔ شاہ جی سیدھے ادھر ہی آئے تھے کہ یہ اُن کا راحت کا کمرہ تھا۔

”اسے کیا ہوا ہے.....؟“ آتے ہی راحت پر نظر پڑی تو ٹھٹھک کر بولے۔

”یہ تو اُسی روز سے بیمار چلی آ رہی ہے، حکیم صاحب سے دوا آ رہی ہے، کئی بار بدل چکے ہیں افاقہ نہیں ہو رہا۔ میں تو بہت پریشان ہو گئی تھی۔“

اتنے سالوں کے بعد آج کبری خوفزدہ اور کمزور نظر آئی تھیں ورنہ تو کئی سالوں سے انہوں نے پڑی بی بی کا بد وقتار خول چڑھا رکھا تھا۔

”اسے شہر کے ڈاکٹر کو دکھائیں شاہ جی بلکہ میں تو کہتی ہوں آپ اسے گاڑی میں لے کر فوراً روانہ ہو جائیں، دیر نقصان کا باعث ہو سکتی ہے۔“

”کیوں.....؟ ایسی کون سی خطرناک بیماری لگ گئی ہے اسے جو فوراً گاڑی میں ڈال کر شہر لے جائیں، کبری تم تو یونہی پریشان ہو گئی ہو، بخار ہے اتر جائے گا، ایسا کرو ساری کیفیت لکھ کر ڈرائیو کو دو، وہ شہر کے کسی ایجنٹ سے مشورہ لے کر دوا لے آئے گا۔“

”مگر شاہ جی، آپ یہ بھی تو دیکھیں، یہ بے ہوش ہے۔“

”بخار کی شدت سے ایسا ہوتا ہے، تم ذرا جلدی سے کھانا لگواؤ، میں نہا کر آتا ہوں اور ہاں کھا اپنے کمرے میں ہی منگوانا، یہیں نہ لگوا لینا..... اور میں کھانے کے بعد کچھ دیر کے لئے نیند لوں گا، مجھے مت جگانا، میں بہت تھکا ہوا ہوں۔“

کمرے میں حکیم کی دی ہوئی دواؤں کی ناگوار بو پھیلی ہوئی تھی۔ شاہ جی نے یہاں بیٹھنا بھی ضروری نہیں سمجھا، فوراً کمرے سے نکل گئے..... اور جا کر کبری کے کمرے کو رونق بخشی۔ کبری نے ایک بار پھر راحت کا ہاتھ چھوا اور بولی۔

”راحت..... راحت، آنکھیں کھولو، دیکھو تو شاہ جی شہر سے واپس آگئے ہیں۔“

دھکٹھٹ گھٹٹ کر روتا ہے بالکل قریب اور کبھی یہ آواز بہت دُور سے آتی ہوئی محسوس ہوتی ہے اور کبھی یوں لگتا ہے جیسے جو یہ یہ کے اپنے دل سے آواز آ رہی ہے۔ وہ راتوں کو سونیں سکتی۔ اچانک بڑبڑا کر اُٹھ بیٹھتی ہے اور چاروں طرف دیکھنے لگتی ہے۔

”ابھی تو تھا، کہاں چلا گیا.....؟ اُس نے آواز دی تھی۔ وہ تنہا تھا اور ڈر گیا تھا.....“

اُداسی کم کرنے کو وہ شوخی سے بولا۔

”ہاں مزید، میں اُس کے لئے رورہی ہوں جو زندگی کی راہ میں مجھ سے بچھڑ گیا ہے۔ وہ جویر دل تھا۔ جس کی خاطر میں نے اس زندگی کو قبول کیا تھا۔ جس کی خاطر میں نے ہر بات کو اُڑا کر تھی۔ یہ کیسا ستم ٹوٹا کہ وہی مجھ سے بچھڑ گیا۔“ جویر یہ بہت کمزور ہو گئی تھی، اب ڈکھ سہا نہیں گیا، اندر کرتے بھی اچانک مزید کے سامنے اپنا غم کھول دیا۔

”کون؟“ آپ کس کی بات کر رہی ہیں ماما؟“ مزید سمجھ بھی کیسے سکتا تھا، حیران ہو کر پوچھ رہا تھا۔

”میرا طلال، میرے جگر کا کلکرا۔ وہ میرا پیارا بیٹا۔ جانے کہاں ہوگا۔؟“ کن ہاتھوں پر ہوگا۔؟“ جویر یہ چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر رونے لگی۔

”پلیز ماما۔۔۔ آپ روئیں نہیں، مجھے پوری بات بتائیں۔ دیکھیں میں کچھ بھی نہیں سمجھ پا رہا۔ کون ہے طلال اور وہ آپ کا بیٹا کیسے ہو گیا۔؟“

جویر یہ کچھ دیر سکتی رہی پھر آنسو پونچھ ڈالے اور آج مزید سے سب کچھ کہہ دینے کا فیصلہ کر لیا۔

الف سے بے تک وہ ساری کہانی رُک رُک کر کبھی آنسوؤں کے درمیان اور کبھی ضبط کے کڑے پہرول کے درمیان اُسے سناتی چلی گئی۔

”اف اتنا کچھ ہو چکا ہے آپ کے ساتھ اور آپ آج مجھے بتا رہی ہیں۔ وہ بھی صرف میرے اصرار کی وجہ سے اور پھر بھی کہتی ہیں کہ تم میرے بیٹے ہی نہیں دوست بھی ہو۔ یہ سنی دوستی ہے ماما۔“ مزید کی آنکھوں میں ڈکھ تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ جویر یہ اتنے طوفانوں میں سے کس طرح گزری ہوگی۔

”تم ابھی خود چھوٹے سے ہو سوائے میرے لئے پریشان ہونے کے اور کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ بس اسی لئے میں نے اب تک یہ سب کچھ تم سے چھپایا۔“

”میں اتنا چھوٹا بھی نہیں ہوں، آپ کو مجھ سے کہنا چاہئے تھا۔ زیادہ نہیں تو تھوڑی بہت کوشش تو میں کر ہی لیتا اور ممکن ہے میرا بھائی اب تک مل ہی گیا ہوتا۔ دیکھیں ناں، آپ مجھے بیٹوں کی طرح عزت سمجھتی ہیں، اتنا پیار کرتی ہیں تو پھر وہ میرا بھائی ہی ہوا ناں۔“

”ہاں مزید، رشتے خون کے ہوتے ہیں، اور رشتے دل کے بھی ہوتے ہیں، وہ تمہارا بھائی نا ہوا۔“

”میں اپنے بھائی کو ضرور تلاش کروں گا۔۔۔ اچھا ایک بات تو بتائیں، پاپا نے کوئی مدد نہیں کی آپ کی اس سلسلے میں۔؟“

”میں نے انہیں اس بارے میں کچھ نہیں بتایا، وہ آج تک اس بات سے بے خبر ہیں۔“

”کیا۔۔۔؟ آپ نے انہیں بھی کچھ نہیں بتایا اتنے برسوں سے۔؟“ یہ ڈکھ اکیلے ہی سہ رہی ہیں

ایسا ظلم نہیں کرنا چاہئے تھا آپ کو خود پر۔“

”کیا بتائی اور کیسے بتائی جبکہ مجھے یقین ہے وہ یہ سب سن کر مجھ سے ہمدردی تو بالکل نہیں کرنے البتہ بھڑک ضرور اُٹھتے اور یہ بھی ممکن تھا کہ غصے کی حالت میں ایسا فیصلہ کر ڈالتے جو مجھے گھر سے بے گھر کر دیتا۔۔۔ بیٹا، عورت جب ایک بار نکاح کے بندھن میں بندھ جاتی ہے، پھر شوہر کیسا ہی کیوں نہ ہو

چھوڑنا اس کے لئے بہت مشکل ہوتا ہے اور میرے تو کوئی آگے پیچھے بھی نہ تھا۔۔۔ اگر کبیر صاحب کوئی ایسا فیصلہ کر ڈالتے تو میں کہاں جاتی۔؟

بس یہی سوچ کر میں اتنے برس ان سے کچھ کہنے کا حوصلہ ہی نہیں کر سکی، اپنے طور پر ہی طلال کو تلاش کرتی رہی اور اب اتنے برس گزر چکے ہیں، تاؤں تو کیا تاؤں۔۔۔؟“ جویر یہ افسردگی سے بولی۔

”اچھا چلیں چھوڑیں، نہیں بتایا تو اچھا ہی کیا، واقعی پاپا سے کچھ اچھی امید نہیں رکھی جاسکتی تھی۔ اب میں کل سے یوں کرتا ہوں کہ اپنے اسکول کے تمام بچوں کے نام چیک کرتا ہوں۔ شاید کوئی طلال نام کا بچہ پڑھتا ہو اور ہاں، آپ نے یہ تو بتایا ہی نہیں، اس کی عمر کیا ہوگی۔؟“ وہ مجھ سے بڑا ہے یا چھوٹا۔“

”وہ تم سے تین سال چھوٹا ہے۔ لیکن مزید تم اپنے اسکول میں اسے تلاش کرو گے تا کہ کام ہی رہو

مے، مجھے اچھی طرح یاد ہے، وہ عورت جسے گلینڈ آپا نے چند روز کے لئے میرا بیٹا دیا تھا، خاصی غریب سی تھی، شاید لوگوں کے گھروں میں کام کرتی تھی۔ اُس نے اتنے مہنگے اسکول میں طلال کو کہاں داخل کروایا ہوگا۔ پتا نہیں عام سے اسکول میں بھی داخل کروایا یا نہیں۔؟“ اور یہ بھی تو ممکن ہے اُس نے میرے لال

کو در بدر ہونے کے لئے چھوڑ دیا ہو۔“

جویر یہ کی آنکھیں پھر بھر آئیں۔۔۔

”نہیں ماما، ایسا تو آپ سوچیں بھی نہیں۔۔۔ مجھے یقین ہے طلال جہاں بھی ہوگا، بہت خوش ہوگا

دیکھیں ناں، آپ اتنی اچھی ہیں، ہر کسی کے ساتھ نیک کرتی ہیں۔ مجھ سے اتنا پیار کیا آپ نے تو پھر آپ کے بیٹے کو اللہ میاں نے بھینٹے تھوڑی دیا ہوگا۔ وہ ضرور محفوظ ہاتھوں میں ہوگا۔ بس کل سے میں اُس کی

تلاش شروع کر دوں گا۔ آپ تفصیل سے اُس کا حلیہ مجھے بتائیں۔ اوہ اگر آج اسکول میں چھٹی نہ ہوتی تو آج ہی یہ کام ہو جاتا۔“

گمراہ گلے روز اسکول جا کر بھی مزید کو نا کامی ہوئی۔۔۔ طلال نام کے تو کوئی لڑکے تھے مگر جس طلال کی اسے تلاش تھی، ان میں وہ نہیں تھا مگر مزید مایوس ہرگز نہیں تھا۔۔۔ اسے یقین تھا طلال ضرور مل جائے گا۔

اب وہ جویر یہ کا ڈکھ جان گیا تھا اور پہلے سے زیادہ اُس کا خیال رکھتا تھا اور بھی قریب آ گیا تھا ماں کے، وہ باپ کے روئے کا بھی جائزہ لینے لگا تھا اور اُسے ڈکھ تھا کہ اُس کا باپ ایک خود پسند اور کس حد تک بے رحم شخص ہے۔

اُس نے ماں کے احساسات کی کبھی پروا نہیں کی، نہ ہی کبھی بچوں کے لئے اُسے فکر مند دیکھا ہے۔

کبیر حسن کی بڑی بہن، دشا د کچھ روز بعد پنڈی سے یہاں آ رہی تھیں۔ وہ آتی تو کم ہی تھیں۔۔۔ مگر جب بھی آئیں۔ جویر یہ کو تو تھا کہ رکھ کر دیتیں۔“ فلاں بچہ یہ کھائے گا، فلاں کو یہ چاہئے، میرے لئے یہ

بنے گا، اس کرے میں نیند نہیں آتی، اب دوسرا سیٹ ہوگا۔“

جویر یہ بے چاری خاموشی سے سب کچھ سنتی اور حکم بجالاتی کہ کبیر حسن کا حکم بھی تھا، میری دونوں

بہنیں مجھ سے بہت پیار کرتی ہیں انہیں میرے گھر میں ہر طرح کا آرام ملنا چاہئے۔“

دشا دا پاپو لئے کی بھی بڑی شوقین تھیں۔ اُن کی ذرا سی بات بھی گھنٹوں پر محیط ہوتی تھی اور جویر یہ کو

ان کے سارے قصے خاموشی سے سننے پڑتے تھے۔ چھوٹی ننڈا جدہ کی ساس بھی اپنی بہو کی بہن سے بہت

تک تھیں کہ اس کی مسلسل گفتگو سے ان کے سر میں درد ہونے لگتا تھا بلکہ وہ کبھی تھیں، مجھے سر درد کی تکلیف

ہوئی ہی دشا دا بی بی کی وجہ سے ہے۔

اتنا کہہ کر ذرا پیچھے ہوا اور بیڈ پر پڑے اخبار کے نیچے رکھی، دادی کی عینک ذرا سی آواز پیدا کر کے اپنے ہونے سے نہ ہونے کا اعلان کر گئی۔

”ارے یہ کیا.....؟“ اُس نے اخبار ہٹا کر عینک کے دونوں ٹکڑے اٹھائے پھر بولا۔ ”دادی یہ بھی کوئی جدت تھی رکھنے کی اور اب الزام سارا مجھ پر آ جائے گا۔ سچ بے مظلوم کی کون سنتا ہے زمانے میں۔“

”اچھا بھیا..... تم جاؤ اور جا کر گیند کھیلو۔“ انہوں نے حنفی کے عالم میں دونوں ٹکڑے اس کے ہاتھ سے لے لئے۔

”سوری..... بڑا نقصان ہو گیا ہے آپ کا..... عینک ٹوٹ گئی، اب آپ ٹی وی پر پروگرام کیسے دیکھیں گی۔ آپ کو کیسے پتا چلے گا کہ آج کل دُنیا میں کون سا فیشن چل رہا ہے اور موٹی، کالی عورتیں لپ اسٹک کا کون سا شید پسند کر رہی ہیں۔“

انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا، ٹوٹی عینک کا معائنہ کرتی رہیں۔

”دادی ایک ترکیب ہے میرے پاس، آپ ایسا کریں درمیان میں دھاگہ لپیٹ کر دونوں ٹکڑوں کو جوڑ لیں۔“

”یہ دھاگے سے جڑنے والی نہیں۔“ انہوں نے منہ بنایا۔

”ہاں واقعی، چوٹ شدید ہے..... اچھا چلیں ایسا کرتے ہیں گوند لگا کر..... مگر نہیں، یہ بھی ٹھیک نہیں، بس پھر جب نیاز آتا گوند سے گا تو میں وہ آٹا لے آؤں گا، اس سے تو ضرور ہی جڑ جائے گی۔ کہتے کیا ہے.....؟“ دادی لپٹا جا ہی۔

”اے پرے بہت..... آٹے سے جوں جوں اور رات کو چوہے وہ آٹا کھانے میرے بستر پر دوڑے چلے آئیں۔“

”ہاں واقعی..... مجھے اس بات کا تو خیال ہی نہیں رہا..... بظہر میں کچھ ادرسو چتا ہوں۔“

”نہیں تم رہنے دو۔“ وہ بے دلی سے گویا ہوئیں۔

”اب یوں رہنے دوں..... بس تھوڑی دیر کی بات ہے..... ضرور کوئی اچھی سی ترکیب لڑاؤں گا..... اودھال، زبردست، سننے دادی اور داد بیچتے مجھے۔“

”اچھا چلو سناؤ۔“ انداز ایسا تھا کہ کہو اور نکلو میرے کمرے سے۔

”وہ ایسا ہے دادی کہ اس کے لئے آپ کو ایک عدد دبل کم چبانی پڑے گی، جب ذرا نرم ہو جائے تو پھر اس سے عینک جوڑ لیجئے گا۔ سچ ایسی مضبوط جڑے گی کہ کیا بتاؤں.....؟“

”تم نے اتنے مشورے دیئے تمہاری بڑی مہربانی، اب جاؤ میں نیا فریم ڈالواؤں گی۔“

”لیجئے، اگر یہی کرنا تھا تو پہلے بتا دیتیں..... میں تو بچت کر وارہا تھا مگر لگتا ہے پھوپھو کا اثر ہو گیا ہے۔ آپ فضول خرچ ہونے لگی ہیں۔“ اُس نے اتنا کہہ کر ایک بار پھر بیچ لیا اور باہر آ گیا۔

رات کے گیارہ بجے ہیں اور حویلی کے سب لوگ جاگ رہے ہیں مگر پھر بھی گہری خاموشی چھائی ہوئی ہے۔ ایک دوسرے سے نظریں چرائے وہ بے مقصد ہی ادھر ادھر کھوم رہے ہیں اور آنے والے وقت سے خوفزدہ ہیں۔

پھوپھو دلشاد نے فون پر اپنی آمد کی اطلاع دی۔ مزید سنتے ہی اوپر چلا آیا اور رُخ دادی کے کمرے کی جانب تھا۔

”میری پھوپھو آ رہی ہیں۔“ انداز علانیہ تھا۔

”کون آ رہی ہیں.....؟“ وہ اپنا دوپٹہ تلاش کر رہی تھیں، مصروف سے انداز میں بولیں۔

”میری خاموش طبع پھوپھو۔“ وہ ہنسا۔

”اس..... تمہاری کون سی پھوپھی خاموش طبع ہو گئیں۔ دو ہی تو ہیں اور دس پر بھاری ہیں بولنے کی شوقین اور پھر وہ بھی جھٹ پھاڑ کر بولنے والی..... تو بہ اللہ بجائے۔“

”دلشاد پھوپھو آ رہی ہیں اپنے بچوں سمیت.....“ اب ذرا تفصیل سے بتایا۔

”نو اتنی مشکل سے سردرد کی تکلیف ٹھیک ہوئی تھی، اب پھر آ رہی ہے، میں پوچھتی ہوں، اے اپنے گھر میں چین نہیں بڑتا کیا۔“

”پتا نہیں آئیں گی تو پہلا سوال یہی ہو گا اور پوچھوں گا بھی آپ کی طرف سے۔“

”نہ نہ، میرا نام نہیں آتا چاہئے.....“

”واہ دادی، آج پتا چلا گیا، آپ کو بڑا دعویٰ تھا بہادری کا۔“ اُس نے ہاتھ میں پکڑی بال ہوا اچھا کرکچ کی اور دادی کو جوش دلا یا۔

”ذرتی درتی تو میں کسی سے نہیں..... بس زبان کی تیز اور بد لحاظ ہیں تمہاری دونوں پھوپھیاں اللہ میں بد تمیزوں کے منہ لگنا پسند نہیں کرتی۔“

واجہدہ کی چھوٹی بیٹی مہنا ز دروازے کے قریب ہی کھڑی تھی، یہ بات سن کر اندر آ گئی اور بولی۔

”دادی! آپ نے میری امی کو بد تمیز کہا ہے۔ میں ابھی جا کر بتاتی ہوں انہیں۔“

”اے ہاں ہاں، جو جیسا ہے ویسا ہی کہوں گی..... تم صرف ماں کو ہی نہیں بتاؤ بلکہ پورے محلے میں اعلان کر آؤ۔“

”واہ دادی..... بندے کو ایسا ہی بہادر ہونا چاہئے۔ مان گیا میں آپ کو، اگر پھوپھو لڑائی کے ارادے سے ادھر آئیں تو ڈریئے گا مت، ہمت سے کام لے کر کھری کھری سنا دیجئے گا، فکر مت کیجئے، میں ہمیشہ موجود ہوں گا اور آپ کو برا بھلا کھڑا پتا رہوں گا۔“ اس نے ایک بار پھر بال ہوا میں اچھالی اور کرکچ کی۔

”اچھا..... تم اب تک کر کہیں بیٹھ جاؤ، گیند کے پیچھے سارے کمرے میں ناچ رہے ہو، کہیں کوئی نقصان نہ کر بیٹھا اب۔“

”نہیں دادی، میں اور آپ کا نقصان کروں۔“ ایک بار پھر وہی عمل دہرانے کے بعد بال ہاتھ میں لی اور جھلانگ لگا کر بیڈ پر آ بیٹھا۔

”دھیان سے..... دھیان سے، اب کیا پنگ توڑو گے.....؟ ویسے تم جب بھی آتے ہو، میرا کوئی..... کوئی نقصان ضرور ہی کر جاتے ہو۔“

”دادی..... نقصان تب ہوتا ہے، جب میں آرام سے بیٹھتا ہوں، صرف آپ کی محبت میں آپ کسی نقصان سے بچانے کی خاطر ہی اچھل رہا تھا جسے آپ نے انتہائی نفرت سے ناچ کا نام دے دیا۔“

ویسے یقین کریں، آج تک میں نے آپ کی کوئی چیز جان بوجھ کر نہیں توڑی۔“

”میرے مالک اسے صحت عطا فرما.....“ اندر کے دوسوں سے گہرا کبر کی خاتون نے کراہ کر کہا۔
ماگئی۔ اور اپنے کمرے سے اٹھ کر باہر برآمدے میں آگئیں۔ کہ یہاں گھر کی ملازماں موجود ہیں۔
وہ سو جتی ہیں، شاید لوگوں کی موجودگی مجھے حوصلہ دے اور میں کچھ ہمت پکڑ لوں۔ میں اس خوف سے نجات
پاؤں جو اس وقت بہت شدت کے ساتھ مجھ پر حاوی ہو رہا ہے۔ راحت کو ابھی ابھی شاہ جی گاڑی میں
ڈال کر قریبی شہر کے ہاسپتال لے گئے ہیں اور پیچھے دوسرے اور خوف باقی رہ گئے ہیں۔

”آپ آرام کر لیتیں بڑی بی بی صاحب۔“ ایک خیر خواہ اس کے کان کے قریب جھک کر سرگوشی
کرتی ہے۔
”نہیں، میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تم سب لوگ راحت کے لئے دعا کرو کہ خدا اسے صحت عطا
فرمائے۔“

پھر کچھ خیال آیا تو فاطمہ بیگم کے کمرے کی طرف چل پڑیں، سوچا شاید وہ بھی سب کی طرح جاگ رہی
ہو اور اگر جاگ رہی ہے تو اسے دعا کے لئے کہا جاسکتا ہے، وہ اللہ والی ہے، اُس کی دعا ضرور قبول ہوگی۔
فاطمہ جاگ رہی تھی اور گل رخ بھی کتا میں کھولے اور بستر کے قریب لیپ رکھے پڑھنے میں
مصروف تھی۔

”آئیے آ جا.....“ فاطمہ اسے اس وقت کمرے میں دیکھ کر کچھ حیران ہوئی اور اپنے بستر پر اس
کے لئے جگہ بنانے لگے جبکہ گل رخ بھی سوالیہ انداز میں کبریٰ کو دیکھ رہی تھی۔
کبریٰ تھکتے تھکتے انداز میں بستر پر بیٹھ گئیں..... اور بولیں۔

”راحت کی طبیعت بہت خراب ہے اور میں اپنے اندر سے اُنھنے والے خوف کی جگڑ میں ہوں۔“
”آپ کو یہ ڈر ہے کہ کہیں یہ بیماری اس کی جان نہ لے لے۔“
”ہاں فاطمہ، کچھ بھی ہے، میں اس کو صحت مند اور جیتا جاگتا دیکھنا چاہتی ہوں، ابھی اس کی عمر ہی
کیا ہے، تم دعا کرو، خدا اسے صحت دے۔“

”آہ آپ..... یہ تو اللہ تعالیٰ کے فیصلے ہیں، بندہ بے بس ہوتا ہے اگر اللہ کا حکم ہو تو آدمی مرتے
مرتے بھی بچ جاتا ہے اور جو حکم نہ ہو تو جنگ بھلا بیٹھا بیٹھا اچانک موت کی وادی میں اتر جاتا ہے، انسان بڑا
بے بس ہے، خدا کی مرضی کے آگے کچھ نہیں چلتی اس کی، اب اگر راحت کی قسمت میں موت ہی لکھی ہے تو
کیسے کوئی ٹال سکتا ہے۔“

”شاید فاطمہ بے حس ہو چکی تھیں۔“ کبریٰ نے اس کے سپاٹ چہرے کو افسوس کے ساتھ دیکھتے
ہوئے سوچا اور اُنھنھنہ مہرزی ہوئی۔ اس کی باتیں تو اور بھی پریشان کرنے والی تھیں۔
گل نے کہا بھی ”آپ تنگی ہوئی لگ رہی ہیں، یہیں آرام کر لیں۔“ مگر وہ انکار کر کے باہر آ گئیں
اور برآمدے میں نیچے تخت پر آ بیٹھی۔

ان کے دوسرے غلط فہمی تھے اور راحت واقعی لمبے سفروں کی تیاری پکڑ چکی تھی۔ اس کا بے جان وجود
حویلی میں آ گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی سکوت ٹوٹ گیا تھا..... اتنی بڑی حویلی ابھی ڈرا در پہلے گہری دُھند
جیسی چپ کی لپیٹ میں تھی اور اب یہاں ہر طرف سے آہوں اور سسکیوں کا طوفان اُٹھ رہا تھا۔ راحت کے
بے جان وجود کو دیکھتے ہی کبریٰ کا دل جیسے شے میں آ گیا تھا۔ ایسا کیوں ہو رہا ہے، ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا

مگر وہ عجب سی کیفیت کا شکار تھیں اور بے جا رہی تھیں، دل ہی دل میں راحت سے مخاطب تھیں۔
”راحت..... راحت! خدا کی قسم میں نے کبھی تمہارا برا نہیں چاہا تھا۔ میری نفرت تم تو کبھی بھی
نہیں رہی۔ میری نفرت تو وہ مرد تھا جس کی آرزو کی تکمیل تمہارا ذات سے ہوئی..... اگر تم اسے بیٹا نہ
دیتیں تو ج کبھی ہوں، تم بھی میرے لئے فاطمہ کی طرح ہوتیں۔ مجھے تم سے کوئی دشمنی نہ تھی۔ پھر بھی اگر
تمہارے دل میں میرے لئے کوئی گدہ تھا تو مجھے معاف کر دینا کہ میں بھی تو ٹوٹی ہوئی عورت تھی۔ میں نے
اپنے نصیب کی خوشیاں تم لوگوں کے دامن میں جا بنے دیکھی ہیں..... مجھے معاف کر دینا۔“

ان کی مجبوری یہ تھی کہ اتنے لوگوں کی موجودگی میں وہ باوازا بلند یہ سب نہیں کہہ سکتی تھیں۔ وہ تو کھل
کر دہی نہیں کہتی تھیں۔ بڑی بیگم کا دوا کر مجروح ہوتا تھا..... بس تو اتر سے آنسو گر رہے تھے اور لب خاموش
تھے جبکہ ان کے گرد ملازمین اور گاؤں کی عورتیں اُوچی آواز میں بین کر رہی تھیں۔ وہ فرش پر بیٹھی تھیں اور
چارپائی کی پٹی سے سر نکالے دل ہی دل میں اس سے مخاطب تھیں۔ ان کے سارے بدن پر لرزہ طاری
تھا..... اور ہونٹ تھرا رہے تھے۔

”کبریٰ.....“ جمشید شاہ نے آواز دی۔ انہوں نے آنسوؤں سے بھیگا چہرہ اُٹھا کر ان کی جانب دیکھا۔
”یہ شخص..... ہاں یہ شخص جو مجھے سازش کرنا سکھا گیا جس نے فاطمہ کی زندگی کو کھر میوں میں دھکیلا
اور اسے جس بنا دیا..... یہی تو ہے جس نے راحت کی جوانی کو اپنی خواہشوں کے لئے خریدا..... یہ آج
بھی کتنا مطمئن نظر آ رہا ہے..... وہی آن بان اور ہر تاثر سے عاری چہرہ اس بے چاری کی موت بھی
اس سپاٹ چہرے پر غم کی کوئی تحریر نہیں لاسکی۔ شاہ کو کوئی رخ نہیں، کوئی ملال نہیں..... حالانکہ راحت تو وہ
عورت ہے جس نے شاہ کو اس کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی دی، اس کے نیچے ہوتے شعلے کو پھر سے
اُونچا کر دیا مگر پھر بھی..... پھر بھی.....“

اُن کا جی چاہا وہ اُٹھ کر شاہ کا گریبان پکڑ لیں..... اور جھنجھوڑ لیں اور جیج جیج کر پوچھیں۔
”کیا یہ اتنی حقیر، اس قدر بے وقعت بھی کہ تم اس کی موت پر دو آنسو بھی بہانا اپنی شان کے خلاف
سمجھتے ہو.....؟“

مگر وہ یہ سب کچھ صرف سوچ ہی سکیں۔
”کبریٰ اب اُٹھ جاؤ..... سنبھالو خود کو..... بہت سے مہمان آئیں گے..... اپنی نگرانی میں
انتظامات مکمل کر لو.....“

وہ یہی کہنے کے لئے آئے ہوں گے..... کہہ کر واپس مردانے میں چلے گئے۔
کبریٰ ایک ملازم کا سہارا لے کر فرش سے اُٹھیں تو دیکھا گل رخ کے ساتھ فاطمہ آہستہ آہستہ قدم
اُٹھاتی ادھر ہی چلی آ رہی تھی۔

”آج وہ چلی گئی ہے فاطمہ..... وہ جو شاہ کے بیٹے کی ماں تھی..... وہ تو اصل ماں تھی تاں اس حویلی
کی..... مگر دیکھو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کس خاموشی سے چلی گئی۔“ کبریٰ آگے بڑھ کر فاطمہ سے لپٹ گئیں
اور آنسوؤں کے درمیان کہنے لگیں۔

”آہ! خوش نصیب عورت تھی۔“ فاطمہ نے اپنی محرومیاں کے زیر اثر اُس کے نصیب پر رشک کیا۔
میر نے اسے آکر کبریٰ کو پکڑا اور پانی کا گلاس ان کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ چند گھنٹہ کی گراں بیہوشی گلاس

بیچے ہٹا دیا اور بولیں.....

”شیریں بیٹی، اپنے بابا سے پوچھو..... اس کے لاڈ لے کو بھی پیغام بھیجا بائیں..... کسی نے اردشیر بھی بتایا کہ نہیں..... اس کی ماں چلی گئی ہے، اب وہ اکیلا ہے، بہت اکیلا.....“ کبریٰ خود کو سنبھالنے میں ناکام ہوئے جاری تھیں۔

”امی..... اتنا مت روئیں، سنبھالیں خود کو۔“ شیریں کے اپنے ہوش اڑے جا رہے تھے۔ ملازماؤں کو یہ سب کام بتا کر وہ خود ماں کے قریب ہی بیٹھ گئی، بھی پانی پلائی تو کبھی ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر دبائے لگتی..... ساتھ ساتھ سنبھلنے کی تلقین بھی کرتی جا رہی تھی۔

جس وقت اردشیر گاؤں پہنچا اور حوٹلی کے اندرونی حصے میں داخل ہوا، اسے دیکھ کر عورتوں کے..... جین اور جینیں پہلے سے کہیں زیادہ بلند ہو گئیں سب سے پہلے اس کی خالہ نے بڑھ کر اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ دیئے اور سر اس کے ساتھ لگا کر رونے لگی۔ پھر باقی کے رشتے دار، جبکہ ملازما میں ہاتھ اپنے اپنے اور سر پر مار کر مین کرتی رہیں۔

وہ سر نیچے کئے اور نظریں جھکائے اُداس چہرے کے ساتھ ہولے ہولے قدم اٹھاتا اپنی ماں کے بے جان وجود کی جانب بڑھا۔

”اردشیر.....“ ابھی وہ چند قدم کے فاصلے پر تھا جب اُس نے اپنے بیچے باپ کی آواز سنی۔ وہ رُک گیا۔ پلٹ کر ان کی جانب سوالیہ انداز سے دیکھنے لگا..... وہ قریب آئے، اس کے شانے پر اپنا ہاتھ رکھا اور مضبوط آواز میں بولے۔

”حوصلے سے بیٹا، تم اب جوان مرد ہو اور مرد تو کبھی حوصلہ نہیں ہارتے۔“

اردشیر نے نہ تو سر اثبات میں ہلایا اور نہ ہی کچھ منہ سے کہا۔

اردشیر کی آمد کی اطلاع پر کبریٰ بھی جو کچھ دیر پہلے اپنے کمرے میں گئی تھیں، اب دوبارہ ادھر آگئی تھیں..... اور کچھ فاصلے پر کھڑی باپ بیٹے کو غور سے دیکھ رہی تھیں۔

”حوصلے سے..... بہت حوصلے سے بیٹا.....“

شاہ جی نے ایک بار پھر اسے کہا تو اب ان کی بات پر گہری سانس کھینچ کر اُس نے سر اثبات میں ہا دیا اور پھر دوبارہ سے قدم آگے بڑھادیئے۔ اب شاہ جی اس کے ساتھ ساتھ تھے۔

جس وقت اُس نے چادر کا کونہ ہٹایا اور ماں کا دیدار کیا..... کبریٰ نے بے اختیار ہاتھ اپنے سینے پر بائیں جانب رکھ لیا..... وہ منتظر تھی کہ اب یہ پندرہ سالہ لڑکا ضبط کا دامن چھوڑ بیٹھے گا، وہ ہار جائے گا..... ابھی وہ اتنا بڑا نہیں ہوا کہ ایسا عظیم نقصان خاموشی سے برداشت کر جاتا مگر اردشیر کے بارے میں اس کا اندازہ غلط تھا۔ اُس کا ضبط ہلا کا تھا..... آنسو روکنے کی کوشش میں سرخ ہوتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ لب بھینچ کر نہایت خاموشی اور پامردی کے ساتھ اُس نے ماں کو یوں مٹی کے بے جان بُت میں ڈھلے ہوئے دیکھا پھر جھک کر اُس کے ماتھے پر بوسہ دیا اور چہرہ دوبارہ..... چادر سے ڈھک دیا۔

شاہ جی نے اُس کی پشت تھپتھپائی اور ہولے سے کچھ کہا..... وہ کسی کی طرف دیکھے بغیر ان کے ساتھ ساتھ چلتا مردانے میں چلا گیا۔

”کتنے برس بیت گئے، جب مجھ سے پچھڑا تھا تو نضا پچھڑا تھا۔ اب میرا طلال اٹھارہ برس کا ہوگا۔“ وہ مسلسل آنسوؤں کے درمیان اسے یاد کر رہی تھی۔ مزید بیڑ پر قریب ہی بیٹھا تھا اور چپ کرانے کی ناکام کوشش کے بعد اب خاموش اور اُداس نظروں سے جویریہ کو روتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

”اب تو وہ پورے اٹھارہ برس کا ہوگا..... مجھے تو بھول ہی چکا ہوگا، کہاں یاد ہوگی ماں، ملنے پر بھی پہچان نہیں سکے گا، مزید! مجھے تو لگتا ہے اب وہ کبھی مجھے نہیں ملے گا۔ اتنے برس تو گزر گئے۔ اب تو وہ مجھ سے دُور، بہت دُور جا چکا ہے۔“

”مما پلیز..... سنبھالیں خود کو، آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے..... ڈاکٹر نے آپ کو مکمل ریست کے لئے کہا ہے، یہ ٹینشن تو اور بھی بیمار کر دے گی آپ کو۔“

”میں خود کو مجرم سمجھتی ہوں اس کی..... وہ جانے کس حال میں ہوگا اور میں یہاں اتنے بڑے گھر میں ایک آرام دہ زندگی بسر کر رہی ہوں..... اچھا کھاتی ہوں، اچھا پہنتی ہوں اور میرا بیٹا..... میرا طلال۔“ وہ اور بھی شدت سے رونے لگی

”مما..... ممما، حوصلہ نہیں ہاریں، خدا پر بھروسہ رکھیں..... آج نہیں تو کل وہ ضرور ہم سے آن ملے گا۔ آپ کیوں گھبراتی ہیں..... پالنے والا تو اللہ ہے اور وہ نیکی کا صلہ بھی ضرور دیتا ہے۔ آپ اتنی اچھی ہیں۔ سب کا اتنا خیال رکھتی ہیں، سب سے پیار کرتی ہیں..... یقیناً آپ کا بیٹا بھی چاہنے والوں کے درمیان ہوگا اور پھر ممما، ہم نے اُس کی تلاش ترک تو نہیں کر دی۔ میں تو اتنے سال گزر جانے کے باوجود مایوس نہیں ہوں۔ مجھے تو لاشعوری طور پر ہی اُس کی کھوج رہتی ہے۔ جہاں کہیں بھی اٹھارہ انیس برس کا خوبصورت لڑکا دیکھتا ہوں تو جلدی سے نام پوچھتا ہوں..... ہم ایک نہ ایک دن ضرور ڈھونڈ نکالیں گے طلال کو..... اور ممما وہ دن کتنا روشن، کتنا خوبصورت ہوگا..... ہے ناں؟“ اُس نے جویریہ کا ہاتھ ہاتھوں میں لے کر پیار سے تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

”مما..... بچا آگئے۔“ رات نے اندر جھانک کر غلج کے عالم میں اطلاع دی اور یہیں سے واپس ہو گئی۔

”اچھا..... ممما، میں چلتا ہوں، آپ بھی آنسو پونچھیں اور شوہر نامدار کے استقبال کی تیاری کریں اور ہاں ڈیڑی اگر کڑوی کیلی باتیں کریں تو دل پر مت لیجئے گا، ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیجئے گا، یاد رکھیں میں اور رات آج آپ کو بہت جلد ایک دم سے فٹ دیکھنا چاہتے ہیں۔“

”تمہاری باتیں مجھے زندہ رہنے پر اُکساتی ہیں بیٹا، تمہارا پیار، تمہاری توجہ، میں تو شرمندہ ہوجاتی ہوں، تمہاری اتنی محنت کے مقابلے میں، میں تو جنہیں کچھ بھی نہیں دے پاتی۔“

”یہ تو آپ سمجھتی ہیں جبکہ میرا خیال ہے جتنی محبت آپ نے مجھے دی ہے، اس کا حق میں کبھی ادا نہیں کر سکتا۔“ وہ اتنا کہہ کر کمرے سے چلا گیا کہ کبیر حسن آیا ہی چاہتے تھے۔

کبیر حسن اپنے مخصوص بگائے انداز میں بیڈروم میں داخل ہوئے اپنی سی نظر بیوی پر ڈالی، حال پوچھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی۔ اُس نے سلام کیا تو جواب سر کے اشارے سے ہی دیا۔ پہلے بریف گیس، پھر کوٹ اور نائی بیڈ پر پھینک کر ڈریسنگ روم میں چلے گئے۔

وہ خود کو سنبھال کر اُنٹھ کھڑی ہوئی اور باہر آ کر ملازمہ کو کھانے کے متعلق ہدایت دی۔ کمرے میں واپس آئی تو کبیر حسن کپڑے بدل کر کمرے میں آ چکے تھے۔

مزید جویریہ کے کمرے سے اُنٹھ کر راتھ کے پاس چلا آیا تھا۔ وہ نماز پڑھ رہی تھی، اُسے کچھ دیر کے لئے انتظار کرنا پڑا۔ بوریت سے بچنے کے لئے حلیف سے کہنا نہیں دیکھنے لگا۔

راتھ پندرہ برس کی ہو رہی تھی مگر اس میں اس عمر والی شوخی نہیں تھی، جویریہ نے اس کی تربیت ہی کچھ اس انداز میں کی تھی کہ وہ خاصی سنجیدہ اور رکھ رکھاؤ والی ہو چلی تھی۔ کبھی تو اس کی باتوں اور انداز پر مزید کوہنی آجاتی اور مذاق بھی خوب اُڑاتا، مگر وہ بھائی کی کسی بات کا برا نہیں مانتی تھی۔ مزید سے اسے بہت پیار تھا اور اتنے اچھے بھائی پر فخر بھی بہت تھا اُسے..... نماز سے فارغ ہو کر اُس نے بھائی کی طرف دیکھا اور بولی.....

”بور ہو رہے ہیں ناں.....؟“

”ظاہر ہے، اکیلا بندہ بور نہیں ہوگا تو کیا ہوگا..... تم نماز پڑھ رہی تھیں..... انتظار کے سوا کچھ بھی کیا سکتا تھا۔“

”ویسے بھائی، آپ بھی کبھی نماز پڑھ لیا کریں، اچھا ہوتا ہے۔“

”چلو ہوگئی نصیحتیں شروع، راتھ! تم تو مجھے پچاس سال کی بڑھیا لگتی ہو۔“

”اچھا..... اگر میں پچاس برس کی ہوں تو پھر بھلا آپ کتنے برس کے ہوئے.....؟“ وہ شرارت سے مسکرائی۔

”چھوڑو اس بات کو..... میرا حساب بڑا کمزور ہے۔“ اس نے بات ٹال دی، پھر فوراً ہی بولا۔

”کبھی کھیل کود بھی لیا کرو۔ اور نہیں تو مہناز کے پاس ہی چلی جایا کرو۔“ یہ مہناز والی بات اُس نے صرف اُسے چھیڑنے کو کہی تھی اور توقع کے عین مطابق اُس نے منہ بنایا اور بولی.....

”ہونہہ..... مہناز باجی..... وہ تو صرف آپ کے ساتھ ہی ہنس ہنس کر باتیں کرتی ہیں..... مجھ سے تو بات کرنا بھی پسند نہیں کرتیں..... بہت مغرور ہیں، پتا نہیں کیا سمجھتی ہیں اپنے آپ کو۔“

”اس میں قصور مہناز کا نہیں مائی ڈیزس سسٹر، بس بندے کی پرستیشی ہوتی ہے، تمہاری جیسی شکلوں سے تو کسی کا بھی بات کرنے کو دل نہیں چاہتا۔“

”اچھا جی، پھر کیوں آئے ہیں آپ میرے کمرے میں.....؟“ اُس نے منہ پھلایا۔

”میں تو بھائی ہوں تمہارا..... اگر میں بھی لوگوں کی طرح نظر انداز کرنے لگوں تو تم بے چاری تو

”مفت کے رہ جاؤ گی۔“

”اب جا کہاں رہے ہیں، بیٹھیں ناں۔“ اُسے اُنٹھے دیکھ کر راتھ نے روکنا چاہا۔

”جب سے آیا ہوں برابر لڑائی کر رہی ہو، کیا فائدہ بیٹھنے کا۔“

”میں لڑائی کر رہی ہوں یا آپ..... آتے ہی مجھ پر اعتراض کیا، میرا مذاق اُڑایا اور کیسی معصوم شکل بنا کر کھڑے ہو گئے ہیں۔“

”بیٹائی کب ہے، ہے ہی ایسی، معصوم پیاری ہی۔“

”رہے بھی دیں.....“ اس وقت وہ ناراض تھی، سو اختلاف کیا ورنہ سارا دن بھائی کی تعریفیں بھی دی کیا کرتی تھی..... وہ کہتا ”ضرور نظر لگاؤ گی مجھے۔“

”آپ کو مہناز بی بی بلارہی ہیں چھوٹے صاحب۔“ ملازمہ نے آ کر مہناز کا پیغام دیا، بن کر راتھ نے برا سامنے بنایا اور سر کو جھکا دیا۔

”کیوں نہیں اتنی تکلیف کس لئے.....؟“ وہ بظاہر برامان کر خفگی سے کہہ رہا تھا۔

”مجھے ذرا اچھی نہیں لگتیں یہ مہناز باجی، ادھر آپ گھر آتے ہیں، ادھر وہ یا تو خود آپ سے باتیں کرنے کے لئے چلی آتی ہیں یا پھر آپ کو بلواتی ہیں اور آپ بھی دوڑے چلے جاتے ہیں، سچ کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے آپ میرے نہیں اُن کے بھائی ہیں۔“ اس بات پر مزید نے زوردار قہقہہ لگایا پھر بولا۔

”پاکل لڑکی، یہ بات اُس کے سامنے مت کہہ دینا، بے چاری سن کر بے ہوش ہو جائے گی۔“ راتھ نے اُس کی بات جیسے ہی سنی نہیں، بولی۔

”پھوپھو کی ساری نیکی ہی عجیب ہے مجھ سے اور ماما سے تو بات کرنا بھی پسند نہیں اور آپ سے کیسے دوستی کر کھی ہے، کبھی کبھی تو مجھے اتنا غصہ آتا ہے کہ بتا نہیں سکتی۔“

”پھوپھو کی خیریت.....؟“ مجھے بلوایا تھا، بس جیسے ہی پیغام ملا میں دوڑا چلا آیا۔“ جاتے ہی واجدہ سے پیار جتایا، وہ بھی کم نہیں تھیں، فوراً بولیں۔

”ارے میرے چاند، میں تو ہمیشہ ہی تمہیں یاد کرتی ہوں، جب کبیر نے جویریہ سے شادی کی، کتنا کہا میں نے یہ بچہ مجھے دے دو، سو تیلی ماں کے ظلم و ستم سہنے کے لئے ساتھ مت رکھو مگر ایک نہیں سنی کبیر نے اور جویریہ..... اُس نے کبھی تمہیں اپنا بچہ سمجھا ہی نہیں، اسے تو بس راتھ کا خیال ہے۔“

”چھوڑیں پھوپھو، یہ بتائیں بلایا کیوں تھا.....؟“

”ہائیں..... کیوں.....؟“ کیک میں ڈالنے والی اشیاء میں مزید حسن کا نام بھی شامل ہے۔“ وہ ڈر کر پیچھے ہٹ گیا۔

”کیک تو کب کا بن گیا، اب چائے بنا رہی ہے سو چال کر شام کی چائے نہیں گے باتیں بھی ہوں گی۔“

”اچھا تو یہ بات ہے آپ نے مجھے ڈرا ہی دیا تھا..... میں دادی کو سلام کر آؤں، پھر مہناز کو بھی دیکھتا ہوں۔“

”جھلی آجانا، میری ساس صاحبہ کو بھی لمبی باتیں چھیڑنے کی عادت ہے۔“

”فکری نہ کریں، یوں کیا اور یوں آیا۔“ یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔

کی، اب جو برتاؤ وہ ماں کو بزرگوں کے ساتھ کرتے دیکھیں گے، وہی اپنی ماں سے بھی کریں گے۔“
 ”بالکل بالکل، بجا ارشاد فرمایا آپ نے..... مجھے شعریا دآ رہا ہے۔ عرض کیا ہے۔
 ”دُنیا عجب بازار ہے اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے
 نیکی کا بدلہ نیک ہے، بد سے بدی کی.....“
 ”بس چپ کرو، یہ شعر دیر مجھے کچھ نہیں آتے..... میں نے تو یہ دیکھا ہے جس نے جو بویا ہے، وہی
 کاٹا بھی ہے۔“

”جی جی..... وہ ایک فلمی گانا ہے، یقیناً اس سے آپ کو دلچسپی ہوگی.....“

سو برس کی زندگی میں ایک بل
 تو اگر کر لے کوئی اچھا عمل

تھ کو دُنیا میں ملے گا اس کا پھل
 آج جو کچھ بوئے گا کانٹے کا کل

”خیر میرا بیٹا تو میرے ساتھ بہت عزت سے پیش آتا ہے، بڑا خیال کرتا ہے میرا، بیوی پر نہیں
 چھوڑا اُس نے مجھے، خود خبر گیری کرتا ہے اور میں سمجھتی ہوں یہ صرف اس وجہ سے ہے کہ میں نے اپنی ساس
 کی بڑی خدمت کی ہے۔“ وہ سنی اُن سنی کر کے بولیں۔
 ”اس پر ایک اور گانا یاد آ رہا ہے مجھے.....“

ساس ہے میری سبیلی
 ساری سکھوں سے الیلی

”تم گانے وانے رہنے دو اور ملازمہ کو بلاؤ۔“

”اچھا ابھی بھیجتا ہوں اور سننے، سومت جائیے گا، آپ کی پوتی کیک بنا رہی ہے۔“
 ”ہمیں کون دے گا کیک۔“

”میں لے کر آؤں گا آپ کے لئے آپ انتظار کیجئے گا۔“

”تمہارا شکر یہ بچے، میں کیک نہیں کھاتی، تم بس ملازمہ کو بھیج دو۔“

”ہائیں تو کیا ملازمہ کھائیں گی.....؟“

”اوہو..... لڑکے یہ شیشے کے ٹکڑے صاف کرانے ہیں..... ایک تو تم بولتے بہت ہو۔“

”بس جا رہا ہوں.....“

وہ ہاتھ ہلا کر کمرے سے چلا آیا۔ ملازمہ کو دادی کے کمرے میں جانے کا کہہ کر خود کچن میں چلا آیا،
 جہاں اس وقت مہناز کے ساتھ ساتھ نہت اور چھو بھی بھی موجود تھیں۔

کبریٰ نے بڑی بیٹی ستارہ کی شادی اپنے میکے میں ہی کی تھی۔ امین شاہ (ستارہ کا شوہر) اُس کا
 بھانجا تھا۔ وہ ستارہ کی طرف سے بہت مطمئن تھیں کہ اسے قدر کرنے والا شوہر اور اچھی سسرال ملی تھی۔
 اب شیریں کے لئے قریب کے رشتے داروں سے دور شے آئے تھے..... ایک تو کبریٰ کا بھتیجا تھا اور دوسرا
 جمشید شاہ کے چچا زاد بھائی کا بیٹا تھا۔

”السلام علیکم دادی محترمہ.....“ اُس نے دروازے سے اندر جھانکا اور مسکراتے ہوئے
 جھاڑا۔ وہ اخبار پڑھ رہی تھیں، آواز پر اُدھر دیکھا پھر غلطی سے گویا ہوئیں۔
 ”آگئے تم.....؟“

”جی آپ کی پوتی عزیزہ مہناز آرام نے بلایا تھا۔“ وہ بظاہر اُن کے سامنے مودب بنا کھڑا تھا
 چہرے پر شونئی کی تحریر تھی۔ یہ سنتے ہی انہوں نے ایک جھٹکے سے ٹینک اُتاری..... اخبار ایک جانب بچا
 بولیں۔

”پتا نہیں کیسے بیٹے ہوتم مانا کہ جو یہ تمہاری سگی ماں نہیں مگر اس نے ماں بن کر ہی تو پالا ہے تمہارے
 اور تمہاری یہ پھوپھی بیگم کتنا برا کرتی ہے اُس کے ساتھ، ابھی کل اس کی شکایت پر تمہارے باپ نے
 لڑائی کی ہے، اس غریب سے..... مگر تمہارے کان پر جوں نہیں رینگتی۔“
 ”دادی بیگم آپ یوں تو سارا وقت اپنے کمرے میں بیٹھی رہتی ہیں مگر خبریں آپ کو دوسرے ٹکڑے
 بھی مل جاتی ہیں، یہ کیا راز ہے.....؟ فوراً مجھے آگاہ کیجئے۔“

”ملازم بتاتے ہیں سب مجھے..... ایک ایک بات کی خبر رکھتی ہوں، خوب جانتی ہوں اپنی پوتیل
 اور بہو کو..... اور تم ایسے بے وقوف لڑکے ہو..... یہ لڑکیاں اشارہ کرتی ہیں اور تم سر کے بل چلے آتے ہو۔“
 ”نہیں نہیں دادی، یہ اطلاع غلط ہے..... سر کے بل تو نہیں آتا، دیکھیں ناں، سر کے بل میز مین
 ملے کر نا خاصا مشکل کام ہے بلکہ ناممکن سا ہے، میں تو بیروں پر چل کر آتا ہوں۔“
 ”ہاں جس دن مہناز بی بی فرمائش کر دیں گی، مزید صاحب سر کے بل آنے پر بھی تیار ہو
 جائیں۔“

”اوہ دادی.....“ اسے زور کی ہنسی آگئی اور یونہی ہنستے ہنستے وہ اُن کے بستر پر آ بیٹھا، ہاتھ قریب رکھ
 ٹیبل پر رکھے شیشے کے گلاس سے ٹکرایا اور گلاس فرش پر گر کر چکنا چور ہو گیا۔
 ”توبہ ہے بچے توبہ..... میں کہتی ہوں اپنے گھر کی چیزیں بھی یونہی توڑتے ہو یا مجھ سے ہی کوئی
 خاص دشمنی ہے..... جب بھی آتے ہو، مجھے تو دھڑکا سا لگ جاتا ہے کہ اب میرا کوئی نہ کوئی نقصان ہو کر
 رہے گا۔“

”دادی دیکھیں تو چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کتنے اچھے لگ رہے ہیں۔“ اُس نے جیسے سنا ہی نہیں کہ
 وہ کیا کہہ رہی ہیں۔

”اتنے ہی اچھے لگ رہے ہیں تو ان کا بار بٹالو اور جا کر اپنی پھوپھی کے گلے میں ڈال دو۔“

”آئیڈیا اچھا ہے۔“ اُس نے دادی، پھر بولا۔

”لگتا ہے آج پھر جھڑپ ہوگئی وہ دونوں معزز خواتین کے درمیان۔“

”یہ پوچھو کب نہیں ہوتی..... دیکھ لینا آج یہ عورت میرا ادب نہیں کرتی، کل اس کی اولاد بھی اس؟“
 ”اب نہیں کرے گی۔“

”کل کس نے دیکھی ہے دادی، ویسے سچی بات تو یہ ہے کہ ان کی اولاد اب کون سا ادب لگاتا
 ہے ان کا۔“

”ہاں تو کرے بھی کیوں.....؟ بچپن سے یہ بچے دیکھ رہے ہیں کہ ماں کتنی عزت کرتی ہے دادی

ڈھلے چاندل کے پار..... 147

شام کو واپس آئیں تو یہ اطلاع ساتھ ہی کہ انہوں نے شیریں کا رشتہ پکا کر دیا ہے۔ گاؤں میں مٹھائی بانٹی گئی..... اور شیریں کے چہرے کے رنگ انہیں بتاتے رہے کہ اُن کا فیصلہ بالکل درست ہے۔ ارد شیریں میں ہی ہوتا تھا اور انہوں نے اس سلسلے میں اسے اطلاع دینا کچھ ضروری نہیں سمجھا کہ بظاہر ارد شیریں کے لئے کتنی ہی اہمیت رکھتا ہو مگر دل میں وہ اسے ذرا بھی اہم جانے کو تیار نہ تھیں اور یہ بھی جانتی تھیں کہ اسے بھی بہنوں کے معاملات سے نہ دچھی ہے نہ مرد کا ر.....

یوں بھی عروفت بہت سی تھیں اب اس کی..... جب تک اسکول اور پھر کالج میں پڑھتا رہا، چنبیوں میں گاؤں آتا رہا..... مگر جب سے تعلیم سے فارغ ہوا تھا..... تو کچھ زیادہ ہی مصروف ہو گیا تھا..... حالانکہ نہ تو وہ شہر میں کوئی بزنس کر رہا تھا، نہ ہی شاہ جی کا ہاتھ بٹاتا تھا مگر پھر بھی مبینہ دو مبینہ بعد ہی کبھی دو تین روز کے لئے ہی گاؤں آتا..... اب تو کبریٰ بھی حویلی میں کم ہی ہوتی تھیں، اکثر اپنی بہن، بھائی یا پھر ستارہ کے ہاں چلی جاتیں..... حویلی میں اب اُن کے لئے کوئی دچھی نہیں تھی۔ ارد شیریں کو انہوں نے جس راستے پر ڈالا تھا، پورا یقین تھا کہ اسی راستے پر جا رہا ہے۔

گاؤں آتا تھا تو وہ بخورا سے دیکھتیں، اونچے قد کا جوان، غرور سے تنی گردن ہلاکی پر کشش آنکھوں میں گاؤں کے لوگوں کے لئے حقارت اور لہجے کی رعونت، مزاج کے خلاف ہونے والی ذرا سی بات اُسے ہمزاد جیتی تھی، حکم تھا.....

”میرا کہہ ہر وقت صاف اور سیٹ ہونا چاہئے..... میں کسی بھی وقت گاؤں آ سکتا ہوں اور اگر مجھے کسی چیز پر ہلکی سی گرد نظر آئی تو پھر خیر نہیں.....“

اپنے کھانے پینے اور لباس کے معاملے میں بھی حساس تھا، گاؤں آتا تو ملازماؤں کو اس کی پسند کا کھانا بنانے میں بڑی محنت کرنی پڑتی اور پھر بھی ڈانٹ ہی پڑتی، اسے پسند جو نہیں آتا تھا۔ یار دوستوں پر بے دریغ خرچ کرنے کا عادی تھا اور اس سلسلے میں کوئی روک ٹوک پسند نہ تھی۔

اس کی لال ڈوروں والی براؤن چمکدار آنکھیں جن میں کبھی بچپن کی معصومیت ہوا کرتی تھی اب وہاں بے باکی اور غرور تھا، ایک عجیب طرح کی بے رحمی تھی اور طلسم تھا، جوں ہی مقابل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتا تھا، چھا جاتا تھا۔ اس کے انداز اور عادات کبریٰ کو سمجھاتی تھیں کہ محنت رائیگاں نہیں گئی۔ جس راستے پر ڈالا تھا، وہ اُسی پر جا رہا ہے۔

وہ غلت میں گاؤں آیا، اسے معلوم تھا بابا اب اکثر نئی کوشی پر ہوتے ہیں، سو بڑی حویلی آنے کے بجائے وہ ادھر ہی آگیا اور ملازم سے شاہ جی کے بارے میں معلوم کیا۔ اس کا اندازہ غلط نہیں تھا۔ وہ یہیں تھے مگر شہر کے چند دوستوں کے ساتھ صبح شکار پر نکلے تھے۔

”واپس کب تک آئیں گے.....؟“ یہ سن کر پیشانی ٹھکن آلود ہو گئی تھی۔

”رات سے پہلے پہلے تو آ ہی جائیں گے چھوٹے سرکار، آپ تشریف لائیں، خدمت کا موقع دیں.....“ ملازم خوشامد کر رہا تھا..... ارد شیریں ایسی بگڑتے موڈ کے ساتھ گاڑی سے اُتر آ اور اندر چلا گیا۔

”کھانا لاؤں سرکار.....؟“ ملازم پیچھے پیچھے تھا۔

”ظاہر ہے، شام تک ادھر رہتا ہے تو بھوکا کیس مرنا.....“ مرکز اتنا کہا اور پھر چل پڑا۔

”کیا کھانا پسند کریں گے.....؟“ پہلے سوال کا جواب ایسا ٹیکھا ملا، اب جبکہ اور رُک رُک کر

ڈھلے چاندل کے پار..... 146

دونوں لڑکے اچھے تھے لیکن قدرتی طور پر کبریٰ کا جھکاؤ اپنے بھتیجے کی طرف تھا۔ پھر انہیں یہ بھی تھا کہ شاہ کے چچا زاد کے گھر شیریں شاید خوش نہ رہ سکے۔ اسے باپ سے کوئی لگاؤ نہیں تھا بلکہ بڑے گلے تھے، پھر وہ چچا کے گھر کو کس طرح قبول کرے گی۔

دونوں گھرانوں کے رشتے شاہ کی موجودگی میں ہی آئے تھے اور شیریں کے لئے خواہش کا اظہار کیا تھا تب شاہ جی نے یہی کہا تھا کہ سوچ کر جواب دیں گے۔ رشتے کی بات کرتے ہی ہاں کی توقع..... وہ بھی نہیں آئے تھے کہ یہ تو رواج ہے، چاہے دل سے کتنے بھی راضی کیوں نہ ہوں، رسی طور پر سوچے وقت ضرور مانتے ہیں۔

کبریٰ منتظر ہی رہیں کہ شاہ جی خود یہ بات چھیڑیں گے مگر وہ تو شاید بھول ہی گئے تھے، یوں اب کئی سالوں سے ان کی دچھی گھر میں نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ جب تک راحت تھی، انہیں کو آکر گھر کا احساس ہوتا تھا، اس کی چھوٹی چھوٹی باتیں ہر معاملے میں شاہ جی سے مشورہ لینا اور ان کا خیال رکھنا..... مگر جب سے وہ گئی، یہ گھر ایک سرے کی مانند ہو گیا..... فاطمہ کی اپنی ڈھانچھی اور کبریٰ کی اپنی، شاہ جی کس وقت آتے ہیں، انہیں کھانا چاہئے، ان کے کپڑوں کا خیال رکھنا ہے، انہیں گھر کی چھوٹی بڑی باتیں بتانا ہے، اس کی پروا کسی کو نہیں تھی۔ اس گھر میں جہاں اُن کی دو بیویاں موجود تھیں، وہاں بھی اُن کا خیال ملازماں میں رکھتی تھیں۔

جب تک راحت زندہ تھی، شاہ جی نے اُس کی قدر نہیں کی مگر اس کے جانے کے بعد وہ خود کو محسوس کرتے تھے اور انہوں نے خود کو بہت مصروف کر لیا تھا۔ اکثر شہر چلے جاتے اور کئی روز تک دہر رہتے۔ شہر میں ان کی تین کوشیاں مختلف علاقوں میں تھیں..... اور یہ تینوں ہی ارد شیریں کے نام تھیں، ایک ٹرے بننے کا قیام تھا، دوسری انہوں نے اپنے لئے اور اپنے ملنے والوں کے لئے رکھی تھی، گاؤں میں ہونے والی بڑی حویلی کے بجائے اکثر نئی تعمیر ہونے والی کوشی جسے گاؤں کے لوگ آم کے باغ کے قریب ہونے کی وجہ سے آموں والی کوشی کہتے تھے۔ وہاں پر ہوتے اور یار دوست بھی ادھر ہی آتے۔

کبریٰ کو اب چونکہ شیریں کے رشتے کے سلسلے میں ان سے صلاح لینی تھی تو وہ اُن کی آمد کی خبر تھی۔ پہلے تو یہی پتا چلا کہ شہر گئے ہوئے ہیں پھر ایک ہفتہ بعد معلوم ہوا واپس آگئے ہیں اور قیام آموں والی کوشی پر ہے۔ وہ سوچ رہی تھیں کہ پیغام بھیج کر حویلی بلوائے یا فون پر ان سے بات کر لے کہ شام کو خود ہی چلے آئیں۔ کبریٰ نے موقع مناسب دیکھ کر بات چھیڑ دی۔

”تم جہاں مناسب سمجھو، کرو۔“ انہوں نے کسی بھی قسم کی دلچسپی لینے سے گویا صاف انکار کر دیا۔ کبریٰ کو دکھ تو بہت ہوا، مگر بولیں کچھ نہیں..... خاموشی سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئیں۔

”اب تو بیٹے کے باپ ہو، پھر بھی بیٹیوں سے اتنے بیزار، کیا بگاڑا ہے ان بے زبان بیٹیوں..... تمہارا.....؟ بیٹا دونوں ہاتھوں سے لٹا رہا ہے، اپنی ہر ضد پوری کر داتا ہے، پھر بھی تمہیں اُس سے پیار..... اور بیٹیاں جو مہمان ہیں اس گھر میں، تمہیں اتنی سی فرصت بھی نہیں کہ اُن کے مستقبل کے بارے میں کو رائے ہی دے دو۔“

فیصلہ اب انہوں نے خود ہی کرنا تھا اور ان کی پسند اپنا بھتیجا ہی ہو سکتا تھا سو انہوں نے اگلے روز گاڑی نکلوائی اور بھائی کے گھر چل دیں۔

پوچھا۔

”پہلے تو چائے بنواؤ میرے لئے..... اور سنو جو نبی بابا جان آئیں، مجھے بتا دینا، انہیں بھی آج ہی جانا تھا.....“ سر جھٹک کر خود کھائی کی اور کمرے میں آکر بیٹھ پر بیٹھ گیا۔

”آف..... کتنا گندہ ہے یہ کمرہ.....“ ہر شے پر گرد کی تہ، طبیعت کچھ زیادہ نفاست پسند تھی۔ کونج میں صفا کی گئی تھی مگر گاؤں میں جو چیز کثرت سے نظر آتی ہے، وہ مٹی ہی تو ہے، اب ہلکی ہلکی گرد کی تہ اگر میز اور کرسیوں کے بازو پر نظر آ رہی تھی تو قصور ملازموں کا نہیں تھا مگر وہ باہر آیا اور ملازموں کو وہ ڈانڈ پلائی کہ اللہ کی پناہ.....

”چلو صاف کرو، مفت خورے بابا جان نے زیادہ ڈھیل دے رکھی ہے، اگر میں ہوں ناں تو تم جیسوں کو ایک منٹ میں سیدھا کروں۔ چلو اب دفع ہو جاؤ۔“

یہ تھے آخری فقرے جو اس نے واپس پلٹتے ہوئے کہے، ان کام کرنے والوں میں کئی تو عمر میں شاہی سے بھی بڑے تھے اور اپنی ایمانداری اور خلوص کی وجہ سے شاہی سے بھی عزت ہی کرواتے تھے مگر اسے کوئی لیا خا نہیں تھا۔

شاہی شام کو کافی دیر سے واپس آئے، وہ اس وقت کمرے میں تھا۔ ملازموں نے اسے شاہی کی آمد کی اطلاع دینے کے بجائے یہ مناسب سمجھا کہ شاہی کو اس کے یہاں آنے کے بارے میں بتا دیں۔ وہ خود ہی بیٹے سے جا کر مل لیں گے۔

”اردشیر یہاں آیا ہوا ہے.....؟“ یوں اچانک بغیر کسی اطلاع کے سن کر انہیں حیرت ہوئی، اس کے کمرے میں آئے تو وہ ہاتھ روم میں نہا رہا تھا۔ انہیں کچھ انتظار کرنا پڑا..... کچھ دیر بعد وہ صرف شلوار پہنے، تولیے سے سر کے بال رگڑتا آہ ہوا۔

”ارے بابا جان کیسے ہیں آپ.....؟ السلام علیکم.....“ لہجے میں برابری تھی، دوستانہ پن تھا اور انداز بھی ایسے ہی تھے، نہ تو بیڑ پر پڑا کرتا اٹھا کر پہننے کی زحمت کی اور نہ ہی تولیے کو ہی اس سلسلے میں استعمال کیا، جو ہاتھ میں ہی پکڑا ہوا تھا۔

”تم کیسے ہو اور یوں اچانک یہاں.....؟ تم تو گاؤں کے نام سے ہی گھبرانے لگے ہو۔“

”ہاں، شہر میں آپ کی کوشی پر فون کیا تھا، آپ نہیں ملے، سو جا گاؤں میں ہی ہوں گے..... کئی گھنٹے ہو گئے مجھے انتظار کرتے ہوئے..... اصل میں بابا جان مجھے کام تھا آپ سے۔“

”ہاں ہاں کہو.....“ وہ ہمت نہ گوش تھے۔

”کچھ رقم چاہتے تھے.....“

”اس کے لئے خود آنے کی کیا ضرورت تھی، پتر کسی کو بھی بھیج کر منگوا لیتے۔“

”نہیں، رقم کچھ زیادہ ہے۔ اس لئے مجھے خود آنا پڑا۔“

”ٹھیک ہے پیسے نہیں مل جائیں گے..... میں بھی ایک بات تم سے کہنا چاہتا تھا۔ دیکھو پتر، اب تم ماشاء اللہ جوان ہو گئے ہو، پڑھ لکھو ہو، سمجھدار ہو، میں چاہتا ہوں اب میرا بوجھ تم بانٹ لو..... کام میں میرا ہاتھ بٹاؤ.....“

”یہ کام.....“ اتنا کہہ کر وہ ہنسا، پھر بیڈ پر سے کھڑا اٹھا کر پہننے ہوئے بولا۔ ”یہ جو کام ہے ناں، اس

کے لئے تعلیم اور سمجھداری کی کیا ضرورت ہے..... اگر آپ نے مجھ سے یہی کچھ کروانا تھا تو شہر بھیجے ہی نہ۔“

”چلو اگر یہ پسند نہیں تو شہر میں کوئی بزنس کرلو.....“ بیٹے کی پسندنا پسند کا تو بہت خیال رہتا تھا انہیں، اس نے انکار کیا تو انہوں نے بھی زور نہیں دیا۔

”ہاں..... یہ ممکن ہے مگر ابھی نہیں جب موڈ ہوگا تو بتا دوں گا۔“

”میرا تو خیال ہے، یہی عمر مناسب ہے۔“ اس نے جیسے اُن کی بات سنی ہی نہیں، بولا۔

”مجھے دس لاکھ روپے چاہئیں..... اور ذرا جلدی۔“

”دس لاکھ.....“ انہوں نے کچھ حیران پریشان سے انداز میں اُس کی طرف دیکھا۔

”اب اتنی بھی بڑی رقم نہیں ہے۔“ ان کے انداز پر وہ جیسے برامان گیا۔

”اس رقم کا کیا کرو گے.....؟ اب سے پہلے تم نے اکٹھے اتنے پیسے نہیں مانگے۔“

”ہاں، اس سے پہلے ضرورت نہیں پڑی..... اب پڑ گئی ہے۔“ وہ اٹھ کر ڈریسنگ ٹیبل کی طرف گیا اور میز پرش اٹھا لیا۔

”پتر ویسے تو سب کچھ تمہارا ہے، تم مالک ہو مگر میں اتنا ضرور کہوں گا، دولت چاہے کتنی بھی ہو اگر دونوں ہاتھوں سے لٹائی جائے تو زیادہ دن ساتھ نہیں چلتی۔“

”زندگی میں پہلی بار میں نے آپ سے لاکھوں کا مطالبہ کیا ہے اور پہلی ہی بار آپ مجھے مایوس کر رہے ہیں۔“ اب اس کا چہرہ تن گیا تھا اور آواز میں غصہ تھا۔

”میں نے انکار نہیں کیا..... میں سمجھا رہا ہوں اور پوچھ رہا ہوں..... آخر اس کا کرو گے کیا.....؟“

”ایک تو میری سمجھ میں یہ نہیں آتا..... آپ ابھی تک مجھے بچہ کیوں سمجھتے ہیں.....؟ اب میں بڑا ہو گیا ہوں، اپنا اچھا برا خوب سمجھتا ہوں اور یہ پیسے جو میں نے مانگے ہیں، کسی غلط کام میں نہیں لگاؤں گا..... بس بات عزت کی بن آئی ہے، اگر آپ نے ندے تو بڑی سخت اٹھانی پڑے گی مجھے۔“

”ہاں ہاں، اب تم بڑے ہو گئے ہو مگر افسوس کہ عزت میں بچپن اب بھی موجود ہے۔“

اردشیر نے اُن کی بات سن کر حیرت اور اکتاہٹ کے عالم میں بھنویں اُچکا کیں اور سوالیہ انداز میں اُن کی طرف دیکھا۔

”تم بچپن میں بھی جس بات کو ذہن پر سوار کرتے تھے پھر پورا کروا کر ہی دم لیتے تھے تب تو نا سمجھ تھے، اپنا اچھا برا انہیں سمجھتے تھے مگر اب تمہاری عمر نادان بچوں کی طرح ضد کرنے والی نہیں، تم سنبھل جاؤ۔“

”آپ بس یہ بتائیں پیسے دیں گے یا نہیں.....؟“ اُن کی کسی بات کا کوئی اثر نہیں تھا اس پر۔

”دے رہا ہوں..... دوں گا کیوں نہیں.....؟ میں تو بس تمہیں سمجھانا چاہتا تھا.....“ وہ دل سے اب بھی راضی تو نہیں تھے مگر لاڈ لے کر انکار ممکن نہیں تھا۔

رات وہ بیس کوٹھی پر رہا، صبح ناشتا کے بغیر ہی شہر واپس چلا گیا۔ اس نے بڑی حوصلی آکر کبری کو سلام کرنا بھی ضروری نہیں سمجھا، یہ نہیں کہ اُس کے دل میں اب بڑی ماں کی محبت نہیں رہی تھی۔ وہ اب بھی اُن سے محبت کرتا تھا مگر اب وہ تنہا بچہ نہیں تھا، اب وہ اردشیر شاہ تھا، پھر پور مرد اور مرد کی محبت ایسی ہی ہوتی ہے جس میں دینا کم اور لینا زیادہ ہوتا ہے، وہ کم دے کر زیادہ وصول کرنے کا عادی ہوتا ہے۔ عورت، ماں، بہن، بیٹی، بیوی کسی بھی روپ میں اُسے مایوس نہیں کرتی، اس کی توقع سے بھی بڑھ کر دیتی ہے چاہے

بدلے میں وہ کچھ بھی نہ دے۔

اس کی گاؤں آمد کی اطلاع اور پھر غریب کو بھی پر ہی منہر جانے کی اطلاع کبیری کورات ہی کو مل گئی تھی۔ صبح یہ بھی ہوتا چلا گیا کہ وہ آکر واپس بھی چلا گیا ہے۔ انہوں نے ارد شیر سے کبھی کوئی اُمید نہیں باندھی تھی۔ کبھی اسے اپنا سمجھا ہی نہیں تھا۔ مگر یہ خیال ضرور تھا کہ میری ہزار نفرتوں کے باوجود ارد شیر مجھ سے بے پناہ محبت کرتا ہے، وہ ملے بغیر چلا گیا، انہیں یقین نہیں آ رہا تھا، اُسے اپنا کچھ نہیں سمجھا تھا مگر پھر بھی بے قرار محسوس کر رہی تھیں، دکھ نہیں تھا، شاید افسوس بھی نہیں مگر حیرت بہت تھی، یا شاید دل کے اندر کہیں افسوس تھا، پھر بھی جی چاہتا تھا اسے بلا کر یاد دلانیں کہ کبھی دعویٰ کیا تھا، مجھ سے محبت کا، تمہیں دنیا میں بڑی بار سے پیارا تو کوئی بھی نہیں تھا، پھر آج کیا ہوا..... میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی، اُڑان کیسے ہی تم مجھے بھی فراموش کر دو گے۔“

کبیری خاتون ایک ذہن عورت کا نام تھا جس نے ایک پلان ترتیب دیا تھا اور کئی سال تک حویلی پر حکومت کی تھی مگر وہ نہیں جان سکتی تھیں، جب مرد سے اُمید لگائی جائے تو ایسے مقام آتے ہی ہیں، مرنے شوہر بن کر ہی نہیں بلکہ ہر رشتے میں ہوتوڑی و ڈنڈی مار جاتا ہے۔

”دس لاکھ لے کر گئے ہیں چھوٹے سرکار۔“ دفا دار ملازم نے پوری رپورٹ دی تھی اور انہوں نے سوچا، ابھی تو دس لاکھ لے کر گیا ہے، ایک روز ساری جائیداد کو آگ لگائے گا۔ ان کے لیوں پر نا مسکراہٹ دوڑ گئی۔ ملازم پر اپنے تاثرات واضح نہیں ہونے دیئے، بولیں۔

”وہ خیریت سے تو تھا ناں.....؟“

”ہاں نہیں بڑی بی بی، غصہ بہت کر رہے تھے، سارے ملازموں کو ڈانٹا اور شاہ جی کے ساتھ بھی شاید تیزی میں بات کی ہے، وہ ان کی طرف سے کچھ پریشان ہیں کہہ رہے تھے اچانک دس لاکھ کی جانے کا ضرورت پیش آگئی ہے۔“

”شاہ جی تو خواہ مخواہ پریشان ہو جاتے ہیں، اب وہ جوان ہے، سمجھدار ہے، اپنا اچھا برا خوب سمجھتا ہے۔“

”لیکن بڑی مالکن، جوانی بھی تو مند زور ہوتی ہے، کبھی کبھی ڈور تک بہا لے جاتی ہے۔“

”وہ اتنی ڈور تک نہیں جائے گا اور سنو تم نظر رکھو جب بھی گاؤں آئے، مجھے ضرور بتانا۔“

”یہ بولتے ہی مائے تھے ناں، مگن لو۔“ اُس نے ساری رقم لا کر آڈر کو تھما دی۔

”تم تو واقعی لے آئے، مجھے یقین نہیں تھا کہ تمہارے بابا اتنی رقم تمہیں تھما دیں گے..... ویسے

پوچھا تو ہوگا، چانک کیا اُفتاد ان پڑی ہے۔“

آڈر حیران تھا اور خوش بھی.....

”نہیں..... انہوں نے کچھ نہیں پوچھا..... جانتے ہیں میں بتاؤں گا نہیں۔“ ارد شیر کا انداز شانہ

تھا۔

”ویسے مجھے یقین نہیں تھا تم واقعی اتنی بڑی رقم لے ہی آؤ گے۔“

”یاروں کے یار ہیں جی.....“ ارد شیر نے کرسی کھینچ کر سامنے رکھی اور پھر ایک شان سے براجمان

ہو گیا۔ ”ہوں، آج ثابت تو ہو ہی گیا ہے۔“ آڈر کا انداز ایسا تھا جیسے کہہ رہا ہو، مجھے اب بھی یقین نہیں ہے، تمہاری دوستی پر..... ارد شیر کو اس انداز پر بے چینی محسوس ہوئی، کچھ غصہ بھی آیا مگر ضبط سے کام لے کر بولا۔

”تو جب بھی آزمائے گا، میں آزمائش پر پورا اُتروں گا۔“

”نی الحال تو کسی آزمائش کی ضرورت نہیں ہے، تمہارا شکریہ تم نے میری مجبوری کو سمجھا اور ان مشکل حالات میں میری مدد کی۔“

”چھوڑو شکریے کو، دوستوں میں ایسے تکلفات کی محبت کبھی کہاں ہوتی ہے.....؟ تمہیں جب بھی ضرورت ہو بلا جھجک مجھ سے بیان کر سکتے ہو، تمہاری خاطر میں اپنے والد سے بدتمیزی بھی کر سکتا ہوں۔“

”نہیں..... میں تمہیں اس کی اجازت نہیں دے سکتا، ماں باپ تو ٹھنڈی چھاؤں ہوتے ہیں ارد شیر اور ان کے جیتے جی خود کو ان کے سائے سے محروم مت کرو۔“

آڈر سے اس کی دوستی بہت پرانی تھی، جب وہ گاؤں سے شہر آیا تھا اور یہاں نويس کلاس میں ایڈمیشن لیا تھا، تب پہلی بار اس کی ملاقات آڈر سے ہوئی، وہ بے حد ذہین اور سلجھا ہوا لڑکا تھا۔ یہ ارد شیر کی خوش قسمتی تھی کہ آتے ہی اُس سے مل کر گیا ورنہ تو ضرور اپنے جیسوں کو ہی دوست بناتا، آڈر اُسے پہلے دن سے اچھا لگا تھا..... یہی وجہ تھی ہزار دوستیاں بنانے کے باوجود اُس نے آڈر کا ساتھ نہیں چھوڑا تھا۔ جبکہ آڈر نے کبھی بھی اس کے خلوص پر یقین نہیں کیا تھا۔

اُس کا تعلق آپرٹل کلاس سے تھا جس علاقے میں ارد شیر کی کوٹھی تھی، وہاں سے اُس کا گھر قریب ہی تھا، وہ کبھی کبھار اس کے گھر بھی آیا کرتا تھا، اسکول میں تو روزانہ ہی ملاقات رہتی تھی۔ ارد شیر کو پڑھائی سے بہت زیادہ لگاؤ بھی نہیں رہا تھا۔ پھر پیسے کی فراوانی نے اس کی طبیعت میں اس جانب سے اور بھی لا پرواہی پیدا کر دی تھی۔ اس کے گرد مطلب پرست دوستوں کا جھوم بھی ہمیشہ سے رہا تھا۔

مگر جانے کیا بات تھی، کبھی کشش محسوس کرتا تھا وہ آڈر کی ذات میں، اسے ناراض کر ہی نہیں سکتا تھا جبکہ آڈر کا رویہ کچھ سرد اور بارعب قسم کا ہوتا تھا اس کے ساتھ، وہ ہمیشہ اس پر اپنی مرضی ٹھونسنے کی کوشش کرتا..... ارد شیر اگر انکار کرتا تو ناراض ہو جاتا اور آخر ہار دیر کو ہی ماننا پڑتی اور اسے ماننا پڑ جاتا، شاید آڈر کی یہی انا، خود داری اور طبیعت کی سادگی اسے اس کی جانب مائل کرتی تھی۔ وہ کئی بار آڈر سے کہتا۔

”تم جانتے ہو آڈر محمود..... میں ضد کا اتنا لڑکا ہوں مگر تمہارے آگے ہمیشہ ہار جاتا ہوں، کبھی کسی لڑکی کو دیکھ کر میرے دل میں ایسا طوفان نہیں اُٹھتا جیسا کہ تمہیں قریب دیکھ کر اُٹھتا ہے، مجھے کہنے دو یار کہ میں تم سے عشق کرتا ہوں۔“

اور جواب میں بڑے سرد انداز میں اس کی جانب دیکھ کر آڈر یہی کہتا تھا۔

”اور کچھ نہیں ہے..... بس تمہیں لڑکیوں کے ساتھ ڈانٹا لگ بول بول کر عادت ہو گئی ہے۔“

اس پر ارد شیر چلا اُٹھتا مگر آڈر پر جیسے کچھ اثر نہیں ہوتا تھا۔

ارد شیر نے جیسے تیسے گرجویشن کیا جبکہ آڈر کا ارادہ مزید پڑھنے کا بھی تھا مگر والد کی وفات کے بعد بڑا بیٹا ہونے کے ناتے اسے ساری توجہ ان کے بزنس کی جانب دینی پڑی۔ اب اُس نے ارد شیر سے کہا

تھا، ”کچھ نقصان ہو رہا ہے، مجھے دس لاکھ روپے کی ضرورت ہے۔“ اور ارد شیر نے اسے جھٹ پر قلم لایا۔
”نہی..... ارد شیر اس سے محبت کرتا تھا..... اور کہتا تھا کہ اس سارے زمانے میں اور اتنے لوگوں سے
شناسائی کے باوجود اگر میں کسی کو اپنا دوست کہتا ہوں تو وہ تم ہو۔“

مگر وہ اس کی کسی نصیحت پر عمل نہیں کرتا تھا۔ اُس نے بہت سمجھایا، خود کو ضائع مت کرو، دولت
مفت خوروں میں مت لٹاؤ اور یہ بھی کہ سدھر جاؤ، تم جن راستوں پر آگے بڑھتے جا رہے
واپسی مشکل ہو جائے گی مگر آؤ کر جواب میں یہی فقرہ سننے کو ملا۔ ”میں تم سے عشق کر سکتا ہوں.....
تمہاری کسی نصیحت پر عمل نہیں کر سکتا، عین ممکن ہے کسی روز تمہارے اس پتھر سے اکتا کر میں تمہارا خون
کردوں اور پھر ساری عمر تمہاری قبر کے سر ہانے بیٹھ کر دوں گا۔“

”ہاں تم جیسا نا عاقبت اندیش ایسا کر بھی سکتا ہے، یہ کوئی حیرت والی بات نہیں ہوگی۔“
”بس پھر تم اپنی خیر مناد..... روز روز مجھے مشورے دینے، نصیحتیں کرنے مت بیٹھ جایا کرو، ابھی
کو تمہاری بہت ضرورت ہے اور فی الحال میرا بھی مجاور بننے کوئی نہیں چاہتا..... اپنے ساتھ ساتھ مجھ پر
ترس کھاؤ۔“

اور اب کچھ عرصے سے آؤرنے اسے سمجھانا چھوڑ ہی دیا تھا، وہ جان گیا تھا اس پر اثر نہیں ہوگا۔
تو وہ اس سے ملنے اس کی کوٹھی پر بھی نہیں آتا تھا۔ ہاں ارد شیر اس کے آفس یا گھر کا چکر مینے میں دس، تین بار
لگایا لیتا تھا اور جب بھی آتا، یہی کہتا۔ ”تمہیں دیکھے بغیر مجھے چین نہیں آتا پار.....“
اور جواب میں آؤر سر جھٹک کر یوں ہنستا جیسے اس کی دماغی حالت پر افسوس کر رہا ہو۔

حریب، جو یہ کو یہ اہم خبر سننے کو بے چین تھا، مگر سے گیا تھا تو کہا تھا ”واپسی دیر سے ہوئی
اب صرف دو گھنٹے بعد ہی واپس آ گیا تھا۔“ مگر یہ کیا، پتا آج آفس نہیں گئے.....؟“
اُن کی گاڑی دیکھ کر اس کے جوش پر کچھ اوس پڑ گئی۔ ڈرائیور سے پوچھا کیا وہ آج آفس نہیں
رہے.....؟“ اسے علم نہیں تھا۔

”اوہ..... دس بجتے والے ہیں، یہ پایا اب تک گھر پر کیوں ہیں.....؟“ اسے اُلجھن ہو رہی تھی۔
اندر نہیں گیا، یہیں ادھر ادھر چکر لگانے لگا، کبھی مسکرا نے لگتا اور کبھی ہاتھ آپس میں رگڑنے لگتا۔ کبھی پلے
چلتے رُک کر کھسوچنے لگتا۔

”کیا بات ہے.....؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے.....؟ میں کب سے لوٹ کر رہی ہوں
تمہیں.....؟“

”خیریت.....؟ آج تم بہت خوش دکھائی دے رہے ہو بیٹا.....؟“ وہ مسکرا کر بولیں۔

”اوہ..... بات ہی خوشی کی ہے..... پتا ہے آپ کے بھائی اکبر علی وطن واپس آ گئے ہیں۔“

”تم..... تم کچھ کہہ رہے ہو حریب.....؟“ وہ یہ خوشی سنبھالنے کی کوشش میں بے حال ہوئے۔

جب حریب کو بھی خیال آیا۔ وہ بیمار ہیں انہیں اتنی بڑی خبر ایک دم سے نہیں سنائی چاہئے تھی۔ وہ گھبراہٹ
انہیں بیڈ پر بٹھا کر نیچے کارپٹ پر ان کے پاؤں کے قریب گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گیا..... اور کہا.....

”خود کو سنبھالیں..... اس طرح تو آپ کی طبیعت خراب ہو رہی ہے۔“

”میں ٹھیک ہوں، بالکل ٹھیک ہوں۔“ مارے خوشی کے وہ رونے لگیں۔

”مما..... اگر آپ کی طبیعت خراب ہوگئی تو پھر ہم اگلے اکبر کے گھر کس طرح جا سکیں گے۔ دیکھیں

یہ تو ابھی پہلی اسٹیج ہے، ابھی ہمیں پتا نہیں کتنا لمبا سفر کاٹنا ہوگا، اُس کی تلاش میں کہاں کہاں جانا ہوگا۔“

”ہاں حریب ابھی تو شاید ہمیں تھوڑا فاصلہ اور بھی طے کرنا ہوگا۔“ اُس کی بات سن کر وہ چونک گئیں

اور خوشی تھوڑی مدہم پڑ گئی۔

”ہاں تو اور کیا طلال اگلے اکبر علی کے گھر میں تھوڑا ہی مل جائے گا۔ ان سے تو ہم صرف اُس

عورت کا ایڈریس لیں گے جس کے حوالے طلال کو کیا گیا تھا اور سب ہی ہم طلال تک پہنچ سکیں گے۔“

”حریب ہمیں جلد ہی اکبر بھائی کی طرف چلنا چاہئے، کہیں ایسا نہ ہو، وہ پھر کہیں طے جا سکیں۔“

”نہیں ممّا، وہ لوگ اب مستقل یہیں آ گئے ہیں..... میں نے ان کے ملازم سے معلوم کر لیا تھا اور وہ

بتا رہا تھا، اندر سامان سیٹ کیا جا رہا ہے اور ویسے بھی اُس علاقے میں اگلے اکبر کے گھر سے کچھ ہی فاصلے پر

میرے ایک دوست کا گھر ہے اور میں نے اُس کو کہہ دیا ہے کہ خود بھی نظر رکھے اور اپنے ملازموں سے بھی

کہہ دے، جو نبی یہ محسوس ہو کہ وہ لوگ گھر چھوڑ کر کہیں جا رہے ہیں، مجھے فوراً اطلاع دے۔“

”ٹھیک ہو بیٹا.....“ جو یہ نے قدموں میں بیٹھے حریب کے سر پر اپنا چہرہ رکھ دیا۔

”مما..... کیا پتا آج آفس نہیں جا رہے.....؟“

”اوہ میں تو بھول ہی گئی تھی کہ وہ گھر پر ہی موجود ہیں، کہہ رہے تھے طبیعت کچھ ٹھیک نہیں۔“

”پھر تو ممّا..... ہم اگلے اکبر کی طرف کبھی نہیں جا سکیں گے۔“

انہوں نے گہری سانس سچ کر سر جھٹکا اور مایوسی کے عالم میں اسے دیکھنے لگیں۔

”کوئی بات نہیں، جہاں اتنا انتظار کیا ہے، وہاں ایک دن اور سی.....“ اُس نے تسلی دینا چاہی۔

”حریب تم چلے جاؤ اُن کی طرف اور اُن سے سب کچھ معلوم کرو۔“

”مگر ممّا، میں کس حیثیت سے جاؤں گا اور کیا کہوں گا جا کر.....؟ وہ تو صاف کہہ دیں گے، تم ہو

کون.....؟ اور یہ سب کیوں پوچھ رہے ہو.....؟ بقول آپ کے ان لوگوں کو تو یہ بھی معلوم نہیں کہ آپ سے

شادی کرنے سے پہلے پیا شادی شدہ تھے اور ان کا ایک بیٹا بھی تھا۔ مجھے تو وہ مشکوک ہی سمجھیں گے اور

مگن ہے سچ بات بتا میں ہی نہیں۔“

”ہاں، ایسا ہو سکتا ہے.....“ حائف میں کتنی بد نصیب ہوں۔ اب جبکہ طلال میرے اتنا قریب آ رہا

ہے تو پھر درمیان میں یہ رکاوٹ کیوں آ گئی ہے.....؟ کیا ستم ہے یہ مجھ پر۔“

”ایسے مت کہیں..... پلیز یوں مت سوچیں آپ، دیکھیں یہی وقت ہمارے سوچنے کے لئے

مناسب ہے۔ آپ ذہن میں وہ تمام سوالات ترتیب دس جو آپ کو اگلے اکبر سے پوچھنے ہیں اور یاد

رکھیں، آپ کی بھابی اب بھی ویسے ہی نیرے حراج کی ہو سکتی ہیں، ان سے سوال بھی تمہارا کر رہی کرنا

ہوں گے۔“

”حریب بیٹا، تم اپنے دوست کو فون کرو، ایک بار پھر اسے کہو، اس گھر پر نظر رکھے، میں جانتی ہوں،
تم نے پہلے ہی اسے ٹھیک طرح سے سمجھا دیا ہوگا مگر میرا دل، تم اس وقت میری کیفیت سمجھ ہی نہیں سکتے۔“

”ٹھیک ہے ممّا، میں فون کر دیتا ہوں۔“

”تم پور ہو رہی ہو سو؟“ وہ پوچھتا اور نالہ ہنس دیتی۔
”صرف میری فرینڈ ہے، میرے علاوہ کسی سے بات کرنا بھی پسند نہیں کرتی۔“
”نہیں، ایسی کوئی بات نہیں.....“ سوہا ہونٹوں پر مسکراہٹ سجا کر تردید کرتی مگر یہ حقیقت ہی تھی وہ کسی اور سے بات نہیں کرتی تھی۔

یہ نہیں کہ وہ شرمیلی سی ڈری سبھی لڑکی تھی، وہ تو بلا کی پراعتماد اور ذہین دکھائی دیتی تھی، اس کی آنکھوں سے روشنی سی پھوٹی محسوس ہوتی تھی مگر شاید وہ کم تھی۔ مزید کہ سوہا ایک پیاری سی گڑبگڑاتی تھی اور کبھی ایک منفرد شہزادی..... وہ کئی بار اسے مخاطب کر بیٹھتا اور جواب ہمیشہ مختصر سا ہی ملتا جبکہ وہ اُسے بولتے ہوئے سنا چاہتا تھا۔ وہ پیاری تھی، اسے بھی پیاری لگتی تھی مگر تب اسے محبت کا نام نہیں دیا جاسکتا تھا۔ وہ منفرد تھی اور اس کو دیکھ کر وہ خوش محسوس کرتا تھا اور اس کے یوں الگ تھلک رہنے پر حیران ہوتا تھا۔ وہ بظاہر ایک ماڈرن سی لڑکی تھی۔ اس کا لباس اور گفتگو کا اسٹائل سب ہی اس بات کی تصدیق کرتے تھے کہ وہ اچھی ٹیلی سے تعلق رکھتی ہے۔ لوگ اس کے نام سے کم ہی واقف تھے۔ اُسے نالہ علی کی فرینڈ کہہ کر پکارتے تھے۔
اور جب ایک بار عید ملن پارٹی کے موقع پر ایک لڑکی نے کہا تھا۔ ”سوہا تم ضرور گانا گاؤ گی.....“ تو اُس کی آنکھوں میں اچانک ہی عجیب سے رنگ اُتر آئے تھے۔ چہرے کی رنگت پھلکی پڑ گئی تھی اور اُس نے گانا گانے سے صاف انکار کر دیا تھا۔

”سوہا، تم ضرور گاؤ گی.....“ بچے اس کی کیفیت سمجھ ہی نہیں سکے اور باقی ساتھیوں کے ساتھ ساتھ نالہ بھی اسے مجبور کرنے لگی۔

”پلیز میرا نام مت دیتا۔“ وہ منت بھرے انداز میں بولی۔
”نہیں نہیں..... ابھی مس آئیں گی تو ہم تمہارا نام کھوادیں گے۔“ اب لڑکیاں اسے جھپٹ رہی تھیں۔ اس کے یوں گھبرانے پر ہنس رہی تھیں۔ وہ اٹھ کر کلاس روم سے باہر آگئی اور کارڈیو میں اس کی ملاقات مزید سے ہو گئی۔
”سنیں..... آپ تو نالہ کے فرینڈ ہیں..... اسے سمجھائیں، پلیز اسے روکیں۔“ وہ روہانی ہو رہی تھی۔

”کیا ہوں.....؟“ وہ سمجھا نہیں تھا۔
”میں گانا نہیں گاؤں گی، اسے کہیں بس کو میرا نام نہ دے۔“
”بس اتنی سی بات، تم نہیں گانا چاہتیں تو مت گاؤ۔“ اس کی پریشانی اسے بلا وجہ ہی لگی اور مسکرا کر کہا۔

”نہیں، وہ لوگ نہیں مان رہے ہیں ناں۔“

اُس روز وہ پراؤڈ سی لڑکی اسے بہت معصوم، تنہا، اچھی لگ رہی تھی مگر یہ کب سوچا تھا کہ وہ اس سے محبت بھی کر سکتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ آج اُسے دیکھ کر اپنے یوں بے انداز خوش ہونے پر وہ خود بھی چونک سا گیا۔

کتنے سال پہلے کی..... ملاقات تھی، تب تو وہ بچے ہی تھے اور اس کے بعد کالج اور یونیورسٹی کے زمانے میں کتنے ہی چہرے نظروں کے سامنے آئے مگر حیرت ہے میں اس چہرے کو بھولا نہیں، یوں گنا

”نہیں نہیں..... فون نہیں کرو، ایسا کرو خود چلے جاؤ، ممکن ہے کوئی نئی بات مل جائے۔“
اور مزید انکار نہیں کر سکا بغور ابی باہر آ گیا۔

”سوہا رعنا.....“ مزید نے زیر لب کہا۔ یقیناً فٹ پاتھ پر دھیرے دھیرے قدم اٹھا کر چلتی، لڑکی سوہا رعنا ہی تھی..... آج اتنے برس بعد..... مزید نے گاڑی روک دی اور بے اختیار اسے پکارا۔ سوہا نے ایک اجنبی کے لبوں سے اپنا نام سنا تو حیرت سے اس کی جانب دیکھا۔
”آپ یقیناً سوہا ہی ہیں، میں پہچاننے میں غلطی نہیں کر رہا مگر آپ شاید مجھے بھول چکی ہیں۔“
”سوری، مجھے واقعی یاد نہیں آ رہا.....“ وہ جس اپنائیت سے بات کر رہا تھا، لڑکی کو شرمندہ ہو کر اعتراف کرنا پڑا۔

”کوئی بات نہیں، اصل میں ہماری ملاقات کے درمیان کئی سال حائل ہیں، یاد ہے نویں کلاس میں نالہ علی آپ کی دوست تھی۔“

”تو کیا آپ نالہ علی کے بھائی ہیں.....؟“ سوہا کا چہرہ ایک دم سے کھل سا گیا۔
”نہیں، میں نالہ علی کا بھائی نہیں ہوں..... اُس کا دوست تھا، آپ لوگوں سے سنیں تھا مگر پھر بھی ہماری دوستی تھی۔ بریک میں وہ اکثر میرے پاس آیا کرتی تھی اور آپ بھی تو ساتھ ہوتی تھیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اسکول میں، میں نے آپ کو بھی اس سے جدا نہیں دیکھا۔“
”نالہ سے کبھی ملاقات..... ہوئی.....؟“ وہ پوچھ رہی تھی۔
”نہیں..... اب تو عرصہ گزر گیا۔“

”اچھا..... اب مجھے چلنا چاہئے، دیر ہو رہی ہے، اسے اچانک ہی احساس ہوا کہ وہ لب مزک ایک اجنبی کے ساتھ خوش گفتگو ہے۔

”آئیے میں ڈراپ کر دیتا ہوں۔“ مزید پر تو اتنے عرصے کے بعد آج اچانک اسے دیکھ لینے کی خوشی سوار تھی۔ جبکہ وہ پہچان لینے کے باوجود اسے انجان ہی سمجھ رہی تھی کہ یاد آ گیا تھا، وہ نالہ کا دوست تھا مگر اس کے ساتھ تو کبھی بھی بیلوہائے سے زیادہ بات چیت نہیں رہی تھی۔
”نہیں میرا گھر قریب ہے، میں چلی جاؤں گی۔“

”شاید آپ کلف برت رہی ہیں..... آئیے ناں.....“ مزید ان لمحوں کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔
”پھر کبھی سہی.....“ وہ ٹال رہی تھی۔

”پھر کہاں ملیں گی.....؟ کوئی آتا پتا تو دیتی جائیں۔“

”جیسے آج ملاقات ہو گئی..... خدا نے چاہا تو پھر بھی ہو جائے گی۔“ وہ اتنا کہہ کر روڈ کراس کر کے ایک گلی میں چلی گئی۔

نالہ علی کی دوست سوہا رعنا اسے تب بھی اچھی لگتی تھی، جب اسکول میں روز ہی نظر آتی تھی، وہ ہلاک صرف اور صرف نالہ کی دوست تھی، اس کے علاوہ کسی اور سے بات بھی کم ہی کرتی تھی اور جس روز نالہ چھٹی کر لیتی، وہ سارا دن اکیلی ہی گزار دیتی، مزید کو اچھی طرح یاد تھا، وہ جب بھی نالہ سے ملتا، یہ لڑکی دو ایک باتیں کرنے کے بعد ان سے بالکل کٹ جاتی یا تو کوئی کتاب کھول لیتی یا پھر ویسے ہی اس کی توجہ آتے جاتے لڑکے، لڑکیوں کی طرف ہو جاتی۔

ہے، میں تو اس کی کھوج میں رہا ہوں، جب ہی تو آج مل جانے پر یوں خوش ہوں۔

مگر یہ جذبہ یک طرفہ ہے، جب ہی تو وہ ایک جھلک دکھا کر کوئی آتا پتا دیئے بغیر یوں غائب ہو گیا ہے۔ اب دوبارہ ملاقات نہ جانے کب ہوگی۔ غلطی میری ہے، مجھے ہر حال میں ایڈریس لے لینا چاہیے تھا۔ یوں نہیں جانے دینا چاہیے تھا اُسے۔ وہ گزرے وقت کو یاد کر رہا تھا اور حیران ہو رہا تھا۔ اُسے سوہارنا کی ایک بات یاد تھی۔ وہ تو کچھ بھی نہیں بھولا تھا۔

اسے یاد تھا، اس لڑکی کے سنہری مائل براؤن بال شانوں تک آتے تھے اور ماتھے پر بھی ایک جھلک رہتی تھی، جسے جھٹک کر بات کرنا اس کی عادت تھی اور اسے یاد تھا، وہ بیٹے ہوئے بہت اچھی لگتی تھی اور یہ بھی کہ کم بولتی تھی مگر تیز بولتی تھی، کئی بار تو اس کی بات مزید کی سمجھ میں نہ آئی تھی اور وہ نالکہ سے کہتا تھا۔
”تم کیسے سمجھ جاتی ہو اس کی بات.....؟“

”میری دولت ہے یہ، کچھ نہ بگھی بولے، میں تو تب بھی سمجھ جاتی ہوں، اس کے دل میں کیا ہے۔“
نالکہ نے شاید کہیں پڑھی ہوئی بات بڑے مدبرانہ انداز میں دہرا دی تھی۔

آج اتنے برس کے بعد آخر اکبر علی کے گھر کا گیٹ کھل ہی گیا تھا..... اور جو یہ اس کھلے گیٹ کے قریب گاڑی میں بیٹھی آنسو ضبط کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ بہت تلخ یادیں وابستہ تھیں اس گھر سے..... آج وہ ڈھاکہ کر رہی تھی کہ خوشی کی خبر لے کر لوٹے۔

پتا نہیں وہ دونوں گھر پر ہوں گے بھی یا نہیں، اگر ہوں گے تو مجھ سے کیسا رویہ اختیار کریں گے خاص کر بھابی عارفہ..... جانے وہ میری بات سننے پر تیار بھی ہوتی ہیں یا نہیں.....؟ مگر میں انہیں سنا کر رہوں گی، ضرورت مند ہوں، برا نہیں مانوں گی، منت کر لوں گی، ہاتھ جوڑ لوں گی اور اپنے بیٹے کا ہاتھ لے ہی واپس جاؤں گی۔

ساڑی کا پلو سنہا لیتی وہ آہستہ آہستہ چلتی اندر آ گئیں۔ گیٹ مین سے یہ تو پوچھ ہی لیا تھا کہ وہ گھر ہیں۔ دل بری طرح دھڑک رہا تھا اور جانے کیا ہوگا.....؟ کے احساس سے اس پر گھبراہٹ طاری تھی۔
”کس سے ملنا ہے میڈم جی آپ کو.....؟“ ملازمہ اس کی شخصیت اور لباس سے اُس کی حیثیت کا اندازہ لگا کر مودبانہ انداز میں پوچھ رہی تھی۔

اُس نے لڑکی کی جانب دیکھا اور خیال آیا، شاید زلیخا اب بھی یہاں کام کرتی ہو، پھر صاحبہ بیگم کو اپنا نام بتا کر اطلاع دینے کو کہا۔ ملازمہ نے ڈرائنگ روم تک اس کی راہنمائی کی۔
جو یہ یہ صوفے پر بیٹھ کر خود کو سنہا لنے کی کوشش کرنے لگی۔ اسے حیرت ہو رہی تھی۔ اتنے برس پہلے جانے کے باوجود آج بھی اس پر عارفہ کا خوف سوار تھا۔ وہ اس کا سامنا ہونے کے خیال سے گھبرا رہی تھی۔ اب اسے خیال آ رہا تھا، اکیلے نہیں آنا چاہیے تھا۔ مزید کو ساتھ لے آئی تو اچھا تا..... اُس کے ساتھ مجھے حوصلہ دتا اور وہ یقیناً مجھ سے کہیں بہتر انداز میں ان سے بھی بات کر لیتا۔

بیگم اور صاحبہ یا تو آئے ہی خاصی دیر کے بعد یا پھر اس پر ہی ایک ایک منٹ بھاری ہو رہا تھا۔ اُن دونوں کو دیکھ کر جو یہ نے اٹھ کر کھڑے ہونے کی کوشش کی مگر محسوس ہوا، وہ گر پڑے گی۔

اُسے یوں لگ رہا تھا کہ اس کے بے جان ہوتے پاؤں اس کا بو جھ نہیں سہا سکیں گے۔

اُس نے بیٹھے بیٹھے آہستہ سے سلام کر دیا..... اور آنے والوں نے اس انداز سے یہی مطلب اخذ کیا کہ شوہر کے عہدے کے غرور نے اُسے اٹھ کر ملنے سے روک دیا ہے اور یوں یہ بات جو یہ کے حق میں ہو گئی کہ یہ کھوکھلے لوگ عہدوں اور امارت سے ہی مرعوب ہو سکتے تھے۔

”جو یہ..... تم اور یہاں.....؟“ ہمیں فون کر دیا ہوتا، ہم خود تم سے ملنے آ جاتے۔“ آج تو عارفہ اکبر کا انداز ہی کچھ اور تھا۔

جو یہ یہ کچھ کہنے لگی تو عارفہ پھر بولی..... ”تم غیروں کی طرح ادھر ڈرائنگ روم میں کیوں آ کر بیٹھ گئیں۔ بھی سیدھے اندر آنا چاہیے تھا نہیں تو، آخر یہ تمہارا اپنا گھر ہے۔“

”جو یہ یہ کیسی ہوتی اور کیر حسن کا کیا حال ہے.....؟“ اکبر علی اُس کے قریب آ کر بیٹھ گئے۔
”بھائی جان..... کہاں چلے گئے تھے آپ لوگ، میں نے بہت انتظار کیا ہے آپ کا۔“ وہ ان کے کندھے پر سر رکھ کر رونے لگی۔

”کیا بات ہے.....؟ خیر تو ہے ناں.....؟“ اب عارفہ بیگم کا ماتھا ٹھکا، لہجے کی شیرینی ایک دم ہی کم ہو گئی۔

جو یہ نے اُن کے بدلے لہجہ کو..... محسوس نہیں کیا، آنسو پونچھ کر بولی۔
”ہاں ہاں..... بالکل خیریت ہے، اپنے بھائی کو اتنے عرصے کے بعد دیکھا ہے تو جذبات پر قابو نہیں رکھ سکی، رونا آ گیا۔“

”یہ بھی تمہیں بہت یاد کرتے رہے ہیں.....“ عارفہ مسکرا کر بولی کہ اب اطمینان ہو گیا تھا۔ لہذا سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔

”بھائی جان..... میں اور کیر حسن صاحب بالکل خیریت سے ہیں۔ ویسے کیر صاحب کو آپ کی وطن واپسی کے سلسلے میں کوئی خبر نہیں ہے۔“

”تمہیں کیسے پتا چلا کہ ہم لوگ واپس آ گئے ہیں.....؟“ عارفہ پوچھنے لگیں۔
”میں تو اتنے برسوں سے منتظر تھی آپ لوگوں کی، مجھے بھلا کیوں کر علم نہ ہوتا، مجھے آپ سے کچھ پوچھنا ہے، مجھے آپ سے اپنی دولت واپس لینا ہے۔“

”کون سی دولت.....؟ ہمارے پاس تو تمہاری کوئی چیز نہیں ہے۔“ دونوں چونک گئے۔

159.....O..... ڈھلے چاندول کے بار.....

نفس خاتون تھیں۔ سوہا اکثر ان کے پاس جایا کرتی تھی۔ کبھی کبھی آذر سے بھی ملاقات ہو جاتی۔ عالیہ کے کہنے پر وہ آذر کے پاس جانے کو تیار ہو گئی۔ یہ تو وہ جانتی تھی کہ والد کی وفات کے بعد ان کا بزنس وہی سنبھال رہا ہے۔

”مجھے افسوس ہے سوہا کہ میں فی الحال آپ کے کسی کام نہیں آسکوں مگر یہ میرا وعدہ ہے۔ جونہی کوئی سیٹ ہوگی، میں آپ کو مطلع کر دوں گا۔“ یہ تھے آذر کے الفاظ جنہوں نے سوہا کو بے حد مایوس کیا مگر بظاہر وہ مسکرا دی۔ اور جانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”بیٹھو ناں..... میں نے چائے کے لئے کہا ہے، آتی ہی ہوگی۔“ وہ اس سے شرمندہ تھا کہ کام نہیں آسکا۔

”نہیں آذر صاحب، آپ کا بہت بہت شکریہ، چائے رہنے دیں، ہاں ایک گلاس پانی مل جائے تو۔“

”ہاں ہاں، کیوں نہیں.....“
”ہیلو، اندر آسکتا ہوں.....؟“ اردشیر نے دروازے سے جھانک کر خوش دلی سے اجازت طلب کی۔

”آؤ آؤ..... تمہیں اجازت لینے کی ضرورت کب سے پیش آگئی.....؟“ آذر بھی مسکرا دیا اور اردشیر اندر آ گیا۔ اندر آتے ہی نظر سوہا پر پڑی، وہ بھی اس وقت آنے والے کو ہی دیکھ رہی تھی۔

اردشیر کی گہری اور بہت گہری کچھ کہتی اور بہت غلط کہتی نگاہ، سوہا نے منہ پھیر لیا..... مگر اس کے چہرے پر گھبراہٹ نہیں تھی، بس بیزاری کی جھلک تھی..... ملازم نے پانی کا گلاس اس کے سامنے رکھا اور وہ اطراف کے ماحول کو بالکل نظر انداز کر کے گھونٹ گھونٹ پانی پینے لگی۔ ”ان کی تعریف.....؟“ اردشیر اُس کے انداز پر حیران اور کچھ مرعوب سا ہو کر آذر سے پوچھ رہا تھا۔

”یہ سوہا ہے..... سوہا رعنا..... کچھ سال پہلے میرے پڑوس میں رہا کرتی تھیں اور سب سے بڑی بات تو یہ کہ مِس سوہا مشہور.....“

”اچھا آذر صاحب، اب اجازت، میں چلتی ہوں۔“
آذر کی بات مکمل ہونے سے پہلے اُس نے جلدی سے گلاس میز پر رکھا اور غلٹ کے عالم میں فقرہ مکمل کیا اور ساتھ ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میں بہت شرمندہ ہوں سوہا آپ کے کام نہیں آسکا۔“
”اوہ نہیں، میں جانتی ہوں اگر آپ کے پاس جگہ ہوتی تو مجھے یوں مایوس نہ لوٹا پڑتا۔“ شانے تک جھوٹے بالوں کو ہاتھ سے پیچھے ہٹا کر وہ مسکراتے ہوئے بولی تھی، پھر اپنی فائل اٹھا کر اردشیر کو مکمل طور پر نظر انداز کرتے ہوئے چلی گئی۔ جبکہ اردشیر نے اس وقت تک اسے نظروں میں ہی رکھا جب تک کہ وہ کمرے سے باہر نہیں نکل گئی۔

”ہاں، تم کیا بتا رہے تھے، کون ہے یہ لڑکی.....؟“ اس کے جانے کے بعد اُس نے گفتگو کا سلسلہ دیکھ سے جوڑنا چاہا، جہاں سے ٹوٹا تھا۔

”میں تمہیں بتا رہا تھا کہ یہ لڑکی سوہا مشہور گلوکارہ یا سیمین بیگم کی بھانجی ہے، والدین کی ڈیٹھ کے

158.....O..... ڈھلے چاندول کے بار.....

”ہے آپ کے پاس، میری سب سے بڑی دولت، میرا بیٹا، میرا اطلاع..... میں اُس کے بارے میں پوچھنے آئی ہوں۔ آپ نے اُسے گینڈا آپا کے ہاں کام کرنے والی ایک عورت کے سپرد کیا تھا..... آپ لوگوں کے جانے کے بعد میں نے بہت ڈھونڈا ہے اسے، مگر وہ مجھے کہیں نہیں ملی..... خدا کے لئے ترس کھائیں مجھ پر..... میں اتنے برسوں سے تڑپ رہی ہوں اس کے لئے، مجھے بتا دیں کہ وہ عورت کہاں ملے گی، رحم کریں مجھ پر، میں بہت ڈر رہی ہوں..... خدا رحم کریں، ترس کھائیں مجھ غریب پر۔“ چہرے پر ہاتھ رکھ کر بری طرح رو رہی تھی۔

زندگی قدم قدم پر امتحان ہے، ہم آزمائے جاتے ہیں..... وہی لوگ جو ہم جیسے ہیں ہمارا تہا دیکھتے ہیں۔ پتا نہیں کیوں ہم ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر نہیں چل سکتے؟ سب کو اپنی اپنی پڑ ہے۔ سہاروں کے لئے ہاتھ بڑھا میں تو ہاتھ جھٹک دیتے ہیں۔

اور یہی وجہ ہے کہ زندگی آزمائش بنتی جا رہی ہے..... قصور وار تو ہم خود ہیں..... یہ بگاڑ ہمارے اپنے پیدا کردہ ہیں، یہ اصول ہم نے خود بنائے ہیں مگر جب ہم خود ان اصولوں کا شکار ہو جاتے ہیں تو گم کرتے ہیں خدا سے..... الزام دھرتے ہیں تقدیر پر.....

احلی لڑکی کی طرف بہت نظریں اٹھتی ہیں، ہزار چہتیں دھری جاتی ہیں اور اگر وہ لڑکی برائی سے اچھائی کی طرف آنے والی ہو تو بھی غیر متقدم نہیں کیا جاتا، ماضی کرید اجاتا ہے..... ابھی آس باقی ہے، ابھی ہمت جوان ہے..... میں دیکھوں گی کب تک آزمائے گی یہ دنیا، اگر حوصلے دم توڑ گئے تو میں یہ زندگی ختم کر لوں گی مگر زمانے کے اشارے پر نہیں چلوں گی..... ایک بار کہہ دیا نہیں، وہ زندگی قبول نہیں..... میں عزت سے جینا چاہتی ہوں..... منہ پرواہ واہ اور پیٹھ پیچھے نفرت، مجھے یہ قبول نہیں..... میں راستہ بناؤں گی..... سوہا خیالات میں الجھ گئی..... کتنے ہی انٹرویو بے ڈالے، جہاں پتا چلا ملازمت ملنے کی امید ہے..... نئی آئیڈیل کے ساتھ وہاں پہنچی مگر ہر بار ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اُس نے یہ خیال بھی اپنے دل کے قریب نہیں بٹھانے دیا کہ اگر سرسوس بھلی تو کیا ہوگا.....؟ وہ پرامید رہنا چاہتی تھی، وہ سوچتی تھی آخر کب تک، آن نہیں تو کل، کل نہیں تو پرسوں اسے ضرور سروس مل ہی جائے گی۔

حزب حسن، نائلہ علی کا دوست جس سے دو روز پہلے روڈ پر ملاقات ہوئی تھی اور اسے نائلہ علی! آگئی، اُس کی پیاری دوست..... پتا نہیں اب کہاں ہوگی.....؟ اسکول کے زمانے میں ہی اس کے چاٹ ٹرانسفر ہو گیا تھا۔ وہ لوگ دوسرے شہر چلے گئے تھے، پہلے چاہل تو نائلہ کے خط آتے رہے، پھر خاموشی ہو گئی..... اور یہ حزب حسن کتنا خوش ہوا تھا مجھے دیکھ کر..... شاید پرانے ساتھی دیکھ کر یونہی خوش ہوتی ہے..... میں بہت جلدی میں تھی، ڈھٹک سے بات بھی نہیں کر سکتی..... کیا سوچتا ہوگا، ایسی لڑکی ہے.....؟

اسے اب کچھ افسوس بھی تھا مگر زیادہ دیر وہ اس بارے میں سوچ نہیں سکی۔ صبح پھر اسے ایک جگہ مل گیا تھا۔ اس کی دوست عالیہ نے اسے یاد دلایا تھا کہ آذر محمود بھی تو ہے، زیادہ نہ سہی، تھوڑی بہت تو جان بچا ہے تمہاری اس کے ساتھ، آخر ایک ماہ تم لوگ پڑوسی رہے ہو، وہ اچھا لڑکا ہے، تم اس سے ملو، شاید تم کام بن جائے اور اب صبح اسے آذر محمود کے پاس جانا تھا۔

سات آٹھ برس پہلے کی بات ہے، جب یہ لوگ آذر کے گھر کے قریب رہتے تھے، آذر کی امی

گاؤں میں شیریں کی شادی کی تیاری زوروں پر تھی۔ جس روز سے شاہ جی نے رشتے کے بارے میں کبریٰ کے رائے مانگنے پر عدم دلچسپی اور چند دوسری اشیاء کی خریداری کے لئے وہ خود شہر جانا چاہ رہی تھیں۔ گل رخ بھی آج کل ہاسٹل سے گاؤں آئی ہوئی تھی۔ انہوں نے اُسے بھی ساتھ چلنے کو کہا کہ اب وہ باغیچہ لڑائی تھی۔ جو شہر کو ان سے کہیں زیادہ جانتی تھی۔ اُس سے بات کی تو وہ ساتھ جانے کو فوراً تیار ہو گئی۔

صبح نہشتے کے بعد دونوں شہر کے لئے روانہ ہوئیں۔ انہوں نے اپنی آمد کی اطلاع نہ تو ارد شیر کو دی اور نہ ہی شہر میں موجود شاہ جی کو۔ سارا دن شاپنگ میں تمام ہوا، شام کو کبریٰ تک کر چور ہو رہی تھیں جبکہ بہت سی خریداری ابھی باقی تھی۔ ہاں جو کچھ خرید چکی تھیں، اُس سے پوری طرح مطمئن تھیں اور انہیں احساس تھا، اگر گل ان کو ساتھ نہ لائی ہوتیں تو اتنی مطمئن ہرگز نہ ہوتیں۔ یہ سب اُس کا کمال تھا۔ گل کو گل ہاسٹل چلے جانا تھا۔ اس لئے وہ آج ہی خریداری مکمل کرنا چاہ رہی تھیں۔

”بڑی ماں دیر ہو رہی ہے۔۔۔۔۔۔ روڈ بھی خاصا خراب ہے، بہتر ہے اب واپس چلیں۔“ گل نے احساس دلایا۔

”ہاں، یہ تو میں بھی دیکھ رہی ہوں کہ شام اب گہری ہو رہی ہے۔۔۔۔۔۔ اور اسی لئے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ آج رات واپس جانے کے بجائے ہم شہر میں ہی ٹھہر جائیں۔۔۔۔۔۔ صبح صبح نکل چلیں گے۔“ گل خاموش رہی، یہی خیال تھا کہ انہوں نے بابا جان کی کوشش پر رہنے کا فیصلہ کیا ہوگا۔ یہ نہیں سوچا کہ ارد شیر کے ہاں بھی جایا جاسکتا ہے۔ جبکہ کبریٰ خاتون، ارد شیر کو میزبانی کا شرف بخشے کے موڈ میں تھیں۔

ڈرائیور سے جس وقت کبریٰ نے ارد شیر کی طرف چلنے کو کہا، گل کا دھیان آتے جاتے لوگوں خاص کر ایک نئے شادی شدہ جوڑے کی طرف تھا، وہ سن نہیں سکی، اگر سن لیتی تو ضرور اعتراض کرتی بلکہ صاف کہہ دیتی کہ ارد شیر کے ہاں ٹھہرنا مجھے پسند نہیں، آپ بابا جان کی طرف چلیں۔

راستے بھر وہ اس کی پسند کو سراہتی رہیں، اس اعتماد پر خوشی کا اظہار کرتی رہیں جو آج انہوں نے گل کے ہر ہر انداز میں دیکھا تھا اور گل کا جی چاہا، اُن کے کاندھے پر سر رکھ کر بازو اُن کے گلے میں حائل کر دے مگر وہ ان سے اس حد تک بے تکلف نہیں تھی، اُن کی آن، اُن کا دبندہ۔۔۔۔۔۔ بہت محبت کے باوجود گل رخ جبکہ کرکڑ جاتی۔

گاڑی گیٹ پر کی تو چوکیدار نے ڈرائیور اور گاڑی کو پہچان کر گیٹ کھول دیا۔

”جاؤ ارد شیر کو ہماری آمد کی اطلاع کرو۔“ گاڑی سے باہر آتے ہی انہوں نے حکم کے انداز میں کہا، تب گل رخ چوٹی چلی، کیا ہم اس کے ہاں آئے ہیں؟ ناگواری کا احساس دور تک پھیل گیا۔ اُس نے سباز کی نظر اس بڑی سی اونچی عمارت پر ڈالی اور پھر خاموشی سے کبریٰ کے قریب آکر کھڑی ہو گئی کہ اب آئی گئے تھے، کچھ کہنا بے کار تھا۔

ملازم گاڑی اور ڈرائیور سے پہچان گئے تھے کہ مہمان گاؤں سے آئے ہیں اور یقیناً صاحب کے قریبی عزیزوں میں سے ہوں گے سو وہ دوڑتا ہوا ارد شیر کے بیڈروم تک گیا۔

دروازے پر ہونے والی دستک نے ارد شیر کے اندر غصہ بھر دیا تھا۔۔۔۔۔۔ حالانکہ اس نے کہا تھا، اس

بعد یاسمین نے ہی اسے اپنے ساتھ رکھا ہے۔“

”گلوکارہ یاسمین بیگم کی بھانجی۔۔۔۔۔۔ واہ، اور انکڑ تو یوں رہی تھی جیسے ملکہ یاسمین سے رشتے داری ہو تمہارے پاس کیا کرنے آئی تھی؟“

”جواب کے سلسلے میں آئی تھی پریشان ہے آج کل۔“

”گلوکارہ کی رشتے دار ہے، اسے بھلا جواب کی کیا ضرورت، یاسمین کا نام ہے ساتھ، اور حسن اس کے پاس کی نہیں ہے، کسی روز اسٹیج پر آجائے، صرف دولت ہی نہیں بلکہ کسی بھی چیز کی کی نہیں رہے گی۔“ ارد شیر گل کرہنسا۔

”وہ بہت شریف لڑکی ہے۔“ آڈر نے سنجیدگی سے کہا۔

”تو میں نے کب کہا شریف نہیں ہے۔“ انداز ایسا تھا جیسے آڈر کی بات کو مذاق میں لیا ہو۔

”یاسمین بیگم خود بھی حالات سے مجبور ہو کر بنی اس فیلڈ میں آگئی تھی، اب بھانجی کو کسی صورت اہم لانا نہیں چاہتی۔“

”ہوں۔۔۔۔۔۔ مگر کیا خبر، حالات اسے بھی ادھر آنے پر مجبور کر دیں۔“

”ارد شیر، خدا کا خوف کرو۔“

”تم کہتو میں، میلیپ کروں، اس مجبور، شریف، معصوم لڑکی کی۔“ اُس پر کوئی اثر نہیں تھا۔

”قسم سے اگر مجھے پتا ہوتا کہ تم ادھر آ رہے ہو تو سو ہا کو باہر سے ہی لوٹا دیتا۔“

”ہا۔۔۔۔۔۔ مگر مسئلہ یہ ہوا کہ میں اندر چلا آیا اور اس پردہ نشیں کو دیکھ بھی لیا۔“ ارد شیر نے بظاہر افسوس سے سر ہلایا۔

”شرافت کسی خاندان کی میراث نہیں ہوتی۔“ آڈر نے یاد دلایا۔

”واہ۔۔۔۔۔۔ آج تو نئے نئے انکشافات ہو رہے ہیں۔۔۔۔۔۔ وہ کسی بھی بات کو سیریس لینے کے موڈ میں نہیں لگتا تھا۔

”چائے منگو آؤں تمہارے لئے۔۔۔۔۔۔؟“ اپنی ہر بات بے اثر دیکھ کر آڈر نے موضوع بدلنا چاہا۔

”ضرور۔۔۔۔۔۔ تکلف کا وہ قائل نہیں تھا۔

چائے کے دوران ان دونوں کے درمیان ادھر ادھر کی ہلکی پھلکی گفتگو ہوتی رہی۔ آڈر بھی سمجھتا تھا کہ سو ہا کا خیال اُس کے ذہن سے اتر گیا ہے مگر وہ نہیں جانتا تھا۔ ارد شیر نے اسے ذہن میں رکھ لیا ہے۔ اُس کے بارے میں ایک فیصلہ بھی کر چکا ہے۔

ایک گھر تھا جہاں کبریٰ کی نگرانی میں ہر کام بڑے طریقے سلیقے سے ہوتا تھا مگر یہ پرانی بات تھی۔ اب تو وہ گھر اور اس کا سکون ایک خواب تھا۔۔۔۔۔۔ اور شاہ جی غیر ارادی طور پر جیسے اس سکون کو ڈھونڈنے پھرتے تھے۔ کبھی بڑی حویلی، کبھی چھوٹی اور کبھی شہر والی کوشی پر مگر گھر کی وہ مخصوص فضا، کھانے میں وہ بلند سادگی اور لذت بھی، وہ اب کہیں نہیں ملتا تھا۔۔۔۔۔۔ شہر میں ہوتے تو بھی ارد شیر کی کوشش پر کبھی بھاری ہوا ہوتا۔ ارد شیر کو اگر یہ علم ہوتا کہ باپ شہر میں ہے۔۔۔۔۔۔ تو بھی کم کم ہی ملنے آتا اور کبھی یہ بھی نہیں کا۔ میرے پاس آکر رہیں۔

”ہماری وجہ سے تم نے اپنا پروگرام کیوں تبدیل کیا تم چلے جاتے۔“
”اوہ بڑی ماں..... کسی باتیں کرتی ہیں آپ، بھلا آپ سے زیادہ اہمیت ہے کسی کی میری نظر میں.....؟ آپ یہاں آئیں، مجھے بہت خوش ہوئی۔“

سارے دن کی شائنگ نے دونوں کو تھکا دیا تھا مگر اردشیر باتیں کرنے کے موڈ میں تھا، وہ بالکل اسی طرح کبریٰ کے قریب، اُن کے بیڈ پر بے تکلفی اور اپنائیت سے بیٹھا تھا جیسے بچپن میں بیٹھا کرتا تھا اور چھوٹی چھوٹی بہت سی بے سرو پاتیاں پوری جزئیات کے ساتھ انہیں سنایا کرتا تھا۔

آج بھی جانے کون کون سے قصے لے بیٹھا تھا جبکہ گل سونا چاہتی تھی، اسے بہت کوفت ہو رہی تھی..... مگر وہ کچھ نہیں کہہ سکتی تھی۔ اسی بیڈ پر ایک جانب وہ کروٹ لئے لیٹی تھی، درمیان میں کبریٰ تھیں اور جہاز ساز کے بیڈ کے ایک کنارے پر وہ بھی بڑے اطمینان سے ٹکا ہوا تھا۔

”بڑی ماں..... آپ کیا سوچ رہی ہیں.....؟“ باتیں کرتے کرتے اچانک اُس نے محسوس کیا کہ کبریٰ کی توجہ اس کی جانب سے ہٹ چکی ہے۔

”مجھے تمہارا بچپن یاد آ گیا تھا اردشیر.....“ وہ کھل کر مسکرائیں۔ مگر وہ سمجھا نہیں، سوالیہ انداز ان کی جانب دیکھا۔

”تم چھوٹی چھوٹی بہت سی باتیں جو بالکل اہم نہیں ہوتی تھیں مگر شاید ایک چھوٹے بچے کے لئے بہت زیادہ اہمیت رکھتی تھیں، آکر مجھے سنایا کرتے تھے، آج مدت کے بعد پھر اُسی طرح میرے قریب بیٹھے ہو۔“

”بڑی ماں..... او بڑی ماں.....“ اُس نے آگے ہو کر دونوں ہاتھ ان کے شانوں پر رکھے اور پھر سر بھی گل نے اُس کے یوں پیار بھرے انداز میں بڑی ماں کہنے پر مڑ کر دیکھا تھا اور اب اُس کے اس انداز کو بھی دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔

”بیٹے بہت بے وفا ہوتے ہیں اردشیر.....“ کبریٰ کا انداز نہ تو جتانے والا تھا اور نہ ہی افسردہ..... یوں لگا، وہ بس اسے چھیڑنے کو ایسا کہہ رہی ہیں۔

”یہ آپ نے کیوں کہا.....؟“ اُس نے سر اٹھا کر پوچھا.....
”اپنے اردشیر کو دیکھ کر، پرکھ کر ہی تو کہا ہے میں نے، جسے شہر کی رنگینیوں میں کھوکھرا کر دی ماں یاد کی نہیں آتی.....“ یہ الفاظ خود بخود زبان سے ادا ہوئے تھے، حالانکہ ایسا کچھ بھی کہنے کا ارادہ وہ نہیں رکھتی تھیں۔

”یقین کریں، سب سے زیادہ پیار آپ سے کرتا ہوں۔“
”ہا..... کیا تجھتیں کرتے ہو تم مرد بھی.....“ وہ بظاہر ہنس رہی تھیں۔

”جویریہ..... یہ تو تمہیں بھی یاد ہو گا کہ جس عورت کے سپرد طلال کو کیا گیا تھا، اسے مگینہ آپا ہی لے کر آئی تھیں، ہم تو واقف بھی نہیں تھے اُس سے۔“ عارفہ بیگم کہہ رہی تھیں اور اُن کی بات سن کر وہ ایک دم سے تھک گئی تھی۔

”مجھے اپنا بیٹا چاہئے.....“ اُس کا انداز اُکھڑا اُکھڑا اور ضدی تھا..... دونوں میاں بیوی خاموش

وقت کوئی ڈسٹرب نہ کرے۔

”نو تو بچنے والے ہیں..... ڈنر پر جانا ہے، اب پتا نہیں کوئی ملے آ گیا یا ان ملازموں کو ہی ہر مصیبت پڑ گئی.....“ ناگواری کے شدید احساس کے ساتھ اُس نے جھٹکے سے دروازہ کھولا۔

”وہ جی، صاحب جی..... گاؤں سے آپ کی مہمان آئی ہیں.....؟“ اردشیر کو اچنبھا ہوا اور دیکھنے کو باہر آ گیا۔

”کل رُخ اور بڑی ماں.....“ بڑی ماں، اُس نے حیرت کے عالم میں کہا اور پھر تیز قدموں سے چلا اُن کے قریب آ گیا۔

”آپ اس وقت یہاں.....؟ خیریت تو ہے ناں.....؟“
بات تو واقعی تشویش میں مبتلا کرنے والی ہی تھی، جواب میں کچھ کہنے سے پہلے انہوں نے بغور ان کے فائل ڈریس کو دیکھا اور پھر تفصیل بتانے کے بعد کہنے لگیں۔

”تم تو شاید کہیں جا رہے ہو.....؟“
”جائیں رہا..... بلکہ جا رہا تھا.....“ وہ مسکرا کر ان کے برابر آکھڑا ہوا اور بایاں ہاتھ اُن کے شانے پر رکھ دیا اور اُسی طرح ساتھ ساتھ چلا اپنی راہنمائی میں اندر لے آیا۔ اس عرصے میں وہ اسے بتا چکی تھی کہ رات ٹھہرنے کے ارادے سے آئی ہیں..... اور اُس نے کہا تھا۔

”ضرور بڑی ماں..... یہ آپ کے بیٹے کا گھر ہے یعنی ماں کا اپنا گھر.....“
انہیں بٹھا کر وہ ”ابھی آتا ہوں“ کہہ کر باہر چلا گیا..... واپس آیا تو لباس تبدیل کر چکا تھا اور تیار تھا۔

”میں نے ملازم سے کہہ دیا ہے، ابھی آپ کے لئے کھانا بھی تیار ہو جائے گا اور کمرے بھی، آپ کو اپنی پسند کے مطابق ملیں گے۔“ وہ صوفے پر ان کے قریب آ بیٹھا اور بولا.....
”بڑی ماں، آنے سے پہلے مجھے اطلاع ہی کر دی ہوئی، دیکھیں ناں، اگر اطلاع ہوتی تو آپ نے شاندار سے استقبال کی تیاری تو کر لیتا میں۔“

”اچھا.....“ وہ پھینکی سی مسکراہٹ کے ساتھ نہ یقین کرنے والے انداز میں کہہ رہی تھیں کہ اس بات پر یاد آ گیا تھا، اب کی مرتبہ جب وہ گاؤں گیا تھا تو بڑی حویلی آیا ہی نہیں، ان سے ملے بغیر ہی واپس چلا گیا تھا۔

”کیوں.....؟ ایسے کیوں کہہ رہی ہیں آپ.....؟“ اُن کے انداز کو پہچان کر وہ کہہ رہا تھا.....
وہ سنبھل گئیں اور ہنس کر بولیں.....

”افسوس..... بتا کر آتے تو شاندار استقبال پر تھوڑا مغرور ہی ہو جاتے.....“ تب وہ بھی اُن کے ساتھ ہنس پڑا..... جبکہ گل یہ سب سن کر بھی بظاہر یوں ٹپٹی میگزین کے ورق الٹ رہی تھی جیسے کوئی وہ ہی نہیں اُن دونوں کی طرف.....

گل اور کبریٰ کے لئے الگ بیڈروم تھے مگر پتا نہیں کیا بات تھی، وہ یہاں گھبرا رہی تھی.....
ماں سے کہہ دیا کہ آپ کے ساتھ ہی سوؤں گی اور انہوں نے بھی اعتراض نہیں کیا..... اردشیر نے رات کھانا اُن کے ساتھ کھایا اور کبریٰ کہہ رہی تھیں۔

رہے۔

”سنا آپ نے، مجھے طلال چاہئے۔“ اب کے وہ چیخ کر بولی۔

”تم یقیناً کرو جو یہ..... یہاں سے جانے کے بعد ہماری کبھی ٹھیکہ آپا سے ملاقات نہیں ہوئی، میرا نہیں معلوم کہ وہ ملک میں ہیں یا ملک سے باہر.....“ ان کے بھائی نے سمجھنا چاہا۔

”آپ کو کچھ تو علم ہوگا، وہ عورت کہاں رہتی تھی.....؟“ کیا کام کرتی تھی.....؟

”ہم شرمندہ ہیں مگر وعدہ کرتے ہیں، اس سلسلے میں کوشش ضرور کریں گے۔“ عارفہ کی بات جو یہ یہ کیا کر سکتی تھی، وہ خود کو سنبھال کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”کچھ دیر تو ٹھہرو.....“ دونوں نے روکا مگر وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی باہر آگئی اور گاڑی میں آکر سیٹ پر گر کر بیٹھ گئی۔

جب گھر واپس آئی تو مزید گھر پر تھا اور اس کی آمد کا شدت سے انتظار کر رہا تھا۔

”آپ اکبر انکل کی طرف گئی تھیں، پھر کیا کہا انہوں نے.....؟“ وہ بے تاب سے جو یہ یہ کی طرف بڑھا اور پوچھا..... جواب میں چہرے پر دونوں ہاتھ رکھ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی..... ایک لمبے مزید کو اہٹا دل ڈوب گیا مگر پھر اس نے آگے بڑھ کر جو یہ یہ کو بازوؤں میں لے کر اپنے ساتھ لگا لیا اور بولا.....

”اچھی ماما..... یوں مت روئیں، مجھے بتائیں کیا بات ہوئی.....؟“ وہ خاصی دیر بعد سنبھل پائی اور ساری بات اسے بتادی۔ حالات واقعی یوں کن تھے مگر انہیں تسلی دینا ضروری تھا۔

”آپ ہمت سے کام لیں..... دیکھیں جس طرح کئی سالوں کے بعد اکبر انکل سے ملاقات ہوئی، اسی طرح ٹھیکہ صاحبہ بھی آپ کو مل جائیں گی۔ اللہ سے اچھی امید رکھیں..... ہمیں ضرور کامیابی ہوگی۔ طلال ایک نہ ایک دن مل جائے گا۔“

♦ ♦ ♦

شیریں کی شادی کے دن قریب تھے۔ جمشید شاہ شہر میں تھے اور اب گاؤں جانا چاہ رہے تھے کہ بہر حال بہت سی ذمہ داریاں تھیں جو انہیں نبھانی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ ارد شیر کو بھی اپنے ساتھ ہی گاؤں لے جائیں گے اور اس لئے وہ اس کی طرف آئے تھے۔ ان کی اچانک آمد پر ارد شیر کو بھلا نا پڑا کہ حالات ہی کچھ ایسے تھے۔ بے شک باپ سے سرگرمیاں پوشیدہ تو نہیں ہوں گی کہ وہ فارما ملازم بات ادھر سے ادھر پہنچاتے ہی رہتے ہیں مگر اس پوچش کے ساتھ اس سے پہلے بھی آنا سامنا نہیں ہوا تھا۔

”یہ میری نئی ملازمہ ہے۔“

ارد شیر نے بھلا ہٹ کے عالم میں جھوٹ بولا تھا..... مگر لڑکی کس فٹاش کی ہے چہرے پر کبھی تھا..... اور آنے والا جہان دیدہ تھا، یہ تحریر پڑھنا اس کے لئے کچھ مشکل نہیں تھا۔ انہوں نے اس کے کپڑے ہرگز نہیں سمجھا مگر باز پرس بھی نہیں کی..... ہاں یہ ارد شیر نے بھی ان کے چہرے سے پہچان لیا کہ انہیں اچھا نہیں لگا، نگار کی ہلکی سی تحریر ان کے چہرے پر تھی، ارد شیر نے سر جھکا لیا۔

رات کا کھانا باپ بیٹے نے اکٹھے ایک ہی میز پر کھایا اور کھانے کے دوران انہوں نے اپنے بہال آنے کا مقصد بھی بیان کر دیا۔ اگر ان کے یہاں آتے ہی اسے شرمندگی سے دوچار نہ ہونا پڑتا تو

”شادی سے ایک دو روز پہلے آ جاؤں گا..... ابھی کچھ کام ہے مجھے شہر میں۔“

مگر اب وہ ایسا نہیں کہہ سکتا تھا کہ کام کی نوعیت وہ یہی سمجھتے، سو دل نہ چاہتے ہوئے بھی ان کے ساتھ جانے کی ہامی بھرتی۔ ٹھیک دو روز کے بعد اسے گاؤں کے لئے روانہ ہونا تھا۔

گاؤں میں وہی روایتی انداز کا استقبال، ان کی آمد کی اطلاع پہلے ہی پہنچ چکی تھی، سو نشی اور دوسرے خاص آدمی گاؤں سے باہر نہر کے پل پر موجود تھے اور ان کی آمد کے منتظر تھے۔

شادی میں دس روز باقی تھے مگر چونکہ بیاہ گاؤں کا تھا تو اتنے روز پہلے ہی چہل پہل اور رونق دکھائی دے رہی تھی۔ دس گھنٹے چڑھ گئی تھیں اور برادری کے لوگ اندر باہر آ جا رہے تھے۔ شاہ جی اور ارد شیر پہلے مردانے میں آئے عزیز رشتے داروں سے ملنے اور مبارکباد وصول کرتے رہے، پھر وہ اندر چلا گیا۔

اتنی رونق..... اندر آتے ہی اسے خوشگوار سی حیرت نے گھیر لیا۔ یہاں آنے سے جو بوریٹ اب تک اس پر سوار تھی، ساری کی ساری ہوا ہو گئی۔ ہر سمت لہراتے آچل، ٹھنکتی چوڑیاں، پرانے میں بندھے نئے ٹھنکے دس کی چٹنگ، ہنسی کی آوازیں اور ڈھولک کے ساتھ گیتوں کا مدھر شور..... آج تو ملازم لڑکیاں بھی نہائی دھوئی اور صاف ستھری چمکتے دکتے کپڑوں میں نظر آ رہی تھیں۔

”چھوٹے شاہ جی آ گئے.....“ اُس نے قدم زنان خانے میں رکھا ہی تھا کہ ہر طرف سے یہی آواز ابھرنے لگی جیسے یہ محفل اسی کے لئے سجائی گئی تھی اور سب کو انتظار تھا کہ کب وہ آتا ہے۔ جان پڑ گئی تھی محفل میں، کچھ نکل کا دوہا جو آ گیا تھا..... کئی آنکھیں اُس کی جانب اٹھیں اور پھر جھک گئی تھیں۔ چھوٹے شاہ جی نے اس پڑ پڑائی پر کوئی تاثر چہرے سے نہیں دیا۔ ابھی تک دروازے کے قریب ہی کھڑے تھے اور ادھر ادھر بظاہر اچھتی سی نگاہیں ڈالی تھیں۔

”بسم اللہ سرکار..... بسم اللہ..... جی آ یاں نوں..... چھوٹے شاہ جی سلام..... سرکار سلام..... شاہ جی کی خیر..... اللہ ہزاری عمر دے۔“ ملازماں دُعا دے رہی تھیں اور باقی تمام مہمان خواتین اپنی اپنی دلچسپیاں چھوڑ کر ادھر متوجہ تھیں۔ کچھ تو اپنی اپنی نشستوں سے اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ وہ سب کی توجہ کا مرکز تھا۔

ملازمہ عورتوں کے سلام کا جواب دینے کی ضرورت تھی نہ فرصت..... برادری کی لڑکیاں سر پر دوپٹے اوڑھے بظاہر چہرہ چھپانے کی کوشش میں مصروف، مگر برابر اُسے دیکھتی اور آچل جانے کیوں ڈھلک جاتے تھے جسے فوراً ہی سر پر بھانے کی کوشش بھی کی جاتی حالانکہ کچھ دیر پہلے تک یہ آچل اتنے شہرینہ تھے جہاں لگایا تھا، نکلے رہے تھے اور بزرگ خواتین اسے ملنے کو آگے بڑھتی ہوئیں۔

وہ چاچی، پھوپھی، تائی..... کے آگے رسم کے مطابق سر جھکا تا (کہ یہ بزرگ خواتین کے احترام کی نشانی تھی) ان سے سر پر ہاتھ پھر تا دعا مانگ لیتا آگے بڑھ رہا تھا۔ بہت سی خواتین کو وہ نہیں جانتا تھا مگر ان کے لباس اور انداز بتاتے تھے برادری کی ہیں اور سلام کرنا اس پر فرض ہے۔ یہ سلسلہ خاصا طویل تھا اور اس کی نگاہیں برابر بڑی ماں کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ جب ملتے ملاتے مہراں کے قریب پہنچا تو پوچھ ہی لیا۔

”بڑی ماں اب تک دکھائی نہیں دیں، کہاں ہیں وہ.....؟“

مہراں جواب ان کے ایک مزارعے کی بیوی تھی، دو بچوں کی ماں تھی۔ ایک گود میں تھا، دوسرا

اور شہقت میں ڈال کر ان کی خواہش پوری کی ہوتی ہیں..... اردو شیر بھی ناز و نعم میں پلا ہے۔ ہمیشہ اس کی ہر بات مانی گئی ہے اور وہ اب صرف اپنی ذات سے پیارا کرتا ہے۔“

”اماں بائی مانگا تھا تم نے۔“

وہ بڑی توجہ سے لڑکیوں کے اس جھرمٹ کو دیکھ رہا تھا۔ جب سبز سوٹ میں ملبوس ایک لڑکی جس کے دوپٹے پر سلور گولے کا جال بنا ہوا تھا اور جس نے چاندی کے بڑے بڑے جھمکے پہن رکھے تھے پھر بھی کو پانی کا عیس پکڑانے کے لئے اس کے..... بالکل قریب آ کر کھڑی ہوئی اور باقی منظر سے نظر ہٹا کر رادھیر نے اس کی جانب دیکھا..... ماں کو پانی پکڑاتے ہوئے لڑکی نے بھی اتنی ساری بزرگ خواتین کو حتمہ دے کر نہ صرف اس کی طرف دیکھا بلکہ دھیرے سے مسکرا بھی دی۔

”یہ میری بیٹی ہے کلثوم.....“ پھوپھی نے ارد شیر کو بتایا اور بیٹی نے جھٹ سلام جھاڑ دیا جس کا جواب ارد شیر پر واجب تھا۔ وہ چلی گئی اور جا کر دوری پر ایسی جگہ بیٹھی جہاں سے وہ ارد شیر کو اور ارد شیر کلثوم کو اچھی طرح دیکھ سکتا تھا۔

رنگ کو مزید رنگین بنانے کے مگر سے آشنا تھی۔ میک اپ کے انداز اور لباس میں ہلکا سا مگوار پن، جھلک رہا تھا مگر ہاں اتنی ساری لڑکیوں میں وہ بہتر بھی تھی اور نمایاں بھی..... دونوں ایک دوسرے کی جانب متوجہ تھے۔

رات جو کمرہ اس کے حصے میں آیا، وہاں بستر بھی آرام دہ تھا اور کمرے کی صفائی ستھرائی بھی بہت مناسب تھی مگر نئی جگہ ہونے کی وجہ سے ٹھکا ہوا ہونے کے باوجود اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ کچھ دیر کروٹیں لینے کے بعد وہ چت لیٹ گیا۔ دایاں بازو سر کے نیچے رکھا اور آج کے دن کی مصروفیت پر نظر دوڑائی.....

کچھ دیر سوچ ادھر ادھر پھرتے کے بعد پہلے کلثوم پر ٹھہری مگر تھوڑی سی دیر کے لئے کلثوم کے ساتھ ہی اسے سوار عماما یاد آ گئی تھی۔

”سہو..... ہا..... کیا لڑکی ہے اور لگتا ہے خود کو سارے شہر کی مالک سمجھتی ہے مگر ہم بھی بہت جلد بتا دیں گے کہ تمہاری اصل جگہ کہاں ہے..... ایک تو بابا جان اتنی جلدی گاؤں لے آئے ورنہ ملاقات کی کوئی صورت نکال ہی لیتا..... اور ویسے بھی اُس سے ملنا اتنا مشکل تو نہیں گلو کارہ کی بیٹی ہے..... ایسے لوگ تو بغیر کواڑوں کے گھر کے مکین ہوتے ہیں۔ جن سے کسی بھی وقت جا کر ملا جاسکتا ہے۔ ویسے جب تک گاؤں میں ہوں، یہ کٹوم بھی بری نہیں..... مگر خود سے اشارہ تو میں بھی نہیں کروں گا۔ مجھے یقین ہے وہ آپ ہی آپ آجائے گی لائن پر۔“

ریں کرتا پیچھے پیچھے، جوانی کا سارا کس نیل اب خواب ہو چکا تھا، آنکھوں لے بولنا اور ہونٹوں نے چھوڑ
شاہ جی کو دیکھتے ہی مسکرا کر بھلا دیا تھا۔ اب وہ بڑے ادب اور احترام کے ساتھ اسے بڑی ماں کے بارے
میں بتا رہی تھی کہ وہ اس وقت شیریں بی بی کے کمرے میں ہیں۔

’جی سرکار.....‘ گود کے بچے کو ایک پہلو سے دوسرے پر لاتے ہوئے وہ بولی اور پھر حکم کی قیامت چل پڑی۔ مگر زیادہ دُور نہیں گئی تھی، جب ارد شیر کو کچھ خیال آیا، وہ خود بھی پیچھے چلا آیا اور قریب ہر بولا.....

”رہنے دو میں خود جا کر سلام کرا تا ہوں۔“

وہ نظروں سے اوجھل ہوا تو وہ سب کام جو رک گئے تھے پھر سے شروع ہو گئے۔ ڈھولک پر تھا پڑنے لگی اور گاؤں کی میراٹھوں کے ساتھ ساتھ خاندان کی لڑکیاں بھی گیت گانے لگیں۔ ملازم لڑکیوں کی بھاگ دوڑ شروع ہو گئی اور خواتین پھر سے اپنی اپنی نشستوں پر آ بیٹھیں اور ان کی گفتگو اب ارد شیر کے متعلق تھی۔

ارد شیر نے شیریں کے کمرے کے دروازے پر پہنچ کر ہلکی سی دستک دی اور ساتھ ہی آواز دی۔
 ”بڑی ماں.....“

”اوہ..... یہ تو اور شیر ہے۔“ کبریٰ نے ہلکی سی آواز میں کہا اور ساتھ ہی بیٹی کی طرف دیکھا کہ.....
 ”اندر بلاؤں یا نہ بلاؤں.....؟“ شیریں نے نفی میں سر ہلادیا..... تب کبریٰ خود کمرے سے باہر آئیں۔
 ”السلام علیکم بڑی ماں.....“ اُس نے سعادت مندی سے سر اُن کے آگے جھکا کر پیار لیا..... پھر
 شیریں کی شادی کی مبارکباد دی۔

شیریں کا پلنگ کھڑکی کے قریب تھا اور کھلی کھڑکی سے اسے ارد شیر اور ماں کی گفتگو بخوبی سنا کی دے رہی تھی، درمیان میں نیلے اور براؤن پرنٹ کا پردہ جال تھا۔ شیریں اس گھر سے رخصت ہونے والی تھی..... اور اب اُسے اس گھر کی ہر بات اچھی لگ رہی تھی یہاں تک کہ ارد شیر بھی.....

وہ ماں سے مل کر واپس چلا گیا، جب کبریٰ دوبارہ کمرے میں آئیں تو وہ رو رہی تھی، کبریٰ بہت تیز اور باریک ذہن کی عورت تھیں..... اُس کے گالوں پر پھسلنے والے آنسو اور آنکھوں میں محرومی کی تحریر انہوں نے بہت جلد اصل بات بھانپ لی تھی۔

”جوشے ملی، نہیں نہیں، جس کے ذائقے سے بھی ناواقف ہو، اس کے لئے کیوں روتی ہو.....؟“

”امی..... چھوٹی امی کا بیٹا ہونے کے باوجود وہ میرا اور ستارہ کا بھائی بن سکتا تھا..... آج میرا لگا چاہتا تھا، اسے روک لوں، ہاتھ پکڑ کر یہیں بٹھا لوں..... لعلہ اُس کے سینے پر سر رکھ کر خوب رڈوں۔“

”خود کو سنبھالو! میری اور میری ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا، اچھے یا برے، حالات جیسے بھی ہوں، کبھی اردشیر سے امید مت رکھنا ورنہ بہت دکھ اٹھاؤ گی..... ایسے بچے جنہیں بچپن میں ہی حکم دینے کی عادت ڈال دی جاتی ہے، جن کی ہر خواہش پوری کرنا ایمان سمجھا جاتا ہے۔ وہ خود غرض بن جاتے ہیں، انہیں صرف اپنی ذات سے محبت ہوتی ہے، وہ اکثر انہیں بھی نقصان پہنچا دیتے ہیں جنہوں نے خود کو مشکل

انسان کے درجے پر سمجھا ہی کب جاتا تھا..... بے جان شے کی طرح گونگا بہرہ جان کر راز اُن کے سامنے اُگل دیے جاتے تھے، انہوں نے بھی ایسا ہی کیا..... اور بیگانے نے کہا.....
”آپ فکری نہ کریں سرکار، سب پتلا گلوں گی۔“

پھر آنے والے دنوں میں وہ ارد شیر اور کلثوم کی تاک میں ہی رہی تھی مگر یوں کہ انہیں ذرا سا بھی ٹپک نہ ہوا کہ جاسوسی ہو رہی ہے۔

کلثوم کی بے تابی اور ارد شیر کا بظاہر یونہی قریب سے گزرتے ہوئے آنکھوں ہی آنکھوں میں یہ جانے والا اشارہ..... بیگانے کا زمانہ شناس بھی۔ بڑے لوگوں کی حویلیوں میں کام کرتے مدتیں گزری تھیں..... سب سمجھ رہی تھی وہ، اور اس نے ابھی سے پھوپھی (کلثوم کی ماں) کو دوسری خواتین سے زیادہ اہمیت دینا شروع کر دی تھی اور کلثوم بی بی کے بھی صدقے واری ہوئی رہتی تھی۔ جانتی تھی، مالک کے دل میں آج جگہ بن گئی تو کل و دیگر ملازموں کے مقابلے میں اسے کئی مراعات حاصل ہوں گی۔

گل رخ شادی سے دو روز پہلے ہی آئی تھی..... پہلے جا کر ماں کو سلام کیا پھر بڑی ماں اور بہنوں سے ملی۔ وہ شادی میں پورے دل سے شریک ہوئی۔ ستارہ کے ساتھ کل کر مہمانوں کو اٹینڈ کرتی رہی جبکہ فاطمہ شاہ ہمیشہ کی طرح اپنے کمرے میں مقیم تھیں۔ انہیں دنیا اور دنیا داری کی کوئی پروا نہ تھی۔ لوگ ان کے بارے میں کچھ بھی کہتے رہیں، جیسے بھی قیاس کریں، ان کے لئے سب برابر تھا۔ وہ اپنی مرضی کی نیند سوتی اور اُٹھتی تھیں..... حویلی میں ان کا ہونا یا نہ ہونا کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔

”بابا جان جو انہیں یوں ڈنبا سے کٹ کر رہنا سکھا گئے ہیں..... وہ میری ماں سے کتنے لا تعلق ہیں۔ ایک بار بھی انہیں میری ماں کا خیال نہیں آیا.....“ گل کے ذہن میں بار بار یہ بات آ رہی تھی۔

شادی میں فاطمہ شاہ کے دونوں بھائی بھی شریک تھے اور گل سوچ رہی تھی..... کچھ فیصلہ ہو جانا چاہئے، رات جب وہ سونے کے لئے کمرے میں آئی تو ایک نظر ماں کے کمرے میں بھی ڈالی..... وہ ابھی تک جاگ رہی تھیں..... گل نے پردہ ہٹا کر جھانکا تو انہوں نے آواز دے ڈالی۔

”آپ ابھی تک جاگ رہی ہیں امی.....“

”ہوں..... نیند نہیں آتی..... تم آؤ بیٹھو میرے پاس.....“

اور گل نے سوچا، اگر اس وقت بات کر لی جائے تو اچھا ہے..... وہ ان کے بستر کے قریب رکھی کرسی پر بیٹھی اور کچھ دیر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد اصل مقصد کی طرف آگئی۔

”امی..... تانا جی کی جائیداد میں کچھ حصہ آپ کا بھی بنتا ہے نا.....؟“

”ہاں بنتا ہے۔“ فاطمہ نے یہ بھی نہیں پوچھا کہ تم آج یہ سوال کیوں کر رہی ہو۔ مختصر جواب دے کر ”چپ ہوئیں۔“

”یہ حصہ ملا آپ کو.....“

”نہیں بھلا بیٹیوں کو جائیداد میں کب حصہ ملا کرتا ہے۔“ وہ پرسکون تھیں۔

”آپ کے دونوں بھائیوں کو کبھی بے ماں، بہن کا خیال نہیں آیا..... انہوں نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ تمہارا سہی اسے دے دیں، مگر اب میں ضرور مانگوں گی اُن سے آپ کا حق.....“

”رہنے دو، فضول ہے اُن میں اپنے بھائیوں کی صورت دیکھنے سے بھی جاؤں گی۔“

اور اس کا یقین غلط نہیں تھا، وہ واقعی آگئی تھی اس کے پیچھے، اور جب آگئی تو پھر ارد شیر نے ہاتھ لیا اور اتنے لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر وہ بڑی کامیابی سے اپنی مرضی کی بات پر پڑے۔

اور یہ مہندی کے روز سے ایک روز پہلے کی بات تھی شاہ جی صبح آنکھ کھلنے کے بعد کمرے سے اُٹھ کر باہر آئے پھر وہ ٹہلتے ہوئے حویلی کے پچھواڑے کی طرف نکل آئے۔ یہاں پھل دار درختوں کی غنچہ اقسام کبھی انہوں نے بہت شوق سے لگوئی تھیں مگر اب تو یہ جھگھر والوں کی بے توجہی کا شکار تھا۔ ملازم خود ہی کبھی کبھار توجہ دے لیتے تھے، جس کی وجہ سے صفائی نظر آ رہی تھی مگر درخت اور ٹیلیں بہت جگہ کر ایک دوسرے سے اُلجھ رہے تھے۔

اچانک اُبھرنے والی نسوانی ہنسی سن کر اُن کے بڑھتے قدم رُک گئے مگر اب فضا میں صرف برآمد کی چکاڑھی۔ وہ رُک گئے اور کان لگا کر سننے کی کوشش کی اور ساتھ ساتھ چاروں طرف نظر بھی دوڑائی۔ اُن ہنسی کی آواز ابھری، اب صرف عورت کی ہی نہیں کسی مرد کی آواز بھی شامل تھی اور انہوں نے انگوڑی تیل کی اوٹ میں کھڑے مرد کا تھوڑا سا چہرہ دیکھ لیا تھا..... پہچاننے میں غلطی کیونکر کر سکتے تھے..... وہ یقیناً ارد شیر تھا.....

اب وہ بھی ذرا اوٹ میں ہو کر کھڑے ہو گئے کہ دیکھنا چاہتے تھے، اس کے ساتھ جوڑکی ہے..... کون ہے پھر انہوں نے کلثوم کو بھی دیکھ لیا۔

دبی دبی ہنسی اور سرگوشیاں وہ سن رہے تھے..... اور ان کی جانب سے رُخ پھیر کر کچھ سوچ رہے تھے۔ ان کی یہاں موجودگی میں ہی وہ دونوں حویلی کی طرف چلے گئے اور جشید شاہ بیٹھک میں آ گئے۔

کیا ارد شیر واقعی اس لڑکی کے لئے سنجیدہ ہے یا یہ صرف وقت گزارنے کے لئے ہو رہا ہے۔ ویسے اب ارد شیر کا گھر بس جانا چاہئے۔ اگر کلثوم اسے پسند ہے تو پھر کلثوم ہی سہی۔ اپنی ذات برادری، لڑکی ہے، اچھا ہے جو میری بہو بن کر وہی اس حویلی میں آجائے اور حویلی کی رونقیں پھر سے لوٹ آئیں۔

انہوں نے ملازم کو آواز دی۔ وہ حاضر ہوا تو کہنے لگے۔ ”زمانے میں کام کرنے والی ملازمہ بننا۔ کو فوراً بلا کر لاؤ۔“

کچھ ہی دیر کے بعد گیلے ہاتھ دوپٹے سے پونچھتی بیچان حاضر تھی۔ تمام دولت مندوں کی طرح یہاں بھی راز دوستوں اور رشتے داروں سے چھپائے جاتے۔ غیہ ملازم کو شریک کر لیا جاتا تھا کہ

حاضر ہے، ہم تمہاری اس خواہش کا ضرور احترام کریں گے۔“ چھوٹے ماموں نے پہلی مرتبہ زبان کھولی تھی۔

بچاں کی رپورٹ وہی تھی جو شاہ جی کا اندازہ تھا..... ارد شیر اور کلثوم ایک دوسرے میں دلچسپی لے رہے تھے۔ شادی کا بیگانہ سرد ہوا تو شاہ جی نے اس موضوع پر بات کرنے کے لئے ارد شیر کو بلا بھیجا۔
”جی بابا سائیں۔“ وہ سامنے کی کرسی پر آکر بیٹھ گیا..... شاہ جی نے مسکرا کر بیٹے کی جانب دیکھا اور بھر دو ٹوک بات کی۔

”شادی.....؟“ اُس نے بھنویں اُچکا کر حیرت سے اُن کی جانب دیکھا۔
”ہاں ہاں شادی..... کلثوم کے ساتھ.....“ انہوں نے اپنی طرف سے خوشخبری سنائی۔
”کلثوم کے ساتھ.....؟“ اُس نے شاید مذاق سمجھا تھا۔
”ہاں ہاں، کیوں، یقین نہیں آ رہا تمہیں.....؟“ وہ ہنس رہے تھے۔
”مگر کیوں.....؟ یہ اچانک آپ نے ایسا فیصلہ کس لئے کر لیا.....؟“ وہ کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔
شاہ جی نے بھی گامزن ہو کر دیکھا..... وہ سیدھے دو بیٹھے اور بولے۔
”یہ فیصلہ میں نے اچانک نہیں کیا بلکہ بہت سوچ بچار کے بعد اور تمہاری پسند کو مد نظر رکھتے ہوئے کیا ہے۔“

”میری پسند اور وہ منظور لڑکی..... اوہ یہ آپ نے سوچا بھی کیونکر.....؟“ اسے باپ کے کہنے پر شدید حیرت تھی۔ یہ نہیں جانتا تھا کہ جو کچھ وہ انتہائی رازداری سے کر رہا تھا، باپ کو خبر ہو چکی ہے۔ اگر وہ کلثوم کے علاوہ کسی اور لڑکی کا نام لیتے تو یوں جھٹکا نہ لگتا اسے۔
”وہ ہماری ذات برادری کی لڑکی ہے اور میں تمہیں کئی مرتبہ اس کے ساتھ بھی دیکھ چکا ہوں۔“ انہوں نے بیگانے کے بجائے اپنا نام لیا۔ ارد شیر یہ بات سن کر ٹھٹھا ضرور مگر بظاہر کوئی ٹوٹا نہیں لیا اور بولا۔
”میرا فیصلہ وہی ہے، کہہ چکا ہوں، میں نے شادی نہیں کرنی۔“

”ٹھیک ہے، ابھی مت کرو مگر بات پکی کرنے میں تو کوئی حرج نہیں۔“
”وہ جاہل منظور لڑکی، کیا دیکھ لیا آپ نے اُس میں.....؟“ صبر، برداشت اس میں کہاں تھی، اب کے بولا تو انداز بھلایا ہوا اور آواز خاصی بلند تھی۔

شاہ جی بولے کچھ نہیں..... بغور اس کی جانب دیکھا..... اُس نے رخ پھیر لیا اور باہر جانے کے لئے قدم اٹھایا۔

”ارد شیر.....“ شاہ جی کی آواز میں جو سختی آج تھی، اس سے پہلے وہ اس سے واقف نہیں تھا اس کے بیٹے قدم زک گئے۔ شاہ جی اپنی جگہ سے اُٹھے اور اس کے سامنے آکر کھڑے ہو گئے۔ وہ نظروں ہی نظروں میں جیسے اُسے قول رہے تھے..... اور ارد شیر اُن کے بولنے کا منظر بیزار سا کھڑا تھا۔

”ارد شیر کم از کم خاندان کا ہی لحاظ کر لیا ہوتا..... تم ساری عمر کے لئے تو یہاں نہیں آئے تھے جو صبر نہ ہو گا۔“ لہجہ بھی گرم نہ تھا، الفاظ بھی بہت سادہ استعمال کئے تھے..... مگر اب لہجہ اور الفاظ کے پیچھے جو ملکہ چھپا تھا۔

ہائے ری ازل سے بے گھر بے اماں، جہاں بچپن گزارا، وہ دہلیز نہیں بھولتی، ماں جائے میرے ہوں، انہیں دیکھے بنا تجھے چین نہیں پڑتا، بظاہر ہر خوشی غمی سے لاتعلقی ہو جانے والی عورت بھائیوں کو تار کرنے کا حوصلہ نہیں پاتی تھی۔

”چلو پورا حصہ نہ سہی مگر اتنا تو دیں کہ ہم چھت ڈال کر کچھ جینے کا سامان کر لیں۔“
”کل..... کیا تم یہاں رہنا نہیں چاہتیں.....؟“ فاطمہ نے ہنسی بار حیرت اور توجہ سے پوچھا تھا۔
”ہاں امی، اب میں یہاں رہنا نہیں چاہتی..... ارد شیر کے گھر، اُس کے رحم و کرم پر، یہ مجھے قبول نہیں..... آپ ماموؤں سے بات کر لیں..... اور اگر آپ ایسا نہیں کر سکتیں تو ٹھیک ہے، پھر میں فر بات کروں گی۔“

فاطمہ خاموش رہیں..... گل سونے کے لئے اپنے کمرے میں آگئی..... وہ جان گئی تھی، مایہ باز کرنے سے جھجک رہی ہے۔

”ٹھیک ہے میں خود اُن سے بات کروں گی۔“ اُس نے فیصلہ کر لیا۔
اور صبح اُس نے دونوں ماموؤں کو ماں کے کمرے میں بلا کر بات ان کے سامنے رکھ بھی دی۔
”جائیداد میں حصہ.....؟“ بڑے ماموں کی حیرت بہت زیادہ تھی جبکہ چھوٹے ماموں کے سامنے بہن کی ویران زندگی کا دکھ تھا۔

”ماموں جی..... آپ بھی دیکھ رہے ہیں..... جائیدادوں والے جلیل شاہ کے گھر فاطمہ شاہ کے پاس صرف یہ چھوٹا سا کمرہ ہے اور کچھ بھی نہیں اور اب تو عسکرانی ارد شیر کی ہونے ہی والی ہے، پھر شاید عسکرہ بھی نہ رہے، میں صرف اتنا پوچھنا چاہتی ہوں، جب بہن در بدر ہوگی، تب اُنہیں شملے والے بھائیوں کی عزت کہاں جائے گی..... مانگ تو حق رہی ہوں مگر پھر بھی منت ہے کہ ارد شیر کی عسکرانی پہلے ہمیں ایک چھت دے دیں۔“

”تم..... جائیداد کا چکر کیوں ڈالتی ہو بیٹی، ہماری اتنی بڑی حویلی ہے، تم دونوں کے لئے بہت بڑا ہے وہاں، تم ہمارے ساتھ چلو۔“

”نہیں ماما جی..... مجھے اپنی چھت چاہئے..... جیسے یہ گھر ارد شیر کا ہے، ویسے وہ گھر آپ کے بچل کا ہے..... میرے لئے تو یہاں سے جا کر بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“

”یہ صرف تمہارا خیال ہے بیٹی..... ورنہ ایسی کوئی بات نہیں، تم ہمارے ساتھ چل کر تو دیکھو..... بڑے ماموں کا انداز بیٹھا تھا مگر بات نہ کر دی۔

وہ بولی..... ”ماموں چند لاکھ ہی تو مانگ رہی ہوں..... پوری جائیداد (جو حق ہے) کا مطالبہ تو نہیں کیا مگر چند لاکھ بھی بہن سے زیادہ پیارے ہو گئے آپ کو۔“

”چھوڑ بیٹی کیوں جی جلاتی ہے..... ہمیں نہ جلیل شاہ کے آسرے کی ضرورت ہے، نہ بھائیوں کے ور کی طرف دیکھنا ہے..... بہت عزت ہے گاؤں میں..... جب فاطمہ شاہ بے گھر ہوگی تو کوئی نہ کوئی نہ کوئی اندھا بندہ گارے مٹی کی دیوار ہمارے لئے اٹھائی دے گا۔ گھاس پھوس کی چھت ڈال ہی دے گا، بحث نہ کر میرا حساب خدا لے گا۔“

”فاطمہ، میری بہن..... کیسی باتیں کرتی ہو.....؟ تم اکلوتی بہن ہو ہماری..... تمہارے لئے سب

”میں نے کہا نہیں تم سے، چلی جاؤ یہاں سے..... ایک تو بابا جان نے نوکروں کو بہت سڑھا رکھا ہے..... میں ہوں ناں یہاں پر، تو دماغ درست کر دوں سب کے..... نکل جاؤ اور خبردار جو کسی کو یہاں بھیجا..... میں لعنت بھیجتا ہوں کلثوم پر..... میرا بھلا اس سے کیا تعلق؟ تم نے بھلا یہ نام خاص طور پر کیوں لیا؟“

بیگم کی ایک عمر گزری تھی پیسے والوں کے کھیل اور رنگ ڈھنگ دیکھتے، اب تو اندر کے راز پلک جھپکنے جان جاتی تھی..... اب اس نے مزید کچھ نہیں کہا، ادب سے سر جھکا کر خاموشی سے باہر چلی گئی۔ اور ارد شیر کو حیرت کے سمندر میں غوطے کھانے کو چھوڑ گئی۔

”یہ بات پھیلی کس طرح؟“ کیونکر بابا جان اور اس ادنیٰ ملازمہ کو خبر ہوئی؟ اس کا مطلب ہے، سب جانتے ہیں..... شاید اسی لئے بابا جان پریشان ہو گئے ہیں..... ممکن ہے پھوپھی جی سے بھی اُن کی کوئی بات ہوئی ہو..... برادری نے انکسے ہو کر بابا جان پر دباؤ ڈالا ہو..... اگر ایسا ہوا ہے تو پھر واقعی بابا کے لئے یہ بات اہم تھی۔

میرے انکار نے یقیناً انہیں الجھن میں ڈالا ہوگا۔

مگر یہ تو طے ہے کہ مجھے اس لڑکی سے شادی نہیں کرنی.....

اگر برادری کی طرف سے مجھ پر کوئی دباؤ ڈالا گیا تو سب کے سامنے کھڑا ہو کر کہہ دوں گا۔

”جو لڑکی ماں باپ کی عزت کی پروا کئے بغیر ایک اشارے پر کسی نامحرم کے ساتھ چل پڑے، اُسے بیوی بنانے کا رسک مجھ جیسا شخص تو کبھی نہیں لے سکتا..... اس بات پر اگر یہ سر کھولنے پر آمرا آئیں تو بھی پروا نہیں، کمزور میں بھی نہیں ہوں، وار روک سکتا ہوں اور وار کر بھی سکتا ہوں۔“

اُس کی سوچ میں ضد ہی ضد تھی.....

اُسے آنے والے دنوں میں انتظار ہی رہا کہ بابا جان کلثوم والی بات پھر دہرائیں گے مگر شاہ جی نے اس قصے کو پھر نہیں چھیڑا۔ اصل میں بات ابھی اس حد تک نہیں پہنچی تھی جہاں تک ارد شیر نے اندازہ لگایا تھا۔ اُس کے خیال میں تو سب واقف ہو چکے تھے جبکہ حقیقت یہ تھی کہ بیگم اور بابا جان کے علاوہ کوئی کچھ نہیں جانتا تھا..... اور شاہ جی نے تو اس خیال سے یہ بات بیٹے سے کی تھی کہ بیٹا شاید برادری کی لڑکی سے کھیل نہیں کھیل رہا، وہ واقعی سنجیدہ ہے۔ اب جان گئے تھے تو بات دل سے نکال دی تھی۔

کلثوم ارد شیر کے بدلے روئے پر بہت حیران تھی۔ کئی بار آتے جاتے اُس نے ارد شیر کو متوجہ کرنا چاہا مگر بار بار وہ انجان بن گیا۔ کلثوم منتظر رہی کہ کب ایسا موقع ملے کہ وہ تنہائی میں بات کر سکے اور یہ موقع بڑی مشکل سے اس کے ہاتھ لگا۔

”کیا بات ہے ناراض ہو مجھ سے.....؟“ وہ شہر جانے کی تیاری کر رہا تھا، جب کلثوم دبے قدموں سے اس کے کمرے میں چلی آئی۔

”ناراض.....!“ اُس نے ہاتھ میں پکڑی شرٹ بیگ میں پھینکتے ہوئے حیرت سے اُس کی جانب دیکھا، پھر یہ حیرت ایک طرف کر کے سنجیدگی سے بولا.....

”بھلا ہم میں ایسی کیا بات ہوئی کہ ناراضگی کا حق استعمال کیا جاسکے۔“

”پھر مجھ سے بات کیوں نہیں کرتے.....؟ میری جانب دیکھتے بھی نہیں ہو۔“

وہ نا سمجھ نہیں تھا اور مارے شرمندگی کے سر نہیں اٹھا پار ہا تھا کہ آخر سامنے باپ تھا..... وہ اتنا بڑا کمرے سے چلے گئے۔

”کیا سمجھا ہے انہوں نے مجھے.....؟ میں ایسا گیا گزرا نہیں ہوں.....“ ہر انسان کی طرح وہ اپنی غلطی کو تسلیم کرتے ہوئے ہچکچا رہا تھا اور خود کو صحیح کہہ رہا تھا مگر باپ کے سامنے وضاحت کی بہت بڑھوتی کہ بچ توجہ تھا۔

وہ سخت طیش کے عالم میں بستر پر گرنے کے انداز میں آکر بیٹھ گیا۔

”کیوں کی بابائے یہ بات.....؟ میں نے اگر کلثوم کے لئے انکار کیا ہے تو اس میں اتنا برا مانا بھلا کون سی بات تھی..... وہ لڑکی جس کے لئے آج بابا مجھ پر ناراض ہوئے ہیں، بھلا وہ اس قابل ہے اسے بیوی کا درجہ دیا جاسکے۔

ہونہ..... ذرا سے اشارے پر پیچھے چلی آئی..... یہ تو میری شرافت ہے کہ صرف لفظوں سے وہ ہوں..... ورنہ مجھے پورا یقین ہے، وہ تو پھر بھی واپس نہ پلٹتی اگر میں..... اور بابا ایسی لڑکی کو بھولتے خواہش کر رہے ہیں۔ حیرت ہو رہی ہے مجھے اور سخت افسوس بھی.....“ مارے غصے کے اُس نے دوا تکیے اٹھا کر نیچے فرش پر پھینک دیئے۔

باپ کا کہا غلط نہیں تھا مگر چونکہ وہ اس پر کبھی ناراض نہیں ہوئے تھے تو اسے اُن کے کہے پر بہت تھا..... اور اس رنج نے جوان خون کو جوش دلا کر غصے میں تبدیل کر دیا تھا۔

کافی دیر تک وہ اپنے کمرے میں اکیلا بیٹھا رہا..... بیگم کی کام سے ادھر آئی۔ اسے یوں اس میں گم تھا بیٹھے دیکھ کر فحش اور بولی.....

”میں صدقے شاہ جی..... خیر تو ہے ناں، یہاں اس طرح اکیلے کیوں بیٹھے ہو.....؟“

”اچھا، تو پھر کیا تمہیں ساتھ بٹھاؤں.....؟“ ارد شیر کی بیزاری اور بدتمیزی عروج پر تھی مگر نوکر پیشہ کیا برامنائی، اُسی انداز میں بولی.....

اپنے سامنے کے لئے.....

”تم شاید اونچا سنتی ہو..... میں نے کہا ہے چلی جاؤ یہاں سے۔“ ارد شیر چلایا مگر بیچمن سے ڈانٹ ڈپٹ گالی گلوچ سہہ کر بڑھاپے تک آجانے والے یہ ملازم ایسی ڈانٹ کو تو مسکرا کر لبی جاتے ہیں۔

ارد شیر اب لیٹ گیا اوبازو آنکھوں پر رکھ لیا.....

بیگم نے اُس کے انداز کو بغور دیکھا..... کچھ سوچ کر معنی خیز مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر رہ گئی۔ ذرا قریب آئی اور مضار کر بولی.....

”میرا سونا..... اگر حکم کرو تو میں ابھی ابھی کلثوم بی بی کو آپ کا حال بتاؤں اور بھیج دوں آپ پاس۔“

ارد شیر کو جیسے کرنٹ لگا، یہ نام سن کر، بازو آنکھوں سے ہٹا کر وہ حیران نظروں سے بیگم کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”سوہنا..... بس حکم کی دیر ہے۔“ اب کے بیگم کھل کے مسکرائی۔

”نہیں ماما جی، بات اصول کی ہے..... جب تک کاغذات نہیں مل جاتے..... ہم ماں بیٹی اسی جہنم میں رہیں گی۔“

”نہیک ہے جیسے تمہاری مرضی..... تم شاید پڑھ رہی تھیں.....؟“ اُس کے ہاتھ میں کتاب دیکھ کر بڑے ماموں نے کہا تھا..... اور اثبات میں جواب پا کر بولے.....

”تم جاؤ، پڑھو جا کر، بس یہی بتانے کے لئے بلایا تھا۔“

وہ پھر سے برآمدے میں آئی تھی مگر اب کتاب میں دھیان نہیں تھا۔ کچھ دیر بیٹھی رہی، پھر اٹھ کر دھڑ سے اُدھر بیٹھنے لگی۔

”اچھا بڑی ماں! میں چار ہا ہوں۔“
وہ بڑی ماں کے قریب تھی جب ارد شیران کے ساتھ یہ کہتا ہوا کمرے سے باہر آیا۔
”اچھا بیٹا..... خیر سے جاؤ۔“ وہ سر پر ہاتھ رکھ کر کہہ رہی تھیں۔
”آپ آئیے گا میرے ماں شہر.....“
”شہر میں میرا جی کہاں لگے گا، تم ہی گاؤں کا چکر لگالیا کرو۔“ انہوں نے رواداری میں دونوں باتیں کرتے برآمدہ عبور کر گئے..... وہ وہیں ٹک گئی۔

راجہ..... او راجہ بیٹی..... اُنھ کر روٹی ڈال لے، عمر آنے والا ہی ہوگا.....“ زیتون تل پر بیٹھی پکڑے دھوئی تھیں..... اور ساتھ ساتھ راجہ کو بدایات جاری کر رہی تھیں۔

”اُناں..... ابھی تو بڑا نام پڑا ہے عمر کے آنے میں، میں وقت پروٹی تیار کر لوں گی۔ بس یہ قیص منوئی سی رہ گئی ہے، آج پوری ہو جائے تو کچھ پیسے ہی ہاتھ آجائیں گے۔“ زیتون نے پھر کچھ نہیں کہا پکڑے دھوئی رہیں۔

اس چچی آبادی میں جہاں یہ لوگ پچھلے چند برسوں سے مقیم تھے، کوئی بھی یہ نہیں جانتا تھا کہ راجا اور مرزا دونوں کے بیچ نہیں ہیں۔ جب طلال کی ماں کی تلاش سے مکمل مایوس ہو کر وہ اسے اپنا عمر بھرتا کر روٹ کر جانے لگی تھیں، تب چند سال بعد تقدیر نے ان کی بھانجی راجا کو بھی ان کی گود میں ڈال دیا تھا۔ ان کی بہن اور بہنوئی بس کے ایک حادثے میں ہلاک ہو گئے تھے اور راجا بچ بچ گئی تھی۔

وہ لڑکھالی سے دو برس بڑی تھی اور ویسے بھی سمجھدار بچی تھی..... زیتون کو غریبی کے شدید ترین دنوں میں بھی ان بچوں کی پرورش میں زیادہ مشکل پیش نہیں آئی..... یا شاید ان کے حوصلے ہی بہت بلند تھے، مشکل کو انہوں نے مشکل سمجھا ہی نہیں..... رابعہ کو زرا سیانی ہوئی تو ان کا ہاتھ بٹانے لگی۔

عمر تو زین کو ماں کہتا ہی تھا، وہ بھی انہیں ماں کہنے لگی..... حالانکہ رابعہ اس حقیقت سے واقف تھی کہ زین کو ان کی ماں نہیں خالہ ہیں اور عمر بھی جانتا تھا کہ رابعہ اس کی سگی بہن نہیں بلکہ خالہ کی بیٹی ہے مگر یہ سن کر بھی اُن کے درمیان آئی نہیں، لوگ تو بھائی، بہن ہی سمجھتے تھے۔

نیتون نے عمر کے لئے بڑی محنت کی تھی، خود کو مشقتوں میں ڈال کر اسے بڑھایا تھا۔ وہ تھا بھی نین اور پڑھنے کا شوق بھی رکھتا تھا..... نیتون خوش تھیں کہ اُن کی محنت رایگاں نہیں گئی اور عمر بھی تو اپنی سال کی بہت قدر کرتا تھا۔ وہ اُن کے سارے خواب جو انہوں نے عمر کے حوالے سے دیکھے تھے، پورے

174.....O.....ڈھلے چاندول کے پار

وہ اس شکایت پر ہنس پڑا..... اور عین سامنے آ کر کھڑا ہونے کے بعد بولا۔
 ”دیکھو، تم بھی چند روز کے لئے یہاں آئی تھیں اور میں بھی..... ہم دونوں کو یہ دن گزرنے کے لئے دلچسپی تو تلاش کرنی ہی تھی..... ایک دوسرے کے ساتھ اچھے دن گزر گئے ہمارے اور بس..... اب میں شہر جا رہا ہوں..... کبھی فرصت کے اوقات میں تمہیں بھی یاد کر لیا کروں گا اور اسی طرح تم بھی کبھی کبھار سوچ لینا مجھے..... اب اس سے زیادہ تو ہم کچھ نہیں کر سکتے۔“
 ”اردشیر.....“ کلثوم کی آواز پھٹ گئی۔ وہ دُکھے دل سے اسے دیکھ رہی تھی اور ہونٹ اڑھ کھینچے تھے۔

”چلو، اب آ جا اصل حالت میں، یہ تو میں بھی اچھی طرح جانتا ہوں، تمہیں مجھ سے کتنی محبت تھی۔“ وہ سن کر اڑا رہا تھا۔

”اتنی ذلت.....“ وہ ایک دم سے رونے لگی۔

”مجھے غلط سمجھاتم نے..... میں نے دل سے چاہا ہے تمہیں..... میں نے سچی محبت کی ہے..... یقین کرو..... میرا یقین کرو۔“

”اوہو..... اچھا چلو کوئی بات نہیں..... اگر آج ایسا ہے بھی تو کیا ہوا.....؟ وقت کے ساتھ ساتھ خیالات بدل جاتے ہیں..... آج اگر دل میں ہم ہیں تو کل کوئی اور بھی ہو سکتا ہے..... تم گھبراؤ نہیں۔“ اتنی سفاکی سے دی جانے والی تسلی..... کلثوم دو پٹے سے آنسو پوچھتی ہوئی باہر چلی گئی۔ وہ دوبارہ کپڑے رکھنے لگا۔

”کل بی بی..... آپ کو شاہ بی بی کمرے میں بلارہی ہیں۔“ وہ کتاب لے کر طویل برآمدے کے آخری سرے پر آنی پھنسی تھی اور ملازمہ کا بی دریں تلاش کے بعد کامیاب ہوئی تھی۔

”ای کیوں بلارہی ہیں.....؟ کوئی کام ہے مجھ سے.....؟“

”پتا نہیں گل بی بی، ویسے آپ کے دونوں ماموں بھی اُدھر ہی ہیں۔“
گل جب کمرے میں آئی تو تینوں بہن بھائیوں میں گفتگو جاری تھی۔
”آؤ بیٹی.....“ چھوٹے ماموں ہمیشہ کی طرح شفقت انداز میں بولے۔
”بلا تا تھا آپ نے مجھے.....“

”ہاں ہم تمہیں یہ بتانا چاہتے تھے کہ ہم بہت جلد بہن فاطمہ کے نام مکان لکھ رہے ہیں اور دس لاکھ روپے نقد بھی دے رہے ہیں۔“

اُس نے باری باری تینوں کی جانب دیکھا۔ ماں اس وقت بھائیوں کی مشکور دکھائی دے رہی تھی جبکہ خود اُس کا چہرہ سیاہ تھا..... کروڑوں کی جائیداد بھضم کرنے والے اگر چند لاکھ مالیت کا مکان اور کچھ نقد سے رہے تھے تو اُس جیلر احسان والا کوئی بات نہ سمجھا۔ اُس نے یہی طور پر بھی شکر و ادائیں کیں۔

”ٹھیک ہے ماموں، پھر یہ مکان اور رقم ہمیں کب تک مل جائے گی.....؟“

”یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں، تم لوگ بے شک ابھی نہروالی کوچی میں چلی جاؤ..... کاغذات بعد میں دے سکتے ہو، آخر گھر ہی کیا بات ہے۔“

جو یہ کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی تھی۔ کبیر حسن گھر نہیں تھے۔ انیس مزید بی ہاسپٹل نے کرایا تھا۔ وہ پچھلے دو روز سے ایڈمٹ تھی۔

”کیا میں نے اپنے طلال کو ہمیشہ کے لئے کھو دیا ہے۔“ آنسوؤں کے درمیان اُس نے مزید سے کہا تھا۔

”کتنی حسرت تھی.....“

دل چیر دینے والا دکھ تھا لکھے میں.....

ایک لمحے کو مزید بھی کچھ کہنے کی ہمت خود میں نہ پاسکا۔ خاموشی سے اُن کا ہاتھ اپنے زندگی کی حرارت سے بھر پور ہاتھ میں لے کر لبوں سے لگا لیا پھر کہنے لگا۔

”ایسی باتیں مت کیا کریں..... جب تک سانس ہے آس بھی سلامت دینی چاہئے۔“

کبیر حسن کا موڈ آج کل خاصا بہتر تھا..... دن میں ایک بار ہاسپٹل کا چکر ضرور لگا لیتے اور نہ بھی آتے تو جو یہ یہیں شکایت کی مجال نہ تھی۔

راخ کو البتہ بہت گلہ تھا باپ سے، وہ ماں کی وجہ سے پریشان تھی اور کبیر حسن نے کبھی بیٹی کو پاس بلا کر پیار نہیں کیا، حوصلہ نہیں دیا۔ مزید ہاسپٹل میں ہی زیادہ وقت گزارتا۔ وہ منتظر رہتی آتا تو وہ رونے لگتی۔

”کیا ہو گیا ہے میری ماما کو.....؟ وہ گھر کب آئیں گی.....؟“ اُس کے ساتھ لگ کر وہ روز بیٹی سوال کرتی۔

”وہ ٹھیک ہیں..... جلدی آجائیں گی۔“ وہ تھکا ہوا تو ہوتا تھا مگر پریشانی اس سے بڑھ کر تھی۔ جو یہ کو ہارٹ کی پرابلم تھی۔ ڈاکٹر نہیں سکون اور اطمینان کا مشورہ دیتے تھے اور یہی تو ان کے پاس نہیں تھا۔

”یہ سب پاپا کی وجہ سے ہوا ہے۔“ راخ نے غصے سے کہا۔

مزید خاموش رہا وہ سوچ رہا تھا اگر طلال نہ ملا تو کیا ہوگا.....؟ بہت صبر کیا ہے ماما نے مگر اب وہ بھر بھر بیٹی کی طرح بیٹھ رہی ہیں۔ میں کیا کروں.....؟ کہاں تلاش کروں طلال کو، پتا نہیں وہ اس شہر میں ہے بھی یا نہیں، اتنا بڑا شہر، اتنا بڑا ملک اور اس سے کہیں بڑی یہ دنیا، خدا! تو ہی کار ساز ہے۔

ہاسپٹل میں جو یہ کے پاس آیا تو اسے دیکھ کر لگتا ہی نہیں تھا کہ یہ لڑکا سارا دن کتنا پریشان رہا ہے۔ مگر اگر انہیں سلام کیا اور حال پوچھنے کے بعد بولا.....

”جلدی سے گھر آجائیں..... ایسا نہ ہو، ہم دونوں کی غیر موجودگی میں پھو پھو قبضہ جمالیں۔ دیکھیں ناں آپ یہاں، میں بھی آپ کے پاس ادھر..... اور گھر بے چاری راخ، اس کی کیا مجال کہ پھوپھو کا راستہ روک سکے۔“

”مزید بیٹا، میری وجہ سے تمہارا بہت حرج ہو رہا ہے۔“

”اے ماں، آپ سے بڑھ کر کون ہے میرے لئے.....؟ آپ ٹھیک ہو کر گھر آجائیں، پھر تیاری ہوتی رہے گی، دعا کریں اچھی سی سروس مل جائے مجھے، پھر کیا شان ہوگی میری ماں کی۔“

”تم کچھ بن جاؤ تو میں تمہارے لئے پیاری سی ڈھن تلاش کروں۔“

کرنے کے لئے بہت محنت کر رہا تھا۔

رابعہ قبضہ مکمل کر کے اٹھی اور ابھی پہلی روٹی ہی تو ہے پر ڈالی تھی کہ عمر طلال گھر آ گیا۔ رابعہ چھوٹے سے صحن کے کونے میں لگے نیم کے درخت کے نیچے کھڑی کی اور رابعہ کو دیکھ کر زور سے ہنسا بھاڑا۔

”زیادہ خوش ہونے کی ضرورت نہیں، آج میں نے ٹینڈے پکائے ہیں۔“

”ہیں..... واقعی.....؟“ ٹینڈوں کے نام پر اُس کا منہ بن گیا۔

”ہاں تو کیا جھوٹ بولوں گی میں۔“

”میری سمجھ میں نہیں آتا آخر تمہیں اور ماں کو ان ٹینڈوں سے اس قدر محبت کیوں ہے.....؟“

کتانیں چار پانی پر رکھ کر وہ منہ بنا تا رابعہ کے قریب آ گیا۔

اس لئے کہ ان کی شکل تم سے ملتی ہے۔“ اپنی بات پر وہ خود ہی ہنسی۔

”آج مجھے بڑک پر ایک فقیرنی ملی..... اس کی شکل ہو ہو تمہارے جیسی تھی۔“

”شرم نہیں آتی بہن کو فقیرنی سے ملاتے ہو۔“

”تم نے کوئی شرم کی تھی مجھے ٹینڈوں سے ملاتے ہوئے اور اوپر سے ہنس بھی رہی تھیں۔ دیے پر مشورہ ہے کم ہنسا کرو، ہنسنے ہوئے تم کچھ زیادہ اچھی نہیں لگتیں۔“

”ہاں، تم تو کہیں کے شہزادے، نوابزادے ہونا چاہیے..... ابھی جب روٹی اور سالن سامنے رکھوں گی پھر جو تمہاری شکل بنے گی، وہ بھی دیکھنے والی ہوگی۔“

”آگے عمر.....“ زیتون چھت پر کپڑے پھیلا کر نیچے آئیں اور اسے دیکھتے ہی چہرے پر روٹی آگئی۔

”اماں..... آج ٹینڈے کیوں پکائے آپ نے.....؟“

”اصل میں بیٹے مفت مل گئے تھے..... رحیمہ خالہ دے گئی تھیں، اُن کے گھر کی فصل ہے ناں۔“

”چلو..... مجال ہے جو رحیمہ خالہ کے گھر سے کوئی اچھی چیز آئے، کبھی وہ اُن کی صاحبزادی رحیمہ بی شریف لے آتی ہیں اور بھی یہ ٹینڈے.....“ اُس نے ٹھنڈی آہ بھری۔

”ہا، ہا، تم نے رحیمہ کے لئے یہ کہا..... بس آنے دو اسے، سب بتاؤں گی۔“

”میری طرف سے اجازت ہے..... ضرور بتا دیتا اسے۔“

”وہ تمہارے لئے پاگل جو ہو رہی ہے، اسی لئے زیادہ اتراتے ہو۔“

”اچھا اچھا بس.....“ وہ چولہے کے قریب سے اٹھ کھڑا ہوا۔ چار پانی پر پڑی کتابیں اٹھائیں۔

اندھر چلا گیا۔

”رابعہ..... تو ایسا کر پیاز ڈال کر بھائی کے لئے انڈہ بنا لے کیاری میں ہری مرچیں لگی ہیں، وہ بھی ڈال دینا۔“

”ہری مرچیں تو رہنے ہی دو..... اماں پہلے ہی مزاج کافی تیز ہے اس کا۔“ رابعہ کے چہرے؛

شرارت تھی اور وہ مسکرا کر کہہ رہی تھی۔ عمر نے سن تو لیا مگر بولا کچھ نہیں..... میز پر کتابیں سیٹ کرنا رہا۔

”کیا ضرورت تھی تمہیں جتانے کی.....؟“

”کیوں، جب وہ ہر بات جتا سکتی ہیں تو ہم کیوں نہیں، مہم آپ ہر کسی سے دُرتا چھوڑ دیں، میں تو کہتا ہوں، گھر جاتے ہی آستینیں چڑھالیں اور لکاریں پھوپھو کو۔“

”اُن کے سامنے میری آواز نہیں نکلی، تم لکارنے کو کہہ رہے ہو۔“

”چلیں پھر ایسا کرتے ہیں لکاروں گا میں مگر چھپ کر..... سامنے آپ ہوں گی اور میری آواز کے ساتھ ہونٹ ہلاؤں گی..... جیسے فلموں میں گانا پکچرا کر رہے ہیں۔“

”ہاں جی، بہت اچھا آئیڈیا ہے..... چلو اب جاؤ..... بہت دیر ہو گئی ہے..... ڈاکٹر صاحب بھی آنے والے ہوں گے۔“

”صاف کیوں نہیں کہتیں، یہ وقت آپ کے مجازی خدا کی آمد کا ہے۔“
اتنے میں دروازے پر ہلکی سی دستک دے کر کاشف اندر چلا آیا۔
مزید کے دوست جو یہ یہ سے ملنے ہاسٹل آتے ہی رہتے تھے اور کاشف تو اکثر ہی چکر لگا لیتا تھا۔ جو یہ اسے دیکھ کر شفقت اور اپنائیت سے مسکرائی جبکہ مزید نے منہ بنالیا..... اور کہا۔
”اچھا تھا جو آپ کا کہا مان کر پہلے ہی چلا جاتا، یہ صورت تو دیکھنے کو نہ ملتی۔“
”قدر کیا کرو نکلے لڑکے، اتنے اچھے دوست ملے ہیں تمہیں۔“
”آئی! یہ تو ہمارا ہی حوصلہ ہے جو بھرا ہے ہیں ورنہ مزید..... اسے کسی کا خیال نہیں۔“
”میری ماں کے سامنے میری برائی..... ممانہت کریں اور لگا ئیں زور کا طمانچہ اس کے منہ پر.....“
”مزید بیٹا..... تمیز سے..... آؤ کاشف ادھر بیٹھو بیٹا.....“ وہ مزید کو ڈانٹ کر پھر کاشف سے

دونوں لڑکے ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنس پڑے، پھر بولے.....
 ”ہم تو دن میں جانے کتنی مرتبہ لڑتے ہیں..... آپ گھبرا سیں نہیں، دونوں ہی برابر کے ہیں، ایک جیسے بدتمیز.....“
 پانچ دس منٹ بعد دونوں اجازت لے کر اٹھ کھڑے ہوئے اور جاتے جاتے مزید بولا.....
 ”آپ کے سہینڈ آنے والے ہیں، اب ہمیں چلنا ہی چاہئے۔“ کاشف نے اسے اپنے گھر چلنے کو کہا اور وہ بھی جھٹ مان گیا۔

”سوبا..... لگتا ہے ابو گھر آ گئے ہیں..... چلو اب تمہارا کام بن جائے گا۔“
 ”نہیں عالیہ، اچھا نہیں لگتا..... میں خود ہی چلی جاؤں گی۔“
 ”کیوں بھی، اچھا کیوں نہیں لگتا.....؟ تم آؤ میرے پاس میں کہتی ہوں ابو سے، تمہیں گھر تک ڈراپ کر دیں۔“ عالیہ اس کا ہاتھ پکڑ کر کمرے سے باہر لے آئی۔
 گیٹ سے مزید کی گاڑی داخل ہو رہی تھی۔
 ”اے یہ تو مزید بھائی ہیں، چلو اب تو کوئی پرائلم ہی نہیں۔“ عالیہ اتنا کہہ کر بھاگتی ہوئی ان دونوں کی طرف آئی۔

”کچھ بن جاؤں، مطلب یہ کہ ابھی آپ کی نظر میں کچھ بھی نہیں، کوئی حیثیت ہی میری...؟“ وہ منہ پھلا کر اس کے بیڈ پر بیٹھ گیا۔

جو یہ کہانی آگئی اور اس کے بازو پر ہلکا سا ہاتھ مار کر بولی..... ”کچھ بات اتنی بری کیوں کر کر سکتی ہیں۔“

”ہوں، لگتا ہے طبیعت ٹھیک ہے آپ کی جسمی توانی شوخ ہو رہی ہیں..... بس ماما اب آجائیں! اپنا نہیں تو میرا اور راتھ کا ہی خیال کر لیں۔“

”تم لوگوں کے لئے تو جی رہی ہوں بیٹے ورنہ اب کیا ہے.....؟“

”راکھ تو بہت ڈرپوک لڑکی ہے..... یہ ذرا سادہ ہے اُس کا آپ دیکھ ہی رہی ہیں..... یہاں سے ملنے آتی ہے، تب بھی رونے بیٹھ جاتی ہے..... میں گھر جاتا ہوں تو بھی روتی ہوئی لیتی ہے..... مہاراج نے بڑا پریشان کیا ہے مجھے۔“ مزید چاہ رہا تھا..... جو یہ طلال کے علاوہ بھی کچھ سوچے، راکھ مزید کا خیال کرے اور ہمت سے کام لے۔

”ہاں، وہ بالکل مجھ پر گئی ہے، بہت چھوٹا دل ہے، جلدی حوصلہ ہار دیتی ہے۔ رونے لگتی ہے۔ ہمیشہ اُس کا خیال رکھنا۔“

”میں تو اس کا خیال رکھوں گا ہی مگر یہ تو بتائیں، میرا خیال کون رکھے گا۔ خود تو ساری ذمہ داریاں
سے بچھا چھڑا کر بیڈ سنجال لیا ہے آپ نے۔“
جو یہ مسکرا دی اور بولی..... ”فکر نہ کرو، خیال کرنے والی بھی آجائے گی۔“
”یاد آیا، دادی آپ کا پوچھ رہی تھیں، کہہ رہی تھیں ہر نماز میں باقاعدگی سے آپ کے لئے دعا کرتی
ہوں۔“

”اللہ انہیں اجر دے..... بڑی نیک بہت اچھی خاتون ہیں۔“
 ”ہاں مگر میری لڑائی ہوگئی اُن سے۔“
 ”کیا..... اتنی بزرگ خاتون سے لڑائی ہوگئی..... شرم کرو مزید۔“ اس کی بات پر وہ ہنس پڑا اور بولا.....
 ”میں نے بس اتنا ہی کہا تھا، بحث تو آپ کی ٹھیک ٹھاک ہے، آپ مہم کو دیکھنے جانا ہے۔
 چاہئیں، بس پھر کیا تھا وہ سنائیں مجھے کہ میرے بچاؤ کے لئے پھوپھو کو آنا پڑا۔“
 ”تم نے غلط بات کیوں کی.....؟“

”اوہو..... آپ کیوں شرمندہ ہو رہی ہیں.....؟ ہمارا تو آپس میں یہ چل رہا ہے اور جب ناراض ہو جاتا ہوں تو پھر آوازیں دینے لگتی ہیں، مجھ سے ناراض نہیں رہ سکتیں۔“

”تم ان کے پیار کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہو، بری بات ہے۔“

”وہ بھی تو اپنی بہو اور پوتے پوتیوں کا غصہ مجھ پر نکالتی ہیں اور ہاں ماما پھوپھو بھی آپ کا حال! رہی تھیں۔“

”بہت مہربانی اُن کی.....“ جویریہ کا لہجہ بے تاثر تھا۔
 ”میں نے بھی کہہ دیا، ہاسپٹل اتنا دور تو نہیں.....“

”میرا مطلب ہے ٹیلنڈ لڑکیوں کو، پتا ہے سوہا اُس روز جب میں نے آپ کو دیکھا اور آپ پر بغیر کوئی آتا پتا بتائے چھلاوے کی طرح غائب ہو گئیں تو مجھے بہت افسوس ہوا اپنی حماقت پر اور یہی سوچتا رہا اب دوبارہ ملاقات کیسے ہوگی؟ مگر دیکھ لیں، نیک بندوں کی خدا مدد کرتا ہے۔“ وہ قریب تھی، مزید خوش تھا، بہت خوش۔

”کیوں؟ کوئی کام تھا آپ کو مجھ سے؟“ سوہا کا انداز اب بھی سنجیدگی لئے ہوئے تھا۔

”اچھا۔۔۔ آپ اپنے دوستوں کو بس اُسی وقت یاد کرتی ہیں، جب کام ہوتا ہے۔“

”نہیں، میں نے تو یونہی پوچھ لیا تھا۔“

”اوہو۔۔۔ یہ میں نے کیا آپ جناب لگا رکھی ہے۔ آخر ہم پرانے واقف کار ہیں۔ ہمیں یہ

تلف سوٹ نہیں کرتا۔ ہاں اب یہ بتاؤ تمہارا گھر کہاں ہے؟“

”ساتھ ساتھ بتاتی جاؤں گی۔“ مزید کے یوں اچانک تم پر آجانے کا اُس نے برا نہیں مانا۔

”کتنے بہن بھائی ہیں تمہارے؟“ مزید ہی سوال کر رہا تھا۔

”بس میں اکیلی ہی ہوں۔“

”پھر تو خوب مزے ہوں گے، لاڈ ہی لاڈ۔“

”نہیں۔۔۔ میں تو اس کی کو بہت محسوس کرتی ہوں، بہن بھائی بہت بڑا سہارا ہوتے ہیں۔ باقی

جہاں تک لاڈ پیار کی بات ہے تو امی ابا ہیں نہیں، اپنی آنٹی کے پاس رہتی ہوں۔ وہ بے چاری بیمار ہیں، زیادہ چل پھر بھی نہیں سکتیں۔ ہر جگہ مجھے ہی بھاگ دوڑ کرنا پڑتی ہے۔“

”سوہا۔۔۔ زندگی اسی کا نام ہے۔ ہر کسی کے ساتھ کوئی نہ کوئی مسئلہ لگا ہوا ہے۔ بہر حال کوئی بھی

براہم ہو، تم مجھ سے کہہ سکتی ہو۔ ہمیشہ مجھے مفصل دوست باؤ گی۔“

”شکر یہ مزید صاحب۔۔۔“ اُس نے دوستی کی آفر قبول کر لی، پھر بولی۔

”اپنے بارے میں بھی تو کچھ بتائیں۔“

”ہائے۔۔۔ کہاں تک سونگی، کہاں تک سناؤں۔۔۔ کہنے کو تو مختصر فیملی ہے ہماری، مگر مسائل بڑے

گیر ہیں۔۔۔ چھو بھو بیگم کا مسئلہ۔۔۔ ان کی صاحبزادیوں کا مسئلہ۔۔۔ اُن کی ساس کا مسئلہ۔۔۔“

”کیا ہوا ہے اُن لوگوں کے ساتھ۔“ سوہا نے ہمدردی سے پوچھا۔

”شاید ان کا سب سے بڑا مسئلہ میں ہی ہوں، ہر وقت مجھے پکار رہی رہتی ہیں۔“

”اور آپ کی امی، ابو، بھائی، بہن بھی تو ہوں گے۔“

”ہاں ایک والد ہیں نہایت سخت گیر قسم کے، ایک والدہ بہت پیاری بہت اچھی اور ایک بہن ہے نہایت بے وقوف قسم کی۔“

اردو شیر کو یقین تھا اچھی جو گاڑی کچھ دیر اس کی گاڑی کے پیچھے رہنے کے بعد قریب سے گزر کر بائیں طرف کوڑھی ہے، اس میں فرنٹ سیٹ پر بیٹھی ہنس ہنس کر لڑکے سے بائیں کرنے والی لڑکی سوہا کے علاوہ کوئی اور نہیں تھی۔

”مجھے دیکھ کر تو کوئی رسپانس نہیں دیا۔ تعارف کے باوجود غرور سے گردن اکڑا کر بیٹھی رہی تھی۔ یہ اُن کا کون تھا اس کے ساتھ؟ بھائی تو اس کا کوئی ہے نہیں۔۔۔ ورنہ سروس کے لئے پریشانی کے عالم میں

”کیا ہوا، کہیں آگ لگ گئی ہے کیا؟“ کاشف نے سہم کر بہن کو دیکھا۔

”مزید بھائی، آپ سے کام ہے مجھے۔“ کاشف کو نظر انداز کر کے وہ اس سے کہنے لگی۔

”کام کی نوعیت بتاتی جائے۔“

”وہ میری ایک دوست ہے بے چاری۔“

”بس بس لفظ بے چاری نے سب کچھ سمجھا دیا ہے۔۔۔ اب تم کہو گی کہ میں اس بے چاری سے شادی کر لوں اور منوں کے حساب سے ثواب حاصل کروں مگر میری طرف سے۔۔۔“

”اوہو۔۔۔ مزید بھائی پوری بات تو سن لیا کریں، وہ میری طرف آئی ہوئی ہے، گھر واپس جا چاہ رہی ہے، ڈراپ کرویں اُسے۔“

”اچھا تو یوں کہیں ناں، ایک تو عالیہ تمہیں پوری بات نہ کرنے کی بڑی خراب عادت ہے۔ اب اگر وہ سن لیتی تو کیا رائے قائم کرتی میرے بارے میں۔“

”ہاں بھئی عالیہ، یہ تمہاری بڑی غلط عادت ہے۔“ کاشف نے بھی دوست کا ساتھ دیا۔ اتنے میں سوہا بھی چلی آئی۔۔۔ اور مزید، کاشف کی بات کے جواب میں کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

سوہا نے اُس کی طرف دیکھا، شناسائی کی چمک اس کے چہرے پر لہرا گئی۔۔۔ اور مسکرا کر سر کے اشارے سے سلام کیا۔

”شکر ہے، آپ نے پہچانا تو۔۔۔ میں تو یہ سمجھا تھا کہ آپ بھول گئی ہوں گی اور آپ کو یاد دلانے پر بھی یاد نہیں آؤں گا۔“

”ارے، آپ دونوں ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔“ عالیہ چمک کر بولی۔

”جی ہاں۔۔۔ پچھلے جنم میں طوطا بنا ہوا کرتے تھے۔۔۔ ایک ہی ڈالی پر گھر تھا ہمارا۔“ مزید نے بھی عالیہ کے انداز میں جواب دیا۔

”ہم دونوں ایک ہی اسکول میں پڑھا کرتے تھے۔“ بات لمبی ہونے سے پہلے سوہا نے بڑی سنجیدگی سے بتا دیا۔

”اور یہ بھی تو بتائیں نا کہ ہم دونوں کی فریڈ مشٹر کتھی۔“

”جی، یہ بھی درست ہے۔“ اب کے سوہا مسکرا دی۔

”چلے پھر میری سفارش کی تو ضرورت ہی نہیں سوہا، تم خود ہی کہہ دو مزید بھائی سے۔“

”کہنے کی کیا ضرورت ہے، آئیے میں آپ کو ڈراپ کر دیتا ہوں۔“

اور سوہا کی سا انکار بھی نہ کر سکی۔

”اور سنائیں کیا کرتی ہیں آج کل آپ؟“ گیٹ سے گاڑی نکالتے ہی اُس نے گفتگو کا آغاز کیا۔

”سروس کرنا چاہا رہی ہوں۔۔۔“ سوہا نے پہلی ہی ملاقات میں ڈکھڑے رونا مناسب نہیں سمجھا اور بڑے نارل سے انداز میں کہا۔

”اچھی بات ہے۔۔۔ آپ جیسی لڑکیوں کو کچھ نہ کچھ کرتے رہنا چاہئے۔“

”یہ مجھ جیسی بے کیا مراد ہے۔۔۔؟“

جب تک یہاں پر جمید شاہ صاحب کی حکومت تھی، ہم یہاں رُکے رہے، وقت جیسے بھی گزرا، ہم نے غاموشی سے گزرا لیا مگر اب یہاں ارد شیر کی حکومت ہوگی اور اس کی رعایا بننا مجھے کسی طور گوار نہیں۔
مجل نے مضبوط لہجے میں کہا۔

”اوہو گل! تم تو خواہ مخواہ جذباتی ہو رہی ہو..... میں تو یہ چاہ رہی تھی کہ تم ہاں کو بھی سمجھاؤ..... میری بات ہوئی تھی ارد شیر سے..... اُس کا تو گاؤں آکر رہنے کا کوئی ارادہ ہی نہیں..... وہ شہر میں ہی رہے گا اور اس گاؤں والی حویلی پر کھرنائی تو تمہاری ہوگی۔“

”چھوڑیں بڑی ماں..... وہ گاؤں میں نہ بھی رہے تو بھی ہمارے لئے یہاں رہنا آسان نہیں ہوگا۔ آپ کا تو لاڈ لایا ہے مگر ہمارے لئے اُس کی آنکھوں میں جو حقارت ہے، وہ میری برداشت سے باہر ہے۔ بہتر یہی ہے ہم ابھی چلے جائیں۔“

”گل..... میرا کام تھا سمجھانا، باقی تمہاری مرضی..... مگر یہ ضرور کہوں گی، تم غلط کر رہی ہو..... صرف ایک گھر لے لینے سے تمام مسائل حل نہیں ہو جائیں گے..... زندگی کی گاڑی کے لئے پیسہ بہت ضروری ہے۔“ کبریٰ نے اسے پریشانوں سے آگاہ کرنا چاہا۔

”مجھے ذنناداری نہیں کرنی..... صرف دو وقت کی روٹی اور تن کے لئے کپڑا چاہئے اور بہتر سے مرید ہیں میرے۔“ فاطمہ کا چہرہ اور آواز آج بھی ہر تاثر سے خالی تھی۔

”جن لوگوں کو ساری عمر دیتی آئی ہو، اب اُن سے لوگی؟ گل یہ کیا سبق دے رہی ہو تم ماں کو.....؟“ فاطمہ سے بات کرتے کرتے وہ گل رخ کی طرف پلٹیں۔

”یہ بات نہیں، بڑی ماں! میں تو اُن لوگوں سے کچھ لینے کا سوچ بھی نہیں سکتی..... میں نے ماموں سے مکان کے ساتھ دس لاکھ روپے کی رقم بھی مانگی ہے۔“

”صرف دس لاکھ..... گل رخ، تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔“

”بس بڑی ماں، یہ میرا فیصلہ ہے.....“ گل اب ڈری سہی پچی نہ تھی..... اُس نے بچپن محرومیوں میں گزارا اور اب کالج اور پھر یونیورسٹی میں ساتھیوں سے تعریف سیمٹی اور اس تعریف نے اسے اعتماد دیا تھا۔ وہ محسوس کرنے لگی تھی کہ اس میں اتنا اطمینان ہے کہ وہ حالات کو اپنی مرضی کے تابع کر سکتی ہے اور وہ الٹا اس وقت کو آزمانا چاہتی تھی۔

البتہ بات کا رد کیا جانا کبریٰ خانم کو بھی اچھا نہیں لگا تھا..... وہ توری جڑھا کر واپس پلٹ آئیں۔ آج گل نے کسی لحاظ کے بغیر ان کی بات کاٹی تھی، انکار کیا تھا..... شاید تعلیم دلا کر میں نے اچھا نہیں کیا مگر نہیں، مجھے یوں نہیں سوچنا چاہئے..... انہوں نے اپنے ذہن کو خشنوار کھنے کی کوشش کی۔

”بڑی بی بی..... شاہ بی بی کدھر جا رہی ہیں؟“ ملازمہ نے آکر پوچھا تو انہوں نے ڈانٹ کر ہٹا دیا۔

”اچھا بڑی ماں، ہم جا رہے ہیں.....“ کچھ دیر بعد گل رخ اُن کے قریب کھڑی تھی۔

”خدا حافظ.....“ کبریٰ نے اس کی جانب دیکھے بغیر کہا۔

”آپ شاید ناراض ہیں مجھ سے؟“ وہ کرسی کے قریب فرش پر بیٹھ گئی۔

”نہیں..... میں کتنی سے ناراض نہیں ہوں..... تم سب اپنی مرضی کی مالک ہو، اچھا برا جو بھی ہوگا،

ماری نہ پھرتی۔“

ساتھ میں اگر ملک سر فرزند نہ ہوتا تو ارد شیر ضرور گاڑی پیچھے ڈال دیتا مگر اب وہ ایسا نہیں کر سکا۔ آکر بھی اُس کے ذہن پر سو باسواریں..... خاص ملازم اور شاہ کو بلا کر کہا.....

”جتنی جلدی ممکن ہو گا کارہ یا حسین بیگم کے گھر کا پتا معلوم کرو، میں ملنا چاہتا ہوں، اُس سے۔“

”یہ تو کوئی مشکل بات ہی نہیں..... ایسی عورتوں کے گھر کا پتا تو بڑی آسانی سے مل جاتا ہے۔ وفادار ملازم نے مؤدبانہ کہا۔

”ٹھیک ہے پھر میں منتظر ہوں.....“ وہ بیڈروم میں چلا گیا۔ ذہن پر اب بھن طاری تھی۔

”ایسی کی تپسی.....“ میز پر رکھا شیشے کا گلاس غصے کے عالم میں فرش پر دے مارا..... اسے سہا

اُس روز والا انداز نہیں بھول رہا تھا۔

”بجھتی کیا ہے خود کو..... میں چاہوں تو ماں بیٹی دونوں کو خرید لوں..... اور اب تو میں ایسا ہی کروں گا۔“

اس فیصلے پر پہنچ کر بھی وہ پرسکون نہیں ہوا..... جی چاہتا تھا ابھی سو باسائے آجائے اور وہ اسے تا

دے کے گلوکارہ کی بیٹی کی اوقات کیا ہوتی ہے۔

”ہماری نظر کرم کی منتظر ہمیں ہی غرہ دکھا رہی ہے..... اور وہ ساتھ کون تھا..... دیکھ لوں گا اے

بھی۔“ ارد شیر کمرے میں ادھر سے ادھر گھل رہا تھا۔

فاطمہ اور گل رخ حویلی سے جانے کی تیاریوں میں تھیں۔ کبریٰ خانم کو ملازم کے ذریعے پتا چلا،

حیران سی فاطمہ کے پاس آئیں۔

”تم یہاں سے جا رہی ہو فاطمہ.....؟“

”جی آپا.....“ جواب مختصر تھا اور لہجہ سپاٹ.....

”کیوں جا رہی ہو، یہ گھر تم لوگوں کا ہے اور بھلا کوئی اپنے گھر کو بھی چھوڑتا ہے، گل تم ہی سمجھاؤ اپنی

ماں کو، پتا نہیں کیوں یہ ہر جڈے سے عاری ہو چکی ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے پتھر کی رسل کی طرح لگتی ہے۔ تم

بتاؤ اے یہ یہ گھر اس کا بھی ہے..... اور سب سے بڑھ کر تو یہ کہ گل! تم اس گھر کی بیٹی ہو، عزت ہو اس حویلی

کی.....“

”بیٹی.....!“ وہ استہزاء سے انداز میں ہنسی پھر بولی..... ”بڑی ماں! کبھی اس گھر نے مجھے بیٹی سمجھا

بھی ہے۔“ اس کے لہجے میں ڈھک بول رہے تھے۔

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے.....؟ جو حقیقت ہے وہ تو ہے، اسے کوئی نہیں جھٹا سکتا۔“

”جب میرے باپ نے مجھے پیار نہیں دیا، کبھی میری ضرورتوں کے بارے میں نہیں پوچھا تو پھر

میں بھی یہاں سے کچھ نہیں لوں گی۔ میں انہیں بتا دوں گی کہ ان کی مہربانیوں کے بغیر میری زندگی اچھے

طریقے سے گزرا سکتی ہوں۔“

”ادھو..... گل! میرا تو خیال تھا تم ماں کو سمجھاؤ گی مگر تم بھی.....“

”ہاں بڑی ماں، میں بھی..... بلکہ اصل بات تو یہ ہے کہ ماں سے بھی یہ فیصلہ میں نے ہی کر لیا۔“

خود ہی بچتی گی۔“

”پلیز بڑی ماں! اس لمحے میں تو آپ بات مت کریں مجھ سے۔ یقین کریں میرے لئے اس دنیا میں اگر کوئی آسرا ہے تو وہ آپ کی ذات ہے۔ جب بھی کسی طوفان میں گھر جاؤں گی، آپ ہیکاروں کی۔ آپ کی مدد چاہوں گی۔ آپ نے ہمیشہ مجھے شیریں اور ستارہ باجی کی طرح سمجھا ہے۔ مجھے تعلیم دلائی ہے۔ پھر اب کیوں ناراض ہو رہی ہیں مجھ سے؟“

”اس لئے کہ آج بیٹی نے ماں سے بد نیزی کی ہے۔“

”بڑی ماں! مجھے معاف کر دیں۔ شاید اپنی ماں والی تلخی مجھ میں بھی آگئی ہے۔ تنہائی کا زہر ہر تیز ہوتا ہے۔ بڑے بڑوں کو مار دیتا ہے۔ میں تو بہت کمزوری لڑکی ہوں۔“

”کل رُخ۔ کبریٰ نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھا کہ وہ تو یہ بھی نہیں کہ اب یہ لڑکی بہت مضبوط ہو چکی ہے۔ بڑا اعتماد ہے اس میں۔“

”کل رُخ! تنہا کیوں بھتی ہو خود کو بیٹا۔؟“ ساری تلخی بھلا کر انہوں نے اُس کا چہرہ ہاتھوں میں لے لیا۔

”بچپن کے خوف اور کامپلیکس کبھی کبھی ساری عمر ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔“

”نہیں بیٹا۔ تم خود کو اکیلا مت سمجھو۔ ٹھیک ہے اگر یہاں سے جانے میں ہی اپنی بہتری سمجھتی ہو تو جاؤ لیکن جب بھی بڑی ماں کو پکارو گی، مجھے اپنے قریب محسوس کرو گی۔ تم میری بیٹی ہو، چھوٹی بیٹی اور چھوٹے بہت لاڈلے ہوتے ہیں۔“ انہوں نے گل کی پیشانی چوم لی۔

کچھ ہی دیر بعد گل رُخ اور فاطمہ شاہ چلی گئیں۔ آج پھر حویلی میں وہ اکیلی تھیں۔ اس حویلی کا مالک کتنے برس کے بعد آج پھر یہاں کوئی شراکت دار نہیں تھا۔

”شاہ جی! تم مجھ پر فاطمہ شاہ کو لائے، پھر راحت بیگم کو لائے مگر آؤ اور آکر دیکھ لو، آج میرے علاوہ یہاں کوئی بھی نہیں۔ کوئی شاہ بی بی نہیں، کہیں بھی چھوٹی بی بی کی آواز نہیں۔ یہاں صرف میں ہوں، میں بڑی بی بی، کبریٰ خاتون۔ یہاں پر میری آواز ہے، میرے قدموں کی چاپ ہے۔“

وہ ایک کیفیت کا شکار بے مقصد ہی ساری حویلی میں گھومتی رہیں۔ گزرے وقت کو یاد کرنی نہیں، کبھی آنکھ بھراتی اور کبھی لبوں پر طنز یہ مسکراہٹ رہنک جاتی۔ وہ حویلی میں پھرتی رہیں یہاں تک کہ تھک گئیں۔

اس شام شاہ جی شہر سے گاؤں آئے۔ قیام بڑی حویلی میں ہی کیا۔ کبریٰ سے ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے، کھانا بھی پیئیں، فاطمہ اور گل بھی حویلی آکر کمرے تک ہی محدود رہتی تھیں، کبھی شاہ جی کے سامنے ہی نہیں آئیں کہ وہ اُن کی کمی کو محسوس کرتے، اُن کے بارے میں پوچھتے اور کبریٰ نے خود بھی نہیں بتایا، سو چالازم بتا دیں گے۔ انہوں نے پوچھا نہیں، میں بھی نہیں بتاؤں گی۔

کچھ ہی دیر بعد ملازم نے کسی کی آمد کی اطلاع دی۔ وہ اٹھ کر بیٹھک میں چلے گئے۔ اور کبریٰ سوچنے لگیں، جب انہیں فاطمہ کو حویلی پر پھرتی دیکھ کر چلے جانے کی خبر ہوگی تو کیا روئے ہوگا ان کا۔ بے شک سالوں خبر نہیں لی۔ مگر ہے تو بیوی باندہ کی غیرت پر چوٹ پڑے گی اس کے یوں چلے جانے پر۔

ارد شیر نے ارشاد سے کہا تھا کہ جلد یا بسین بیگم کے گھر کا پتا معلوم کرے۔ اور مالک کے موڈ سے ارشاد خوب واقف تھا، سو بحث گیا اس کام میں اور زیادہ دن نہیں گزرے تھے، اُس نے پتا لگایا اور فوراً ارد شیر کے پاس چلا آیا۔

وہ بھی اسی وقت وہاں جانے کے لئے تیار ہو گیا اور ارشاد کو بھی ساتھ چلے کو کہا۔

”آپ فون کر لیں۔ پتا نہیں وہ گھر ہوں گی یا نہیں۔“ ارشاد نے اُس کے خوشگوار موڈ کو دیکھ کر مشورہ دیا جسے اُس نے رد کر دیا کہ وہ خود اس کے گھر جانا چاہتا تھا، یہ دیکھنے کے لئے کہ اب وہ کن تیوروں کے ساتھ ملتی ہے۔

”اگر محترمہ نے میز سے لے لیا ہے لہجہ میں بات کی تو لحاظ نہیں چلے گا۔ دو منٹ میں اوقات یاد لا دوں گا۔ ہونہ! آواز کا جاو دو جگا کر ہماری خوشی کی محفلوں میں گا بجا کر پیٹ کا دوزخ بھرتے ہیں اور خیرے بھی ہمارے ساتھ۔ ہمارا دیا کھانے والے ہم پر آنکھیں نکالتے ہیں، فنکار کہلانے والے یہ نکلے نکلے کے لوگ پھر عزت مانگتے ہیں۔ کیسی عزت، کس عزت کی بات کرتے ہیں، عزت کے مفہوم سے بھی واقف ہیں۔“ اُس نے نفرت سے ہنکارا بھرا۔

اُس نے فیصلہ کر لیا، وہ سو با کی طرف بظاہر گلوکارہ یا بسین بیگم سے ملنے کے بہانے جائے گا۔ یا بسین بیگم کو اپنے ہاں ہونے والے ایک فنکشن میں بلانے کی بات کرے گا۔ اور معاملہ طے کر کے ہی اٹھے گا۔

سو با خوبصورت لڑکی تھی مگر حسن کی اس دنیا میں کمی تو نہیں۔ خود اس کے حلقہ احباب میں بھی طرح طرح کی باتیں موجود تھیں۔ ان میں بھی کچھ چونکا دینے والے حسن کی مالک تھیں۔ مگر اسے سو با کا حسن نہیں اس کا رخ اس کا غرور یا درہ گیا تھا۔

اُس نے آذری طرف ہی دھیان رکھا تھا۔ اس کی جانب توجہ نہیں دی تھی۔ جب ارد شیر نے اُس کی جانب دیکھا تو اس نے منہ پھیر لیا تھا۔ بس اس بات نے اسے غصہ اور ضد دلا دی تھی جو اسے ایک لڑکے کے ساتھ دیکھ کر اور بھڑک اٹھی تھی۔

بڑی تیاری کے ساتھ وہ باہر آیا۔ ڈرائیور سے گاڑی نکالنے کو کہا اور ارشاد کو ساتھ لے لیا جو اُس کے پروگرام سے واقف نہ ہونے کے باوجود پرسکون تھا۔

یا بسین بیگم کا گھر اُن کے علاقے سے خاصا دُور تھا اور آبادی بھی اب گنجان ہونے لگی تھی۔ وہ ایک پرانی طرز کی عمارت تھی۔ کم رقبہ پر مگر خوبصورت طرز تعمیر کا ایک نمونہ تھی۔

ارشاد نے دُور ہی سے دیکھ کر کہا۔

”صاحب! یہی گھر ہے یا بسین بیگم کا۔“



”؟“
اردشیر کے چہرے پر جھلاہٹ اور ناکامی کے رنگوں سے اس نے پریشانی اخذ کر کے پوچھا۔ جواب میں اس نے آنکھیں نکال کر اسے گھورا اور تلخ لہجے میں بولا۔
”اس طرح کی عورتوں کا ہم سے کیا تعلق.....؟“
”وہ بہت اچھی تھیں جی، لگتا ہی نہیں تھا گلوکارہ ہیں.....“
”اچھا اچھا..... ٹھیک ہے۔“ اردشیر بے نیازی سے کہتا ہوا گاڑی میں آ بیٹھا..... ارشاد نے بھی اس کی تہنید کی۔
”معاف کر دیں صاحب، وعدہ کرتا ہوں زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑے گا آپ کو، میں ڈھونڈ نکالوں گا اس کو۔“

”تم دونوں مین روڈ پر اتر جانا، مجھے کہیں جانا ہے۔“ اردشیر نے ارشاد کی بات نظر انداز کر کے اتار دی کہا۔
گاڑی لے کر وہ میڈم فیروزہ سے ملنے اُن کے کالج چلا آیا تھا۔ ابھی چند روز پہلے ہی انہوں نے ایک ملاقات میں بتایا تھا کہ ان کا ایک گرلز کالج میں پرنسپل کی حیثیت سے تبادلہ ہو گیا ہے، ”بڑا نام ہے اس کالج کا، تم آؤ ناں کسی روز۔“

”کیوں نام بدنام کرنا ہے اس کالج کا.....“ وہ ہنس پڑا تھا۔
”نہیں نہیں بھئی، ایسا ظلم مت کرنا شرفاء کی بچیاں پڑھتی ہیں..... میں تو صرف وزٹ کے لئے بہہ رہی تھی۔“

میڈم فیروزہ اچھی خاصی عمر کی تھیں مگر انداز کچھ اور تھے..... بڑی دوستی چلی آ رہی تھی ان کی اردشیر سے۔ آج بھی وہ یہی سوچ کر ان کے پاس جا رہا تھا کہ باتیں اچھی کرتی ہیں، دھیان بٹ جائے گا۔ اُسے یاد تھا، اُس نے کہا تھا..... ”اب اس بہت بڑے کالج کی پرنسپل تم ہو۔ صورت حال خاصی دلچسپ ہوگی۔“
”اوہ نہیں بھئی، جہاں پر یہ کالج ہے، اس سے قریبی علاقے میں اپرٹل کلاس آباد ہے اور تم جانو ان کی لڑکیاں سادہ اور کھٹی کھٹی سی ہوتی ہیں۔ میں بھی وہاں ایک بالکل بدلی ہوئی میڈم فیروزہ دکھائی دیتی ہوں۔“

”اوہ..... تمہارا وہ روپ بھی چونکا دینے والا ہو گا ہر روپ کی طرح۔“ وہ ہنس کر بولا تھا۔
گیٹ پر کھڑے چوکیدار کو اپنا کارڈ دے کر میڈم فیروزہ کو اطلاع کروائی۔ چوکیدار بہت جلدی واپس آ گیا تھا اور گیٹ کھول کر گاڑی اندر لانے کو موند بانہ گزارش کی تھی جسے اردشیر نے قبول کر لیا۔
”یہ کون حضرت تشریف لا رہے ہیں.....“ رانچہ کی دوست فائزہ کتاب بیگ میں رکھتے ہوئے ہاتھ روک کر گاڑی دیکھنے لگی..... اور رانچہ نے بھی ادھر دیکھا۔

”واہ..... کیا پرنسپلٹی ہے.....“ فائزہ نے فوراً ہی کہہ دیا جبکہ رانچہ نے دل کی دل میں ہی رکھی۔
”شاید کسی لڑکی کا بھائی یا کزن ہے..... مگر ایسی حسین لڑکی کون ہے ہمارے کالج میں سوائے تمہارے.....؟“

”نہیں کیا، کوئی بھی ہو.....“ رانچہ نے دھیرے سے کہا مگر باوجود دوشل کے وہ نگاہ کا ز۔۔۔

ارشاد نے دُور ہی سے اشارہ کیا کہ یہی گھر ہے یا سیمین بیگم کا اور اردشیر کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔ ڈرائیور کو اشارے سے بتایا کہ ادھر گاڑی روکنا ہے۔

”یہ لوگ تو شاید گھر پر ہی نہیں.....“ اردشیر نے بے قراری سے کہا..... گیٹ پر پڑا بڑا سا تالا اُن کا منہ چڑھا رہا تھا۔

”صاحب..... تالا تو کل بھی تھا..... میں یہی سمجھا کہ کچھ دیر کے لئے گئی ہوں گی کہیں۔“ اردشیر کا مجڑوا ہوا موڈ دیکھ کر ارشاد نے ڈرتے ڈرتے اطلاع دی۔

”کیا کل بھی تالا تھا.....؟“ اُس نے ایک ہاتھ اپنے دوسرے ہاتھ پر مارا، پھر بولا۔
”اُتر دو..... کسی سے پتا کرو۔“

اُس نے جھٹ حکم کی تعمیل کی اور قریب گزرتے ایک لڑکے کو روک کر یا سیمین بیگم کے بارے میں پوچھا.....

”وہ تو جی یہ مکان چھوڑ کر جا چکی ہیں۔“

”کیا کہا، جا چکی ہیں.....؟“ اردشیر دروازہ کھول کر نیچے اترتے ہوئے تیزی سے بولا۔ لڑکے نے اس کی جانب دیکھا اور بولا.....

”کرنا یہ زیادہ تھا، وہ دے نہیں سکی تھیں، بس چلی گئیں۔“

”کب گئیں.....؟ کتنے دن ہو گئے.....؟“ اردشیر نے پھر سوال کیا۔

”ایک مہینہ تو ہو ہی گیا ہے، شاید اس سے کچھ زیادہ..... ٹھیک سے کچھ نہیں کہہ سکتا.....“ لڑکا اردشیر سے خاصا مرعوب ہو کر ادب سے کہہ رہا تھا۔

”اور تم اس گھر کا ایڈریس لے کر آ گئے ہو، واہ! کیا عقل پائی ہے تم نے۔“ وہ طنز اور غصے سے ارشاد سے مخاطب تھا۔

”سرکام میں تو ریڈیو والوں سے پتا کیا تھا اور انہوں نے ہی ایڈریس دیا تھا مجھے۔“ صاحب کے تیور دیکھ کر وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔

”کیا تم کچھ مدد کر سکتے ہو ہماری.....؟“ ابھی تک یہیں موجود لڑکے کی طرف دیکھ کر اُس نے پوچھا۔

”نہیں جی ہمیں کیا پتا وہ تو کسی سے زیادہ ملتی ملاتی بھی نہیں تھیں۔ آپ کیا رشتے دار ہیں اُن

نہیں ختی بھتی چلوں سے دیکھتی رہی۔

”ہے ناں شاندار...“ فائز شوخ ہوئی۔

”نہیں، آؤ چلیں...“ راکھ نے اس خیال سے کہ کہیں وہ بھی ادھر متوجہ نہ ہو جائے، کہا۔

لو ایسے ہی چلیں... ذرا پتا تو چلے، کس سے ملنے آئے ہیں؟“

”یہ تو توجہ ادھر ادھر اس لئے نہ ہو سکی کہ میڈم فیروزہ اپنے آفس سے اٹھ کر اس کے استقبال پر...“

میں۔ لڑکیوں نے تو تب دیکھا، جب وہ برآمدے کو عبور کر کے سیڑھیوں پر آئیں جبکہ ارد شیر کی ڈنڈہ پر بھی۔

”اوہ...“ یہ تو میڈم کے ملنے والے ہیں...“ فائزہ کو جیسے مایوسی ہوئی، راکھ یہاں سے ہٹ کر کلاس روم میں چلی گئی۔

”شیر گھر واپس آیا تو جشد شاہ موجود تھے اور کب سے اس کے منتظر بیٹھے تھے۔“

”سلام بابا...“ انہیں دیکھ کر اسے کچھ بھی محسوس نہیں ہوا، نہ اچھا لگا، نہ برا لگا... جبکہ وہ بیٹے کو دیکھنے کے لئے بے تاب تھے۔

”کہاں گئے تھے پتر...؟“ جواب طلبی مقصود نہ تھی، یونہی پوچھ لیا تھا۔

”آپ کب آئے بابا جان...؟“ ان کی بات کا جواب دینے کے بجائے اس نے سوال کیا اور چونکہ ان کی بات کے فوراً بعد ہی پوچھ لیا تھا تو انہوں نے محسوس نہیں کیا کہ ٹال رہا ہے، بولے۔

”مجھے آئے کچھ دیر ہو گئی ہے۔“

”پھر کچھ چائے پانی لیا آپ نے...؟“

”ہاں ہاں، تم فکر کیوں کرتے ہو...؟ سب لے چکا ہوں... آؤ ادھر میرے پاس بیٹھو... میں تو اپنے پتر کو دیکھنے کے لئے آیا ہوں۔“ وہ تھکے تھکے تھے مگر ہر انداز میں اسے کے لئے پیار تھا۔

”اچھا... بابا آپ بیٹھیں میں پیچھ کر کے آتا ہوں۔“

وہ اپنے بید روم میں چلا آیا اور سوچ رہا تھا، شام کو ربانی کی طرف جانا ہے اور بابا جان جس انداز میں بیٹھے تھے، ملتا ہے جلدی ملیں گے نہیں۔

کپڑے بدل کر وہاں آیا تو وہ صوفے پر نیم دراز تھے، اسے دیکھ کر سیدھے ہو بیٹھے اور بولے۔

”آدھر نہیں، ادھر آ کر میرے قریب بیٹھو...“ وہ مسکرا کر برابر میں آ بیٹھا۔ باپ نے شفقت سے اس کے کا نہ دھے پر ہاتھ رکھا اور کہا۔

”بیٹا... کچھ گاؤں کا چکر لگا لیا کرو اور میں شہر کی کٹھی پر بھی اکثر آتا رہتا ہوں۔ اگر گاؤں نہیں آ سکتے تو ادھر ہی آ کر اپنی شکل دکھا جایا کرو۔ میں تو ترس ہی گیا ہوں تمہارے لئے۔“

”کیا بات ہے بابا جان...؟ آج آداس دکھائی دے رہے ہیں آپ...؟“

”ہاں شاید میں تھک گیا ہوں۔“ جو کیفیت وہ خود نہیں سمجھ رہے تھے، وہ بیٹے سے کیا کہتے۔

تین شادیاں کیں... راحت کو موت نے جدا کیا اور فاطمہ کو خود انہوں نے اور کبریٰ نے اس سے پہلے کہ شاہ اس سے نفرت کرتے اپنے دل میں ان کی نفرت کا تناور درخت کھڑا کر لیا۔ تین بیٹیوں کے باپ تھے۔ بیٹیاں تو باپ پر جان دیتی ہیں۔ بائبل کو دیکھ دیکھ جیتی ہیں مگر ان کی بیٹیاں بہت فاضل

تھیں، جانتی تھیں باپ کو ان کے ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

جوانی تو گزر جاتی ہے، طاقت کے نشے کے ساتھ ساتھ اگر اقتدار بھی حاصل ہو تو سونے پر سہاگ... مگر وقت کے ساتھ ساتھ انسان اُن آنکھوں کو تلاشتا لگتا ہے، جن میں اُس کے لئے پیار ہو... چرے جو اس کے اپنے ہوں۔

شاہ جی اب گاؤں جاتے، قیام بڑی حویلی میں ہو یا چھوٹی میں، ان کے گرد ہجوم صرف ملازموں کا ہوتا تھا، آنکھ بولتا تھا، روکھنا چاہتی تھی، دل جو محبت چاہتا تھا، اب وہ کہاں بھی۔

کبریٰ اکثر موجود نہیں ہوتی تھیں، پوچھنے پر یہی جواب ملتا، ستارہ بی بی کی طرف ہیں یا شیریں بی بی کے ہاں گئی ہیں۔ فاطمہ اور گل کے جانے کی خبر بھی زیادہ دن ان سے چھپ نہ سکی۔ انہیں ملازموں نے بتا دیا تھا کہ وہ بڑی حویلی سے جا چکی ہیں۔

کچھ بھی تھا فاطمہ سے جیسا بھی تعلق تھا مگر وہ بیوی تو بہر حال تھی اُن کی... اس کے یوں بتائے بغیر چل جانے پر بہت غصہ آیا اور اسی غصے کے اثر میں وہ اس کے سینے والے گاؤں میں اُس کے پاس پہنچ گئے تھے۔ گل شہر واپس جا چکی تھی۔ فاطمہ سے ہی ملاقات ہوئی۔

”تم بتائے بغیر چلی آئیں...؟“

”نہیں میں بتا کر آئی تھی۔“ فاطمہ نے جیسے ان کی آمد کا نوٹس ہی نہیں لیا گیا... تسبیح کے دانے گراتی رہیں۔ ذرا توقف کے بعد ان کی جانب پھر دوکھا اور سپاٹ لہجے میں بولیں۔

”جسے بتا کر آنا چاہئے تھا، میں اسے ہی بتا کر آئی ہوں۔“

”کون...؟ کس کی بات کر رہی ہو...؟“ ان کا بے گانہ اور انہیں کچھ نہ سمجھنے کا واضح انداز کر کے کے باہر مرید نیوں کا ہجوم، لہذا آواز خود بخود دھیمی ہو گئی۔

”کبریٰ خاتون کو... وہی جو بیوی ہے تمہاری، جو حویلی کی واحد مالکن ہے اور جو ہمارا درد رکھتی ہے، جو ہماری ہے۔“

”تمہیں وہاں کیا تکلیف تھی...؟“ شاہ نے زچ ہو کر کہا۔

”کبھی بہت تکلیفیں اٹھائی تھیں ہم نے... اب تو شاید راضی ہی تھی مگر میری بیٹی راضی نہیں ہو سکی۔ تو پھر میں بھی چلی آئی... میں کیسے ناراض کر سکتی تھی اُس کو، ہیں شاہ، کیسے نہ مانتی اُس کی، تم ٹال سکتے ہو ارد شیر کی بات اور اب جاؤ میرے مرید انتظار کر رہے ہیں میرا۔“

”تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ تم جانتی نہیں، میں کون ہوں، یہ کس لہجے میں مخاطب ہو تم مجھ سے۔“ غصے سے اُن کا برا حال تھا۔ اتنی توہین کہ وہ جانے کو کہہ رہی تھیں۔

”تم... نفس کے غلام... دنیا کی معمولی آسائشوں کے پیچھے بھاگنے والے خدا کے وجود کو بھول جانے والے، ایک حقیر بندے ہو کر بھی اکڑ کر ملنے والے... میں بڑی اچھی طرح جانتی ہوں تمہیں۔“

انداز میں بے غوفی چرے کا پتھر ملا پن کا تھم میں پکڑی موٹے دانوں والی تسبیح... غلط نہیں کہا تھا انہوں نے، وہ نفس کا غلام کمزور بندہ جو مقابل کو مضبوط محسوس کرنے کے بعد گھبرا جاتا ہے۔ قدم پیچھے ہٹانے کی کوشش کرتا ہے۔ آہستہ آہستہ سر کٹے ہوئے پرے چلا جاتا ہے... یہی کچھ ہوا جشد شاہ کے ساتھ۔

وہ واپس آ گئے پھر دوبارہ فاطمہ کی طرف نہیں گئے۔

190

”ماں تو گھر ہی ہے ناں تمہاری.....“
 ”ہاں نہیں پھوپھو، میں تو گھر نہیں تھا..... ابھی آیا ہوں، ویسے میرا خیال ہے وہ گھر نہیں ہیں۔“

”دادی کا کیا حال ہے؟ میں بھی مصروف رہا، اُن کے پاس جا نہیں سکا۔ بے چاری بڑے گھر میں بھی اکیلی ہوتی ہیں۔ بڑا ترس آتا ہے مجھے اُن پر۔“

”اکیلی ہوتی ہیں تو اُن کی اپنی مرضی..... ہم نے بھی کہا تو نہیں کہ ہمارے درمیان آکر بیٹھیں۔“

جویریہ چائے لے آئی جبکہ رات آٹھ بجے کے پاس چلی گئی تھی۔

”یہ کام بڑی سے کہا ہوتا۔“ انہوں نے پھر طنز بھرے انداز میں منہ بنا کر کہا۔

”اوہومما..... مہناز سے کہیں بناوے گی چائے، آپ آرام سے ادھر آکر بیٹھیں۔“ مزرب نے ہر

بھر پور حملہ کیا.....

واجدہ کو محسوس تو پہلے ہی ہونے لگا تھا، آج تو پورا یقین ہو گیا، یہ لڑکا بدل رہا ہے۔ اکثر بڑے دائرہ انداز میں ماں کی حمایت کر جاتا ہے۔

”اچھا بیٹا جی، کرنی ہوں تمہارا بھی علاج۔“ انہوں نے پکا فیصلہ کر لیا۔ جویریہ کے اس حمایتی ضرور اس سے کاٹ لیں گی۔

مہناز کوواجدہ نے بھی چائے بنانے کو کہا تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ جویریہ مزرب سے کافی فاصلہ رکھ کر ایک طرف بیٹھ گئیں۔ نندکی موجودگی میں تو وہ بیٹے سے بات کرتے ہوئے بھی ڈرتی تھیں۔

”طبیعت ٹھیک ہے ناں آپ کی؟“ اُس کو خاموش ایک طرف بیٹھے دیکھ کر مزرب نے پوچھا۔ جویریہ مسکرا دی۔ سرانبات میں ہلادیا۔

وہ رات کا کھانا کھا کر واپس گئیں۔ راتھرتن سمیٹ کر اپنے کمرے میں آئی اور سونے کے لئے بستر پر لیٹی تو ”وہ“ یاد آ گیا۔

”میڈم سے ملنے آیا تھا، اُن کا کوئی عزیز ہوگا..... فائزہ تو بعد میں بھی کافی دیر تک یاد کرتی رہی میں خاموش رہی۔ مگر یہ حقیقت ہے۔ وہ اتنی جلدی بھلانے والے نہیں..... گرے شلوار سوٹ میں سٹوٹلے کے کھٹنے اطراف سے بے گانہ..... کچھ پراؤڈ، کچھ لئے دیئے سے انداز کے ساتھ بہت منفرد، بہت

”یہ میں کیا سوچ رہی ہوں.....“ مجھے ایسا نہیں سوچنا چاہئے..... وہ کوئی بھی ہوں..... مجھے اُن سے کیا؟“

اس نے کروٹ بدلی مگر وہ صورت پھر سامنے تھی۔

”اتنی جلدی کوئی بھول نہیں سکتا مجھے.....“

”ہاں مجھے اس سے اختلاف بھی نہیں.....“ راتھ نے بڑی جلدی ہار مان لی۔

”آئی کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں رہتی..... میں بہت فکر مند ہوں اُن کی طرف سے۔“ سوہا فکرت

لہجے میں عالیہ سے کہہ رہی تھی۔

”تم اتنی پریشان کیوں ہو جاتی ہو سوہا..... انشاء اللہ آئی جلدی ہی ٹھیک ہو جائیں گی۔“ عالیہ نے

اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر تسلی دیتے ہوئے کہا۔

”کبھی کبھی تو بہت گھبرا جاتی ہوں میں، اکیلی ہوں ناں شاید اس لئے۔“

”خود کو تنہا مت سمجھو، میں تمہارے ساتھ ہوں۔ جب بھی بلاؤ گی، کبھی مایوس نہیں کروں گی۔“

”تمہاری دوستی بڑی تو فخر ہے مجھے۔“ سوہا اُس کے کاندھے پر سر رکھ کر بولی۔

”جائے بناؤں تمہارے لئے.....؟“

”نہیں عالی! بس میرے پاس بیٹھی رہو۔ کسی بھی چیز کو جی نہیں چاہ رہا۔“

”سوہا..... تم اس روز مزرب بھائی کے ساتھ گھر گئی تھیں ناں.....؟“ عالیہ کو یاد آ گیا۔ اُس نے

اثبات میں سر ہلادیا، پھر سوالیہ انداز میں عالی کی جانب دیکھا۔

”وہ بہت تعریف کر رہے تھے تمہاری۔“

”ارے میری تعریف.....؟ مگر ہماری تو کچھ زیادہ بات بھی نہیں ہوئی۔ تم یونہی گپ نہ لڑاؤ۔“

”جج کہہ رہی ہوں بابا، بہت بہت تعریف کی انہوں نے..... اصل میں جو ہر شے اس وہ۔“

”اچھا بھلا کیا کہہ رہے تھے میرے بارے میں.....؟“ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ پوچھ بیٹھی۔

”کہہ رہے تھے بہت مہمان نواز لڑکی ہے..... تم نے چائے بھی تو پلائی تھی ناں انہیں..... اُس

چائے کی بہت تعریف کرتے رہے۔“

”لو اور ابھی تم کہہ رہی تھیں میری تعریف کر رہے تھے۔“ سوہا کے لبوں پر بے ساختگی مسکراہٹ

تھی مگر کوشش تھی لہجے بے زاری ظاہر کرے۔

”تمہاری بیانی ہوئی چائے کی تعریف بھی تو تمہاری ہی تعریف ہوئی کہ نہیں۔“

”ہاں یار، زیادہ مرچیں کھانے سے صحت پر برا اثر پڑ تو سکتا ہے مگر.....“

”آہ..... اسے کہتے ہیں دل کو دل سے راہ ہوتی ہے..... میں ادھر آنا نہیں چاہ رہا تھا مگر کوئی قوت

میرا مجھے انہی راستوں پر دھکیل رہی تھی۔“

اس پر نظر پڑتے ہی مزرب، عالی کے ملازم کو ممرچوں کی نقصانات بتانا بھول گیا۔

”بھئی، وہ قوت تو بڑی ہی زبردست ہوگی، جس نے آپ کو دھکیل دیا۔“ عالیہ مسکرا کر گویا ہوئی۔

”یہ تم تعریف کر رہی ہوئی تعریف.....؟“ مزرب نے ہاتھ اٹھا کر پوچھا۔

”تعریف بھائی، سو فیصد تعریف.....“

”پھر میری جانب سے شکر یہ قبول کرو.....“

”بائی دادے۔ یہ دل کو دل سے راہ کب سے ہے۔“ عالیہ نے شریر انداز میں کہا تو سوہا نے اُس

کا بازو باکسرزنش کرنا چاہی۔

”کب سے ہے.....؟“ اُس نے سوہا کی جانب دیکھا اور فنس پڑا۔

”میں آئی کو سلام کر کے آتی ہوں۔“ سوہا اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میری طرف سے بھی کہہ دیجئے گا۔“ مزرب کا انداز شریر تھا۔

”جی نہیں.....“ وہ اُس کی طرف دیکھے بغیر ڈرائنگ روم سے چلی گئی۔

”دیکھا، میں یہاں آیا، محترمہ بہانہ بنا کر چلی گئیں۔“ مزرب نے جیسے عالیہ سے شکایت کی۔

”یہ کیا چکر ہے بھائی.....؟“ عالی نے سنجیدگی سے پوچھا۔

سے زیادہ بیمار ہو گئی ہیں..... ہمت ہی ہار بیٹھی ہیں وہ تو.....
 ”میں آؤں گا کسی روز آپ کی طرف سمجھاؤں گا انہیں۔“
 ”ہاں..... اس روز آپ آئے تھے، اُن سے باتیں کرتے رہے..... کئی بار آپ کا ذکر کر چکی ہیں۔“
 ”دیکھو عالی، یہ ہوتی ہے بندے کی پر سنائی جہاں سے گزرے لوگ مدتوں یاد کرتے رہیں۔“
 جواب میں عالیہ نے منہ بنا کر شانے اُچکا دیئے۔

”آپ گھر کب جائیں گی سوہا.....؟“
 ”کیا مطلب آپ کا، ابھی تو میں آئی ہوں۔“
 ”ہاں اور اتنی جلدی تو میں جانے ہی نہیں دوں گی مزید بھائی، آپ میری فرینڈ پر قبضہ جمانے کی کوشش مت کریں۔“

عالیہ کے اس فقرے پر سوہا گڑبڑا گئی اور گھور کر اس کی جانب دیکھا۔ یہ حرکت مزید سے چھپ نہ سکی۔ وہ ہنس رہا تھا۔
 ”جائیں آپ امی کے پاس جا کر بیٹھیں، ہم دونوں کو اپنی باتیں بھی کرنا ہیں۔“ عالیہ، سوہا کی سنجیدگی اور چپ کی وجہ سے کہہ رہی تھی۔

”کاشف کہاں ہے.....؟ میں تو اُس کے پاس آیا تھا۔“
 ”جی..... اُس کے پاس آئے تھے مگر یہاں آتے ہی بھول گئے..... ہوں بڑی جلدی خیال آیا ہے دوست کا۔“

”عالی..... تم ضرورت سے زیادہ تیز ہوتی جا رہی ہو..... ایسا نہ ہو میں آنٹی جان سے شکایت لگا دوں۔“

”آپ اتنے تیز ہیں، میں نے کبھی جو یہ آنٹی سے شکایت کی ہے آپ کی، خیر چھوڑیں یہ بتائیں آپ کی مہناز کا کیا حال ہے.....؟“ وہ پھر شرارت کر گئی۔

”میری مہناز.....“ سوہا کے سامنے اس کا یوں کہنا مزید نے کن اکھیوں سے سوہا کی جانب دیکھا، وہ پوری طرح متوجہ تھی اور بالکل سنجیدہ بیٹھی تھی۔

”اوہ بس یونہی منہ سے نکل گیا تھا، ویسے کنزن تو ہے ناں آپ کی.....؟“
 ”خدا نہ کرے وہ میری ہو، یہ تم کس جرم کا بدلہ لے رہی ہو مجھ سے.....“
 ”بدلہ کوئی نہیں، ذکر بڑا سنا ہے تو کہہ دیا۔“

”ذکر تو میں اپنی تمام محترم پھوپھوزادیوں کا کرتا ہوں اور اُن کی تعداد چار ہے۔“ پھر سوہا کی طرف ہلکا اور بولا.....
 ”یقین کرو ایسی کوئی بات نہیں عالیہ کو تو سوچے سمجھے بغیر بولنے کی عادت ہے۔“

”اگر ایسی بات ہو تو مجھے کیا.....؟“ وہ ایک دم سے انجان بن جایا کرتی تھی۔
 مزید نے خفا سے انداز میں گھور کر عالیہ کی طرف دیکھا اور عالیہ کو بھی ترس آ گیا۔ اس کی مدد کی ٹھان لی، بولی.....

”اوہ سوہا تم نے تو سیریس ہی لے لیا..... ہم تو یونہی آپس میں مذاق کرتے رہتے ہیں۔“
 ”کیا مطلب.....؟ کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ لوگ.....؟ اگر مزید صاحب کی کوئی کنزن ہیں

”چکر..... کیسا چکر.....؟ بڑے افسوس کی بات ہے، تم نے مجھے چکر باز سمجھ رکھا ہے۔“
 ”میں صاف صاف کہہ دیتی ہوں، میری فرینڈز کے ساتھ دھوکا کیا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔“
 ”یہ کاشف کہاں ہے.....؟ وہ ہوتا تو میری سائیڈ لیتا..... عالی میں سیریس ہوں ہنڈر ہنڈر۔“
 سیریس.....

”یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کا بیک گراؤ کیا ہے.....؟“
 ”عرض ہے کہ شادی مجھے سوہا سے کرنی ہے، نہ کہ بیک گراؤ سے۔“
 ”پھر بھی بھائی، آپ سوچ لیں، آپ کے والدین مان جائیں گے.....؟“
 ”میری ماما تو ضرور میرا ساتھ دیں گی۔“
 ”اور آپ کے والد.....؟“

”اوہو عالی، اتنے عرصے سے میں تمہارے ہاں آ رہا ہوں اب تک سمجھی نہیں مجھے، ہمیں کیا بولنا جو پیا انکار کر جائیں۔ ایسا کمیل رچاؤں کا کہ پیا خود مجھ پر بندوق تان کر کہیں گے۔ اگر تم نے سوہا کے ساتھ شادی سے انکار کیا تو میں تمہیں شوٹ کر دوں گا۔“

”وہ بہت اچھی لڑکی ہے بھیا.....“
 ”تو مجھ میں کیا برائی ہے.....؟“ اُس نے منہ پھلایا۔

”اوہو..... آپ تو ناراض ہو گئے، میرا یہ مطلب تھوڑی تھا۔“ وہ مسکرائی پھر کہنے لگی۔
 ”وہ آپ کی بن جائے میرے لئے اس سے زیادہ خوشی کیا ہو سکتی ہے۔“

”اگر یہ خوشی چاہتی ہو تو اسے ہموار کرو میرے لئے آخر بہن..... ہوتی میری۔“
 ”میں کیا سائیڈ لوں آپ کی، آپ تو خود ہی بڑے تیز جا رہے ہیں۔ پہلی ہی ملاقات میں آپ۔“

”کیا کیا ہوا، کچھ کہہ رہی تھیں محترمہ.....؟“ بے تابی عروج پر تھی۔ عالیہ کو فقرہ بھی مکمل نہیں کر دیا۔

”نہیں کہا تو کچھ نہیں، میں ہی آپ کی باتیں سن رہی تھی اور وہ سن کر مسکرائے جا رہی تھی۔“
 ”اوہ..... سنائی ہوں گی تم نے میری اونگی اونگی حرکتیں۔“

”آپ جیسے جیسے اونگی اونگی حرکتیں کرتے ہی کب ہیں.....؟“
 ”ہاں، یہ تو ہے۔“ مزید نے بھی فوراً اتفاق کیا اور پھر بولا.....

”تم میری کیا باتیں کر رہی تھیں کے ساتھ جون کر مسکرائے ہی چلی جا رہی تھیں۔“

”اوہو..... بس یونہی ایک دو باتیں کی تھیں..... میں نے اندازہ لگایا..... وہ آپ کو ناپسند کر رہی کرتی۔“

”خیر میں نے کون سا اُس کا اُحوال دیتا ہے جو ناپسند کرے گی۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ ہنڈر ہنڈر لگے۔“ مزید ذرا سنجیدہ ہو کر بیٹھا ہی تھا کہ سوہا چلی آئی۔

”کیا حال ہے آپ کی آنٹی کا.....؟“ اُس نے سوہا سے پوچھا۔
 ”بس ویسی ہی ہیں، کہیں آجا بھی نہیں سکتیں..... سارا دن گھر میں بند رہتی ہیں..... بس اُن۔“

رہ گئی۔ ”جو ممکن نہیں، اس کی خواہش کیوں کرتے ہیں آپ۔“

”تم اسے ناممکن کیوں سمجھتی ہو۔۔۔۔۔؟“

”اس لئے کہ حقائق پر نظر رکھتی ہوں۔ خوابوں کے مگر میں کبھی نہیں رہی۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ میرے نام کے ساتھ گلوکارہ یا سینکین بیکم کا نام بھی لیا جاتا ہے اور گانے والی کی اس معاشرے میں یہ حیثیت ہے، یہ مجھ پر پوری طرح واضح ہے جبکہ آپ کا حلق ایک معزز فیملی سے ہے، آپ کے گھر والے بھلا کسی ایسی لڑکی کو کیونکر قبول کر سکتے ہیں۔۔۔۔۔؟“

”یہ تمہارا نہیں میرا مسئلہ ہے، انہیں کیسے منانا ہے، یہ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔“

”رہنے دیں، مجھے پتا ہے آپ کبھی بھی اپنے گھروالوں کو قائل نہیں کر پائیں گے۔ ایک روز ایسا آئے گا، جب آپ مجھ سے معذرت کر کے نئی راہ اپنائیں گے۔ میں اپنی تنہائیوں کے ساتھ خوش ہوں، آپ مجھے خوش رہنے دیں۔ محبت میں ناکامی زندگی کو موت سے ہلکا کر دیتی ہے۔ میں ابھی مرنا نہیں چاہتی، مجھے زندگی نے کچھ نہیں دیا مگر پھر بھی مجھے جینا ہے تب تک جب تک آئی زندہ ہیں۔ میں اُن کے لئے محنت کرنا چاہتی ہوں۔ زندگی سے جنگ کے لئے تیار ہوں۔ آپ یہ نئی راہ مت دکھائیں مجھے۔“

”میں سمجھ رہا ہوں عالیہ نے جو کزن والی بات مذاق میں کی تھی، تم نے دل پر لے لی ہے۔“ اُس کی اتنی باتوں کے باوجود وہ ڈٹا ہوا تھا۔

”نہیں میں تو خوش ہوں، شکر کر رہی ہوں کہ بروقت ہوش میں آگئی۔ عالیہ کی بات سے ہی مجھے آپ کی اور اپنی حیثیت کا فرق یاد آ گیا ورنہ پتا نہیں کیسے میں تو بھول ہی گئی تھی مگر اب ہمیشہ یاد رکھوں گی۔“

”اس عالیہ کی بچی کے تو کان سمجھنوں گا اور آنے دو کا شرف کو اس سے بھی شکایت کروں گا۔ بنانا یا کام بگاڑ کر رکھ دیا اس کی بے وقوفی نے۔“

”مگر یہ یاد رکھو، تم جو بھی کہتی رہو، میں باز آنے والوں میں سے نہیں۔ تمہارے پیچھے آتا رہوں گا۔ اور مٹا کر ہی دم لوں گا۔“

اُس کی آنکھوں میں عزم تھا، سوہانے سر جھکا لیا۔

ارد شیر کہنے کو فارغ تھا مگر پھر بھی ڈھیروں مصروفیات تھیں اس کی، گھر میں کم ہی ہوتا تھا وہ اور جب ہوتا تو پھر ارشاد کی شامت آ جاتی۔ یہ سوال ضرور کیا جاتا۔۔۔۔۔ پتا چلا اُس گانے والی کے نئے گھر کا۔۔۔۔۔؟ ارشاد لگا ہوا تھا مگر قسمت کی خرابی، گھر مل کے نہیں دے رہا تھا۔ اور صاحب کی ڈانٹ پھونکار روز بروز بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

آج تو وہ گھر پر ہی تھا۔۔۔۔۔ صبح معمول کے مطابق خاصی دیر سے اُٹھا۔ اس کے بعد کوئی ملنے والا آ گیا۔ پھر ارشاد کی طلبی ہوئی۔

”مجھے پوری امید ہے آج بھی تمہارا جواب ہمیشہ کی طرح نفی میں ہوگا۔“ لفظ اور چہرہ دونوں میں فخر کا شعلہ لگی ہوئی تھی۔

”میں پتا چلا لوں گا سرکار، آپ مجھے تھوڑا سا وقت تو دیں۔“ ارشاد اندر ہی اندر ڈر کر بظاہر یقین

تو مجھے اُن سے کیا، پتا نہیں آپ لوگ کس انداز میں سوچ رہے ہیں۔۔۔۔۔؟“

”اچھا اچھا۔۔۔۔۔ اب بھائی کے ساتھ ساتھ مجھ سے بھی آپ جناب مت کرو ورنہ بری طرح جاؤ گی۔“

”عالیہ۔۔۔۔۔ تمہیں اتنا بھی علم نہیں کہ جب مہمان گھر آئے تو اُن سے چائے پانی کے لئے بھی پوچھا جاتا ہے۔“

وہ عالیہ کو یہاں سے ہٹانے کے بعد سوہانے کھل کر بات کرنا چاہتا تھا۔۔۔۔۔ عالیہ بھی اس کی بات سن گئی اور اُنٹھ کھڑی ہوئی۔

”میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔“ سوہانے کہا۔

”کیوں بھلا مجھے آپ سے کیا خطرہ ہو سکتا ہے۔۔۔۔۔؟“ وہ پھینکی سی ہنسی ہنس دی۔

”اچھا۔۔۔۔۔ پھر بیٹھ جائیں۔۔۔۔۔ اور وہ بھی صرف یہ جتانے کے لئے کہ میں کتنا نہیں رہی، بیٹھ گئی۔

”بہت شکریہ۔۔۔۔۔“ جو نبی عالیہ باہر گئی۔ اس نے خاموشی سے سر جھکا کر بیٹھی سوہانے سے مکرانے ہوئے کہا۔۔۔۔۔

”کس بات کا۔۔۔۔۔؟“ سوہانے تھوڑا اڑخ پھیر کر کہا۔

”میری بات مان کر رک جانے کا اگر یو بی مانی رہو تو کیا ہی اچھا ہو۔“

”ایک بات تو بتاؤ، وعدہ کرتا ہوں کسی سے نہیں کہوں گا۔ یہ میری کزن کے بارے میں سن کر کیا کیوں آف ہو گیا ہے تمہارا۔۔۔۔۔؟“

”نہیں تو ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ وہ شرمندہ سی ہو گئی، سوچا کس قدر بے وقوفی کی ہے میں نے، اب سوچتا ہو گا مزید کہ لڑکی تو ملنے ہی نہ جانے کیا کیا آس لگا بیٹھی ہے۔“

”میری چاہت بہت پرانی ہے سوہا۔۔۔۔۔ اس وقت ہم اسکول میں پڑھا کرتے تھے۔۔۔۔۔ میں اس لفظ سے ناواقف تھا مگر میرا دل تو جانتا تھا ناں۔“

”چھوڑیں۔۔۔۔۔“ وہ سنبھل چکی تھی اور خود کو سرزنش بھی کی تھی۔ اسے یاد آ گیا کہ وہ کون ہے اور اُسے زندگی سے اپنا حصہ بہت جدوجہد کے بعد وصول کرنا ہوگا۔

مزید صوفے کی بیک سے ٹیک لگا کر بیٹھا تھا۔ اب آگے ہو کر اُس کی جانب جھکا اور بولا۔۔۔۔۔

”کیسے چھوڑ دوں۔۔۔۔۔؟ کیا یہ اتنا آسان ہے۔۔۔۔۔؟“

”میں نہیں جانتی۔۔۔۔۔“ سوہا کا دل پھر دھڑکا مگر اُس نے دل کی بات پر کان نہ دھرنے کا فیصلہ لیا

ابھی کیا تھا۔

”تم تو کچھ بھی نہیں جانتیں سوہاجی۔۔۔۔۔ یہ بھی نہیں کہ چاہت دل میں گھر کر لے تو پھر جاتی نہیں۔ محبت میں ناکامی ہو تو دل ساری عمر ماتم کرتا ہے، کیا تم چاہتی ہو میری عمر بھی ناکام محبت کا ماتم کرنے ہوئے کٹ جائے۔“

”پتا نہیں یہ عالیہ کہاں رہ گئی۔۔۔۔۔ بھلا چائے بنانے میں اتنی دیر۔۔۔۔۔“ سوہانے بات پلٹنا چاہی۔

”یہ میری بات کا جواب نہیں ہے۔“ مزید اپنی جگہ سے اُنٹھ کر اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔

جو عالیہ کے پاس جانے کا ارادہ باندھ رہی تھی، اس کے یوں قریب اور سامنے آ کر کھڑے ہو جانے پر

”ساری تھکن اتر جائے گی..... ابھی تمہیں میں ایک ٹھیلے سے چاٹ کھاؤں گی۔ سچ بہت مزے

نی ہوتی ہے۔“

”کیا.....؟ نبیلہ تم یہاں روڈ پر کھڑی ہو کر چاٹ کھاؤ گی، شرم تو نہیں آئے گی تمہیں.....؟“

اور پارکنگ ایریے سے ادھر آتے ہوئے اردشیر نے اس نرم اور جادو بھری آواز پر بے اختیار ہی ان لڑکیوں کی طرف دیکھا۔ سر پر سیٹے سے چادر اوڑھے، وہ لڑکی تھکی تھکی اپنی ہی دوست سے ناراض، اتنے تھک رہی تھی..... جتنی خوبصورت اس کی آواز تھی، اس سے کہیں زیادہ پیاری نازک سی وہ خود تھی۔

اس کی سیکنی اس کی کوئی بات ماننے کو تیار نہیں تھی اور اب وہ کہہ رہی تھی..... ”ٹھیک ہے، اگر تمہیں بڑی کے کنارے کھڑے ہو کر آلا بکلا کھانی ہے تو ضرور کھاؤ، میں ساتھ نہیں دوں گی۔ مجھے اچھا نہیں لگتا کہ آتے جاتے لوگ گھور رہے ہیں، اُلٹے سیدھے فقرے اُچھال رہے ہیں اور آپ کھڑے چاٹ کھا رہے ہیں ناں سنیں.....“ اس نے چھوٹی سے ناک چڑھا کر ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ اس کے انداز پر اردشیر کے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ بکھر گئی دونوں لڑکیاں اس کے قریب سے گزرتی ہوئی، آگے چلی گئیں۔

وہ بھی کچھ شاپنگ کے ارادے کے ساتھ ہی ادھر آ نکلا تھا۔ ایک مارکیٹ میں داخل ہو گیا۔ تیس منٹ کے بعد وہ کچھ خریدے بغیر ہی واپسی کے لئے نکلا اور اُس نے دیکھا دائیں طرف سے وہی دونوں لڑکیاں آ رہی ہیں۔ اس پیاری سی لڑکی نے بہت سے پکٹ اٹھا رکھے ہیں جبکہ دوسری شاید شرارت کے موڈ میں خالی ہاتھ تیز آگے چلی جا رہی تھی۔

”نبیلہ..... اونیل کی بیٹی، میں یہ سب کچھ یہیں پھینک دوں گی۔“ اس نے دھمکی دی تھی..... ”ہمان آگے جاتی ہوئی نبیلہ کی طرف تھا اور وہ پیچھے آوازیں دیتی چلی جا رہی تھی۔

اردشیر اس کی بالکل سیدھ میں کھڑا تھا۔ چاہتا تو ایک طرف ہٹ کر اسے راستہ دے دیتا مگر وہ پوری لڑکی اور دھیان سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”نبیلہ.....“ اس نے پھر پکارا اور ایک دم سے اردشیر سے آنکرائی..... سارے پیکٹس ادھر ادھر کر کے اور اگر وہ تھام نہ لیتا تو یقیناً وہ بھی گر جاتی۔

”چوٹ تو نہیں آئی.....؟“ اردشیر کے انداز میں عادت کے مطابق آوارہ سی شرارت تھی اور پیکٹس اس پر جیسے جم کر رہ گئی تھیں۔

رائیہ نے ایک نظر اُس پر ڈالی..... یہ تو وہی ہے جو کالج بھی آیا تھا۔ اس کا دل زور سے دھڑکا..... تیرہ دن تھا اس روز اسے دیکھنے میں اور آج یوں ملنے میں..... تب وہ کتنا اچھا لگتا تھا مگر آج جس انداز میں..... ”میرے ہاتھ، ایک چھوٹا سا جملہ جواب تک ادا ہوا۔ وہ کتنا عجیب سالگ تھا کہ ادا کیا ہی کچھ اس طرح گیا

رائیہ کو کچھ ٹھہری سی آگئی۔ اُس نے کوفت بھرے اور کچھ شرمندہ سے انداز میں پھر اُس اُونچے لمبے اور خوبصورت شخص کی طرف دیکھا اور اس کے ہاتھوں کی مضبوط گرفت میں کسمائی..... تب اردشیر نے اس کے وجود کو قہقہے والے اپنے ہاتھ ہٹا لئے مگر نظر کے حصار میں رکھ کر گہرے سے لہجے میں بولا..... ”دیکھ کر چلا کرو، میری جان! تمہاں نہ لیتا تو مری پڑتیں۔“

”ٹھٹ آپ..... مجھے پہلے ہی پتا تھا تم مفت کی کھانے والے کچھ نہیں کر سکتے۔ تمہیں صرف بیڑے کھانے کی عادت ہو گئی ہے، کام کرنے کو کپوتو..... مجھے یہ بتاؤ اتنے دن سے کر کیا رہے ہو، صبح سے شام تک کہاں مرے رہتے ہو.....؟“ وہ چلا رہا تھا۔

”صاحب..... سرکار..... سنا ہے عرصہ ہوا یا سکین بیگم نے گانا چھوڑ دیا ہے اور اب وہ گناہی کی زندگی گزار رہی ہے۔ کسی سے ملتی ملاتی بھی نہیں.....؟“

”میں کچھ نہیں جانتا مجھے اُس سے ملنا ہے۔“

”جی سرکار.....“ اُس نے ادب سے سر جھکا لیا۔

”کیا جی سرکار.....“ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔“

ارشاد سلام کر کے غلت کے عالم میں کمرے سے چلا گیا کہ چلو جان چھوٹی، آج کا دن اب خیریت سے گزر جائے گا۔

اس کے جانے کے بعد دس پندرہ منٹ تک تو اردشیر اخبار لے کر بیٹھا رہا پھر اٹھ کر ڈرائنگ روم میں چلا گیا۔

”صاحب: اگر کوئی ملنے کے لئے آئے تو کیا کہوں.....؟“ جب وہ ڈرائیور سے گاڑی نکالنے کو کہہ رہا تھا تو ایک ملازم نے ادب سے پوچھا۔

کہہ دینا جنم میں گئے ہیں، ملنا ضروری ہے تو وہ ہیں آ جاؤ۔“

ڈری ڈرائیو دے پر لا کر ڈرائیور نے سیٹ اس کے لئے چھوڑ دی۔ وہ اسی بیزاری کے عالم میں گھر..... نکل گیا اور ملازم جواب تک باادب کھڑے تھے، ہتھ لگا کر ہٹ پڑے۔

”ویسے مجھے تو یقین ہے، صاحب جائیں گے جنم میں ہی۔“ ہتھ پھر بلند ہوا۔

”نبیلہ تمہاری ٹانگیں شاید لوہے کی بنی ہیں مگر میں تو بہت تھک گئی ہوں۔ اب زیادہ دیر تک تمہارے ساتھ یہاں ٹیکل نہیں سکتی۔“ ماما بھی انتظار کر رہی ہوں گی۔ مجھے اب گھر واپس جانا ہے..... زیادہ دیر ہو جائے تو وہ پریشان ہونے لگتی ہیں۔“

”اوپہو..... راتھ، ایک تو تمہیں ساتھ لے آؤ تو یہ بڑی مصیبت ہے، ہر بات میں جلدی کا شور کر دیتی ہو، صبح بتا کر کیوں نہیں آئیں اپنی ماما کو آج کالج ناٹم آف ہونے کے بعد تمہیں میرے ساتھ بازار جانا ہے۔“

”بتا کر تو آگئی تھی مگر اب تو بہت زیادہ دیر ہو گئی ہے اور تم نے صرف یہ ایک دو چیزیں ہی خریدی ہیں، ابھی ساری شاپنگ باقی ہے۔“

”تو پر راتھ بی بی، ایک تو تم دوست کم اور بزرگ اس سے کہیں زیادہ ہو، میری ہر بات پر نصیحت بات پر اعتراض مگر آج تو میں نے بھی پکا فیصلہ کر لیا ہے، تمہاری ایک نہیں سنوں گی۔ بہتر ہے چپ چاپ میرے ساتھ چلتی رہو اور دیکھو آج ہم کیا کیا نظارے دکھاتے ہیں تمہیں۔“

”مجھے کچھ نہیں دیکھنا، جو کچھ خریدنا ہے جلدی کرو اور واپسی کی راہ لو، میں تھک گئی ہوں۔“

”ہائے، سچی بڑی غلطی ہوئی، ہمیں پوچھنا تو چاہئے تھا۔“
 ”تو اب پوچھ آؤ.....“ رائے نے سخت غصے سے کہا۔
 ”تم چلوگی میرے ساتھ.....؟“ وہ مسکرائی۔

”مجھے کیا ضرورت ہے..... ہمدردی تو تمہیں ہو رہی ہے۔“
 ”ہمدردی سے زیادہ بے چینی ہو رہی ہے۔ ممکن ہے حضرت جان بوجھ کر کھرائے ہوں۔“
 ”بکومت.....“ رائے نے جھنجھکی ہوئی۔

”کچھ دیر نبیلہ خود ہی ہنستی کبھی مسکراتی خاموشی سے ساتھ چلتی رہی، پھر بولی۔“
 ”کیا خیال ہے، اس خوشی میں ایک ایک پلیٹ چاٹ کی ہو جائے..... میٹ میں کروں گی۔“
 ”مجھے گھر جانا ہے.....؟“ رائے قطعیت سے گویا ہوئی۔

”اچھا بابا چلو.....“ نبیلہ بھی مان ہی گئی کہ واقعی دیر تو ہو گئی تھی۔
 اچانک ایک گاڑی بالکل قریب آ کر رکی، دونوں نے چونک کر دیکھا۔ وہ تو وہی تھا اور مسکرا کر پوچھ رہا تھا۔

”کہاں جاتا ہے آپ کو.....؟ آئے آپ کو میں ڈراپ کر دوں۔“
 رائے نے نبیلہ کی طرف دیکھا اور پیچھے ہٹ کر اس کے پیچھے چھپنے کی کوشش کی۔
 ”آئیے ناں.....“

اب نبیلہ سامنے تھی۔

نبیلہ نے اپنے پیچھے کھڑی رائے کی طرف دیکھا..... پھر ارڈشیر کے فریش جگمگاتے چہرے پر نظر ڈالی اور کچھ کہنے کے لئے لب کھولے۔

• • •

اُس کا جی چاہا، کہہ دے، مگر جاتی تو اچھا تھا، اتنی تکلیف تو نہ ہوتی جو تمہارے چھوٹے اور یوں سے ہو رہی ہے مگر بزدل تھی کچھ کہہ نہیں پائی۔ خاموش اس کے سامنے کھڑی تھی جیسے قدم بھی نہ ہوں۔

”رائے..... رائے..... کیا ہوا.....؟“ نبیلہ نے دُور سے کہا..... اور تیزی سے اس کے پاس آئی اور جھک کر گرے ہوئے ٹیکٹ بکٹ میں آنکھیں کرنے لگی۔

رائے نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا اور نہ ہی اس کا انتظار کیا، چپ چاپ چل پڑی۔
 نبیلہ بھی اس سے آن ٹلی..... اور برابر آتے ہی بولی۔

”اچھا تھا، ہے ناں.....؟“ انداز شرارت سے بھرپور تھا۔
 ”بکومت.....“ رائے کو حقیقتاً غصہ آ گیا۔

”اوہ اتنی ناراض کیوں ہو رہی ہو..... چلو یوں کہتی ہوں، اچھا تھا پر تم سے زیادہ اچھا نہیں تھا۔“
 تو جواب ہی نہیں، تم لا جواب ہو بے مثال ہو۔“

”میں نے فیصلہ کر لیا ہے آئندہ تمہارے ساتھ کبھی کہیں نہیں جاؤں گی۔“ افسوس اور شرمندگی۔
 رائے کا لہجہ گلوگیر تھا۔

”لو جی، منٹا اٹھا کر تو خود چلے آ رہے تھے اور اب الزام دھردیا ہمارے سر..... یا آہا..... کیا ہو گیا۔“
 زمانے کو۔“ نبیلہ پر کوئی اثر نہیں تھا بلکہ خاصا لطف لیا تھا اُس نے ابھی ابھی رونما ہونے والے اس حادثے۔

”تم کیوں سب کچھ مجھے پکڑا کر آگے آگے بھاگی چلی جا رہی تھیں۔“ اب تو آنسو آنکھوں سے تیرنے لگے۔

”میں تو چاٹ کھانے جا رہی تھی..... اب مجھے کیا پتا پیچھے تمہارا اتنا مزیدار چاٹ سے بھی.....“
 چٹ پٹا ایک سیڈنٹ ہو جائے گا۔“ وہ کھلکھلائی اور نظریں جو سیٹلی پر گئی تو حیران ہو گئی۔

”ہا..... پاگل تم ہو رہی ہو..... ارے بھلا اس میں رونے والی کون سی بات ہے.....؟“
 ”کیوں رونے والی بات کیوں نہیں.....؟ اتنے لوگوں نے دیکھا اور اکثر ہنس بھی رہے تھے۔“
 ”اور وہ خود بھی تو، اس کے انداز کو سوچ کر اس نے سر جھٹکا اور چپ رہ گئی۔ دل میں یہ افسوس گئی کہ جب پہلی بار میں نے دیکھا تو میں نے کتنا سوچا اسے، وہ اچھا لگا تھا مگر میرا اندازہ کتنا غلط تھا۔ چہرے دھوکا دیتے ہیں یا شاید میں ہی بے وقوف ہوں، پہچان نہیں پائی۔“

”بہت زور سے کھرائی تھیں، کیا تمہیں چوٹ لگ گئی ہے رائے.....؟“ اُس کی اُداس شکل، آنسو تیرتے آنسو، نبیلہ کو ہمدردی پر مجبور کر گئے۔

اُس نے نفی میں سر ہلایا اور آنسو پونچھ ڈالے۔ واقعی یوں رونا دھونا بے وقوفی ہی تو ہے۔
 ”کیا پتا اُسے لگی ہو، ہم بھی کیسے بے مروت ہیں، پوچھا تک نہیں، بے چارے دُور تک دیکھتے رہے۔“ نبیلہ کو پھر شرارت سوچھی کہ بات ہی کچھ ایسی تھی۔ اگر رائے کی جگہ کوئی اور سیٹلی ہوتی تو وہ خوب ریکارڈ لگاتی مگر رائے کی حالت اسے حیران کر رہی تھی۔ بھلا اس میں اتنا محسوس کرنے والی بات ہے، وہ بار بار کوئی نہ کوئی بات مذاق میں کہہ کر رائے کو غصہ دلا دیتی۔

رائے گھر آئی تو ملازمہ نے بتایا۔ ”کوئی مہمان آئے ہیں۔ شاید آپ لوگوں کے رشتے دار
بجگم صاحب نے تو ڈرائنگ روم میں، بٹھایا تھا پروہ اٹھ کر اندر چلے آئے۔“
”اچھا، کون ہو سکتے ہیں؟“ وہ کتابیں کمرے میں رکھ کر بڑی تیزی سے واپس آئی۔ ماں کو
سلام کیا تو انہوں نے پہلی بات یہی کہی۔
”بڑی دیر کر دی تم نے بیٹا۔“

”ہنس مہا۔۔۔ وہ بیلہ ساتھ تھی، اُس کی وجہ سے دیر ہو گئی۔ میں تو کب سے کہہ رہی تھی واپس
چلو۔ بہت دیر ہو گئی ہے۔“ اُس نے جلدی سے جواب دیا۔

”یہ تمہاری بیٹی ہے جو یہ۔۔۔“ اکبر علی اُٹھ کر دونوں کے قریب آکھڑے ہوئے۔

جو یہ نے سپاٹ سے انداز میں اُن کی جانب دیکھ کر خفیف ساسر ہلادیا۔

انہوں نے بڑی شفقت کے ساتھ اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بولے۔

”بہت پیاری بچی ہے۔“ پھر رائے سے مخاطب ہوئے اور بولے۔ ”کیا نام ہے بیٹی کا؟“

”رائے۔“ جواب دے کر رائے نے سوالیہ انداز میں۔۔۔ ماں کی جانب دیکھا اور آہستہ سے نام بتا

دیا۔

اُس کی آنکھوں میں جو سوال تھا، وہ اکبر علی نے پڑھ لیا۔ اور جو یہ سے پہلے بولے۔

”ہم تمہارے ماموں ہوتے ہیں اور یہ ممانی ہیں تمہاری۔“ اکبر علی نے اپنے ساتھ بیٹھی خاتون کا
بھی تعارف کروایا۔

”یہ ماموں ممانی اچانک کہاں سے آگئے۔؟ ممانے تو کبھی ذکر نہیں کیا۔“ حیرت تو اسے

بہت ہوئی مگر ادب سے عارفہ کو سلام کیا اور یہ سوال مہمانوں کے سامنے نہیں اُٹھایا۔ عارفہ نے اس کے

گال پر بوسہ دیا، پھر بولی۔

”ارے یہ تو بالکل اپنی جو یہ یہ جیسی ہے، وہی ناک نقش اور چہرے پر ویسا ہی بھولپن۔ آؤ بیٹی!

اگر میرے قریب بیٹھو۔“ انہوں نے اپنے برابر میں اس کے لئے جگہ بنائی۔

رائے نے ماں کی جانب دیکھا اور محسوس کیا۔۔۔ انہیں مہمانوں کی آمد سے کوئی خوشی نہیں ہوئی ہے،

الٹی لٹی لٹی کی کھڑی ہیں جبکہ مہمان خصوصاً خاتون بہت چمک رہی تھیں۔ کبھی رائے سے تو کبھی جو یہ سے

کوئی نکتہ بات نکال ہی لیتی تھیں کرنے کے لئے، ماموں بھی خاصے خوش اخلاق تھے مگر اس کی ماں، یہ

انسانی چپ اور بیزارسی کیوں ہیں؟

”کب تک آجاتے ہیں کبیر بھائی۔؟“ عارفہ بیگم نے بڑی اپنائیت سے کبیر حسن کا ذکر کیا۔

”اُن کے آنے کا کوئی نام تو مقرر نہیں۔“ جو یہ یہ خوب سمجھ رہی تھی، اُن کے محبت بھرے انداز کو،

مُسکراتی کبیر سے ملنے آئے تھے اور جو یہ نہیں چاہ رہی تھی کہ وہ اس کے شوہر سے ملیں۔ کبیر حسن کی نظر

مُسکراتی کی جو حیثیت تھی، وہ بھائی، بھائی کے علم میں آجائے اسے گوارا نہیں تھا، پھر یہ دھڑکا بھی تھا، انہیں

پہلے مہمانوں سے وجود پا کر کبیر طر کے تیروں سے وجود چھلنی کر ڈالیں گے، یہ بھی ممکن ہے مہمان بھی پلیٹ

سے کھا جائیں، وہ چاہ رہی تھیں، یہ دونوں اُن کی آمد سے پہلے ہی یہاں سے چلے جائیں۔

مگر بھوکا کبیر حسن آج کچھ زیادہ ہی لیٹ ہوئے اور ان دونوں سے ملاقات کے بغیر ہی واپس

”آئیے ناں۔۔۔“ وہ پھر کہہ رہا تھا۔ بیلہ نے جواب طلب انداز میں رائے کی جانب دیکھا اور پھر
اردشیر کے مسکراتے فریش چہرے پر نگاہ ڈالی اور کچھ کہنے کے لئے لب کھولے مگر پھر رک گئی۔

اس وقت اردشیر کے چہرے پر انتظار کے ساتھ ساتھ جو دوستانہ مسکراہٹ تھی، وہ بیلہ کو انکار سے
روک رہی تھی۔ اردشیر کے ساتھ جانے میں کوئی حرج محسوس نہیں ہو رہا تھا مگر وہ رائے کو اچھی طرح جانتی تھی،
اس لئے جواب اُسی سے چاہ رہی تھی۔

”بہت شکریہ آپ کا، ہم خود ہی چلے جائیں گے۔“ رائے کے انداز میں رکھائی نہیں، جھجک اور خوف
تھا۔

”میرے ساتھ جانے پر کیوں اعتراض ہے، کیا میں صورت سے ناقابل اعتبار لگتا ہوں۔؟“
اُس نے رائے کی آنکھوں میں جھانک کر کہا۔ پھر فوراً ہی بیلہ سے مخاطب ہوا۔

”پلیز۔۔۔ آپ ہی کچھ سمجھائیں انہیں۔۔۔“ انداز ایسا تھا جیسے بیلہ سے تو برسوں کی جان پہچان
رہی ہو۔ اسے بیلہ کی رضامندی کا احساس تھا اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ وہ شخص اپنی دوست کی وجہ سے
خاموش ہے۔

رائے کو بیلہ پر غصہ تو پہلے ہی آ رہا تھا، اب اور بھی بڑھ گیا کہ آخر ضرورت ہی کیا تھی، ایک اجنبی کی
آفر پر غور کرنے کی۔۔۔ بجائے بیلہ کے جواب کا انتظار کرنے کے اُس نے بہتر یہی سمجھا کہ خود یہاں سے
چل پڑے کہ وہ تو جان چھوڑنے کی موڈ میں نظر نہیں آ رہا تھا۔۔۔ اور بیلہ کی بچی بھی چپک کر رہ گئی تھی۔

وہ آگے بڑھی تو اس کی دوست بھی معذرت خواہانہ انداز میں اردشیر کی جانب دیکھ کر اس کے پیچھے
ہلکی۔

”بہت فضول لڑکی ہو تم رائے۔۔۔ بھلا کیا مڑ جاتا جو اس کی بات مان لیتیں۔؟“ بیلہ نے اُس
کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ناراضگی سے کہا۔

”تم میرے پیچھے کیوں چلی آئیں۔؟ بیٹھ جاتیں گاڑی میں۔۔۔ رائے نے جیسے لہجے میں کہا۔

”ہاں، بیٹھ جاتی مگر تمہارا خیال آگیا۔۔۔ ہائے اتنے ڈینٹ بندے کی انسلٹ کرتے ہوئے
تمہیں ذرا ترس نہیں آیا۔“ بیلہ نے مصنوعی افسردگی سے کہا۔

”اب باتو خاموش ہو جاؤ پھر کوئی اور بات کرو۔“ رائے اس ذکر سے کتر رہی تھی۔ مگر بیلہ
نے اس کی بات نہیں مانی۔ خوب باتیں کیں اُس انجان شخص کے متعلق۔

بچن میں آگئی کہ خانساں نیا تھا، اسے خود بھی ساتھ لگنا پڑتا تھا۔
مزید لائبریری گیا تھا، اُس کی واپسی خاصی دیر سے ہوئی۔ راتھ کا ذہن ماں کی طرف سے الجھا
ہوا تھا، اب مزید کی طرف سے پریشانی ہو رہی تھی۔
”کہاں رہ گئے تھے آپ؟ جہاں جاتے ہیں، وہیں رہ جاتے ہیں۔ یہ خیال نہیں آتا کہ ہم
فکر مند ہوں گے؟“ اسے دیکھتے ہی راتھ بولی۔
”کیا ہوا؟“ آج موڈ کچھ بدلا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔ لگتا ہے کام زیادہ کرنا پڑ گیا ہے۔“
”کام سے میں نہیں گھبراتی۔“

”اچھا تو پھر کیا پوچھو نے ازراہ شفقت پھول سا ہاتھ رسید کر دیا ہے۔“ مزید نے شرارت سے
کہا۔
”وہ بھی کر دیں گی کسی دن، انہیں کوئی روک سکتا ہے بھلا۔“ راتھ کی اُداسی اُس سے چھپی نہ رہ
سکی۔
”کیوں، روک کیوں نہیں سکتا؟“ وہ بھی سنجیدہ ہو گیا، پھر بولا۔ ”اُس کا مطلب ہے کوئی
بات ہوئی ہے آج؟“

”نہیں۔۔۔ کچھ نہیں ہوا، میں تو ماما کی طرف سے پریشان ہوں۔۔۔ ان کی طبیعت شاید زیادہ
خراب ہے آج جب میں گھر آئی تو ایک صاحب اور اُن کی بیگم ہمارے گھر آئے ہوئے تھے۔ مجھ سے
بہت پیار سے ملے۔ ماما سے بھی باتیں کرتے رہے مگر ماما تو چپ چپ سی تھیں۔
پھر ان صاحب نے ہی بتایا کہ وہ میرے ماما ہوتے ہیں۔ مجھے تو یقین ہی نہیں آیا۔ اُن کے
جانے کے بعد ماما سے پوچھا تو انہوں نے بھی یہی کہا۔ وہ ماما ہی ہوتے ہیں۔ مگر بھائی، اُن کی
آمد سے ماما کو بالکل خوشی نہیں ہوئی۔ حالانکہ وہ بے چارے تو بہت اچھے لگ رہے تھے۔
“او۔۔۔ تو اکبر علی یہاں آئے تھے، کیا کہا پھر انہوں نے؟“ بھائی کی بے تابی راتھ کے لئے
حیران کن تھی۔

”میرے سامنے تو کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔“
”اچھا۔۔۔ میں ماما سے پوچھ لیتا ہوں۔“ وہ غلٹ میں نظر آ رہا تھا۔ اسے جانا دیکھ کر راتھ
بولی۔

”اگر ماما سوری ہوں تو جگایے گا نہیں۔۔۔ اور یہ آپ اتنے ایکسائینڈ کیوں ہو رہے ہیں، کچھ مجھے
بتائیں۔“

”پھر کبھی سہی۔۔۔“ وہ چلا گیا۔ مگر جلد ہی واپس بھی آ گیا۔ جو یہ یہ دوا کھا کر سو گئی تھی۔
”ہاں اب بتائیں۔“ راتھ نے اسے دیکھتے ہی کہا۔
”کیا بتاؤں، کوئی بات میرے علم میں تو ہے ہی نہیں۔“
”پھر۔۔۔ یوں بے چین ہو کر کیوں بھاگے تھے؟“ راتھ مطمئن نہ ہوئی۔
”خود یہ تو بتایا تھا ماما کی طبیعت اچھی نہیں ہے۔ اچھا یہ بتاؤ، کھانا بننے میں کتنی دیر ہے؟“
”ابھی تو وقت لگے گا۔ وہ رمضان کو ٹائم لینے بیجا تھا، واپسی نہیں ہوئی اور کھانا بھی مجھے بنانا

جانا پڑا۔۔۔ جاتے ہوئے عارفہ بار بار اپنے ہاں آنے کی دعوت دے رہی تھیں۔ مگر جو یہ یہ نے اُن
نہیں کیا۔ انہیں دیکھ کر ماما کے زخم رسنے لگے تھے اور تکلیف برداشت سے باہر ہو رہی تھی۔
”مما۔۔۔ کون لوگ تھے یہ؟“ اُن کے جانے کے فوراً بعد اُس نے ماں سے پوچھا۔
”جتا تو رہے تھے وہ ماماں اور اُن کی بیگم تھیں۔“
”وہ واقعی میرے ماماں ہیں، اُسی والے ماماں ہیں ماما؟“ راتھ کی حیرت یقینی تھی۔
جو یہ یہ اثبات میں سر ہلا کر اُنھ کھڑی ہوئی مگر بیٹی نے ہاتھ پکڑ لیا۔ اور بولی۔
”مما، کتنے بچے ہیں ان کے، کوئی بیٹی بھی ہوگی؟“ راتھ کے لہجے میں اشتیاق تھا۔
”راتھ۔۔۔ ہاتھ چھوڑ میرا۔۔۔ میں اتنی دیر بیٹھ کر تھک گئی ہوں اور دوا بھی لینا ہے مجھے۔“ جو یہ
نے بیزار سی سے ہاتھ پھڑوا دیا۔

”ممائی۔۔۔ مزید گھر آیا یا نہیں؟“ یہ پہنا ز کا تیسرا چکر تھا۔ وہ دو مرتبہ پہلے بھی آ چکی تھی
جب اکبر علی اور عارفہ موجود تھے مگر ان سے ملاقات نہیں ہوئی اس کی۔ باہر ملازمہ سے پوچھ کر ہی چلی گئی
تھی۔

”نہیں، وہ گھر نہیں ہے۔“
”کچھ نہ کچھ کہہ کر تو گیا ہی ہوگا۔“ اُس کا انداز برابر کا تھا۔
”نہیں، کچھ بتا کر نہیں گیا۔“
”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ اُس نے سر کچھ اُڑا دیا اور اُنچا کر کے بے یقین انداز میں کہا۔ جو یہ یہ کو ان
کا یہ انداز اچھا نہیں لگا لیکن وہ خاموشی سے چلی گئی۔
”جب مزید آئے تو اُسے آؤ پر بھیج دینا۔“ اب اُس نے راتھ کو کہا۔
راتھ نے کچھ کہنے کے بجائے اثبات میں سر ہلا دیا۔
”بھیج دینا۔۔۔ ایسا نہ ہو کہ جان بوجھ کر بھول جاؤ۔“
وہ اتنا کہہ کر واپس چلی گئی اور جا کر ماں سے کہا۔

”ممائی یہ بات پسند نہیں کرتیں کہ ہم لوگ مزید سے ملیں۔“ میں اس کے بارے میں پوچھنے لگی
یہ مجھے منہ بات بھی نہیں کی۔ ”اوپر جا کر مہناز نے مزید سے ملاقات نہ ہونے کا غصہ جو یہ یہ پر اُٹا
اور وادہ تو دیے بھی چلی گئی یعنی بیگم تھیں، پورا ہو گئیں۔

”آئے تو دو مزید کو۔ ایک ایک بات بتاؤں گی، یہ خود کو سمجھتی کیا ہے، اس کا کیا حق ہے اس لئے
پر، راخون ہے، جاؤں تو اس کے پاس جانے سے ہی روک دیں۔

ہونہ۔۔۔ اسمتھروں کے خاندان سے ہے اور بن بیگم اتنے اچھے خاندان کی بہو۔۔۔ اب اسی لئے
تو پھر زین پر نہیں نکلتے۔ مگر آجائے مزید گرانی ہوں اسے تو منہ کے بل۔“ وادہ تو کب سے بیٹا
کئے بیٹھی تھیں کہ مہناز کے لئے مزید سے بہتر اور کوئی نہیں لیکن اب انہیں یہ معاملہ اتنی آسانی سے لے
ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا۔

راتھ، ماں کے انداز پر الجھ کر رہ گئی تھی۔ اُن کی خاموشی، اُداسی اور تھکن پریشان بھی کر رہی تھی، اُن
انتظار تھا، مزید جلدی کہہ جائے کہ وہی ماں کو خوش رکھتا تھا۔ کچھ دیر جو یہ یہ کے پاس بیٹھنے کے بعد

نبیلہ پوری طرح تیار دکھائی دے رہی تھی۔ وہ ضرور..... قبول کر لیتی اس کی آفر اور زبردستی مجھے بھی اپنے ساتھ کھینچ لیتی۔ وہ شاندار تھا مگر کوئی ایسی بات جو میں سمجھ تو نہیں سکتی مگر تھی ضرور جو مجھے ڈر لگا تھا۔ ”وہ سوچتا نہیں چاہتی تھی مگر ہزار کوشش کے باوجود نا کام تھی۔ وہ تھایا اس کا خیال، ایک ہی بات تھی ناں، بس قافیض تھا وہ اس کے دل و ذہن پر۔

”نبیلہ سب دوستوں کو میرے اس لکراؤ کی داستان خوب نمک مرچ لگا کر سنائے گی، پھر سب خوب نہیں گی مجھ پر، کتنا مذاق بنائیں گی میرا اور سب سے آگے تو یہ نبیلہ کی ہنسی ہوگی۔ ہائے نبیلہ ہے بڑی ذلیل اور وہ..... شاید وہ بھی میرے ہی بارے میں سوچ رہا ہوگا، ہنسا ہوگا..... حوالیا ہوگا..... کتنی غلطی ہوئی مجھ سے..... مجھے راستہ دیکھ کر چلنا چاہئے تھا..... سارا قصور نبیلہ کا ہے کیوں وہ آگے آگے بھاگی جا رہی تھی“ رانچہ کی جوانی نوخیز تھی اور یہ حادثہ پہلا پہلا بھی تو تھا ذہن سے چپک کر رہ گیا اور پھر وہ بھولنے والی..... چیز بھی تو نہیں تھا۔

یاسمین بیگم نے گلوکاری تو عرصہ ہوا چھوڑ دی تھی مگر گمنامی میں پناہ کی ہزار کوشش کے باوجود وہ نا کام رہی، لوگ جاننے تھے لہذا پہچان لیتے تھے۔

اور اسی لئے ارد شیر کے ملازم کو ذرا سی کوشش کے بعد اس کے نئے گھر کا ایڈریس معلوم ہو گیا تھا..... اور وہ اس کا میا بی پر بہت خوش تھا، اطلاع دینے کے لئے فوراً اپنے صاحب کے پاس پہنچا تھا۔ جو نبی ارد شیر تک یہ خبر پہنچی، وہ ملنے کے لئے تیار ہو گیا حالانکہ کچھ دیر پہلے تک وہ آذر کی طرف جانے کا ارادہ کئے بیٹھا تھا۔

”تم نے اچھی طرح پتا کر لیا ہے ناں، وہ وہیں رہتی ہے، ایسا نہ ہو پہلے کی طرح نا کا لوشا پڑے، اب ایسا ہوا تو یاد رکھنا تمہارا خیر نہیں.....“ جی صاحب..... میں نے پوری معلومات حاصل کر لی ہیں..... اس مرتبہ غلطی نہیں ہوئی مجھ سے.....

ارشاد کے ساتھ وہ سوہا کے فلیٹ تک آیا اور ارشاد نے آگے بڑھ کر کال بیل کا بٹن پش کیا۔ ذرا دیر انتظار کے بعد دروازہ کھل گیا، اب ان کے سامنے کھمرے بالوں والی ایک بوڑھی سی عورت کھڑی سوالیہ انداز میں ان کی جانب دیکھ رہی تھی۔

چہرے مہرے اور حلیے سے وہ ملازمہ دکھائی دیتی تھی۔

”کس سے ملنا ہے آپ کو.....؟“

ارد شیر کی شخصیت اور لباس سے مرعوب ہو کر اس نے بڑے ادب سے پوچھا۔

”یاسمین بیگم یہیں رہتی ہیں.....؟“ اُس نے ٹھہرے ہوئے انداز میں پوچھا۔

جواب اثبات میں ملا۔

”ہم ان ہی سے ملنا چاہتے ہیں۔“ منصوبے کے مطابق اسے سوہا کا نہیں بلکہ یاسمین بیگم کا ہی نام پڑا تھا۔

”جی ہاں، بیگم صاحبہ گھر پر موجود ہیں.....“ ملازمہ اب بھی دروازے کے عین درمیان راستہ روکے

ہے، وہ کسی کام کا نہیں..... اور ہاں مہناز صاحبہ بہت یاد کر رہی تھیں آپ کو۔“

”جہنم میں ڈالو مہناز کو..... یہ بتا دینا گھر آ کر دوبارہ گئے ہیں یا آئے ہیں نہیں۔“

”نہیں وہ گھر نہیں آئے..... اور بھائی، وہ ممانی آپ کا بہت پوچھ رہی تھیں۔ آپ گھر پر ہوتے ملاقات ہو جاتی.....“

مزید نے اثبات میں سر ہلادیا، وہ سوچ رہا تھا۔

شاید وہ لوگ طلال کے بارے میں کوئی اطلاع دے کر گئے ہیں جو مہناز پریشان ہو گئی ہیں..... وہ چپکے کرنے اپنے کمرے میں چلا گیا۔

مہناز نے اوپر سے اسے گھر آتے دیکھ لیا تھا اور وہ کب سے اس کی آمد کی منتظر تھی، اب خود اپنے آگئی.....

”میں نے جنہیں کہا تھا جب مزید آئے تو میرے پاس بھیج دینا.....“ وہ رانچہ سے مخاطب تھی، انداز سراسر حاکمانہ تھا۔

”آپ نے کہا تھا بھائی کو بتادینا، میں نے بتا دیا ہے۔“ رانچہ کو بھی برا لگا۔ اُس کی جانب دیکھے بغیر فرج میں سلا کی پلیٹ رکھتے ہوئے کہہ دیا۔

مہناز نے شانے جھٹک کر ”ہونہہ“ کہا اور چلی گئی..... ذرا دیر کے بعد وہ مزید کے کمرے میں موجود اس سے کہہ رہی تھی.....

”میں تم سے سخت ناراض ہوں۔“

”تم بھی خفا ہو، لوگ بھی برہم ہیں دوستو

اب ہو چلا یقین کہ برے ہم ہیں دوستو“

”مذاق میں مت نا لو مزید یاد ہے کل تم نے کچھ وعدہ کیا تھا مجھ سے۔“

”کیا ہوگا..... وعدے تو دن میں جانے کتنے کرتا ہوں اور کس کس کے ساتھ کرتا ہوں۔“ وہ ان وقت اسے ٹالنے کی کوشش میں تھا۔

”تم نے کہا تھا مجھے اپنے ساتھ شاپنگ کے لئے لے کر جاؤ گے۔“

”اور اب میں ہی کہہ رہا ہوں، نہیں لے جا سکتا۔“

”کیوں.....؟“ مہناز منہ پھلا کر اس کے بیڑ پر دھپ سے بیٹھ گئی۔

اس سے پہلے کہ وہ جواب میں کچھ کہتا، دروازے پر دستک ہوئی اور پھر ملازم ڈھلے کپڑے لے کر اندر چلا آیا۔

رانچہ نے دھرتو کاموں میں الجھی رہی مگر رات تو اپنی تھی۔ دوپہر کو بازار میں ہونے والا کراڈا آگیا۔ بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی..... اس کی آنکھیں بہت سحر انگیز تھیں..... شخصیت غیر معمولی ایک دم سے ڈسٹرب کر دینے والی مگر اس کا انداز..... رانچہ نے جیسے گہرا کر کھل اچھی طرح اپنے ارد گرد لپیٹ لیا۔

”بہت برا انداز تھا اس کا.....“ اُس نے گھر کے کچھ کے ساتھ یاد کیا اور بازو آنکھوں پر رکھ لیا۔

وہ بہت منفرد بارعب اور پراڈ سا لگا تھا۔ پھر بھی اُس نے ہم سے بات کی، ڈراپ کرنے تک۔

آفر کر ڈالی مگر وہ ایسا نہیں تھا جس پر آنکھیں بند کر کے میں یقین کر سکتی، اچھا ہی ہوا جو میں چل پڑی رہی

”مگر کاجر کیسے چلاتی ہیں؟ میرا مطلب ہے بیماری پر تو بہت رقم اٹھ جاتی ہوگی۔“ اُس نے دوبارہ کھوجنا چاہا۔

”اب تو علاج کروانا ہی چھوڑ دیا ہے شاہ صاحب، ویسے میں کچھ اتنی بھی بیمار نہیں ہوں، چلنے بھرنے سے معذور ضرور ہوگئی ہوں مگر اس پر راضی ہوں تو معذوری اب معذوری لگتی ہی نہیں۔“ بانی صحت اللہ کے فضل سے ٹھیک ٹھاک ہے۔“

”میں نے سنا ہے آپ گانا چھوڑ چکی ہیں۔“

”ہاں ٹھیک سنا ہے آپ نے، گانا میرا خاندانی پیشہ نہیں تھا، بس حالات لے آئے تھے اس طرف۔ مگر جی نہ لگا تو میں خود کو اس ماحول میں ڈھال ہی نہ سکی۔ اب اس پروفیشن کے لوگوں نے مجھے چھوڑ دیا ہے اور میں نے انہیں چھوڑ دیا۔ اب بالکل نہیں گاتی۔“

”اگر کوئی معقول معاوضے کی بات کرے اور اسے ہاں بہت عزت سے مدعو کرے تب آپ کا جواب کیا ہوگا یاسمین بیگم؟“ اردشیر ایسا ہی تو منصوبہ بنا کر آیا تھا سو یہ سوال کرنا تو بہت ضروری تھا۔

”اُس کی مہربانی بہت بہت شکریہ۔ مگر میں معذرت ہی کرلوں گی۔ اب جی ہی نہیں لگتا اس کام میں۔“ وہ اس کی بات سمجھ گئی اور تمیز سے انکار کر دیا۔ اُس کی یہاں موجودگی انہیں پریشان تو بہت کر رہی تھی۔ وہ چاہ رہی تھیں سوہا کی آمد سے پہلے پہلے وہ یہاں سے چلا جائے۔

دوسری طرف اردشیر کے لئے یہاں کوئی کشش نہیں تھی۔ وہ موسیقی کا کوئی ایسا رسیا نہیں تھا اور نہ ہی گانے بجانے والوں کو اچھی نگاہ سے دیکھتا تھا۔

عجیب الجھن میں تھا کہ آڈرنے تو یہی بتایا تھا، وہ لڑکی اپنی آغوش کے پاس رہتی ہے اور آغوش مشہور گلوکارہ یاسمین بیگم ہے تو پھر کہاں ہے وہ لڑکی؟

”کوئی عزیز، رشتے دار بھی تو ہوں گے آپ کے؟“ پھر کچھ سوچ کر یہ سوال اٹھایا۔

وہ یاسمین بیگم کے انداز میں مسکرائیں اور اُس کی جانب یوں دیکھا جیسے اس کی عقل پر شبہ ہو اور یہ بگوانہ سوال انہیں کچھ کوفت میں مبتلا کر گیا ہے۔ سمجھانے والے انداز میں لہجوں پر زور دے کر گویا ہوئیں۔

”عرض کیا ہے ناں شاہ جی۔ حالات نے مجھے گانے پر مجبور کیا تھا، نہ تو خاندانی گلوکارہ ہوں اور نہ ہی شوق مجھے اس راستے پر لایا تھا اگر اتنی بڑی دنیا میں کوئی اپنا ہوتا تو پھر ادھر آ کر یوں خوار ہوتی۔“

”ہاں یہ تو ہے۔“ اردشیر کو ان کے اس انداز پر غصہ تو بہت آیا مگر ضبط کر گیا اور معقولیت سے سر ہلا کر یوں بولا جیسے اب ان کی بات پوری طرح سمجھ میں آئی ہو۔

کچھ دیر دونوں طرف خاموشی رہی، ان کا انداز اردشیر کو مزید کچھ کہنے سے روک رہا تھا۔ اور یاسمین بیگم وہ تو چاہ رہی تھیں اب بس یہ یہاں سے چلا جائے، آخر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”اب چلتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے جیسے آپ کی مرضی۔“ انہوں نے اطمینان کا سانس لیا۔

”میں پھر آؤں گا۔“ جانے سے پہلے اُس نے کہہ دیا۔

”کیا کریں گے یہاں آ کر آپ کی دلچسپی کے لئے یہاں پر کچھ بھی نہیں۔“ انہوں نے عینک

کھڑی تھی۔

”عجب بدتمیز ملازمہ ہے۔“ اردشیر نے الجھ کر سوچا، پھر ہاتھ کے اشارے سے اسے پچھڑا کر کہا اور اندر آ گیا جبکہ ارشاد باہر ہی رُک گیا تھا۔

ملازمہ کی رہنمائی میں وہ کمرے تک آیا اور دیکھا یہاں پر جو خاتون موجود تھیں، وہ کہیں سے گانے والی دکھائی نہیں دیتی تھیں، سادہ کمزوری خاتون وکیل چیئر پر بیٹھی اخبار دیکھ رہی تھیں۔

”یقیناً یہ کوئی اور ہوگی۔“ یہ سوچ کر اردشیر نے سوالیہ انداز میں ملازمہ کی جانب دیکھا۔

”یہ یاسمین بیگم ہیں۔“ اُس نے بتایا۔ تب اُس نے ایک حیران سی نظر ان پر ڈالی۔

کو حیرت تھی، ملے آیا ہے مگر پہچانتا تک نہیں۔

یاسمین بیگم نے پہلے اخبار میز پر ڈالا، پھر عینک آنکھوں سے ہٹائی اور اسے دیکھ کر بولیں۔

”کون صاحب ہیں آپ؟“ معاف کیجئے گا میں پہچان نہیں پا رہی۔“ انجمنی یوں چلا آیا۔

بیگم یاسمین کو اچھا نہیں لگا۔ مگر جب مخاطب ہوئیں تو لہجہ شائستہ اور مضبوط تھا۔

”مجھے اردشیر شاہ کہتے ہیں، آپ کی شہرت سن کر ملنے کے لئے آیا ہوں۔“

”شہرت، کیسی شہرت؟“ وہ استہزائیہ انداز میں ہنس پڑیں پھر ایک دم سے بے حد متحیر ہوئے ہوئے بولیں۔

”اب آہی گئے ہیں تو تشریف رکھئے۔“ (الفاظ جو بھی تھے مگر لہجہ کھر در انہیں تھا)۔

”بہت دکھ ہوا آپ کو اس حال میں دیکھ کر، کب سے بیمار ہیں آپ؟“ مجھے تو علم ہی نہیں تھا،

نئے چوک گیا تھا۔

وہ مسکرائیں اور بغیر کسی تاثر کے بولیں۔ ”جو قسمت میں لکھا ہو، وہ تو ہو کر ہی رہتا ہے اردشیر صاحب اور میں اپنے رب کی رضا پر راضی ہوں۔ اچھا ہے گناہوں کی سزا دنیا میں ہی بھگت لی جائے۔

کیوں آپ کا خیال ہے اس بارے میں۔“

”جی۔“ وہ صرف اتنا ہی کہہ سکا۔ ایک گانے والی کے منہ سے اس طرح کی باتیں نہ

حیرت ہو رہی تھی۔ پھر ذرا توقف کے بعد بولا۔

”اکیلی رہتی ہیں آپ یہاں؟“

”ہاں۔ مگر نہیں۔ یہ ملازمہ اس سے تو آپ ملے ہیں یہ یہیں رہتی ہیں۔ چوبیس بجے میرے ساتھ۔ جیسے یہ بھی حصہ ہو میرے وجود کا۔“ یاسمین بیگم نے دنیا کو بہت قریب سے پرکھا تھا۔

لفظوں سے زیادہ کہنے والے کا چہرہ اور آنکھیں پڑھنے کو ترجیح دیتی تھیں۔

اردشیر کو دیکھتے ہی پہچان گئی تھیں یہ امیر زادہ کس قماش کا ہے سو اس لئے سوہا کا ذکر بڑے آرام سے

گول کر گئیں۔

ان کے اس سوال پر اردشیر کو بڑی الجھن ہوئی جس کے پیچھے وہ یہاں تک آیا تھا، اس عورت نے

مطابق وہ تو یہاں رہتی ہی نہیں تھی۔ یہ عورت جھوٹ بول رہی ہے۔ اُس نے تو لٹی لگا ہوں ہے؟

بیگم کو دیکھا مگر مقابل اس سے کہیں زیادہ ہوشیار تھا، وہ اس کے چہرے سے اس جھوٹ اور جھجکا

لگانے میں ناکام رہا مگر اتنی جلدی ہار نہیں مانی۔

ہاتھ تھا۔ میڈم فیروزہ سے اُس کی ملاقات تقریباً ایک سال پہلے ہوئی تھی۔ اُس وقت اردشیر کے ساتھ جو دوست تھا، اُس نے ہی ان دونوں کا تعارف کرایا تھا۔ پھر دو تین بار کی ملاقاتیں..... اُن کی گہری دوستی کا باعث بن گئیں۔

میڈم فیروزہ اردشیر کے مگر جب پہلی مرتبہ آئی تھیں، تب ہی اندازہ لگا لیا تھا، یہ امیر زادہ شاہ خرچ ہے اور انہیں ایسے لوگ بڑے اچھے لگتے تھے۔ پھر ان کے ہاں نیو ایر کا فنکشن، نئی کوٹھی میں شفٹ ہونے پر دی جانے والی پارٹی اور اس کے علاوہ دیگر چھوٹی موٹی تقریبات ان سب میں اردشیر کی شرکت لازمی تھی۔

اگر کبھی وہ انکار کرتا تو میڈم بڑے ناز سے ناراض ہونے کی دھمکی دے ڈالتیں۔ اس کی بھانجی نورین بھی خوب ہی اصرار کرتی اور اردشیر کو اُن کے کا وعدہ کرتے ہی مٹی، ویسے یہ سچ تھا کہ اُن کے ہاں ہونے والی ہر تقریب ہوتی تو بہت شاندار تھی۔

میڈم فیروزہ کے بارے میں طرح طرح کی افواہیں تھیں، لوگ کہتے تھے..... کئی کئی شوہر کر چکی ہیں، بڑی دنگ خاتون ہیں، جس کام میں ہاتھ ڈال دیں پیچھے نہیں ہٹیں..... مرد تو بہت مانتے تھے جبکہ خواتین کی اکثریت خاصا نا پسند کرتی تھی۔

”کیا بات ہے، بہت تھکے ہوئے دکھائی دے رہے ہو، کب تو نورین کو بلا دوں، وہ ابھی کل ہی ذکر کر رہی تھی تمہارا.....“

”نہیں فی الحال میں کسی سے بھی ملنا نہیں چاہتا۔“ اُس نے صاف منہ کر دیا۔

”یہ بتاؤ، چائے، کافی یا ٹھنڈا..... کیا لینا پسند کرو گے.....؟“

”کچھ بھی نہیں، بس میں تھوڑی دیر بعد چلا جاؤں گا۔“

”آخر ہوا کیا تمہیں، کچھ تو بتاؤ اگر یہاں ایڑی ٹپٹ نہیں کر رہے تو بیڈروم میں آ جاؤ۔“

اردشیر نے جواب نہیں دیا۔ دائیں ہاتھ سے پیشانی سہلاتا رہا۔ سوہا سے ملاقات نہیں ہو سکی تھی، اس وجہ سے مجھٹھا ہٹ انہی تک دل و دماغ پر ہلکے سے غبار کی طرح چھائی ہوئی تھی۔ دل اس کا کہیں بھی نہیں لگ رہا تھا۔

”شاہ..... چند روز بعد میرے کالج میں ایک فنکشن ہے، کیا خیال ہے چیف گیسٹ تمہیں نہ بتا لوں۔“

”مجھے.....؟“ وہ مذاق سمجھا..... ”آئیڈیا تو بہت اچھا ہے۔“

”ہاں ہاں، تم سے بہتر اور کون ہوگا۔ بس کچھ ڈونٹ ہی تو کرنا پڑے گا اور یہ تمہارے لئے کوئی ایسی بڑی بات تو نہیں۔“

”ارے میڈم تم تو واقعی سیریس ہو۔“ اب وہ چونکا۔

”تو اور کیا میں تم سے ایسا مذاق کروں گی۔“

”سوچ لو میڈم اور یہ بھی دھیان میں رکھو اس سے پہلے مجھے کبھی ایسا اتفاق نہیں ہوا۔ کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔“

”کچھ نہیں ہوگا یہ کوئی ایسی مشکل بات تو ہے نہیں، تم نے بھی اپنے تعلیمی دور میں مختلف موقعوں پر

آنکھوں پر جماتے ہوئے ہاتھ اخبار کی جانب بڑھایا۔

اردشیر منہ بنا کر کمرے سے چلا گیا۔ اُنہوں نے ملازمہ کو اشارہ کیا، جا کر بیرونی دروازہ پر ”بی بی..... کون تھا یہ.....؟ میں نے پہلے تو اسے کبھی نہیں دیکھا۔“ دروازہ بند کر کے واپس پوچھنے لگی۔

”ان لوگوں کا الگ سے نام کب ہوتا ہے سرداراں، یہ سب تو ایک ہوتے ہیں..... ہانگ جیسے، تم سمجھ رہی ہونا میری بات.....“

”ہاں بی بی، اب تو سمجھ گئی ہوں.....“ ملازمہ اثبات میں سر ہلا کر بس پڑی پھر بولی۔

”پر بی بی، اب یہ یہاں کیا لینے آیا تھا.....؟“

”اسی بات پر تو میں حیران ہوں، آخر کون سی کشش اسے یہاں تک لائی ہے اور سنو دروازہ..... کوشش کرنا دروازے سے ہی ٹپ ل جائے، اندر نہ آنے پائے، یہ تو اچھا ہوا آج سوہا گھر پر نہیں ضروری تو نہیں ہے کہ آئندہ بھی وہ گھر نہ ہو۔“

”ٹھیک ہے بی بی، اس بار تو مجھے پتا نہیں تھا کہ یہ کون ہے، اب جان گئی ہوں، کہہ دوں گی، کوئی ہے ہی نہیں۔“

اردشیر کو سوہا کے نہ ملنے پر سخت غصہ تھا اور اس غصے میں وہ آذر کے آفس چلا آیا، خیال تھا کہ سوہا کے بارے میں پوچھنے کی کوشش کرے گا مگر وہاں جا کر غصہ اور بھی سوا ہوا کہ آذر موجود ہی نہیں سیکرٹیری نے بتایا.....

”شفا کپہنی کے ساتھ میٹنگ تھی، وہیں گئے ہیں..... آپ بات کر لیں۔“ مگر وہ آنے سے سائے ڈر گفٹگو کر سکتا تھا۔ اُس نے ارشاد کو یہیں سے واپس بھیج دیا..... اور خود گاڑی لے کر میڈم فیروزہ کی طرف چلا آیا۔

ملازم نے بتایا تھا میڈم گھر پر ہیں، پھر بھی اسے بیس منٹ انتظار کی کوفت اٹھانا پڑی۔ مگر اب انہوں نے نہیں تھی۔ اس قسم کی خواتین مہمانوں کے سامنے آنے سے پہلے تیاری میں کم از کم اتنا نام تو لگنا ہیں۔

”اوہ شاہ..... تم آئے ہو، مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا بھی.....“ ہاف سیلیوس بلاؤں، بلک ساڑا چہرے پر میک اپ کی موٹی تہہ، فربہ اندام، ادھیر عمر میڈم فیروزہ..... اُسے دیکھ کر خوشی کے اظہار کے چلائی تھیں اور اب کسی نازک اندام حسینہ کی مانند اٹھلائی چلی آ رہی تھیں۔

اردشیر صوفے پر بیٹھا تھا۔ ٹانگ پر ٹانگ بجا رہی تھی، میڈم کو دیکھ کر نہ تو چہرے پر مسکراہٹ آئی نہ ہی منہ سے کچھ بولا۔ بس یونی بیٹھا دیکتا رہا۔ قریب آ کر انہوں نے گریجویٹ سے ہاتھ ملا بولیں.....

”کہو آج تم ادھر کیسے آ گئے.....؟ تمہیں تو بلانے کے لئے مجھے ہمیشہ کوئی نہ کوئی فنکشن ارٹنگ تھا ہے۔“

”تمہاری یاد نے کھینچا اور ہم کچھ چلے آ گئے۔“ اردشیر اب ذرا سیدھا ہوا کر بیٹھا تھا۔ عمر کا فرق احترام کا جذبہ ابھارتا ہے مفقود تھا..... مگر نہ تو کہنے والے کو احساس تھا اور نہ ہی سننے والا اس کے انداز

دیکھیں تو ہوا نہ گئے۔ چیف گیسٹ، کچھ بھی تو نہیں کرنا پڑتا بس ادارے کی کارکردگی پر اطمینان کا اظہار کرتے لہوئے جھوٹی سی تقریر اور رقم کا چیک۔

”تقریر..... نہ بھی یہ کام میرے بس کا نہیں۔“

”اب انکار نہیں چلے گا، میں تو فیصلہ کر چکی ہوں۔ جلد ہی ڈیٹ بھی بتا دوں گی..... اور تم سب بڑے تقریر بھی مت کرنا لیکن آنا ضرور۔“

”اچھا..... چلو نمٹک ہے آ جاؤں گا۔“ اسے بھی یہ بات نئی اور دلچسپ لگی سو مان ہی گیا۔



وہ سائیکل پر سوار گھر کی طرف آ رہا تھا، آج ٹیوشن..... پڑھاتے ہوئے خاصا نام ہو گیا تھا۔ اب میں بچہ تھا ہی اس قدر کند ذہن، کئی بار عمر کا جی چاہا کہ اس کے والدین سے صاف کہہ دے، ”کوئی اور انتظام کر لیں، میں اس کے ساتھ سر نہیں کھا سکتا۔“

مگر پھر جب اپنی خالی جیب اور گھر کی ضرورتوں کا خیال آتا تو وہ کہتے کہتے رُک جاتا۔

”اماں تو کب سے میری منتظر ہوں گی..... صبح اُن کی طبیعت بھی اچھی نہیں تھی اب میری طرز سے پریشان ہو رہی ہوں گی۔ پتا نہیں دوا بھی کھائی ہے انہوں نے یا بھول گئیں۔“

اپنے خیالوں میں الجھا ہوا تھا، اچانک سامنے سے گاڑی آ گئی۔ عمر نے بروقت سائیڈ پر ہو کر فوراً اس کی زد سے توجہ لیا مگر سائیکل سمیت سڑک پر گر جانے سے خود کو نہیں بچا سکا۔

”تمہیں چوٹ تو نہیں آئی بھائی.....“ گاڑی سے ایک لڑکا اتر کر پریشانی کے عالم میں اس کی جانب لپکا۔

روڈ پر گرنے سے کچھ چوٹ لگی تھی..... اور کچھ اس متوقع حادثے کی وجہ سے اس کے اعصاب بدلے طرح متاثر ہوئے تھے۔

وہ فوری طور پر نہ تو کچھ سن سکتا تھا اور نہ ہی اسے کچھ دکھائی ہی دے رہا تھا۔

گاڑی والے نے سہارا دے کر کھڑا کیا اور دیکھا، اس کے بازو سے خون بہہ رہا ہے۔

”قصور میرا نہیں، تم پتا نہیں کن خیالوں میں کم سائیکل لہراتے چلے آ رہے تھے، شکر کرو پتی ہو گئی۔“

عمر نے اب اُس کی جانب دیکھا مگر بولا کچھ نہیں، آنکھوں کے سامنے ماں اور راجہ کے چہرے آ گئے تھے۔ اگر اُسے کچھ ہو جاتا تو ان دونوں کا کیا بنتا۔

اجنبی نے پہلے سہارا دے کر اسے گاڑی میں بٹھایا پھر سائیکل اٹھا کر ڈگی میں رکھی۔ ”یہ آپ کیا کر رہے ہیں.....؟“ اُس نے پہلی مرتبہ زبان کھولی۔

”خون بہہ رہا ہے..... تمہاری ڈریسنگ کروا دیتا ہوں۔“

گاڑی والے بھی سینے میں درد مند دل رکھتے ہیں، عمر نے کچھ حیران سا ہو کر اس کی طرف دیکھا۔

”ایسے کیا دیکھ رہے ہو چھوٹے بھائی.....؟“ وہ مسکرا دیا۔

”میں حیران ہوں، دولت مند ہو کر بھی آپ کا دل غریبوں کے لئے حساس ہے۔“

”ارے دل مردہ ہونے کے لئے جتنی دولت درکار ہوتی ہے، اتنی میرے پاس نہیں ہے۔“

”نہ پڑا.....“ عمر میں تو بہت غریب سالز کا ہوں۔“

”جبکہ میری ماما کہتی ہیں، سب انسان برابر ہوتے ہیں، نام کیا ہے تمہارا.....؟“ ڈرائیونگ کے دوران وہ اس سے باتیں بھی کئے جا رہا تھا۔

”عمر..... مجھے عمر کہتے ہیں.....“

”عمر..... بہت اچھا نام ہے اور میں مزید حسن ہوں۔ تم مجھے بھائی کہو یا دوست، مجھے خوشی ہوگی۔“ اجنبی بہت مہربان صاف اور کھرا تھا..... عمر کو بہت اچھا لگا۔

ڈرائیونگ کروانے کے بعد جب مزید نے گھر تک ڈراپ کرنے کی آفر کی تو وہ صرف اسی لئے انکار نہیں کر سکا کہ وہ اور اس کی باتیں بہت اچھی لگ رہی تھیں۔ وہ اس کی کہنی میں کچھ دیر رہنا چاہتا تھا۔

اس تھوڑے سے سفر کے دوران ہی اُس نے عمر سے بہت سی باتیں پوچھ لیں..... وہ کہاں رہتا ہے..... کیا کرتا ہے، کتنے بھائی بہن ہیں اور اُس کی محنت کے بارے میں سن کر بہت متاثر ہوا۔

”اچھا عمر..... پھر بھی ملاقات ہوگی.....“ اُس گلی میں اُتار کر وہ کہہ رہا تھا۔

”نہیں مزید بھائی، یوں نہیں..... بے شک یہ گھر آپ کے لائق نہیں ہے مگر پھر بھی میری خواہش ہے آپ آئیں اور میرے ساتھ چائے پیئیں۔“

”بھائی کہہ دیا ہے تو پھر میں بھائی کی بات کیسے ٹال سکتا ہوں۔“ وہ بھی فوراً راضی ہو گیا۔

دروازہ اماں نے کھولا اور بیٹے کے بازو پر پٹی بندی دیکھ کر دل تمام لیا۔

”ارے ماں..... کچھ نہیں ہوا، بس سائیکل سے گر پڑا تھا..... تھوڑی سی چوٹ لگ گئی۔ پٹی کی ضرورت بھی نہیں تھی مگر انہوں نے زبردستی بندھوا دی۔“ وہ ماں کو تسلی دے رہا تھا۔

مزید نے آگے آ کر سلام کیا..... انہوں نے دُعاؤں سے نوازا۔ وہ اسے جانتی پہچانتی نہیں تھیں، مگر بیٹے کے ساتھ آیا تھا تو کوئی اپنا ہی تھا۔

”میں عمر کا دوست ہوں۔“ اُس نے خود ہی اپنا تعارف کرایا۔

”اچھا بیٹے..... عمر کے دوست ہو تو میرے بیٹے ہو..... دیے پہلے تمہیں دیکھا نہیں میں نے۔“

”جی پہلے میری شکل اور طرح کی ہوئی تھی، حال ہی میں تبدیل کروائی ہے۔“ زیتون سمجھیں نہیں، عمر غصہ پڑا..... اور ہاتھ پکڑ کر اسے بیرونی دروازے کے قریب بنے کمرے میں لے آیا۔ یہ یقیناً اس گھر کا ڈرائنگ روم تھا۔ وہ اُسے بیٹھنے کا کہہ کر ماں کے پلس چلا آیا۔

”اچھی سی چائے بنائیں، کسی بچے کو بھیج کر سو سے بھی منگوا لیں..... یہ کون ہے، بعد میں بتاؤں گا..... اور یہ راجہ آپ کی کہاں ہیں، دکھائی نہیں دے رہیں۔“

”ہاں، وہ سامنے والوں کی طرف گئی ہے، کوئی کام ہے تو بلوا دیتی ہوں۔“

”نہیں نہیں رہنے دیں، میں تو ویسے ہی پوچھ رہا تھا۔“

اس عرصے میں مزید نے کمرے کا جائزہ لے لیا..... چار کرسیاں اور ایک میز جس پر سفید میز پوش تھا، اور اس پر ایک خوبصورت سا پھول شونخ رنگوں سے کڑھا ہوا تھا..... کمرے کا ایک دروازہ کھنک کی جانب کھلتا تھا اور ایک باہر کی گلی میں اور ایک کھڑکی بھی تھی جو گلی میں کھلتی تھی..... اور وہ دیکھ رہا تھا بچے اُس

عمر اس کے پاس بیٹھک میں آگیا۔ ذرا دیر اماں اور اُن کے پیچھے چائے کی ٹرے اٹھائے رابعہ بھی بیٹی۔ بظاہر بڑے سلیقے سے سلام کیا۔
”یہ ملازمہ ہے آپ لوگوں کی.....“ اُس نے سنجیدگی سے پوچھا اور رابعہ نے غصے سے ٹرے میز پر

ڈالی۔
”نہیں نہیں، یہ میری بہن ہے۔ رابعہ نام ہے اس کا۔“
”اچھا..... سوری.....“ مزید نے بدلہ تو لے لیا تھا۔

”عمر، میں اندر جا رہی ہوں، چائے خود ہی بنا لیتا۔“ وہ ہلٹ گئی۔
”یہ شاید برا مان گئیں.....“ مزید نے بظاہر بڑی شرمندگی سے کہا۔
”نہیں نہیں، تم چائے پو بیٹے، اس لڑکی کا تو دماغ خراب ہے۔“

جانے سے پہلے مزید نے پورے خلوص کے ساتھ عمر کو اپنے ہاں آنے کی دعوت دی۔
”مزید بھائی! میں بھلا آپ کے گھر.....؟ کیا پتا جب تک آپ بھول ہی چکے ہوں، مجھے وہاں جا کر شرمندہ ہونا پڑے۔“

”ارے ایسی کمزور یادداشت نہیں ہے میری، تم ضرور آنا۔“
”مزید بیٹا..... تم بھی چکر لگاتے رہنا۔“ زیتون کو بھی یہ لڑکا بہت اچھا لگا تھا۔
”جی خالہ ضرور، میں تو اب آتا جاتا ہی رہوں گا۔“

عمر گلی میں اس کے ساتھ آیا اور جب تک مزید کی گاڑی نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئی، ہاتھ ہلاتا



کی گاڑی کے گرد اکٹھے ہو رہے ہیں، پھر سامنے کے گھر سے ایک لڑکی باہر نکلی۔
”رابعہ آپا تمہارے گھر گاڑی والا مہمان آیا ہے۔“ بچوں نے کورس کے انداز میں اسے اطلاع دی۔ مزید جو بیڑی دچکی سے انہیں دیکھ رہا تھا، مسکرا دیا۔

”گاڑی والا مہمان.....“ لڑکی نے بے یقینی سے دُہرایا..... پھر اُوچی آواز میں بولی..... ”چلو، چلو، ہر وقت کوئی نہ کوئی جھوٹ بولتے رہتے ہو، میرا بھائی تیز سکھانے کے چکر میں آدھا رہ گیا ہے، پڑ لوگوں کو تیز نہیں آئی۔“
”نہیں نہیں آپا..... ہم سچ کہہ رہے ہیں، مہمان آیا ہے اور عمر بھائی بھی اُس کے ساتھ ہی آئے ہیں۔“

تجربہ رابعہ کی نظر اپنی بیٹھک کی کھلی کھڑی پر پڑی، وہ سامنے ہی بیٹھا یقیناً سب سن رہا تھا۔ جیڑ چہرے پر مسکراہٹ نمایاں تھی۔

رابعہ حیرت اور تجسس میں گلی پار کر کے گھر میں داخل ہوئی اور ہمیشہ کی طرح گھر میں داخل ہو کر عمر اُوچی آواز میں بلا کر مصایوں کی باتیں مزے لے لے کر سنانے کے بجائے دبے قدموں اماں کے پار چولہے کے قریب آکر کھڑی ہو گئی اور بولی.....

”کون آیا ہے ہمارے گھر میں.....؟“
”عمر کا دوست ہے۔“

عمر کا دوست اور گاڑی والا..... ”رابعہ نے حیرت کا اظہار کیا۔
”پتا نہیں کیا بات ہے، عمر زخمی ہے، پٹی بندھی ہوئی ہے مگر کہہ رہا ہے معمولی سی چوٹ ہے، میرا دل پریشان ہو رہا ہے بچے کے لئے۔“

”ہائے اللہ زخمی ہے۔“ رابعہ گھبرا کر اُس کے کمرے کی طرف چل دی۔ عمر کمرے سے باہر آ رہا تھا۔ رابعہ اسے دیکھ کر رُک گئی اور بولی.....

”چوٹ کیسے لگی..... لڑائی ہو گئی تھی کسی سے.....؟“
”میں تمہیں ایسا نظر آتا ہوں کیا.....؟“

”تم ایسے نہیں پر لوگ تو بڑے ذلیل کہتے ہیں۔“
”اچھا اچھا..... زیادہ جذبات میں آنے کی ضرورت نہیں..... میں سائیکل سے گر پڑا تھا۔ چوٹ لگ گئی ہے۔“

چھوٹے سے آنکھن میں جو باتیں ہو رہی تھیں، اُس کی آواز مزید تک بخوبی پہنچ رہی تھی اور اب اسی کے بارے میں ان الفاظ میں پوچھ رہی تھی۔

”یہ نمونہ کہاں سے پکڑ لائے ہو، وہ بھی گاڑی سمیت.....؟“
”سوچ سمجھ کے، بھائی ہے وہ میرا.....“ عمر نے ڈپٹ کر کہا۔

”لو اماں، تمہیں بیٹھے بٹھائے ایک اور بیٹا مل گیا۔“ رابعہ نے تمسخر اڑایا۔
مزید کا جی چاہا، یہ تیز طراری لڑکی سامنے آجائے تو ذرا مقابلہ ہو، جھگڑتی کیا ہے خود کو، بیٹھے بٹھائے مجھے نمونہ کہہ دیا ہے۔

لئے کباب ہی فرائی کر کے لے آؤ..... ساتھ میں چائے ہو تو کیا ہی بات ہے۔“
”آپ نے جو کچھ بنانا ہے کچن میں جا کر فٹے سے کہیں، بن جائے گا..... اور پلیز مجھے ڈسٹرب مت کریں۔“

”ہاں ہے مہنازا تنے اچھے کھانے بناتی ہے، بندہ انگلیاں چاٹتا رہ جاتا ہے۔“
”اچھا پھر میری دُعا ہے، آپ کی شادی مہنازا باجی سے ہو جائے، کھاتے رہنے عمر بھر اچھے کھانے۔“

”اور اٹھ کی بچی.....“ مزید نے چلا کر کہا مگر وہ کمرے سے چلی گئی، مزید اکیلا بیٹھ کر کیا کرتا، وہ بھی باہر چلا آیا.....

جو یہ یہ اخبار دیکھ رہی تھی، وہ اُن کے سامنے والی کرسی پر آ بیٹھا اور بولا.....
”کیا پڑھ رہی ہیں، ڈاکے کی خبر ہے یا قتل کی؟“
”نڈا کے کی خبر ہے نہ قتل کی.....“ انہوں نے اخبار ایک طرف ڈال دیا اور بولیں..... ”آج تم

اس وقت گھر پر کیسے نظر آ رہے ہو؟“
”جی..... میں نے سوچا آپ کا گلہ بھی دُور کر دوں..... مگر دیکھ لیں راتھ کو میری ذرا بھی پروا نہیں، گئی ہے اپنے کاموں میں..... چاہے تک نہیں بنا کر دی مجھے.....“
”اچھا میں ابھی پوچھتی ہوں اُس سے.....“

”اوہ نہیں..... نہیں ماما میں نے تو یونہی کہہ دیا تھا۔“ وہ اُٹھنے لگی تو ہاتھ پکڑ کر اُس نے پھر بٹھالیا اور بولا.....

”ہاں ہے، دو روز پہلے میری گاڑی سے..... ایک لڑکے کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔“
”ہائے اللہ..... مزید دیکھ کر چلایا کرو..... کچھ زیادہ نقصان تو نہیں ہوا۔“ جو یہ بے حد پریشان ہو کر بولی۔

”میں تو دیکھ بھال کر ہی ڈرائیو کرتا ہوں مگر وہ لڑکا ہٹا نہیں کن سوچوں میں گم تھا، سائیکل سیٹ آ کر آیا۔“

”زیادہ چوٹ تو نہیں لگی تھی اُسے.....“ وہ فکر مند تھی۔
”نہیں، بالکل نہیں، بس معمولی خراشیں ہی آئی تھیں اور میں نے خود ڈریسنگ کروائی، پھر گھر تک ڈراپ بھی کیا..... حالانکہ میرا تو کوئی قصور بھی نہیں تھا۔“

”بہت اچھا کیا تم نے..... لیکن یہ اتنی اہم بات تم دو روز کے بعد بتا رہے ہو مجھے.....“
”بس بھول گیا تھا، اگر اُسے یا مجھے زیادہ چوٹ لگتی تو بتا بھی دیتا..... ویسے وہ لڑکا ہے بہت اچھا..... بہت مخلص اور سادہ سا..... عمر نام ہے اُس کا..... میں اُس کے گھر گیا تو والدہ اور بہن سے بھی ملاقات ہو گئی..... والدہ بھی بیٹے کی طرح مخلص اور سادہ سی ہیں، ہاں بہن بہت تیز ہے مگر پریشانی کی بات نہیں، آپ کے بیٹے کے مقابلے کی پھر بھی نہیں۔“

جو یہ یہ پس پڑی اور بولی.....
”تم تو یوں مقابلہ کر رہے ہو جیسے رشتہ کرنا ہے اُن کے ہاں.....“

”راتھ چندا..... کیوں ادھر ادھر چکر لگا رہی ہو..... بیٹھ جاؤ کہیں دماغ نہ گھوم جائے تمہارا مزید کب اس کے کمرے میں آیا اُسے پتا ہی نہ چلا، وہ تو پورے خشوع و خضوع سے تقریر یاد کر رہا لگی ہوئی تھی۔“

”آپ کب آئے بھائی.....؟“ اُس نے رُک کر اُس کی جانب دیکھا۔
”پورے سوا چار منٹ سے یہاں کھڑا ہوں اور تمہیں مسلسل چکر لگاتے دیکھ رہا ہوں، کسی نے پھر دی ہے کیا.....؟“

”میں نے ڈیش میں نام لکھوایا ہے۔“ اُس کے بتانے کا انداز بڑا پر جوش تھا۔
”جواب میں مزید نے برا سامنا نہ بنایا اور بولا.....
”تم ضرور نام ڈبوؤ گی کالج کا۔“

”آپ ہمیشہ ایسی باتیں ہی کرتے ہیں..... مجال ہے جو کبھی حوصلہ بڑھایا ہو..... جبکہ کالج سب لڑکیاں میری اتنی تعریف کرتی ہیں اور نیچر بھی بہت پسند کرتی ہیں مجھے.....“
”اور تمہیں کسی کے کہے کا یقین نہیں، تم مان نہیں سکتیں جب تک میں بھی نہ کہہ دوں اور میری

مجبوری ہے کہ میں جھوٹ بول ہی نہیں سکتا۔“ اُس نے شرارت سے کہا۔
”اچھا..... جب میں فرسٹ پرائز لے کر آؤں گی تب پتا چلے گا آپ کو۔“ راتھ فحش سے بولی۔

”کیا پتا چلے گا..... ہوگی اندھوں میں کا نارنج بلکہ رانی.....“
”ٹھیک ہے، اب مجھ سے بات مت کریں اور جائیں یہاں سے، مجھے تیاری کرنا ہے۔“
”اچھا..... یہ بتاؤ، یہ لکھوائی کس سے ہے.....؟“ مزید جانے کے بجائے بیڈ پر آ بیٹھا۔

”آپ کو اس سے کیا.....؟“ وہ منہ بنا کر بولی۔
”میں تو اس لئے کہہ رہا تھا کہ ایک نظر دیکھ لیتا ہوں، کوئی کمی بیشی ہو تو ٹھیک کر دوں..... کہیں.....“

میری گڑیا کو اٹھنے کا شائبہ نہ پڑ جائے۔“
”آپ بیٹھیں یہاں، میں چلتی ہوں.....“

”ارے..... تم کہاں چلیں، سنو تو.....“ وہ اس کے پیچھے دوڑا۔
”سنائیں..... مگر ذرا جلدی.....“ وہ رُک گئی مگر پلٹے بغیر بولی۔
”یہ تقریریں وغیرہ کچھ کام نہیں آئیں گی..... کچھ ہانڈی چولہے کی بھی فکر کرو اور کچھ نہیں تو بہر۔“

”وہ بھی ہنس پڑا اور بولا.....

”میں تو جانیں رہا تھا، عمر زبردستی گھر لے گیا، جائے بھی پلائی..... مجھے اُن کے گھر کے مال حالات اچھے نہیں لگ رہے تھے۔ گھر بھی بہت چھوٹا سا ہے، مگر وہ لڑکا عمر بہت سختی ہے، پڑھ بھی رہا ہے اور نیشن بھی پڑھا تا ہے۔ وہ مجھ سے متاثر ہوا اور میں اُس سے..... یوں ہم دونوں متاثرین کی دوستی ہوئی۔ کہہ رہا تھا ”مزید بھائی دوبارہ ہمارے گھر ضرور آنا۔“

”تمہاری دوستی تو ہر کسی سے ہو جاتی ہے۔“ جویریہ نے تعریفی انداز میں کہا۔

”ہاں مجھے لگتا ہے دنیا میں اچھے لوگ زیادہ ہیں اور برے بہت کم۔“

”تم خود اچھے ہو، اس لئے تمہیں سب اچھے لگتے ہیں۔“ جویریہ نے محبت سے دیکھا۔



گر لڑکا کالج کال لڑکیوں سے کچھ کچھ بھرا ہوا تھا۔ مہمان خصوصی کی آمد کا انتظار تھا۔

رائحہ اور دوسری لڑکیاں جنہوں نے حصہ لے رکھا تھا، اُن کی عجیب کیفیت تھی، خود کو ہزار بار سمجھانے کے باوجود گھبراہٹ تھی..... رائحہ کو سہیلیاں بار بار تسلی دیتیں۔

”دیکھنا پہلا پرائز ہو گا تمہارا تم گھبرا نا نہیں، ہم تمہیں حوصلہ دیتے رہیں گے۔“

”ہائے..... مجھے تو لگتا ہے اسٹیج پر جا کر میں سب کچھ بھول جاؤں گی۔“

”کچھ نہیں ہو گا.....“ نیلہ اور فائزہ سمجھاتیں۔

پھر چیف گیسٹ کی آمد کا شور اُٹھا..... اساتذہ نے اسٹوڈنٹس کو خاموشی اور تیز کے ساتھ بیٹھنے کو کہا۔ یہ تو کسی کو بھی علم نہیں تھا کہ چیف گیسٹ ایسی حواسوں پر چھا جانے والی شخصیت ہوگی۔ خاموشی میں کچھ بے ساختہ خیر آمیز آوازیں اُبھری تھیں کہ آخر یہ شوخ شوخ نوجوان لڑکیوں کا تعلیمی ادارہ تھا۔

تالیوں کا شور اگر فوراً بلند نہ ہو جاتا تو یقیناً یہ آوازیں اسے چونکا دیتیں، وہ تو ویسے بھی بہت چوکنا رہتا تھا۔

تقریب کا آغاز ہوا، وہی روایتی انداز، ارد شیر اسٹیج پر آنے والی ہر لڑکی کو ایک نظر دیکھتا پھر میڈم فیروزہ سے باتیں کرنے لگتا۔

”بور تو نہیں ہو رہے.....؟“ میڈم فیروزہ پوچھ رہی تھیں۔

”انتابذوق نہیں ہوں۔“ اس پاپ کی چھوٹی اور اپنی پوزیشن کا خیال بات کے ساتھ بے ساختہ قہقہہ لگانے سے توروک گیا مگر یہ جملہ کہنے سے خود کو باز نہیں رکھ سکا۔

میڈم فیروزہ نے کچھ گھبرا کر اسٹاف کی طرف دیکھا، جن میں سے اکثر کے چروں پر بے گانگی اور بے زاری طاری تھی یقیناً انہوں نے اس کی آمد کو پسند نہیں کیا تھا، دل ہی دل میں میڈم سے اختلاف تھا مگر کہنے کی جرأت نہیں کر سکتی تھیں۔

میڈم فیروزہ نے پھر دوبارہ ارد شیر کی جانب دیکھا اور آنکھوں میں سرزنش کی کہ ”خدا کے لئے اس ماحول کا بھی کچھ خیال کر لو اور آرام سے بیٹھے رہو، نہ زبان سے گفتگو کرو اور نہ ہی آنکھوں کو تکلیف دو۔“

توقع تو نہیں تھی کہ وہ مانے گا مگر اسے بھی شاید میڈم کی حالت پر ترس آ گیا اور میڈم سے گفتگو کا

سلسلہ روک دیا.....

”ارے..... یہ لڑکی.....“ آنے والی کو دیکھ کر وہ چونک گیا تھا..... ایک کے بعد دوسری، تیسری اور پھر چارہنگہ بجانے پر مجبور تھا۔ وہ ذہن کے کسی گوشے میں موجود تھی..... اسے سوچنے میں ذرا بھی تو نہیں لگا۔

یہ تو وہی ہے جو بازار میں اس سے ٹکرائی تھی۔ کمال ہے اتنے چہرے ہر روز دیکھتا ہوں، بھول جاتا ہوں مگر اسے نہیں بھولا..... یہ شکل ذہن میں پوری طرح محفوظ ہے۔ آج پھر دیکھا تو یاد کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی کہ کہاں دیکھا تھا۔

”کون ہے یہ لڑکی.....؟“ اُس نے میڈم فیروزہ کی جانب جھک کر سرگوشی کی مگر وہ اس وقت کسی نچرے مخاطب تھیں، اس کی سرگوشی سنی ہی نہیں۔

”پتا نہیں کیا نام ہے اس لڑکی کا..... ابھی انا ڈسمنٹ تو ہوئی تھی۔ میں نے دھیان ہی نہیں دیا۔ مجھے کیا پتا یہ یہاں پڑھتی ہے۔ کتنی پیاری ہے اور کیا معصوم سا چہرہ ہے، ہر ہر انداز دلکش ہے۔

وہ جانے کیا کہہ رہی تھی، کیا موضوع تھا جس پر اسے بولنا تھا وہ تو پوری دلچسپی سے صرف اسے دیکھ رہا تھا۔

پھر آخر میں رائحہ نے پورے اعتماد کے ساتھ بولتے ہوئے مہمان خصوصی کی جانب دیکھا اور حیرت، شہید حیرت..... اچھا ہوا جو پہلے ادھر نہیں دیکھا لیا ورنہ یہ اعتماد کہاں رہتا۔ وہ چلی گئی تھی مگر اب تو ارد شیر کے لئے یہ ماحول بہت دلچسپی لئے ہوئے تھا، وہ پوری طرح حاضر تھا۔

تقریب کے اختتام پر وہ انعامات کی تقسیم کے لئے میڈم فیروزہ کے ساتھ اسٹیج پر موجود تھا۔ پہلے کیلوں میں مختلف پوزیشن کیلئے والی لڑکیوں کو انعامات دیئے گئے۔ وہ ہر لڑکی کو انعام کے ساتھ نینزدار مسکراہٹ بھی تمسار ہاتھ اور ہاتھ بھی ملارہا تھا۔

اور پھر رائحہ سامنے بھی بہت قریب مگر اس کی جانب دیکھنے سے گریزاں، وہ ارادہ پاندہ کر آئی تھی، اس کے چہرے کی جانب نہیں دیکھے گی مگر کب تک ایک لمحے کے لئے نگاہ اٹھ ہی گئی اور پہچان کا جو رنگ ارد شیر کی آنکھوں میں اس وقت دیکھا۔ گھبراہٹ بڑھ گئی اسے سامنے پا کر ارد شیر تیز وار مسکراہٹ کا دامن چھوڑ چکا تھا۔ اب تو اس کے چہرے پر شوق اور شرارت تھی۔ اُس کی فسون گرنگاں نکراؤ کا واقعہ پوری جزئیات کے ساتھ دہرا رہی تھیں۔

اول پوزیشن لینے پر اُس نے مبارکباد دی تھی۔ رائحہ نے سنا ہی نہیں۔ پھر اُس نے پرائز تمسار کرنا تھا اُس نے اپنے آخری گھبراہٹ میں وہ اس بڑھے ہوئے ہاتھ کی طرف دیکھے بغیر انعام لے کر تیزی سے واپس مڑی اور چلی گئی۔

لڑکیوں کی دلی دلی آوازیں اور ہنسی ہال کے ہر کونے سے اُٹھ رہی تھی۔ میڈم فیروزہ بھی رائحہ کی اس تیز پری پر ناراض تھیں اور یہ ناراضگی ان کے چہرے پر لکھی جا چکی تھی جسے ارد شیر نے بھی پڑھ لیا تھا۔

”کیا نام ہے اس لڑکی کا.....؟“ وہ اب بھی انہیں جانتا تھا مگر ابھن نہیں تھی کہ نام کیا وہ تو بڑے آرام سے ایڈریس بھی معلوم کر سکتا تھا۔

وہ میڈم فیروزہ کے کالج میں زیر تعلیم تھی گویا اس کی دسترس میں تھی۔

پہلے تو اس لئے ملنا تھا کہ وہ اچھی سی مگر اب تو منہ بہت ضروری تھا، وہ ہاتھ ملائے بغیر جو چلی گئی

وہ پیار تھے، ایک آس لے کر شہر سے یہاں آئے تھے مگر جب یہاں بھی تنہائی ملی تو غم و غصے نے ان کی بری حالت کر دی۔ ملازم خیال رکھنے کی کوشش تو بہت کر رہے تھے مگر انہیں کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

ہو خواہ مخواہ ہی ملا زموں پر برسے رہے۔ رات کا کھانا بھی نہیں کھایا۔ یہ بھی سوچا کہ جا کر خود کبریٰ کو لائیں مگر یاد آگیا، وہ تو یہاں ہے ہی نہیں، پتا نہیں کون سے شہر گئی ہے۔ ڈرائیور بے وقوف پوری بات کر کے بھی نہیں آیا۔

وہ مشکل سے ایک رات اور ایک دن ہی وہاں قیام کر سکے۔ پھر شہر دوبارہ واپسی کے لئے تیاری کر لی۔ راستے میں اپنے ایک جاننے والے جو بھری نذر کا ڈیرہ پڑتا تھا اُس نے کئی بار اپنے ہاں آنے کی دعوت دی۔ سوچا چلو آج وہاں چلتے ہیں، کچھ وقت اچھا کٹ جائے گا۔

اور یہیں پر اُن کی ملاقات اپنے پرانے منشی غلام علی سے ہو گئی اور اُسے دیکھ کر انہیں یوں لگا، انہیں کوئی اپنا مل گیا ہو ایسا جس کے ساتھ وہ ہر بات بلا خوف و خطر کر سکتے ہیں جو ان کا ہمدرد، سچا خیر خواہ اور اپنا

جو ہدیری نذیر تو ذریعے پر نہیں تھا مگر غلام علی کا اصرار تھا آپ شہر جانے کے بجائے میرے ساتھ پلیس اور مجھے خدمت کا موقع دیں۔ شاہ جی نے یہی سنا انکار کیا..... مگر حکمرمان گئے۔

غلام علی کا چھوٹا سا گھر جس کی دیواریں کچی تھیں، آنگن بھی کچا تھا مگر وہاں چیزوں پر مدھول نہیں تھی۔ آنگن میں جھاڑو لگی ہوئی تھی۔ سبزیوں کی کیاریاں ہریالی لئے ہوئے اور چند پھولوں سے لدے ہوئے پودے، مومن میں دودر خست بھی تھے، ایک نیم کا، ایک پھیل کا..... سامنے تین کمرے تھے۔

”آئے ناں سرکار، آپ کا انا گھر ہے۔“ وہ بہت خوش تھا اُن کی آمد پر۔

جس کمرنے میں انہیں بٹھایا گیا، وہ بہت بڑا نہیں تھا مگر سلیقہ یہاں پر بھی دکھائی دے رہا تھا۔ رنگین ہلوں والے پلنگ پر ڈالے گئے سرخ، ہنبر اور سیاہ ڈیزائن کا صاف ستر لٹکھیں، ٹکیے پر سفید غلاف جس کے گرد کوٹھے سے تیل بنا کر لگا کر لٹی تھی..... اور خوبصورت کشیدہ کاری بھی نظر آ رہی تھی۔

پلنگ کے ساتھ میرز ہاتھ کا پلنگ رکھا تھا۔ چار کرسیاں جن پر ڈھلے ہوئے سفید غلاف چڑھے ہوئے تھے اور دیوار پر پچھلے سال کا کلنڈر لگا تھا۔ غالباً جو تصویر سب سے زیادہ خوبصورت تھی وہ سامنے کی تھی۔

بے شک سجاوٹ کا سارا انداز خالص دیہاتی تھا مگر صفائی کی وجہ سے..... بہت اچھا لگ رہا تھا۔
 کبھی ان کا گھر بھی کتنا کھرا کھرا اور روشن ہوا کرتا تھا..... چہل پہل اور رونق دکھائی دیتی تھی مگر اب
 یہ سب کچھ خواب کی طرح تھا اور وہ حیران تھے حقیقت خواب میں کیونکر بدل گئی ہے وہ تو مستقبل کے
 اسے میں بہت برا مہدے، بڑی آس لگائی تھی مگر جو کچھ ہوا، وہ انہیں توڑ رہا تھا۔

کبریٰ کی گماٹی اور اراد شیر کلا ابالی پن وہ تو اکیلے ہوتے جا رہے تھے۔ گہری سانس کھینچ کر دوپٹہ برا بٹھے۔

”میں ابھی آیا سرکار.....“ غلام علی ادب سے کہہ کر کمرے سے چلا گیا۔ انہوں نے آنکھیں موند

تختی

فشی غلام علی کو تو وہ پہچان ہی نہیں سکے، اسی نے بڑھ کر سلام کیا، نام بتایا، تب جمشید شاہ چو کئے۔
 ”او غلام علی، یہ تم ہو.....“ اُن کے لہجے میں خوشی تھی، وہ بہت بے تابی سے اُس کی جانب بڑھے اور اپنائیت سے لمبے یوں چمپے وہ اُن کا لازم نہیں بلکہ بچھڑا ہوا دوست ہے۔

اتنی گرجوٹی کی توقع تو غلام علی کو بھی نہ تھی۔ پہلے پہل وہ پہچان نہیں پائے تو اسے شدید مایوسی ہوئی تھی کہ شاہ جی کے پاس اتنے برس کام کیا۔ ان کے اس قدر قریب رہا اور آج بھی پہچان ہی نہیں پارہے۔ ”تم تو ایسے غائب ہوئے کہ پھر پلٹے ہی نہیں۔ میں نے تمہیں اکٹرا دیا۔ تم جیسا سختی اور دیا ندر فشی مجھے دوبارہ نہیں ملا۔“

”شاہ صاحب، میں آپ کو بھولا تو کبھی نہیں، بس دُنیا کے جھنجھٹ مجھے آپ کے پاس آنے سے روکتے رہے۔ آپ جیسا مہرمان مالک میں نے پھر نہیں دیکھا۔“

”تم یہاں کہا کر رہے ہو.....؟“

”شاہ صاحب! جہاں دانہ پانی لکھا ہو بندہ وہاں پہنچ کر ہی رہتا ہے۔ میں کچھ دو برس سے اہل بیت ہوتا ہوں۔“

یہ بہت سال پہلے کی بات تھی جب جمشید شاہ کی جوانی کا آفتاب پوری آب و تاب سے جگمگا رہا تھا، اور وہ پور پور کبرئی کی محبت میں ڈوبے ہوئے تھے۔ جب فشی غلام محمد اُن کی زمینوں کا حساب کتاب سنبھالے ہوئے تھا اور انہیں بہت سی معیبتوں سے بچائے رکھتا تھا۔

پھر ان کی کبریٰ سے شادی ہو گئی۔ بیٹیاں آئیں تو محبت و بے پاؤںِ رخصت ہو گئی۔ شاہ جی کے مزاج میں تبدیلی آئی وہ، جھکے جھکے، اُجھے اُجھے سے رہنے لگے۔ ان دنوں غلام علی بیمار ہو گیا اور کام پہلی سی جانفشانی سے نہ کر سکا۔

اس سے پہلے کہ شاہ جی اسے ڈانٹ ڈپٹ لرتے یا سوال و جواب کرتے وہ خود ہی ملازمت چھوڑ کر چلا گیا کہ عزت۔۔۔ وقت گزر ا تھا۔ بہت اچھی یادیں وابستہ تھیں۔ وہ انہیں ایسا ہی خوشگوار رہنے دینا چاہتا تھا۔

شاہجی کی اس سے ملاقات گاؤں سے شہر آتے ہوئے ہوئی، اُن کی طبیعت اچھی نہیں تھی۔ لہٰذا شہر میں ہی رہے، علاج کروایا، پھر یہ سوچ کر کہ کھلی فضا طبیعت پر اچھا اثر ڈالے گی۔ وہ گاؤں چلے آئے اور سیدھے بڑی حویلی ہی آئے۔

مگر حسب معمول کبریٰ خاتون وہاں موجود نہیں تھیں صرف ملازمائیں ہی تھیں جو مالکوں کی غیر موجودگی میں عیش کر رہی تھیں۔ انہوں نے فوراً ڈرائیور کو اس پیغام کے ساتھ کبریٰ کو لانے کے لئے بھیجا کہ شاہ جی حویلی آئے ہوئے ہیں اور آپ کو بلارہے ہیں۔

ڈرائیور ان کے اندازے سے جلدی واپس آ گیا مگر اکیلا ہی..... کبریٰ خاتون کے سارے میں نے بتایا کہ وہ شیریں بی بی کے ساتھ شہر گئی ہوئی ہیں اور یہ علم نہیں ہو سکا کہ شہر سے اُن کی واپسی کب تک ہوگی۔

لیں اور نیچے سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گئے۔

کچھ دیر کے بعد جب وہ دودھ میں تازہ شکر ڈال کر لے آیا تو انہیں اتنے آرام سے بیٹھے دیکھ کر حیران دیا۔

”شاہ جی جوتے اتار کر میری اوپر کر لیجئے، میں نے آپ کو کھانا کھلائے بغیر نہیں جانے دینا۔“
”اوہو..... تم کن چکروں میں پڑ رہے ہو، میں یہاں آکر خوش ہوا ہوں۔ کچھ نہ بھی کرو تو مجھے مطمئن ہوں۔“

”سرکار..... میں بھی آپ کی اپنے ہاں آمد سے بہت خوش ہوں اور میرا بس نہیں چل رہا کہ آپ کی کیا خدمت کروں۔“

”بابا..... دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور سوانی آواز میں کسی نے غلام علی کو پکارا۔“
”مجی رانی، اندر آ جاؤ..... اپنے شاہ سائیں آئے ہیں، ان سے کوئی پردہ تھوڑی ہے۔“
شاہ جی جو نیم دراز تھے، جلدی سے سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔

ذرا دیر کے بعد دودھ پندرہ پر سلیقے سے اوڑھے پچیس پچیس سالہ ایک بھرپور لڑکی اندر آ گئی۔ سالوار رنگ، صحت مند جسم اور نقش کھڑے کھڑے۔

اُس نے ادب سے شاہ سائیں کو سلام کیا۔ پھر غلام علی سے بولی.....
”بابا میں یہ دینے آئی تھی.....“ اور ہاتھ میں پکڑی پلیٹ شاہ جی کے سامنے میز پر رکھ دی۔
گا جڑ کا گرم گرم حلہ جس پر بادام چھڑکے گئے تھے اور جس کی مہک سے سارا کمرہ مہکے لگا تھا۔
پلیٹ رکھ کر فوراً ہی واپس چلی گئی۔

”کتنے بچے ہیں تمہارے.....؟“ شاہ جی نے پوچھا۔
”بس یہی ایک بیٹی ہے سرکار۔“
”یہیں رہتی ہے.....؟“ انہوں نے یونہی بالکل سرسری سے انداز میں پوچھا تھا۔
”ہاں جی بڑی لاڈلی ہے میری مگر نصیب اچھا نہیں لکھا کر لاٹی۔ اب یہیں ہوتی ہے میرے پاس۔“ غلام علی کے لہجے میں ڈکھل گیا تھا۔

”کیا ہوا.....؟“ جسکے شاہ نے ہمدردی لئے ہوئے پوچھا۔
”چار سال پہلے شادی کی تھی، میں نے اس کی، مگر صرف چھ مہینے بعد اس کا گھر والا اللہ کو پیارا ہو گیا اور میری لاڈلی بیٹی بیوی کی چادر اوڑھ کر ایک بار پھر باپ کی دلہیز پرائی گئی۔“
”اوہ بہت افسوس.....“ انداز بے ساختہ تھا کہ انہیں واقعی یہ جان کر ڈکھ ہوا تھا۔
”تم نے دوبارہ شادی کر دی ہوئی اس کی.....“ یہ مشورہ تھوڑے وقفے کے بعد دیا تھا۔
”بیوہ سے کون شادی کرتا ہے، آپ تو جانتے ہی ہیں جی اپنے دیہاتوں کے رسم و رواج کو.....“
اب تو ساری عمر میرے ساتھ ہی رہے گی۔“

”اور تمہاری بیوی کہاں ہے.....؟ کیا گھر پر نہیں ہے اس وقت.....“
”وہ اس دنیا میں ہی نہیں ہے بس میں اور میری بیٹی زینت ہم دونوں ہی ہوتے ہیں اس گھر میں بہت فر ہے مجھے اپنی بیٹی کی۔ میں بوڑھا تو ہوں مگر ساتھ ساتھ بیمار بھی رہتا ہوں۔ سوچتا ہوں میرے

کیا بنے گا اس کا۔“

”اللہ مالک ہے غلام علی، تم فکریں پال کر خود کو مت گھلاؤ، وہ بہتر کرنے والا ہے۔“

”عمر..... او عمر..... تم جتنا مرضی سر کھا لو یہ عقل کے اندھے انسان بن ہی نہیں سکتے۔ میں تو کہتی ہوں، انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو۔“
”اوہو راجہ آئی..... ایک تو تم درمیان میں ضرور ہی ٹوکنا، اس طرح خاک پڑھیں گے یہ بچے۔“
عمر، راجہ کی بات پر چڑ کر بولا۔

”یہ نہ ایسے پڑھیں گے، نہ ویسے، تم انہیں سمجھا سمجھا کر اپنا گھبراہٹ کر لیتے ہو اور یہ ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیتے ہیں۔ نصیحت کرتے ہو تو بھول جاتے ہیں اور سارا دن محلے میں ایک دوسرے سے لڑائی کرتے ہیں، تم نے منع کیا تھا، گالی مت دینا اور یہ اتنی بڑی بڑی گالیاں دیتے ہیں۔“
اُس نے باقاعدہ ہاتھوں سے سانسز بتایا۔

”ہیں..... سچ کہہ رہی ہیں آپ؟“ عمر نے گھور کر بچوں کی طرف دیکھا.....
وہ سب کے سب معصوم شکل بنا کر بیٹھ گئے، اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔
”چلو ادھر لائن میں لگ جاؤ اور سچ بتاؤ کون کون گندی باتیں کرتا ہے۔“
”سب کے سب ایک جیسے ہیں بد نیز، لڑاکا، جھگڑالو۔“

”اوہو آپا، تم تو چپ کر جاؤ بلکہ یہ اچھا ہو گا کہ یہاں سے جاؤ اور کوئی کام کرو۔“
”ہاں ہاں راجہ آپا، تم تو جاؤ یہاں سے، ہمیں پڑھنے دو۔“ سب بچے شور مچانے لگے تو راجہ مارنے کو لگی مگر اسی وقت دروازہ بجا کر کسی نے اندر آنے کی اجازت مانگی۔ سب نے بیک وقت دروازے کی طرف دیکھا۔

”گاڑی والا آیا ہے۔“ سب بچے کورس کے انداز میں چلائے۔
راجہ جو بچوں کو مارنے کو لگی تھی، اب جہاں کی تہاں رگ مٹی تھی اور عمر جلدی سے اٹھ کر حیرت اور خوشی سے بھرپور مسکراہٹ لئے اس کے استقبال کو لپکا تھا۔
”مزید بھائی آپ.....“ اُس سے ہاتھ ملاتے ہوئے وہ کہے بغیر رہ نہیں سکا۔
”دیکھ لو کہا تھا ناں تمہیں دوست اور بھائی بنایا ہے، ویسے تم لوگ ڈسٹرب تو نہیں ہوئے میری آمد سے.....“

”اوہ بھائی..... کسی بات کرتے ہیں..... میں بتا نہیں سکتا، آپ کی آمد سے مجھے کتنی خوشی ہوئی ہے، آئیے اندر آ جائیے۔“ ہاتھ پکڑ کر وہ اسے کمرے میں لے آیا۔
”مہاں پر شاید کسی معرکے کی تیاری تھی۔“ مزید، راجہ کو بچوں کے پیچھے لپکتے دیکھ چکا تھا اور اب شرارت بھرے انداز میں پوچھ رہا تھا۔

”کیوں، آپ نے بھی شریک ہونا ہے.....؟“ راجہ جھٹ سے بولی.....

”اول ہوں آپا.....“ عمر نے سرزنش کی..... جبکہ مزید بولا.....

”کہنے دو انہیں، میری بھی ایک بہن ہے مگر تمہاری بہن سے بالکل مختلف۔“

روایت پرست واقع ہوئی ہے۔ وہ ان لڑکیوں سے بالکل مختلف ہے، جن سے تمہاری روز کی ملاقات رہتی ہے۔

اردشیر نے یہ سب مبر سے سنا پھر بولا۔ ”کیا اپنے کالج میں پڑھنے والی ہراسٹوڈنٹ کے بارے میں اتنی ہی معلومات رکھتی ہو.....؟“

”نہیں، اصل میں رات کو بہت بریٹش اسٹوڈنٹ ہے اور خاصی پاپولر ہے کالج میں.....“

”اچھا، مجھے تو بس یہ بتاؤ، ملاقات کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔“

”کسی کو تو بخش دو میرے شاہ، اتنا ہی خیال کرلو، وہ میرے ہی کالج میں پڑھتی ہے، کوئی ایسی ویسی بات ہوگی تو سا کھراب ہو جائے گی۔“ میڈم فیروزہ بڑے لالیٹ موڈ میں کہہ رہی تھیں۔

اردشیر نے اُن کی جانب دیکھا، پھر صوفے کی بیک سے کمرنگا کر بائیں ٹانگ دائیں پر رکھی اور بلیکس موڈ میں بیٹھتے ہوئے بولا۔

”یہ میری اُس کے ساتھ دوسری ملاقات تھی۔“

”ہا۔۔۔ اچھا تو پہلی بار کہاں ملے تھے.....؟“ میڈم نے حیرت کے مہر پورا انداز کی اداکاری کرتے ہوئے سوال کیا۔

اردشیر نے پہلی ملاقات کی تفصیل بتادی۔

”پھر تو کوئی مشکل ہی نہیں تمہارے لئے، یقیناً وہ بھی تمہیں پہچانتی ہوگی کہ یہ ملے ہے، تم بھول جانے والی چیز نہیں ہو۔“

”تم میری ہیلپ کر سکتی ہو.....؟“ اردشیر تو ارادہ باندھ کر آیا تھا۔

”او۔۔۔ یہ بھی تو سوچو میں برہنہ ہوں اس کالج کی، کوئی ایسا رول ادا کروں گی تو سا کھ ضرور متاثر ہوگی کہ ایسی باتیں زیادہ دیر چھپی تو نہیں رہ سکتیں۔“ میڈم فیروزہ کے انداز میں ہچکچاہٹ تھی۔

”تو تم انکار کر رہی ہو.....؟“ اردشیر کے موڈ نے ہلکا کھایا۔

ابھی یہ بات ہو رہی تھی کہ فیروزہ کی منہ بولی بھانجی نورین چلی آئی۔ بہت تیز لڑکی تھی وہ اور اس کی آنکھیں اس عمر میں کسی تجربہ کاری آنکھیں دکھائی دیتی تھیں۔

”اوہ شاہ، ہمیں پتا تھا، آج آپ سے ملاقات ہو جائے گی ورنہ کچھ تیاری کے ساتھ آگئی کی طرف آتے۔“ انداز بے حد پر جوش اور شوخ تھا۔

”ہمیں پہلے خیال ہی نہیں آیا، اس کام کے لئے نورین سے بہتر کوئی نہیں۔“ میڈم نے اردشیر کو راہ دکھائی۔

اردشیر نے بھی نورین کو دیکھا۔

”ہاں یہ لڑکی میری ہیلپ کر سکتی ہے، اس کے ذریعے رات کو تک پہنچنا بہت آسان ہوگا۔“

”کیا کام لینا ہے مجھ سے.....؟“ نورین نے دونوں کی جانب سوالیہ انداز میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”رات کو حسن دل و دھن پر چھائی ہوئی ہے آج کل.....“ انہوں نے ہنس کر اپنی بھانجی کو بتایا۔

”اوہ شاہ، وہ تو بڑی سویت لڑکی ہے۔“ نورین کو افسوس ہوا تھا یہ بات سن کر۔

”ہوں، خوب سمجھ رہی ہوں، آپ یہی کہنا چاہتے ہیں ناں کہ وہ بڑی اچھی ہے۔“ رابعہ نے بتایا۔

”نہیں نہیں، بہنیں تو ساری اچھی ہوتی ہیں اور عمر کی بہن بھی تو میری ہی بہن ہوئی ناں.....؟“

”اب رابعہ نے پہلی بار تیزی طراری کو ایک طرف رکھ کر اس کی جانب دیکھا پھر اثبات میں سر ہل کر ہنس پڑی۔

”عمر، میں نے اپنی والدہ سے بھی تمہارا ذکر کیا تھا اور اپنی دوستی کے بارے میں بتایا تھا..... وہ مجھ سے ملنا چاہ رہی ہیں، اب بتاؤ کب آنے کا ارادہ ہے ہماری طرف.....؟“

عمر چپ سا ہو گیا، کچھ دیر بعد بہت سنجیدگی کے ساتھ گویا ہوا۔

”مزید بھائی، مجھے آپ کے گھر آنے پر اعتراض تو نہیں، آپ بہت اچھے ہیں اور یقیناً وہ ماں بھی بہت اچھی ہوگی جس نے آپ کی تربیت کی ہے مگر پتا نہیں کیوں پھر بھی ایک جھجک سی ہے۔“

”اوہو..... تم کوئی دھم دل میں مت لاؤ، بس ابھی ابھی فیصلہ ہو جانا چاہئے کہ کب آ رہے ہو ہماری طرف، دیکھو میں تو بن بلائے ہی چلا آیا ہوں۔“

”بن بلائے کیوں، میں نے اُس روز آپ سے کہا تو تھا، دوبارہ ضرور آئیے گا۔“

”اچھا کہا ہوگا، ویسے میں خود ہی چلا آیا ہوں۔“

”ٹھیک ہے بھائی، آپ جب کہیں گے، میں چلا آؤں گا۔“ عمر بھی مان گیا۔

”ٹھیک ہے، پھر تیار رہو، مغرب میں تمہیں اپنے گھر لے کر جاؤں گا۔“

”ارے شاہ، تم آئے ہو.....؟“ میڈم فیروزہ اُسے دیکھ کر کھل گئی تھیں۔

”کیا کر رہی تھیں تم.....؟ کب سے منتظر بیٹھا ہوں۔“ اردشیر کے انداز میں ناراضگی تھی۔

”باتھ لے رہی تھی، تم بتاؤ اس وقت کیسے آنا ہوا.....؟“ یہ سوال ہوا تو حیرت انگیز طور پر اردشیر کا موڈ پچال ہو گیا، وہ بولا۔

”اصل میں، میں تم سے کچھ پوچھنا چاہتا تھا اس لڑکی کے بارے میں۔“

”کون سی لڑکی شاہ.....؟“ وہ بھی نہیں۔

”نام میں نہیں جانتا، بس اتنا پتا سکتا ہوں، اس روز تقریری مقابلے میں فرسٹ پرائز لیا تھا اُن نے..... بہت خوبصورت لڑکی ہے اور اُس کی آواز بھی بہت اچھی ہے۔“

”مجھی گئی، تم رات کو حسن کی بات کر رہے ہو، بڑی تفصیل سے دیکھا ہے۔“ میڈم ہنس پڑیں، پھر بولیں۔

”واقعی بہت کیوٹ ہے، لائق بھی ہے اور ذہین بھی مگر خیر تو ہے ناں، تم نے اتنا یاد کیوں رکھا اسے.....؟“ میڈم کی دلچسپی فطری تھی۔

”یہ بھی کوئی کرنے کا سوال ہے فیروزہ، جب اردشیر کسی لڑکی کے بارے میں پوچھنے کے لئے تمہارے پاس آئے گا تو مطلب تو صاف ہوگا۔“ وہ دل کھول کر ہنسا تھا۔

”اوہ شاہ..... وہ تو بڑی معصوم بھولی بھالی سی لڑکی ہے، غالباً کسی سرکاری افسر کی بیٹی ہے اور غالباً

وہ سہی سہی، بستی گھبرائی ہوئی لڑکی تھی، اس کے گالوں پر سرخی تھی جیسے نگہ بوں کی گرمی نے انہیں دھکا دیا۔ اس کی پلکیں جھکی ہوئی تھیں اور وہ نونوں کی بالائی سطح پر شاید ہلکا سا پسینہ تھا۔

پہلی ملاقات بھی اور پھر دوسری ملاقات پر بھی ایک سی گئی..... بے ریا..... معصوم..... اُن
 اس کا نازک سراپا بے شک اتنی کشش رکھتا تھا کہ دیرینک دیکھنے والوں کو یاد رہ جائے۔

اردشیر اس مرتبہ جس جذبے کا شکار ہوا تھا، وہ مختلف تھا، اسے اس لڑکی نے متاثر کیا تو وہ اسے دیر تک ساتھ ساتھ رکھنے کی سوچ رہا تھا، کسی قیمتی چیز کی طرح، وہ اس کے سامنے بیٹھ کر اسے بولتے ہوئے سناتا اور دیکھتا چاہتا تھا۔ اُس کی سوچوں میں اترنے کی خواہش نے دل میں جگہ بنائی تھی..... ورنہ اگر لمحوں کی بات ہوتی تو پھر کچھ بھی مشکل نہ تھا مگر اب مسئلہ یہ تھا کہ دل تک رسائی کا خیال آگیا..... یہ اور بات کہ اس کی سوچ میں پاکیزگی کا دخل کبھی رہا ہی نہیں۔

نورین نے بڑے یقین کے ساتھ کہا تھا۔ بہت جلد وہ لڑکی تمہارے سامنے بیٹھی ہوگی اور اردشیر کو اس گھڑی کا بڑی شدت سے انتظار تھا۔

ایکڈنٹ شدید تھا، غلام علی کو ہاسٹل جا کر ہوش آیا تو اُس نے شاہ جی سے ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ شاہ جی کو پیغام ملا، وہ اس وقت کہیں جانے کو تیار تھے مگر پروگرام ملتوی کر دیا۔ اس کے گھر ملنے والے اسکول اس کی تابعداری انہیں بھولی نہیں تھی، وہ فوراً ہاسٹل پہنچ گئے۔

اس کی حالت اچھی نہیں تھی شاہ جی ملنے آئے تو انہیں دیکھ کر رونے لگے۔ جمشید شاہ نے تسلی دی، اچھی صحت کے لئے دوا دی مگر وہ کہتا تھا۔

”شاہجی، میری زینت بنی گھر میں اکیلی ہوگی، وہ تو اپنے بابا کی راہ دیکھ رہی ہوگی۔ گاؤں میں کسی کو اس حادثے کی اطلاع نہیں ہے، وہ پریشان ہوگی۔“

”تم فکر نہ کرو غلام علی میں خود گاؤں جا کر اسے تسلی دوں گا اور سنو ہاسپٹل میں اُنھنے والے اخراجات کی بھی فکر مت کرتا۔“

جب شاہ جی کی گاڑی غلام علی کے گھر کی گلی میں داخل ہوئی تو شام رات میں ڈھل رہی تھی، سلطان زینت باپ کے انتظار میں دروازے پر کھڑی تھی اور ہاتھ میں پکڑی لائٹین سے باپ کی راہ میں ابلے کی کوشش کر رہی تھی۔

گاڑی اسی کے دروازے کے سامنے آکر رُکی، دل کسی انجانے خدشے کے تحت دھک دھک
رہنے لگا۔

”یا اللہ خیر..... یہ کون ہو سکتا ہے اور کس لئے آیا ہے.....؟ شاہ جی گاڑی سے اتر کر دروازے کے قریب آئے اور سلام کے بعد بولے.....

”میرا نام جشید شاہ ہے، تم زینت ہوتاں.....؟“

”جی جی شاہ ساکس، میں زینت ہوں اور بابا تو ابھی تک گھری نہیں آیا۔ میں بہت فکرمند ہو رہی

”تمہارے بابا اس وقت شہر میں ہیں..... میں اُن سے مل کر اُن کے کہنے پر ہی تو یہاں پر آیا ہوں۔“ اُس کا گلا اتنا کھڑکھڑا رہا جیسا کہ وہ بچہ تھا۔

”تو ہمیں بھی تو سوئٹ لوگ ہی اچھے لگتے ہیں ڈیئر اور میں اس کے ساتھ دوستی چاہتا ہوں۔“

”کوئی مشکل نہیں، وہ کلاس میں مجھ سے جو نیز ضرور ہے مگر میرے لئے اسے دوست بنانا ہے اور بہت جلد تم سے بھی ملاقات کی صورت نکل آئے گی۔“

”ہاں کچھ کرو مگر جلدی..... تاخیر میرا موڈ بگاڑ دیتی ہے۔“

”زیادہ انتظار نہیں کراؤں گی۔“ نورین یہ کہتے ہوئے صوفے پر اس کے برابر کر بٹن بٹن

”وہ تو وہی تجھے اور شاید انہوں نے بھی مجھے پہچان لیا تھا روزانہ کتنے ہی لوگوں سے ملتا رہتا تھا۔“

مگر پھر بھی میرا چہرہ انہیں یاد رہا مگر کیوں یہ کوئی اچھی بات تو نہیں اور میں کتنا گھبرا گئی تھی، میری گھبراہٹ کو لڑکیوں نے بھی محسوس کیا۔ وہ بار بار ہنس رہی تھیں۔

مجھے کسی نے کہا بھی تھا کہ تم نے ان کے بڑے ہوئے ہاتھ کو بھی نظر انداز کر دیا تھا اور وہ صرف اپنی تو ملتا ناچا رہے تھے، ہمیشہ کے لئے تھانے کی خواہش تو نہیں کی تھی، جو تم شرما کر ہگ آ کر

اوهو، مجھے اتنا پریشان نہیں ہونا چاہئے تھا، شکر ہے تقریر کے دوران میں نے ان کی جانب ہر دیکھا ورنہ بھول جاتی سب کچھ..... مگر کیوں، میں ایسا کیوں سوچ رہی ہوں.....؟ اساکو اس محسوس کر،

ہوں..... شاید میں نے بھی انہیں بہت اچھی طرح یاد رکھا ہے۔ واقعہ تو چھوٹا سا تھا مگر میں بھلا نہیں سکتا۔
اور نمبر ۱۔ وہ مجھے بھولنے دیتی بھی نہیں، ذرا جو خاموش بیٹھتی ہوں تو کہتی ہے، کسا ہوا کپڑا،

خود بواجبی یاد آ رہا ہے۔ پھر بہت ریکاؤڈ لگائی ہے کہتی ہے کالج تک صرف تمہاری کشش لے آئی تھی۔
 نہیں اور تمہیں پہلا انعام بھی اُن کی سفارش پر ملا ہے۔

نبیلہ ہے بہت بد مزاج۔ ایک بات ہے اُس نے ابھی تک یہ بات فائزہ وغیرہ سے چھپائی ہے، مگر نے منع کیا تھا تو اُس نے کسی سے ذکر تک نہیں کیا۔ اُس کے لیوں رزمکارا ہٹ دوڑ گئی۔

کمرے میں اکیلی بیٹھی تھی۔ سامنے کتاب کھول رکھی تھی مگر سچوں میں وہ تمام منظر تھے جن میں درشتر تھا، کبھی میڈم فیروزہ سے ملنے کالج آجائے اور وہ فائزہ کے ساتھ کھڑی دکھ رہی ہے، کبھی ہارکٹ

”جانتیں وہ کون ہیں، کیا نام ہے ان کا.....؟“

”وہ یقیناً مجھے یوں تو نہیں سوتے ہوں گے اور انہیں بھلا کا ضرورت ہے۔ تو میں نے وہ دن

س، پتا نہیں کیوں میں خود کو اس سوچ سے الگ کر رہی نہیں پاتی حالانکہ جانتی ہوں۔ یہ غلط ہے مگر بڑی.....

راخہ کا خیال غلط تھا، وہ بھی اسے سوچتا تھا مگر تب جب کوئی اچھی بات سوچنا چاہتا تھا۔ دلہن کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو اتارنے لوگوں کی موجودگی میں نظر انداز کر کے چلم گنگر ار، شر کے اندر غصہ نہیں

۔ صندوق نے سر نہیں اٹھایا تھا کہ سوہارنا کی طرح اس لڑکی کے کسی بھی انداز میں بے نیازی اور اکڑنا تھا۔

ہوں۔“

”بابا خود کیوں نہیں آیا شاہ سائیں.....؟“ زینت نے بات کاٹ کر جلت میں کہا۔
”تمہارے بابا کو حادثہ پیش آ گیا ہے۔ وہ ہاسپٹل میں ہیں مگر کبیراؤ نہیں، وہ ٹھیک ہو جائیں گے۔
زینت رونے لگی شاہ جی نے تسلی دی مگر اس کا دل قابو میں نہیں آ رہا تھا۔
”یہ لڑکی بہت پریشان ہے، پھر یہاں ایکلی بھی ہے۔ رات کیسے گزارے گی، بہتر ہے اسے
ساتھ شہر لے جاؤں۔“ انہوں نے زینت سے اس خیال کا اظہار کیا تو وہ فوراً تیار ہو گئی کہ باپ کو
کے لئے بے تاب تھی۔

ہاسپٹل میں شاہ جی کے دو ملازم غلام علی کے پاس موجود تھے۔ جب وہ زینت کے ساتھ پہنچے
علی کی سائیں اُکھڑی تھیں۔

”شاہ جی، میری بیٹی.....“ اسے اب بھی زینت کی فکر تھی۔

”تم فکر کیوں کرتے ہو.....؟ اس کی حالت دیکھ کر ان کی آواز بھی لڑکھڑاہی تھی۔

”شاہ جی..... یہ بیچ ذات ہے مگر اس کے سر پر چادر ڈال دینا، بے آسرامت کرنا، سہارے کو
سہی، اپنے نکاح میں لے لینا۔“ زینت کی آہیں، اُس کی چیخیں بہت شدید تھیں مگر زندگی بڑھ گئی
جانے والا کیسے رکتا اور جاتے وقت اسے جسدِ شاہ کے حوالے کر گیا۔

بھری دُنیا میں اب وہ تھا تھا۔ شاہ جی نے اسے بڑی حویلی اس خیال سے بھیج دیا کہ اب کبیرا
کبری آج بھی ہوگی، وہ نہ بھی ہوئی تو ملازما سیں سنبھال لیں گی۔

بعد میں فون کیا تو پتا چلا کبری ابھی تک واپس نہیں آئی۔ حویلی میں خدمت گار تو بہت تھے مگر دل
کرنے والا کوئی نہ تھا۔

شاہ جی ایک ہفتے کے بعد گاؤں آئے۔ رات کا وقت تھا، زینت کو نیند نہیں آرہی تھی، وہ برآمدہ
میں ٹہل رہی تھی..... ادھر شاہ جی نے قدم رکھا، ادھر وہ سلام کو لہکی پھر کھانے کو پوچھا۔ جواب اٹھا
میں باکر کسی ملازمہ کو جگانے کے بجائے خود ہی باورچی خانے میں چلی آئی جب تک وہ نہا کر آئے گا
تیار کر چکی تھی اور ان کی آمد کی منتظر تھی۔

”آپ بہت دنوں کے بعد آئے ہیں۔“

”میں آنا چاہتا تھا مگر کاموں میں گھرا رہا تم ٹھیک ہو ناں.....؟“ لہجہ خود بخود نرم اور اپنائیت بھرا ہوا تھا۔

”ہاں جی..... میں ٹھیک ہوں، آپ شہر میں گئے ناں گاؤں میں.....؟“

”شاید ایک دو روز.....“

”میں آپ کا کمرہ ٹھیک کرتی ہوں۔“

وہ چلی گئی..... شاہ جی کو محسوس ہوا ابھی ابھی راحت یہاں موجود تھی..... سب کچھ کتنا صاف
اُجلا ہوا کرتا تھا اور اب اتنے سالوں کے بعد گرد و صاف ہوئی ہے..... ہر شے چم چم کر رہی ہے۔

انہیں یاد آیا، غلام علی نے کہا تھا..... ”زینت کو اپنے نکاح میں لے لینا۔“

اور وہاں اردو شیر سوچ رہا تھا، گاؤں کا چکر لگا لینا چاہئے..... بڑی ماں سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔



”آؤ صاحب! میری سمجھ میں نہیں آ رہا، میں آپ کا کس طرح شکریہ ادا کروں.....؟“ اُس
نے سروں دلائی تھی اور سوہا از حد ممنون ہو کر کہہ رہی تھی۔

”ہم پڑوسی رہ چکے ہیں سوہا اور اس ناتے تم نے مجھے ہیلپ کے لئے کہا تھا، میں انکار کیسے کر سکتا
فہ، اسی دن سے تمہارے لئے کوشش کر رہا تھا..... اپنی فرم میں جگہ نہیں تھی مگر میں ادھر ادھر بھی دیکھتا رہا۔
بہت سے لوگوں سے بات بھی کی اور آخر کامیابی ہوئی گئی..... ادارے کے مالکان اچھی شہرت کے حامل
ہیں..... مجھے یقین ہے تمہیں کسی پرابلم کا سامنا نہیں ہوگا..... لیکن پھر بھی اگر کوئی بات ہو، کوئی مشکل پیش
آئے تو مجھے ضرور بتانا۔“

”بہت شکریہ.....“ وہ خوشی سے کھلی پڑ رہی تھی۔

آؤ جب اس ملازمت کے بارے میں بتانے کے لئے خود اُس کے گھر آیا تھا۔ تب وہ کتنی مایوس
ہو رہی تھی، ہر طرف اندھیرا تھا مگر جب اُس نے یہ خوشخبری بتائی تو کتنی دیر یقین ہی نہیں آیا۔

”اچھا سوہا، اب اجازت.....“ اُسے فلیٹوں کی اُس دُنیا سے کچھ فاصلے پر وہ ڈراپ کر کے کہہ رہا
تھا۔

”نہیں، اس طرح تو نہیں، آپ اندر آئیے، آئی سے بھی ملیں اور چائے بھی پیتے جائیں۔“

”سوہا..... اس وقت تو میں جلدی میں ہوں، ہاں وعدہ رہا کسی روز آؤں گا ضرور، آئی کو تمہاری
ملازمت پر مبارکباد بھی دینا ہے اور چائے بھی ضرور پیوں گا۔“

خدا حافظ کہہ کر وہ گاڑی بڑھالے گیا۔ سوہا مسرور کھڑی ہاتھ ہلاتی رہی۔

آؤ کی کل شام اردو شیر سے بات ہوئی تھی اور بہت ناراضگی کے ساتھ اردو شیر نے کہا تھا.....

”میں تمہاری طرف نہیں آیا تو اتنا بھی نہیں ہوا کہ آکر شکل دکھا دیتے، اب مجھے پورا یقین ہو چلا ہے
آؤ محمود، دوستی صرف میں، تمہارا ہوں، تمہیں میرا کوئی خیال نہیں۔“

اُس کی بات سن کر آؤ شرمندہ ہو گیا تھا۔ واقعی وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ پچھلے دنوں بزنس میں وہ کچھ ایسا
تھکا تھا کہ اُس کی طرف نہ تو جا سکتا تھا اور نہ ہی بات کر سکا۔

آؤ نے وعدہ کیا تھا اور وقت بھی طے کر لیا تھا کہ ضرور آؤں گا..... اب سوہا کو ڈراپ کرنے کے بعد وہ
اردو شیر کی جانب ہی جا رہا تھا۔ ریست وایج پر ٹائم دیکھا، وہ دس منٹ لیٹ ہو چکا تھا۔

جب وہ اردو شیر کے ہاں پہنچا تو اُسے ڈرائنگ روم میں ہی موجود پایا۔ وہ اکبیا نہیں تھا، ساتھ میں

”آج سے پہلے تم اپنے جیسوں کے ساتھ ہی نظر آتے رہے ہو جبکہ بقول تمہاری اس دوست
دین کے وہ لڑکی روایت پرست اور شریف ہے۔“
اردشیر نے اس کی ناراضگی کا حوالہ دیا..... اسے نظر میں رکھ کر بولا.....
”ہاں، ٹھیک کہہ رہے ہو پیارے، لیکن اب میری سوچ بدل گئی ہے۔ سوچا ہے ادھر بھی نظر ڈانی
ہے۔“ تجربات میں جتنا اضافہ ہو سکے، اتنی ہی اچھی بات ہے۔“
”کیا ہی اچھا ہوتا جو میں یہاں تمہارے پاس آنے کی حماقت نہ کرتا۔“
”اب تو یہ حماقت ہو ہی چکی ہے تو یہ بتاؤ چائے پیو گے یا کافی؟“
”کچھ نہیں.....“ وہ واقعی اُداس ہو رہا تھا۔
”تم مجھے یہ بتاؤ، میرے دوست ہو یا اس لڑکی کے.....؟“ اردشیر نے سختی سے کاغذ ہا کرا سے
اپنا جانب متوجہ کرنا چاہا۔
”تمہارا دوست ہوں اسی لئے تو تمہیں یوں تباہ ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔“ اُس کا ہاتھ کاغذ سے ہٹا
رہا جلاہٹ میں کہہ رہا تھا۔
اردشیر نے سر پیچھے کو کر کے اُونچا قبچہہ لگایا اور بولا.....
”اوہو..... مجھے تو بتا ہی نہیں چلا کہ میں تباہ و برباد ہو رہا ہوں..... اگر تم اب بھی اطلاع نہ دیتے تو
برایا نہتا دوست ہوتا تو تم جیسا.....“
”مذاق اُڑا رہے ہو، اُڑاؤ، جتنا جی چاہئے فس لو..... مگر میری باتیں ایک دن تمہیں بہت یاد آئیں
گیں۔“
”اچھا..... ویسے یہ بات تم پچھلے آٹھ دس سالوں سے کہہ رہے ہو۔ اب بتائیں وہ وقت کب آئے
گئے؟“ اردشیر نے ہنسنا شروع کیا۔
”کون ہے وہ لڑکی.....؟“ آذر نے صاف صاف بات کی..... یوں جیسے یہ مذاق اُس کا نہیں کسی
اداکار کا تھا۔
”تباہی و قوف نظر آتا ہوں میں کہ تمہیں اس کے بارے میں بتا دوں گا..... ارے وہ تو میری جان
ہے۔“ اردشیر کی شوخی ختم ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔
”تم نے بلوایا کیوں تھا مجھے.....؟“ آذر کی سنجیدگی گہری ہوتی جا رہی تھی۔
”اوہ ہاں..... یہ جلی بھٹی شکل دیکھے کافی دن ہو گئے تھے پھر میرا ڈانٹ کھانے کو بھی جی چاہ رہا
تھا۔ اسی لئے التجا کی تھی حضور تشریف لائے کبھی غریب خانے پر..... ویسے تم لیت آئے ہو، اس کا
نہیں کھاؤ اور کرا پڑے گا۔“ اب اردشیر بھی شرافت کی جون میں نظر آنے لگا تھا۔ وہ لہجہ جو کچھ دیر پہلے تک
سب چھوڑ کر تامل انداز میں بولا تھا۔
”وہ اصل میں یہاں آنے سے پہلے میں مس.....“ آذر سوہا کے بارے میں بتاتے ہوئے رک گیا
تھا۔ اردشیر نے اسے جب اُس کے آفس میں دیکھا تو سوہا کے جانے کے بعد کس قسم کی گفتگو
”ہاں ہاں، کیا ہوا؟“ کون سی مس.....؟“

ایک شوخ سی لڑکی تھی۔ اردشیر نے اپنے دوست کا ادھر اساتعارف کروایا۔ یہ سن کر آذر اس کا دوست
وہ نورانی بے تکلیف ہونے لگی۔ مگر آذر ہمیشہ ان باتوں سے دُور رہا تھا۔ لہذا حد برقرار رہی تھی۔
”اچھا..... اب چلتی ہوں۔“ وہ سمجھ گئی تھی کہ دونوں یہی چاہ رہے ہیں۔
”ٹھیک ہے، میں کل خود میڈم فیروزہ کی طرف آؤں گا۔ تم سے بھی وہیں ملاقات ہوگی۔“
”نہیں شاہ، اتنی جلدی تو نہ کرو۔“ اردشیر نے اُس کی جانب دیکھا، سر کو افسوس کے انداز میں ہڑا
اور بولا.....
”تم اسے جلدی کہہ رہی ہو نورین، میرے دل سے پوچھو، کتنی الجھن میں ہے اس در پر.....“
”خوب سمجھتی ہوں تمہارے دل کو، ہر بات میں غلت اچھی نہیں ہوتی..... ویسے تم فکر مت کرو،
دوستی تو میں نے کر ہی لی ہے۔ مگر وہ ہے بڑی روایت پرست سی لڑکی اور ہر بات میں پہلے صبح اور غلط
اندازہ لگاتی ہے پھر قدم اٹھاتی ہے۔ میں جلد ہی تمہیں ساری رپورٹ دے دوں گی۔“
”چلو ٹھیک ہے مگر یاد رکھو، رپورٹ اچھی ہونی چاہئے۔“ اردشیر کا شوق اور بے چینی اُس کے
چہرے سے آذر بخوبی پڑھ سکتا تھا۔
”کیا وہ بہت پسند آگئی ہے شاہ.....؟“ نورین نے شاہ کو لہبا کر کے کہا اور پھر ہنس پڑی۔
اردشیر نے جواب نہیں دیا۔ محالہ باتوں تلے دبا کر بغور نورین کو دیکھا، پھر ہنس پڑا۔
آذر سمجھ گیا تھا چکر بے چاری کسی لڑکی کا ہے۔ اردشیر کے انداز پر غصہ بھی آ رہا تھا، الجھن بھی سوار
تھی اردشیر نے اس سے تو صرف سلام ہی کیا تھا، گفتگو تو برابر نورین نامی اس لڑکی سے ہو رہی تھی۔
”مجھے صرف شکل دیکھنے کو بلایا تھا۔“ اُس نے جل کر سوچا اور دواہی کے ارادے اٹھنے لگا۔ اردشیر
بھی خوب سمجھ رہا تھا، نورین سے گفتگو کرتے ہوئے دیمان آذر کی جانب تھا۔ وہ اُنھا تو برابر میں صوفے پر
بیٹھے اردشیر نے بازو پکڑ لیا۔ مجبوراً اسے پھر بیٹھنا پڑا۔
نورین چلی گئی، تب وہ پوری طرح ادھر متوجہ ہوا اور بولا.....
”اتنے دنوں کے بعد آئے ہو، وہ بھی میرے بلانے پر اور اس پر غرے بھی دکھا رہے ہو، بھان
اللہ تمہارا بھی جواب نہیں۔“
”یہ کیا باتیں ہو رہی ہیں ابھی.....؟“ آذر پوری طرح سنجیدہ تھا۔
”کچھ نہیں، بس یونی نام پاس کر رہے ہیں۔“ اندازاً نلے والا تھا۔
”میں سمجھ رہا ہوں۔“ آذر نے ابھی تک اُس کی گرفت میں موجود اپنا بازو آزاد کراتے ہوئے سخت
تلاش کی۔
”آ..... اچھا..... یہ تو بڑی اچھی خبر ہے میرے لئے، یہ چند دن جو ہم نے ایک دوسرے سے ملے
غیر گزارے اس میں آپ بڑے ہو گئے ہیں، سب سمجھنے لگے ہیں۔“
”میں مذاق کے موڈ میں بالکل نہیں ہوں اردشیر.....“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔
”تو پھر کس موڈ میں ہیں سرکار..... ہیں.....“ وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا اور پھر ایک دم سے دھکا دے کر
آذر کو صوفے پر گرادیا۔ اور بولا.....
”تمہیں اتنی تکلیف کیوں ہو رہی ہے؟ سمجھاؤ گے یہ بات مجھے.....“

آؤر کو بیٹھک میں چھوڑا، اپنی آمد پر گھبرائے ہوئے ملازموں کو ہدایات دیں اور بڑی ماں کو سلام کرنے کے لئے اندر چلا آیا۔
 ”سلام چھوٹے شاہ.....“ گیٹ سے قریب کام کرتی ملازمہ نے پہلے تو سرسری نظر ڈالی مگر اد شیر کو دیکھ ہی کام چھوڑ کر ادھر لپکی اور ہونٹوں پر عاجزانہ سی مسکراہٹ سجا کر سلام کیا۔
 ”بڑی ماں کدھر ہوں گی؟“ اس کے سلام کو نظر انداز کرتے ہوئے اد شیر نے گہری سنجیدگی اور کھردرے پن سے پوچھا۔

”وہ جی..... وہ ستارہ بی بی کی طرف گئی ہوئی ہیں.....“
 ”اچھا..... کب آجائیں گی؟“ اُسے یہ نہ کر خاصی الجھن ہو رہی تھی۔
 ”پتا نہیں جی..... ویسے بڑی بی بی سائیں کو گھٹے کا پی دن ہو گئے ہیں۔“
 ”ہوں ٹھیک ہے..... تم اپنا کام کرو.....“ کاندھے پر رکھی لوٹی کو درست کرتا وہ آگے بڑھ گیا۔
 طویل برآمدہ اس کے گول ستون، ان ستونوں پر چڑھی سیلیں..... سب کچھ وہی تو تھا مگر پھر بھی لگتا تھا، جیسے بدلا بدلہ سا ہے۔ شاید اس لئے ایسا لگ رہا ہے کہ آج ہر شے ڈھلی ڈھلائی گھری ہوئی ہے۔
 برآمدے کی میز چھوٹے پر قدم رکھنے سے پہلے اُس نے گہری سانس لے کر بغور یہ سب دیکھا اور قدم پہلی میز پر رکھ دیا، اُس سے پہلے کہ دوسرا قدم اٹھاتا، وہ سامنے کے کمرے سے نکلے..... گلابی سوٹ اور گلابی، نیلی دھاریوں والا دوپٹہ جو سلیقے سے سر پر اوڑھ رکھا تھا۔
 ایک دولہے کی بات تھی..... اُس نے ایک اجنبی نوجوان کو دیکھا ٹھٹھکی اور پھر تیزی سے واپس مڑ کر دوبارہ اسی کمرے میں چلی گئی جہاں سے ابھی آئی تھی۔ اب صرف دروازے کے بھاری پردے مل رہے تھے۔

”کون ہو سکتی ہے؟“ اد شیر کا سوچنا یقینی تھا کہ وہ لباس سے ملازمہ نہیں لگ رہی تھی اور پھر ملازمہ اسے دیکھ کر اُلٹے قدموں واپس نہ ہو جاتی، آگے بڑھ کر ادب سے سلام کرتی۔
 شاید کوئی رشتے دار ہو مگر جب بڑی ماں ہی یہاں نہیں تو پھر کسی رشتے دار لڑکی کی موجودگی کے کیا معنی؟ ہاں یہ ممکن ہے پوری فیملی ہی یہاں مہمان ہو.....
 اُس نے کام کر لی لڑکی کو آواز دی۔

”جی چھوٹے سائیں.....“ وہ جلدی سے حاضر ہوئی۔

”ادھر حویلی میں کوئی آیا ہوا ہے کیا؟“

”ہاں جی، بڑے سائیں ادھر ہی آئے ہوئے ہیں اپنی بڑی حویلی میں.....“

”اوہو..... میرا مطلب ہے کوئی مہمان..... رشتے دار لڑکی، عورت، کوئی فیملی وغیرہ.....“

”ہاں جی، وہ زینت بی بی آئی ہوئی ہیں ادھر حویلی میں.....“

”کون زینت.....؟“ پیشانی پر ہل ڈال کر وہ سوالیہ انداز میں اُس کی جانب دیکھنے لگا۔

”یہ تو مجھے خود بھی پتا نہیں شاہ جی..... بس وہ زینت بی بی ہیں، شاہ جی کے ساتھ ادھر آئی تھیں، اسی کمرے میں ٹھہری ہوئی ہیں۔“

”اکیلی ہی آئی تھی، میرا مطلب ہے ساتھ کوئی اور عورت یا مرد نہیں تھا۔“

آؤر نے بات نہیں بتائی، بتانے سے صاف صاف انکاری ہوا۔
 اد شیر نے اس کے شانے پر زور کا ہاتھ رسید کیا اور بولا..... ”ہائے..... تیری پردہ داریاں..... تمہاری یہی باتیں تو اچھی لگتی ہیں مجھے۔“

”کبھی آؤتاں ہمارے ہاں.....“

”میں.....؟“ راکھ تذبذب کا شکار ہوئی۔

”کیوں.....؟ ایسے کیوں کہہ رہی ہو.....؟ آخر میں بھی تو تمہاری طرف آئی ہوں، میری ماں..... بھی تو اعتماد کر کے مجھے اجازت دے دی ہے۔ اب تمہیں بھی میری بات ماننا پڑے گی۔“
 ”اصل میں میری مماند نہیں کرتی اس بات کو.....“ راکھ نے ہولے سے کہا کہ نورین کو انکار اسے واقعی مشکل لگ رہا تھا۔

”آئی کی تو فکر ہی نہ کرو، انہیں میں منالوں گی..... یہ بتاؤ پھر تو تمہیں کوئی اعتراض نہ ہوگا.....؟“ راکھ نے مسکرا کر نفی میں سر ہلا دیا۔

”ٹھیک ہے، پھر میں جلد ہی آئی سے بات کر لوں گی۔“

کھانے کے بعد راکھ نے اُسے مزید رُکے کو کہا مگر وہ نہیں مانی..... جو یہ یہ کو سلام کرنے اور اجازت لینے کے لئے آئی تو اُس نے بھی یہی کہا کہ اتنی جلدی کیوں جاری ہو۔

”نہیں آئی..... اب تو اجازت چاہتی ہوں..... امی گھر میں اکیلی ہوتی ہیں..... انتظار کرو ہوں گی۔ میں کبھی اتنی دیر گھر سے باہر نہیں رہی..... اجازت لے کر تو آئی تھی مگر پھر بھی وہ فکر مند ہوں گی ہم دوسری تو ہیں، ایک میں اور ایک میری والدہ۔“

”اور آپ کے والد..... کیا وہ آپ کے ساتھ نہیں رہتے بیٹا.....“

”آئی میں بہت چھوٹی تھی، جب اُن کی ڈیجھ ہو گئی تھی، مجھے تو ان کی صورت بھی ٹھیک ہے..... نہیں۔“ نورین بات پر بات بنائے جاری تھی..... جو یہ یہ نے یہ سن کر افسوس کا اظہار کیا۔

”بس آئی..... میرے لئے تو میری ماں ہی سب کچھ ہے۔“

”خدا تمہاری ماں کو سلامت رکھے۔“ جو یہ نے دعا دی۔

”اچھا..... آئی، خدا اظہار میں پھر آؤں گی اور وعدہ رہا زیادہ دیر تک بیٹھوں گی۔“

وہ چلی گئی، راکھ گیٹ تک ساتھ گئی۔ کہا بھی کہ ڈرائیور تمہیں چھوڑ آئے گا مگر نورین نے انکار کر دیا۔

اد شیر، آؤر کے ساتھ گاؤں اچانک ہی پہنچا تھا۔ پہلے سے اطلاع نہیں دی کہ مقصد چننا انجوائے کرنا تھا، وہ باپ کی نصیحت کے احترام میں ان کا کام میں ہاتھ بنانے تو آیا نہیں کہ انہیں اپنے گاؤں جا رہا ہوں، آپ بھی وہیں آجائیں۔

شہر سے گاؤں آنے میں آموں والی کوئی پہلے آئی تھی اور بڑی حویلی بعد میں..... مگر وہ بھی نہ، کا، سپید بڑی حویلی آیا، اس خیال سے کہ بڑی ماں بھی یہیں موجود ہو گی، ان سے بھی ملاقات جائے..... اور دوستی..... خطرواری بھی وہ دل و جان سے کریں گی۔

”نہیں جی اور تو کوئی بھی نہیں، بس شاہ جی کے ساتھ آئی تھیں۔“
”کب سے ہے یہاں.....؟“ ارد شیر کچھ الجھ گیا تھا۔
”انہیں تو کافی دن..... ہو گئے ہیں جی.....“
”تب بڑی ماں حوبلی میں تھیں.....؟“
”نہیں چھوٹے شاہ جی، وہ تو ادھر ہی ہوتی ہیں، کبھی ستارہ بی بی کے پاس، کبھی شیریں بی بی کے پاس۔ میں چائے لاؤں جی چھوٹے سرکار.....؟“

”نہیں چائے کے لئے میں نے باہر غلاموں سے کہہ دیا تھا..... اب تک اُس نے کچن میں پیغام بھیج دیا ہوگا۔ تم جاؤ جا کر اپنا کام کرو۔“
”تو آپ کو یاد نہیں آیا چھوٹے شاہ جی کہ زینت بی بی سے آپ کی کیا رشتے داری نکلتی ہے۔“ لڑکی نئی تھی، ارد شیر سے زیادہ سامنا نہیں ہوا تھا، اس لئے مزاج سے واقفیت نہیں تھی۔ اُس نے دو ہاتھ کیا پوچھ لیں، وہ سوالوں پر اتر آئی۔

اس کے سوال سے پہلے ارد شیر مردانے میں جانے کے لئے قدم بڑھا چکا تھا۔ اب رُکا مڑ کر اُس کی جانب یوں دیکھا کہ بے چاری لرز گئی۔
”اپنی اوقات نہ بھول جایا کرو..... چلو چل کر اپنا کام کرو..... ذرا منہ کیا لگو، سر پر سوار ہونے لگتے ہیں۔“ وہ ڈانٹ ڈپٹ کروا پس پیشک میں چلا گیا جہاں آذرا سی کا منتظر تھا۔
”مل آئے گھر والوں سے.....؟“ اُسے دیکھ کر آذرا نے سسکتا ہونے پوچھا۔
”کہاں یار، ہم اتنی دُور سے یہاں ملنے کے لئے آئے ہیں اور یہاں گھر والے غائب ہیں۔“ وہ تلخی سے مسکرایا.....

”غائب ہیں، کہاں.....؟“ آذرا نے پوچھا۔

”ہوں..... بڑی ماں تو اپنے بھائی کی طرف گئی ہوئی ہیں اور بابا جان کے بارے میں پتا چلا ہے وہ آج کل گاؤں آئے ہوئے ہیں مگر گھر پر وہ بھی موجود نہیں۔“

”کیا کہا..... ماں اپنے بھائی کی طرف گئی ہوئی ہیں تو ماں کے بھائی تمہارے کچھ نہیں لگتے.....؟“
”بات مت پکڑا کرو یار، تمہیں پتا تو ہے سوتیلی ماں ہیں..... یہ ٹھیک ہے کہ میرے لئے سگی ماں کی طرح ہیں، وہ بھی مجھے اپنا بیٹا سمجھتی ہیں مگر ان کی باقی فیملی کے ساتھ میرا مطلب ہے کہ میں اُن لوگوں کے ہاں شاید ایک دو مرتبہ ہی گیا ہوں۔“

”یار..... لگتا ہے گاؤں میں بڑے رعب داب سے رہتے ہو تم لوگ..... یہ ملازم بے چارے مجھ سے بھی بات کرتے ہوئے گھبرا رہے ہیں۔“

”ہم لوگ نہیں صرف میں..... بابا جان نے تو سر پر پڑھا رکھا ہے۔ بدتمیز ہو گئے ہیں یہ مگر میں جب بھی آتا ہوں، انہیں اُن کی اوقات یاد دلاتا ہوں۔“ آذرا کے چہرے پر افسوس کا تاثر ابھرا.....
”ارد شیر سمجھ گیا کہ اسے یہ بات اچھی نہیں لگی..... لہذا بولا.....

”یقیناً یہ فرمان آپ کا اپنا ہوگا.....“ آذرا طنز بھرے انداز میں مسکرا کر کہہ رہا تھا۔

”..... سائیں آگئے ہیں چھوٹے شاہ جی.....“ ابھی وہ دونوں چائے پی رہے تھے کہ ملازم

ڈھلے چاندل کے پار..... 235

نے کمرچند شاہ کی آمد کی اطلاع دی۔

”ٹھیک ہے، انہیں ابھی میری آمد کے بارے میں مت بتانا، میں خود چائے پی کر مل لوں گا اُن سے.....“

”اب صرف خود ہی سلام کر کے نہ آ جانا، میں بھی ملنا چاہ رہا ہوں۔“

”ہاں ہاں، مجھے پتا ہے آپ کو سعادت مندی کی دھاک بٹھانے کا بہت شوق ہے۔“

ارد شیر چائے کی لڑکی بار پھر اندر آیا..... ملازمہ سے بابا جان کے بارے میں پوچھا تو اُس نے بتایا بڑے سائیں اپنے کمرے میں آرام کر رہے ہیں، وہ اثبات میں سر ہلا کر آگے بڑھ گیا۔ دروازے پر دھک کے بعد رُک کر انتظار نہیں کیا۔ ساتھ ہی پردہ ہٹا کر اندر داخل ہو گیا۔

وہ لڑکی جو اُسے دیکھ کر فوراً ہی کمرے میں واپس چلی گئی تھی، اس وقت بابا جان کے پٹنگ کے قریب رکھی میز پر کھانا لگا رہی تھی اور بابا جان ارد شیر کو دیکھ کر جس انداز میں گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے، وہ ضرور چونکا نے والا تھا۔

سلام کرنا یاد نہیں رہا تھا..... باپ سے نگاہ ہٹا کر لڑکی کی طرف دیکھا..... وہ سر جھکائے کھڑی تھی اور چہرہ دوپٹے کی اوٹ میں چھپا لیا تھا۔

”یہ کون ہے بابا جان.....؟“ ارد شیر کا انداز اچنبھا لئے ہوئے تھا۔

”نہ سلام نہ دُعا..... آتے ہی سوال کر دیا۔“ اب وہ سنہیل چکے تھے، اُسے بتا گئے۔

”السلام علیکم.....“ اسے اُن کا یوں جتنا اچھا نہیں لگا۔ بے رنگ سے انداز میں سلام کیا اور بولا.....

”میں اور میرا دوست یہاں آئے ہوئے ہیں، وہ ملنا چاہ رہا ہے آپ سے، اب آپ کی مرضی ہے جب بھی بیٹھک میں آئیں.....“ اس کا لہجہ خاصا سرد تھا اور سوچا تھا باپ نے نہیں بتایا اس کے بارے میں، میں دوبارہ نہیں پوچھوں گا۔“ وہ کمرے سے باہر آ گیا۔

جب بیس منٹ کے بعد شاہ جی ادھر آئے تو وہ اکیلا ہی بیٹھا تھا۔

”کہاں ہے تمہارا دوست.....؟“

”پتا نہیں شاید باہر نکل گیا ہو..... آپ جائیں جب آئے گا میں بلا لوں گا۔“ نہ چاہتے ہوئے.. ایسا کہہ گیا تھا۔

”تم زینت کو یہاں دیکھ کر حیران ہوئے ہو گے۔“ خلاف توقع انہوں نے خود ہی یہ موضوع چھیڑ دیا۔

ارد شیر نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ کرسی پر آ بیٹھے اور بولے.....

”..... غلام علی کی بیٹی ہے..... تم غلام علی کو نہیں جانتے..... بلکہ اس نام سے تو تمہاری ماں بھی پختہ نہیں تھی۔ وہ بہت عرصے پہلے میرے پاس ملازم تھا، سلکھا ہوا اور نڈرا انسان تھا۔ میرے لئے بہت نام کیا اُس نے..... یہ زینت اس کی اکلونی بیٹی ہے۔ غلام علی کی وفات کے بعد میں اسے اپنے ساتھ ہال سے آیا ہوں کہ اس کی عورت بھلا کہاں جاتی، بیوہ ہے بے چاری۔“ اُن کے لہجے میں اُس کے لئے فانی ہمدردی موجود تھی۔

تھا۔

چھوٹے سے آنگن میں پہلے تین چار مرغیاں اور ایک عدد مرغ ایک شان سے واک کیا کرتے تھے۔ اس مرتبہ وہ آیا تو درجن بھر چوزے بھی ہمراہ تھے۔
”ارے یہ کب آئے.....؟“ عزیز اپنے گرد جمع چوزوں کے قریب فرش پر بیٹھ گیا۔
”کب آئے ہیں.....؟“ رابعہ اس کی بات سن کر کئی پھر بولی..... ”یہ سویرے والی گاڑی سے ہی پہنچے ہیں۔“
”واؤ..... کتنے پیارے ہیں..... کیا نام ہیں ان کے.....؟“

”ارے بیٹا..... تم کہاں بیٹھ گئے..... آؤ اندر آ جاؤ.....“ زخون اس کی آواز سن کر کمرے سے نکلیں..... اور اسے چوزوں کے پاس فرش پر بیٹھے دیکھ کر بولیں۔
”عمر کہاں ہے خالہ.....؟ میں تو اُسے لینے آیا ہوں..... آج اپنے گھر لے جانے کا ارادہ ہے اپنی اہلی سے ملواؤں گا۔“ عزیز نے کہا۔

”ابھی آجائے گا کہاں قریب ہی سبزی لینے گیا ہے۔ آج کانج سے چھٹی تھی ناں۔“
”ہاں ہاں، میں جانتا ہوں، اسی لئے صبح ہی آن دھکا ہوں۔“
”ناشتا کرو گے بھائی.....؟“
”نہیں شکر یہ، ناشتا تو کر کے آیا ہوں۔“
”اچھا پھر مر وٹا کھالیں، میں نے خود بنایا ہے اپنے ہاتھ سے۔“
جب عمر گھر آیا، وہ مر وٹا کھانے میں مصروف تھا۔
”کیا کھایا جا رہا ہے بھئی.....؟“ اسے اپنے ہاں دیکھ کر وہ خوش ہو گیا۔
”ارے تم آگئے..... اب حصہ بھی مانگو گے.....“ عزیز نے منہ بنایا۔
عمر نے سبزی کا تھیلہ چولہے کے قریب پڑھنے پر رکھا اور خود اُس کے برابر آکر بیٹھتے ہوئے بولا.....

”کیسا حصہ.....؟ کچھ پتا بھی تو چلے۔“
”ہا ہا مر وٹے کا حصہ اور کیسا حصہ، تم فوراً اٹھو اور چل کر کپڑے بدللو، بالوں میں برش کرو اور پھر میرے ساتھ میرے گھر چلو۔“
”عزیز بھائی، سوچ لیں آپ کے گھر والے مجھ سے ملنا پسند بھی کریں گے یا نہیں۔“ وہ ہچکچا رہا تھا۔

”یکومت، جلدی سے تیار ہو کر آؤ، میں ماسے کہہ کر آیا تھا، آج اس غصے کو لے کر ہی آؤں گا، وہ شکر ہوں گی ہماری۔“
”عزیز بھائی، میں ڈرتا ہوں، آپ نے انہیں میرے بارے میں جانے کیا کیا بتا رکھا ہوگا..... مل کر یقیناً پاپس ہوں گی۔“
”اچھا..... ایک نہ ایک دن تو ملاقات ہوتا ہی ہے کہ آخر تم دوست ہو ان کے بیٹے کے تو میرے

”کب تک یہاں رہے گی.....؟“ اردشیر کا لہجہ ہر جذبے سے عاری تھا گویا ابھی جوانیوں نے وہ ضائع ہی کیا۔

”ابھی کیا کہہ سکتا ہوں، تمھوٹے دن ہی ہوئے ہیں اسے یہاں آئے ہوئے، غم تازہ ہے سب چاری کا..... اُداس رہتی ہے۔“
”کیوں، آپ گھر پر نہیں ہوتے کیا.....؟“ وہ کس انداز میں کہہ گیا تھا پھر جیسے خود ہی خیال آ گیا۔
کہنے کے ساتھ ہی زبان دانتوں تلے دبا کر نظر بھکا لی۔

اردشیر کا اس انداز میں جتنا، بے شک وہ اپنی اس حرکت پر خود بھی شرمندہ دکھائی دے رہا تھا مگر شاہ جی ضرور ٹھٹھک گئے۔

شاہ جی سے آؤر کی ملاقات شام کو ہوئی..... اُس کی سنجیدگی اور متانت نے انہیں بے حد متاثر کیا..... خوشی ہوئی کہ اتنا اچھا لڑکا ان کے بیٹے کا دوست ہے، فیصلہ کر لیا وہ آؤر سے بات کریں گے کہ اردشیر کو سمجھائے، ذمہ داریوں کا احساس دلانے کہ باپ کی تو وہ سنا نہیں تھا، شاید دوست کی بات ہی دل کو لگ جائے۔

”صبح ناشتے کے فوراً بعد وہ آؤر سے تیار ہونے کو کہہ رہا تھا۔“
”اب کہاں کی تیاری ہے.....؟“

”ہم بڑی ماں سے ملنے جا رہے ہیں۔ تم دیر نہ کرو، فوراً اُٹھ کر تیار ہو جاؤ۔“
وہ دونوں پہلے کبرئی خاتون کے بھائی کی طرف گئے۔ پتا چلا وہ ستارہ کے ہاں ہے، ماموں نے کہا بھی..... ”چائے پانی ہی پیتے جاؤ۔“ مگر اُسے کبرئی سے ملنے کی بہت جلدی تھی، شکر یہ کہہ کر گاڑی میں آ بیٹھا۔

کبرئی نے اردشیر کی آمد کا سنا تو ملازمہ سے کہہ کر اپنے کمرے میں ہی بلو الیا۔ وہ اور آؤر اندر آئے تو کمرے میں وہ اکیلی اُن کی آمد کی منتظر تھیں۔ اردشیر ہمیشہ آؤر کے سامنے بڑی ماں کی بہت تعریف کرتا تھا۔ وہ انہیں ایک غیر معمولی عقل والی عورت کہتا تھا اور اسے دعویٰ تھا کہ انہوں نے مجھے میری سگی ماں سے بھی بڑھ کر محبت دی ہے۔

”وہ عورت آؤر کے سامنے تھی مگر وہ محبت، وہ پیار جس کا ذکر اس کا دوست ہمیشہ کرتا آیا تھا، وہ تو سرے سے موجود نہیں تھی۔ آؤر اُن کے انداز پر حیران ہوا کہ وہ اردشیر سے بڑے عام سے انداز میں ملیں، کچھ۔ ان دونوں کی ملاقات کافی عرصے کے بعد ہوئی تھی۔ آؤر کے ساتھ بھی تکلف سے سلام دعا ہوئی۔“
انہوں..... دونوں سے بیٹھے کو کہا۔ اردشیر باتیں کرتا رہا جبکہ آؤر انہیں بغور دیکھتا رہا۔

اور اسے احساس ہوا، واقعی ان میں کوئی ایسی بات ہے ضرور جو انہیں ممتاز کرتی ہے۔ آنکھوں میں ذہانت کی چمک اور اس کے ساتھ ساتھ بے پناہ عزم جھلک رہا تھا۔ چہرے پر حد درجہ سنجیدگی، وہ مسکراں تھیں تو بھی اس سنجیدگی میں کوئی فرق نہیں آتا تھا، اپنے ارادوں میں چٹان دکھائی دیتی تھیں۔
اُس عورت پر ایک نہیں، دو دو سوئیں لائی جاسکتی ہیں..... کیسے برداشت کیا اس نے.....؟ آؤر حیران بھی تھا اور متاثر بھی۔

وہ دونوں آپس کی گفتگو میں سے بھلا ہی چپے تھے، وہ اس وقت سے فائدہ اُٹھ کر انہیں دیکھ رہا تھا۔

خیال میں یہی بہتر ہے، ابھی مل لو اور مایوس کر دو، چلو شاہ جلدی کرو۔“
عمر تیار تو نہیں تھا اُس کے ساتھ جانے کو مگر مزید کے آگے چل نہیں رہی تھی۔

وہ سوچ رہا تھا ضروری تو نہیں بھائی کے گھروالے بھی ان ہی جیسے ہوں، امیر غریب کا فرق نہ رکھنے والے اور کھلے دل کے مالک، اگر انہوں نے اچھے رویے کا مظاہرہ نہ کیا تو مجھے تو افسوس ہو گا ہی مگر بھائی بھی شرمندگی اٹھانا پڑے گی..... لیکن اب بار بار انکار کیا کرتا، وہ اتنے شوق سے ساتھ لے جانے کے لئے کہہ رہا تھا، اُسے ماننا ہی پڑی۔

کپڑے بدل کر آئی تو بولی.....
”تم بھی منہ کا تھو کر فریش ہو جاؤ۔“
رائے اثبات میں سر ہلا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔
جب واپس آئی تو نورین ڈیرنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی میک اپ کر رہی تھی۔
”ارے کیا گھر میں بھی میک اپ کرتی ہو؟“

صبح کالج جانے سے پہلے نورین خود جویریہ کے پاس آئی تھی اور درخواست کی تھی کہ رات کو میرے گھر آنے کی اجازت دے دیں۔ جویریہ سوچ میں پڑ گئی تھی۔
”پلیز آئی، ماں جائیں ناں، وہاں پر میرے اور میری مُمی کے علاوہ اور کوئی نہیں ہوتا۔“

”نہیں بس ایسے ہی آج جی چاہ رہا ہے۔“ پھر اس کی جانب دیکھا اور بولی.....
”یوں سمجھ لو تمہارے آنے کی خوشی میں یہ اہتمام ہو رہا ہے..... تم یہیں بیٹھو، میں کھانا پیہیں منگواؤں ہوں۔“ جنہیں بھوک تو لگی ہوگی۔ ”وہ ارد شیر کی آمد سے پہلے یہ کام نہ سالیٹا چاہتی تھی۔“

اور جویریہ انکار نہیں کر سکی..... اسے اجازت دیتے ہی بنی۔
نورین نے کل ارد شیر سے بات کی تھی اور پورے یقین کے ساتھ کہا تھا۔
”کل دوپہر کو تم میری طرف آ جانا شاہ..... رات تمہیں ضرور میرے گھر پر ملے گی۔“

ارد شیر کو یقین تھا، نورین نے وعدہ کیا ہے تو پورا بھی کرے گی، بہت تیز لڑکی تھی وہ، میڈم فیروزہ کہتی تھیں، بھانجی ہے میری، بانی اصل حقیقت کیا ہے اس کے بارے میں کسی کو علم نہیں تھا۔
وہ پوری طرح تیار تھا۔ جب گھر سے نکلنے لگا تھا، تب حبشید شاہ نے اتنی دُور گاؤں میں بیٹھ کر ایک ایسی خبر سنائی جس نے سارے موڈ کا ستیا ناس مار دیا۔

نورین نے کل ارد شیر سے بات کی تھی اور پورے یقین کے ساتھ کہا تھا۔
”کل دوپہر کو تم میری طرف آ جانا شاہ..... رات تمہیں ضرور میرے گھر پر ملے گی۔“
”مگر تم تو کہتی تھیں، اُس کی ماں تمہیں آنے جانے نہیں دیتی۔“ ارد شیر کو یقین نہیں آیا تھا۔
”ٹھیک کہا تھا میں نے مگر تم نورین کو نہیں جانتے شاہ، میں جو کہہ دیتی ہوں، ہر صورت میں پھر کر کے ہی دکھائی ہوں..... بس تم دو اور تین بجے کے درمیان آ جانا۔ وہ میرے بیڈروم میں موجود ہوگی۔“

وہ بتا رہے تھے..... ”میں نے زینت سے نکاح کر لیا ہے، بے آسرا تھی اور اس کے باپ نے مرتے وقت وعدہ بھی لیا تھا مجھ سے، میں نے اسی وعدے کا پاس کیا ہے۔“ یقیناً جوان بیٹے کو یہ اطلاع دیتے ہوئے وہ خود بھی کچھ شرمندہ تھے، جیسی تو وہ وضاحت پر وضاحت کئے جا رہے تھے۔
ارد شیر ایک لفظ نہیں بولا۔ اُسے باپ سے اس کی اُمید نہیں تھی۔

”ٹھیک ہے..... میں پہنچ جاؤں گا، اگر تم واقعی کامیاب ہو گئیں تو انعام کی حقدار ہوگی۔“
”وہ تو خیر میں لوں گی، اس کے علاوہ کل رات کا کھانا بھی تمہارے ساتھ کسی اچھی جگہ پر۔“
نورین نے جویریہ سے اجازت لے لی تو تھی..... مگر پھر بھی کالج کا ٹائم ختم ہونے کے بعد رات، نورین کے ساتھ اس کے گھر جاتے ہوئے گھبراہٹ تھی۔
”تمہاری امی برا تو نہیں منائیں گی؟“

”ہونہ..... بے آسرا، بے سہارا، بے چاری، تو کسی دارالامان میں بھیج دیتے۔ اصل بات تو یہ ہے کہ زینت خراب ہو گئی تھی آپ کی اور میں سوچ رہا ہوں اس شادی کے نتائج کیا نکلیں گے کہیں میرے لئے مصیبت نہ بن جائے۔ بوڑھے شوہر کی جوان بیوی تو اگلیوں پر نچائے گی۔“

”پاگل، بھلا اس میں برا ماننے کی کیا بات ہے؟“ نورین اُس کا گال چھو کر پیار سے بولی تھی۔
وہ وہ بیڈروم کا جدید اسٹائل کا کم رتبے پر بنا مکان تھا۔ دروازہ ملازم نہ کھولا تھا اور نورین سیدھی اُسے اپنے بیڈروم میں لے آئی تھی۔

ایسی کئی مثالیں اس کے ملنے والوں میں موجود تھیں۔ جوان بیوی کو پاتے ہی باپ نے اولاد سے انہیں بچھڑا لیں..... جائیداد سے عاق کر دیا تھا۔ اولاد دسپ سے بڑی دشمن نظر آنے لگی۔ کیا اولاد ہونے کا امکان بھی ہو سکتا ہے۔ سب سے زیادہ یہی بات پریشان کن تھی۔

”تمہاری مُمی سے قول لوں.....“ رات کہنے لگی۔
”نٹھرد میں دیکھ کر آتی ہوں۔ پتا نہیں وہ گھر پر ہیں یا نہیں۔“ نورین نے بات بتائی۔ کچھ دیر کے لئے کمرے سے باہر گئی، پھر واپس آ کر وہ بولی.....

اوہو بابا جان نے بیٹھے بٹھائے یہ کیا مصیبت کھڑی کر دی ہے۔
پتا نہیں بڑی ماں کے علم میں ان کا نکاح ہے یا نہیں، اگر ہے تو ان کا رد عمل کیا ہے، کیا وہ بھی میری طرح اُس آنے والی کو خطرہ سمجھ رہی ہیں..... یا ابھی تک وہ لاعلم ہیں۔ اُس روز گل زرخ کی وجہ سے بد مزگی ہوئی اور نہ ہی بڑی ماں کو زینت کے بارے میں بتانے کا ارادہ رکھتا تھا..... اور وہ وقت پر اس مصیبت کا فائدہ نہ کوئی حل نکال لیتیں..... اب بھی بڑی ماں سے ملنا اور یہ بات کر کے مشورہ لینا بہت ضروری ہے۔

”ملازم بتا رہا ہے، وہ گھر پر موجود نہیں ہیں، کسی دوست کی طرف گئی ہیں، واپسی پر درہر ہو جائے گی اور یہ تم بیٹھی جیسے ہو، یوں لگتا ہے موقع ملے ہی اٹھ کر بھاگ جاؤ گی، ٹھیک ہو کر بیٹھو، میں نے کہہ دیا ہے۔ ابھی کھانا لگ جائے گا۔ میں بس ابھی دو منٹ میں پہنچ کر کے آتی ہوں۔“ اُس نے ریست واپچ پر نظر ڈالی۔ بھی دو بجتے میں تیس منٹ باقی تھے۔

”مجھے تو نورین کے ہاں جانا تھا..... اب دیر ہو جائے گی۔“ وہ غلٹ کے عالم میں گاڑی

تک آیا۔

نورین حیران تھی..... وہ ابھی تک آیا کیوں نہیں..... وہ باتیں تو رات سے کر رہی تھی مگر سارا صبح
اردشیر کی جانب تھا۔ بچے چپکے کئی بار نائم دیکھ چکی تھی۔
ڈھائی بجے کے قریب اسے محسوس ہوا کوئی آیا ہے۔ گاڑی کا شور اور پھر گیٹ کھلنے اور بند ہونے کا
آواز آئی اور وہ رات سے ”ابھی آتی ہوں“ کہہ کر باہر نکل آئی۔ اندازہ غلط نہیں تھا۔ آنے والا وہی تھا جس کا
اُسے انتظار تھا۔

”اتنی دیر.....؟“ نورین نے کہا۔

”ہاں بس کچھ کام پڑ گیا تھا، تم بتاؤ کیا وہ موجود ہے.....؟“

”یقیناً..... وہ میرے بیدروم میں بیٹھی ہے، تم چلو میرا کام ختم ہوا، میں ڈرائنگ روم میں ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔“ وہ سر ہلا کر آگے بڑھ گیا۔

دروازہ کھلا تو تصویروں کے الہم دیکھتی رات سے بھی کئی نورین آئی ہے، سر اٹھائے بغیر بولی.....

”اب مجھے چلنا چاہئے، کافی دیر ہو گئی ہے، ممانظر کر رہی ہوں گی۔“

فقرے کے اختتام پر نظریں اٹھائیں تو گھبرا کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

آنے والے کی نظر اُس پر جمی ہوئی تھی، وہ یقیناً اس کی گھبراہٹ سے لطف لے رہا تھا۔



”آ..... آپ.....؟“ بے ساختہ ہی رات کے منہ سے نکلا۔
”اور یہ تم ہو، مجھے یقین نہیں آ رہا.....“ اردشیر جواب تک دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھے کھڑا
نہایت حیرت کی بڑی اچھی ادارکاری کے ساتھ کہتے ہوئے آگے آگیا۔
رات سے یہاں دیکھ کر اچھی خاصی گھبرا گئی تھی..... اُس نے اس شوق کو نہیں دیکھا جو اردشیر کی
آنکھوں میں نمایاں تھا، وہ اُنھی اور جانے کے ارادے کے ساتھ بیک اٹھا کر کاندھے پر ڈال لیا۔
”کیسی ہو رات حسن.....؟“ وہ اس کا ارادہ بھانپ چکا تھا مگر اظہار نہیں کیا۔ اس کے سوال کا رات
نے کوئی جواب نہیں دیا۔

”نورین کی دوست ہو۔“ اردشیر آکر صوفے پر بیٹھ گیا۔ تب رات نے صرف اثبات میں سر ہلا کر
اُس کی بات کا جواب دے دیا البتہ منہ سے کچھ نہیں بولی، نہ ہی جھکی ہلکیں اٹھانے کی ہمت ہوئی۔
وہ جسے تنہائیوں میں سوچتی رہی نہ چاہتے ہوئے بھی جس کا خیال ساتھ ساتھ رہتا تھا، وہ اتنا قریب
نہ اس سے مخاطب تھا، رات کا دل بہت تیز دھڑک رہا تھا۔

”بیٹھو نا..... کھڑی کیوں ہو.....؟“ اردشیر کے انداز میں شوق تھا، کچھ التجاء بھی تھی۔ باقی کے
انداز ایسے وقت میں خود بخود آن وارد ہوتے تھے، آج غائب تھے، وہ اشتیاق کے عالم میں اُسے ایک
نکد دیکھ رہا تھا اور اُس کی باتیں سننے کا مشتاق دکھائی دیتا تھا، آج اس کے لہجے میں، اُس کی آنکھوں میں
نہ الال ایسا ویسا کوئی رنگ نہیں تھا جو رات کو چونکا دیتا خوف میں مبتلا کر دیتا۔

”اُس میں جانا چاہ رہی تھی، بہت دیر ہو گئی ہے، مجھے یہاں آئے ہوئے۔“ رات نے اپنی کیفیت سے
نورین کو مطلع نہیں کیا۔

”جلی جانا ابھی کوئی زیادہ وقت تو نہیں ہوا، آؤ ادھر آکر بیٹھو۔“

”آپ یہاں.....؟“ وہ اسی قدر پوچھ سکی حالانکہ کہنا یہ چاہ رہی تھی، کیا آپ نورین کے رشتے دار
.....؟ اُسے یاد آ رہا تھا پہلی بار جب اُسے دیکھا تھا، وہ میڈم سے ملنے ہی اُن کے کالج آیا تھا اور نورین
نورین کی بھانجی ہے۔

”میں نورین کا کزن ہوں، نورین بہت اچھی لڑکی ہے..... میں نے جب بھی اسے کسی کام کے
ساتھ لایا، اُس نے مجھے مایوس نہیں کیا۔“ اردشیر کی ہلکی رات کی سمجھ سے بالاتر تھی۔

”تم ابھی تک کھڑی کیوں ہو.....؟“ وہ پھر کہہ رہا تھا، تب اُسے بیٹھنے ہی بنی۔

”میرانا م“

”کہو ناں، کیا کہہ رہی تھیں تم.....؟“ وہ شوق اور توجہ سے اس کی بات سن رہا تھا۔
”کچھ نہیں، بس یہی کہ کسی غیر مرد کے ساتھ یوں بیٹھ کر باتیں کرنا اچھی بات نہیں، دیکھیں ناں، ہم مسلمان ہیں، ہمارا مذہب ہمیں اس بات کی اجازت نہیں دیتا، جس سے اللہ میاں نے منع کر دیا، وہ بات ہم کیوں کریں۔“ جس انداز میں رک رک کر اعتقاد کو بمشکل بحال کر کے وہ بول رہی تھی۔ ارد شیر کو اچھا لگ رہا تھا۔ اور ہنسی بھی آ رہی تھی۔
”ارے واہ۔ مذہب کے متعلق تو بڑی مکمل معلومات رکھتی ہو۔“
”سب کو رکھنی چاہئے، مذہب سے بڑھ کر تو کچھ بھی نہیں، اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان ہے کہ اُس نے ہمیں مسلمان گھرانے میں پیدا کیا۔“
”کتنے بہن بھائی ہیں تمہارے.....؟“ ارد شیر کو مذہب سے بھلا کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ لہذا جلدی سے موضوع بدل دیا۔

”دو..... ایک میں اور ایک میرا بھائی..... بھائی بڑے ہیں مجھ سے.....“
”میری تین بہنیں ہیں اور میں اکلوتا ہوں۔“ اُس نے خود ہی بتا دیا اور اس کے ساتھ ہی اسے باپ کے کاج والی بات یاد آ گئی..... راکھ کو دیکھ کر اس کے ساتھ باتوں میں وہ بھول ہی گیا تھا مگر اب یاد آ تو طبیعت ایک دم سے مکدر ہو گئی۔
”کیا ضرورت تھی بابا جان کو، خیر انہیں تو ضرورت ہوگی ہی، جی تو کی ہے مگر بندہ اپنی عمر کا ہی کچھ احساس کر لیتا ہے، اور میرے لئے تو خواہ خواہ میں مصیبت کھڑی کر دی ہے، پتا نہیں کس کس کی عورت ہے۔ کیا عزائم ہیں اس کے؟“ محترمہ مجھ سے تو پردہ فرما رہی تھیں اور بابا جان کے کمرے میں موجود اُن کے لئے کھانا پچھا جا رہا تھا۔ ہونہد، دیکھ لوں گا سب کو، اپنا حق کسی کو چھیننے نہیں دوں گا۔ (وہ اسی سوچ میں الجھا اور الجھتا چلا گیا۔
راکھ نے بھی اس کی خاموشی اور چہرے پر پھیل جانے والی سختی کو ڈرزدیدہ نگاہ سے دیکھا اور حیران بھی اچھی خاصی ہوئی۔
”اب میں چلتی ہوں، اتنی دیر تو کبھی گھر سے باہر نہیں رہی، میری ماما انتظار کر رہی ہوں گی۔“ اُس کے انداز میں التجا بھی..... ارد شیر اس کی آواز پر سوچ سے ملنا، اسے دیکھا اور بولا.....
”بہت زیادہ جلدی میں ہو، زیادہ نہیں تو تھوڑا سا خیال میرا بھی کرلو۔“ اس بات کا وہ کیا جواب دیتی۔

پھر جیسے اسے راکھ پر ترس آ گیا، بولا.....
”اچھا جاؤ۔ مگر اس وعدے کے ساتھ کہ پھر ملو گی۔“
”جی ٹھیک ہے۔“ اسے تو جانے کی جلدی تھی، جھٹ سے ہامی بھری کہ بعد میں ملنا یہ تاملنا تو اپنے اختیار میں تھا۔
وہ تیزی سے قدم اٹھاتی کمرے سے باہر آ گئی۔ جیسے یہ خدشہ ہو، اگر ذرا بھی رفتارست پڑی تو پھر بھی جانیں پائے گی۔
”ارے تم جارہی ہو راکھ.....؟“ چھوٹے سے لان میں کھڑی نورین نے اسے دیکھا تو حیرت

ارد شیر شاہ ہے اور میں.....“
”یہ نورین پتا نہیں کہاں رہ گئی ہے، میں اسے دیکھ کر آتی ہوں۔“ راکھ نے پورا تعارف مجھ کو روانے دیا اُسے.....
”نہیں کہیں ہوگی، شاید میرے لئے جائے بنانے میں لگ گئی ہو، تم پریشان کیوں ہو رہی ہو تمہیں کیا معلوم راکھ، کہ یہاں تمہاری موجودگی مجھے کتنی خوشی دے رہی ہے۔ تم مجھے پہلی ہی ملاقات پر اچھی لگی تھیں..... اور میں نے سوچا تھا، کاش دوبارہ ملاقات ہو سکے۔ خواہشیں اتنی جلدی بھی پوری نہیں، یقین نہیں آتا۔“
راکھ نے پہلی بار سیاہ لمبی پلکیں اٹھا کر اُس کی جانب دیکھا اور راکھ کی آنکھوں میں حیرت ہی ج تھی۔ اُسے ارد شیر کی بات پر یقین جو نہیں آیا تھا۔
”میں سچ کہہ رہا ہوں۔“ اُس کی بے یقینی بھانپ کر اُس نے یقین دلایا تھا، تب پلکیں پھر ہر گئیں اور اس نے چہرہ بھی نیچے کر لیا۔

”تم بھولنے والی چیز ہو ہی کب..... اتنی پیاری، اتنی معصوم لڑکی میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی نہ حسن نکلنے پر مجبور کرتا ہے۔ اور تمہاری آواز گھٹان کر سننے والے پر چھا جاتی ہے..... اتنی مل لڑکی سوچتا ہوں، پہلے کیوں نہیں ملیں..... اب تک کہاں چھپی رہیں تم.....“
یہ تعریف تو جوشی تو جی مگر اس کی آواز، لہجہ کا اتار چڑھاؤ، یہ سب اُس چھوٹی موٹی لڑکی کے بہت زیادہ تھا، وہ گھبرا گئی اور ملتجیانہ انداز میں اسے دیکھا..... اُس کی حالت پر وہ ہنس پڑا اور بولا.....
”یہ تو کچھ نہیں، مجھے تو وہ الفاظ ہی نہیں مل رہے جن میں تمہاری تعریف کر سکوں۔“
”آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں.....؟“ دے دے لفظوں میں اُس نے اپنی گھبراہٹ اور اُن بے باکی کا احساس دلانا چاہا۔ وہ اس گھبراہٹ اور شرم کا لطف پوری طرح لے رہا تھا، بھر بولا.....
”اچھا تو پھر تم بتاؤ، کیسی باتیں سننا پسند کرتی ہو.....؟“ راکھ کیا کہتی خاموشی سے دوپٹے کا مروڑنے لگی.....

”سچ بتاؤ، کبھی تمہیں میرا خیال آیا تھا.....؟“
یہ سوال ایسا تھا کہ راکھ کو ایک دم سے اندر کا چور پکڑے جانے کا احساس ہوا۔ دوپٹے کے کونے ساتھ مصروف ہاتھ رک گیا..... اور اسے لگا پورا بدن ٹپکے ٹپکے پسینے میں بھج گیا ہو..... جبکہ وہ اپنے کے جواب کا منتظر تھا..... راکھ نے لمبا وقفہ دیا پھر ہمتیں جمع کر کے بولی.....
”آپ تو نورین سے ملنے آئے تھے، جا کر مل لیجئے۔“
”اب نورین سے ملنا اتنا ضروری نہیں ہے۔“ اُس کا انداز معنی خیز تھا۔
”مگر یہاں پر میں اور آپ..... میرا مطلب ہے کہ نورین آگئی تو.....؟“
”تو کچھ بھی نہیں..... ہم دونوں اگر یہاں موجود ہیں یا باتیں کر رہے ہیں تو اس میں کیا ہے.....؟“
”آپ کے نزدیک نہیں، لیکن میری ماما کہتی ہیں.....“ بات کرتے کرتے جو ارد شیر کی جانب سے اعتماد بھر سے اُڑ گیا، وہ بات مکمل نہیں کر سکی۔

”بولو..... کیا پیو گے؟“ نورنی نے میز بانی بھائی۔

”کچھ نہیں، اب چلتا ہوں، پھر آؤں گا۔“

”آخر اتنی غلٹ کیوں سوار ہے؟“ وہ کھڑا ہوا تو نورین نے آگے بڑھ کر بازو پر ہاتھ رکھ دیا

جسے اس نے نرمی سے الگ کیا اور بولا۔

”بہت الجھا ہوا ہوں، پھر بھی سہی.....“ اور وہاں سے چلا آیا۔

”آ جاؤ، عمر زک کیوں گئے۔“ مزرب نے ہاتھ پکڑ کر اسے کہا۔

”آپ کا گھر بہت اچھا ہے۔“ عمر راستے بھر خاموش رہا تھا اور یہاں آ کر تو ٹھنک گیا تھا۔

”گھبراتے کیوں ہو؟ میری مہمانی اچھی ہیں جیسے تمہاری ماں مجھ سے ملتی ہیں۔ اسی

طرح میری ماں بھی بیٹے کے دوست کے ساتھ اپنائیت سے ملیں گی، آؤ، آ جاؤ شاہاش.....“

ہاتھ پکڑے ہوئے ہی وہ اسے ڈرائنگ روم تک لایا۔ صوفے پر ہلکا سا دھکا دے کر بٹھایا اور

بولا.....

”کیا خاطر کروں تمہاری؟“

”سادہ بانی لے آئیں..... سچ اس وقت پیاس سے حلق خشک ہو رہا ہے۔“

”تم تو بالکل پاگل ہو عمر..... ارے بابا ایسا بھی کیا گھبراتا، ابھی جب تم میری والدہ سے ملو گے، تو

یقیناً خوش ہو گے۔ بہن تو اس وقت کالج گئی ہوگی۔ تم میری دادی بلکہ میری نزن کی دادی سے ملو گے تو

سوچو گے کاش میں بھی اس گھر میں پیدا ہوا ہوتا۔ تم میرے گھر والوں سے ملنے کے بعد یہ کہنے پر مجبور ہو

جاؤ گے کہ گھر والے مزرب سے زیادہ اچھے ہیں۔“

عمر ہلکا سا مسکرایا۔ کہا کچھ نہیں۔

”میں ذرا زوردار قسم کی چائے کا کہنے جا رہا ہوں، تم میری غیر موجودگی میں ادھر ادھر سرگھا کر جائز

لے سکتے ہو، میں بالکل برا نہیں مانوں گا۔“

”زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ مزرب جویریہ کے ساتھ آ گیا اور بولا.....

”ان سے ملنے، یہ ہیں میرے دوست جناب عمر صاحب.....“ مزرب نے مسکرا کر خوشگوار انداز

میں تعارف کرایا تھا۔ عربی احترام سے اٹھ کھڑا ہوا..... اور نہایت اپنائیت بھرے انداز میں ”السلام علیکم

آئی“ کہا۔

بلک، بینک اور وائٹ برعوض سازی، بالوں کا سادہ جوڑا بنائے، وہ خاتون سوہر تو تھیں ہی مگر اس

کے علاوہ بھی کوئی بات تھی، عمر کو انہیں دیکھتے ہی اپنائیت کا احساس ہوا تھا، یہ عورت تو اس سے کہیں اچھی

تھی، جتنا مزرب بتایا کرتا تھا، وہ سہرا پاشفت اور نیک دکھائی دیتی تھیں، عمر ملیں جھپک نہیں سکا۔

وقت تو کتنا بھی تیز چل لے، تیرے بڑھتے قدم کتنوں کو روند ڈالیں، تیری رفتار کا ساتھ دیتے

ہوئے ہاتھ ہاتھوں سے چھوٹ جائیں مگر دل نہیں بدلتے یاد رکھنا، جذبے نہیں مرتے، تیرے بے رحم

فیصلوں کا شکار ہونے والے بظاہر سر جھکا کر ان فیصلوں کو قبول کر لیتے ہیں جو تو ان کے لئے کرتا ہے مگر

یادیں ہر بل ساتھ ساتھ رہتی ہیں، بظاہر ہنستے لوگ، اندر سے روتے ہی رہتے ہیں۔

سے کہے بغیر نہیں رہ سکی۔

”ہاں مجھے بہت دیر ہوگئی ہے اور تم ادھر کھڑی کیا کر رہی ہو؟ اندر کیوں نہیں آئیں

تمہارے کزن بھی منتظر ہیں تمہارے.....“

نورین کو اس طرح کے جملوں کی اس وقت توقع نہیں تھی، اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس نے

سے پاؤں تک بغور رانچ کو دیکھا پھر چہرے پر نظر جما کر بولی۔

”تم سے کیا باتیں ہوئیں شاہ کی؟“

”کوئی خاص تو نہیں اور تم تھیں کہاں، آئیں کیوں نہیں، جانتی ہو مجھے ان کے ساتھ اکیلے بیٹھنا

نہیں لگا۔“

اردشیر کے سامنے تھی تو گویا طلسم کے اثر میں تھی مگر باہر آتے ہی اسے سب غلط لگنے لگا تھا۔ جمیڈ

نورین کے پوچھنے پر کہ شاہ نے اس سے کیا کہا ہے، کوئی خوبصورت رنگ اس کی آنکھوں میں نہیں آیا بلکہ

صاف کہہ دیا کہ کوئی خاص بات چیت نہیں ہوئی..... وہ اب جلد از جلد گھر پہنچنا چاہتی تھی..... اس نے

نورین سے کہا.....

”اپنے ڈرائیور سے کہو مجھے گھر تک ڈراپ کر دے۔“

”گاڑی تو شاہ کے پاس بھی ہے۔ وہ تمہیں لے جائیں گے۔“

”نہیں نہیں..... ایسا غضب مت کرنا، تم میرے گھر والوں کو جانتی نہیں ہو۔“ رانچ نے جان بوجھ

کر گھر والوں کا ذکر کیا کہ اگر اپنے طور پر منع کرنی تو یقیناً نورین نہ مانتی اور شاہ کو بلالاتی..... اب نورین کو

بھی قائل ہونا پڑا۔

رانچ چلی گئی، تب نورین شاہ کے پاس اندر چلی آئی۔ وہ کسی سوچ میں کم دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے

پیشانی سہلاتے ہوئے ملا.....

”تمہیں کیا ہوا شاہ.....؟“ اس کی حیرت اور ہلکا سا غصہ ضروری بھی تھا کہ کتنا شور کر رکھا تھا اردشیر

نے، لگتا تھا وہ لڑکی اس کے حواسوں پر چھا گئی ہے۔ نورین نے بہت سادہ وقت رانچ پر ضائع کیا تھا اور اب

جب وہ شاہ کے سامنے آئی تو ایسا کچھ بھی نہ ہوا جس کی توقع نورین کو تھی۔

اس کی آواز پر پیشانی سہلانے کا عمل روک کر اس نے نورین کی طرف دیکھا اور بولا.....

”کچھ بھی تو نہیں ہوا، تم مجھے ایسے کیوں دیکھ رہی ہو؟“

”مجھے تو جناب شاہ صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں لگتی، کتنا شور مچا رکھا تھا اس کے لئے، اگر چند من

دیکھنا ہی چاہتے تھے تو پھر مجھے اتنا لمبا سیم کھیلنے کو کیوں کہا تھا۔“

”صرف چند من کی بات نہیں میری جان، میں اسے بار بار دیکھنا چاہتا ہوں، وہ بہت اچھی بہت

بیاری ہے، اسے توڑنے کو نہیں سنبھال کر احتیاط سے کسی مضبوط حصار میں رکھنے کو جی چاہتا ہے۔“

”یہ باتیں تم کر رہے ہو شاہ..... مجھے یقین نہیں آ رہا۔“

وہ ہنس پڑا، پھر آہ بھر کر بولا..... ”یقیناً تو مجھے بھی نہیں آ رہا، کیا ہے یہ سب اور کیوں ہو رہا ہے، اب

نہی ہوتا چاہئے مگر میں بے بس ہوں، یہ دل بھی میرے اختیار میں نہیں رہا۔ اس نے ہمیشہ من مانی

ہے۔“ اس کے انداز میں ابھن تھی۔

”جی آئی.....“ میں ضرور آؤں گا.....“ وہ کہہ نہیں سکا کہ آپ مجھے بہت اپنی اپنی سی لگ رہی ہیں، انا ہم باتیں جو آج تک کسی سے نہیں کہیں، جی چاہتا ہے آپ سے کہہ دوں..... میں بار بار آپ سے ملنا چاہتا ہوں، آپ کی باتیں سننا چاہتا ہوں، کس قدر سکون ملا ہے آپ کو دیکھ کر آپ کے پاس بیٹھ کر..... مگر وہ کچھ بھی تو نہ بول سکا۔

سوپا آفس سے آتے ہی کچن کی جانب متوجہ ہوئی تھی، روزانہ تو وہ صبح ہی دوپہر کا کچھ نہ کچھ کام کر کے جاتی تھی اور باقی کا تھوڑا..... بہت ملازمہ سرداراں دیکھ لیتی مگر وہ آج کل چھٹی پر تھی۔ سوپا کی بھی آنکھ پر سے کھلی..... جیسے تیسے ناشتا بنایا اور گھر سے نکل گئی۔

دور تیل کی آواز پر خیال بھی نہیں تھا کہ مزید، عالیہ اور کاشف ہوں گے۔
”ارے آپ لوگ.....؟“ انہیں اچانک سامنے پارکروہ حیرت سے کہے بغیر نہ رہ سکی۔
”دیکھا..... میں پہلے ہی کہہ رہا تھا، ہمارا آنا اچھا نہیں لگے گا محترمہ کو.....“ مزید نے مایوسی سے مدہنایا اور اُن دونوں سے کہا.....
”اچھا..... کب اور کسے کہا تھا..... ہماری تو جان کھائے ہوئے تھے کہ سوپا کے گھر چلو.....“ کاشف نے بھانڈا اچھوڑ دیا۔

”آئیے.....“ سوپا نے دروازے سے ہٹ کر انہیں راستہ دیا..... پہلے عالیہ، پھر کاشف اندر آئے جبکہ مزید باہر ہی کھڑا رہا۔

سوپا خوب سمجھ رہی تھی، ہنس پڑی اور بولی.....
”مجھے پتا ہے جب تک پرزور اصرار نہیں کروائیں گے، اندر قدم نہیں رکھیں گے، سو میں کہہ رہی ہوں پلیز مزید صاحب، آپ اندر تشریف لا کر غریب خانے کو رونق بخشیں۔“
”ہاں، یہ ہوئی ناں بات.....“ اُس نے بچوں کی طرح خوشی کا بھرپور اظہار کیا اور دروازہ عبور کر لیا۔ اُس کی اس حرکت پر سوپا کی ہنسی بڑی بے ساختہ تھی۔

”آئی اس وقت سوری ہیں، اُن کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، سردار بی بی آج کل اپنی بہن سے ملنے گاؤں گئی ہوئی ہے۔ میں آفس چلی جاتی ہوں اور وہاں جا کر ان کی طرف سے فکر مند ہی رہتی ہوں۔“
جب یہ دونوں آنٹی کے کمرے میں آئے تو عالیہ اُن کے بیڈ پر بیٹھی تھی اور شاید ان ہی دونوں کے بارے میں بتا رہی تھی۔ انہوں نے ادب سے سلام کیا۔

کاشف کو دیکھ کر وہ مسکرائیں، پھر ذرا پیچھے کھڑے مزید پر نظر ڈالی اور بولیں.....
”بڑے دنوں کے بعد چکر لگایا ہے بیٹا.....؟“

”آئی.....“ سوپا نے ایک دوبار عالی کے گھر میں ملاقات ہوئی تھی۔ میں نے کہا بھی آئی سے ملنا چاہتا ہوں مگر صاف منع کر دیا، کہنے لگی، وہ اجنبی لوگوں سے ملنا پسند نہیں کرتیں۔ بس اسی وجہ سے آنے کی منت نہیں پڑی۔“

”لوگوں میں بھی بڑا فرق ہوتا ہے اور میں یہ فرق پہچان جاتی ہوں، تم یقیناً بہت اچھے لڑکے ہو، تمہاری آمد پر خوش ہوتی ہے۔“

دل کو جھٹکا لگا تھا، یہ صورت یہ قربت.....“ ارے ناصر سے کس قدر مشابہت رکھتا ہے یہ لڑکا۔ وہ ہنسی تھی، پھر سنبھلی۔

”مما..... یہ عمر ہے..... میرا دوست.....“ مزید نے تعارف کرایا۔
”عمر.....“ اُسے یہ نام اجنبی لگا۔ دل نے کہا اس کا نام طلال ہونا چاہئے تھا۔
”تم عمر ہو بیٹا.....؟“ اُس نے کہا ہوں کو دبا کر عمر سے تصدیق چاہی، اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔

مگر جویریہ کی کی آس ابھی باقی تھی۔

”مما، اچھا ہے ناں میرا دوست.....؟“ مزید بڑے لاڈ سے پوچھ رہا تھا۔
”ارے بیٹا..... صرف اچھا..... یہ تو بہت اچھا ہے۔“ جویریہ اپنی کیفیت پر بہت کوشش کے باوجود پوری طرح قابو نہیں پاسکتی تھی۔ مزید نے یہی اندازہ لگا تھا کہ شاید ماں کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے جبکہ عمر سمجھ نہیں سکا..... کہ خود اپنی جو حالت تھی، وہ سمجھ سے بالاتر تھی۔ نظر بار بار جویریہ کی طرف اٹھ جاتی تھی۔
”میں کب سے تمہاری آمد کا سن رہی تھی، اتنی دیر کیوں کر دی بیٹا یہاں آنے میں.....“
”مما..... میں تو اسے کہتا تھا مگر یہ مانتا نہیں تھا، بالآخر رہا ہے مجھے، اصل میں اس کا خیال تھا میرے گھر والے پتا نہیں ملنا پسند بھی کریں گے یا نہیں.....“

”کہاں رہتے ہو بیٹا.....؟“ تیزی سے دھڑکتے اور ایک ہی دُعا مانگتے دل کے ساتھ اُس نے پوچھا۔

جواب میں عمر نے جھجک کر محلہ بتا دیا۔

”اور بہن بھائی بھی ہیں بیٹا.....؟“ جویریہ کے لب خشک ہو رہے تھے۔

”جی..... ایک بڑی بہن ہے راجہ..... میرے والد کا انتقال ہو چکا ہے، میری والدہ بہن اور میں..... بس ہم تینوں ہی ہیں۔“

”بڑی بہن.....“ اُس کا محل دھڑام سے گر گیا..... اسے یاد تھا، نگینہ نے بتایا تھا، بیوہ عورت ہے، ایک

ہی بیٹا تھا جو مر چکا تھا اور عمر بتا رہا تھا کہ بہن مجھ سے بڑی ہے وہ میرے طلال..... میرے لال! تمہاری تلاش نے مجھے دیوانہ بنا دیا ہے۔ مزید کے دوست میں ناصر کی مشابہت..... یہ کوئی انوکھی بات تو نہیں، اکثر

لوگ جن کا آپس میں کوئی رشتہ نہیں ہوتا، پھر بھی چال ڈھال، شکل و صورت میں حیرت انگیز طور پر ملتے ہیں۔ یہ جان کر بھی وہ اُس کا طلال نہیں ہے، جویریہ کی بیاسی نگاہ بار بار بڑے پیار سے عمر کی جانب اٹھتی

رہی، وہ اس سے چھوٹی چھوٹی بہت سی باتیں کرتی رہی حالانکہ اتنا بولنے کی وہ عادی نہیں تھی..... زیادہ تر خاموش رہتی تھی، آج اسے اتنی باتیں کرتے دیکھ کر مزید کو حیرت کے ساتھ ساتھ خوشی بھی ہو رہی تھی۔

عمر بھی بہت اپنائیت سے باتیں کر رہا تھا۔ مزید خاموش ہی رہا اور ان دونوں کی باتیں توجہ اور دلچسپی سے سنتا رہا۔ ایک دوبار جویریہ نے ٹوکا بھی مگر یہی کہا..... ”آپ دونوں کی باتیں اچھی لگ رہی ہیں،

بولتے رہنے، میں سن رہا ہوں۔“

”تم اب آتے جاتے رہنا بیٹا، مجھے تمہارا انتظار رہے گا۔“ جب وہ جانے کی اجازت طلب کر رہا تھا تو جویریہ بہت اصرار کے ساتھ کہہ رہی تھیں۔

”ہاں بیٹا، آؤ بیٹھو، میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں۔“
وہ اُن کے بیڈ سے کچھ فاصلے پر دائیں جانب رکھی دو کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا اور سوالیہ انداز میں اُن کی جانب دیکھا۔

”تم پہلے بھی دو مرتبہ یہاں آچکے ہو۔“

”جی ہاں آنٹی، ہماری ملاقات پہلے بھی ہو چکی ہے۔“

”عالیہ تو سوہا کی دوست ہے اور اس کا بھائی کا شف وہ بھی کبھی کبھار بہن کے ساتھ ہی یہاں آتا جاتا ہے مگر بہت کم، عام طور پر عالیہ اکیلی ہی آتی ہے لیکن مزید بیٹا، تمہارا یہاں آنا، تمہاری یہاں دلچسپی، تمہاری اس وضاحت کر دو تو اچھا ہوگا بیٹا۔“

وہ اس سوال کے لئے تیار تو نہیں تھا مگر چونکہ دل صاف تھا تو فوری جواب میں بھی مشکل نہیں ہوئی۔ دیر سے مسکرایا اور اعتماد کے ساتھ بولا۔

”میری جو دلچسپی ہے وہ میں سوہا سے کہہ چکا ہوں آنٹی۔“

”یقیناً سوہا سے کہہ چکے ہو گے مگر میں تم سے پوچھنا چاہ رہی ہوں کیا مجھ سے کہتے گھبراتے ہو۔۔۔۔۔؟“
”نہیں تو آنٹی، گھبراتا وہی ہے جس کے دل و دماغ میں کشش ہو، دل کچھ اور کہتا ہو اور ذہن کچھ اور سوچتا ہو، نیت میں کھوٹ ہو تو بات کرنا مشکل ہوتا ہے، میرا فیصلہ ہے کہ زندگی کا ساتھی سوہا کے علاوہ اور کوئی نہیں ہوگا۔“

”اچھا۔۔۔۔۔ کیا تمہارا آخری فیصلہ ہے۔“ اُن کے لبوں پر استہزاء سے مسکراہٹ اور آنکھوں میں بھی مسخرانہ رنگ تھا۔ مزید کوئی لہجہ محسوس ہوئی۔ اُن کا یہ انداز اچھا نہیں لگا۔

”جب میں کہہ رہا ہوں کہ مخلص ہوں تو پھر آپ مان کیوں نہیں لیتیں۔“ اُس نے الجھ کر کہا۔

”تمہارے والد اور والدہ، وہ کیا کہتے ہیں اس سلسلے میں بیٹا۔۔۔۔۔؟“

اور اب مزید کا سر غیر محسوس انداز میں جھک گیا۔

”وہ مان جائیں گے۔“ اب کے اُس نے نظر ملائے بغیر کہا تھا۔

”مان جائیں گے، اس کا مطلب ہے ابھی وہ اس رشتے کے حق میں نہیں ہیں۔۔۔۔۔؟“

”ایسی بات نہیں ہے آنٹی، میں اپنی والدہ کو اچھی طرح جانتا ہوں، وہ ماں ہی نہیں، میری دوست بھی ہیں، میری بات نہیں ٹال سکتیں۔ انہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“

”تمہاری بات سے تو یہ ظاہر ہو رہا ہے مزید۔۔۔۔۔ کہ تم نے ابھی تک گھر والوں سے اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کی۔“

”میں ان سے بات کر لوں گا۔“ غلطی کا احساس اسے بھی ہوا۔ واقعی اب تک اسے ماں سے تو ضرورت بات کر لینی چاہئے تھی۔

”مجھے تم سے ایسی امید نہیں تھی بیٹا، مجھے تو دعویٰ تھا کہ میں چہرے پہچان لیتی ہوں، کھرے کھوٹے کی بڑی پہچان ہے مجھے، مگر جانے کیسے دھوکا کھا گئی۔۔۔۔۔؟“

”پلیئر آنٹی یوں مت کہیں، آپ نے دھوکا نہیں کھا یا مگر اب میں لفظوں سے یقین نہیں دلاؤں گا۔“
لہذا اس سے بات کرنے کے بعد ہی یہاں آؤں گا۔ تاکہ آپ اور سوہا پوری طرح مطمئن ہو سکیں۔“

”بہت شکریہ آنٹی۔۔۔۔۔“ مزید کو کافی تسلی ہوئی۔۔۔۔۔ اور بے تکلف انداز میں ان کے کہنے سے بڑھ کر ہی کرسی پر بیٹھ گیا۔

”آنٹی۔۔۔۔۔ آپ کی طبیعت کیسی ہے۔۔۔۔۔؟“ عالیہ نے پوچھا۔

”شکر ہے خدا کا اب تو کافی بہتر ہوں۔“

”دوا لیں گی آپ۔۔۔۔۔؟“ سوہانے پوچھا۔

”نہیں ابھی کچھ نہیں، تم پہلے مہمانوں کے لئے چائے بناؤ۔“

”جی۔۔۔۔۔ چائے تو میں بنانے ہی جا رہی تھی۔“ وہ اُنھی اور کا شف کو بھی جاہر آنے کو کہا۔۔۔۔۔ وہ بڑے سننے کے لئے اٹھا تو مزید بھی ساتھ ہو گیا۔ سوہا کا شف سے کہہ رہی تھی۔

”خالی خولی چائے پلانا اچھا نہیں لگتا، آپ قریبی مارکیٹ سے کچھ لے آئیں۔“

”ہاں ہاں، کیوں نہیں، کھانا بھی تو ہم نے ہے۔“ کا شف فوراً تیار ہو گیا۔

”اچھا میں پیسے لے کر آتی ہوں۔“

”رہتے دو، اب اتنا بھی غریب نہیں۔“ وہ اتنا کہہ کر چل پڑا، سوہانے روکا بھی مگر زکام نہیں۔

”چائے بنانا اتنا مشکل تو نہیں۔۔۔۔۔ آپ اندر چل کر بیٹھیں، میں بنالوں گی۔“ وہ مزید سے بڑھ کر رہی تھی۔

”آپ تو تکلف سے کام لے رہی ہیں، ہم کوئی مہمان تھوڑی ہیں۔“ وہ اس کی بات سمجھ کر بھی نہیں سمجھا پیچھے پکڑ میں آ گیا۔

”زبیبو بھائی، آپ کو آنٹی بلارہی ہیں۔“ عالی نے آکر اطلاع دی۔

”اوہ عالم سماج۔۔۔۔۔ دو منٹ بھی بات نہیں کرنے دی۔۔۔۔۔ اور عالیہ لی بی بی تم کس مرض کی دوا ہو۔۔۔۔۔ گھر سے کہہ کر لایا تھا۔۔۔۔۔ آنٹی کو باتوں میں لگائے رکھنا مگر تم سے اتنا سا کام بھی نہیں ہو سکا۔“

”آنٹی، بہت سیریس ہیں، جلدی جائیں آپ۔۔۔۔۔“

”کہیں پٹائی کا پروگرام تو نہیں، اگر ایسا ہے تو کا شف کو آنے دو، پہلے وہ اندر جا کر انہیں غلٹا کرنے کی کوشش کرے گا۔۔۔۔۔ اتنی دیر میں، میں کھڑکی کے راستے اندر جا کر ان کی عنک چھاپ دوں گا۔“

کا شف انہیں غلٹا کرنے میں ناکام بھی رہا تو ابھی بغیر عنک کے پٹائی میں دقت ہوئی بلکہ تین منٹ کے سارے طمانچے ہمارے بچاؤ کے لئے آنے والی سوہا کو ہی پڑ جائیں۔“

”میں بچانے کے لئے ہرگز نہیں آؤں گی۔“ سوہانے شرارت سے شانے اچکا کر انکار کر دیا۔

”تو ٹھیک ہے پھر جب میرے گھر والے تمہاری پٹائی کیا کریں گے تو مجھے مت پکارنا۔“

”تو زبیبو بھائی۔۔۔۔۔ کتنا بولتے ہیں آپ، اب چل بھی چکے، آنٹی انتظار کر رہی ہوں گی۔“

”جار رہا ہوں، تم دونوں اپنی باتوں کے دوران میری چیخوں کا بھی دھیان رکھنا۔ سوہانے تو صاف جواب دے دیا ہے مگر تم فوراً میری مدد کو آنا پیاری بہن۔۔۔۔۔“

”اچھا اچھا۔۔۔۔۔ ٹھیک ہے، آپ جانے والے تو نہیں۔“

مزید جب آنٹی کے کمرے میں آیا تو چہرے پر حد درجے سنجیدگی اور متانت طاری تھی۔

”آپ نے بلایا تھا آنٹی۔۔۔۔۔“

”ہاں بیٹا، ہم سب کے لئے یہی بہتر ہوگا۔“
”خدا حافظ آئی۔“

وہ اٹھ کھڑا ہوا، جواب میں یاسین بیگم نے روکا نہیں، یہ نہیں کہا کہ چائے پنی کر جانا۔ بڑا وقت دیکھا تھا انہوں نے، یہ بھی جانتی تھیں۔ ذرا غلطی تمام عمر کا چھٹاوا بن جاتی ہے۔ عالیہ اور سواچن میں تھیں، مزید نے اتنا ہی کہا کہ میں جا رہا ہوں، جانے کی وجہ پوچھی تو بولا۔
”یہ تم آئی پوچھ لیتا۔“

سواچن پریشان ہوئی اور آوازیں دیتی پیچھے آگئی۔ وہ بھی چلتے چلتے رُک گیا اور مڑ کر اس کی جانب دیکھنے لگا۔

”آپ ایسے کیوں جا رہے ہیں؟ آئی کی کوئی بات بری لگی ہے آپ کو؟“ وہ فکر مری پریشانی اس کے چہرے پر لکھی تھی۔

”ایسی تو کوئی بات نہیں، میں ہرگز ناراض ہو کر نہیں جا رہا، آئی نے آج جو کچھ مجھ سے کہا افسوس ہے کہ انہیں یہ کہنے کی ضرورت ہی کیوں پیش آئی۔ مجھے ان باتوں کا خیال خود سے کیوں نہیں آگیا۔ میں نے ابھی تک تمہارے بارے میں گھر میں بات نہیں کی۔ مگر اب میں اپنی ماسے تمہارے سلسلے میں بات کر کے ہی یہاں آؤں گا اور تم یقین رکھو، بہت جلد آؤں گا۔“

آخری فقرہ اُس نے اُس کی سلی کے لئے مسکرا کر کہا، اُس کا ہاتھ بھی ہاتھوں میں لے کر تھپکا۔

”چائے تو پیتے جائیں، یوں جا رہے ہیں مجھے اچھا نہیں لگ رہا۔“

”اُدھار رہی۔“ وہ ہاتھ چھوڑ کر چل پڑا۔



اردشیر نے پہلے ستارہ کے ہاں بات کی اور ستارہ کے شوہر امین شاہ نے بتایا کہ کبریٰ خاتون اُن کی طرف نہیں ہیں، وہ اپنے چھوٹے بھائی کی طرف گئی ہوئی ہیں۔

”ہم انہیں بڑی ماں بھی کیا سوچے بیٹھی ہیں، حویلی کی کوئی فکر نہیں، وہ کیوں کی بیٹی، اُن کی جگہ ماگن بن کر بیٹھ گئی ہے۔ اگر بڑی ماں حویلی میں ہوتیں تو بھی ایسا نہ ہوتا (دھول بول رہا تھا کہ اسی بڑی ماں پروردہ سوکنیں آچکی تھیں اور تب تو وہ حویلی میں ہی رہا کرتی تھیں)۔“

اس پر اُچھن طاری تھی، وہ جلد از جلد کبریٰ خاتون سے اس سلسلے میں بات کرنا چاہ رہا تھا کہ اُن کے مشورے سے ہی چلنے کا ارادہ تھا۔

”اب کہاں ملوں ان سے، پر انہیں کس شہر گئی ہیں، کتنے روز کے لئے گئی ہیں، یہ بھی ممکن ہے وہ شاہ بی بی (فاطمہ شاہ) کی طرف چلی جائیں۔ اگر ایسا ہو تو وہاں میں ہرگز نہیں جاؤں گا۔“ وہ کمرے میں ادھر سے ادھر ٹہل رہا تھا۔

”کیا مجھے خود حویلی جانا چاہیے۔ وہاں جا کر رنگ ڈھنگ دیکھنے چاہئیں۔ ہاں یہی مناسب ہے مجھے وہاں ضرور جانا چاہئے۔ بابا سائیں کی نئی نویلی دہن کو چتا تو چلے کہ یہ جائیداد اس کے بوڑھے شوہر نہیں بلکہ میری ہے۔“

”جو خواب لے کر وہ اُن کے نکاح میں آنے پر راضی ہوئی ہے۔ وہ میں کبھی پورے نہیں ہوں۔“

اس کا شوہر میرا مقابلہ نہیں کر سکے گا۔ میں اپنے ساتھ زیادتی کرنے والوں کو کبھی معاف نہیں کرتا۔ اُس نے فیصلہ کر لیا وہ کل صبح ہی گاؤں جانے کے لئے نکل کھڑا ہوگا۔

گاؤڑی ڈرائیوے پر آکر رُک گئی۔ چونکدار جمشید شاہ کو نہ صرف پہچانتا تھا بلکہ یہ بھی جانتا تھا کہ وہ اس صاحب کے والد ہیں۔ لہذا جھک کر سلام کرنا لازم تھا۔

شاہ جی اکیلے نہیں تھے، اُن کے بڑی سی چادر میں اپنا وجود چھپائے آنے والی خاتون بھی تھی۔

”وہ تمہارا صاحب تو سو رہا ہوگا۔ اس وقت تک اس کی صبح ہی کہاں ہوتی ہے۔“

بڑے خوشگوار موڈ میں بھئی کے دوران انہوں نے بیٹے کے بارے میں پوچھا تھا۔ جواب میں۔

موجود تمام ملازموں کا ہنستا تو ضروری ہو جاتا تھا۔ اسی بھئی کے دوران سب کے سر اثبات میں ہلے۔

”چلو ٹھیک ہے، سو رہے دو اُسے، جاگے گا تو لیں گے تم فنافٹ ناشتا بنواؤ۔“

وزینت کو ساتھ لئے ڈرائنگ روم میں آگئے۔ اور بولے۔

”ہاں تو یہ ہے جی ہمارے چتر کا گھر، کہنے پسند آیا۔“

”جی بہت اچھا ہے۔“ اُس نے ستائشی نگاہ سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولے سے کہ۔

”کیوں نہ ہو بھئی، بڑا ڈالا اور نازک حراج بیٹا ہے میرا، گاؤں میں آتا، کہتا ہے گرداؤڑی ہے اور لازم ٹھیک سے صفائی بھی نہیں کرتے۔“ بیٹے کے بارے میں بتاتے ہوئے اک فخر آپ بے آپ اُن کے

لہجے میں اُمنڈ آیا۔ پھر کچھ یاد آیا۔ وزینت سے بولے۔

”تم نے تو دیکھا ہوا ہے اردشیر کو، آیا تھا ایک بار گاؤں۔“

”جی۔۔۔۔۔ وہ آئے تو ضرور تھے مگر میں یہ نہیں جانتی تھی کہ وہ کون ہیں، اس لئے پردہ کیا تھا۔“ وہ

”اتوا احترام سے ذکر کر رہی تھی۔“

شاہ جی نے اس کی جانب دیکھا۔ کچھ عجیب سا لگا تھا، ماں ہو کر بیٹے کے لئے ”آئے تھے، گئے تھے“ کا استعمال وہ اردشیر کی ہمعصر ہوگی یا شاید کچھ بڑی ہی رہی ہو تو بھی جمشید شاہ سے تو بہت چھوٹی تھی۔

”چپ سے ہو گئے پھر جیسے لفظوں کو ترتیب دے کر گویا ہوئے۔“

”قدت مجھ پر گیا ہے، میری طرح وہ بھی اپنی عمر سے بڑا دکھائی دیتا ہے، تم سے تو کافی چھوٹا ہوگا۔“

یہ آپ جناب، عزت و احترام سے مت بلانا، تمہارا بیٹا ہوتا ہے وہ۔۔۔۔۔“

وہ بھرپور جوان بیٹا۔۔۔۔۔ وزینت اس رشتے کو قبول کرتے ہوئے ہچکچائی، بے شک اُس نے فوراً پردہ

ٹھیک سے اسے دیکھا نہیں تھا مگر قدت کا اندازہ تو اک ذرا سی نظر میں بھی ہو جاتا ہے۔ اُس نے

شہر کی بات کے جواب میں کچھ نہیں کہا۔

اور شاہ جی منہ زور جوانی والے خوب رو بیٹے کی تعریف کر کے ایک بار پھر گھبرا گئے تھے۔ کیا ضرورت

نہ تھی قد کاٹھ کے بارے میں کہنے کی۔

”شاہ جی، آپ تھک گئے ہوں گے، تھوڑا آرام ہی کر لیتے۔“ وزینت نے ایک اچھی بیوی کی طرح

شوہر کا خیال کر کے یہ بات کہی تھی مگر شاہ جی کو یہ بات گولی کی طرح لگی۔

”میں تھک گیا ہوں، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ تم جانتی نہیں وزینت بیگم میں تو کئی سالوں سے کبھی بیمار نہیں

ہوا۔ چادر اتاریں یونہی بٹھائے رکھو تو بھی کچھ نہیں بگڑے گا میرا، ہاں اردشیر کی طرف سے مجھے فکر رہی ہے،

نازک مزاج ہے، بیمار پڑ جاتا ہے۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ کہہ گئے۔
”جی..... ایک ہی تو بیٹا ہے آپ کا..... خیال تو رہتا ہوگا۔“

”صرف خیال..... زینت بیگم اس میں تو میری جان ہے۔“ باپ کی شفقت نے پھر سراٹھایا۔
گہری محبت کے ساتھ کہنے لگے۔

ملازم ناشتا لے کر آیا تو ساتھ یہ اطلاع بھی تھی کہ صاحب جاگ چکے ہیں اور انہیں آپ لوگوں کے آمد کے بارے میں بتا دیا گیا ہے۔

اور جب یہ دونوں ناشتے سے فارغ ہو چکے تھے۔ وہ شاید کہیں جانے کا ارادہ رکھتا تھا (نار) ڈریس یہی بتا رہا تھا) اور ذرا کی ڈراٹے ہی آیا تھا۔

”السلام علیکم! کب آئے آپ لوگ.....؟“ اس کا انداز سپاٹ تھا۔

”اودہ پتر..... آج تو جلدی آنکھ مل گئی تمہاری، میرا تو خیال تھا بارہ بجے تک انتظار کرنا پڑے گا۔“
شاہ جی کا انداز الفاظ سے کہیں کم پر جوش تھا۔ وہ کچھ جھینپے جھینپے سے اس کے تاثرات جاننے کی کوشش میں دکھائی دے رہے تھے کہ آخر جوان بیٹے کے گہرائی نئی بیوی کے ساتھ آئے تھے۔

اردشیر نے باپ کی طرف دیکھا، بالوں کی سفیدی کو سیاہ کیا گیا تھا۔ مونچھوں کو تاد دینے وہ تن کر کھڑے تھے، اسے ہنسی آگئی۔ اُن کی طرف سے منہ پھیر کر زینت کی طرف دیکھا تو وہ جلدی سے اُٹھ کر کھڑی ہوئی اور ادب سے سلام عرض کیا۔

(آخر بے ناں کمی کی اولاد..... اسے یاد نہیں رہا کہ اب یہ شاہ کی بیوی ہے رشتے میں میرے لئے احترام کی جگہ ہے، کسی ملازمہ کی طرح سلام کیا ہے) اردشیر نے صرف سر کے اشارے سے جواب دینے ہوئے سوچا۔

”تمہاری ماں ملنا چاہتی تھی تم سے، یہی مجھے لے کر آئی ہے۔“ شاہ جی نے اسے زینت کی طرف سے خوش کرنے کو کہا۔

”ماں.....“ اردشیر کا جی چاہا قہقہہ لگا کر ہنس پڑے..... گوٹے کنارے والے سبز جوڑے میں لمبوس مہندی سے سجے ہاتھ، بازو میں چمکتی لال چوڑیاں۔

اس کی ماں کہلاتا ابھی زینت سے بھی ہضم نہیں ہو رہا تھا، جُبو دکھائی دیتی تھی۔

”بڑی مہربانی، بڑا احسان ہے، بہت نوازش ہے۔“ اردشیر سنجیدہ تھا اور ٹانگ پر ٹانگ جا کر بوجھ گیا تھا جبکہ یہ دونوں اس سے ملنے کے لئے کھڑے ہوئے تھے اور اب تک کھڑے تھے۔

شاہ جی نے محسوس کر لیا تھا کہ وہ اس شادی پر ناخوش ہے مگر اس کی ناراضگی کو عارضی خیال کر رہے تھے۔ کچھ دنوں کی بات ہے، پھر ٹھیک ہو جائے گا۔

انگریزی سوٹ میں لمبوس یہ جوان مرد جس کا ہر انداز بیگانوں والا تھا، باپ کے لئے اس کے کمرے کے انداز میں کوئی احترام نہیں تھا، کیا بیٹے ایسے ہوتے ہیں۔ زینت نے سوچا۔

اس نے اردشیر کی طرف نگاہ کی..... اس وقت وہ بھی ادھر ہی دیکھ رہا تھا۔ نظری تو زینت نے فوٹو میں جھک لیں۔

”ممما..... کیا کر رہی ہیں آپ.....؟“ مزید کچن میں کھڑی جویریہ سے پوچھ رہا تھا۔
”تھوڑا سا کام تھا، اب تو بننا چکی ہوں، تم بتاؤ کوئی کام ہے مجھ سے.....“
”نہیں، کام تو کوئی نہیں، بس ایک بات کرنا ہے مجھے آپ سے.....“
”ہاں ہاں، کہو میں سن رہی ہوں۔“
”اوں ہوں..... یہاں نہیں اپنے کمرے میں چل کر آرام سے بیٹھیں اور پھر پوری توجہ سے میری بات سنئے۔“

”اچھا، کوئی اہم مسئلہ ہو گیا ہے کیا.....؟“
”میرے لئے تو اہم ہی ہے، باقی آپ سن کر فیصلہ کیجئے گا۔“ وہ مسکرا دیا۔
”چلو.....“ جویریہ اس کو لے کر آگے بڑھ گئی۔ اپنے کمرے میں آ کر چیئر پر بیٹھ گئی اور اسے بھی بیٹھے کا اشارہ کیا..... اور بولی.....

”تم کہو، میں پوری توجہ سے سن رہی ہوں۔“
وہ سامنے آ بیٹھا..... کچھ دیر خاموش رہا..... نگاہ اٹھا کر جویریہ کی جانب دیکھ کر کچھ کہنے لگا پھر ہنس پڑا۔

”ایسی کیا بات ہو گئی.....؟“ جویریہ مسکراہٹ کے درمیان حیران ہو کر کہہ رہی تھی۔
”میری کچھ میں نہیں آتا کہ بات کہاں سے شروع کروں۔“
”ارے، مجھ سے بھی جھجک رہے ہو، بس اب جلدی سے کہو چکو، زیادہ سسپنس مجھ سے نہیں ہوتا۔“

”وہ اصل میں بات کچھ یوں ہے کہ میری ایک لڑکی سے دوستی ہو گئی ہے۔“ آخر کار تمہید چھوڑ

اُس نے صاف سیدھی بات کر دی۔
”اودہ تو یہ بات ہے..... اب سمجھی.....“ جویریہ نے مسکرا کر زور سے سانس کھینچا پھر اس کی جانب دیکھ کر بولی.....

”وہ دوستی تو تم نے یونہی کہہ دیا، اصل میں کہنا تو یہ تھا کہ محبت ہو گئی ہے، کیوں ٹھیک بدلوں میں جس میں.....؟“

”آپ بہت جینئس ہیں۔“ پہلی بات کرنا ہی مشکل تھا، کہہ چکا تو اعتماد بحال ہو گیا۔

”وہ نہیں ہے جس کی مجھے تلاش ہے تو پھر میں اسے دیکھ کر ایسا کیوں محسوس کرنے لگتی ہوں۔ اس کے لئے نذر ہے تابی کیوں ہے۔ وہ تو کسی اور گھر کا چراغ ہے۔ کسی ماں کے دل کا سکون ہے۔ میں اس کے بچے کیوں جانا چاہ رہی ہوں۔“

”کیا ہوا ماما، آپ کہاں کھو گئی ہیں؟“ جویریہ کا ایک دم سے چپ ہو جانا اور یہاں موجود ہونے کے باوجود ذہنی طور پر غائب لگتا، حزیب کو حیران کر رہا تھا۔

”کچھ نہیں، کچھ بھی تو نہیں ہوا مجھے، تم بتاؤ کیا بات کر رہے تھے ابھی، شاید عمر کسمحلق کچھ کہا تھا۔“

”وہ اس کی آمد سے خوفزدہ تھی، اس کے خیال سے پیچھا چھڑانا چاہتی تھی مگر بار بار اس کا ذکر سننے کی بھی خواہش نہ تھی۔“

عمر کی طرف تو میں کتنے دنوں سے جا ہی نہیں سکا۔ کاشف کی کمی بیمار تھیں۔ میں زیادہ تر وقت اُن کے گھر پر رہا۔ کاشف بھی تو آج کل پنڈی گیا ہوا ہے، میں تو آپ سے سو با کا ذکر کر رہا تھا۔“

”آہاں..... تم سوہا ہی کے بارے میں بتا رہے تھے مجھے.....“ وہ سنبھل گئی۔

حزیب ذرا کی ذرا چپ ہوا پھر دھم سے بولا.....

”وہ بہت اچھی لڑکی ہے..... ہر لحاظ سے اچھی ہے لیکن ماما، ایک بات ہے اور مجھے خدشہ ہے کہ پاپا شاید اس رشتے کے لئے آسانی سے راضی نہ ہو سکیں۔“

”ایسی کیا بات ہے؟“

”اصل میں ماما..... وہ گلوکارہ یا سیمین بیگم کی بھانجی ہے، وہ بہت چھوٹی تھی جب اس کے والدین کی زندگی ختم ہو گئی تھی۔ اسے آٹنی یا سیمین نے ہی اپنے پاس رکھا ہوا ہے..... اور پرورش کی ہے۔ ان کے علاوہ سوہا کا اس دنیا میں کوئی اور نہیں۔“

”گلوکارہ کی بھانجی.....“ جویریہ نے آنکھوں میں حیرت اور لہجے میں بے یقینی لئے دہرایا تھا۔

”پلیز ماما..... آپ تو اسے مت کہیں، وہ بہت اچھی لڑکی ہے..... اور یا سیمین انہی بھی بہت اچھی ہیں۔ اب تو وہ گلوکاری ترک کر چکی ہیں۔ انہیں دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کبھی ان کا تعلق شو بزم سے بھی رہا ہوگا۔ سادہ طبیعت کی مالک ہیں اور بہت محبت کرنے والی خاتون ہیں۔“

”وہ تو ٹھیک ہے مگر تم خود سوچو، کیا تمہارے پاپا مان جائیں گے؟“

”پاپا کی بات تو بعد میں آتی ہے، میں تو یہ دیکھ رہا ہوں کہ آپ کو بھی میری بات اچھی نہیں لگی۔“

”ہاں..... سچ کہہ رہے ہو..... دیکھو ناں بیٹے، شادی گڈے لڑیا کا کھیل نہیں ہے، یہ عمر بھر کا ساتھ دینا ہے، نوجوانی میں انسان جذبات کے دھارے میں بہہ کر ایسا بہت کچھ کر گزرتا ہے۔ جس پر بعد میں پچھتانا پڑتا ہے، ہم جوتہارے بڑے ہیں، تمہیں سمجھانا، غلط اور صحیح کی پہچان کروانا ہمارا فرض بنتا ہے کہ تمہیں دکھ میں دیکھنے کا تصور بھی ہمارے لئے محال ہے۔“

”ماما..... آپ کی محبت اپنی جگہ مگر آپ ایک بار سوہا سے مل تو لیجئے، مجھے پورا یقین ہے، پھر آپ کو میرا ساتھ دیتے ہوئے ہنسی پھٹ نہیں ہوگی۔“

”اوکے..... تم کسی روز اسے یہاں لے آؤ..... میں بھی اس لڑکی کو دیکھنا چاہ رہی ہوں۔“



”جینٹس کے کچھ لگتے، یہ تو بتاؤ وہ ہے کون.....؟“ جویریہ بھرپور دلچسپی لے رہی تھی۔

”ایک لڑکی ہے۔“ اس نے مزے سے کہا۔

”ہاں، یہ تو تم بتا ہی چکے ہو کہ لڑکی ہے، میرا مطلب تھا، کیا نام ہے اس کا.....؟ کہاں؟“

”تر سے ملاقات کب اور کیسے ہوئی.....؟“

”ملاقات تو بہت پرانی ہے، اسکول ایک ہی تھا ہمارا، وہ مجھ سے جونیئر تھی، پھر بھی ملاقات ہوئی۔ اصل میں وہ میری ایک دوست کی دوست تھی۔ اس سے ملنے اکثر ہماری کلاس میں آیا کرتی تھی، مزے کی بات ہے کہ اب بھی وہ کاشف کی بہن عالیہ کی فرینڈ ہے اور اُن کے گھر خاصا آتا جاتا ہے اس کا۔“

”ہوں..... تو اب کبھی کہ کاشف کے گھر کے اتنے چکر کیوں لگائے جاتے ہیں۔ کب سے یہ سلسلہ.....؟“

”ہو گیا ہے کچھ عرصہ.....؟“

”اور مجھے اب بتا رہے ہو، پھر کہتے ہو ماما، دونوں دوست ہیں۔“ جویریہ نے مصنوعی غصہ دکھایا۔

”بہن پڑا، پھر سر جھٹک کر بولا.....

”اوہو..... بھلا کیسے بتاتا، آپ دیکھ تو رہی ہیں، کس قدر شرمیلا ہوں، کتنی مشکل سے بات کی ہے میں نے.....“

”آپ کس قدر شرمیلے ہیں، یہ تو میں خوب جانتی ہوں اور ہاں نام تو تم نے اب بھی نہیں بتایا۔“

”بتانے ہی والا تھا، آپ نے درمیان میں ناراضگی دکھانا شروع کر دی۔ سوہا نام ہے اس کا۔“

”بہت پیارا نام ہے، خود بھی یقیناً بہت پیاری ہوگی، مجھے کب ملو رہے ہو اس سے.....؟“

”مغربیہ اسے آپ سے ملوانے کے لئے گھر لے کے آؤں گا، تیار تیار ہو کر رہا کریں میری ماں کا اپریشن بہت اچھا سا ہونا چاہئے۔ جیسے اس روز آپ بہت اچھی لگ رہی تھیں اور میں نے محسوس کیا تھا، آپ خود بھی بہت تھیں۔“

”اُسے عمر کا اپنے ہاں آنا اور ماں سے عمر کی ملاقات یاد آگئی تھی۔“

”کسی روز.....؟“ وہ سمجھی نہیں۔

”اُسی روز..... جب میں عمر کو لے کر آیا تھا..... وہ تو یہاں آتے ہوئے بہت گھبرا رہا تھا، اس کا خیال تھا، میری ماں ایک روایتی موٹی سی تک چڑھی بیگم ہوگی مگر آپ کو دیکھ کر تو حیران ہی رہ گیا ہوگا۔“

عمر کے ذکر پر جویریہ کے سینے میں ہوک انٹھی..... کاش وہ میرا اطلاع ہوتا..... اگر یہ ممکن نہیں تو پھر وہ یہاں آیا ہی نہ ہوتا..... عمر تو اسے بھولتا ہی نہیں تھا۔ کتنی بار خود کو سمجھایا..... وہ اگر قد بُت میں باصرہ کی طرح ہے تو کیا ہوا، اس دنیا میں سے ایسے لوگ ہیں، جن کا آپس میں کوئی رشتہ نہیں ہوتا مگر پھر بھی وہ حیرت انگیز حد تک مماثلت رکھتے ہیں۔

مگر پھر بھی دل نہیں مانتا تھا، بار بار اس سے ملنے کی تمنا جاگ اٹھتی، جویریہ پریشان ہو جاتی۔“

سوچتی، ابھی تو ایک بار ملاقات ہوئی ہے اور میرا یہ حال ہے، اگر وہ بار بار یہاں آیا تو ٹھیک نہیں۔ جب

”ہیلے اُن سے بات تو کر لیں، ممکن ہے وہ نہ مانیں۔“
 ”ارے بابا، بڑی غلط سوچ رکھتی ہو میری ماں کے بارے میں، یقین رکھو، وہ ضرور آئیں گی۔ تم

نہا تم بتاؤ۔“
 ”جب جی چاہے آجائے گا شام کو میں گھر ہی میں ہوتی ہوں۔“

”انتظار کرنا، ہم بہت جلد آئیں گے۔“
 ”ہم سے کیا مطلب ہے، کیا سارا محلہ جانچنے آئے گا۔۔۔؟“ اب وہ مسکرائی اور شرارت سے

”اُوں ہوں۔۔۔۔۔ بس میں اور میری ماں۔۔۔۔۔ اور یہ جانچنے والی کیا بات ہوئی، مغرور حسینہ جسے گھر کا
 رہنا ہوتا ہے، اس کو ملنا، ایک نظر دیکھ لینا کوئی غلط تو نہیں ہے۔“
 ”ہاں تو ٹھیک ہے، میں کب کہہ رہی ہوں، غلط ہے۔“ وہ مسکرا دی۔

● ● ●
 شیریں کے ہاں بیٹا پیدا ہوا تھا۔ کبریٰ بیٹی کو لے کر آج صبح ہی شہر کے ہسپتال سے واپس گاؤں چلی
 گئیں۔

”بی بی صاحب! چھوٹے شاہ جی آئے ہیں، میں نے بیٹھک میں بٹھا دیا ہے جی انہیں، بلار ہے
 فٹ آپ کو۔۔۔۔۔“ ملازمہ بتا رہی تھی۔
 ”کون چھوٹے شاہ جی۔۔۔۔۔؟“ وہ سمجھی نہیں کہ ارد شیر کی آمد کا گمان جو نہ تھا۔

”آپ کے بیٹے بی بی۔۔۔۔۔“
 ”اوہ اچھا۔۔۔۔۔ ارد شیر آیا ہے۔۔۔۔۔ ٹھیک ہے تم جاؤ میں مل لیتی ہوں۔“

وہ سوچ رہی تھیں، وہ اچانک یہاں کیسے چلا آیا۔ ممکن ہے شیریں کے ہاں بیٹے کی ولادت کی
 اطلاع ملی ہو اور مبارکباد دینے چلا آیا ہو۔ خوش بھی سر اٹھارہی تھی۔

وہ جب بیٹھک میں آئیں تو ارد شیر صوفے پر پھیل کر بیٹھا تھا۔ ایک بازو بیک پر رکھا تھا اور
 دروازے کی سمت ہی نگاہ تھی۔ انہیں آتے دیکھ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔۔۔۔۔ اور سلام کیا۔

”کیسے ہو ارد شیر۔۔۔۔۔؟“ وہ مسکرا کر پوچھ رہی تھیں۔
 ”یاد ہے بڑی اماں، کتنا عرصہ ہو گیا ہے آپ کو اپنی حویلی سے آئے ہوئے اور آپ نے پلٹ کر خبر

منگوائی۔“
 ”یاد ہے بالکل یاد ہے مگر مصروف رہی ہوں۔ شیریں کے ہاں بیٹا ہوا ہے ناں۔“

”ہوں۔۔۔۔۔ پتا ہے مجھے، آپ کو پوچھتا رہا ہوں، فون کرتا رہتا تھا۔ ملازمہ نے بتایا کہ آپ شیریں
 کے ساتھ شہر گئی ہوئی تھیں، کون سے شہر یہ اُسے پتا نہیں تھا۔ ویسے اب اور کب تک یہاں رہنے کا ارادہ

ہے۔“
 ”کتنا سرسری لیا تھا اُس نے، رسی طور پر بھی مبارکباد نہیں دی۔ کبریٰ کے لیوں کی مسکراہٹ کا فور

نہ۔۔۔۔۔ وہ چٹکیں نہیں کھڑے کھڑے ہی بولیں۔۔۔۔۔
 ”تم کہو، کیسے آتا ہوا۔۔۔۔۔؟“

اس شام مزید سوہا سے ملا اور اسے بتایا کہ میری امی تم سے ملنا چاہ رہی ہیں۔“
 ”اچھا تم نے میرا ذکر کر رہی دیا اُن سے۔۔۔۔۔“

”ہاں، وہ تو کرتا ہی تھا، میں تم سے کوئی کھیل تو نہیں کھیل رہا سوہا۔“
 ”انہیں اچھا تو نہیں لگا ہوگا۔۔۔۔۔“ سوہا کا انداز درست تھا مگر مزید اس بات کا جواب اثبات پر
 دے کر سے افسردہ نہیں دیکھ سکتا تھا۔
 ”بھئی ایسے وہ کوئی فیصلہ نہیں دے سکتیں، تم سے ملنے کے بعد ہی مجھے اپنی رائے سے آگاہ کریں

گی۔۔۔۔۔“
 ”اور اگر ان کی رائے میرے حق میں نہیں ہوئی تو پھر کیا کرو گے۔۔۔۔۔؟“

”یہ ممکن ہی نہیں۔۔۔۔۔ میری اور میری ماں کی پسند الگ نہیں ہو سکتی اور پھر انہیں میری خوشی ہر حال
 میں عزیز ہوگی۔۔۔۔۔ تم ایسا تو کوئی خیال دل میں لاؤ بھی نہیں۔ وہ تو بس تم سے ملنا چاہ رہی ہیں، دیکھنا چاہتی
 ہیں، کون ہے وہ لڑکی جو ان کے بیٹے کے حواس پر چھا گئی ہے۔ اب اسے سوہا کے سوا کچھ سوچتا ہی نہیں۔“
 ”تم نے یہ تو بتا دیا ہے ناں کہ میں گلوکارہ یا مین کی بھانجی ہوں۔۔۔۔۔؟“ سوہا اپنے خدشات میں

گہری ہوئی تھی۔
 ”اوہو بابا، سب بتا دیا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ اگر خود تم گلوکارہ ہو تیں تب بھی مجھے کوئی اعتراض نہیں
 ہوتا کہ میں تمہاری آنکھ سے جھانکتی پا کبزار عورت کو بخوبی دیکھ سکتا ہوں۔۔۔۔۔ اور آنکھ تو باطن کا عکس ہوتی

ہے۔“
 اُس کی بات سن کر سوہا نے سر جھکا لیا اور کچھ سوچنے لگی، مزید کچھ دیر منتظر رہا پھر بولا۔۔۔۔۔
 ”کہاں کھو گئی ہو۔۔۔۔۔؟“

اُس نے سر اٹھایا اور گہری سنجیدگی کے ساتھ مگر ڈک ڈک کر بولی۔۔۔۔۔
 ”برا نہیں مانتا مزید، میں تمہارے ساتھ تمہارے گھر نہیں جاؤں گی۔“

”اچھا تو پھر کیا اکیلی آؤ گی۔۔۔۔۔؟“ وہ مصنوعی حیرت اور ناراضگی سے پوچھ رہا تھا۔
 ”نہیں۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے میں تمہارے گھر نہیں آؤں گی۔“

”کیا یہ بتانا پسند کریں گی کہ یہ فیصلہ کس بنیاد پر کیا گیا ہے۔۔۔۔۔؟“ وہ ٹھنکا تو تھا مگر بظاہر مطمئن تھا۔
 ”اس لئے کہ لڑکی خود بھی یوں نہیں جایا کرتی، بیٹے کے لئے خواہش مند خود چل کر لڑکی کے گھر آ

کرتے ہیں۔“
 ”اوہ۔۔۔۔۔ تو یوں کہو ناں، میری ماں کی جوتیاں گھسانے کا پروگرام بنائے بیٹھی ہو۔ شادی ابھی ہوئی

نہیں، ساس، بہو والی دشمنی شروع ہو گئی۔۔۔۔۔ میں تو مارا جاؤں گا اس جھگڑے میں۔۔۔۔۔“
 ”اچھا، اب یوں منہ منہ بتائیں، میں نے کوئی غلط بات تو نہیں کی۔ اگر ایسا چاہا ہے تو یہ میرا حق

ہے۔ مجھے تمہارے ساتھ تمہارے گھر جا کر خود کو ان کے سامنے پیش کرنا اچھا نہیں لگتا۔ سوری میں ایسا نہیں
 کر سکتی گی۔“

”ٹھیک ہے جی آپ کا فیصلہ سنا دیں گے انہیں اور لے آئیں گے آپ کے دولت خانے پر، اب یہ
 بھرتا دو کب آئیں گے۔۔۔۔۔؟“

”آپ کو پتا تو ہوگا کہ بابا جان نے شادی کر لی ہے۔“ اسے اندازہ تھا۔ وہ اتنی لاپرواہ
 سکتیں..... یقیناً جانتی ہوں گی اور یہ اندازہ درست ثابت ہوا۔ وہ کہہ رہی تھیں۔
 ”ہاں مجھے علم ہے، انہوں نے منشی غلام علی کی بیٹی سے نکاح پڑھوا لیا ہے اور اس کا نام زینہ
 ہے۔“

”اچھا تو سب جانتی ہیں، حیرت ہے پھر بھی اتنے اطمینان کے ساتھ ادھر بیٹھتی ہیں۔ بڑی دلیرانہ مجھے بھی تو سمجھائیں، اس میں کیا مصلحت ہے.....؟ وہ عورت سارے گھر پر قابض ہو چکی ہے اور مجھے دبا دبا کر رہا ہے، بابا جان کے حواس پر بھی چھائی ہوئی ہے کہ آخر جوان عورت ہے اور بابا کو اپنے بارے میں چاہیے تو خوش نہیں ہے جو شادی رچا بیٹھے.....؟“

اس کا انداز دیکھ کر کبرٹی چوکیں، وہ زینت کی باتیں کرتا رہا، ایسی صورت ہے، اتنی عمر ہے اور یہ

وغیرہ۔

اور اُن کے ذہن میں بڑی تیزی سے ایک منصوبہ بننے لگا۔ پہلے جو وہ بیزار کھڑی تھیں، اب 'بیٹھ گئی تھیں'..... اور چہرے پر مسکراہٹ کھینے لگی تھی۔

”تم کیا چاہتے ہو اور میری؟“

انہیں لگ رہا تھا، منزل بہت قریب آچکی ہے۔ جو کچھ انہوں نے چاہا تھا۔ اردو شیر کی پیداوار پر
 طرح انہوں نے اپنے جذبات چھپا کر ایک پلان ترتیب دیا تھا اور پھر دن رات اُس کے لئے کام کیا۔
 میں کیا ہے، کبھی کسی پر عیاں نہیں ہونے دیا۔

ایک ہی خواہش تھی اور وہ اس پلان کی تکمیل چاہتی تھیں۔ مگر یہ اتنی جلدی ممکن نہ تھا آہستہ آہستہ اُس کی طرف ارد شیر کے بڑے قدم گمراہ ایک دم سے وہ ہو جائے گا جو انہوں نے چاہا تھا، خود گمراہ کے بدن میں سوچ کر ہی سنسنی سی دوڑ گئی تھی۔

”میں یہی بات آپ سے پوچھنے آیا ہوں بڑی ماں کہ اب مجھے کیا کرنا چاہئے۔ میں اس بات سے خوش کیسے ہو سکتا ہوں..... اور میں تو اس کا اظہار بھی کر دیتا مگر میرے گاؤں جانے سے پہلے بابا جان آپ روزِ مئی صبح اُسے ساتھ لے کر شہر میں میرے گھر پر آ گئے۔ اب گھر آئے مہمانوں سے کیا کہتا رہے؟ میں نے سوچا پہلے آپ سے مل لیا جائے۔ پھر ہی کوئی قدم اٹھانا بہتر ہوگا۔“

”ہاں، یہ تم نے بہت اچھا کیا، جو ان ہو، مگر خون ہے تمہارا، یونہی کوئی ایسی بات کر جاتے جو
کے حالات میں غلط ثابت ہوتی تو سوائے افسوس کے تمہارے پاس کچھ نہ رہتا۔ ہاں تم بتا رہے تھے.....“
”نئی تھی تمہارے پاس.....“

”ہاں، بابا بڑے خوش تھے اور وہ ابھی تو بڑے اخلاق دکھا ہی تھی مجھے مگر کب تک جلدی کرنے کے لئے نکال لے گی۔ آخر ایک بوڑھے سے بیاہ کچھ سوچ کر ہی تو رہ جاپا ہو گا اُس نے.....“

”اور تمہارے بابا، اُن کا رویہ کیسا تھا تمہارے ساتھ.....؟“

”اچھا تھا، ویسے میرے سامنے جھینپ رہے تھے جو بات ابھیں پہلے سوچنا چاہئے تھی۔ اس بات میں میرے سامنے آکر آیا تھا۔“ پھر خود کلامی کے انداز میں بولا..... ”عورت کے بغیر وہ نہیں ہے۔“
بھی بیوی کا جھنجھٹ پالنے کی کیا ضرورت تھی۔ ایک ایک کو دیکھ لیا گا، ابھی یہ مجھے جانے نہیں۔“

”مجھے یقین ہے ارد شیر، مجھے پورا یقین ہے تم وہی ہو تم نہیں بدل سکتے تم کل بھی میری بات مانتے تھے اور آج بھی مانو گے۔“

چائے پیٹے ہی وہ جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔

”واپسی پر ہوتے ہوئے جاؤ گے؟“

”نہیں بڑی ماں یوں تو بہت دیر ہو جائے گی۔ اب جب اگلی مرتبہ آؤں گا تو ادھر کا بھی چکر لگاتا ہوں گا۔“

”چلو یہ ٹھیک ہے۔“ انہوں نے اتفاق کیا۔

ارد شیر بڑی حویلی آیا۔ پہلے تو خیال آیا کہ اندر جانے سے پہلے اپنے یہاں آنے کی اطلاع بھیج دے مگر پھر سوچا، یہ میرا اپنا گھر ہے مجھے بھلا اجازت لے کر جانے یا زنا خانے میں اطلاع بھیجوانے کی کیا ضرورت ہے۔ گاڑی باہر کے احاطے میں کھڑی کی اور چھوٹا بچا تک کر اس کے اندر چلا آیا۔

وہ خاصا آگے تک آگیا مگر ہر سو خاموشی محسوس ہوئی۔ برآمدے تک وہ بونہی آگیا۔ نہ تو کسی ملازمہ نے سلام کیا اور نہ ہی کوئی اسے دیکھ کر گھبراہٹ کے عالم میں باتوں کو اطلاع دینے کے لئے دوڑی۔ ہاں برآمدے میں آتے ہی اُس نے زینت کو دیکھ لیا۔ وہ کرسی پر ایک شان سے بیٹھی تھی، فرش پر دو ملازماں میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ایک پر اندہ بنا رہی تھی۔ دوسری کے ہاتھ میں کڑھائی کا فریم تھا دونوں کی نظر اس پر نہیں پڑی، البتہ زینت نے اسے دیکھ لیا۔

”آپ.....“ وہ نگاہ پڑتے ہی اضطرابی انداز میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ ملازماں چوکیں اسے دیکھا تو کام کرتے ہاتھ رک گئے۔ مودب ہو کر سلام پیش کیا اور پھر توجہ سے اسے دیکھنے لگیں کہ دیکھیں سوتیلی ماں کے ساتھ خود دوسر چھوٹے شاہ جی، کیا رویہ اختیار کرتے ہیں۔

”تم لوگ میرا منہ کیا دیکھ رہی ہو، چلو جاؤں یہاں سے.....“

اُس نے اُن دونوں کو ڈانٹا..... وہ گئی نہیں، اس کی جانب دیکھنا چھوڑ کر پھر کام میں لگ گئیں کہ آئندہ حالات انہیں خاصے دلچسپ محسوس ہو رہے تھے، وہ یہ منظر دیکھنے سے محروم ہونا نہیں چاہتی تھیں۔

”سنا نہیں تم دونوں نے، میں کہہ رہا ہوں، جاؤ مرد یہاں سے.....“ اب کے چھوٹے شاہ جی کا انداز کاٹ کھانے والا تھا سو انہیں اٹھنا پڑا۔

اُن کے جانے کے بعد اُس نے زینت کی جانب توجہ کی اور گہری سنجیدگی کے ساتھ بولا.....

”گلتا ہے میرا حویلی آنا کچھ پسند نہیں آیا بیگم جمشید شاہ کو، ہے ناں.....؟“

”نہیں نہیں، مجھے بھلا کیوں برا لگنے لگا، آپ کا اپنا گھر ہے آپ جب چاہیں یہاں آئیں۔“

زینت کا انداز بے حد صلیح ہو تھا۔

ارد شیر تو اسے دیکھتے ہی بڑی ماں کی نصیحت بھول گیا تھا جو غصہ دل میں زینت کے لئے تھا۔ وہ زبان پر بھی آگیا۔ زینت نے بیٹنے کو کہا مگر وہ یہاں رکا نہیں، اپنے کمرے میں آگیا، یہ دیکھنے کہ وہ اب کئی دیر سے بائیں بیگم نے اپنی مرضی سے کچھ تبدیلی کی کوشش کی ہے۔

مگر وہ ویسا ہی تھا البتہ صفائی اچھی طرح کروانے کی وجہ سے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ وہ آکر بید پر بیٹھا

اپنے انداز سے انہیں یہ احساس دلاتے رہنا کہ تم ان کی اس شادی پر خوش نہیں ہو مگر دیکھو، بڑے میں مت اٹھنا اور ان سے جھگڑا بالکل نہ کرنا۔ ایک بات اور..... اور یہ بات بے حد ضروری ہے، تم زینت کے ساتھ اپنے رویے کو دوستانہ رکھو تا کہ تمہیں یہ علم ہو سکے کہ وہ کس قسم کی عورت ہے اور کن عزائم کے فائدہ اُس نے شاہ جی کے ساتھ نکاح قبول کیا ہے.....؟“

”اُس سے دوستی.....؟“ ارد شیر نے اختلاف کرنا چاہا۔

انہوں نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش کر دیا اور بولیں.....

”جذباتی مت بنو، جو میں کہہ رہی ہوں، غور سے سنو اور اس پر عمل بھی کرو۔ اگر تم زینت سے دوستانہ رویہ رکھو گے تو وہ تمہارے باپ کو تمہارے خلاف بھڑکائے گی نہیں، دوسری صورت میں وہ اُن کے کان تمہارے خلاف بھرنے لگے گی..... اور نقصان تمہیں ہی اٹھانا پڑے گا۔

بس تم کچھ اور مت سوچو، فوراً گاؤں آنا جانا شروع کر دو۔ جب بھی آؤ شاہ جی سے بڑی رقم ہائے اور..... زینت سے ہمیشہ اچھی طرح پیش آؤ، اسے کبھی یہ احساس نہ ہونے دو کہ تم اسے اپنے باپ کی بیوی کے طور پر قبول نہیں کرتے۔“

”ٹھیک ہے بڑی ماں، جیسا آپ نے کہا ہے، میں ویسا ہی کروں گا اور سچ تو یہ ہے کہ مجھے پتا تھا، آپ سے بہتر مشورہ مجھے اور کوئی نہیں دے سکتا۔ اب بس جلدی سے چائے پلوائیں، مجھے بابا سے ملے گاؤں جانا ہے۔“

”ہاں ہاں، کیوں نہیں، اتنی دیر بعد تو تم آئے ہو، لاال میں تو تمہاری صورت دیکھنے کو ترستی ہی رہتی ہوں۔“ آج پھر وہ بہت سال پہلے والی کبریٰ کے رُوپ میں آئی تھیں۔ ارد شیر سے پیار جتانے والی اس کے صدقے واری ہونے والی۔

”بڑی ماں، اب تو آتا جا تا رہوں گا کہ بابا سے ملنے ان کے گاؤں جو آتا ہوگا اور آپ میرے پاس شہر کیوں نہیں آئیں، وہاں آئیں میرے پاس رہیں، ہم اکٹھے کھانا کھایا کریں گے..... اور بہت سی باتیں بھی کریں گے۔“

”اتنا وقت کہاں ہوگا جو ان بیٹے کے پاس کہ بوڑھی ماں کے ساتھ کھانا کھائے اور اُس سے باتیں بھی کرے۔“

”ارے ماں، آپ کے لئے تو وقت ہی وقت ہے۔“ وہ اٹھ کر اُن کے قریب آگیا۔ پہلے شانوں پر ہاتھ رکھے پھر مسکرا کر گلے لگالیا۔

”اتنے عرصے تک بڑی ماں یا نہیں آئی، اب آئے ہو تو پیار جتانے لگے ہو، مجھے تو سب دکھاؤ کی محبت لگتی ہے۔“ وہ ہنس کر کہہ رہی تھیں۔

ارد شیر سنجیدہ ہو گیا اور بولا..... ”یوں مت کہیں بڑی ماں، میں نے محبت کی ہے تو صرف آپ سے..... آپ میرے لئے کیا ہیں، میں بتا نہیں سکتا۔ بڑی ماں، آپ ہی وہ ہستی ہیں جس کے سامنے اپنا دل کھول سکتا ہو، رونا چاہوں تو رو بھی لوں اور جو کبھی بے اندازہ خوشی ملے تو دیوانوں کی طرح رقص بھی کر لوں آپ کے لئے میں وہی ارد شیر ہوں جو بچپن میں تھا، آپ سے کوئی پردہ نہیں ہے۔“

وہ اُس کا چہرہ تھپک کر بولیں.....

”آپ کا اپنا گھر ہے مرضی کے مالک ہیں، میں نے بھلا کیا کہنا ہے۔“
”ہوں تو ابھی محترمہ کے دماغ پر ملکیت کا کیزا نہیں کاٹا۔“ اردو شیر نے سوچا اور اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ وہ کچھ دیر منتظر رہی پھر چلی گئی۔

”یہی گھر ہے سوہا کا.....“ مزید، جو یہ کہنے لگے آیا تھا اور بتا رہا تھا۔ سارے راستے وہ ادھر ادھر کی جگہں کرتا آیا تھا مگر کوشش کے باوجود جو یہ کام مؤثر نہ کر سکا تھا۔ اس نے سوچا کہ ماں بالکل خوش نہیں ہے۔

اردوہ واقعی خوش نہیں تھی۔ مزید اس کا سگ بٹانا سہی مگر اُس نے تو ہمیشہ اپنا بیٹا ہی سمجھا تھا اور بیٹے کے لئے کسی ایسی ویسی لڑکی کے لئے ہاں کہہ کر اس کا دل بھلا کیسے مطمئن ہو سکتا تھا۔ اُس نے مزید سے کہا تھا.....

”مجھے تم سے ایسی توقع ہرگز نہیں تھی..... اتنے سمجھدار ہو کر بھی تم اسے معاملے میں نا سمجھی کا ثبوت دے رہے ہو۔ پسند کی شادی کرنے میں کوئی برائی نہیں مگر عقل کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے تو بہتر ہوتا۔“

مزید اس بات کے جواب میں ہنس پڑا تھا۔ یقین تھا سوہا سے ملنے کے بعد ماں کی رائے بدل جائے گی۔ سوہا یقیناً انہیں پسند آئے گی۔
دروازہ سوہا نے ہی کھولا..... مزید کے ساتھ ایک سوہا اور نفیس سی خاتون کو دیکھا، سمجھی نہیں کہ یہ مزید کی کون ہو سکتی ہیں۔

”ایسے آنکھیں چھاڑ پھاڑ کر کیا دیکھ رہی ہو، یہ میری ماما ہیں۔“ مزید نے تعارف کرایا۔
اُس نے بوکھلا کر مزید کی طرف دیکھا، پھر جو یہ کہی جانے لگی اور ساتھ ہی سلام کر دیا۔
”ماما، سوہا ہے..... سوہا عتنا.....“ مزید بتا رہا تھا، جو یہ نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔
”آئیے..... اندر آ جائیے۔“ سوہا دونوں سے مخاطب تھی۔ اپنی رہنمائی میں یا سمین بیگم کے کمرے تک لائی اور تعارف کرایا۔ یا سمین بیگم ایک اچھی میزبان کی طرح جو یہ سے ملیں۔

سوہا کچھ دیر یہاں بیٹھی پھر چائے بنانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کی آنٹی ان دونوں سے ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہیں۔ ان دونوں کو باتیں کرتا چھوڑ کر مزید چپکے سے کھسک آیا۔
”اے لڑکی، کیسی لگیں میری والدہ محترمہ.....؟“ چکن کے دروازے پر ہاتھ رکھے، وہ اندر جھانکتے ہوئے اس سے پوچھ رہا تھا۔

”یاد رہے میں انہیں نہیں بلکہ وہ مجھے دیکھنے اور پرکھنے آئی ہیں۔“
”تو تم نے آنکھیں تھوڑی بند کر رکھی ہیں اور یہ پرکھنے والی تو خوب ہی کہی۔“
”بظاہر تو بہت اچھی ہیں۔“ سوہا سچائی سے گویا ہوئی۔
”بظاہر ہی نہیں، وہ واقعی بہت اچھی ہیں، یہ مت سمجھنا کہ میں بیٹا ہونے کے ناتے تعریف کر رہا ہوں..... انہیں تو سب ہی پسند کرتے ہیں۔ مجھے تو پورا یقین ہے، مثالی ساس ثابت ہوں گی۔“
”اچھا..... تم یہاں کسوں چلے آئے..... آخر چائے بنا کر اندر ہی تولانی تھی۔“ سوہا نے مذاق میں

گیا اور ساتھ ہی اسے بڑی ماں کی سمجھائی باتیں بھی یاد آ گئیں۔
”یہ اتنا آسان ہرگز نہیں جتنا کہ میں اس وقت سمجھا تھا۔ میں صاف اور کھرا بندہ ہوں، یہ پکڑنے نہیں آتے اور یوں بھی چالیں تو وہ آزماتے ہیں، جنہیں سیدھے راستے پر شکست کی امید ہوتی ہے، شہر نے ہارنا نہیں سیکھا.....“

جب زینت خود چائے بنا کر اس کے کمرے میں لائی، تب تک وہ فیصلہ کر چکا تھا، وہ بھی ویسا ہی رویہ رکھے گا۔ جیسا زینت اس کے ساتھ رکھے گی..... اگر وہ ٹھیک رہی تو بھی ٹھیک رہوں گا۔ اگر ذرا مٹی اکڑ دکھائی تو ساری شینی نکال دوں گا۔

”یہ چائے.....“ اُس نے میز پر برتن رکھتے ہوئے کسی ملازمہ کی طرح ہی ڈرتے ڈرتے نرم انداز میں کہا تھا۔

”ٹھیک ہے..... میں بنا لیتا ہوں.....“ وہ دونوں پاؤں جو توں سمیت بیڈ پر رکھے اور گانے سے ٹیک لگائے نیم دراز اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

”چینی کتنی.....؟“ اُس نے پوچھا۔

اردو شیر نے بیڈ سے اتر کر کرسی پر بیٹھتے ہوئے سپاٹ لہجے میں کہا.....
”میں خود بنا لیتا ہوں۔“

”کھانے میں کیا پسند کریں گے.....؟“ وہ ذرا پیچھے ہٹ کر کھڑی ہو گئی اور پوچھنے لگی۔
”جو بنا سکیں گی کھا لیں گے۔“ اُس کی جانب دیکھے بغیر وہ کہہ رہا تھا۔

”نہیں آپ بتا دیں، مجھے پتا ہے آپ اپنی مرضی کے خلاف کچھ بھی پسند نہیں کرتے۔“
”یہ کس نے بتایا آپ کو.....؟“ وہ پہلی بار مسکرایا تھا اور سوالیہ انداز میں اُس کی جانب دیکھ رہا تھا۔

وہ بھی مسکرا دی..... یہ نہیں بتایا کہ ملازما میں تمہارے مزاج کی سختی پسندنا پسند کا ذکر کرتی ہیں۔ اسی ڈر سے تو میں تمہارا کمرہ روز بہت دھیان سے صاف کرواتی رہی ہوں کہ پتا نہیں کس روز چائیک آ جاؤ اور کمرہ صاف نہ ہونے پر بگڑ جاؤ..... جبکہ وہ اس کے ساتھ بگاڑنا نہیں چاہتی تھی۔ پھر یہ دنیا میں ایسی کمی شاہ جی نے اسے تحفظ دیا تھا، بیوہ بھی دوسری شادی کی آس تھی، نہ ارمان سوا سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا شاہ جی کس عمر کے ہیں وہ تو دل بھی اسے دے چکی تھی جواب قبر کے اندھیروں میں اتر گیا تھا۔

زندگی جتنی بھی ٹی ٹی تھی، وہ عزت کے ساتھ بسر کرنا چاہتی تھی۔ اُس نے سوچا تھا بڑی بیگم یہاں آئیں تو ان کی بھی خدمت کرے گی۔ لیکن وہ ابھی تک حویلی آئی نہیں تھیں۔ زینت کی ان سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ ویسے یہاں اردو شیر کی طرح ان کا بھی بہت ذکر ہوتا تھا جبکہ فاطمہ اور گل کو کبھی بھی یاد کیا جاتا تھا۔

”جو بھی بچے کے کھالوں گا، آپ تردد نہ کریں۔“ پہلی بار اس کے لہجے میں نرمی اور دوستانہ پن چھلکا تھا۔ زینت کو حوصلہ ملا اور بولی.....

”اب آپ آئے ہیں تو رہیں گے ناں یہاں پر.....؟“
”آپ کیا چاہتی ہیں.....؟“ اردو شیر اس کی جانب دیکھے بغیر چائے کا کپ ہونٹوں تک لے جانے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

”کیا تم اپنے بابا کی مرضی کے خلاف.....؟“
”پلیز ماما، ایسی باتیں مت کریں، میں ایسی کوئی بات سوچنا بھی نہیں چاہتا۔“
جویریہ خاموش ہوئی مگر وہ سوچ رہی تھی۔ کبیر حسن بھی نہیں مامیں گئے، پتا نہیں کیا بنے گا۔ مزید کتنا خوش ہے۔ خدایا! تو اسے ہمیشہ خوش رکھنا۔“

”جہیں شاہ کیسا لگتا ہے رائج.....؟“ کالج کی کینٹین میں بیٹھی نورین نے اچانک ہی یہ سوال کر کے رائج کو گڑبڑا دیا۔ رائج نے پلکیں جھکا لیں اور کچھ بھی کہے بغیر اپنے سامنے رکھی کوک کی بوتل پر ہاتھ پھرنے لگی۔

نورین ہنس بڑی اور میز پر دونوں ہاتھ رکھ کر اس کی جانب جھکتے ہوئے بولی.....
”انتہا تو میں کہہ سکتی ہوں کہ شاہ نظر انداز کرنے والی شے ہی نہیں..... اب بنو نہیں یہ بتا دو جہیں کتنا اچھا لگتا ہے۔“

”یہ آج تم کیسی باتیں لے بیٹھی ہو۔“ رائج نے ہولے سے کہا اور ادھر ادھر دیکھنے لگی۔
”اس کے ذکر پر تمہارا گھبراہٹا جانا اپنی رائے کا اظہار نہ کرنا، ڈیئر یہ تو ظاہر کر رہا ہے کہ وہ تمہیں میرے انداز سے کہیں زیادہ اچھا لگتا ہے اور سناوب انکار کی کوشش مت کرنا کہ میں مانوں گی نہیں۔“
”دیکھو نورین، ایسی کوئی بات نہیں..... جیسا تم سمجھ رہی ہو۔“ رائج نے منت بھرے انداز میں کہا تھا۔ جواب میں نورین نے اسے گھور کر دیکھا اور بولی.....

”مجھے بے وقوف بنانا ہی ہو..... ارے بابا، میں تو تمہیں تم سے زیادہ جاننے کی دعویدار ہوں۔“
کچھ دیر کے لئے دونوں کے درمیان خاموشی چھا گئی۔ پھر نورین بولی.....
”تم نے بتایا تھا آج آئی کو تمہارے بھائی کے ساتھ چپک آپ کے سلسلے میں ڈاکٹر کے پاس جانا ہے۔“

”ہاں جانا ہے تو پھر.....؟“
”پھر یہ کہ گھر پر تو کوئی ہو گا نہیں، تم جا کر کیا کرو گی.....؟ کیا یہ بہتر نہیں، میرے ساتھ چلو..... مجھے آج ایک کام ہے، میڈم کی طرف جانا ہے، اسی بہانے تم اپنی میڈم کا گھر بھی دیکھ لینا۔ پھر میں تمہیں ڈراپ کر دوں گی۔“
”میڈم سے کام ہے تو یہیں آفس میں جا کر مل لو۔“
”مشورہ تو بڑا اچھا ہے..... مگر آفس میں عمل نہیں کر سکتی کہ میڈم ابھی کچھ دیر پہلے گھر جا چکی ہیں۔“

”تم کل مل لینا.....“ رائج ہچکچا رہی تھی۔
”بہانے مت بناؤ، باہر کی ہوا لگنے سے بیمار نہیں پڑ جاؤ گی۔ بس اب تو مجھے بھی ضد ہو گئی ہے تمہیں ساتھ لے کر ہی جاؤں گی۔ تمہارا کچھ کہیں تو بے شک میرا نام لے لینا، میں خود ہی فیس کر لوں گی..... اور ایسے مجھے یقین ہے، وہ کچھ نہیں کہیں گی۔ تم خود ہی ہر ایک سے کتراتے ہو۔“
”اچھا بابا..... چلی چلوں گی تمہارے ساتھ مگر دیکھو مجھے جلدی گھر ڈراپ کر دینا۔“

ٹالنا چاہا۔
”میں نے سوچا، تھوڑی سیلپ ہی کر دوں تمہاری.....“ اُس نے آگے آ کر پلیٹ سے مسکرا لیا۔

سوہانے اس حرکت پر گھور کر اسے دیکھا پھر بولی.....
”پلیز اندر جاؤ..... یوں مجھے کچھ اچھا نہیں لگ رہا۔“
”تم ہمیشہ مجھ پر اعتراض ہی کرتی رہا کرو..... مجھے نہیں یاد پڑتا کہ کبھی بھولے سے بھی تم میرے بارے میں کوئی خوبصورت بات کی ہو۔“ وہ بظاہر ناراض ہو کر دوبارہ کمرے میں چلا آیا۔
”نئے مسکرا کر اسے دیکھا پھر جلدی سے برتن سیٹ کرنے لگی۔

مزید کی ممانہ جانے کا فیصلہ کریں گی۔ یہ سوچ اُس پر گھبراہٹ طاری کر رہی تھی۔ ٹھنڈے پڑے ہاتھوں سے ٹرائی اندر لے کر آئی تو مزید اپنی ماں کے قریب خاموش اور باادب سر جھکائے بیٹھا تھا۔
کوئی قصہ سنار ہی تھیں۔ جویریہ کی ساری توجہ ان ہی کی جانب تھی۔ اُس کی سعادت مند دیکھ کر سوہا کو اُٹھ گئی۔ وہ جلدی سے جھک کر برتن سیٹ کرنے لگی۔

یاسمین بیگم ہی زیادہ تروتی رہیں اور جویریہ کو وہ اچھی لگیں کہ ان کی باتوں میں بناوٹ نہیں تھی۔ اپنے بارے میں کبھی کچھ بتا دیا حالانکہ ایسے موقعوں پر لوگ بہت کچھ چھپاتے ہیں۔
چائے پیتے ہی مزید نے واہی کے لئے کہا شروع کر دیا کہ وہ سوہا کے بارے میں ماں کی رائے جاننے کو بے چین تھا۔

”اتنی جلدی کیا ہے، کچھ دیر تو بیٹھنے دو۔“ یاسمین بیگم نے کہا۔
”نہیں آئی..... ہم پھر آئیں گے۔ ابھی تو اجازت دیں۔ انھیں ماما بڑی دیر ہو گئی ہے۔“
وہ اس جلدی کی وجہ کبھی نہیں سمجھا کر کھڑی ہوئیں۔ یاسمین بیگم سے اجازت طلب کی پھر سوہا کو لگا یا اور بولیں.....

”بہت پیاری بیٹی ہے..... مل کر دل خوش ہوا، میں پھر آؤں گی۔“
”ضرور جویریہ، یہ آپ کا اپنا گھر ہے۔“ یاسمین بیگم نے اپنائیت سے کہا، اُس فقرے نے اُن کے دل میں ڈھیروں اطمینان اتار دیا تھا۔ سمجھ گئی تھیں سوہا، جویریہ کو اچھی لگی ہے۔
”پھر ماما..... بتائیں کیسی لگی آپ کو ہماری پسند.....؟“ گاڑی میں بیٹھتے ہی اُس نے پوچھا۔
”ابھی جو کچھ میں نے سوہا سے کہا تھا، کیا تم نے سنا نہیں تھا.....؟“ وہ مسکرا کر اُس کی بے چینی کا

لیتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔
”سنا تو تھا مگر سوچا ہو سکتا ہے، یونہی اخلاقی تقاضے نبھانے کو کہہ دیا ہو۔ باہر نکلتے ہی یہ شادی نہیں ہو سکتی“ کا اعلان کر دیں۔“

”نہیں جناب، اصل بات بھی یہی ہے، وہ واقعی مجھے اچھی لگی ہے، جیسا میں سوچ رہی تھی۔ اس سے قطعی مختلف، سادہ سی پیاری سی لڑکی ہے، تمہارے ساتھ بیچ رہی تھی۔ لیکن مزید تم یہ بات کیوں پوچھ رہے ہو، اصل پسندنا پسند تو تمہارے بابا کی ہوگی اور پتا نہیں وہ سوہا کو قبول کریں گے یا نہیں۔“
”آپ کو پسند آئی ہے میرے لئے یہ بہت ہے، آپ میرے ساتھ ہیں تو مجھے کسی کی پروا نہیں۔“

آکر بولا.....
”اتنی ظالم ہو یا صرف مجھ پر ظلم ڈھانے کو جی چاہتا ہے۔“
”بیلا شاہ.....“ میڈم کی آواز میں حیرت اور پریشانی کے تاثرات نمایاں تھے۔ یقیناً انہیں آئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی۔ پردہ ہٹاتے ہی ان دونوں کی یہاں موجودگی چونکا گئی ہوگی۔
رائحہ نے پلٹ کر دیکھا۔ جان میں جان آئی۔ وہ تقریباً بھاگتی ہوئی میڈم تک آئی اور اُن سے لپٹ کر رونے لگی، جبکہ ارد شیر خاموش اور کسی حد تک ساٹ چہرے کے ساتھ کھڑا تھا۔
”میڈم، نورین کہا ہے.....؟ میں اُس کے ساتھ یہاں آئی تھی۔ اُسے کہیں مجھے گھر ڈراپ کر دے۔ میں فوراً یہاں سے جانا چاہ رہی ہوں۔“ اُس کے رونے میں کمی نہیں ہوئی تھی۔
”اچھا تو تم نورین کے ساتھ یہاں آئی تھیں، پھر تو وہ یہیں کہیں موجود ہوگی۔ جاؤ تلاش کرو اسے..... اور یہ آنسو پونچھ لو..... شاباش.....“ انہوں نے آخر میں پیار سے کہتے ہوئے اسے خود سے الگ کیا۔ پھر ارد شیر کی جانب دیکھا تو اُس نے کچھ کہنے کے لئے لب کھولے مگر میڈم فیروزہ نے اشارے سے منع کر دیا۔
رائحہ کمرے سے چلی گئی۔ تب وہ ارد شیر کی جانب متوجہ ہوئیں اور بولیں.....
”شاہ..... یہ کہاں تم سے ٹکرائی آج.....؟“
وہ ہنس پڑا اور بولا.....
”میں تو تم سے ملنے یہاں آیا تھا، اتفاقاً یہ مل گئی..... مگر تم نے آتے ہی رنگ میں بھٹک ڈال دی۔ اگر کچھ دیر میرے پاس رہ جاتی تو بھلا تمہارا کیا بگڑتا۔“
”میں نے اسے نہیں بلایا تھا، مجھے دیکھتے ہی وہ مجھ سے لپٹ گئی تھی۔ تم کچھ تو خیال کرو شاہ، وہ لڑکی میرے کالج میں پڑھ رہی ہے اور تم میرے ہی گھر میں..... اوہ تم ضرور میرا کام تمام کرو گے۔“
رائحہ گھر آئی تو عزیز اور جویریہ ابھی تک گھر نہیں لوٹے تھے۔ وہ سیدھی اپنے کمرے میں آئی اور بہتر پر گر کر رونے لگی۔
”میں نے اُن کے بارے میں جو سوچا تھا سب غلط تھا..... شاہ ایسے نہیں جیسا میں نے سمجھا تھا۔ وہ بڑے ہیں، بہت بڑے، اب میں اُن سے کچھ نہیں منوں گی۔“
• • •

اُس کے ساتھ وہ میڈم فیروزہ کے ہاں آئی۔ چوکیدار نے گیٹ پر ہی بتا دیا کہ ”میڈم ابھی کمرے سے گئی ہیں۔“
”چلو واپس چلتے ہیں نورین۔“ رائحہ نے کہا۔
”کسی کام سے گئی ہیں۔ کچھ دیر بعد آجائیں گی۔ تم اندر چلو، آرام سے بیٹھو کہ آخر یہ میری آنٹی کا گھر ہے۔“ اُس نے گاڑی پورچ میں کھڑی کی اور رائحہ کو ساتھ لئے ڈرائنگ روم میں آگئی۔ کچھ دیر اس کے ساتھ بیٹھی رہی، پھر یہ کہتی ہوئی اُنھ کھڑی کہ بھوک ستا رہی ہے، میں ابھی کچن کا جائزہ لے کر آئی ہوں۔“
”جلدی آ جانا.....“ رائحہ نے پیچھے سے کہا، نورین جواب دیئے بغیر چلی گئی۔
”رائحہ نے بیک ایک طرف رکھا۔ صوفے کی بیک سے ٹیک لگائی اور آنکھیں موند کر بیٹھ گئی۔
”زہے نصیب مس رائحہ حسن، آپ واقعی یہاں تشریف لائی ہیں کہ میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔“
”شاہ..... شاہ جی آپ.....“ رائحہ نے گھبرا کر آنکھیں کھولیں اور پھر اسے دروازے سے ڈرا کر آئے موجود پا کر اُنھ کھڑی ہوئی۔
”گلتا ہے میری آمد ابھی نہیں لگی۔“ وہ کہتا ہوا قریب آیا، پھر بے تکلفی سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔
وہ بے چین دکھائی دینے لگی۔ ارد شیر نے اسے صوفے پر بٹھایا۔ جب برابر میں خود بیٹھا تو رائحہ سمٹ کر ڈرا پیچھے ہو گئی۔
”بیلا ڈیر..... کیا بات ہے، اپنی ہو کر بھی غیر کیوں بن جاتی ہو.....؟“ اُس کا ہاتھ چھوڑ کر اس پر جھکا اور شکایت کی۔
رائحہ نے گھبرا کر اُنھ جانا چاہا..... اُس نے ارادہ بھانپ لیا اور بھاری ہاتھ اُس کے شانے پر یوں رکھا کہ وہ اُنھ نہیں سکی۔
”ڈور نہیں، یہیں بیٹھو میرے ساتھ، میرے قریب.....“
”شاہ آپ.....“ وہ رو ہاںسی ہو گئی۔ اس سے اس کی بے باکی کی شکایت کرنا چاہتی تھی مگر نہیں سکی۔
”کہو ڈیر.....“ وہ فسوں گرا آنکھیں جو بہت بے باک تھیں اسے جکڑے ہوئے تھیں، جو رنگ اُن میں رائحہ نے دیکھا تھا، وہ اُس جیسی با کردار لڑکی کے لئے کسی طرح بھی قابل قبول نہیں تھا۔ وہ ایک جھٹکے سے اُنھ کھڑی ہوئی۔ مگر ارد شیر کی پہنچ سے ڈور نہیں تھی۔
اُس نے جیسے اُس کی بے بسی کا مزالیا اور ہستے ہوئے بولا.....
”کیا بات ہے سرکار، آج تو رکھنا چھوڑ دے رہے، کوئی قصور ہو گیا ہے ہم سے.....؟“
”میں گھر جانا چاہ رہی ہوں.....“ خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے اُس نے التجائی کی۔
”گھر..... کس کے گھر.....؟ اچھا میرے گھر..... آؤ ضرور آؤ، تمہارے لئے دل اور گھر کے دونوں دروازے کھلے ہیں۔ میرا دل بھی تمہارا ہے اور گھر بھی.....“ وہ سمجھ کر بھی نہیں سمجھا تھا۔
”مجھے جانے دیں پلیز.....“ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور خوف سے آواز کانپ رہی تھی۔
”س پران آنسوؤں اور اس لہجے کا کوئی اثر نہیں ہوا، اپنی جگہ سے اُٹھا اور خوفزدہ لڑکی کے صحن سامنے

”جو بھی ہوں، آپ کے سامنے ہوں۔“ وہ بھی اس ہنسی میں شامل ہو گیا۔
”مما سے ملو گے.....؟“ مزید نے پوچھا تو اُس نے جھٹ اثبات میں سر ہلا دیا اور بولا.....
”میں صرف آپ سے ہی نہیں، آنٹی سے بھی ملنے آیا ہوں۔“
”ہوں، تو سارے خدشے دُور ہو چکے ہیں، گندویری گند..... ابھی انہیں بلا کر لاتا ہوں۔“
جب مزید نے جویریہ کو اُس کی آمد کی اطلاع دی، وہ دروازہ پر سیٹ کر رہی تھی۔ کام چھوڑ کر فوراً
ملنے کو تیار ہو گئی۔
”کیسے ہو عمر.....؟“ اس کے انداز میں پیار اور بے تابی تھی۔ پھر اس کے جواب کا انتظار کئے بغیر

بولی۔

”اتنے دنوں کے بعد کیوں آئے ہو بیٹا، میں تمہاری طرف سے فکر مند تھی۔ مزید گھر پر ہوتا ہی
نہیں ہے ورنہ اسے تمہاری خیر خیریت کی خبر لینے ضرور بھیجتی۔“
”یہ خاتون کتنی اچھی ہیں، سراپا اُلفت اور مہربان.....“ عمر کا جی چاہا، ان کے قدم چوم کر آنکھوں
سے لگا لے، اُن سے کہے.....
”میں آپ کو اتنا ہی چاہتا ہوں جتنا اپنی ماں کو..... ماں سے بڑھ کر تو کوئی نہیں ہوتا مگر میں محسوس
کرتا ہوں، میرا دل آپ کو بھی اس درجے پر رکھتا ہے، اے مہربان خاتون! مجھے بتائیں ناں، یہ کیوں
ہے، میرے ساتھ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ آپ کی شخصیت میں یہ کیسی کشش ہے۔ آپ سے ملنے کے بعد
مجھے محسوس ہوا ہے جیسے میرے اندر شدت کی پیاس ہے اور آپ کو دیکھ کر، آپ سے مل کر یہ پیاس بھڑک
اُٹتی ہے۔ برداشت ہی نہیں ہوتی..... ایسے ہی جیسے پانی نظر آنے پر پیاسا بے قابو ہو جاتا ہے۔“
”بیٹا..... تم اپنے اپنے سے لگتے ہو، پہلی بار جب تمہیں دیکھا تھا، تب بھی میرے محسوسات یہی
تھے۔“

اس سے پہلے کہ جواب میں وہ کچھ کہتا، مزید بولا.....
”مما..... یہ سارا کمال اس کی معصوم سی صورت کا ہے، جو بھی ملتا ہے، اس سے محبت کرنے پر مجبور
ہو جاتا ہے۔“



”بہت سکون ملتا ہے مجھے بھائی کے ہاں جا کر، کتنے اچھے ہیں وہ اور اُن کی والدہ سوچتا ہوں، سب
”لت مند ایک جیسے نہیں ہوتے، اُن کے سینے میں بھی ہماری طرح دل ہوتا ہے اور احساسات بھی، وہ
بہت اچھی ہیں۔ جی چاہتا ہے ان کے پاس بیٹھ جاؤں اور ڈھیروں باتیں کروں۔“



کہاں تو ان کے بار بار اصرار کے باوجود گاؤں آنے پر تیار نہیں ہوتا تھا اور اب چکر پہ چکر لگائے جا
رہے تھے۔ اس وقت شام ہو رہی تھی۔ یہ اوائل نومبر کے دن تھے۔ موسم میں خنکی کا اثر بہت گہرا تھا۔ فضا
میں موسم کی خوشبو رچی ہوئی تھی اور گاؤں پر گہری خاموشی کا راج تھا۔ حویلی کے چھانک پر گاڑی رکی تو
نویدار کو یقین ہی نہیں آیا کہ آنے والے واقعی اس کے چھوٹے شاہ جی ہیں ہی۔
”ارے خیر تو ہے، کچھ روز پہلے ہی تو ہو کر گئے تھے۔“ جلدی سے لکڑی کا بڑا پھاٹک کھولتے ہوئے

بہت انتظار کیا مزید کا، وہ نہیں آیا تو عمر کے قدم اس کے گھر کی جانب اٹھ گئے۔ وہ کانچ سے
سیدھا اس کے گھر جا رہا تھا۔ سوچا تھا زیادہ دیر نہیں بیٹھے گا، بس مل کر خیر خیریت معلوم کر کے واپس آ جائے گا
کہ اماں اور راجہ اس کی آمد کی منتظر بیٹھی ہوں گی۔
جہاں یہ خیال اُسے مسرور کر رہا تھا کہ وہ ایک بار پھر مزید کی ماں سے ملے گا، انہیں دیکھ سکے گا،
وہاں یہ خدشہ بھی ساتھ ساتھ تھا کہ ممکن ہے وہ گھر پر نہ ہوں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کسی کام میں مصروف ہوں
مجھ سے ملنے نہ آ سکیں۔
گیٹ پر پہنچ کر اُس نے مزید کے بارے میں تو پوچھا ہی، ساتھ یہ بھی پوچھ لیا..... ”کیا ان کی
والدہ بھی گھر پر موجود ہیں.....؟“

دونوں سوالوں کا جواب اسے اثبات میں ملا۔

زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ ملازم کو لڈو رک رکھ کر گیا ہی تھا کہ مزید ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ پڑا
ہٹا کر اسے دیکھا تو سیٹی بجائی اور پھر آگے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا۔
”ہم تو آپ کے منتظر رہے مزید بھائی.....“ اُس نے اتنے روز تک نہ آنے کا شکوہ کر ڈالا۔
”عمر..... میں بہت شرمندہ ہوں تم سے..... اصل میں مصروف رہا ناں، میرے ایک دوست کی
والدہ بیمار تھیں۔ میں جھوٹ نہیں بول رہا، تم بے شک مماسے پوچھ لیتا۔ انہیں بھی یہی شکوہ رہا کہ میں گھر
بالکل نہیں رہتا۔“

”مجھے کسی سے نہیں پوچھنا، آپ کے کہے پر یقین ہے۔“

”تھینک یو..... اور سناؤ راجہ اور خالہ کیسی ہیں.....؟“

”سب ٹھیک ہیں اور آپ کو بہت یاد کرتی ہیں۔“

”میرا سلام کہنا اور یہ بھی کہ میں غریب آؤں گا، دیر تک بیٹھوں گا اور خوب باتیں ہوں گی۔“
”جی بھائی، ہم تو آپ کے اتنے عادی ہو گئے ہیں کہ منتظر ہی رہتے ہیں۔ اب آپ نہیں آئے تو طرح
طرح کے دوسے ستارے رہے۔ یہ بھی سوچا کہ شاید آپ کی فیملی کو آپ کا مجھ سے ملنا اچھا نہیں لگے گا
لئے آپ نے میرے یہاں آنے کے بعد سے ہمارے ہاں آتا ہی چھوڑ دیا ہے۔ آج میں بہت ڈرنے
ڈرتے آپ کی طرف آیا ہوں۔“
”اُف..... عمر تم تو بالکل پاگل ہو۔“ مزید ہنس کر کہہ رہا تھا۔

بڑوں ہاتھوں میں سونے کی چوڑیاں، کانوں میں بڑے بڑے سونے کے جھمکے، گلے میں لاکٹ اور ان سب پر بھاری اس کا اعتماد..... آج وہ واقعی حویلی کی مالکن لگ رہی تھی۔
”سنا تھا بابا جان گھر پر ہی ہیں؟“ اردو شیر کا لہجہ اور آنکھیں سپاٹ تھیں۔
”جی ہاں..... گھر پر ہی ہیں وہ..... طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے، سو گئے ہیں۔“
”کیا ہوا انہیں.....؟“ اُس نے سرسری انداز میں کہا۔
”موسم بدل رہا ہے تو نزلہ زکام ہو گیا ہے، ویسے ٹھیک ہیں، آپ گھبراہٹیں نہیں۔“ اُس کا انداز دوستانہ تھا۔

”اور آپ کیسی ہیں.....؟“ وہ اسے کیا کہہ کر پکارے، یہ اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔
”شکر ہے جی اللہ کا.....“ اُس نے حال پوچھا تو وہ بہت خوش ہوئی۔
”آپ کے ابا جی تو بہت ذکر کرتے رہتے ہیں آپ کا، اچھا ہوا آپ آگئے۔“
”ذکر کرتے ہیں میرا..... اچھے لفظوں میں یا برے لفظوں میں.....؟“ اُس نے اندر کی تلخی کو چھپا کر بظاہر یونہی پوچھ لیا تھا۔
”اللہ نہ کرے جی، برے لفظوں میں کیوں کریں گے، اچھے لفظوں میں یاد کرتے ہیں۔“
”یہ تو بڑی مہربانی ہے اُن کی۔“ اب کے اندر کا اثر کسی حد تک لہجے میں آگیا۔ مگر وہ سمجھی نہیں بولی۔

”مہربانی کیسی..... آؤ کوک تو پتر ہیں اُن کے..... وہ تو بڑی محبت کرتے ہیں آپ سے، بہت خیال رہتا ہے انہیں آپ کا۔“

یہ عورت کون ہوتی ہے مجھے میرے باپ کے متعلق یہ بتانے والی کہ وہ مجھے کتنا چاہتے ہیں۔ کیا یہ مجھ سے بھی زیادہ حقدار ہو گئی ہے ان کی، اس کی اہمیت اُن کے لئے مجھ سے بڑھ کر ہے، جوان کا اکلوتا بیٹا ہوں، اب دوسرے نمبر پر ہوں، پہلا نمبر اُن کے لئے اب اس عورت کا ہے، وہ اپنا پیار، اپنی محبت اب اس کے لئے وقف کر چکے ہیں.....؟ اردو شیر نے محبت کو، رشتوں کو بھلا کب اہمیت دی تھی۔

مگر یہ تو انسانی فطرت ہے، چاہے جانے کا جذبہ بہت شدت سے سب جذباتوں پر بھاری ہوتا ہے۔ جب تک باپ کی محبت، اس کی توجہ صرف اسی کے لئے تھی، تب اسے پروا نہیں تھی مگر اب درمیان میں تیسرا وجود آیا تو اردو شیر چونک اٹھا، بروداشت مشکل ہو رہی تھی۔

وہ خاموش بیٹھا تھا، زینت کچھ کہہ رہی تھی..... مگر اُس کا دھیان اس کی باتوں کی جانب بالکل نہیں تھا۔

ملازمہ چائے لے کر آئی، زینت نے خالی چائے دیکھی تو اسے ڈانٹ کر بولی..... ”مگر میں اللہ کی ان نعمتیں موجود ہیں اور تم نے خالی خولی چائے اٹھا کر چلی آئی ہو۔“

”یہ کون ہوتی ہے میرے لئے کوئی فیصلہ کرنے والی، کیا میں اپنی مرضی سے کچھ نہیں منگو سکتا۔ میں یہاں کسی مہمان کی طرح ہوں، ہر انداز مالکوں والا، جبکہ مالک تو میں ہوں، یہ سب میرا ہے۔“ یہ خیال کناز ہر پلے ناگ کی طرح پھنکاریں مارتا اس کے ذہن سے لپٹ رہا تھا۔

”کیوں ڈانٹ رہی ہیں اس بے چاری کو..... میں نے خود صرف چائے کے لئے ہی کہا تھا۔“

اُس نے سوچا تھا۔

”بابا جان موجود ہیں.....؟“ اُس نے اندر داخل ہونے کے بعد گاڑی کے گرد اکٹھے ہونے والوں کی طرف دیکھے اور کسی کو نام لے کر مخاطب کئے بغیر پوچھا تھا..... جواب میں بھی نے جی ہاں کہا۔
”ہونہ۔“ اب تو سارا وقت گھر پر ہی بیوی کے تازخے اُٹھاتے ہی گزرتا ہوگا۔ گھر میں بندہ کرکون سا کام کرتے ہیں..... وہ مجھ پر تو بڑا اعتراض کیا کرتے تھے کہ کام میں دلچسپی نہیں لیتا۔ صرف پیسہ خرچ کرنے میں دلچسپی ہے۔“ اس کے اندر تلخی کھلنے لگی۔

ملازمین کے سلام کا جواب سر کے اشارے سے دیتا وہ اندرونی حصے کی جانب آیا۔ چھوٹا بچا ہانک تو کھلا ہی رہتا تھا کہ یہ رہا کئی حصہ تھا اور سارا دن ملازم اور گاؤں کی عورتیں آتی جاتی رہتی تھیں۔
چونکہ شام ہو رہی تھی اور خنکی خاصی تھی تو یہاں سے وہاں تک پورا صحن خالی تھا۔ کوئی ملازم عورت کی کام میں مصروف دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ دینو کے آگے آگے چلتا ہوا اپنے کمرے کی جانب بڑھ رہا تھا اور اس کا سامان اُٹھائے بارہ تیرہ سالہ دینو پتا نہیں کیوں دانت نکالے چلا آ رہا تھا جیسے چھوٹے شاہ جی کا سامان اُٹھانا کوئی اعزاز کی بات ہی ہو۔

کمرے میں آکر اُس نے دینو کو اشارے سے بتایا کہ ”سامان اس طرف رکھ دو اور یہ بھی کہ بابا سائیں کو میری آمد کی اطلاع دے دو۔“

چائے کا بھی بول دوں جی، ادھر ماسی ہوگی چولہے کے پاس، وہ اچھی چائے بناتی ہے جی۔“
(پتا نہیں دینو کے نزدیک اچھی چائے کا معیار کیا تھا۔)

اُس نے اثبات میں سر ہلادیا۔ دینو کی طرح خوشی سے بے حال اُچھلتا کودتا باہر چلا گیا۔
”کیا مصیبت ہے، اب اس عورت کی وجہ سے مجھے ہزاروں کام چھوڑ کر بار بار گاؤں کے چکر لگا پڑتے ہیں۔“ وہ دھپ سے بستر پر بیٹھا، براسا منہ بنا کر کمرے کے چاروں طرف تنقیدی انداز میں نگاہ دوڑائی، ایسی کوئی بات نظر نہیں آئی جس پر اعتراض کر کے غصے کو ہوا دی جاسکے۔ سوسر خواہ خواہ ہی تاسف بھرے انداز میں دائیں بائیں جھٹکا اور پھر جھک کر جوتے اُتارے، رست واج سائینڈ ٹیبل پر رکھی اور لیٹ گیا۔

بستر پر کبل یا لاف نہیں تھا جبکہ اس نیم تاریکی میں خنکی کا احساس بڑا گہرا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے سردی اسی کمرے سے پھوٹ کر اطراف میں پھیل رہی ہے۔

دروازے پر گرے بھاری پردوں کے پار سے چوڑیوں کی ٹھنک اُبھری۔ کوئی ملازمہ بھی ہو سکتی تھی۔ اُس نے کوئی خیال نہیں کیا، یونہی لیٹا رہا۔ قدموں کی چاپ قریب آئی۔ چوڑیوں کی ٹھنک اب اس بھی واضح ہو گئی۔ پھر دروازے پر ہلکی سی دستک دے کر گویا اندر آنے کی اجازت چاہی جی۔

جواب اثبات میں ملتے ہی وہ سامنے آگئی۔

”السلام علیکم.....“ اس کی آواز صاف اور واضح تھی، اس میں کسی قسم کی جھجک نہیں تھی۔

اردو شیر اُٹھ بیٹھا۔ زینت نے ہاتھ بڑھا کر لائٹ آن کی اور بولی.....

”بہت اندھیرا ہو رہا ہے..... آپ یونہی بیٹھے ہوئے تھے۔“

اردو شیر نے سر سے پاؤں تک سرسری انداز میں اُس کو دیکھا۔ سبز ویلٹ کا سوٹ کام والا دہن

”ہاں، یہ سب ٹھیک ہے۔“ اُسے اتفاق کرنا پڑا۔
”تو پھر بے قصور کو مزادینے کا کیوں سوچنے لگتے ہو؟“ ہاں یا یاد آیا، تم نے شاہ جی سے رقم لی ہے
برکت میں مانگ ہی نہیں سکے؟“

”سروٹ.....“ وہ ہنس پڑا اور بولا..... ”پہلے آیا تھا تب بھی لی تھی اور اب بھی اسی ارادے سے آیا
ہوں۔“
”اچھی بات ہے، انہیں اپنے وجود کا احساس دلاتے رہو۔“
وہ دیر تک اُن کے پاس بیٹھا رہا۔ انہوں نے رات کا کھانا نہیں کھانے کو کہا اور اُس نے بھی انکار

نہ کیا۔
”بڑی ماں بیٹے کا گھر تو آپ کا اپنا ہے ناں، آپ میرے ساتھ شہر چلیں۔“
”ہاں لال ضرور آؤں گی مگر ابھی نہیں اور ایک بات یاد رکھو، جب تک بڑی ماں تمہارے ساتھ
موجود ہے تمہارا باپ بھی تمہیں تمہارے حق سے محروم نہیں کر سکتا۔“
”پہلے بھی آپ کی بات مان کر اسے برداشت کرتا رہا ہوں، اب بھی آپ کے کہنے پر ہی چلوں
گی۔“

”شاباش..... مجھے تم پر فخر ہے، یقین ہے تم بڑی ماں کو کبھی مایوس نہیں کرو گے۔“
”ہاں بڑی ماں، یہ میرا وعدہ ہے، زندگی کا کوئی بھی موڑ ہو، آپ جو بھی مانگیں گے میں دوں گا،
ہاں میری جان ہی کیوں نہ ہو۔ آپ کا بیٹا آپ کو کبھی مایوس نہیں کرے گا۔“ اُس نے ایک عزم سے کہا۔
جب وہ اُن سے اجازت لے کر رخصت ہوا تھا، تب کالی رات کی حکمرانی تھی۔ چاند کی شروعات کی
بار نہیں تھیں، سو ہر سوتا رہی تھی اور خاموشی بھی، گرد سے اُنے راستوں پر وہ خالی ذہن کے ساتھ سفر کر رہا
تھا۔

اب بھی سیدھا اپنے کمرے میں آیا مگر ملازم تو دیکھ ہی چکے تھے، زینت کو اُس کی آمد کی اطلاع دے
دی، وہ کبل اوڑھ کر لیٹا ہی تھا کہ زینت آگئی۔

”کہاں چلے گئے تھے آپ، میں تو کھانے پر انتظار ہی کرتی رہی۔“ انداز میں غصہ یا انتظار کی
الہن نہیں تھی۔

وہ بتاتے جاتے جانے کیوں رُک گیا کہ بڑی ماں سے مل کر آ رہا ہوں..... اتنا ہی کہا..... ”ایسے ہی
باہر نکل گیا تھا۔“ کھانا بھی کھا کر آ رہا ہوں۔“

ابھی اُن کے درمیان گفتگو ہو رہی تھی کہ شاہ جی چلے آئے، اس کے سلام کا جواب دیتے ہی، فوراً
نہا.....

”کہاں چلے گئے تھے تم، اس بے چاری نے تمہارے لئے کھانے پر اتنا کچھ بنوایا، پھر دیر تک
انتظار کرتی رہی اور تم اب آرہے ہو۔“

”بس بابا جان، ذرا باہر نکل گیا تھا۔“

”اگر ایسا ارادہ تھا تو تیار کر تو جاتے، یہ بے چاری خواہ خواہ خود بھی کچن میں جان کھاتی رہی اور پھر
انتظار میں اتنا وقت ہو گیا، ہم نے ابھی کچھ دیر پہلے ہی کھانا کھایا ہے۔“ اُن کے انداز میں شکوہ تھا، ہلکی سی

اور ملازمہ اس مہربانی پر حیران رہ گئی۔ یہ لفظ چھوٹے شاہ جی نے ہی ادا کئے ہیں، اُسے یقین نہیں
آ رہا تھا۔

”تم جاؤ.....“ اب زینت نے اُس عورت کو بھیج دیا، پھر ارد شیر سے بولی.....
”شاہ جی..... ملازموں کے ساتھ ضرورت سے زیادہ نرمی برتتے ہیں۔“ وہ منہ بنا کر کہہ رہی تھی۔
جی میں آئی کہہ دو، ”اگر نرمی نہ برتتے تو تم جو نشی کی بیٹی ہو، مالکن نہ بنی بیٹھی ہوتیں۔“
وہ شاہ جی کی ملازمین کی مہربانی کے چھوٹے چھوٹے قصے سناتی رہی، ارد شیر نہایت بددلی سے ہر
دیر تو سنتا رہا پھر بول ہی پڑا.....

”میں چائے پی کر کچھ دیر آرام کرنا چاہوں گا اور ہاں ایک کبل بھجوا دیں۔“
”ہاں جی، سردی تو بہت ہو رہی ہے..... میں بیڑ بھی لگوادیتی ہوں اور کبل بھی لادیتی ہوں۔“
وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ دروازے تک پہنچی تو پھر کچھ خیال آیا، پلٹ کر بولی.....
”شاہ جی کو چکا دوں یا آپ کھانے پر ہی اُن سے ملیں گے۔“
”انہیں سونے دیں، میں بعد میں مل لوں گا۔“
وہ اثبات میں سر ہلا کر باہر چلی گئی۔

چائے پینے کے دوران ہی اُس نے بڑی ماں کی طرف جانے کا پروگرام بنالیا۔ مسافت زیادہ نہیں
تھی صرف تیس منٹ کی ڈرائیو کی۔ چائے پیتے ہی وہ کسی کو بتائے بغیر نکل کھڑا ہوا۔
کبریٰ کو نو روٹنے اُس کی آمد کی اطلاع دی تو وہ فوراً ڈرائنگ روم میں آئی اور بڑے پیار سے ملیں،
پھر بولیں..... ”کیسے آتا ہوا ارد شیر؟“

”بڑی ماں..... میں دو غلا پن نہیں کر سکتا..... سچ مجھے بہت غصہ آتا ہے اس عورت پر..... اور تب
دوستہ انداز اس کے ساتھ باتیں کرنا میرے لئے ممکن ہی نہیں رہتا، جی چاہتا ہے.....“ اُس نے شربت
جذبات سے بات مکمل نہیں کی، بائیں تھکی پر، دائیں ہاتھ کا مکا مار کر خاموش ہو گیا۔ تیوری پر بل تھے اور
لب بھیجے ہوئے تھے۔

انہوں نے اس کی جانب دیکھا اور مسکرا کر بولیں..... ”کیوں، آخر کیا بگاڑا ہے اُس عورت نے
تمہارا.....؟“

یہ سوال توقع کے خلاف تھا..... اُسے حیرانی ہوئی، بولا.....

”کیا بگاڑا ہے، ارے بڑی ماں وہ حویلی کی مالکن بنی بیٹھی ہے۔ اُس نے آپ کی جگہ لے لی ہے۔
وہ اپنی اوقات بھول گئی ہے۔ آج مجھ سے کہہ رہی تھی شاہ جی ملازموں کے ساتھ بہت نرمی برتتے ہیں، لی
میں آئی کہ کہہ دوں، اسی نرمی کے نتیجے میں تو آج تم یہاں ہو مگر ضبط کر گیا۔ بڑی ماں، وہ بابا جان کے بہت
قریب آگئی ہے۔ اس کے علاوہ اب انہیں کسی کی پروا نہیں۔“

”اُسے حویلی میں تمہارے بابا جان لائے تھے۔ عزت کے ساتھ..... نکاح پڑھوا کر..... نشی کی بیٹی
کو مالکن تمہارے بنانے بنا دیا ہے۔ اُسے اپنے سے بہت قریب بھی وہی رکھتے ہیں۔ سب اختیارات بھی
انہوں نے ہی اس سونپ دیئے ہیں۔ ہمارے تمام رشتے شاہ جی کے ساتھ ہیں نہ کہ زینت کے ساتھ۔“
رشتے شاہ جی نے ہی توڑے ہیں، پھر تمہیں گلہ اس عورت سے کیوں ہے.....؟“

اس کی بات نے ارد شیر کو چونکا دیا۔ کیا واقعی اتنی اچھی ہے.....؟ دل میں اس کے بارے میں پہلی بار کوئی اچھا جذبہ محسوس ہوا۔

”میں نے تو ان سے کئی بار کہا ہے کہ وہ یہاں آ کر رہیں، مجھے یقین ہے، آپ دونوں ایک گھر میں خوش رہ سکتی ہیں، وہ بھی بہت اچھی طبیعت کی مالک ہیں اور آپ بھی، مگر جانے کیوں، وہ یہاں آنا نہیں چاہتیں، کافی عرصے سے اپنے بھائی کے گھر ہیں۔ خیر اب آپ نے کہا ہے تو جب بھی ملاقات ہوئی، یہ بات آپ کی طرف سے ان سے کہہ دوں گا۔“ ارد شیر کا لہجہ بڑا دوستانہ اور اچانکیت بھرا تھا۔

دو پہر کو شاہ جی گھر آئے، اس وقت زینت، ارد شیر کے کمرے میں تھی، دونوں میں جانے کیا باتیں ہو رہی تھیں۔ زینت ہنسے جارہی تھی، شاہ جی اندر آئے تو ایک دم سے کھڑی ہو گئی اور سر سے سرک آنے والا دوپٹہ بھر سے سر پر ڈال لیا۔

”آئیے بابا جان..... بڑی دیر لگا دی آپ نے.....؟“

”ہاں بس کام ہی ایسا تھا، تم بتاؤ کیا باتیں ہو رہی تھیں ماں بیٹے میں.....؟“ وہ مسکرا کر بولے تھے دونوں کو عجیب سا لگا، خاموش رہے۔

”میں آپ کے کپڑے نکال دیتی ہوں.....“ زینت اتنا کہہ کر کمرے سے چلی گئی۔

”بابا جان..... مجھے کچھ رقم چاہئے تھی۔“ وہ اس کے بعد بڑی بنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

”اچھا..... کتنی رقم.....؟“

”بہی کوئی دس بارہ لاکھ.....“ انداز قطعیت بھرا تھا۔

”کیا کرو گے اتنی رقم کا.....؟“ اُن کا انداز بتا رہا تھا، وہ خاصے مجھ گئے ہیں۔

”نئی کوٹھی بنانا چاہ رہا ہوں۔“ اُس نے بڑے اطمینان سے جھوٹ بول دیا۔

”دس بارہ لاکھ میں کوٹھی، بھلا کون بنا کر دے رہا ہے تمہیں.....؟“ انہوں نے تمسخر اُڑایا کہ اس کے جھوٹ پر غصہ آ گیا تھا۔

وہ بڑے ضبط سے کام لے کر بولا..... ”ابھی تو صرف زمین کے لئے مانگ رہا ہوں، کچھ رقم موجود ہے، کچھ سوچا آپ سے لے لوں۔“

”یہ بیٹھے بیٹھے نئی کوٹھی کی ضرورت کیوں پیش آ گئی ہے ارد شیر پتر..... کچھ تو خیال کرو، ہوش سے کام لو، اب تم بچے نہیں ہو۔“

”آپ صاف صاف بتا دیں، دیں گے یا نہیں دیں گے.....؟“ اُن کی بات پر بہت موڈ خراب ہوا تو۔

”دینا یا نہ دینا اسی بنیاد پر ہے کہ اسے استعمال کہاں کیا جائے گا..... ارد شیر اب تو میں تمہاری طرف سے فکرمند رہنے لگا ہوں۔ جس انداز میں تم دولت نگار ہے ہو، ہم جلد ہی لکھ سے لکھ ہو جائیں گے۔“

”میرا خیال ہے آپ کی زندگی میں ایسا نہیں ہوگا، جو بھی بیٹے کی مجھ پر بیٹے گی۔ لہذا آپ فکرمند کریں..... اور مجھے میرا حق لینے سے مت روکیں۔“

”ارد شیر.....“ اُن کے انداز میں تنبیہ تھی۔ اُس نے جیسے سنا ہی نہیں بولا.....

”بہتر تو یہ ہے کہ آپ اب میرا حق، میرے حوالے کر دیں، میں بڑھاؤں یا اُجاڑ دوں، آپ کو فکر

ناراضگی بھی محسوس ہو رہی تھی۔

ارد شیر کی چپستانی پر ہل پڑ گئے اور جب بولا تو آواز میں ہلاکی ٹھنڈک تھی۔ وہ کہہ رہا تھا.....

”میں یہی سمجھتا رہا، یہ میرا گھر ہے، میں اپنی مرضی سے یہاں آ جا سکتا ہوں..... اور جب نہ چاہے، کھا سکتا ہوں، اچھا ہوا آپ نے بروقت مجھے اس غلط فہمی سے نکال لیا۔“

”آپ تو یونہی گرم ہونے لگے شاہ صاحب، وہ ابھی تھکے ہوئے آئے ہیں، پھر کیا ہوا جو کھا نا پیر لیا۔ کوئی دوست مل گیا ہوگا۔“ زینت نے مکمل طور پر اُس کی طرف داری کی تھی۔

شاہ جی نے بھی محسوس کیا، ان سے کچھ زیادتی ہوئی ہے، جیسی تو لاڈلیوں منہ بنائے ہوئے ہے۔ قریب آ کر اُس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور بولے..... ”پتر تم غلط سمجھ رہے ہو، میرا مطلب ہرگز نہیں تھا، یہ تمہارا اپنا گھر ہے، میں تو بس یونہی کہہ رہا تھا۔“

اُس نے بھی اثبات میں سر ہلا کر اُن کی معذرت قبول کر لی..... زینت کمرے سے باہر چلی گئی۔

”یہ بتاؤ، کیسے آتا ہوا.....؟“ ذرا توقف کے بعد انہوں نے پوچھا۔

”لٹنے ہی آیا ہوں..... اور کس لئے آتا.....؟“ اُس کا موڈ اتنی جلدی نارل نہیں ہو سکتا تھا۔

شاہ جی ہنس پڑے اور بولے.....

”اگر لٹنے آئی گئے ہو تو اس قدر ناراض کیوں ہو رہے ہو، میں نے تو اس لئے پوچھ لیا کہ بہن جلدی چکر لگا لیا ہے گاؤں کا۔“

”میں ناراض نہیں ہوں۔“ اُس نے سانس کھینچ کر اُن کی بات کی نفی کی تھی مگر بنجیدگی ہنوز برقرار تھی۔

”تھک گئے ہو، اب آرام کر لو، صبح ناشتے پر ملاقات ہوگی۔“

وہ اٹھ کر چلے گئے، اُس نے بھی کپڑے تبدیل کئے اور سونے کے ارادے سے لیٹ گیا۔

صبح جب ناشتے کے لئے ان کے درمیان بیٹھا تھا، جب تک موڈ بالکل ٹھیک ہو چکا تھا، شاہ جی ناشتے کے دوران زینت کے سلیٹے اور رکھ رکھاؤ اور ذہانت کی تعریف کرتے رہے..... اور وہ خاموشی سے نہایت صبر کے ساتھ سنتا رہا۔

ناشتے کے بعد شاہ جی تو باہر نکل گئے، وہ کرسی ڈلو کر صحن کی کھلی دھوپ میں آ بیٹھا۔ زینت ملازماؤں کے سر پر کھڑی ہو کر صفائی کر رہی تھی۔ ارد شیر کے قریب آ کر مسکرائی اور بولی.....

”آپ کو بڑی نیگم صاحب سے ملنے بھی تو جانا ہوگا، آج ہی جائیں گے یا پھر کسی دن پرکھ ہے.....؟“

”کون بڑی نیگم..... وہ اچھا بڑی ماں.....“ پہلے سمجھا نہیں، پھر خیال آیا تو بولا..... زینت نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”کل رات میں اُن ہی کی طرف تھا، کھانا بھی وہیں کھایا تھا۔“

”اچھا، اب جب ملنے جائیں تو اُن سے کہیں کہ وہ حویلی آ جائیں، خدا کی قسم میں دل سے چاہتی ہوں، وہ مالکن ہیں، بڑی نیگم ہیں، پہلا حق اُن کا ہے۔ میں برابری کا ارادہ نہیں رکھتی۔ انہیں عزت دوں گی جیسا وہ چاہیں گی، میں ویسا ہی کروں گی۔“

نہیں ہونی چاہئے۔“

”اردشیر یہ تم کیا کہہ رہے ہو.....؟“ اُن کی آواز خاصی بلند تھی۔

”میں غلط تو نہیں کہہ رہا، کیا باپ کی زندگی میں جائیداد بیٹے کے نام ہونا ناممکن ہے۔“

”مگر میں اپنے جیتے جی ایسا نہیں کروں گا۔“ اُن کا انداز قطعیت بھرا تھا، غصے سے اُن کا چہرہ سرخ

ہو رہا تھا۔

اُس کے جی میں آئی کہہ دے آپ کو اب اپنی نئی ولی بیگم کے لئے، اس کے چاؤ پورے کرنے کے

لئے ہماری رقم درکار ہوتی ہوگی، بھلا ایسا کیونکر کر سکیں گے۔ جائیداد کہاں میرے نام کریں گے، آپ نے

ایک پائی دینے کے بھی روادار نہیں، اُس نے یوں اُن کی جانب دیکھا جیسے فیصلہ چاہ رہا ہو۔

اُسی وقت زینت کمرے میں آئی۔ دونوں کا انداز دیکھ کر فحش اور خاموش کھڑی ہو گئی۔

”مجھے تم سے ایسی اُمید نہیں تھی۔“

”غلط کیا کہا ہے میں نے، کیا اپنے حق کے لئے آواز اٹھانا بد تیزی ہے.....؟“

”تو میں نے کب تمہارا حق غضب کیا ہے، تم نے جو چاہا، ہمیشہ پورا کیا، پھر بھی ایسی بات کر رہے

ہو۔“

”تو آپ تم نہیں دیں گے، ہے ناں.....؟“ اِس وقت وہ بیٹا نہیں لگ رہا تھا، برابری پر اُترتا ہوا

لگ رہا تھا۔

شاہ جی کچھ کہنے والے تھے کہ زینت درمیان میں آگئی اور بولی.....

”شاہ جی، جو مانگ رہے ہیں یہ آپ دے کیوں نہیں دیتے.....؟“

”اُسے فضول خرچی کی عادت ہو چکی ہے۔ ہاتھ پیر ہلا کر کمانا پڑے تو سمجھ آ جائے۔“

”آپ دے دیں سب کچھ ان ہی کا تو ہے.....؟“ وہ رसान سے کہہ رہی تھی۔ شاہ جی ہنسنے سے

باہر نکل گئے۔

”آپے کھانا لگ گیا ہے۔“ زینت کے کہنے پر اسے آنا پڑا۔

شاہ جی اُس کی آمد سے پہلے ڈرائنگ ٹیبل پر موجود تھے، اسے دیکھ کر بولے.....

”تم تمہیں مل جائے گی مگر یاد رکھو آئندہ یہ لہجہ امت اختیار کرنا، مجھے بہت دکھ ہوا ہے۔“

”سوری بابا، میں شرمندہ ہوں..... اُسے رقم مل رہی تھی لہذا کیوں بحث کرتا اور یہ زمینوں

جائیدادوں کے چکر میں تونی الحال وہ خود بھی نہیں بڑنا چاہتا تھا۔

کھانا اچھا بنا ہوا تھا..... اُس نے تعریف بھی بہت کی۔ شاہ جی..... خاموشی سے کھانا کھاتے رہے

جبکہ وہ اور زینت باتیں کرتے رہے۔

شام کو اپنی بات منوا کر وہ زینت سے ملے۔ شاہ جی خامے مجھے مجھے سے تھے مگر اُس نے پروا نہ

کی۔

”واجدہ آپ کچھ روز سے آئیں نہیں..... وہ خیریت سے تو ہیں ناں.....؟“ کبیر حسن ناشی؛

جویریہ سے مخاطب تھے۔

”معلوم نہیں، میں کئی روز سے اُن کی طرف نہیں گئی۔“ جویریہ نے دھیرے سے جواب دیا۔

”تم کبھی آبا کی طرف نہیں جاتیں، یہ تو وہی ہیں جو ہماری طرف آتی رہتی ہیں..... اور ایک ایک کا

مال احوال دریافت کرتی ہیں۔ جویریہ بیگم! تم نے تو اپنی سی پوری کوشش کر لی تھی کہ میرا میری بہنوں سے

مٹا جتنا ہی ختم ہو جائے۔“

”یہ بات غلط ہے پیا..... ممالیسی نہیں ہیں، ہاں اُن لوگوں نے کبھی اتنی اہمیت نہیں دی۔ آتی ہیں تو

صرف بھائی سے ملنے۔“ مزید خاموش نہیں رہ سکا۔

”اہمیت..... کیسی اہمیت.....؟ یہ کیا کسی منشر کی بیٹی ہے، نوابزادی ہے، میں پوچھتا ہوں کیا حیثیت

ہے اس کی۔“

”انہوں نے چائے کا کپ میز پر بٹھا..... اور زہر خندانہ انداز میں جویریہ کو دیکھتے ہوئے بولے.....

”بیٹاؤ بیگم صاحبہ کون ہو تم.....؟ اگر اس گھر میں آکر ماضی کو فراموش کر چکی ہو تو میں یاد دلادیتا

ہوں، اس گھر کی بہن جو ہوم نہ چھپا کر ملک سے فرار ہو گیا ہے..... یہ تو ہم ہیں کہ یہ بات کھل چکنے کے بعد

بھی اسے اپنی عزت بنائے رکھا، نہ میں نے کبھی جتایا اور نہ ہی میری بہنوں نے، گھر میں جگہ دی اور عزت

بھی ورنہ آج کہاں ٹھکانا ہوتا اس کا۔“

”پیا پلیز.....“ رانچ نے ڈرتے ڈرتے استعفاء کی جبکہ مزید اپنی کرسی سے اُٹھ کر جویریہ کی کرسی

کے پیچھے آکھڑا ہوا اور ہاتھ جویریہ کے شانے پر رکھ کر اسے اپنے ساتھ کا احساس دلایا۔

”جویریہ بیگم آپا کے سامنے بات کرتے ہوئے ہمیشہ یہ یاد رکھنا کہ ان کا مقام میرے دل میں بہت

بلند ہے۔“

رانچ ناشا چھوڑ کر کمرے لے چلی گئی تھی۔

”ہم نے کبھی پھوپھو سے بدتمیزی نہیں کی۔“

”تم خاموش رہو مزید، مجھے اس عورت سے بات کرنے دو، ہاں تو جویریہ بیگم، آبا اور ان کے

بچے مجھے بہت پیارے ہیں، ابھی تو اُن سے ایک رشتہ ہے، کل رشتہ ڈھرا ہوگا، اُن کی بیٹی کو بہو بن کر

میرے گھر آتا ہے۔“

”نہیں.....“ جویریہ کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

”کیا مطلب ہے اس نہیں کا.....؟“ اُن کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور ششے کا گلاس فرش پر پٹختے

ہوئے غضب ناک لہجہ میں اس سے مطلب دریافت کیا۔

”بیب اولاد جو ان ہو جائے تو پھر فیصلہ اُس کی مرضی کے مطابق کرنا ہی اچھا رہتا ہے۔“ بات

مزید کی تھی، جس نے ہر معاملے میں ماں کا کھل کر ساتھ دیا تھا تو پھر وہ اُس کی خاطر کیوں نہ بولی۔

”تم یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو.....؟“ انہوں نے مزید کی طرف دیکھا اور ڈانٹ کر کہا۔

”پلیز پیا..... آپ کچھ تو خیال کریں، ماما بیمار ہیں۔“

”یہ تو سدا کی روٹی ہے..... میں نے کبھی..... صحت یاب ہوتے نہیں دیکھا..... تم جاؤ یہاں سے،

مجھے کچھ بات کرنی ہے۔“

”ہاں بیٹا..... تم جاؤ۔“ جویریہ کے کہنے پر وہ تھکے تھکے انداز میں باہر آیا اور دروازے کے ساتھ لگ

کچھ کراس کا دل بیٹھ گیا۔ مہاکس قدر پریشان اور تھکی تھکی دکھائی دے رہی تھیں۔ بھائی بھی خاموش سر جگائے بیٹھا تھا۔ پیاسہ سے لابلعل اخبار پر نظر نہ جمائے ناشتا کر رہے تھے۔
اس سے کچھ نہیں لیا گیا، ایسے ہی اٹھ کر کالج آگئی اور یہاں آکر بھی پیر پڑ نہیں لے۔ دل پر ابھرن ماری تھی۔ آج نورین بھی نہیں آئی تھی ورنہ اس سے کہہ کر دل کا بوجھ ہی ہلکا کر دیتی۔ فائزہ اور نبیلہ ساتھ تھیں۔ مگر ان سے اُس نے کچھ نہیں کہا کہ اس کے خیال میں شاید سن کر بھی اُس کی کیفیت نہ سمجھ پائیں۔
نورین عمر میں اُس سے بڑی تھی اور کچھ اُس کے خیال میں وہ ہمدرد اور مہربان لڑکی تھی۔
تین پیر پڑا بھی باقی تھے جب نورین چلی آئی۔

”اتنی دیر سے کیوں آئی ہو.....؟ میں صبح سے تمہاری منتظر تھی۔“ راتھ نے ملتے ہی شکوہ کیا۔
”تم ادھر کیوں بیٹھی ہو، آج پڑھائی کا موز نہیں ہے کیا.....؟“
”ہاں بس کچھ ایسی ہی بات ہے، دل نہیں لگ رہا یہاں اور میں گھر بھی نہیں جانا چاہ رہی، چتا نہیں مل کیا چاہتی ہوں.....؟“ راتھ کے انداز میں ٹھکن اور بے بسی تھی۔
”چلو چھوڑو، دفع کرو یہ سب اور میرے ساتھ چلو۔“
”تمہارے ساتھ مگر کہاں.....؟“

”بس جہاں میں لے چلو۔“ نورین نے فائل اُس کے ہاتھ سے لے لی۔

”مگر نورین.....“ اُس نے پس و پیش سے کام لیا۔

”ارے میں کوئی لڑکا تو ہوں جو تم کوں گھر لے رہی ہو۔ بس اب آ جاؤ، اطمینان رکھو، اغوا نہیں کر رہی۔“ وہ چلتے ہوئے بول رہی تھی، راتھ بھی ساتھ ساتھ تھی۔ نورین اپنی گاڑی میں کالج آتی تھی، اُسے گاڑی تک لائی اور بولی.....

”کالج ٹائم آف ہونے میں ابھی ڈیڑھ گھنٹہ باقی ہے، تم میرے گھر چلو، یہ وقت ہم وہاں گزاریں گے پھر میں تمہیں تمہارے گھر چھوڑ آؤں گی۔“ خلاف توقع راتھ نے فوراً اثبات میں سر ہلادیا۔

نورین کا ارادہ تو اُسے لے کر اپنے گھر جانے کا تھا مگر اپنے گھر سے کچھ ہی فاصلے پر اُس کا ارادہ بدل گیا۔
”کیوں نہ آج شاہ کو خوش کروا دیا جائے، وہ بھی کیا یاد کرے گا۔“ اُس کے لیوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔
اُس نے راتھ کی جانب دیکھا۔ وہ آنکھیں موندے سرایت کی بیک سے نکالے بیٹھی تھی۔ نورین نے خاموشی سے گاڑی شاہ کے گھر کے راستے پر ڈال دی۔

”یہ تم مجھے کہاں لے آئی ہو.....؟“ راتھ نے آنکھیں تب کھولیں جب وہ اسے اترنے کو کہہ رہی تھی۔
”ایسے ہی نہیں سر پرانز دینے کو جی چاہا تھا، تم آؤ تو سہی، جب یہ بات علم میں آئے گی کہ کس کا گھر ہے تو بے اختیار مجھے داد دو گی۔“

”آخر کوں رہتا ہے.....؟“ راتھ ابھ رہی تھی۔

”آؤ تو.....“ نورین نے دروازہ کھولا اور ہاتھ پکڑ کر اسے باہر کھینچ لیا۔

”تمہارے صاحب تو گھر پر ہیں ناں.....؟“ اُس نے چوکیدار سے پوچھا..... جواب اثبات میں ملنے پر بولی.....

”ہم ڈرائنگ روم میں ہیں، انہیں ذرا جلدی آنے کو کہو۔“

کر کھڑا ہو گیا۔

”آج جو بات تم نے بے بیٹے کے سامنے کی ہے، وہ دوبارہ مت دہرائنا۔“ یاد رکھو اس گھر میں بہتر کے علاوہ کوئی لڑکی میری بہو بن کر نہیں آسکتی۔“

”کیا فائدہ.....؟ آپ کی یہ ضد آپ کی بھانجی کی زندگی میں بھی زہر گھول دے گی۔“ جویریہ کی آواز دھیمی مگر لہجہ مضبوط تھا۔

”کیا مطلب ہے تمہاری اس بات کا.....؟“ مزید دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑا تھا مگر جویریہ اتنی دھیمی آواز میں بول رہی تھی کہ اسے اُس کی آواز نہیں آ رہی تھی البتہ باپ کی دھاڑ وہ بخوبی سن رہا تھا۔
”مطلب یہی ہے کہ مزید کو یہ رشتہ پسند نہیں ہے، وہ نہیں مانے گا۔“

”ہونہہ..... یہ سب تمہاری پڑھائی ہوئی پٹی ہے، اُسے کس طرح قائل کرنا ہے، یہ میں جانوں اور میرا بیٹا جانے، تم کون ہوتی ہو دخل دینے والی.....“

”آپ کچھ بھی کہیں مگر وہ میرا بیٹا ہے، رشتے صرف خون ہی کے نہیں، رُوح کے بھی ہوتے ہیں۔“
”ہوتے ہوں گے.....“ انہوں نے تیزی سے کہا..... ”مگر میرا فیصلہ اٹل ہے، اسے تم ماں ہونے کی دعویدار ہو کر بھی نہیں جھٹلا سکتیں۔“

وہ ناشتا مکمل کئے بغیر ٹیبل سے اٹھ کھڑے ہوئے اور ڈرائیو بعد آفس چلے گئے۔

راتھ اُن کے جانے کے بعد اپنے کمرے سے نکل کر لاؤنج میں آئی تو اپنی ماں اور بھائی کو پریشان پایا۔
”کیا ہوا.....؟“ اُس نے فکر مندی کے عالم میں دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”کچھ نہیں..... تم جاؤ یہاں سے.....“ جویریہ نے اُسے دیکھ کر سنبھلنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔
”مما..... اگر پیانے سختی کی تو میں گھر چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔“ مزید پر غصہ اور بغاوت سوار تھی۔

”ایسی باتیں مت کرو، خدا سے اچھی امید رکھو، کوئی نہ کوئی رستہ نکل ہی آئے گا۔“ وہ اُس کی بات پر بہت فکر مند ہوئی تھی اور سمجھا رہی تھی۔

”بہن کی محبت میں انہیں کچھ دکھائی نہیں دے رہا، یہ بھی نہیں دیکھا کہ وہ کس نیچر کی لڑکی ہے، اُس نے تو کبھی اپنی ماں کی بات نہیں مانی، باپ کو خاطر میں نہیں لاتی، ہمیشہ من مانی کرتی ہے اور ہمارے پیار جان پر ایک ہی ذہن سوار ہے، بہو بنائیں گے تو مہناڑ کو..... ہونہہ! بیٹا ہوگا تب ہی بہو آئے گی ناں۔“

”اوہو..... مزید کیوں اپنا جی جلا رہے ہو..... کچھ نہیں ہوگا، تم پریشان مت ہو۔“ جویریہ بار بار سمجھا رہی تھی۔

”مما..... میں نے وعدہ کر رکھا ہے سو باسے، وہ کیا سوچے گی اور اُس کی آئی، انہیں تو پہلے ہی اعتبار نہیں تھا مگر سوہانے میرا یقین کیا ہے، مہا میں یہ یقین توڑنا نہیں چاہتا۔“ اُس نے بے بسی کے احساس تلے دب کر سر ہاتھوں میں گرا لیا۔

رات کو کبیر حسن دیر سے گھر آئے تھے اور آتے ہی سو گئے تھے، ان سے اس موضوع پر کسی کی بات نہیں ہو سکی۔

صبح ناشتے کی ٹیبل پر ایک بار پھر سب موجود تھے۔ راتھ کو ان سب سے پہلے صبح جلدی جانا ہوتا تھا۔

وہ تیار ہو کر اس امید پر آئی تھی کہ کل کی رخصت کے تمام نشان اب تک مٹ چکے ہوں گے مگر ہنوز وہی کیفیت

”میں تو جہیں ڈھونڈنے لگی تھی اور تم یہاں پہنچ گئے ہو۔“

رائحہ اُسے دیکھتے ہی اُس کی جانب لپکی اور بازو پکڑ کر بولی۔
”چلو نورین۔“

”رائحہ..... یہ کیا حرکت ہے؟“ نورین نے آنکھوں میں سرزنش کی اور ہولے سے
ڈانٹ بھی ملا دی۔

”میں واپس جانا چاہتی ہوں۔“ رائحہ نے اُس کے سمجھانے کو نظر انداز کر کے اپنی بات دہرائی۔
”آپ دونوں میں لڑائی ہوئی ہے شاہ.....؟“ نورین پوچھ رہی تھی۔

”ہم اور ان سے لڑائی کر لیں..... ایسی جال کہاں، ہاں اگر نادانستی میں انہیں کسی شکایت کا موقع
دے بیٹھے ہیں تو اس کے لئے معذرت خواہ ہیں۔“

”لو، اب تو بیٹھ جاؤ..... اتنے غرے بھی اچھے نہیں ہوتے۔“ نورین اُسے بازو سے پکڑ کر لائی اور
صوفے پر ڈھکیل دیا۔ پھر ادشیر سے بولی۔

”شاہ..... برا مست منانا..... میں تمہارے بکن پر چھاپہ مارنے جا رہی ہوں، سچ بھوک بہت ستا
رہی ہے..... اور سنو پلیز میری دوست کو ستانا مت۔“

نورین کے جانے کے بعد ادشیر خاموش کھڑا سر جھکا کر بیٹی اس لڑکی کو دیکھتا رہا۔ نگاہوں کی تپش کو
محسوس کر کے رائحہ نے سر اٹھایا پھر اُس کو خود پر اس قدر متوجہ پا کر زور سا کسمپاسی اور دوبارہ سر جھکا لیا۔

”کیا بات ہے رائحہ؟“ ناراض کیوں ہو مجھ سے؟“ خلاف توقع آج اس کا لہجہ بہت ستھرا
اور دوستانہ تھا۔ وہ آکر اُس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا اور اُس کے بولنے کا انتظار کرنے لگا۔ وہ
چپ رہی تو بولا۔

”آج میرا دل بہت اُداس ہے، میں کسی اپنے سے ملنا چاہتا تھا، خوشی ہوئی کہ تم آ گئیں۔“

”آپ پریشان کیوں تھے؟“ وہ شائستگی سے بولا تو رائحہ کا دل جو پہلے ہی اُس کے نام کی دہائی
دیتا تھا، اُس کے لئے پریشان ہونے لگا۔

”پتا نہیں یا رگر مجھے لگتا ہے، کچھ ہے ضرور، شاید میری زندگی میں کوئی بڑا حادثہ رونما ہونے والا
ہے، سوتا ہوں تو ایسے ایسے خواب آتے ہیں کہ پریشانی ہونے لگتی ہے اور پھر میرا دل بھی یہی کہہ رہا ہے۔“

”پلیز شاہ ایسی باتیں مت کریں، کچھ نہیں ہوگا آپ کو، آپ ہمیشہ خوش رہیں گے۔“

اپنے لئے اس کی پریشانی اور تڑپ دیکھ کر ادشیر کو کہاں خوشی ہوئی، وہاں ایک خوشگوار حیرت نے
بھی آگن گھیرا۔ یہ لڑکی اتنا چاہتی ہے مجھے مگر پھر زور کیوں بھارتی ہے۔ اُس دن جس طرح دامن چھڑا کر
چلی گئی تھی۔ اردشیر کو غصہ آیا تھا اور سوچا تھا اب ملے گی تو اس کا رویہ مختلف ہوگا مگر سامنے آئی تو سب بھول
گیا۔ اسے دیکھ کر زور تک سرشار ہو گئی۔

”آپ خوش رہا کریں۔“ وہ سمجھا رہی تھی۔
”خوش تو رہتا ہوں۔“

”تو پھر ایسی باتیں اور یہ پریشانی کیوں؟“

”اوہ یار..... ابھی سوکر اٹھا ہوں ناں اور خواب بھی کچھ ایسا دیکھا ہے، ہر روز کی طرح.....“

وہ اسے ساتھ لئے اندر آگئی اور بولی۔

”یہ اپنے شاہ کا گھر ہے۔ کب خوشی ہوئی ناں یہ بات سن کر؟“

”نورین..... تم مجھے یہاں کیوں لے آئی ہو.....؟“ وہ گھبرا کر کہہ رہی تھی۔

”کیا بات ہے، تمہیں یہاں آنا اچھا نہیں لگا۔ دل میں تو ضرور خوش ہوگی مگر مجھ پر ناراضگی
تو ضروری ہے۔“ نورین کچھ ناراض ہو گئی تھی۔

”نہیں..... مجھے یہاں آنا بالکل بھی اچھا نہیں لگا۔“ اسے پچھلی ملاقات پر اردشیر کا رویہ یاد تھا۔
روٹی تھی وہ اُس روز کی ملاقات کے بعد، شاہ ایسے بھی ہو سکتے ہیں۔ وہ اتنی سطحی گفتگو بھی کر سکتے ہیں۔

نے کب یہ سوچا تھا، بہت ڈکھ پہنچا تھا اُن کے اُس روز والے رویے سے۔
دل کی آواز پر کان نہ دھرتے ہوئے فیصلہ کیا تھا اب شاہ سے نہیں ملے گی مگر آج نورین بتائے ہوئے

اسے اُس کے گھر لے آئی تھی۔
”میں اُن سے ملنا نہیں چاہتی..... پلیز چلو یہاں سے۔“ لرزتے لبوں کے ساتھ اُس نے یہ بات

کہی تھی۔
”اوہ اچھا..... مجھے پہلے بتایا ہوتا، خیر اب بھی کچھ نہیں بگڑا، میں دیکھ کر آتی ہوں۔ اگر وہ ادھر نہیں

آ رہا تو ہم چپکے سے نکل جاتے ہیں۔“
دل ہی دل میں ہنسی نورین اسے بیٹھنے کو کہہ کر بیاہر نکل گئی تھی۔

رائحہ بیٹھی نہیں، اسے جانے کی بہت جلدی تھی، چاہتی تھی جو نبی نورین آئے وہ یہاں سے نکل
جائے۔ مگر نورین نے اُس کے انداز سے کھین زیادہ دیر لگا دی۔

وہ سوچ رہی تھی کہ اُسے خود جا کر گاڑی میں بیٹھ جانا چاہئے۔ اسی وقت دروازہ کھلا۔ اُس نے اکر
امید پر دیکھا کہ نورین آئی ہوگی مگر آنے والا اردشیر تھا۔

اسے سامنے دیکھ کر وہ ٹھٹکا کلازم نے دو مہمان خواتین کی آمد کی اطلاع دی تھی، یہ تو نہیں بتایا تو
کہ کون آیا ہے۔

”رائحہ تم اور یہاں.....؟“ حیرت زبان پر آگئی۔
”نورین کہاں ہے؟“ رائحہ بے اختیار یہی کچھ پیچھے ہٹ گئی۔ حالانکہ ان دونوں کے درمیان

بہت فاصلہ تھا۔ وہ تو ابھی دروازے سے اندر داخل ہوئی تھا اور وہ سینئر نیل کے قریب کھڑی تھی۔
”اچھا..... تو تم نورین کے ساتھ آئی ہو۔“ وہ یہ کہتا ہوا آگے بڑھا۔ رائحہ خوفزدہ نظروں سے اُس کی

جانب دیکھ رہی تھی۔
”بیٹھو پلیز، کھڑی کیوں ہو.....؟ میں بتا نہیں سکتا، تمہیں یہاں دیکھ کر مجھے کتنی خوشی ہو رہی ہے

تمہیں کیسا لگ رہا ہے میرے پاس آنا.....؟“
”مجھے نورین یہاں لے آئی ہے بتائے بغیر۔“

”نورین کا بہت شکریہ۔“ وہ ہنس پڑا تھا۔
”بیلو شاہ.....“ نورین نے اندر آتے ہی اسے دیکھا تو گرجوٹی سے کہا پھر رائحہ پر نظر پڑی تو توجہ

یاد آیا..... اور وہ بولی۔

رام سے اس کی بات مان جائیں گے..... اور جانے کی اجازت بھی مل جائے گی۔ اُس نے حیران ہونے میں وقت ضائع نہیں کیا، جلدی سے اوپر آگئی۔

وہ اندر آئے تو مزید اور رات کو موجود پایا، نہبت والی اُلجھن ذہن پر سوار تھی، اُن کے سلام کا سر کے اشارے سے جواب دیا اور اپنے کمرے میں چلے آئے۔

”موڈ ابھی تک خراب ہے، کئی وقت بھی یہاں آکر ڈانٹ ڈپٹ کر سکتے ہیں۔“ یہ سوچ کر رات کو نے اپنی کتابیں میٹیں اور اپنے کمرے میں چلی آئی۔

مزید بیوی آن کر کے بیٹھ گیا..... مگر دھیان میں سوہا تھی۔ جب سے پیانے اُس کی اور مہنا زکی ٹادی کا ارادہ ظاہر کیا تھا، وہ سوہا کی طرف نہیں گیا تھا۔ سوچا تو کئی بار مگر یہ خیال بار بار پاؤں جکڑ لیتا کہ

یہی صورت حال میں اس سے کیا بات ہو سکے گی، آنٹی پوچھیں گی..... ”تمہارے گھر والوں کی کیا رائے ہے۔ تمہاری ماما تو دوبارہ آنے کا کہہ کر گئی تھیں، پھر آئیں کیوں نہیں.....؟“

مگر ابھی ابھی اُس نے فیصلہ کیا، صبح ضرور اس سے ملے گا۔ وہ تو پہلے ہی کہتی تھی..... ”تم خواہ مخواہ ی اتنا آگے بڑھ رہے ہو، تمہارے گھر والے کبھی نہیں مانیں گے۔ تمہیں مجھ سے معذرت کرنا پڑے گی۔“ اب تو کیا یقین کر لیا ہوگا کہ گھر والے نہیں مان رہے۔ ”میں اسے دھوکا نہیں دے سکتا۔ چاہے کچھ بھی

ہو جائے، میں شادی سوہا سے ہی کروں گا۔ پیانے اس غلط فیصلے کے آگے سر نہیں جھکاؤں گا۔“

خیال تھا کہ صبح آفس ٹائم سے پہلے ہی اُس کے آفس چلا جائے گا۔ وہ عام طور پر جلدی آچاپا کرتی تھی۔ اس وقت ملنا ہی مناسب تھا۔ گھر وہ جانا نہیں چاہتا تھا کہ آنٹی کے سوالات کے جوابات فی الحال اُس کے پاس نہیں تھے۔

رات بھر سوچوں میں گھبرا رہا۔ پایا کو مٹاؤں تو کس طرح..... یہ اُلجھن اُسے پریشان کرتی رہی۔

مگر دیر سے آنکھ کھلی۔ سوچا چلو آفس ٹائم آف ہونے پر مل لوں گا۔

وہ بیٹن منٹ پہلے ہی آکر اس بلڈنگ کے باہر کھڑا ہو گیا۔ سوہا اُسے دیکھ کر جہاں خوش ہوئی، وہاں بیگی پوچھ ڈالا کہ ”تم نے دن غائب کہاں رہے ہو.....؟“

”تم نے تو فوراً یہ سمجھ لیا ہوگا کہ بھاگ نکلا ہوں، اب نہیں آؤں گا۔“

سوہا ہنس پڑی، پھر بولی.....

”ج کھوں تو میرے دل میں ایک بار بھی یہ خیال نہیں آیا۔“

”اس اعتبار کا شکریہ..... اور سناؤ آنٹی کیسی ہیں.....؟“

وہ دونوں باتیں کرتے کرتے پیدل روڈ تک آ رہے تھے۔

”یہ تو وہی لڑکی ہے یا سبین بیگم کی بھانجی اور ساتھ میں جولا کا ہے، اسے پہلے بھی اس کے ساتھ دیکھ

اس لئے ذہن پر بوجھ ہے۔ تھوڑی دیر بعد سب بھول بھال جاؤں گا۔“

”اب سو کر اٹھے ہیں.....؟“ اُس نے حیرت سے اُسے دیکھا۔

”ہوں..... رات کو لیٹ گھرا یا تھا پھر بڑی ماں کا فون آ گیا، اُن سے باتیں ہوتی رہیں، پس درہم برہم.....“

پھر اس سے بولا..... ”تم اپنی سناؤ آج ہم کافی دنوں کے بعد مل رہے ہیں اور میں دیکھ رہا ہوں کہ

خاصی کمزور ہو رہی ہو، کیا بیمار رہی ہو.....؟“

وہ گھر کے حالات کی وجہ سے پریشان رہی تھی، نہ کچھ کھا سکی، نہ آرام ٹھیک سے ہو سکا، اثرات چہرے پر آگئے تھے اور اردو شیرے منتی جلدی پہچان لیا..... اور رات کو ابھی ابھی سی تھی، رو پڑی۔

”ارے کیا ہوا.....؟“ وہ گھبرا کر اپنی جگہ سے اٹھا اور اُس کے قریب آکر سر تھپکتے ہوئے بے تابی سے پوچھنے لگا۔

”میں بہت پریشان ہوں، نورین سے کہہ دوں گی۔ شاید کہہ دینے سے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے۔“

”تم مجھ سے کہنا، آخر کیا ہوا.....؟ کیوں روئی ہو تم.....؟“

”مجھے اپنی ماں سے بہت محبت ہے، میرے لئے تو باپ بھی وہی ہیں اور ماں بھی وہی، پیانے تو

کبھی مجھ سے پیار نہیں کیا، وہ بہت سخت طبیعت کے مالک ہیں..... ماما یا رات ہی ہیں مگر انہیں پروا نہیں

ہوتی..... اُن کا رویہ ماما کے ساتھ بہت خراب ہے اور اب کچھ دنوں سے ماما اور بھیا بہت پریشان ہیں مگر

میرے پوچھنے پر بھی مجھے کچھ نہیں بتاتے، ٹال جاتے ہیں۔ انہیں پتا نہیں میں ان کی خاموشی سے کیے

وہوں کا شکار ہو رہی ہوں، اُلجھ کر رہ گئی ہوں..... مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں پیام کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ

نہیں رہے، اگر ایسا ہے تو.....“ اُس کے رونے میں اور بھی شدت آگئی۔

اس مسئلے پر وہ بھلا کیا مدد کر سکتا تھا، یہی جانتا تھا خالی خالی ہمدردی سے وہ پہلے کی نہیں فہم اٹا بولا.....

”اتنا جانتی ہو اپنی ماما اور بھیا کو.....؟“

”بہت..... اس سے کہیں زیادہ.....؟“

”تو پھر دل میں کسی نئے فرد کی گنجائش ہے کیا..... ہوں بولناں.....؟“

ایسی بات کی توقع اس وقت کہاں تھی..... چونکہ اسے دیکھا پھر شرما کر فوراً سر جھکا لیا۔

رات دس بجے کے قریب کبیر حسن گھر سے چند گز کے فاصلے پر تھے۔ انہوں نے گیٹ کے سامنے ٹیکسی رُکتے اور واجدہ آپا کی بڑی بیٹی نہبت کو نہ صرف دیکھا بلکہ اچھی طرح پہچان بھی لیا۔ جب تک کہ

کرایہ دے کر فارغ ہوئی۔ ان کی گاڑی گیٹ پر پہنچ چکی تھی۔ نہبت انہیں دیکھ کر کچھ گھبرائی پھر جلدی سے اندر چلی گئی۔

”ظہر جاؤ نہبت، میری بات سن کر جانا۔“ ماموں جان کی آواز پر اس کے بڑھتے قدم ٹک گئے۔

”کہاں سے آ رہی ہو اس وقت.....؟“ وہ اس کے سامنے آکھڑے ہوئے۔

”ماموں جان! میری ایک سہیلی بیمار ہے، اُس کی طرف گئی تھی، واپس پر درہم برہم.....“

”اب تک اپ ایسے کہنے سے کیا واقعی وہ بیمار سہیلی کی عیادت کو گئی تھی۔“

”مجھ گئے بہانہ بتا رہی ہے مگر کچھ سوچ کر اثبات میں سر ہلا دیا۔ نہبت کو اُمید نہیں تھی کہ وہ اتنے

”کون..... کون یا آتا ہے؟“ عمر نے نرمی سے پوچھا۔
 ”وہ جو دنیا کی بھیڑ میں مجھ سے بچھڑ گیا، مجھے لگتا ہے اب کبھی نہیں ملے گا مگر مزید میری آس کو
 نے نہیں دیتا، شاید اس لئے کہ وہ جانتا ہے جس روز یہ آس ٹوٹ گئی، میں مر جاؤں گی۔ بہت بیمار کرتا
 ہے مجھ سے، مجھے کھانا نہیں چاہتا۔“ جویریہ آنکھ میں آئے ہوئے آنسوؤں کو چہرہ جھکا کر اُس سے
 چھانے کی کوشش کرنے لگی۔
 ”پلیز آئی..... روئیں تو نہیں.....“ اس کے آنسو عمر کے دل پر گر رہے تھے۔

”سوری..... میں نے تمہیں بھی اُداس کر دیا۔“ وہ مسکراتے کی ناکام کوشش کے درمیان بولی۔
 ”آئی پلیز..... آپ اپنا خیال رکھا کریں، مزید بھائی بتاتے ہیں، آپ اکثر بیمار رہتی ہیں۔“
 ”اگر مزید اور رات نہ ہوتے تو میں یہ زندگی ختم کر لیتی..... اور عمر، اب تو تم بھی مجھے زندگی کی
 طرف بلا رہے ہو۔“

”ممائی..... مزید کہاں ہے؟“ مہنا نے پردہ ہٹا کر اندر جھانکا..... اور مہمان کی موجودگی کو
 بکھر نظر انداز کرتے ہوئے جویریہ کو مخاطب کیا۔
 ”مزید تو گھر پر نہیں ہے، کیوں تمہیں کوئی کام تھا اس سے؟“ جویریہ پوچھ رہی تھی۔

”مہنا کے چہرے کا زاویہ بگڑ گیا، تنک کر بولی۔
 ”آخر وہ رہتا کہاں ہے آج کل..... جب بھی آکر پوچھتی ہوں، یہی جواب ملتا ہے کہ گھر پر نہیں
 ہے۔“ اُس کے انداز میں رکھائی اور جھلا ہٹ تھی۔
 جویریہ اب بھلا جواب میں کیا کہتی..... مہنا نے کچھ لمحے توقف کے بعد عمر کی جانب دیکھا اور
 بولی۔

”یہ کون ہیں؟“
 ”یہ عمر ہے.....“ جویریہ کو اس کا انداز اچھا نہیں لگ رہا تھا، جواب دینے کو ہی نہیں چاہ رہا تھا مگر
 خاموش رہی تو وہ جا کر ماں سے کہتی اور پھر بات کہاں سے کہاں پہنچ جاتی۔
 ”مزید کے ملنے والے.....؟“ اُس نے پھر پوچھا۔

جویریہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
 ”اچھا..... اب ایسا نہ ہو کہ وہ آئے اور ان کے ساتھ چل پڑے، کہنے گا مجھ سے مل کر جائے، میں
 پہلے بھی آپ کو کہہ کر گئی تھی مگر لگتا ہے آپ نے کہنے کی زحمت ہی نہیں کی۔“
 ”میں نے اُسے بتا دیا تھا اگر وہ نہ ملنا چاہے تو میں زبردستی تو نہیں کر سکتی۔“
 ”کیوں، وہ بھلا کیوں نہیں ملنا چاہے گا؟“ انداز میں سراسر بدتمیزی تھی۔
 جویریہ اسے نظر انداز کر کے عمر سے چائے کے لئے پوچھنے لگی۔

”نہیں آئی..... اب میں چلتا ہوں۔“ وہ جویریہ سے بہت سی باتیں کرنا چاہتا تھا مگر مہنا زبانی
 بندھ گئی تو وہ واپسی کا ارادہ کرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس لڑکی پر غصہ بھی آ رہا تھا۔ کتنی بدتمیزی سے آئی کو
 مخاطب کرتی تھی۔

جویریہ نے نرکتے کو کہا بھی مگر وہ پھر آنے کا کہہ کر چلا آیا۔

”مزید بھائی تو گھر پر ہیں ناں.....؟“ عمر نے یہ بات ڈرائنگ روم میں آنے کے بعد پہنچ
 تھی صرف اس لئے کہ اگر وہ گھر پر نہ ہو تو بھی اس کی والدہ سے ملے بغیر واپس نہ ہونا پڑے۔

”وہ تو گھر پر نہیں ہیں صاحب.....“

”اچھا..... اور ان کی والدہ.....؟“

”ہاں جی، وہ تو ہیں..... میں بلاتی ہوں انہیں۔“

ملازمہ جویریہ کے کمرے میں عمر کی اطلاع دینے آئی تو وہ دوا لے رہی تھی۔

”وہ جی چھوٹے صاحب کے دوست آئے ہیں، عمر نام بتاتے ہیں، میں نے ڈرائنگ روم میں بلا
 دیا ہے انہیں اور بتایا ہے کہ چھوٹے صاحب تو گھر پر نہیں ہیں۔“

”تم نے کہہ دیا، وہ گھر پر نہیں ہے۔“ جویریہ گلاس سائینڈ ٹیبل پر رکھ کر تیزی سے اٹھی اور ننگے پاؤں
 ہی ڈرائنگ روم کی طرف چل دی۔ اسے اندیشہ جو تھا کہ مزید کی غیر موجودگی کا سن کر عمر واپس نہ
 جائے۔

وہ جب اندر داخل ہوئی تو اُس کا سانس ہموار نہیں تھا۔ دوپٹہ سنبھالتے ہوئے اور اسے پکارنے
 ہوئے اُس نے تیزی سے دروازہ کھولا۔

اس کی حالت دیکھ کر عمر گھبرا گیا اور پریشان نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

”اوہ.....“ جویریہ کو اپنی دیوانگی کا احساس ہوا، مسکرانے کی ناکام کوشش سے خفت مٹانے کی کوشش کی
 اور اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے خود بھی بیٹھ گئی۔

”آپ ٹھیک تو ہیں ناں.....؟“ عمر لگہ مندی سے پوچھ رہا تھا۔

جویریہ نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا، بیاسی نگاہ اس پر جما کر بولی۔

”کیا تم بھی یہاں سے جانے کے بعد مجھے یاد کرتے ہو.....؟“

”آپ مجھے یاد کرتی ہیں.....؟“

وہ جواب دینے میں ہچکچاہٹ محسوس کر رہا تھا، کیسے بتاتا آپ میری سوچوں پر میرے ذہن پر؟
 گئی ہیں، میرا جی چاہتا ہے آپ سے ملاقات کی ہر بات ہر ایک کوسناؤں، سب کو بتاؤں میں آپ سے
 کر رہا ہوں۔ مگر وہ ان سب باتوں کو زبان پر نہ لاسکا۔

”میں تو تمہاری آمد کی منتظر رہتی ہوں بیٹے، تمہیں دیکھ کر مجھے کوئی اپنا یاد آتا ہے۔“

”نہیں جویریہ، میرا خیال ہے وہ کسی کو بھی بتا کر نہیں جاتی، نہ آپا کو اور نہ ہی اپنے باپ کو..... اور پتہ تو یہ ہے کہ گھر کے معاملات میں دلچسپی نہیں لیتا، سب کچھ بے چاری آپا کے سر پر ڈال رکھا ہے، وہ بھانپ لے گا تو اسے نہ پڑھنے سے دلچسپی ہے، نہ کوئی سروس کرنا چاہتا ہے اور اب یہ نزہت، پتا نہیں یہ لڑکی سن رہی ہے یا چل نکلی ہے۔ یوں تو آپا کے لئے بڑی مشکل ہو جائے گی۔“

وہ کیا جواب دیتی ان کی باتوں کا..... واجدہ آپا کا ذکر آیا تو اسے وحشت ہونے لگی۔ کیا خبر نزہت درمیان کی باتیں کرتے کرتے انہیں مہناز بھی یاد آجائے اور ابھی ابھی کر ڈالیں کوئی فیصلہ۔

”کھانا تیار ہونے میں کتنا ٹائم ہے.....؟“ وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور کوٹ اتار کر اسے پکڑاتے ہوئے پوچھا۔

”بس پندرہ بیس منٹ مزید لگیں گے۔“

”ٹھیک ہے، پھر میں کھانا کھا کر ہی آپا کی طرف جاؤں گا، میرا خیال ہے بھائی صاحب اس وقت گھر پر ہی ہوں گے، ساری بات اُن کے سامنے ہو جائے تو اچھا ہے۔“

”کیسی بات.....؟“ جویریہ نے بے حد پریشان ہو کر اُن کی طرف دیکھا (اُس کے حواسوں پر مہناز ہوا تھا)۔

”نزہت کی بات..... اور کیسی بات.....“ انہیں اس کے یوں چونکنے اور گھبرا کر پوچھنے پر حیرت ہوئی۔

جویریہ نے گھر سانس کھینچ کر اثبات میں سر ہلا دیا اور بولی.....

”آپ ضرور بات کریں ماں باپ کو اولاد کی سوچ اور اس کے معاملات سے ضرور آگاہ ہونا چاہئے اور میرا آپ کو بھی مشورہ ہے کہ آپ مزید سب سے بھی بات کریں، وہ بھی تو بیٹا ہے آپ کا۔“ جویریہ نے اندر سے کانپتے ہوئے مگر بظاہر بڑی ہمت سے کہا تھا۔

”مزید بے وقوف ہے۔ اسے ابھی کچھ نہیں پتا صرف جوانی کا جوش ہے پاگل پن ہے اور بس.....“

”شاید آپ ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں۔ مگر اس کی بات سننا، غلط ہو تو پیار سے سمجھانا تو آپ کا فرض ہے۔ دیکھیں ناں، ایک ہی تو بیٹا ہے ہمارا، ہمیں توجہ دینی چاہئے اس پر، یوں تو وہ ہم سے دور ہو جائے گا۔“

”ٹھیک ہے کھانا لگاؤ، پھر میں آپا کی طرف سے ہواؤں بعد میں مزید سب سے بات بھی کر لیں گے، پتہ نہیں گے اس سے بھی کہ کیا مسئلہ ہے اُس کے ساتھ۔“ خلاف توقع آج اُن کا موڈ بہت بہتر تھا۔

”نورید کو بہت اطمینان ہوا۔ کچن میں جانے سے پہلے مزید سب سے پاس چلی آئی۔

”سنو بیٹا..... تمہارے بابا مہناز کے سلسلے میں تم سے کچھ بات کریں گے، تم پورے اعتماد سے اُن کے سامنے بات کرنا، ان پر واضح کر دینا کہ مہناز تمہیں کیوں ناپسند ہے لیکن دیکھو اس ساری گفتگو میں ابھی کہا کا ذکر نہیں آتا چاہئے، معاملہ بگڑ بھی سکتا ہے۔“

کھانا کھا کر پہلے تو خود واجدہ کی طرف جانے کا ارادہ تھا پھر کچھ سوچ کر انہیں اپنے ہاں بلو یا۔

”واجدہ کے شوہر گھر پر نہیں تھے، واجدہ اکیلی ہی آگئیں۔

”پتا نہیں آئی کیا کہنا چاہ رہی تھیں مگر اس بد مزاج لڑکی کی وجہ سے بات اُدھوری رہ گئی۔“ اسے خاصا غصہ آتا رہا مہناز پر۔

کبیر حسن رات کے آٹھ بجے اپنے معمول سے ہٹ کر آج جلدی گھر آ گئے۔ نزہت اس وقت پوری تیاری کے ساتھ باہر جانے کے ارادے سے نیچے اُترتی تھی۔ انہیں دیکھا تو بل دوپل کے لئے کھڑی پھر واپس جانا چاہا مگر وہ دیکھ چکے تھے۔

”نزہت.....“ انہوں نے پکارا تو زکنا پڑا۔

”جی ماموں.....“ وہ سر جھکائے ہوئے تھی اس کوشش میں کہ ماموں اس کا ڈارک میک اپ نہ دیکھ سکیں۔

”کہاں جا رہی ہو اس وقت.....؟“ رسلٹ واضح پر نگاہ ڈالتے ہوئے انہوں نے سختی سے پوچھا۔

”ماموں..... وہ اصل میں میری ایک دوست کی شادی ہے، مجھے وہاں جانا تھا۔“

”اکیلی جا رہی ہو، باپ یا بھائی سے کہیں، تمہیں ڈراپ ہی کر دیتے۔“

”وہ دونوں گھر پر نہیں ہیں۔“

”مزید سے کہہ دیتیں.....“ اُس کا انداز بتا رہا تھا، سچ یہ نہیں جو کہہ رہی ہے۔

”میں اکیلی جا سکتی ہوں اس لئے خواہ مخواہ اسے ڈسٹرب کرنا اچھا نہیں لگا۔“

”چلو آؤ، میں چھوڑ دیتا ہوں، کہاں جانا ہے تمہیں.....؟“

اُن کی بات پر نزہت نے ایک دم سے چہرہ اوپر اٹھا دیا۔

”نہیں..... ماموں..... میں سوچ رہی ہوں اب تو بہت دیر ہو گئی ہے، کیا فائدہ جانے کا.....؟“

اتنا کہہ کر کبیر حسن کو مزید کسی بات کا موقع دینے بغیر وہ تیزی سے مڑی اور پھر سیڑھیاں طے کر کے اوپر چلی گئی۔ کچھ دیر وہیں کھڑے وہ سوچتے رہے پھر اندر آ گئے۔

جویریہ یہ کچن میں کھانا بنا رہی تھی۔ فارغ ہوتی تو طرح طرح کی سوچیں پریشان کرتی تھیں سواب خود کو مصروف رکھنے کے لئے کچن کا بہت سا کام خود کیا کرتی تھی۔

”ماں کہاں ہے تمہاری.....؟“ انہوں نے ٹی وی لگا کر بیٹھے مزید سب سے پوچھا۔

”شاید کچن میں ہوں گی۔“ ٹی وی آف کر کے اُس نے تھکے تھکے انداز میں کہا۔

انہوں نے زک کر اُس کی طرف دیکھا۔ کچھ کہنا چاہا، پھر ارادہ ترک کر کے باہر آ گئے۔

جویریہ یہ چاول بنا کر فارغ ہوئی تھی۔ انہیں آتے دیکھ کر سلام کیا، پھر چائے کا پوچھا تو وہ انکار کرتے ہوئے بولے.....

”مجھے تم سے کچھ بات کرنا ہے، کیا تم اس وقت فارغ ہو.....؟“

”یا اللہ خیر..... اب کیا کہنے والے ہیں یہ.....“ اُس نے ڈرتے ڈرتے اُن کی جانب دیکھا۔

چہرے سے موڈ کا انداز نہیں لگا سکی، اُن کے پیچھے پیچھے چلتی کرے تک آ گئی۔

کمرے میں آ کر وہ بیڈ پر بیٹھ گئے..... اور اسے بھی بیٹھے کا اشارہ کیا..... اور بولے.....

”نزہت کے بارے میں علم ہے یہ لڑکی آج کل کہاں آتی جاتی ہے.....؟“

”جی، میں تو کچھ نہیں جانتی، وہ اپنی امی کو بتا کر جاتی ہوگی۔“

مگر مہناز نے کوئی نوٹس نہیں لیا۔ "نیازی سے ہاتھ میں اخبار پکڑے پھر سے صوفے پر جا بیٹھی

ہاں، ہوں تو میں ماموں کی لاڈلی، اس میں بھلا کیا ٹنک ہے، مگر تم کیوں جلتے ہو.....؟"

"تو جاؤ جا کر اسے ماموں کے پاس بیٹھو، میرا سر کیوں کھا رہی ہو، ساری زندگی ہم پر مسلط رہے مجھے یاد نہیں پڑتا، کبھی ہمارے باپ نے ہم لوگوں کو پہلے اور تم لوگوں کو بعد میں دیکھا ہو، وہ ہمیشہ ہم پر نفرت دیتے رہے ہیں۔ یہ گھر ماما کا تھا مگر حکمران پھوپھو ہی ہیں مگر اب یہ سب کچھ مجھ سے نہیں ہوتا۔"

وہ اخبار بھینک کر اٹھ کھڑی ہوئی، اس کے سامنے آ کر بولی..... "اگر ماموں نے یہ سب کیا ہے تو میں ہمارا کیا قصور ہے.....؟ یہ سب کچھ تمہاری اس چیتنی ماں کی وجہ سے ہوا ہے، جس نے ہمارے کی زندگی خراب کر دی ہے، گھر کو گھر بنایا ہی نہیں، بس ان ہی کوششوں میں لگی رہیں کہ کسی طرح ان کو ان کی بہنوں سے دور کر دیا جائے۔ بھانجیوں کے خلاف نفرت پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہوں مگر رزلٹ اس کے خلاف نکلا۔"

"شٹ اپ..... ماما کا نام درمیان میں مت لاؤ، میں خوب جانتا ہوں، کس نے کس کے خلاف نہ پھیلائی، اور عرس نے کس کو ڈور کرنا چاہا، اگر ہم چپ ہیں تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ کچھ جانتے بھی

نہیں۔" کیا ہوا تم لوگوں کو.....؟" ان کی آوازیں یقیناً کبیر حسن اور واجدہ تک پہنچی تھیں جو وہ یہاں آئے اور انہیں اس موڈ میں دیکھ کر حیرت سے پوچھ رہے تھے۔

مہناز نے جو بچی ماموں کو دیکھا، دوڑ کر ان کے پاس گئی اور ان سے لپٹ کر ڈھواں دھار طریقے پر انداز شروع کر دیا۔

"مزید..... کیا کہا ہے تم نے مہناز کو.....؟" انہوں نے بیٹے کو کڑی نظروں میں رکھ کر شدید لہجہ

باز کیا۔ "اس نے الزام لگایا تھا کہ ماما آپ کو ان لوگوں کے خلاف بھڑکاتی رہیں..... اور جواب میں، میں نے کھنکھایا، کہہ دیا اگر ہم خاموش ہیں تو اس کا یہ مطلب مت نکالو کہ بے وقوف ہیں، تم لوگوں کی ٹیٹوں سے ناواقف ہیں، ہم بھی جانتے ہیں، کون کس کے خلاف سازشوں کے جال بناتا رہا ہے۔ یہ ہمارے گھر کی باتیں ہیں اور میں ان کے سامنے کہہ سکتا ہوں۔"

"اور بوجھ..... ذرا سی بات تھی اور تم لوگ لڑنے لگے، بھلا ایسا بھی کرتے ہیں اور مہناز بے وقوف نام لے کر یہاں آکر دھونا چا کر کھا ہے۔ اگر مزید بیٹے نے کچھ کہہ بھی دیا تھا تو اس میں برائے کی کون سی شے ہے، یہ تمہارے ماموں کا بیٹا ہے اور مت بھولو کہ ماموں جان کے تم پر، ہم سب پر کتنے احسان کر رہے ہیں چاند! میں تم سے مہناز کی طرف سے معافی مانگتی ہوں، یہ ابھی تاں سمجھ ہے، ذرا ذرا سی بات کہہ سکتے تھے..... چلو احمق لڑکی....."

انہوں نے بیٹی کا بازو پکڑا اور چلی آئیں کہ وہ بھائی کے سوال و جواب سے بچنا چاہتی تھیں۔ مزید

وہ جب آئیں تو جو یہ وہاں سے ہٹ گئی کہ اس کے خیال میں کبیر اور واجدہ دونوں ہی اس کی موجودگی میں بات کرنا شاید پسند نہ کرتے۔

کبیر نے بہن کو اطلاع دینے کے انداز میں نزہت کے بارے میں بتایا، انہوں نے پورے انداز سے ساری بات سنی پھر بولیں.....

"کبیر..... تمہیں یقیناً غلطی ہوئی ہے، وہ واقعی اپنی دوست کی طرف جا رہی تھی۔"

"آپ..... میں یہ بات پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ نزہت اپنی دوست کی طرف نہیں جا رہی تھی اور میں نے آپ کو بتایا تو ہے، میں ایک بار پہلے بھی اسے رات کے دس بجے گھر آتے دیکھ چکا ہوں۔ تب میرے پوچھنے پر اس نے سبکی کی بیماری کا بہانہ بنادیا تھا مگر اتنے ڈارک میک اپ میں وہ بیمار کیسی کیسی بیمار لگتی تھی۔"

"کبیر! اب بچے بڑے ہو گئے ہیں، ان کی اپنی ایک لائف ہے اور میں نے اپنے بچوں کو تربیت اس انداز میں کی ہے کہ وہ اپنا اچھا برا خوب اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ مجھے یقین ہے میرے بچے کوئی غلط راہ اختیار کر ہی نہیں سکتے۔"

"اوہ تو آپ اس ساری صورت حال سے واقف ہیں۔" وہ حیران ہوئے۔

"کیسی صورت حال بھی، میں کہہ رہی ہوں آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے، دیکھیں ناں زمانہ بہت آگے جا رہا ہے، اب تو بندہ کسی مرگ پر بھی جائے تو بھی لباس کا خیال رکھنا ہی پڑتا ہے، کیا کریں اب زمانے کا چلن ہی یہی ہے۔"

"پتا نہیں ماموں نے امی کو کیوں بلایا ہے.....؟" مہناز کو بے چینی لگی ہوئی تھی۔ پہلے اوپر سے ہی جھانک جھانک کر دیکھتی رہی کہ ماں آ رہی ہے یا نہیں، زیادہ دیر انتظار نہیں کر سکی، نیچے چلی آئی۔

نیچے آتے ہی ملاقات مزید سے ہوئی، ہاتھ میں صبح کا اخبار لے کر وہ لاؤنج میں بیٹھا تھا۔ "ہیلو ہیلو..... کس سوچ میں گم ہو بھی.....؟" اُس نے پیچھے سے جا کر اُس کے شانوں پر دونوں

ہاتھ رکھتے ہوئے شوخ انداز میں کہا۔

"تم....." اس کا لہجہ کڑوا ہو گیا..... ہاتھ میں پکڑا اخبار میز پر پھینکتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ "میری امی کچھ دیر پہلے ادھر آئی تھیں، بتا سکتے ہو اس وقت اُن سے کہاں ملاقات ہو سکتی ہے۔"

اُس کے انداز کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے وہ دھب سے صوفے پر بیٹھ گئی۔

"مجھے نہیں پتا کہاں ہیں....." اُس نے ایک بار پھر اخبار اٹھا لیا اور یہاں سے جانے کے ارادے سے قدم آگے بڑھائے۔ مہناز تیزی سے اُنھی اور اُس کے راستے میں آکر اخبار اُس کے ہاتھ سے چھین لیا۔

"یہ کیا بد تمیزی ہے..... لاؤ ادھر دو....." وہ جھلا کر خاصی بلند آواز میں بولا۔

"کیا ہے، اتنے غصے میں کیوں ہو.....؟ اور یہ صبح کا اخبار اب پڑھنے بیٹھے ہو، سارا دن کیا کرنے رہے ہو، ذرا ہٹاؤ مجھے....."

"تم زیادہ فری ہونے کی کوشش مت کرو، اس وقت میرا موڈ ویسے بھی سخت آف ہے، ایسے ہی تم کہہ بیٹھو گا تو پھر آسو بھائی ماموں جان سے شکایت کرنے چل پڑو گی۔" اُس نے خاصے کڑوے لہجے

”اچھا..... ویسے ہم نے تو ہمیشہ آپ کو کسی قدر دان کے ہمراہ ہی دیکھا ہے، حسرت ہی رہی اکیلی ہوں، اور ہم جمعی کچھ کہہ سکیں۔“ ارد شیر کا انداز معنی خیز اور بہت کڑوا تھا۔

پہلی بات تو یہ کہ اسے اُمید ہی نہیں تھی کہ وہ مخاطب کرے گا اور دوسری بات بھی ایسی تلخ..... اُس نے تیوری پر بل ڈال کر ارد شیر کی جانب دیکھا اور اندازہ ہوا جگرے ہوئے رئیسوں کی طرح اُس نے مرف تعارف حاصل کرنے کو ہی نہیں کہا تھا، وہاں بڑی گہری پہچان، دشمنی اور تسخیر کا رنگ تھا۔

”آپ کی تعریف.....؟“ سوہانے بڑی بنجیدگی اور قدرے تیز آواز میں کہا۔

ارد شیر کے اندر جیسے آگ بھڑک اٹھی۔ اُس کے چہرے پر بہت کچھ کہتی نگاہیں..... اور بہت غلط کہنی نگاہیں گاڑ کر بولا.....

”اپنی تعریف ہم خود نہیں کیا کرتے۔“

”اچھا آذر صاحب..... آپ لوگ باتیں کریں، میں ابھی آتی ہوں.....“ وہ ارد شیر کے انداز کو ٹھکانے لگانے پر تیار تھی۔ آخر یہ کیوں انگارے چاہا ہے اور اس کی نگاہوں میں اس کے لئے اس قدر غارت کیوں ہے.....؟ اُسے اُس کے سامنے سے ہٹ جانا ہی بہتر لگا۔ مگر وہ پھر سنانے کو بولا.....

”اُسے کیا آج کی تقریب کی رونق دوبالا کرنے کے لئے بلایا گیا ہے، میرا مطلب ہے گانے کے لئے بلائی گئی ہے کیا.....؟“

وہ اچھی طرح جانتا تھا، سوہا گلوکارہ نہیں ہے مگر اس لڑکی نے بہت ستایا تھا۔ کئی دنوں تک اس کا نظر انداز کرتا، ارد شیر کے ذہن دول پر چھایا رہا تھا۔ پھر جب بھی اسے پانے کی کوشش کی، ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اب تو اُس نے سوہا سے دشمنی پال لی تھی۔

آذر کو اس کے انداز برحیرت تو تھی مگر پوچھ کر شعلوں کو اور ہوا دینا نہیں چاہتا تھا۔ یوں پوچھ کر کیا جیسے اُس نے کچھ سنا ہی نہیں اور ارد شیر سے بولا.....

”تم آغا صاحب کے پاس بیٹھو، میں ابھی آتا ہوں۔“

مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ گہری اور بے رحم نظروں سے برابر سوہا کو دیکھتا رہا، جیسے اپنی بات کا جواب چاہتا ہو، دیکھنا چاہتا ہو اس کے کاری و کار کا زخم اسے کتنا گہرا لگا ہے مگر سوہانے ان کی جانب سے رُخ بھیر لیا اور اپنی پہلی والی جگہ کی جانب چل دی۔

آذر بے حد حشر مندہ تھا۔ وہ اس سے ملنے کے لئے ہی اپنی جگہ سے اٹھ کر آئی تھی اور کیا کیا نہ سنا ڈالا ارد شیر نے، جب وہ اتنے فاصلے پر چلی گئی کہ آواز اس تک نہیں پہنچ سکتی تھی تب اُس نے کڑی نظروں سے ارد شیر کی جانب دیکھا اور ڈالتے ہوئے بولا.....

”دماغ تو ٹھیک ہے ناں تمہارا.....؟“

ارد شیر سنی اُن سنی کر کے بولا..... ”میں نہیں جانتا تھا اب آغا سراج صاحب کے ملنے والوں میں اس طرح کے گھٹیا لوگ بھی شامل ہو چکے ہیں۔ سخت افسوس ہوا ہے مجھے..... آخر کچھ تو خیال کرنا چاہئے تھا۔ ہونہ! فرما رہی تھیں، ہمیں ہر جگہ اکیلے ہی جانا پڑتا ہے حالانکہ میں کئی بار اسے ایک لڑکے کے ساتھ دیکھ چکا ہوں..... اور اور بھی نہ جانے کتنے ہوں گے، جن کے ساتھ وقت کو زمین کرتی ہوگی اور ہمیں غرے دکھائی ہے۔“ کہتے ہوئے اُس نے زیر لب یہودہہ سا جملہ کہا۔

آئیں۔

”مجھے تمہارا رویہ بہت برا لگا ہے عزیز.....“ ان دونوں کے جانے کے بعد کبیر حسن نے ڈانٹا۔

”پلیز پیا..... آپ میری کسی بات پر خفا مت ہوں، دیوانگی سمجھ کر نظر انداز کر دیں.....“ وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔

وہ آنا نہیں چاہتی تھی مگر فرم کے مالک آغا صاحب کی بیگم نے تاکید کی تھی۔ اصل میں بیگم آغا کی والدہ کی بہت اچھی دوستوں میں سے تھیں، آذر کے ہاں آئیں تو اُس نے انہیں کہا، سوہانہ ہی ایک آپ کی فرم میں ملازم ہے اور خیال رکھنے کی تاکید بھی کی، تب اگلے ہی روز انہوں نے سوہا سے ملازمت کی، یہ لڑکی انہیں بھی اچھی لگی۔ اب بیٹی کی شادی سراسے انوائٹ کیا تھا۔

سوہا یہاں آگئی مگر اب اپنے مزاج کے خلاف اسے گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ اصل میں کلاہ نمایاں فرق تھا۔ وہ تو اپنے لباس، اپنی شخصیت سب پر شرمارہی تھی۔ اتنے لوگوں میں، میں سب سے ا تھلک اور عام سی ہوں۔ یہاں کوئی واقف نہیں تھا۔ ہوں کے سر سبز لان میں وہ ذرا سا ہٹ کر ا طرف..... بیٹھی، سب کا جائزہ لے رہی تھی۔

اس نے ارد شیر کو آتے اور آغا صاحب سے ملنے انہیں مبارکباد دیتے دیکھا ضرور مگر سر سر ہی ان میں۔ وہ تو اس بات سے غلطی نا واقف تھی کہ ارد شیر اس کے لئے کیا سوچ رکھتا ہے اور کیسے کیسے منصوبہ چکا ہے۔

ارد شیر کی نگاہ ابھی تک اس پر نہیں پڑی تھی۔ وہ آغا صاحب کی چھوٹی بیٹی کے قریب تھا۔ کافی تک وہ دونوں باتیں کرتے رہے۔ سوہا بھی اس کی جانب سے جلد ہی توجہ ہٹا کر سننے آنے والوں کو دیکھ لگی اور جب آذر آیا تو پھر اس کی توجہ صرف اس کی جانب ہوگی۔ شکر ہے کوئی جانی پہچانی صورت تو دکھا دی۔ وہ اس سے کافی فاصلے پر تھا۔ آغا صاحب سے ملنے کے بعد مسز آغا کی جانب گیا..... اور اپنی والدہ کے نہ آسکے پر معذرت کی۔

سوہا اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ چاہ رہی تھی، آذر کے ساتھ رہے۔ اکیلے بیٹھے ہوئے اُن گہما گہمی میں بھی بور ہو رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ آذر تک پہنچتی، ارد شیر نے آذر کو دیکھ لیا اور آذر نے بھی دونوں دوست ایک دوسرے کی جانب بڑھے۔ پہلے ہاتھ ملایا پھر ہنستے ہوئے گلے لگ گئے۔

”ہیلو آذر صاحب.....“ سوہا کی آواز پر آذر سے گلے ملنے ارد شیر نے اپنی پشت پر ابھرنے والا آواز کی صورت دیکھنے کے لئے چہرے کا رخ موڑا، پھر دوست کو چھوڑ کر ذرا پیچھے ہٹا، ہونٹوں پر زبردست مسکراہٹ سجا کر اُس نے سوہا کو سر سے پاؤں تک بغور دیکھا۔ اس وقت وہ مکمل طور پر آذر کی جانب متوجہ تھی اور اس سے اس کی والدہ کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔

”ای کا ارادہ تھا آنے کا مگر آج شام چاکا اُن کی طبیعت خراب ہوگئی۔ بلڈ پریشر بہت ہائی.....“

تھا، بس اسی لئے نہیں آسکیں..... اور تم کیا اکیلے آئی ہو.....؟“

”ہاں ظاہر ہے، مجھے ہر جگہ اکیلے ہی آنا پڑتا ہے۔“ وہ خواہ مخواہ ہنس پڑی۔

قریب کھڑی آغا صاحب کی چھوٹی صاحبزادی نے حیرت سے دونوں جانب دیکھا پھر بولی.....
 ”کیا ہوا ہے انہیں اور آپ بھلا کیوں ڈانٹیں گے.....؟“
 ”کچھ نہیں، بس میرے دوست کو کبھی بھی دورہ سا پڑ جاتا ہے، آج بھی پڑا تھا، اثرات مجھے اب بھی
 مالتی دے رہے ہیں۔“ اُس نے ارد شیر کی طرف دیکھتے ہوئے ہنس کر جواب دیا۔
 ”دورہ زیادہ خطرناک تو نہیں ہے.....“ وہ سمجھ گئی تھی آذر مذاق کر رہا ہے۔ ارد شیر باہر ناراض ہو کر
 الگ جا بیٹھا..... کچھ دیر بعد موقع ملے ہی آذر اس کے پاس آیا اور بولا.....
 ”سارے ماحول سے کٹ کر چہرے پر متانت آنکھوں میں ذہانت سجائے بیٹھے تم کتنے اچھے لگ
 رہے ہو، ہمیشہ یونہی بیٹھا کرو ناں۔“
 جواب میں وہ منہ ہٹا کر بولا.....
 ”تم میرے پاس کیوں چلے آئے تنہا بیٹھے رہنے دو۔“
 ”تمہیں تنہا کون رہنے دیتا، میں نہ آتا تو کوئی اور آ جاتا۔“
 پھر اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر ایک دم سے بڑی سنجیدگی کے ساتھ کہنے لگا۔
 ”ارد شیر..... تم اب شادی کر لو۔“
 ”ہاں، اب تو میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔“ ارد شیر نے دھیمے سے کہا۔
 ”کیا مطلب.....؟ چونکہ ارد شیر نے اب کہا تھا تو آذر چونکا، سمجھا شاید اُس نے سوہا کو دیکھ کر ایسا
 ارادہ باندھا ہے۔“

”مطلب کیا..... بھی کیا شادی کا مطلب نہیں جانتے اور ابھی خود ہی مجھے مشورہ دیا ہے کہ شادی کر
 لو۔“

”مگر مجھے گمان نہیں تھا کہ تم مان جاؤ گے اور اتنی جلدی مان جاؤ گے، یہ تو میں کبھی بھی نہیں سوچ سکتا
 تھا اب تو مجھے لگ رہا ہے تمہاری طبیعت واقعی خراب ہے۔“
 ”بکومت..... میں بالکل ٹھیک ہوں اور شادی کا فیصلہ میں نے بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے۔“
 ”کون ہے وہ.....؟“ آذر نے خاصی غلٹ میں پوچھا۔
 ”اتنے بے صبرے کیوں ہو رہے ہو.....؟“ ارد شیر ہنسا اور کچھ نہیں بتایا۔ سوچ رہا تھا، کبھی آذر کو
 راتھ سے بلوائے گا اور کہے گا۔

”دیکھ لو، یہ ذرا سی لڑکی تمہارے دوست کو بے بس کر گئی ہے، دل میں آبی ہے، سوچ پر چھانگنی ہے
 اور ایسا اُس نے بالکل اچانک ایک دم سے کیا ہے، مجھے سننے کی مہلت ہی نہیں دی۔ اب تو میں اسیر ہوں
 اس کا، یہ بہت پیاری ہو گئی ہے مجھے۔“
 ”تم واقعی شادی کر لو..... میں یہ مشورہ بہت سنجیدگی سے دے رہا ہوں مگر مجھے لگتا ہے، تم نے مذاق
 میں لیا ہے۔“

اُس نے بات کا جواب دینے کے لئے لب کھولے پھر اس کی نظر سوہا پر پڑی۔ وہ مسز آنا.....
 جانے کی اجازت لے رہی تھی۔
 ”اچھا آذر..... اب میں چلتا ہوں.....“ ایک دم سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

”اچھا..... تم نے اس سے شادی کرنا ہے..... جو اس قدر تحقیق کروار ہے ہو۔“
 ”مثبت.....“ آذر کی بات اسے غصہ دلا گئی۔ بازو سے اس کا ہاتھ ہٹا کر وہ چل پڑا۔
 یہ ممکن نہیں تھا کہ ایک ہی جگہ پر موجود ہو کر سوہا اُس کی نگاہوں کی زد میں نہ آتی..... یا سوہا کی نظر
 ادھر ادھر سے ہوتی ہوئی کبھی کبھار اس پر نہ پڑ جاتی۔

سوہا کو تو یہاں کوئی جانتا نہیں تھا مگر اس کے کئی ملنے والے تھے، کبھی کسی سے ملتا ملتا یا باتیں کر،
 اس کے قریب آ جاتا تو سوہا کو پریشانی ہونے لگتی، کہیں پھر کوئی ایسی ویسی بات نہ کر دے، ویسے وہ کبھی نہیں
 تھی کہ آخراں نے ایسے کیوں دیکھا اور اس قسم کی باتیں کیوں کی۔

”جانتا ہوگا میں یا سیمین بیگم کی بھانجی ہوں اور کچھ لوگوں کی عادت ہوتی ہے، دوسروں کی تدبیر
 خوشی دیتی ہے، یہ بھی یقیناً ایسے لوگوں میں سے ہے۔“ وہ اب اس سے چپنا چاہتی تھی۔ ڈنر کے دوران آذر
 اُس کے پاس آیا اور ارد شیر کے غلط رویے پر معذرت چاہی۔

”آپ کے دوست نے ایسا کیا کیوں.....؟ آخر مجھ سے کیا دشمنی ہے.....؟“
 ”بس یہ ایسے ہی مزاج کا مالک ہے، تمہیں شاید یاد ہو ایک بار میرے آفس میں تمہاری اس سے
 ملاقات ہو چکی ہے اور اس نے تمہارے جانے کے بعد تمہارے بارے میں پوچھا تھا، کون ہو، کہاں رہتی
 ہو، یہ تم سے دوبارہ ملنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ یہ جان کر کہ تم آئی یا سیمین کی بھانجی ہو اس نے کچھ ایسی باتیں
 کیں جو مجھے اچھی نہیں لگیں۔“

میں نے صاف کہہ دیا کہ تم اُس طرح کی لڑکی نہیں ہو جیسی وہ سمجھ رہا ہے۔ تمہارا خیال ذہن سے
 نکال دینا ہی اس کے لئے بہتر ہوگا اور یہ بھی بتایا تھا کہ تم مجھے بے حد عزیز ہو۔ میں تو سمجھا تھا اس کے ذہن
 سے تمہارا خیال نکل چکا ہے مگر آج اندازہ ہوا ہے، وہ تمہیں بھولا نہیں تھا۔“

”آذر صاحب..... آپ پلیز سمجھائیں اپنے دوست کو، دیکھئے میں خواہ مخواہ کی دوستیاں اور
 دشمنیاں پالنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں اور دولت کے گھمنڈ پر خدا بننے والے ان لوگوں سے مجھے دیے
 بھی بہت خوف آتا ہے، یہ ہمیں کھلونا سمجھتے ہیں۔“

”تم پریشان مت ہو، یہ تو اتفاق ہی ہے کہ آج یہاں تم دونوں کی ملاقات ہو گئی ورنہ دیکھو تو اس
 بات کو کتنا عرصہ گزر چکا ہے۔ جب تم مجھ سے ملنے میرے آفس آئی تھیں اور وہاں پر ارد شیر نے تمہیں دیکھا
 تھا..... اب دوبارہ تمہیں کبھی ملو گے کبھی یا نہیں.....“ وہ اسے تسلی دے رہا تھا۔ سوہا مغموں کی کھڑی تھی۔

”آذر..... فاروق صاحب تمہارا پوچھ رہے ہیں.....“ ارد شیر اچانک ہی آکر بولا تھا۔ سوہا اسے
 دیکھ کر گھبرا گئی، اور جلدی سے ہٹ کر بیٹھ گئی..... وہ بھی جان گیا تھا کہ اس کی وجہ سے الگ ہوئی ہے ورنہ تو
 بڑے آرام سے آذر کے پاس کھڑی باتیں کر رہی تھی۔

”بن رہی ہیں محترمہ.....“
 آذر نے ارد شیر کی جانب دیکھا اور اس کا موڈ بحال کرنے کو اور خاص طور پر سوہا کی طرف سے
 اُس کا دھیان ہٹانے کا کوشش کرتے ہوئے بولا.....

”اب تمہاری طبیعت کیسی ہے میرے پیارے دوست.....؟“
 ”یہ مت پوچھو، بتاؤں گا تو ڈانٹنے لگو گے۔“ ارد شیر نے جیسے دانت پیٹتے ہوئے جواب دیا تھا۔

”ابھی تو تم میری بات کی تائید کر رہے تھے..... اب کیا برامان گئے ہو؟“

”نہیں نہیں..... یہ بات نہیں، میں بس اب گھر جا رہا ہوں..... آج دیر تک بیٹھنے کا موڈ نہیں، آج کل انجمنوں میں ہوں خاندانی معاملات میں بری طرح جکڑا ہوں..... اچھا پھر ملاقات ہوئی، میں آؤں گا تمہارے آفس۔“

وہ بہت جلدی میں یہ سب کچھ کہہ کر چل پڑا تھا، اسی انداز میں آغا صاحب سے اجازت لی اور ان کی سنے بغیر خدا حافظ کہہ کر آگے بڑھ گیا۔

گاڑی پارکنگ ایریے سے نکالی..... ابھی گیٹ کر اس کیا ہی تھا کہ اسے پیدل جاتی سوا نظر آگئی۔ گاڑی اُس کے قریب جا کر روکی۔ وہ ایک دم سے پیچھے ہوئی، پھر اس پر نظر پڑی تو گھبراہٹ میں کئی منہ اضافہ ہو گیا۔

”تم پیدل جا رہی ہو، یقین نہیں آ رہا، ارے کسی سے بھی کہہ دیا ہوتا، تمہاری بات کون ٹھکرا سکتا ہے۔“

”مسٹر..... میں نے تمہارا بہت لحاظ کیا ہے۔“ وہ تپ کر بولی کہ وہ تو جان کو ہی آگیا تھا۔

”لحظا تو میں نے کیا ہے، ورنہ بہت سے ایسے مواقع آئے، جب میں تمہیں اٹھا گاڑی میں ڈال سکتا تھا۔“ وہ جو کہہ رہا تھا، سوہا کو اندازہ تھا، کبھی سکتا ہے، یہ خالی خولی دھمکی نہیں ہے، وہ جھڑامول لینا نہیں چاہتی تھی۔ اس سے مزید انجئے سے بہتر جانا کہ راستے سے ہٹ جائے مگر وہ کچھ اور سوچے بیٹھا تھا ایک بار پھر سامنے آگیا اور بولا.....

”بھانجھی ہوتی ہوتاں یا سمین بیگم کی اور یا سمین بیگم کے ساتھ ہی رہتی ہو، ویسے تمہاری آنٹی گلوکارہ ہی نہیں، بہت بڑی اداکارہ بھی ہے، کیسے صاف جھوٹ بول دیا کہ میں تو یہاں اکیلے رہتی ہوں۔ مگر ہم بہت اچھی طرح جانتے ہیں ایسی عورتوں کو، اُس کے کہے کا اعتبار نہیں کیا اور آخر کار کھوج ہی لیا کہ کہاں رہتی ہو تم۔ میرا لازم چھچھا کرتا رہا ہے تمہارا.....“

سوہا اندر سے تو لرز رہی تھی مگر بظاہر کسی کمزوری کا اظہار نہیں کیا، بولی.....

”اگر کہا تھا ایسا تو کسی مصلحت کے تحت ہی کہا ہوگا انہوں نے۔“

”مصلحت..... ہونہ! میرے خیال میں اتنی عمر گزر جانے کے باوجود اس اپنا بچ بڑھیا کو کاروبار کرنا نہیں آیا، اسے ابھی تک گاہک کی پہچان نہیں ہے، منہ مانگی قیمت دینے کو تیار تھا میں۔“

”شب اپ مسٹر اردشیر..... اس سے زیادہ بکواس میں برداشت نہیں کر سکوں گی۔ بہت لحاظ کیا ہے میں نے تمہارا..... یہ جانتے ہوئے بھی کہ تم عزت و احترام کے لائق ہرگز نہیں ہو، میں تمہارے ساتھ عزت سے پیش آئی ہوں.....“ وہ نہ جانے کیا کچھ کہتی چلی گئی۔

اُس کے الفاظ اردشیر کو طمانچوں کی طرح لگے تھے..... آنکھوں میں چنگاریاں سلگنے لگیں۔ وہ گاڑی سے نیچے اتر آ، دانت بردانت جھا کر، بھاگنے کا ارادہ کرتی سوہا کا بازو اپنی مضبوط گرفت میں لے لیا اور اسے گاڑی کی طرف دھکیلا۔

وہ بہت کمزور تھی اُس کے مقابلے میں مگر یہ بھی جانتی تھی، یہ جنگ زندگی کی جنگ ہے یہاں گئی تو جیتے جی مرنے کی اور وہ مرنے نہیں چاہتی تھی..... مگر مقابل بہت زور آ رہا تھا۔

”اردشیر..... اردشیر..... کوئی تیزی سے پکارتا ہوا قریب چلا آیا۔ اردشیر کا ہاتھ اُس کے بازو پر ہا کر اسے اپنی مہربان پنہ میں لے آیا۔

”یہ کیا کرنے لگے تھے تم.....؟“ آذری دھیمی آواز میں ڈکھا اور بلا کا قہر تھا۔

”آج تم درمیان میں مت آؤ آذر، میں اس کو اس کی اوقات یاد دلانا چاہتا ہوں، اسے بتانا چاہتا ہوں کہ یہ کیوں ہے اور میں کون ہوں۔“ اُس نے غزا کر کہا اور ایک بار پھر اُس پر جھپٹا، آذر نے بڑی پھرتی سے سوہا کو اپنے پیچھے کر لیا اور بولا تو لہجہ دوستانہ اور کسی حد تک منت بھرا تھا۔

وہ جانتا تھا، اردشیر جیسے ضدی اور سرکش سے مقابلہ کرنا سودمند نہیں ہو سکتا۔

”تم اس کا خیال دل سے نکال دو، تمہیں اور بہت مل جائیں گی مگر کسی شریف کی آبرو سے مت کیل۔“

”بکواس بند کرو آذر، میں اسے کسی قیمت پر نہیں چھوڑ سکتا، خوب جانتا ہوں کتنی آبرو مند ہے یہ۔“

اردشیر کی آنکھوں میں شرارے بھرے تھے اور لہجہ پتھر پر سارا تھا۔

”میری خاطر اردشیر..... اگر تمہیں میرا ذرا سا بھی خیال ہے، تمہارے دل میں اگر دوستی کی کوئی بات ہے تو اسے معاف کر دو، اسے جانے دو۔“ آذر نے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔

وہ آذر کے بندھے ہاتھوں کو دیکھ کر ٹھنکا۔ آذر نے اُس کی پچکچاہٹ کو دیکھ کر یہی موقع مناسب سمجھتے ہوئے مزید کہا.....

”اس کی خاطر میں تمہارے قدموں میں اپنا سر رکھنے کو بھی تیار ہوں۔“

ہاتھ وہ اب تک جوڑے کھڑا تھا، اردشیر کو ایک دم سے بے بسی کا احساس ہوا۔ اس کی رگ رگ ہل اُگ بھڑکنے لگی..... غصے کی وجہ سے تنفس اتنا تیز تھا کہ کچھ دیر کے لئے اس سے بولا ہی نہیں گیا صرف آذر کے ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیئے، پھر کہنے لگا.....

”تم نے دوست ہو کر میرے ساتھ دشمنی کی ہے مگر میں تمہاری خاطر اسے چھوڑ رہا ہوں۔“

”بہت شکریہ.....“ آذر نے جیسے سکون کی سانس لی۔

سوہا اب تک اس کے پیچھے کھڑی برستی آنکھوں اور لرزتے بدن کے ساتھ یہ ساری کارروائی دیکھ رہی تھی، اردشیر اس کی جانب پلٹا۔

”اگر آج آذر درمیان میں نہ آ جاتا تو یا سمین بیگم باقی کی عمر تمہاری یاد میں روتے ہوئے گزار دیتی، نسبت اچھی تھی جو بچ گئی ہو۔“



دن کے گیارہ بجے اُس کی آنکھ کھلی، ناشتا منگوا یا اور ساتھ ساتھ اخبار بھی دیکھتا رہا۔ اس دوران رات کا واقعہ وہ فراموش کر چکا تھا۔ ابھی ناشتا کر رہا تھا کہ گاؤں سے کبری کا فون آگیا۔ وہ کب اسے فون کیا کرتی تھیں، سو اُس نے پہلا سوال یہی کیا۔

”خیریت تو ہے ناں بڑی ماں.....؟“

”ہاں ہاں بالکل خیریت ہے..... تم سناؤ کیسے ہو اور کیا مصروفیات ہیں کہ اتنے دنوں سے گاؤں کا فون نہیں لگایا۔ میں نے آج پریشان ہو کر فون کیا ہے، تم ٹھیک تو ہونا.....؟“

”آپ ادھر ہی کیوں بیٹھ گئے؟ اندر آ جائیں۔“
 ”نہیں، اس موسم میں دھوپ اچھی لگتی ہے۔“ اردشیر نے یہ کہتے ہوئے دوسری چار پائی سے بھی
 نیک اٹھایا۔ اپنے نیچے پر رکھا اور نیم دراز ہو گیا۔
 ”موسم اب خاصا بدل گیا ہے۔ صبح کے گیارہ بجنے کو ہیں مگر ہوا ٹھنڈی چل رہی ہے، دھوپ میں
 تیزی بھی نہیں ہے۔“
 ”ہاں جی.....“ اُس نے مختصراً کہا پھر ذرا توقف کے بعد بولی..... ”ناشتا بنواؤں آپ کے
 لئے.....؟“

اردشیر نے اُس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ اُس کی توجہ ان کام کرنے والیوں کی طرف ہو گئی تھی جو
 باری باری آکر سلام کرتی تھیں اور پھر یہاں سے واپس جانے کے بجائے کچھ فاصلے پر جا کر کھڑی ہو جاتی
 تھیں۔

شہری لباس والے خورو اپنے چھوٹے شاہ سائیں میں انہیں بڑی دلچسپی محسوس ہوا کرتی تھی۔ وہ
 گاؤں آتا تو اس کا مزاج، بات کم، ڈانٹ زیادہ والا انداز انہیں اس کے قریب آنے روکتا، دُور دُور سے
 دیکھا کرتیں اور ہر بات یاد رکھی جاتی اور باتوں کو بتاتی جاتی کہ.....

”جتنا سوہنا ہے غرے بھی اُٹنے ہی ہیں..... اُسے کچھ پسند نہیں آتا، ہر بات پر منہ بناتا ہے.....
 اپنی مرضی کا مالک ہے، کسی کی نہیں سنتا.....“

غرض اردشیر کی گاؤں آمد ان لڑکیوں کے لئے خاصی خوشگوار ہوا کرتی تھی۔

ان دنوں جب وہ گاؤں میں ہوتا، تو حویلی میں آکر کام کرنے والی لڑکیوں کی تعداد اچھی خاصی
 بڑھ جاتی۔ زینت لاکھ کہتی ضرورت نہیں ہے، تم لوگ اپنے گھروں کو جاؤ مگر وہ سارا سارا دن یہیں
 برآمدوں میں بیٹھی رہتیں۔

”چائے بنوا دیں..... اور صرف چائے..... ساتھ میں اور کچھ نہیں لوں گا۔“ وہ زینت سے کہہ رہا
 تھا۔

”گھر کی بچیری بنی ہوئی ہے..... گا جبر کا حل وہ بھی ہے، میں لے آتی ہوں۔“
 ”نہیں نہیں..... اس وقت صرف چائے۔“ اُس نے منع کر دیا پھر یہاں پر موجود کیوں کی لڑکیوں
 کی طرف دیکھ کر بولا.....

”او..... تم لوگوں نے کیا میلہ لگا رکھا ہے، کوئی کام و ام نہیں ہے کیا، مفت کی روٹیاں توڑنے کو ہو،
 پلو بھاگو یہاں سے۔“

”ہم تو سلام کرنے آئے تھے جی.....“ سانولی سی لڑکی بڑی معصوم شکل بنا کر یہاں آنے کا مقصد
 بیان کر رہی تھی۔

”تو کر لیا ناں سلام..... اب کیا پیار.....“ وہ کہتے کہتے رک گیا۔ اور زینت سے بولا.....

”یہ کیا پال رکھی ہیں آپ لوگوں نے؟“

”منع تو کرتی ہوں کہ اتنا زیادہ کام تو ہوتا نہیں مگر یہ سب اپنے اپنے گھروں کے کام بننا کر ادھر
 حویلی میں آ جاتی ہیں۔“

اور اسے خیال نہیں آیا کہ پہلے تو بھی سالوں میں ایک آدھ بار چکر لگایا کرتا تھا، تب بڑی ماں
 کبھی بھی یوں فکر مند ہو کر فون نہیں کھڑکایا تھا۔ ان کی محبت پر سکرا دیا اور بولا.....

”بڑی ماں، میں بھی پچھلے تین چار روز سے گاؤں آنے کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔“

”اوہو..... تین چار روز صرف سوچنے میں ہی لگا دیئے، تم بہت وقت ضائع کرتے ہو اردشیر

میرے لال سوچو ہی نہیں، عمل بھی کرو، دیکھو یہ وقت بڑا نازک ہے، تمہیں تو ہر لمحے ہوشیار رہنے
 ضرورت ہے، ورنہ بڑا نقصان ہوگا، کچھ نہیں بچے گا تمہارے پاس، خالی ہاتھ رہ جاؤ گے۔“

اردشیر کی ایک دفعہ پھر گاؤں آمد ہوئی، زینت نے چادلوں کی بوریاں اپنی مگرانی میں رکھواری تھیں
 جب ملازمہ دوڑتی ہوئی باہر کے احاطے سے اندر آئی اور پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ چھوٹے شاہی
 آمد کی اطلاع دی۔

اچھا اچھا، تو جلدی دیکھ کے آ، اُن کا کمرہ تو ٹھیک ہے ناں، کہیں گرد نہیں ہونی چاہئے جلدی جلدی
 سب چیزیں بھاڑ دے۔“

”صبح میں نے صفائی کی تھی جی.....“

”ہاں پتا ہے مجھے، ایک بار پھر دیکھ لے گی تو کیا ہو جائے گا۔“ زینت پر بھی گھبراہٹ سوار تھی۔

حالانکہ اُس نے بھی کچھ ایسا دیا کہا نہیں تھا مگر شخصیت کا جو رعب پہلی ملاقات میں اُس پر رہا تھا، اُس کا

تاثر اب تک برقرار تھا۔ وہ خود بھی کام کرتی ملازماؤں کی مگرانی چھوڑ کر رہائشی حصے کے گیٹ کی جانب آئی۔

اردشیر گاڑی احاطے میں چھوڑ کر اور ملازموں سے یہ معلوم کر کے کہ شاہ جی گھر پر ہیں یا نہیں، اندر
 آ رہا تھا۔ ملازموں نے بتایا تھا، شاہ سائیں گھر پر موجود نہیں ہیں۔ وہ صبح سے چھوٹی حویلی گئے ہوئے

ہیں، واپسی شاید بارہ ایک بجے تک ہوگی۔

رہائشی حصے کا گیٹ کراس کر کے اندر آیا تو سامنے ہی زینت استقبال کو کھڑی تھی، اُس نے سلام

میں پہل کی جس کا جواب اردشیر نے چہرے پر درد ستانہ مسکراہٹ سجا کر دیا اور بولا.....

”سنا ہے آپ کے سر تاج گھر پر نہیں ہیں۔“

”ہاں جی..... وہ صبح نشی کے ساتھ گئے تھے۔“ اُس نے جس انداز میں لفظوں پر زور دے کر اور

مسکرا کر سر تاج کہا تھا زینت بھی ہنس پڑی تھی۔

”تو کیا انتظار میں صبح سے یہیں کھڑی ہیں.....؟“ اسے گیٹ کے قریب پا کر وہ مذاق کے رنگ

میں کہہ رہا تھا۔

”نہیں، جی نہیں..... میں تو آپ کی آمد کا سن کر ادھر آئی تھی۔“ وہ اس کی بات پر جھنجھک کر

وضاحت کر رہی تھی۔ دونوں ساتھ ساتھ چلتے برآمدے کے سامنے صحن میں بچھائی گئی چار پائیوں تک

آئے، اردشیر یہیں بیٹھ گیا اور بولا.....

”میرا سامان گاڑی میں رکھا ہے کسی سے منگوا لیں۔“

”اچھا جی منگوا لیتی ہوں.....“ اُس نے ملازمہ کو آواز دے کر سامان لانے کو کہا پھر اس سے
 بولی.....

زینت اس کے لئے خود چائے بنا کر لائی۔ وہ آنکھیں بند کئے یہیں صحن میں لیٹا تھا۔
”یہ چائے.....“ زینت نے متوجہ کیا۔

اُس نے آنکھیں کھول دیں، جلدی سے اُٹھ بیٹھا اور مسکرا کر بولا.....

”آپ نے کیوں تکلیف کی.....؟ کسی ملازمہ سے کہہ دیا ہوتا۔“

”نہیں جی، آپ کا کام کر کے تو مجھے خوشی ہوتی ہے۔“ زینت کے لہجے میں اپنائیت اور غلط فہمی،
... متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکا۔

جب زینت اسے چائے پکڑا رہی تھی، تب شاہ جی آگئے۔ اُسے دیکھ کر ٹھٹھے، ابھی چند روز پہلے ہی تو
ہو کر گیا تھا، وہ دل ہی دل میں حیران ہوتے ہوئے آگئے بڑھے۔

”اسلام علیکم بابا جان.....“ ملازم لڑکیوں کے سلام پر چونک کر اُس نے گیٹ کی جانب دیکھا تھا
اور سچ میز پر کراٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”تم کب آئے اور میں بہت حیران ہوں، بڑی جلدی جلدی چکر لگانے لگے ہو۔“ ان کے انداز
میں خوشی کی کوئی رن نہیں تھی، بڑا سیدھا سا لہجہ تھا۔

”بس بابا فارغ تھا، سوچا آپ لوگوں سے مل آؤں..... آپ کا گلہ بھی دُور ہو جائے گا، ہمیشہ یہی کہا
کرتے تھے ناں کہ گاؤں آیا کرو۔“ وہ مسکرا رہا تھا۔

”ہاں یاد ہے مجھے..... مگر تم نے آدمی بات یاد رکھی ہے..... ارد شیر، میں نے تم سے یہ تو کبھی نہیں کہا
تھا کہ گاؤں آؤ اور آ کر حویلی میں بیٹھ جاؤ..... یوں تو تم شہر میں رہو یا گاؤں میں، میرے لئے ایک ہی

بات ہے، میں تو نہیں ہاتھ بٹانے، زمینوں کے معاملات میں دلچسپی لینے کے لئے کہا کرتا تھا۔ ویسے یہ
تمہارے بھلے کو کہا تھا، مجھے تو کوئی ضرورت نہیں..... میں بڑے آرام سے یہ سب کچھ خود سنبھال لیتا

ہوں۔“

جب سے اُس نے بنا کسی لحاظ کے زمینوں کی منتقلی کی بات کی تھی، وہ اس سے بدگمان تھے، بھر دیا
نہیں رہا تھا انہیں بیٹے پر..... اور پھر جوان بیوی کے سامنے خود کو کدور کہتے بھی کس طرح، اندر سے چاہے
وہ بھر بھری مٹی کی طرح بیٹھ رہے ہوں مگر بظاہر سر اٹھا کر اکڑ کر چلنا تھا انہیں۔

ارد شیر کے ذہن میں فوراً یہ خیال آیا کہ وہ اب جائیداد سے دُور دُور رکھنا چاہ رہے ہیں اُسے، ان کی
خواہش ہے کہ وہ ان کی زندگی کا ان ہی کا محتاج رہے، یہ جو ٹھوڑا بہت اسے دے دیں، ممبر شکر کر کے وہ اسی

پر گزرا کرے اور خود یہ جیسے جی چاہے لٹاتے رہیں۔

”یہ تو جی ب سے آئے ہیں، آپ ہی کا انتظار کر رہے تھے۔“ زینت نے اچھی میزبان کی طرح
نکراتے ہوئے شاہ جی کو بتایا.....

”تو آ جانا تھا..... حویلی..... اتنی دُور تو نہیں ہے اور پھر میں نے کوئی کام تو نہیں سوچ دینا تھا
اسے۔“ شاہ جی روکے انداز میں اتنا کہہ کر آگے بڑھ گئے۔ اُس نے اطراف میں نگاہ دوڑائی۔ شکر ہے

اس وقت کام کرنے والیوں میں سے کوئی یہاں موجود نہ تھی مگر زینت کے سامنے تو اس کی انسٹ ہوئی
تھی، وہ اگر عزت دینا چاہتی تھی تو اس لئے کہ وہ شاہ جی کا لاڈلا تھا، کیا سوچتی ہوگی وہ.....؟

اُسے چائے تڑوی کھینے لگی۔ سارے موڈ کا ستیا ناس مار دیا، جی چاہتا تھا چائے کا کپ فرش پر دے

بارے مگر ضبط سے کام لیا۔ زینت اندر چلی گئی۔ اُس نے چائے کا کپ میز پر رکھ دیا اور ایک بار پھر نیم
دراز ہو گیا۔ ذہن میں شاہ جی کے جملے، ان کا انداز گھوم رہا تھا اور اسے کسی بل چین نہیں آ رہا تھا۔

شاہ جی سے دوبارہ ملاقات دوپہر کے کھانے پر ہوئی۔ وہ ابھی ڈائننگ ٹیبل پر آیا ہی تھا تو
بولے.....

”اگر تمہیں پیسوں کی ضرورت ہو تو فون کر کے منگوا لیا کرو، بار بار گاؤں آنے کی زحمت کیوں
کرتے ہو.....؟ یہاں ہے ہی کیا، اُڑتی گرد اور نت نئے مسائل.....“

اُس نے اُن کے چہرے کی جانب دیکھا مگر سمجھ نہیں سکا، وہ یہ بات کس موڈ میں کر رہے ہیں،
شانے اُچکا کر بولا.....

”آخر ایک نہ ایک روز تو مجھے ان مسئلے مسائل سے بچنا ہے۔ آج ہی سے کوشش شروع کر دی جائے
تو میرا خیال ہے زیادہ کامیاب رہوں گا۔“

زینت پانی کا جگ لے کر آئی تو بولا.....

”یہ کام کس ملازمہ سے کہہ دیں اور آپ ہمارے ساتھ کھانا کھائیں۔“
باپ سے بات کرتے ہوئے لہجہ کیسا روکھا اور لیا دیا تھا مگر اب دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ اسے کہا

تھا.....

”زینت تم جا کر چائے بناؤ.....“ شاہ جی کی آواز غصے کو دباتے دباتے بھی خاص اُونچی ہو گئی۔
وہ ”اچھا جی“ کہہ کر واپس چلی گئی۔ تب ارد شیر سے بولے.....

”کب تک رہو گے یہاں پر.....؟“
”کچھ نہیں کہہ سکتا، شاید صبح واپس چلا جاؤں یا شاید پرسوں جاؤں۔“

”کیا مطلب.....؟ کچھ بھی طے کر کے نہیں آئے.....؟“
”نہیں بس ایسے ہی چلا آیا..... اور بابا آپ تو بس اب گاؤں کے ہی ہو کر رہ گئے ہیں۔“ اُس نے

اول پر طاری تناؤ کو کم کرنے کے لئے بات کا رخ بدلنے کی کوشش کی تھی مگر شاہ جی بری طرح چونکے۔
”کیا تم چاہتے ہو، میں شہر ہی میں رہوں.....؟“

”نہیں..... آپ کی مرضی..... آپ یہاں رہیں یا وہاں..... میں نے تو یونہی بات کی تھی.....“ وہ
نیران ہو کر کہہ رہا تھا۔

کھانا کھا کر وہ اپنے کمرے میں جانے کے بجائے باہر کے احاطے میں چلا گیا۔ کچھ دیر نشی اور
”کمرے لوگوں سے باتیں کرتا رہا۔ سہ پہر کے قریب دوبارہ اندر آیا۔ اس وقت سردی کافی بڑھ گئی تھی۔

کمرے میں ٹھنڈک رہی تھی۔ وہ کچھ ہی دیر اپنے کمرے میں بیٹھ سکا، پھر اُٹھ کر باہر دُھوپ میں آ گیا۔
شاہ جی کا کوئی ملنے والا آیا، وہ بیٹھک میں جانے لگے تو اسے بھی ساتھ چلنے کو کہا۔ اُس نے انکار کر

نیا اور ٹکیٹ کر کے لیٹ گیا۔
زینت کمرے میں ہی تھی، جب وہ کسی کام سے باہر آئی تو سورج ڈھل چکا تھا۔ ہوا سرد اور تیز تھی۔

پرانے ارد شیر کو ایسے موسم میں صحن میں بغیر بستر کے چاٹانی پر لیٹے سوئے دیکھا تو اپنا کام بھول کر ادھر
گئی۔ آنکھوں پر دایاں بازو رکھے وہ دائیں کروٹ لیٹا تھا اور بھینٹا سو گیا تھا۔ پہلے سو گیا، بگاڑے اور انا

چلنے کو کہے پھر کچھ سوچ کر ارادہ ترک کر دیا۔ اندر گئی اور کمر کھلائی، کھولا، اوڑھانے لگی پھر رُک گئی۔
نظر سونے ہوئے ارد شیر کے سر اُسے سے اُلجھ کر رہ گئی، مضبوط، توانا بھر پور مرد، سرد مہم تھا مگر اس
نے گرم کپڑا نہیں پہنا، ایک شرٹ پہن رکھی تھی۔ مضبوط شانے، خوب رو چہرہ، جب جاگ رہا ہوتا تھا تو کمر
اتنے غور سے دیکھا تھا، تب اس کے چہرے کی رعوت، آنکھوں کی لالی مقابل کو ایسا موقع ہی کب دیتی
تھی..... مگر سو یا ہوا کتنا بے ضرر کتنا معصوم دکھائی دیتا تھا۔

وہ سانس بھرے انداز میں بغور اسے دیکھ رہی تھی۔ نہیں جانتی تھی آنکھوں پر بازو رکھ کر لینا ارد شیر
بھی اسے دیکھ رہا ہے، اُس نے آنکھوں سے بازو ہٹایا اور ایک دم سے اُٹھ بیٹھا، زینت کی حالت تو چہر
جیسی ہو گئی، وہ گھبرا کر پیچھے ہٹی۔

اُس نے ہاتھ بڑھا کر کمر کھلا کر پکڑ لیا..... اور ہنس پڑا، نادم سی زینت نے پلکیں اٹھائیں۔
”شاہ جی.....“ گیٹ پر کھڑے شاہ جی کو دیکھ کر اُس نے کہا.....
ارد شیر نے بھی پلٹ کر دیکھا..... وہ گیٹ کے قریب کھڑے تھے، چہرے پر ہلاکی بنیدگی اور
آنکھوں میں اتنی ہی ٹھنڈک تھی۔
”آپ کب آئے بابا.....؟“
شاہ جی چونکے۔

اُس کا ذہن دول صاف تھا، سوانداز بھی گھبراہٹ سے پاک تھا اور ایسا ہی اطمینان زینت کے
چہرے پر بھی تھا.....
مگر انہوں نے ان کی طرف سے نگاہ پھیر لی اور ایک بار پھر باہر چلے گئے۔



یہ روڈ اس وقت تک سنسان ہو جایا کرتی تھی کہ اس ایریے میں فلیٹ ہی فلیٹ واقع تھے، کوئی
ٹاپک پلازہ یا مارکیٹ قریب نہیں تھی، جو حادثہ پیش آیا، یہ تو سان و گمان میں بھی نہ تھا۔ رات کے بارہ
بجے کو تھے۔ کبیر حسن خود گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے گھر واپس آرہے تھے۔ وہ اپنے ایک دوست کے گھر
مئے تھے۔ باتوں باتوں میں وقت کے گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا اور انہیں اتنا ناظم ہو گیا۔
دُور سے انہوں نے یہی دیکھا کہ ایک کار سڑک کے کنارے کھڑی ہے اور توجہ نہیں دی مگر ان کے
قریب آنے تک وہ گاڑی روڈ کے عین درمیان میں آ کر راستہ ہلاک کر چکی تھی۔ وہ تین لڑکے تھے۔
چہرے سیاہ نقاب سے ڈھانپ رکھے تھے۔ ہاتھوں میں اسلحہ لئے وہ ان کی گاڑی کو گھیرے کھڑے تھے۔
گاڑی کی چابی کے ساتھ ان کے پاس جو کچھ تھا، وہ سب ان کے حوالے کرنے کا مطالبہ ہوا۔ انہوں نے
حاجت کی تو تشدد پر اُتر آئے..... اور تشدد بھی اچھا خاصا.....

انہیں نیم بے ہوشی کی حالت میں چھوڑ کر وہ کامیاب واردات کے بعد فرار ہو گئے۔
کبیر حسن کافی دیر کے بعد اس قابل ہوئے کہ چند قدم چل کر ان فلیٹوں کی جانب جائیں اور کسی
سے مدد کی درخواست کریں۔ بدن بری طرح ڈکھ رہا تھا اور آنکھوں کے آگے بار بار اندھیرا اچھا جاتا تھا۔
کسی نہ کسی طرح خود کو گھسیٹتے وہ ان رہائشی مکانوں کی جانب آئے اور ایک گھر کی تیل پر اُنگلی رکھ
دئی۔ دروازہ جلدی کھل گیا..... اور دروازہ کھولنے والی لڑکی ایک اجنبی کو دیکھ کر جس کی حالت خاصی اتر
گئی، گھبرا گئی..... اور پیچھے ہٹی، اُس کے لبوں سے بے ساختہ چیخ نکل گئی۔ کچھ دیر وہ اسی ڈرے ڈرے
انداز میں انہیں دیکھتی رہی پھر پوٹی.....

”کون ہیں آپ.....؟“

ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں انہوں نے پیتا سادی اور ہیلپ کی درخواست کی۔

”اچھا آپ اندر آ جائیے.....“ وہ ہمدردی سے کہہ رہی تھی۔

انہوں نے اندر قدم رکھا تو ساری ہمتیں جواب دے گئیں۔ وہ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ لڑکی اُن
کے قریب بیٹھ گئی اور ملازمہ کو پکارنے لگی۔

جب وہ دوبارہ ہوش میں آئے تو صبح کی اذان ہو رہی تھی۔ وہ مہربان لڑکی کرسی پر بیٹھے بیٹھے سو گئی
تھی۔ ایک عورت جو صلیب سے ملازمہ لگ رہی تھی، بیٹھی ادکھ رہی تھی۔

پہلے پہل تو یہی سمجھ میں نہیں آیا کہ کہاں ہیں، وہ سوچنے لگے اور پھر سب کچھ یاد آ گیا۔ وہ اُٹھ بیٹھے

راکھ کالج آئی اور اُس روز کلاس اینڈ کرنے کے بجائے نورین کو تلاش کرنے لگی۔ وہ اپنے گروپ کے ساتھ اسے آفس کی سیڑھیوں پر مل گئی۔ راکھ نے اشارہ کیا تو اپنے گروپ سے معذرت کرتی، اُس کے پاس چلی آئی..... اور آتے ہی بولی.....

”دوروز کے بعد کالج آ رہی ہو، خیریت تو رہی ناں.....؟“

”میرے پیا کا ایکسڈنٹ ہو گیا تھا.....“

”اوہ..... اچھا تم مجھے فون پر اطلاع ہی دے دیتیں..... میں آؤں گی تمہارے گھر.....؟“

”کیا پیا کو دیکھنے.....؟“

راکھ نے پوچھا تو اُس نے اثبات میں سر ہلادیا۔

راکھ نے کہا..... ”اس خیال کو ترک کر دو تو اچھا ہے..... میرے پیا کچھ اور ہی مزاج کے مالک ہیں، اُن کا کچھ پتا نہیں چلتا..... کبھی تو بہت اچھی طرح ملیں گے اور کبھی بات بھی کرنا پسند نہیں کریں گے۔“

”آج پیر بیڈ نہیں لیا تم نے.....؟“ نورین نے اس کی بات کا برا نہیں منایا اور پوچھا۔

جواب میں راکھ نے نفی میں سر ہلایا اور بولی.....

”آج دل نہیں چاہ رہا..... میں تو صرف تم سے ملنے چلی آئی ہوں اور تم نے بھی پیر بیڈ نہیں لیا.....؟“

”میرا تو اکثر سوڈ نہیں ہوتا.....“ نورین نے ہنس کر کہا۔ پھر اُس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولی.....

”آؤ ذرا کالج کا ایک چکر لگائیں..... دیکھو موسم بھی کتنا اچھا ہو رہا ہے۔“

”شاہ صاحب کی طرف گئی تھیں.....؟“ راکھ نے نظر چرا کر آستنی سے کہا۔

”شاہ صاحب.....“ وہ صاحب، پرزور دے کر ہنس پڑی۔ ”تمہیں آج شاہ صاحب کیسے یاد آ گئے محترمہ.....؟“

راکھ نے اس کے مذاق کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ پوری سنجیدگی سے بولی.....

”اس روز جب تم مجھے ان کے گھر لے کر گئی تھیں تو وہ بہت اُلجھے اُلجھے سے تھے۔“

”مجھے تو لگتا ہے، وہ تمہیں دیکھ کر اُلجھ جاتا ہے۔“ نورین پر وہی موڈ طاری تھا۔

”کیا مطلب.....؟“ راکھ نے اس کی طرف دیکھا۔

”کوئی مطلب نہیں ہے یار، میں تو مذاق کر رہی تھی۔“ نورین نے بالوں کو جھٹک دیتے ہوئے اس کی عقل کا نام کرتے ہوئے کہا۔ پھر ذرا توقف کے بعد پوچھنے لگی.....

”کیا کہہ رہی تھیں تم، شاہ کچھ اپ سیٹ ہے۔“

”ہاں اُن کی باتوں سے یہی ظاہر ہو رہا تھا۔“

”تو کیا خیال ہے، چلیں اُس کی طرف.....؟“

”تمہارا مطلب ہے اُن کے گھر..... نہیں نورین، یہ کسی طور پر بھی مناسب نہیں۔“ راکھ اُس سے ملنا تو چاہ رہی تھی مگر اس کے گھر جانا نہیں چاہتی تھی۔

”اچھا پھر آج میرے گھر چلو۔“

اور اپنی اس پیاری سی محنت کو جگانے کے بارے میں سوچا مگر کیا نام ہے اس نیک دل لڑکی کا، وہ تو واقف نہیں تھے۔

”بہن!.....“ انہوں نے بڑے نرم لہجے میں پیار سے پکارا۔

پہلی ہی آواز پر اُس لڑکی نے آنکھیں کھول دیں۔ پلکیں جھپک جھپک کر ان کی جانب دیکھنے لگی۔

پھر وہ بولی..... ”کیا آپ نے مجھے بلایا تھا سر.....؟“

انہوں نے اثبات میں سر ہلادیا۔

”کیا کہہ کر بلایا تھا.....؟“ اُس کے انداز میں بے تابی تھی۔

”بہن! کہا تھا میں نے.....“ وہ مسکرائے۔

”بہن!.....“ اُس کے لب تھر تھرائے وہ کرسی سے اٹھی اور اُن کے پاس بیڈ پر آ بیٹھی۔ ان کا ہاتھ

اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور بولی.....

”پلیز ایک بار پھر کہیے..... کہتے ہی رہے۔“ اُس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔



اردو شیر نے اُس روز کسی پریشانی کا ذکر کیا تھا اور راکھ اپنے گھر کے حالات کی وجہ سے گھبراہٹ ہوئی تھی۔ اس سے پوچھا ہی نہیں، نسلی ہی نہیں دی اُسے..... مگر اب اپنی پریشانی بھول کر صرف اُس کے بارے میں سوچتی رہی تھی۔

”انہوں نے اُس روز ایسی باتیں کیں کیں۔ وہ ایسا کیوں کہہ رہے تھے کہ اُن کے ساتھ کوئی

حادثہ ہونے والا ہے..... خدا بھی نہ کرے کہ ان کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آئے۔ وہ ہمیشہ خوش رہیں۔“

راکھ گھبرا کر اُس کے لئے دُعا میں کرنے لگتی تھی مگر چین اسے کسی بل نہیں تھا۔ سوچتی..... ”وہ اب بھی

اُداس ہوں گے۔ کہہ رہے تھے میں تنہائی محسوس کرنے لگا ہوں۔ کیا وہ اکیلے ہیں.....؟ ان کا کوئی

نہیں.....؟ مگر سب تو ہیں، انہوں نے ایک بار ذکر تو کیا تھا..... اُس گھر میں شاید وہ اکیلے رہتے ہیں۔

میں جب اُن کے گھر گئی تھی تو صرف ان ہی سے ملاقات ہوئی تھی اور ان کی باتوں سے بھی ایسا ہی

انداز ہو رہا تھا۔ میں تو اُن کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی۔ میں نے اُن سے بھی پوچھا ہی نہیں اور اپنی

پریشانی تو جھٹ سے انہیں کہہ دی تھی۔ اب پتا نہیں کب ملوں گی اُن سے۔ خدا کرے اب جب بھی

ملاقات ہو ان کی ساری پریشانیاں دُور ہو چکی ہوں..... آج کل تو ہپا کی بیماری کی وجہ سے کالج بھی کم تہی

جاتی ہوں۔“

کبیر حسن اُس روز والے حادثے کے بعد کچھ بیمار تھے۔ انہیں ٹیبلٹ بھی تھا اور کچھ خور و نوش

تھے..... راکھ تو یہی تھی وہ تو اب مزید کو بھی پوری طرح پوچھ گچھ کے بعد ہی گھر سے باہر جانے دیتے

تھے۔ اگر بتائے ہوئے وقت سے لیٹ ہو جاتا تو انہیں فکر ہونے لگتی تھی۔

جویریہ اور راکھ تو اُن کی دیکھ بھال کرتی ہی تھیں۔ واجدہ اور مہناز بھی آ جاتیں جبکہ نزہت بہت کم

آتی تھی۔ وہ بھی صرف چند منٹ کے لئے اور یہ آنا بھی واجدہ کی ڈانٹ پر ہی ہوتا تھا۔ نزہت کا کہنا تو

”مہناز کو تو اپنا مطلب ہے، میں وہاں جا کر خواہ مخواہ ناٹم ضائع کیوں کروں..... اور یوں بھی ماموں

جان تو مجھ سے ناراض ہیں۔“

بڑی جھلاہٹ سوار ہونے لگی۔

جسید شاہ شہر آئے ہوئے تھے۔ بیٹے کی طرف سے دل میں بدگمانی سر اٹھا چکی تھی۔ انہوں نے بیٹے سے پہلے اس کے دوست آذر سے ملنا ضروری سمجھا اور وہ اس وقت اسی کے آفس میں موجود تھے۔ آفس کے ساتھ ساتھ ادھر ادھر کی باتیں بھی ہو رہی تھیں۔

”ارد شیر آج کل کیا کر رہا ہے؟“ آخر کار وہ اصل موضوع پر آ ہی گئے۔

آذر سنجیدہ ہو گیا اور بولا: ”معاف کیجئے گا انکل، آپ نے بیٹے کو لاڈ پیار میں اچھا خاصا بگاڑ دیا۔ وہ اب کچھ نہیں کر سکتا اور خدا کا فضل ہے اس پر، اسے کچھ کرنے کی ضرورت بھی کہاں ہے۔“ آذر نے اسے ہلکی سی سی گھل گئی تھی۔

”وہ شہر میں کوئی نئی ٹیگھی بنوا رہا ہے؟“ انہوں نے پوچھا۔

”نہیں تو۔۔۔ یہ آپ سے کس نے کہا؟“ آذر کو حیرت ہوئی۔

شاہ جی سانس کھینچ کر ذرا دیر کو چپ ہو گئے۔ اور پھر بتانے لگے۔

”وہ مجھ سے بڑی بڑی رئیس ادھر ادھر کے بہانے بنا کر لے چکا ہے، آذر بیٹا، تمہارا تو وہ دوست بہنہ ہی سمجھاؤ اسے۔“ ان کے انداز میں التجا تھی۔

”سمجھئے سمجھانے کا وقت تو اب گزر چکا ہے۔۔۔ وہ بہت آگے بڑھ گیا ہے۔ ماں آپ تو اس کے رہیں۔ آپ کا لحاظ ہوگا، آپ کی بات سن لے گا۔ آپ کو شش کر دیجئے۔ ممکن ہے کچھ تسنبل ہی جائے۔ آپ بڑی سیکم صاحبہ سے بات کریں۔ ارد شیر کو ان سے نہ صرف محبت ہے بلکہ وہ ان کا احترام بھی بہت کرتے ہیں، بہت مانتا ہے وہ انہیں۔“

”بیٹا۔۔۔ بڑی سیکم سے میں کیا بات کروں کہ سچ تو یہ ہے کہ بے جالاؤ پیار سب سے زیادہ دیا بھی رہا ہے۔ اسی نے ”میرا شہزادہ بیٹا“ کہہ کر اس کا دماغ خراب کر دیا ہے۔“ آج شاہ جی بیٹے کے ناجس انداز میں بات کر رہے تھے، اس سے پہلے بھی نہیں کی تھی۔

”انکل، ارد شیر کی وجہ سے تو میں بھی بہت پریشان ہوں، وہ میرا دوست ہے مگر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ جب کوئی بات اس کے دل میں سما جاتی ہے تو پھر اسے کچھ بھی سمجھا نہیں دیتا۔“

”کیا ہوا پتر؟“ لڑائی کی ہے اس نے تمہارے ساتھ؟“ شاہ نے فکرمندی سے پوچھا کہ

بڑے کچھ بھی بعید نہیں تھا۔

”ایک لڑکی ہے سوہا، میرے پڑوس میں رہتی تھی، ہماری فیملی سے بہت اچھے تعلقات تھے ان کے، میرے لئے تو وہ بہنوں کی طرح ہے۔۔۔ اور یہ بات میں نے ارد شیر کو بہت پہلے سمجھا دی تھی مگر

میں نے خیال نہیں کیا۔“

آذر نے ارد شیر اور سوہا والی بات انہیں تفصیل سے سنا دی پھر کہنے لگا۔

”ادرب مجھے اسی کی جانب سے دھڑکا لگا ہوا ہے، میرے بندھے ہاتھوں کا اس وقت تو لحاظ کر لیا

بڑا دھڑکا لگا ہے، بٹے کا نہیں اس بات سے۔“

شاہ جی کی پریشانی قابل دیدی تھی، جب بولے تو ان کی آواز میں ہلکی سی لرزش تھی۔

”یہ بھی ممکن نہیں، میرے پیا آج کل گھر پر ہی ہوتے ہیں، میں لیٹ ہو گئی تو زبردست ڈانٹ پڑ سکتی ہے مجھے۔“

”اوہو۔۔۔ ایک تو تم پر پابندی بہت ہے، کالج میں پڑھائی تو آج کل ہو نہیں رہی۔ ابھی چلے ہیں۔“

”اچھا کل میں ماما سے اجازت لے لوں گی پھر تمہارے ہاں چلوں گی۔“

اب اس نے خود کل کے لئے ہائی بھری تھی تو نورین نے بھی آج کے لئے اصرار نہیں کیا۔

ارد شیر کا دل بھی آج اس سے ملنے کو چاہ رہا تھا۔۔۔ سوچا کالج سے اسے اور نورین کو پک کر لے گا۔ نورین کے گھر میں ہی بیٹھ کر باتیں ہوں گی۔ وہ کالج کا نام ہونے سے چند منٹ پہلے ہی پہنچا تھا اور آفس میں جا کر میڈم سے ملنے کے بجائے یہیں گیٹ سے تھوڑے فاصلے پر گاڑی سے ٹیک لگائے کھڑا آتی جاتی لڑکیوں کو دیکھ رہا تھا۔ رات کا ابھی تک دکھائی نہیں دی تھی۔

نورین گھر جانے کے ارادے سے گاڑی لے کر باہر آ گئی۔ ارد شیر پر نگاہ پڑی تو اس کے قریب چلی آئی۔

”خوب جانتی ہوں شاہ، کس کے لئے آئے ہو اور تمہارے لئے اطلاع یہ ہے کہ کل وہ میرے ہاں آئے گی، تم بھی آ جانا۔۔۔ آج تو اُسے لازمی اپنے گھر جانا ہے، والد گھر پر ہیں ناں اُن کے۔“

”میں اُسے کہیں ساتھ لے جانے کے ارادے سے نہیں آیا، صرف ملنا چاہتا ہوں۔“

”بہتر ہے آج میرے ساتھ چلو، بچ اکٹھے کریں گے۔“

”نہیں، آج نہیں۔“ وہ رات کے ملے بغیر جانا نہیں چاہتا تھا، نورین کو صاف انکار کر دیا۔

مزید دس منٹ بعد جب وہ اس انتظار سے اچھا خاصا بور ہو چکا تھا۔ اُس نے سفید گاڑی میں مزید کو دیکھا، وہ یقیناً کسی کو لینے آیا تھا۔ یہ تو وہی لڑکا ہے جسے میں سوہا کے ساتھ کئی مرتبہ دیکھ چکا ہوں۔۔۔ اور جس روز سوہا کا پیچھا کر کے اس کے گھر کا پتا لگایا تھا، تب بھی یہ اس کے ساتھ تھا۔

وہ اب گیٹ کے بجائے مزید کو دیکھ رہا تھا جبکہ مزید اس بات سے قطعی بے خبر بہن کا انتظار کر رہا تھا۔ ذرا دیر بعد رات کے گیٹ سے باہر آئی، ادھر ادھر دیکھے بغیر وہ مزید کی گاڑی میں فرنٹ سیٹ پر بیٹھی اور چلی گئی۔

”رات کا اور اس لڑکے کے ساتھ۔۔۔“ اُسے کوفت نے آن گھیرا۔ ”اتنی دیر انتظار میں کھڑا رہا اور وہ دیکھے بغیر چلی گئی۔۔۔ یہ لڑکا کون ہے، کیا تعلق ہے اس کا رات کے ساتھ۔“

رات کے جس قسم کی لڑکی تھی، وہ کوئی غلط بات نہیں سوچ سکتا تھا۔ بس یہی اُلجھن تھی کہ مزید کون ہے اُس کا بھائی یا کزن۔۔۔ جو بھی ہو، یہ اچھا نہیں ہوا۔

اسے سوہا کے ساتھ اپنا سلوک یاد آ گیا۔ اگر یہ لڑکا واقعی سوہا کے ساتھ سیریس ہے تو پھر۔۔۔ محبت انسان کو قدم قدم پھونک پھونک کر رکھنا سکھا دیتی ہے۔ دھڑکا سا ہی لگا رہتا ہے۔ کہیں من کا میت بھجھڑنا جائے۔ یہی حال اس وقت ارد شیر کا تھا۔ وہ جب یہاں سے واپس آیا تو اچھا خاصا آپ سیٹ تھا۔ ملازم نے کھانے کے بارے میں پوچھا تو بھی اس نے منع کر دیا۔ کچھ سوچ کر نورین کا نمبر ملایا تو پتا چلا وہ گھر نہیں ہے۔ نورین کو ضرور پتا ہوگا۔ وہ تو اس کے سب گھر والوں کو جانتی ہے مگر اس سے بات نہیں ہو سکی۔

”یہ جان کر بھی کہ وہ تمہارے لئے بہنوں کی طرح ہے، پھر بھی.....“
”کہاں ناں انگل، جب کوئی بات اس کے دل میں سما جاتی ہے تو پھر اسے کچھ سمجھائی دیتا۔“
شاہ جی کا ذہن کہیں اور ہی گم تھا۔ ارد شیر کا بار بار گاؤں آنا، زینت سے اتنا اچھا رویہ اور.....
جب وہ گھر میں داخل ہوئے تھے، ارد شیر اور زینت کسی بات پر ہنس رہے تھے، اُن کے آتے یہ نہ نہ.....
گئے تھے۔

”آخر یہ بات پہلے میری سمجھ میں کیوں نہیں آئی..... نہیں میں سمجھ تو گیا تھا مگر قبول کرنے.....
چھپکا ہٹ تھی۔ میں ارد شیر سے کسی ایسی گھٹیا حرکت کی توقع نہیں کر سکتا تھا۔“
انہیں پسینہ آ گیا۔ کپ میز پر رکھ کر ایک دم ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔ آذر نے بیٹھے کو کہا تو.....
آؤں گا، کہہ کر آفس سے چلے آئے۔ گاڑی میں بیٹھے ہی ذرا نیورے ارد شیر کے ہاں چلنے کو کہا۔
تمام راستہ ان کے ذہن پر ارد شیر اور زینت سوار ہے۔ ”پہلے پہل میں نے صاف محسوس کیا تھا.....
اس شادی پر خوش نہیں ہے مگر بعد میں زینت سے اُس کا رویہ بے حد دوستانہ ہوتا گیا اور سب سے بڑا.....
آخری منظر اس مرتبہ جب وہ گاؤں آیا تھا، جب میں نے کہا تھا آؤ میرے ساتھ باہر چلو تو صاف.....
دیا تھا۔ جب میں ذرا دیر کے بعد گھر واپس آ گیا تو زینت چادر پکڑے اُس کی چار پائی کے پاس.....
تھی۔“

”شاہ جی، اب تو چھوٹے سرکار گاؤں آنے لگے ہیں۔ پہلے تو آنے کا نام ہی نہیں لیتے تھے.....
ڈرائیور کی آواز، تھوڑے کی طرح اُن کے سر پر پڑی۔

وہ اُس کی بات کا جواب نہیں دے سکے۔ آنکھیں موندے بیک سے ٹیک لگائے بیٹھے.....
یہاں تک کہ ارد شیر کا گھر آ گیا۔ وہ چاہ رہے تھے کہ بیٹا اس وقت گھر نہ ہوتا کہ وہ اپنی کیفیت.....
سکس مگر وہ گھر پر ہی تھا۔ ان کی آمد کا سن کر استقبال کو آیا مگر طنزیہ انداز میں بولا.....

”اچھا تو آج آپ بھی گاؤں سے نکل ہی آئے۔“
”اُنہوں نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ دونوں ساتھ ساتھ چلتے سنگ روہ میں آئے۔

”کیسے ہیں آپ.....؟ اور آپ کی چھوٹی بیگم کا کیا حال ہے.....؟“
انہیں لگا کہ ان کا حال تو یونہی پوچھ لیا ہے اصل مطلب تو اسے زینت سے ہے۔ انہوں نے.....
اسے دیکھا اور غی سے بولے.....

”میری بیوی تمہاری کچھ نہیں لگتی.....؟“
”کم آن بابا جان..... کیوں تماشا بنواتے ہیں آپ ہمیں، اب میں اسے ماں کہتے ہوئے.....
ہوں کیا.....؟“

”تماشا میں نہیں تم بنا رہے ہو ارد شیر شاہ، جو رشتہ ہے اسے پیچانو، قبول بھی کرو ورنہ اچھا.....
تمہارے لئے.....“ وہ پھٹ پڑے۔
اتنا لہجہ، وہ حیران ہوا..... ان کے چہرے کی جانب دیکھتا ہوا نشست سے اٹھ کھڑا.....
گہری سنجیدگی اور کھڑپن سے بولا.....
”کیا اچھا نہیں ہوگا، کھل کر کہیں جو کہنا چاہتے ہیں..... اس عمر میں شادی آپ نے کی، ایک.....

بہت کو گھر آپ لائے، مزارع کی بیٹی کو بیوی آپ نے بنایا، اس پر روپیہ آپ نے لٹایا..... اور قصور.....
مارے میرے ہو گئے۔ وہ جواب نہیں اور اب ضد یہ کہ میں اسے ماں بھی کہوں۔“ وہ استہزائیہ انداز میں.....
بنا پھر سنجیدہ ہو گیا اور بولا.....

”میری جگہ خود کو رکھ کر سوچئے تاکہ محسوس کر سکیں کہ یہ بات کس قدر مضحکہ خیز ہے۔“
”اچھا.....“ انہوں نے دانت پس کر اس کی جانب دیکھا اور بولے..... ”پھر..... تم کیا کہنا.....
چاہے ہو اسے.....؟“ اُن کے لہجے میں گہرا طنز اور آنکھوں میں جیسے خون اتر آیا تھا۔

”جی کہ وہ صرف آپ کی بیوی ہے۔“ شاہ جی کے مقابلے میں ارد شیر کا انداز خاصا دھیمہ تھا، وہ.....
حیران تھا کہ آج باپ کو اس قدر غصہ کیوں آرہا ہے.....؟ اور اتنی ضد کیوں کر رہے ہیں وہ۔
”نہیں نہیں ارد شیر..... جھوٹ مت بولو، تم نے اس رشتے کو کبھی قبول ہی نہیں کیا۔“ انہوں نے.....
اٹ کر کہا۔

”آپ صاف کہئے میں آپ کو اچھا نہیں لگتا..... میرا گاؤں آنا آپ پسند نہیں کرتے۔“ وہ تو اس.....
فاظ سے کہہ رہا تھا کہ گاؤں جاتا تھا تو رقم مانگتا تھا، جو شک با..... اس پر کر رہا تھا، وہ تو سان و گمان میں بھی نہ.....
ٹھاس کے۔

”یہ سب تمہارے ذہن کی اختراع ہے..... ہونہ! وہ بیٹا جسے میں نے اتنے..... پیار سے الا تھا،.....
جس کی خاطر دنیا بھلا دی تھی، آج وہ میری محبت پر شک کر رہا ہے اور تم کہتے ہو زینت مزارع کی بیٹی ہے تو.....
تمہاری ماں کہاں کی ملکہ تھی۔“

”میری ماں کی بات مت کرنا بابا.....“ اب کے ارد شیر کا لہجہ اور انداز سرکش ہوا۔ ”وہ غیر سید ضرور.....
تمی مگر ایک معزز خاندان سے تھی، تعلیم یافتہ لوگ ہیں، میری تخیال دولت مند نہیں مگر باعزت ضرور ہے،.....
آپ میری مری ہوئی ماں کو بیچ میں مت لائیں۔ بات کو ذرا سرائی مت دیں۔ بات تو آپ کی محبتوں کی.....
ہے، بیٹا ہوں آپ کا، جائیداد پر حق ہے میرا..... مگر ذرا سامی مانگ لوں تو حساب ہونے لگتا ہے۔“
مارے غصے کے انہوں نے چیک بک نکالی اور اس کے سامنے پھینک دی۔

”جتنی رقم دو کر رہے ناں تمہیں، وہ لکھ دو، میں سامین کر دیتا ہوں اور کان کھول کر سن لو، تمہیں اب.....
گاؤں آنے کی ضرورت نہیں۔“

(اب سب کچھ بیوی کے لئے ہے) اس خیال نے ارد شیر کے سارے جسم پر ڈنک مارا۔ اُس نے.....
بیک بک پر پاؤں رکھا اور وہاں سے چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد شاہ جی بھی وہاں سے آ گئے۔
ارد شیر نے کبریٰ خاتون کو فون کیا اور ساری تفصیل سے آگاہ کرنے کے بعد بولا.....

”میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا، میرا باپ اس حد تک بدل جائے گا۔ آپ تو کہتی ہیں انہیں بیٹے کی.....
بڑی چاہ تھی، بڑی مرادوں کے بعد میں اس دنیا میں آیا تھا..... کیسے کی چاہ تھی بڑی ماں کہ ایک عورت کے.....
آتے ہی انہیں بیٹے کا وجود کھٹکنے لگا ہے۔“

”تم بھی تو زیادتی کر جاتے ہو ارد شیر، دیکھو ناں اب وہ بوڑھے ہو گئے ہیں، برداشت کم ہو گئی ہے.....
ان میں، تم ان کے سامنے سر اٹھاتے ہو تو انہیں اپنی کمزوری کا احساس ہوتا ہے۔“

”میں نے کچھ نہیں کہا، کوئی ایسی ویسی بات نہیں کی۔ سارا قصور ان کا ہے، کیا میں نے مشورہ دیا؟ زینت سے شادی کا.....؟“ وہ اچانک گرم ہو کر بولا.....

”اچھا اچھا..... تم کیوں پریشان ہو رہے ہو خواہ مخواہ میں، گھروں میں جھگڑے تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔ انہوں نے جو کچھ کہا، کوئی اہمیت مت دو، تم گاؤں ضرور جاؤ اور جا کر حویلی ہی میں ٹھہرو، ان دونوں کے ساتھ اسی انداز میں طویسے کہ پہلے ملتے تھے۔“

”ناممکن.....“ اُس نے قطعیت سے کہا۔

”اپنا ہی نقصان کرو گے..... دیکھو جب تک جائیداد تمہارے ہاتھ میں نہیں آتی ہے، تمہیں بڑے ضبط سے کام لینا ہوگا۔“

”وہ میری صورت دیکھنے کے روادار نہیں، آپ مشورے دے رہی ہیں۔“

”میری تو غلط فہمی ہے تمہاری، باپ اگر بچوں کو کبھی غصے میں ڈانٹ دے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ ان کا دشمن بن گیا ہے، تم گاؤں جاؤ، زینت سے ملو، دیکھو کہ شاہ جی کی تم سے ناراضگی کے جواب اس کا کیا رویہ ہے تمہارے ساتھ..... میرا خیال ہے وہ اچھی عورت ہے، باپ بیٹے کے جھگڑے میں اس کی کوئی قصور نہیں ہوگا..... مگر پھر بھی اپنے اندازوں سے زیادہ ضروری یہ ہے اس سے مل کر ہی کوئی رائے قائم کی جائے..... تم شاہ جی سے بھی معافی مانگ لو تو اچھا ہے۔“

”معافی کس بات پر، قصور میرا نہیں ہے، میں ہرگز معافی نہیں مانگوں گا۔“ اُس نے صاف انکار کر دیا۔

”ہاں ہاں، بے شک منہ سے مت کہنا مگر رویے سے تو ظاہر کر سکتے ہو کہ تم شرمندہ ہو۔“

”میں شرمندہ نہیں ہوں.....“

”اچھا چلو رویے سے بھی ظاہر مت کرنا مگر وہاں جاؤ ضرور اور سنو ذرا صبر اور ضبط سے کام لیتا۔“

”ٹھیک ہے چلا جاؤں گا۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ انہیں انکار نہ کر سکا۔

”میں تمہارے کالج آیا تھا تم سے ملنے کے لئے، کتنی دیر مجھے انتظار کرنا پڑا۔“

”اچھا، پھر ملے کیوں نہیں.....؟“ رانچہ نے حیرت سے پوچھا۔

”کیسے ملتا، میرے دیکھتے ہی دیکھتے تم ایک لڑکے کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر ہوا ہو گئیں۔ ویسے کون تھا وہ لڑکا.....؟“ وہ اصل میں تو یہی پوچھنا چاہتا تھا۔

”ہاں، بھیا لینے آئے تھے مجھے۔“

”اچھا تو وہ تمہارا بھائی ہے۔“ ارد شیر کی پیشانی پر تفکر کی لکیریں ابھریں۔

”ہاں وہ میرے بہت پیارے بھائی ہیں عزیز..... عزیز حسن نام ہے اُن کا۔“

”تمہیں پتا ہے رانچہ، وہ سوہانامی ایک لڑکی میں انٹرنلڈ ہے۔“

”اچھا..... مگر آپ کو کیسے پتا چلا.....؟“ اُس نے حیرت سے کہا۔

”سوہانامی وہ لڑکی گلوکارہ یا سیمین بیگم کی بھانجی ہے، میں نے تمہارے بھائی کوئی بار اس لڑکی کے ساتھ دیکھا ہے۔“

”کیا مطلب.....؟“ وہ سمجھی نہیں۔

”مطلب یہی کہ میں نے آزاد زندگی گزاری ہے۔ اپنے لئے سب جائز سمجھا ہے۔ اب خیال آتا ہے، جب تو میں نے بھی سوچا بھی نہیں تھا اور میں نے یہ بھی کب سوچا تھا کہ تم مجھ لے جاؤ گی..... اور میں.....“

”بہن بھائیوں گا، میں تو سمجھتا تھا، دل نام کی کوئی شے ہے ہی نہیں میرے پاس، یہ پیار محبت میرے نزدیک بے بیکاری باتیں تھیں، میں سمجھتا تھا جو کچھ بھی ہے وہی ہے، کسی کو سر پر سوار کرنا تو زنی حماقت ہے مگر تم سُن کر احساس ہو رہا ہے، دل ہے میرے پاس اور میں محبت کر سکتا ہوں۔“

”کوئی اور بات کریں۔“ رانچہ نے پھر کہا۔

”اور بات.....“ اُس کی آنکھوں میں شرارت کی چمک ابھری اور بولا..... ”نورین کو بلا لاؤں،“

”نورین سے تم نے اُسے یاد نہیں کیا۔“ رانچہ اس کی شرارت سمجھی نہیں، بولی.....

”ہاں نورین کو بلا دیں، پتا نہیں کہا رہ گئی ہے۔“

”وہی ہے تمہاری بات سن بھی رہی ہو یا نورین کو ہی یاد کرتی رہی ہو۔“

”نہیں نہیں نورین کو تو نہیں سوچ رہی۔“ اُس نے جلدی سے وضاحت کی۔

”جب میں پاس ہوں، اس وقت صرف مجھے دیکھا کرو، مجھے ہی سوچا کرو۔“ وہ بڑی سنجیدگی سے بولا تھا، رات کو نے سعادت مندی سے اثبات میں سر ہلادیا۔

کچھ دیر کے لئے خاموشی چھا گئی۔ رات کو اس کے سامنے ہمیشہ ہی خاموش رہا کرتی تھی۔ اس وقت وہ بھی کسی سوچ میں گم تھا۔

”دیکھو رات کو، وقت ایک سا نہیں رہتا، آج میرے پاس وہ سب کچھ ہے، جس کی خواہش تم کر سکتی ہو مگر یہ بھی ممکن ہے کل یہ سب کچھ میرے پاس نہ ہو، وعدہ کرو ہر صورت میں میرا ساتھ دو گی۔“

”میں نے دولت کو کبھی اہمیت نہیں دی اور نہ دوں گی۔“ رات کو یہ کہتے ہوئے ذرا نہیں ہچکچائی۔

”تمہیں اپنی محبت مان کر میں نے کوئی غلطی نہیں کی، یہ خیال مجھے پہلے بھی تھا، اب بھی ہے۔“

”کوئی پریشانی ہے آپ کو، ایسی باتیں کیوں کر رہے ہیں؟“ رات کو اس کی بات سے زیادہ اس کے بچھے بچھے انداز پر فکر مند تھی۔

”بس کبھی کبھی ایسے ہی مجھے لگتا ہے جیسے سب کچھ ہے مگر کچھ نہیں ہے۔ میں لاکھ چاہنے کے باوجود اس کیفیت سے بچھا نہیں چھڑا پار ہاں مگر خیر دفع کرو، ٹھیک ہو جائے گا، سب کچھ، آج کل میرے بابا جان بھی مجھ سے کچھ ناراض ہیں، خواہ مخواہ ہی ضد کرنے لگے ہیں، مجھے بھی پروا نہیں، وہ اپنا رشہ بھول سکتے ہیں تو میں بھی فراموش کر سکتا ہوں۔ اصل میں انہیں یہ فکر لاحق ہو گئی ہے کہ کہیں میں حصہ نہ مانگ لوں۔“

”آپ نے والد صاحب سے لڑائی کی ہے؟“ رات کو کون کر کچھ ڈر سا لگا۔ جو باپ کو یہ عزت دینا ہے، وہ باتوں کے ساتھ کیا کچھ نہیں کر سکتا، واہ رے دل کہاں لا پھنسا یا ہے۔

”ابھی تو زیادہ نہیں مگر حالات بتا رہے ہیں، جھگڑا ختم نہیں ہوگا اور بڑھے گا۔“

”مگر آپ بیٹے ہیں، اُن کے اکلوتے بیٹے، وہ تو بہت پیار کرتے ہوں گے آپ سے۔“

”ہونہ۔ عورت کا نشہ چڑھ جائے، تب بیٹے کہاں دکھائی دیتے ہیں، وہ اُلو۔۔۔۔۔“ وہ گالی دیتے دیتے رُک گیا، لحاظ آ گیا تھا اس کا، بات بدل کر بولا۔۔۔۔۔

”تم فکر نہ کرو، بیاہ کر کے گھر میں نہیں لاؤں گا۔ اپنا حق نہیں چھوڑوں گا، ایک ایک پائی وصول کر کے رہوں گا۔“

”آپ جھگڑا مت کریں، آخر وہ والد ہیں، بزرگ ہیں آپ کے، زیادہ دیر ناراض نہیں رہ سکتے وہ آپ سے۔“

”ڈر گئی ہو۔۔۔۔۔“ بغور اسے دیکھ کر وہ ہنسی اُڑاتے ہوئے بولا۔

”ہاں مجھے لڑائی جھگڑے سے ڈر لگتا ہے۔“ اُس نے اعتراف کیا۔

”دل مضبوط کرو، میری زندگی میں شامل ہو کر یہ سب تو دیکھنا ہی ہوگا، ہم اُن کی خاطر جان دے بھی سکتے ہیں اور لے بھی سکتے ہیں۔ ابھی تو میں ان مسکوں سے دُور ہوں۔ شہر میں ہی وقت گزرتا ہے مگر جب یہ سب میری نگرانی میں آ جائے گا، تب گاؤں جانا پڑے گا اور چھوٹے موٹے لڑائی جھگڑے تو خیر چلتے ہی رہتے ہیں، تم دل مضبوط کرو، بہادر بنو، ماں کی طرح۔۔۔۔۔ ہاں۔ کیا عورت میں وہ بہادر، بڈر، ذٹ کربات کرنے والی اور اپنی منوا کر چھوڑنے والی، میرا خیال ہے تم جیسی لڑکی تو ان کے سامنے بول نہیں

سکتی، ان کے سامنے جاتے ہوئے بھی ڈرا کرو گی۔“

”بہت سخت گیر ہیں۔“ رات کو بے چاری ابھی سے ڈر گئی۔

”بہت۔۔۔۔۔ مگر میرے لئے تو سراپا شفقت ہیں لیکن ان کی شخصیت میں کوئی ایسی بات ہے ضرور کہ جو کوئی چاہتا ہے۔ اب میں گاؤں جاؤں گا تو انہیں ساتھ لے کر آؤں گا۔ اور تمہاری طرف سے کوئی وہ، انہیں وہی احترام تمہارے ہاں بھی ملنا چاہئے جو ہم انہیں دیتے ہیں۔“

”جی۔“ وہ سر جھکا کر صرف اسی قدر کہہ سکی۔

”انکار مجھے پسند نہیں۔“ انداز رعونت بھرا تھا۔

”میں کیا کہہ سکتی ہوں۔“ رات کو کا سر اور بھی جھک گیا اور اس کے انداز پر دل گھبرانے لگا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا۔۔۔؟ تم کیا سمجھتی ہو، اگر تمہارے گھر والے انکار کر دیں گے تو بات ختم ہو جائے گی، بولو کیا سوچے بیٹھی ہو تم، حیرت ہو رہی ہے، ایسا سوچا بھی کس طرح، اتنی ملاقاتوں میں تم مجھے کبھی نہیں سکیں۔ مگر اب غور سے سنو اور یاد بھی رکھنا، میں ارد شیر شاہ ہوں جو چیز پسند آجائے، زبردستی ہی اٹھا لیا کرتا ہوں۔ یہ بات تم اپنے والدین کو بھی سمجھا دینا۔“

”شاہ صاحب۔۔۔۔۔“ اُس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھا۔۔۔۔۔ اور گھبرا کر چہرے کے دائیں بائیں دونوں ہاتھ رکھ لئے۔

”بہتر یہی ہے، وہ مان جائیں، اسی میں اُن کی عزت ہے۔“ اُس نے سلسلہ کلام جاری رکھا۔

”ایسی کوئی بات سوچئے گا بھی مت، وہ بھی عزت دار لوگ ہیں، عزت کی خاطر بیٹی کی قربانی دے دیتے ہیں۔“ وہ تکی ہی بزدل، گھسی ہی سہمی ہوئی، شرمیلی لڑکی تھی مگر جہاں والدین کی عزت پر اُس نے اتنی کڑی، خاموش نہیں رہی سکی۔۔۔۔۔ اسے ارد شیر کا اناز، اس کی بات بے حد غلط محسوس ہوئی تھی، خواہش مند تو بڑبڑا رہا تھا۔ اور یہ پہلے ہی اٹھا لینے کی دھمکی دے رہے ہیں، جھک کر بات کرنے پر تیار نہیں، سے رونا آ رہا تھا۔

”اگر وہ نہ مانے تو پھر تم کیا کرو گی، کیا تم میرے لئے ان سب کو چھوڑ سکو گی؟“

”وہ مان جائیں گے۔“ ارد شیر جو سننا چاہتا تھا، وہ ایسا سوچتا بھی نہیں جانتی تھی۔

اُس کے اس جواب نے اس کے پاؤں میں جیسے انکار سے بچھا دیئے۔ جھٹکے سے اٹھا، کرسی ایک طرف کی اور چل پڑا۔

”سنئے تو۔۔۔۔۔ پلینز ناراض نہ ہوں۔۔۔۔۔“

وہ اٹھ کر پیچھے آئی مگر ارد شیر کی رفتار بہت تیز تھی، غصے میں اسے کچھ سنائی بھی کب دے رہا تھا۔ نہ زلف وہ مکرے سے نکلا بلکہ گھر بھی چھوڑ کر چلا گیا۔

”کیا ہوا، شاہ بہت غصے میں تھا۔؟“ اس کے جاتے ہی نورین اس کے پاس آئی اور پوچھنے لگی،

”ہاں، انہوں میں گراؤں رہی تھی۔“

”بولو ناں، کیا کہہ دیا ہے تم نے اُسے؟“

رات کو نے سر اُٹھا دیا اور پچھتائے کے ساتھ بولی۔

”میں اسی بات سے ڈرتی تھی، میں اس راہ پر چلنا نہیں چاہتی تھی مگر پتا نہیں کیسے قدم اٹھتے ہی چلے

گئے، اب تو اتنا آگے آگئی ہوں کہ واپسی ممکن ہی نہیں۔
وہ اور بھی تو اتارے رونے لگی۔

تو سلی دے رہا تھا۔
زیتون کو بہت دیر بعد قرار آیا، عمر کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے اور بولیں.....
”تم مجھ سے وعدہ کرو، میرے پاس رہو گے، میری آنکھوں کے سامنے، اسی گھر میں، میرے قریب۔“

”اماں..... پیاری اماں، کسی باتیں کر رہی ہیں آپ، میں بھلا کہاں جا سکتا ہوں۔“
”تم وعدہ کیوں نہیں کرتے؟“ انہوں نے غصے سے اس کے ہاتھ جھٹک دیئے۔
”میں وعدہ کرتا ہوں اماں، آپ کے پاس رہوں گا، آپ کے قریب آپ کے ساتھ۔“
”اور تم میری ہر بات مانو گے۔“

”ہاں ہاں..... ہر بات مانتا تو ہوں اور مانتا رہوں گا۔“

”بہت ڈکھ دیکھے ہیں بیٹے، میں نے تمہیں اور رابعہ کو بڑی مشکلوں سے پالا ہے اور آج جب تم پڑھ لکھ کر اس قابل ہو کہ میرا سہارا بن سکو تو مجھے چھوڑ کر چل دو۔ یہ میں برداشت نہیں کر پاؤں گی۔“
”اماں، کیا ہو گیا ہے آپ کو..... میں اور آپ کو چھوڑ کر چلا جاؤں گا..... میں آپ کا بیٹا ہوں اماں.....“ وہ بہت پیار سے سلی دے رہا تھا اور اُن کی باتوں پر پریشانی بھی تھا۔ بھلا وہ ایسا کیوں کہہ رہی تھیں۔ کیا بات تھی ان کے دل میں ورنہ آج سے پہلے کبھی انہوں نے ایسا نہیں کہا تھا۔
”پتا نہیں..... پتا نہیں.....“ زیتون نے سر تکیے پر اڈھر اڈھر مارا۔ عمر تسلیاں دیتا رہا مگر ان کے دل میں ایک وہم آ گیا تھا۔

بار بار آنکھوں کے سامنے وہ منظر آٹھہرتا، جب گینے نے ننھا بچہ اس کے حوالے کیا تھا اور بعد میں بتایا تھا، اس کی ماں کی تو شادی ہو چکی ہے، اب یہ بچہ تم رکھ لو، ممکن ہے اس کی ماں پہچان کر بھی انجان بن جائے، اس نے اپنے دوسرے شوہر کو اس بچے کے بارے میں نہ بتایا ہو، وہ اپنے بیٹے کو پہچان تو نہیں سکے گی کہ تپ نہ ننھا سا بچہ تھا، اب جوان سے مگر مجھے دیکھ کر اسے سب کچھ ضرور یاد آ جائے گا اور اگر اُس نے اپنے بیٹے کی واپسی کا مطالبہ کر دیا تو..... مگر کیا میں یہ جھوٹ پورے اعتماد کے ساتھ بول سکوں گی.....؟ شاید نہیں بول پاؤں گی۔

زیتون بیمار تھیں، ان سوچوں نے طبیعت اور بھی خراب کر دی۔ ایک بار پھر اپنے عمر کو کھونے کے تصور سے دل ڈوبنے لگا۔

”میں عمر کو کسی قیمت پر نہیں چھوڑ سکتی۔ لیکن اگر اُس نے خود ہی اپنی ماں کے پاس جانے کی خواہش کا اظہار کر دیا تو.....؟“

ساری رات وہ جاگتی رہیں اور ان ہی سوچوں میں الجھی رہیں۔

راٹھ، نورین کے ساتھ شاپنگ کے لئے آئی تھی۔ اصل میں خریداری تو صرف نورین کو کرنا تھی، اُسے تو بونہی اپنے ساتھ کھینچ لیا تھا۔
”اگر مجھے پتا ہوتا اتنی دیر لگاؤ گی تو کبھی نہ آتی.....“ راٹھ بے زار ہو کر کہہ رہی تھی۔
”ارے یہ تو آؤ رہے شاہ کا بہت اچھا دوست۔“ نورین کی نگاہ آؤر پر پڑی تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ

شام عمر ماں کو لے کر کینک پر گیا تھا۔ واپسی پر انہیں فٹ پاتھ پر انتظار کرنے کو کہہ کر روڈ والے سے کرایہ طے کر رہا تھا۔ سامنے سپر مارکیٹ بھی اور زیتون نے مزید کو ایک عورت کے ساتھ جاتے دیکھا۔

”یہ عورت.....“ اسے پہچاننے میں ایک لمحے کی بھی دیر نہیں لگی..... سب یاد آ گیا۔ ”یہ تو اس کی ماں ہے۔“

زیتون کو قدموں تلے سے زمین سرکنے کا احساس ہوا۔ یوں لگا اگر ذرا دیر بھی یہاں رکی تو عمر بڑھ کے لئے پھنجر جائے گا۔

”عمر..... عمر..... جلدی کرو، اگر زیادہ پیسے مانگ رہا ہے تو بھی کوئی بات نہیں۔“
وہ اتنا کہہ کر کٹے میں سوار ہو گئیں، یوں لگ رہا تھا، وہ اپنی بیماری فراموش کر چکی ہیں، یادیں بُرے کر اُن کے لئے تو یک قدم اٹھانا بھی دشوار ہو رہا تھا۔

”اماں..... مزید بھائی اور اُن کی والدہ.....“ عمر کی نظر سڑک پار کھڑے ان دونوں پر پڑی۔
”عمر.....“ زیتون نے سختی سے اس کا بازو پکڑ لیا اور بولیں..... ”جلدی چلو، میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

”اچھا اماں.....“ اُس کی نگاہیں جو یہ یہ تھیں مگر زیتون کی بات ٹال نہیں سکا۔
”چلو رکشے والے جلدی کرو۔“ انہیں یہ فکر تھی عمر، مزید کو آواز نہ دے ڈالے۔
کچھ آگے جا کر جب یہ یقین ہو گیا کہ وہ دونوں پیچھے رہ گئے ہیں تو بولیں.....
”کیا مزید کا گھر یہاں سے قریب ہی ہے؟“

”نہیں تو اماں، وہ لوگ تو یہاں نہیں رہتے..... شاید خریداری کے لئے آئے ہوں..... آپ کی طبیعت کیسی ہے اب؟ میں اسی پریشانی میں ان سے ملا بھی نہیں، خیر کوئی بات نہیں، چلیں گے اب کی روز اُن کے ہاں.....“

زیتون نے نفی میں سر ہلادیا اور ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولیں.....
”نہیں مجھے وہاں نہیں جانا.....“ زیتون کی حالت بہت عجیب سی ہو رہی تھی۔ وہ گھبراہٹا ہوا پوچھتا۔

”آپ ٹھیک تو ہیں؟“

وہ ہر بار اثبات میں سر ہلاتی مگر وہ سمجھ رہا تھا، اُن کی طبیعت ٹھیک نہیں، گھر آتے ہی وہ ہلکا لیٹ گئیں اور رونے لگیں۔

”ہائے اماں..... کیا ہوا آپ کو.....؟“ رابعہ گھبرا گئی۔

”اماں اماں..... پریشانی نہ ہوں، کیوں رونے لگی ہیں، ایسے مت کریں میری اچھی اماں.....“ بہت جلدی ہو جائیں۔ ڈاکٹر نے بھی تو اتنی سلی دی ہے۔“ وہ اُن کا ہاتھ سہلاتے ہوئے انہیں

”نورین! تم تو شاہ صاحب کو ایک عرصے سے جانتی ہو کہ وہ کیسے آدمی ہیں۔“
”اچھا اچھا..... اب شاہ کی باتیں نہیں، مجھے ذرا شاپنک کر لینے دو۔“
وہ اپنی خریداری میں مگن رہی۔ رات کو ڈوبتے دل کے ساتھ اس کے ساتھ ساتھ چلتی رہی۔ گاڑی میں آکر ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہوئے نورین نے اس سے پوچھا۔
”تم شاہ کے بارے میں کوئی بات کر رہی تھیں؟“
اُس نے بات نہ برداری..... وہ تہہ بہہ لگا کر ہنس پڑی..... اور بولی.....
”سارے مرحلے طے کرنے کے بعد اب تمہیں یہ خیال آیا ہے کہ وہ کیسے آدمی ہیں، تم بھی کیا ہی خوب ہو سوئی.....“

”بتاؤ ناں، کیا وہ روایتی امیر زادے ہیں؟“
”تو تم اب تک اسے کیا سمجھتی رہی ہو.....؟ نورین کا موڈ ہنوز وہی تھا۔
”مجھے تو ہمیشہ مہرباں دوست کی طرح لگے ہیں۔“

”واہ..... کیا پہچان ہے تمہیں لوگوں کی۔“ اُس نے مذاق اڑایا۔
”اگر وہ ایسے تھے تو تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟“ اُس کی آواز میں لڑش تھی۔ ارد شیر کے بارے میں وہ یہ باتیں نہیں سننا چاہتی تھی۔ یہ اس کے لئے قابل قبول نہیں تھی۔ کاش نورین کہہ دے، میں مذاق کر رہی تھی، وہ اچھے ہیں، بہت اچھے۔
”تم نے مجھ سے پوچھا کہ اب اور ویسے بھی اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ زندگی کی راہ میں ہر قسم کے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ ہمیں دنیا داری نبھانے کو اچھے طریقے سے ملنا ہی پڑتا ہے۔“
”نورین! میں تو بہت آگے آگئی ہوں۔“ وہ رو ہانسی ہو گئی۔

”سب کتنے غلط طریقے سے ذکر کر رہے تھے شاہ کا، وہ جو قریبی دوست تھا وہ بھی اور نورین بھی۔ غلطی میری ہے، میں نے ماما کے اعتماد کو دھوکا دیا ہے، میرے ساتھ یہی ہوتا تھا۔“ دل کی چوٹ اسے بے چین کر رہی تھی، درد پھیلتا جا رہا تھا۔

زینت، حبیب شاہ کے ساتھ کبریٰ خاتون سے ملنے گئی تھی۔ شیریں سے بھی ملاقات ہوئی۔ اُسے اور اُس کے بیٹے کو تحائف بھی دیئے جبکہ کبریٰ اور شیریں اس سے اچھے طریقے سے نہیں ملیں مگر زینت نے ان کے رویوں کی کوئی شکایت شاہ جی سے نہیں کی۔

”تم بہت اچھی ہو زینت۔“ واپسی پر وہ دل سے قائل ہو کر کہہ رہے تھے۔
”یہ سب آپ کے حوالے سے میری بھی سب کچھ ہیں، وہ سمجھیں نہ سمجھیں مگر میں نے انہیں ان ہی رشتوں کے ساتھ قبول کیا ہے جو آپ کے حوالے سے ان کے میرے ساتھ بنتے ہیں۔“

”ارد شیر کو بھی.....“ اُن کے لبوں پر نہ چاہتے ہوئے بھی یہ سوال آ گیا تھا۔
”ہاں انہیں بھی.....“ اُس کے لہجے کی سچائی شاہ جی کو قرار بخش گئی۔ وہ انہیں پہلے سے کہیں زیادہ اچھی لگی اور ساتھ ہی یہ خیال بھی آیا کہ ارد شیر نے اس رشتے کو اس طرح قبول نہیں کیا۔
میں نے جب بھی اسے یہ کہا زینت تمہارے لئے ماں کی جگہ ہے، اُس نے انکار کیا اور پھر اُس کا

خدا کا، تمہارے کمر اس کی طرف بڑھی۔
”اودہ بابا، اگر ان کے دوست ہیں تو میرا تعارف کیا ضروری ہے.....؟“ مگر نورین نے اس کی ایک نہیں سنی۔

”ہلو آؤ صاحب.....“ نورین بے تکلفی سے مخاطب تھی جبکہ وہ فوری طور پر پہچان بھی نہیں سکا۔
”آپ آذر ہیں ناں..... ارد شیر شاہ کے دوست؟“
تب اسے بھی یاد آ گیا اور اس نے سر اثبات میں ہلادیا۔
”کیسے ہیں آپ.....؟“ نورین مسکرائی۔
”اچھا ہوں..... شکر الحمد للہ.....“ اُس کے انداز میں بنجیدگی اور کچھ دکھائی تھی۔
”کیا بات ہے آج کل آپ کے دوست شاہ کچھ آپ سیٹ دکھائی دیتے ہیں۔ کوئی پرالہم ہے کیا.....؟“

”آپ کیوں پریشان ہو رہی ہیں۔“ وہ اسی انداز میں بولا۔
”مجھے کیا ضرورت ہے، پریشان تو یہ رات کو صبح ہیں اُن کے لئے۔“ اُس کے انداز پر نورین کو رات کے سامنے سبکی محسوس ہوئی، اتنا کہہ کر اس کا ہاتھ چھوڑا اور واپس ہو گئی۔
”آپ تو مجھے کسی شریف گھرانے کی بہت اچھی لڑکی لگتی ہیں..... حیرت ہے آپ ارد شیر کے حال میں کس طرح آگئیں۔ آپ کو اپنے گھر والوں کی عزت کا ذرا احساس نہیں۔ آپ لڑکیاں چند بیٹھے بولوں کے عوض سب کچھ داؤ پر لگانے کو کیوں تیار ہو جاتی ہیں۔“
”جی..... میں سمجھی نہیں.....“ رات کو تو رنگ فاق ہو گیا۔ وہ ارد شیر کا قریبی دوست تھا اور اُس کے بارے میں کیا کہہ رہا تھا۔

”اس میں بھلا سمجھ میں نہ آنے والی کون سی بات ہے، دکھ ہوتا ہے مجھے جب آپ جیسی لڑکیاں کسی عیاش دولت مند کی خواہشوں کی بھینٹ چڑھنے کو تیار ہو جاتی ہیں۔“
”کیا وہ بہت خراب ہیں.....؟“ رات کو آواز لرز رہی تھی، لگتا تھا ابھی رو دے گی۔

آذر کے لبوں پر استہزاء سے مسکراہٹ دوڑ گئی، بولا.....
”نہیں نہیں..... وہ تو پانچ وقت کا نمازی، پرہیزگار، تہجد گزار ہے۔“

”آپ ٹھیک کہتے ہیں، میں واقعی باعزت خاندان کی بیٹی ہوں اور سچ تو یہ ہے کہ آج تک خود پر حیران ہوں کہ میں اس راہ پر کیسے چل پڑی مگر یہ بھی حقیقت ہے، انہوں نے آج تک میرے ساتھ اخلاق سے گری حرکت نہیں کی، ان کا لہجہ بہت سافٹ ہوتا ہے۔ وہ ہمیشہ مجھ سے دوستانہ انداز میں ملتے ہیں اور.....“

یہ کہتے کہتے ارد شیر کی کبھی بات یاد آگئی (اگر وہ انکار کریں گے تو اٹھوا لوں گا، ارد شیر کو جو چیز پسند آجائے، چھوڑ نہیں سکتا۔)

”بہن سمجھ کر سمجھا رہا تھا، اب آگے تمہاری مرضی ہے۔“ آذر اتنا کہہ کر کاؤنٹر کی طرف بڑھ گیا اور اس کے لپٹو ڈھیروں پر بھڑال گیا۔
”نورین کے پاس چلی آئی اور گلہ آمیز لہجے میں بولی.....

پھر جتنی دیر وہ یہاں بیٹھ رہا بیٹھا جائے پتہ نہ پڑا، وہ سامنے والی کرسی پر بیٹھی رہی۔

”میں اور شاہ جی، بڑی بیگم اور شیریں سے ملے گئے تھے۔ شیریں کا بیٹا بہت پیارا ہے، شیریں خود بھی تو بہت خوبصورت ہے۔“ اُس نے سب کچھ بتا دیا، ذکر نہیں کیا کہ اُن لوگوں نے اس کے ساتھ کچھ اچھا رویہ نہیں رکھا تھا..... اور جب وہ ان سے مل کر آئی تھی تو سوچ رہی تھی یہاں گاؤں کے سب لوگ ارد شیر کی بدعلاجی کی بات کرتے ہیں مگر میرے ساتھ ان لوگوں کے مقابلے میں وہ بہت زیادہ اچھا ہے۔ اُس نے تو کبھی دل دکھانے والی بات نہیں کی۔ کبھی مجھ سے نفرت کا اظہار نہیں کیا۔

وہ اس مرتبہ گاؤں آیا ہی اس ارادے سے تھا کہ بابا شہر میں ہیں، اُن کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے زمینوں کے بارے میں ضروری معلومات اکٹھی کرے گا۔ جائیداد کے کاغذات دیکھے گا اور یہ بھی معلوم کرے گا کہ اندازاً بابا جان کی آمد کی کتنی ہے۔ گاؤں کے چند اہم افراد سے ملاقات کا بھی ارادہ تھا۔

وہ چائے پی کر باہر کے احاطے میں آیا تو علاقے کا ایس۔ ایچ۔ او سے وہی بات کر رہا تھا۔

”کیا ہوا، کوئی مسئلہ ہو گیا ہے کیا.....؟“ ارد شیر بھی وہیں جا کر بیٹھ گیا۔

اُدھر شاہ جی کو اس کا انتظار تھا کہ یا تو خود آئے گا یا کسی ملازم کو بھیج کر رقم منگوائے گا کہ چاہے مہینے میں کتنے ہی پیسے کیوں نہ لے چکا ہو، آغاز پر ضرور لیا کرتا تھا۔ وہ نہیں آیا اور نہ ہی کسی کو بھیجا، جب ایک بار پھر انہوں نے ارد شیر کا فون نمبر ملایا تو پتا چلا، وہ گاؤں جا چکا ہے۔ انہیں لگا جیسے سر پر ہم پھنسا ہے، غم دغھے کے طوفان نے یوں لپیٹ لیا کہ کتنی دیر وہ بولنے کے قابل ہی نہ ہو سکے۔ مٹھیاں بھیج کر ادھر سے ادھر چکر لگاتے رہے۔ سوچتے سمجھتے کے قابل ہوئے تو ڈرائیور سے گاڑی نکالنے کو کہا۔

گاؤں پہنچتے تو سہ پہر ہو رہی تھی۔ ارد شیر باہر احاطے میں بیٹھا کوئی فائل دیکھ رہا تھا۔ جونہی اُن کی گاڑی چھانک کر اس کے اندر آئی، اُس نے جلدی سے فائل رب نواز کو پکڑا دی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ آگے بڑھ کر سلام کیا جس کا جواب انہوں نے اس کی طرف دیکھے بغیر سر کے اشارے سے دیا اور اندر چلے گئے۔ اندازہ تو ہو ہی گیا تھا، باپ ناراض ہے اور غصہ اسے بھی آرہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا جب اُس نے دل میں بات نہیں رکھی تو یہ باپ ہو کر اب تک کیوں خفا ہیں مجھ سے.....؟

وہ سیدھے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ جب یہ بھی اپنے کمرے میں آ بیٹھا۔ شاید وہ پیغام بھیج کر بلائیں مگر دیر تک کوئی پیغام نہ آیا۔ یہ اُمید بھی جاتی رہی۔ وہ بستر پر لیٹ گیا اور ذرا دیر بعد اُس کی آنکھ لگ گئی۔

رات کے کھانے کے لئے زمینت خود اسے جگانے آئی۔ اگر کوئی ملازمہ آتی تو ڈانٹ کر بھگا دیتا مگر وہ خود آئی تھی، اسے بات ماننا پڑی۔

کھانے کی میز پر نگاہ پڑی تو اندازہ ہوا خاصا اہتمام کیا گیا ہے۔ شاہ جی اس کی آمد سے پہلے یہاں موجود ایک کرسی پر سر جھکا کر کسی گہری سوچ میں گم بیٹھے تھے۔ وہ اُن کے دائیں جانب والی کرسی پر خاموش سے آ بیٹھا۔ زمینت رد مال میں گرم روٹی لے کر آئی، ان دونوں کو یونہی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے دیکھا تو بولی.....

”آپ دونوں نے ابھی تک شروع کیوں نہیں کیا..... بسم اللہ کریں ناں.....“

بار بار گاؤں آنا، زمینت سے اس قدر دوستی اور مجھ سے بدتمیزی یہ سب باتیں یہی ظاہر کرتی ہیں کہ اُس کی نیت ٹھیک نہیں ہے۔

”کیا سوچتے لگے آپ.....؟“ زمینت کی آواز انہیں چونکا گئی۔

انہوں نے حویلی آتے ہی ارد شیر سے بات کی، صاف کہہ دیا۔

”تمہیں گاؤں آنے کی ضرورت نہیں، جتنی رقم درکار ہو یا تو کسی ملازم کو بھیج کر منگوا لیا کرو یا پھر خود شہر میں میری کوٹھی پر آ جایا کرو۔“

ان کی بات کا اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ شدید غصہ سوار ہو گیا تھا اُس پر۔

”بابا جان مجھے جائیداد سے دور رکھنا چاہتے ہیں مگر میں اب ضرور گاؤں جاؤں گا۔ اچھا ہے یہ شہر میں ہوں گے، میں بہت سی ضروری معلومات اکٹھی کر سکوں گا۔“ اُس نے سوچا۔

جس روز وہ گاؤں پہنچا، زمینت کی طبیعت اچھی نہیں تھی، اسے بخارا آرہا تھا، پھر بھی اُس کی آمد کا سن کر بستر چھوڑ دیا اور ملنے کے لئے آگئی۔

”کیا ہوا.....؟ طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی آپ کی۔“ اُترا چہرہ دیکھ کر اُس نے پوچھا۔

”ہاں بخارا آرہا ہے مجھے..... آپ سنائیں، کیا خیال ہے آپ کا.....؟“

”میں ٹھیک ہوں، آپ ریست کریں جا کر۔“

”کوئی بات نہیں، اب ایسی بھی طبیعت خراب نہیں۔“ وہ مسکرائی۔ ”چائے بناؤں آپ کے لئے.....؟“

”خود نہیں بنائیں، کسی سے کہہ دیں۔“

اُس کے جانے کے بعد اُس نے بیگ سے کپڑے نکالے اور ملازمہ کو بلا کر استری کرنے کے لئے کہا۔

جب زمینت چائے لے کر آئی تو وہ نہا کر نکلا تھا۔

”آپ نے خود کیوں زحمت کی.....؟“ وہ شرمندہ تھا۔

”یہ لوگ چائے اچھی نہیں بناتے، اور پھر آپ کے لئے کام کرتے ہوئے مجھے کسی تھکن کا احساس نہیں ہوتا۔“ آپ صاحب کے بیٹے ہیں تو اس حوالے سے میرا بھی تورشتہ بنتا ہے ناں آپ سے، چاہے آپ اسے قبول کریں یا نہ کریں، مگر میں نے آپ سب کو اپنی رشتوں کے ساتھ قبول کیا ہے، آپ ہوں، زمینت، سارا، بھائی..... میں سب سے محبت کرتی ہوں، بڑی بیگم اور شاہ جی بی بی کا بہت احترام ہے میرے دل میں۔“

”کتنی اچھی عورت ہے یہ، کیسا اُجلا اور محبت بھر اُل ہے اس کا۔“ اُس نے سوچا۔

”بابا جان مجھ سے اکھڑے اکھڑے سے رہتے ہیں، سمجھا نہیں انہیں۔“ کبھی وہ اس خیال سے ہی آگ بگولہ ہو جاتا تھا کہ یہ عورت اس کے اور بابا جان کے درمیان آگئی ہے، آج اسی سے درخواست کر رہا تھا۔

”میں پہلے بھی انہیں کہتی رہتی ہوں، اب بھی ضرور سمجھ جائیں گی۔“ وہ چائے بنا کر کپ اُس کی طرف لے جاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

بھٹک میں جانا ہی پڑا۔
وہ عادت کے مطابق لیٹ اٹھا۔ ناشتا ملازمہ نے لا کر دیا۔ اس سے زینت کے بارے میں پوچھا۔
پتا چلا اپنے کمرے میں ہیں۔
”بخار اُترا اُن کا.....؟“
”نہیں چھوٹے سرکار..... دوا تو کھائی ہے پر بخار بھی نہیں ٹوٹا۔“
وہ بتا کر چلی گئی۔

ناشتے کے بعد زینت کا حال پوچھنے کے لئے وہ اس کے کمرے کی طرف آیا۔ دروازے پر دستک کے جواب میں اس نے اندر آنے کو کہا۔ وہ کمرے میں آیا اور دیکھا زینت شاہ جی کے کپڑے وارڈروب میں رکھ رہی ہے۔

”میں نے سنا تھا آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“
”ہاں، بلکا سبنا ہے مگر بتائیں کیوں کمزوری بہت ہو رہی ہے۔“
”آپ کو آرام کرنا چاہئے۔“ اُس نے دوستانہ انداز میں ہمدردی کے ساتھ مشورہ دیا۔
”بس ٹھوڑا سا کام ہے، ختم کر لوں پھر لیٹ جاؤں گی۔“ وہ بیہوش کرسی پر بیٹھ گیا اور اسے کام کرتے ہوئے دیکھنے لگا۔

زینت کپڑے رکھ کر فارغ ہوئی تو سوچا، ایک نظر کام کرنے والیوں پر بھی ڈال آئے۔ کچھ کمرے بھی رہی ہیں یا موقع جان کر باتیں کرنے بیٹھ گئی ہیں۔ یہ سوچ کر قدم آگے بڑھا، اردشیر نے پوچھا.....
”اب کہاں جا رہی ہیں.....؟“

مگر وہ اس کی بات کا جواب نہیں دے سکی۔ زور کا چکر آیا۔ اگر اردشیر جلدی سے بڑھ کر تھام نہ لیتا تو گر پڑتی۔ وہ اس کے بازوؤں میں تھی جب پردہ ہٹا کر شاہ جی کمرے میں آگئے۔

”اردشیر.....“ وہ اتنی زور سے چلائے تھے کہ زینت اُس کے بازوؤں سے نکل کر ایک طرف ہونے کی کوشش میں بیڈ سے نکل گئی اور نیچے گر پڑی۔

”بابا..... بابا جان.....“ آنکھوں میں حیرانی، بے یقینی لئے اُس نے باپ کی طرف دیکھا اور کچھ کہنا چاہا۔

”مت کہو بابا..... میرا تمہارا کوئی رشتہ نہیں، تم میرے لئے مرچکے ہو، دفع ہو جاؤ یہاں سے اب کبھی مجھے یہ منحوس صورت نہ دکھانا۔ نکل جاؤ ورنہ میں تمہیں شوٹ کر دوں گا۔“

وہ جھپٹ پڑنے والے انداز میں اس کی جانب بڑھے۔ ایک تو قہر و غضب میں ڈوٹی اُن کی آواز، زینت کی چیخیں اور رون..... پھر اردشیر پر ایسی کیفیت طاری تھی کہ اس سے بولا ہی نہیں جا رہا تھا۔ حیرت اور ڈر کے اس کی بری حالت تھی۔ وہ صرف ”بابا جان..... بابا جان.....“ کی گردان کرتا ہوا اُلٹے قدموں پیچھے ہٹا تھا اور کمرے سے باہر نکل آیا تھا۔

”تم بدتمیز لڑکے..... اب کبھی یہاں قدم رکھنے کی جرأت نہ کرنا۔“
”یہ میرا گھر ہے.....“ اُس نے مضبوط لہجے میں کہنا چاہا مگر اس الزام نے اعصاب شل کر دیئے تھے۔ وہ اپنی بات میں زور پیدا نہیں کر سکا۔

”آپ بھی آجائیں۔“ اردشیر نے کہا۔
”اچھا میں اپنے لئے کھانا لے آؤں.....؟“
”کیا مطلب.....؟“ وہ سمجھا نہیں۔
”مطلب یہ کہ مجھے بخار ہے، یہ سب تو منع ہے۔“
”بخار ہے پھر بھی خود چکر لگا رہی ہیں۔“

”چھوٹے سرکار بی بی صاحبہ نے تو پکایا بھی خود ہے۔“ پانی کا جبک لاتی ملازم لڑکی نے انکشاف کر کے اردشیر کو حیران کر دیا۔ زینت مسکرا دی اور بولی.....
”پسند آگیا تو میری ساری تھکن اُتر جائے گی۔“
پھر شاہ جی کی جانب متوجہ ہوئی۔

”اچھا ہوا آپ آگئے ورنہ چھوٹے شاہ جی یہاں گاؤں میں اکیلے کیا کرتے.....؟“
جسید شاہ کی پیشانی پر کئی لکیریں ابھریں مگر بولے کچھ نہیں..... چاول کی ڈش اپنی جانب کھسکا کر چاول اپنی پلیٹ میں ٹکالنے لگے۔ زینت بھی اردشیر کی جانب سے توجہ ہٹا کر انہیں سلام، راستہ اور سالن وغیرہ دینے لگی۔

”بس..... مجھے کچھ نہیں لیتا۔“ وہ بچھے بچھے سے تھے۔
”یہ کونفے تو لیں.....“ اُس نے زبردستی ان کی پلیٹ میں ڈال دیئے۔ پھر اردشیر سے بولی.....

”آپ یونہی بیٹھے ہیں..... چاول لیں ناں.....“
”پتا نہیں کیسے ہوں گی۔“ وہ منہ بنا کر شرارت سے کہہ رہا تھا۔

”بہت اچھے بنے ہیں اور کیوں نہ بنتے، میں نے بتائے ہیں آخر۔“ زینت بھی اسی کے انداز میں بولی، پھر ہنس پڑی۔

”کھا کر دیکھیں ناں۔“ اصرار کیا۔
”کھلا دیں ناں۔“ وہ بھی مسکرایا۔

زینت نے شاہ جی کی پلیٹ سے سچ بھر کر اس کی جانب بڑھایا۔ ہاتھ سے پکڑنے کے بجائے اُس نے منہ کھولا، زینت نے کھلکھلا کر بچچ اُس کے منہ میں ڈال دیا۔

براؤن آنکھیں سفید رنگت جس میں صحت کی سرخی تھی، مغرور ستواں ناک والا یہ خوب رو جوان، انہیں یاد نہیں رہا۔ اُن کا بیٹا ہوتا ہے۔ نئی سارے وجود میں اُتر گئی۔ ایک لاوا سا کہنے لگا۔ یہ منظر تا قابل برداشت تھا۔ اگر زینت ملازمہ کی آواز پر اُٹھ کر باہر نہ چلی جاتی تو شاید وہ مشتعل ہو کر کچھ کڑا لیتے۔ وہ باہر چلی گئی۔ اردشیر خاموشی اور تنہائی کے ساتھ اپنی پلیٹ میں کھانا ٹکالنے لگا۔ اُس نے باپ کی جانب دیکھا تک نہیں جب کہ وہ گھونٹ گھونٹ پانی اپنے اندر اتارتے رہے پھر نمیلے سے اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ زینت بھی وہیں تھی۔ اردشیر نے اکیلے ہی کھانا کھایا پھر اپنے کمرے میں چلا آیا۔

صبح شاہ جی تو سویرے اُٹھ گئے۔ ناشتا بھی کر لیا۔ اصولاً تو اب انہیں باہر والے احاطے میں ہونا چاہئے تھا۔ مگر اردشیر گھر میں موجود تھا، ابھی سو رہا تھا تو کسی وقت بھی اُٹھ سکتا تھا اور وہ اسے تنہائی کا موقع دینا نہیں چاہتے تھے مگر لوگ اپنے اپنے مسئلے مسائل لئے اور کچھ یونہی ملنے کے لئے آنے لگے تو انہیں

اُس نے اثبات میں سر ہلایا..... چہرہ آستین سے پونجی اور پھر کبھی بہت اونچی اور کبھی جیسی،
نبوؤں سے بھی آواز میں ساری بات انہیں سادی۔ ایک تو وہ تیز بول رہا تھا، دوسرا آواز پھٹ رہی تھی۔
ہرئی کو کچھ سمجھ آیا، کچھ نہیں مگر اتنا تو جان گئیں، یہ وہ لمحہ ہے جس کے انتظار نے انہیں نیند میں بھی جگائے
تھا۔
کتنا طویل انتظار کیا تھا..... محبوب نے محبت بھلا کر انہیں دل سے اتار دیا تھا مگر وہ چیخی چلائی نہیں،
نہ بھی نہیں کی..... یہی تھا جس کی چاہ میں میری محبت کو ٹھوکر ماری تھی جشید شاہ.....
آہ! کتنا اچانک آج وہ لمحہ آ پہنچا جس کا مجھے سالوں سے انتظار تھا۔

”بڑی ماں.....“ اُس نے لہو چھلکائی آنکھوں سے اُن کی جانب دیکھا اور کچھ کہنا چاہا۔ اُن کے
یوں کی عجیب مسکراہٹ، آنکھوں میں بے گانے رنگ، چہرے کا خوفناک تاثر..... کہاں تو مہربان چہرے
والی وہ باوقار بڑی ماں اور کہاں یہ بے رحم خوفناک چہرہ..... نفرت کے جذبات حسین سے حسین صورت کو
بھی گاڑ کر رکھ دیتے ہیں۔

”بڑی ماں.....“ وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور اُن کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

”ماں تو صرف ایک ہوتی ہے، نہ بڑی ماں، نہ چھوٹی ماں..... بس صرف ماں..... تم کون ہو.....؟“
کس بڑی ماں کی بات کر رہے ہو.....؟“

اپنے کاندھے پر رکھا ارد شیر کا ہاتھ انہوں نے بڑی نخوت سے جھٹک دیا۔



”تمہارا گھر.....“ شاہ جی نے لال انگارہ ہوتی آنکھوں سے اسے دیکھا اور پھر پورٹھانچا اُس کے
منہ پر بخودیا، پھر دھاڑے۔

”تمہارا گھر.....“ جسے عزت و ناموس کے معنوں سے واقفیت ہی نہیں، کہتے ہو میرا گھر ہے.....
ایک اور ہاتھ اُس کے منہ پر پڑا..... ”میں تم سے کہہ رہا ہوں، یہ منحوس شکل دُور کرو، دفع ہو جاؤ۔“ اُن پر
جیسے دیوانگی کا دورہ پڑ گیا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اسے پینے لگے، آوازیں سن کر ملازم اکٹھے ہو گئے۔
”یہ کہتا ہے، یہ گھر اس کا ہے..... دھکے دے کر اسے یہاں سے نکال دو تاکہ اسے اچھی طرح ہٹ
چل جائے کہ کون مالک ہے۔“ وہ ملازموں سے مخاطب تھے۔

ارد شیر ایک دم سے چونک کر بیدار ہوا۔ اُس نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے اپنے ارد گرد اکٹھے ہونے
والے ان نوکر پیشہ افراد کو دیکھا۔ یہی وہ لوگ تھے ناں جنہیں ہمیشہ پاؤں کی ٹھوکر میں رکھا، جن سے کبھی
سیدھے منہ بات نہیں کی۔ انسان نہیں سمجھا تھا انہیں اُس نے، اور آج اُن کے سامنے اس قدر تذلیل۔

”کان کھول کر سن لو، آج سے میرا اور تمہارا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ میں تمہاری صورت پر ٹھوکرنا بھی
گوارا نہیں کرتا، تم مرچے ہو میرے لئے، تم لوگ کھڑے کیوں ہو، دفع کر دو اسے یہاں سے۔“ وہ
ملازموں کی طرف دیکھ کر چلائے۔

”خبردار، جو کوئی میرے قریب آیا، ہڈی پھلی ایک کر دوں گا.....“ اسے بولنے میں دقت ہو رہی
تھی، پورا زور لگا کر وہ چیخا تھا اور پھر لمبے لمبے ڈگ بھرتا، وہاں سے چلا گیا۔

”اس قدر ذلت..... کیا سمجھا ہے انہوں نے، مجھے ملازموں کے سامنے مارا، گالیاں دیں، ہر رشتہ
ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔“ اُس کی کیفیت خود اس کی سمجھ سے باہر تھی۔ دانت اتنی زور سے پیچھن کر کھٹے
کہ جہڑوں میں درد ہونے لگا تھا۔ وہ گاڑی اُڑائے لئے جا رہا تھا اور رُخ شیریں کے گھر کی طرف تھا.....
وہ کبریٰ سے ملنا چاہتا تھا۔

”بڑی ماں کو بلاؤ.....“ اتنا کہہ کر وہ ڈرائنگ روم میں چلا گیا۔ اُس کی ظاہری حالت ہی ایسی تھی
کہ ملازم گھبرا گیا اور جلدی سے کبریٰ کو اطلاع کر دی۔

”ارد شیر..... کیا ہوا بیٹا.....؟“ جب وہ اندر داخل ہوئیں تو وہ صوفے پر اوندھا پڑا تھا۔ اُس نے سر
اٹھا کر انہیں دیکھا، پھر سسکاری بھر کر دونوں ہاتھ اپنے سر پر رکھ لئے۔

”بڑی ماں..... میں نے اس ہاتھ کو روکا کیوں نہیں جواتے لوگوں کی موجودگی میں میرے چہرے
پر پڑا، میں خاموش کیوں رہا، اتنے آرام سے کیوں چلا آیا۔ میں نے آگ کیوں نہ لگا دی اُس گھر کو، اتنے
لوگوں کی موجودگی میں مجھے تماشا بنادیا۔ میری حیثیت دو کوڑی کی کر دی۔ کیا قصور تھا میرا.....؟ کیوں کیا
انہوں نے میرے ساتھ یہ سب کچھ.....؟ کیا میں خاموش بیٹھا رہوں گا.....؟ نہیں کبھی نہیں..... انہیں پتا
چلنا چاہئے کتنی بڑی غلطی کی ہے انہوں نے.....“

بولتے بولتے ہی دُکھ کی جگہ طیش نے لے لی مگر حالت اتنی خراب تھی کہ اپنے قدموں پر کھڑا ہونے
میں اسے مشکل پیش آرہی تھی۔ وہ ابھی تک صوفے پر ہی بیٹھا تھا۔

”باپ سے لڑ کر آرہے ہو.....؟“ کبریٰ کی آواز میں کپکپاہٹ تھی، دل میں ایک ٹھنڈک سی پڑ گئی
تھی اور ہاتھ پیر سنسنائے تھے۔

کبھی ایسا بھی ہو سکتا ہے، بڑی ماں بھی بدل سکتی ہے۔ اس محبت کا درخت تو بہت بچپن میں اس کے دل میں لگا تھا اور جڑیں بہت گہری ہو گئی تھیں۔ بڑی ماں اس کے لئے قاتل پرستش تھیں۔ وہ جیسا بھی تھا، جو کچھ بھی تھا، کہاں سے کہاں پہنچ گیا تھا۔ مگر یہ محبت، یہ عقیدت کم نہیں ہوئی، پیار کے انداز ضرور بدلے مگر یہ درخت آن بان سے دل میں دُور دُور تک اپنی جڑیں پھیلاتا رہا اور آج وہ کیا کہہ رہی تھیں۔ تاور درخت کی جڑیں ہمیں تو دل لہو لہو ہو گیا۔

اتنا کرب، ایسی اذیت، اُس سے سہنا مشکل ہو رہا تھا، جی چاہ رہا تھا اُن کے پاؤں پکڑے اور منت کرے، مجھے اس اذیت سے بچالو، میرا دل زخم زخم ہے، اس بے دردی سے اس پر پاؤں مت رکھو، مجھے ایک بار وہی پیار دے دو، مجھے سمیٹ لو، کہہ دو بڑی ماں ابھی جو کچھ کہا تھا، وہ جھوٹ تھا، مذاق تھا۔۔۔۔۔

آنسو اب چہرے پر آگئے تھے، وہ سسک رہا تھا۔
کبریٰ اب کارپٹ پر بیٹھے بے حال لٹے پئے ارد شیر کی جانب نہیں دیکھ رہی تھیں۔ اُن کے سامنے ہانسی کی تصویریں تھیں۔ وہ اس وقت جمشید شاہ کو دیکھ رہی تھیں۔۔۔۔۔ اور ان سے مخاطب بھی تھیں۔
کتنا وقت گزر گیا۔ کیا کہا کبریٰ نے اس کا ذہن سن ہو چکا تھا۔ وہ میز پر بازو رکھے اور اس پر اپنی پیشانی ٹکائے بیٹھا تھا، یہاں تک کہ وہ اپنی کہہ کر کمرے سے باہر چلی گئیں۔

وہ کس طرح وہاں سے اٹھا اور کیسے شہر پہنچا۔ کچھ نہیں جانتا تھا۔ اسے ہوش نہیں تھا۔ ذہن میں آندھیاں چل رہی تھیں اور کبریٰ کے الفاظ پتھروں کی طرح یوں برستے کہ بے اختیار اُس کے لبوں سے کراہیں نکل جاتیں۔ گاڑی اپنی کوشی تک لے آیا اور سراسیمہ رنگ پر نکلا کر بیٹھ گیا۔

”صاحب۔۔۔۔۔“ چوکیدار دوڑ کر اس تک آیا اور پریشان ہو کر پکارا۔ اُس نے سر اٹھا کر چوکیدار کی طرف دیکھا اور ٹوٹے چھوٹے لہجے میں بولا۔

”مجھے سہارا دے کر اندر لے چلو، میں چل نہیں سکوں گا۔“

وہ جلدی سے آگے آیا اور اسے اُترنے میں مدد دینے لگا۔

”آپ کو بخار ہے صاحب۔۔۔۔۔“ اُس کے جلتے جسم سے ہاتھ ٹکرایا۔ تو وہ گھبرا کر بولا۔

”میں مر رہا ہوں۔۔۔۔۔ تم آذر کو فون کر دو۔ اُسے کہو، ارد شیر مر گیا ہے۔۔۔۔۔ اگر اُس کی محبت جھوٹی نہیں تو پھر آذر آخری مرتبہ دیکھ لے مجھے۔۔۔۔۔“

ارد شیر کے لئے ایک قدم بھی اٹھانا دشوار ہو رہا تھا۔

ملازم سہارا دے کر بیڈروم تک لائے۔ پھر ارشاد نے آذر کا نمبر ملایا۔ وہ اس وقت آفس میں تھا اس کی بیماری کی اطلاع ملی تو حشک ہوا اور کہا ”میں آ رہا ہوں۔“

”آپ جلدی پہنچے صاحب، اُن کی حالت بہت خراب ہے اور وہ بہت پریشان بھی لگ رہے ہیں۔“

”اسے تسلی دو۔۔۔۔۔ میں بس ابھی پہنچتا ہوں۔۔۔۔۔“

جب آذر پہنچا تو وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں پڑا تھا۔۔۔۔۔ اور کسی کو پہچان نہیں رہا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر آذر بھی پریشان ہو گیا اور فوراً ہسپتال لے جانے کا فیصلہ کر لیا۔



”بڑی ماں، کیا کہہ رہی ہیں آپ۔۔۔۔۔؟“ کچھ تو لفظ پرائے تھے اور کچھ اُس کی حالت ہی ایسی، رہی تھی، اُن کی آنکھوں سے جھلکتی سفاکی دیکھ کر بھی وہ یقین کا ایک مرحلہ بھی نہیں طے کر سکا۔۔۔۔۔ کہ مار بہت تھا، بڑا اعتماد تھا اُسے اس محبت پر۔

بے رحم مسکراہٹ کبریٰ کے ہونٹوں پر دوڑ گئی۔ گہری سانس کھینچ کر انہوں نے نظریں اُس کے چہرے پر گاڑ دیں۔۔۔۔۔ اور بولیں۔

”ارد شیر۔۔۔۔۔ بہت لمبی مدت میں نے آگ کے بھڑکتے الاؤ میں جلتے گزار دی ہے۔ صرف اور صرف آج کے دن کے لئے۔۔۔۔۔ بہت انتظار تھا مجھے اس گھڑی کا۔۔۔۔۔ تم میرے لئے کیا ہو، یہ بھی سن لو کہ آج میں نقاب اُتارنے کا فیصلہ کر چکی ہوں۔۔۔۔۔ تم قاتل ہو میری محبت کے۔۔۔۔۔ تم وہ ہو ارد شیر جس کی خواہش نے شاہ جی کے دل سے میری محبت اس طرح کھرچ ڈالی کہ نام و نشان بھی باقی نہ رہا، میری بیٹیوں کو محرومی کی زندگی دینے والے میری جنت کو برباد کرنے والے میری محبت کو مار ڈالنے والے۔ کیا کیا کہوں، کتنی ہی دُشمنیاں نکلتی ہیں، بہت بڑے جرم ہیں تمہارے کھاتے میں۔“

”بڑی ماں۔۔۔۔۔“ اُس کی آنکھوں میں آنسو اور آواز میں کرب تھا۔ وہ ان اذیت ناک لمحوں میں کبریٰ سے رحم چاہ رہا تھا، اُس کی لال دُوروں والی لیشلی آنکھیں پانیوں سے لبریز تھیں اور ان میں التجائیگی۔ ”ایسا مت کہو۔۔۔۔۔ میں ٹوٹ رہا ہوں، میں کھرب رہا ہوں۔۔۔۔۔ اس وقت سبک زنی مت کرو، مجھے بچا لو، مجھ سے ایسا سلوک مت کرو۔۔۔۔۔“

”بڑی نفرت کی ہے میں نے تم سے۔۔۔۔۔ اتنی کہ شاید ہی کسی نے کسی سے کی ہوگی۔ کئی بار اپنے ہاتھوں سے زہر دینے کا بھی سوچا مگر میں شاہ جی کو یہ بھی تو بتانا چاہتی تھی کہ تمہاری خواہش ان کی زندگی سب سے بڑی بھول تھی، بس اس لئے تمہیں زندہ رکھا اور جو سوچا تھا، وہ آج پورا ہو گیا۔ آج یقیناً شاہ جی تمہارے وجود پر شرمسار ہوں گے۔ جاؤ چلے جاؤ یہاں سے اور سن لو، ہم میں سے کسی کو بھی اب تمہاری ضرورت نہیں، چاہے زندہ رہو اور چاہے تم مر جاؤ۔ ہم نہیں روئیں گے تمہیں۔“

کبریٰ خاتون کے لبوں سے ادا ہونے والے لفظ انکارے بن کر اسے جلا رہے تھے۔ یہاں سے جانے کے بجائے وہ کرسی کی بیک کا سہارا لے کر چند قدم آگے بڑھا مگر پھر ہمت ہار کر نیچے کارپٹ پر بیٹھ گیا۔ کہنے کو اُس کے پاس بہت کچھ تھا مگر زبان ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ ایک لفظ بھی بولنا مشکل تھا۔ اُن کے لب تھر تھرا رہے تھے اور آنکھوں میں ویرانی تھی۔

اور آگئی..... اور بیٹا دنیا میں آیا تو ساری دنیا ہی بھول گئے۔ یاد ہی نہیں رہا اس بیٹے کے علاوہ بھی کوئی اولاد ہے آپ کی..... ستارہ، شیریں اور گل رخ، وہ بھی آپ ہی کا خون ہیں، ان کے جیسے میں صرف محرومیاں اور دکھ آئے ہیں۔ ہمیشہ آپ کی محبت کو ترستی رہیں۔ آج بیٹے کو پھر ماریا تو اتنے پشیمان، ساری دنیا سے ایک تھلک کرہ بند کئے بیٹھے ہیں، کبھی یہ بھی یاد کیا، کتنی مرتبہ آپ کے رویے کی وجہ سے اُن کی آنکھوں میں آنسو آئے ہیں.....؟ بیٹے کے لئے بھی اتنا مت تر نہیں، ابھی اس کی طرف سے آپ کو بہت ڈکھیلیں گے، بہت ڈلائے گا وہ آپ کو، اپنی اس بے عزتی پر خاموش تو ہرگز نہیں بیٹھے گا کہ یہ میری تربیت نہیں، وہ ضرور بدلے لے گا، شاہ جی! اس دن کے لئے برسوں انتظار کیا ہے میں نے، آج میں کتنی خوش ہوں، بتا نہیں سکتی.....“ وہ زور سے ہنس پڑیں۔

اس وقت کبریٰ کا چہرہ کس قدر خوفناک لگ رہا تھا، وہ کہہ رہی تھیں..... آج میں بہت خوش ہوں..... مگر ان کے چہرے پر خوشی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ سنگناخ چٹانوں کی طرح نظر آرہی تھیں اور ان چٹانوں پر کہیں کہیں دراڑیں بھی تھیں۔ شاہ جی اس انکشاف کے بعد پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے انہیں بونے کا موقع نہیں دیا..... جھٹکے سے مڑیں اور واپس ہو گئیں۔

زینت اس عورت کو دیکھ کر اُس کی باتیں سن کر اندر ہی اندر سہم گئی تھی اور خاموش کھڑی جمید شاہ کی جانب دیکھ رہی تھی..... جواب سر ہاتھوں میں گرائے شکست سے بیٹھے تھے۔

”شاہ جی..... کیا کہہ کر گئی ہیں کہ وہ آرام سے نہیں بیٹھے گا..... بدلہ لے گا۔“ زینت کی آواز میں خوف تھا مگر شاہ جی نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں۔

کبریٰ اپنی بات کہہ کر پھر زکی نہیں، ملازم عورتوں کے سلام کا جواب تک نہیں دیا۔ جس طرح آدمی، طوفان کی طرح آئی تھیں، اسی طرح واپس چلی گئی اور گاڑی میں بیٹھے ہی ڈرائیور کو گاڑی پہلے شیریں کے ہاں لے جانے کو ہی کہا۔

رات کا آخری پہر تھا۔ ارد شیر کی آنکھ کھل گئی..... یہ کون سی جگہ ہے پہلے پہل کچھ سمجھ نہیں آیا، پھر ذہن کچھ بیدار ہوا..... ہا چل کا مخصوص بید، کبل، دواؤں کی الماری اور ذرا قافلے پر کرسی پر بیٹھا، اُدھتا ہوا آؤر..... آؤر اُس کے پاس موجود ہے..... مگر میں یہاں پر کیوں ہوں، کیا ہوا ہے مجھے.....؟

اُس یا نہیں آ رہا تھا مگر وہ دل پر بوجھ محسوس کر رہا تھا..... لگتا تھا کوئی سانحہ بہت چکا ہے۔ سر میں درد اب بھی تھا..... کچھ دیر ادھر ادھر دیکھنے کے بعد آنکھیں موند لیں اور لبوں سے آہ نکل گئی۔

”ارد شیر.....“ اس کی آواز سن کر آؤر چونکا اور کرسی سے اٹھ کر اُس کے قریب آ گیا۔ اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا اور بولا.....

”ارد شیر..... کیا تم میری آواز سن رہے ہو.....؟“

وہ سن تو رہا تھا مگر خود میں اتنی ہمت نہیں پاتا تھا کہ اس کی بات کا جواب دے یا آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھ لے۔

”شاید..... مجھے نیند میں ہونے کی وجہ سے دھوکا ہوا ہے۔“ آؤر نے ہی خیال کیا اور پیشانی پر ہاتھ رکھ کر اس کے بال ہٹا کر پیچھے ہٹ گیا۔ تب ارد شیر نے آنکھیں کھول دیں۔ آؤر نے سکون کا سانس

شام ہو رہی تھی۔ پرندے اپنے اپنے آشیانوں کو لوٹ رہے تھے۔ آسمان پر لالی چھائی ہوئی تھی اور ایسی ہی لالی شاہ جی کی آنکھوں میں بھی تھی۔ دل پر اتنا بوجھ تھا کہ دم گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگتا تھا۔

زینت کئی بار معافی مانگ چکی تھی، کہہ چکی تھی.....

”آپ نے غلط سمجھا شاہ جی..... ایسا تو کچھ بھی نہ تھا، بے قصور ہوں میں..... مجھ پر ظلم مت کریں۔“

زینت کی بات کا اعتبار تھا مگر ارد شیر بے قصور نہیں ہو سکتا، کاش ارد شیر اتنا نہ گرتا، کیا کچھ نہیں کیا میں نے اس کے لئے، اتنا پیار لٹایا اس پر کہ پھر کبھی اس کو دینے کے لئے میرے پاس کچھ نہ رہا۔ یہ صلہ دیا تو نے مجھے، کاش ارد شیر تم پیدا ہی نہ ہوتے، اگر دنیا میں آگئے تھے تو پیدا ہوتے ہی مر جاتے۔

”بڑی بیگم آئی ہیں..... بڑی مالکن آئی ہیں..... بڑی سرکار آئی ہیں.....“

باہر سے ملازم عورتوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ پہلے تو وہ سمجھ ہی نہیں سکے۔ یہ شور کیسا ہے، یہ سب کی سب کیا کہہ رہی ہیں۔ پھر سمجھے تو جلدی سے نم آنکھیں پونچھیں اور پٹنگ سے اتر کر باہر جانے کا ارادہ کیا۔ ابھی جوتے میں پاؤں ڈال رہے تھے کہ دروازے کا پردہ ہٹا کر کبریٰ اندر آ گئیں اور پیچھے ہی زینت بھی گھبرائی، بوکھلائی سی کمرے میں آئی اور بولی.....

”بیٹھے آپا جان.....“

”تم چپ رہو..... میں جمید شاہ سے بات کرنے آئی ہوں۔“ وہ ڈپٹ کر بولیں اور کچھ اور آگے بڑھ گئیں۔

اکڑی ہوئی گردن آنکھوں میں بے گانگی اور چہرے کا پتھر پلا پن..... شاہ جی تو کچھ بول ہی نہیں سکے۔ بس کبریٰ کے تیور دیکھ کر رہ گئے۔

”میں نے سنا ہے شاہ جی..... آج لاڈلے کو مارا ہے آپ نے بڑی عزت افزائی کی ہے عزیزا جان کی.....“

انداز ہر خند تھا، وہ ایک ہاتھ کمر پر رکھے تیوری چڑھائے بہت اجنبی نظروں سے جمید شاہ کو دیکھ رہی تھیں۔

”کبریٰ آج وہ اگر اتنا سرکش، اتنا بے ادب اور گستاخ ہے تو اس میں بہت ہاتھ تمہارا بھی ہے۔ یہ تربیت دی ہے تم نے اسے..... ہونہار! بڑی عقلمندی ہو.....“ بیٹے کی حرکت پر افسوس تھا مگر اس کے جانے کا ڈکھ بھی تو بہت تھا اور وہ کبریٰ کو بڑی سختی سے یہ کہہ بیٹھے تھے۔ جواب میں کبریٰ ہنس پڑیں اور بولیں.....

”یاد رہے شاہ جی..... ارد شیر کی خاطر کتنے لوگوں کے دل توڑے ہیں آپ نے..... ارے کبریٰ کے دل کی تو بات ہی چھوڑو، چلو جانے دو کہ وہ تو شاید تھا ہی اس قابل، کبریٰ کو آپ بیاہ کر لے آئے۔ یہ احسان تھوڑا تھا اس پر، پھر ساری عمر کا پیار آپ جیسے دے بھی کہاں سکتے ہیں، یہ تو ہمارا دل ہے شاہ صاحب جو آپ کی بے گانگی برداشت نہیں کر سکا..... تو سوچا وہ کچھ کیا جائے آپ کے ساتھ کہ مرتے دم تک آپ کو

یاد رہے، ساری عمر یاد رکھیں کہ ایک کبریٰ بھی تھی جس نے آپ سے محبت کی غلطی کی اور پھر اس پر ایک اور تم یہ کہ آپ کے وعدوں پر اعتبار بھی کر لیا۔

بیٹے کی خواہش نے بھلا ہی دیا ہمیں، آپ ایک بیوی لائے مجھ پر..... وہ بیٹا نہیں دے سکی تو ایک

لیا..... اور اپنا نیت بھرے انداز میں بولا.....
”اب کیسی طبیعت ہے تمہاری.....؟“ ارد شیر نے اس کی جانب دیکھا، کچھ کہنا چاہا مگر کہہ نہیں سکا۔
”توبہ..... تم نے تو ذرا ہی دیا تھا دوست، کیا ہوا تھا تمہیں.....؟“ آذر مسکرایا۔
”کیا ہوا تھا مجھے.....؟“ اُس نے سوچنے کی کوشش کی مگر خواب آور دواؤں کا اثر تھا، اُس کا ذہن ابھی کچھ سوچنے سے قاصر تھا۔

”ڈاکٹر نے کہا ہے، گہرا شاک لگا ہے۔ مگر ایسا کیا ہو گیا ہے.....؟“ آذر سخت حیران تھا۔ اب بھی اسے دیکھ کر سوچ رہا تھا، آخر ایسا کیا صدمہ پہنچا ہے اسے۔
ارد شیر کا چہرہ جہاں جوانی اور صحت کی سرخی بھٹکتی تھی، اس وقت پیلا ہو رہا تھا، ہونٹ خشک تھے اور آنکھوں میں..... سارے جہاں کی ویرانی آذر نے دیکھی تھی۔
آذر بہت پریشان تھا اس کے لئے، یہی سوچا تھا، صبح اس کے گاؤں اطلاع بھیج دے گا۔ ان حالات میں اپنوں کا ہونا بہت ضروری ہے۔

”بڑی ماں..... آہ کیا کیا ہے آپ نے میرے ساتھ..... مجھے تو اب بھی یقین نہیں آرہا..... کیا واقعی یہ سب آپ نے مجھ سے کہا تھا، مجھ سے، اپنے لال سے کہہ دیا آپ نے..... وہ پیار، وہ محبت دھوکا کیسے ہو سکتا ہے..... نہیں نہیں، ایسا کیسے ہو سکتا ہے..... میں نے ہی سننے میں غلطی کی ہے یا پھر خواب دیکھا ہے۔“
مگر میرے اندر باہر آگ کیسی ہے.....؟

میں تو نفرت کے ان شعلوں کی پنش سے اپنا وجود جھلتا ہوا محسوس کر رہا ہوں۔ بابا، اتنے بے اعتبار تھے مجھ سے تو یوں کو پروا کروا تے، میرے سامنے ہی نہ لاتے..... آپ سب کو میرے لئے رونا پڑے گا۔ بڑی ماں آپ کو کہنا پڑے گا۔ ارد شیر میں نے غلط کہا تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ میں تم سے پیار کرتی ہوں۔ تم میرے بیٹے ہو بڑی ماں..... بابا، آپ کی ان نفرتوں کے بعد میں کیسے جی پاؤں گا..... میں مر جاؤں گا اور آپ کو میری موت پر رونا ہوگا۔ آپ سب کو یہ ماننا پڑے گا کہ میں آپ کی زندگی کا سب سے اہم حصہ تھا..... مگر کیا فائدہ، تب میں تو کہیں نہیں ہوں گا،“ اس کی آنکھوں کی سطح بھینکنے لگی۔
”آپ کو رونا پڑے گا..... آپ کو پچھتانا ہوگا..... بہت ضدی ہوں میں جو کہہ دیتا ہوں، پھر پورا بھی کرتا ہوں..... میں آپ کو رولاؤں گا..... ہاں میں اپنے لئے آپ کی آنکھوں میں آنسو دیکھنا چاہتا ہوں۔“

آذر ڈاکٹر کو لے کر اندر آ رہا تھا اس کی حالت پر گہرا کر لکا اور اس کے دونوں ہاتھ ہاتھوں میں لے کر چہرے سے ہٹا دیئے۔ اس پر نظر پڑتے ہی ارد شیر خاموش ہو گیا۔
آذر نے ہاتھ چھوڑ دیئے اور جھک کر فرش پر پڑا کیلئے اٹھا کر اس کی جانب بڑھایا۔
”چلے جاؤ.....“ ارد شیر نے منہ پھیر لیا۔

”ارد شیر..... میں تمہارے بابا کو اطلاع دے دوں گا..... بس تھوڑی دیر کی بات ہے..... پھر سب تمہارے پاس ہوں گے۔“

”کیا کہا..... تم بابا کو اطلاع دو گے..... نہیں انہیں کبھی مت بلانا..... ہاں اگر میں مر جاؤں، تب ضرور

نہیں اطلاع دے دینا مگر میرے جیتے جی ہرگز نہیں..... یاد رکھو آذر، اگر تم نے انہیں یا میرے گاؤں میں کسی کو اطلاع دی تو وہ میری اور تمہاری دوستی کا آخری دن ہوگا۔ وعدہ کرو آذر تم انہیں نہیں بتاؤ گے۔“
”ارد شیر صاحب.....“ ڈاکٹر نے کچھ کہنا چاہا مگر ارد شیر آذر سے وعدہ کرنے کو کہتا رہا۔
”اب ان سے میرا کوئی تعلق نہیں، کچھ نہیں لگتے وہ میرے، سب کچھ ختم ہو چکا ہے، سب مجھے چھوڑ چکے ہیں..... اور مجھے بھی کسی کی پروا نہیں ہے۔“

اُس نے بازو کو جھٹکایا اور ڈاکٹر کے ہاتھ سے آزاد کر والیا، پھر بولا.....
”میں نے سب کو بھلا دیا ہے، تم بھی اگر جانا چاہو تو شوق سے چلے جاؤ..... میں تم سب کو اکیلے ہی بی کر دکھا دوں گا..... میں سب پر ثابت کر دوں گا کہ ارد شیر اتنا کمزور ہرگز نہیں جتنا تم نے سمجھ رکھا ہے..... باز چلے جاؤ یہاں سے۔“

”میں تمہارا دوست ہوں..... اگر دھکے دے کر نکلاؤ گے تو بھی واپس آؤں گا۔“ آذر نیاس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر پیار سے کہا۔

ارد شیر کی آنکھوں میں اُس کے آنسو بہہ کر چہرے پر آئے اور نیکی میں جذب ہو گئے۔ مہربان، محبت سے چور لکھے نے آگ میں جھلتے دل پر پانی کی بوندیں ٹپکا دیں، وہ چہرے پر بازو رکھ کر سسکتے لگا۔
”میں تمہارے ساتھ ہوں..... ہر قدم پر ہر امتحان میں، دوست بھی ہوں اور بھائی بھی ہوں..... تم نوڈا کیلایوں سمجھ رہے ہو.....“ وہ نہیں جانتا تھا، اس پر کیا بیتی ہے مگر ابھی ابھی اُس نے جو کچھ کہا، آذر نے اسے جس کیفیت میں دیکھا، اُس کے مطابق نسل دے رہا تھا، اسے تھک رہا تھا۔

”تم کہاں جا رہے ہو عمر.....؟“ صبح وہ کالج کے لئے تیار ہو رہا تھا، زیتون بستر پر لیٹی بے چین لگا ہوں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھ رہی تھیں۔

”کالج جا رہا ہوں اماں..... واپسی پر آپ کی دوا بھی لیتا آؤں گا..... بس آج کی خوراک ہی رہ گئی ہے۔ یاد سے کھا لیجئے گا.....“ وہ مصروف انداز میں کہہ رہا تھا۔

”منع کرو اسے یہ کیوں جاتا ہے، سمجھاؤ اسے مت جایا کرے ادھر.....“
”کدھر اماں کس کے پاس.....؟“ وہ کبھی نہیں۔

”مزید کے گھر..... آخر کیا جوڑ ہے ہمارا اُن کا، اسے کون سی کشش وہاں لے جاتی ہے.....؟“
”اماں..... کیا ہو گیا ہے آپ کو.....؟“ آج سے پہلے تو آپ بھی مزید بھائی کی تعریف کرتی رہی تھیں، آپ کو کبھی وہ اچھے لگتے تھے۔ آپ نے مجھے اُن کے ہاں جانے سے بھی کبھی نہیں روکا تھا۔“ وہ زیتون لٹال باتوں سے الجھا سا تھا اور رابعہ بھی کم حیران نہیں تھی۔

”میں نے اس سے پہلے منع نہیں کیا۔“ زیتون بڑبڑائیں، دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے پیشانی مسلی ہو کر سوچ میں گم رہیں، پھر سر اٹھا کر بولیں.....

”اب تو منع کرنا چاہ رہی ہوں..... مگر مجھے لگتا ہے عمر، تم میری بات نہیں مانو گے۔“

”کیوں اماں، ایسے کیوں سوچ رہی ہیں آپ.....؟ میں اور آپ کی بات نہ مانوں، یہ کبھی ہو سکتا ہے بھلا۔“

”ہاں ہاں بولو..... ڈک کیوں گئے؟“
 ”تو اماں میں بہانہ کر دوں گا۔“ عمر نے ہزار دقت سے یہ الفاظ ادا کئے۔
 زیتون نے سکھ کا سانس لیا اور بولیں.....
 ”یہ سب میں تمہارے ہی فائدے کے لئے کہہ رہی ہوں۔“
 ”چنانچہ کس بات میں فائدہ ہے اور کس میں نقصان.....“ وہ جھلاہٹ بھرے انداز میں اپنی سناہیں تلاش کرنے لگا۔

”بہت افسوس ہو رہا ہے تاں تمہیں۔“ زیتون نے پھر سخت انداز اختیار کر لیا۔
 ”بہت زیادہ، آپ نے بھی تو حد کر دی ہے۔“ وہ اُلجھ رہا تھا۔
 ”نہیک ہے عمر، اب میں کبھی تم سے کچھ نہیں کہوں گی، کچھ نہیں مانگوں گی۔ تمہیں اجازت ہے تم کسی ایک گھر کا انتخاب کر لو۔“
 ”عمر..... تم جانتے ہو اماں کتنی بیمار ہیں، کس قدر کمزور ہو گئی ہیں، پھر بھی تم ان سے بحث کر رہے ہو، ان کی بات نہ مان کر انہیں ڈکھ دے رہے ہو۔“ رابعہ کو کہنا پڑا۔
 عمر نے زیتون کے بیمار کمزور چہرے پر نگاہ ڈالی۔ اب وہاں بیماری کے ساتھ ساتھ شدید مایوسی بھی تھی۔ اسے افسوس بھی ہوا۔ واقعی میں نے کیوں بحث کی ماں کے ساتھ..... وہ ان کے پاس آیا اور ان کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر بولا.....

”آپ کا بیٹا بھلا آپ کا حکم مان سکتا ہے۔“
 ”بیٹا.....“ زیتون کا دل جیسے کسی نے ٹھکی میں جکڑ لیا۔ ”کیا صرف اس لئے تم میری بات مانو گے کہ تم میرے بیٹے ہو.....؟“ آنکھوں میں نمی لئے وہ اک کرب کے عالم میں پوچھ رہی تھیں۔
 ”اماں..... میری بیماری اماں..... وہ بستر پر ان کے قریب آ بیٹھا۔

”مزید بیٹا، کہاں گم ہو.....؟ کھانا کیوں نہیں کھا رہے تم.....؟“ وہ گم سم ڈانٹنگ ٹینل پر بہن اور ماں کے ساتھ بیٹھا تھا۔

جویریہ کے کہنے پر سر اٹھا کر پھٹکی سی ہنسی دی اور وہ بولا.....
 ”بیٹا نے ضد لگالی ہے۔ اب وہ ہر صورت میں مجھے نچاؤ کھانا چاہیں گے۔“
 ”کیا کہتے ہیں بیٹا.....؟“ رابعہ نے جویریہ کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔
 ”وہ مہناز سے شادی کرنا چاہ رہے ہیں مزید کی۔“
 ”کک..... کیا..... مہناز سے شادی.....؟ تو ہنسا، یہ نہیں ہوتا چاہئے۔“
 ”پتا کو کون سمجھائے۔“ مزید نے چیخ پلٹ میں پٹھا۔
 ”بھیا..... اگر بیٹا نے ایسا کیا تو آپ گھر چھوڑ کر چلے جائے گا..... بس کسی کی پروا مت کیجئے گا۔ یہ بھی کوئی بات ہے، ساری عمر کے لئے چھو پھوکی ٹیلی کو سمر پر مسلط کر لو۔“
 ”یہ تم کیا اٹلی بیٹی بڑھاری ہو، ماں باپ جیسے بھی ہوں، اولاد کا فرض ہے کہ ان کا احترام کرے اور تم اس بڑھاپے میں انہیں اکیلا کرنے کا مشورہ دے رہی ہو۔“

”تو کیا تم مزید کی طرف جانا چھوڑ دو گے.....؟“ زیتون کی آنکھوں میں اُمید کی کرنیں چمک اٹکیں۔

”اماں.....“ عمر کے انداز میں بے بسی تھی، ہلکا سا احتجاج تھا، جیسے کہنا چاہتا ہو..... ”خدا کے لئے مجھے ایسا حکم نہ دو۔“

”تم بولتے کیوں نہیں، کیا تم اس کی طرف جانا چھوڑ دو گے۔“

”اماں.....“ عمر کو چاک جیسے کچھ یاد آ گیا۔

”اُس روز ڈاکٹر کے کلینک سے واپسی پر جب ہم نے مزید بھائی اور آنٹی کو دیکھا تھا تو آپ نے تجھے جلدی مچا دی تھی، مجھے ان سے ملنے بھی نہیں دیا، یہاں تک کہ کرایہ طے کئے بغیر ہی رکشے میں بیٹھ گئیں۔ کیوں اماں، آپ نے ایسا کیوں کیا تھا اُس دن، کیا آپ مزید بھائی کی والدہ کو جانتی ہیں.....؟“
 ”کس دن مجھے تو کچھ یاد نہیں، تم کب کی باتیں لے بیٹھے ہو.....؟“ تمام حیات ایک جھلکے پر بیدار ہوئیں۔ اس کے سوال پر جسم کی عمارت لرزنے لگی۔ وہ یاد دلانے لگا تو بیزاری سے بولیں.....
 ”اب تمہیں کالج سے دیر نہیں ہو رہی ہے کیا.....؟“

”دیر تو ہو رہی ہے مگر اماں آپ کی طبیعت مجھے اچھی نہیں لگ رہی، آپ کو یوں چھوڑ کر جاؤں گا تو دل اُدھر ہی انکار ہے گا، پریشان رہوں گا میں.....“

”ہونہر! اتنا خیال ہے تمہیں میری صحت کا.....“ زیتون کے انداز میں شک تھا۔

”اماں کیسی باتیں کرتی ہیں.....؟ عمر جیسا بیٹا تو کسی کسی ماں کو ہی نصیب ہوتا ہے۔“ رابعہ بھی ان کی باتوں پر اُلجھ کر بولی تھی۔

”اس لئے تو سمجھاری ہوں، روک رہی ہوں اسے کہ میں اسے کھونا نہیں چاہتی۔“

”لو، میں کوئی بچو ہوں جو کھو جاؤں گا۔“ اس نے ہونٹوں پر مسکراہٹ لا کر ماحول کو خوشوار کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا.....

”عمر بس آج تم مجھ سے وعدہ کرو تم مزید کی جانب نہیں جاؤ گے، تم اس کے ساتھ دوستی ختم کر ڈالو گے۔“

”اماں.....“ وہ ایسا وعدہ کرتے ہوئے ہنچکپایا۔

”تم کیوں تنگ کر رہے ہو اماں کو.....؟“ رابعہ نے ڈانٹ کر کہا۔

”ایسا وعدہ میں کیسے کروں، مزید مجھے بھائیوں کی طرح عزیز ہے، جب وہ ہمارے ہاں آئے تو میں کس طرح ملے بغیر اسے لوٹا سکوں گا اور اگر وہ اپنے ہاں آنے کی تاکید کرے تب بھی بھلا کیا بہانہ ہوگا میرے پاس۔“

”صاف کہہ دینا میری ماں پسند نہیں کرتی۔“ زیتون نے کہا۔

”آپ خود سوچیں مزید بھائی سے ایسا کہنا کیا آسان ہے۔“

”تو تم میری بات نہیں مانو گے.....؟“ وہ مایوس لہجے میں بولیں۔

”اچھا اماں..... میں کوشش کروں گا، میری اب مزید بھائی سے ملاقات ہی نہ ہو..... اور اگر بھی

انہوں نے ہمارے گھر آنے کی بات کی یا اپنے ہاں بلایا تو.....“

”مما۔۔۔ دیکھیں ناں، زندگی تو بھیا کو گزرتی ہے۔۔۔ اور پھر کیا پتا نہیں جانتے کہ ہم سب بھوپھر کی فیملی کو بالکل بھی پسند نہیں کرتے۔“

”ہم جنیں یا میریں۔۔۔ بیا کو کیا فرق پڑتا ہے۔۔۔ انہیں تو ہر حال میں بھوپھو کی خوشی عزیز ہے۔“

مزید سگ اٹھا۔

”ایسے مت کہو، وہ تمہارے والد ہیں، بہت چاہتے ہیں تمہیں۔“ جویریہ نے ٹوکا۔

ڈرا دیرو کا موٹی چھانگی جسے جویریہ نے ہی توڑا۔

”اگر عمر سے ملو تو اُسے گھر آنے کو ضرور کہنا، پتا نہیں کیا بات ہے، ہر مرتبہ جلد آنے کی تاکید کرتی ہوں مگر وہ بھول جاتا ہے۔“

”مما۔۔۔ میں جاؤں گا کسی روز اُس کی طرف۔۔۔“

”اور سو ہا کی طرف گئے تھے۔۔۔؟“

”نہیں، مجھے ادھر گئے ہوئے بھی کافی دن ہو گئے ہیں۔۔۔ ہاں ایک دو مرتبہ فون پہ بات ہو چکی ہے۔۔۔ ممما، ایک تو وہ لڑکی مجھے بڑا مایوس کرتی ہے۔۔۔ کہتی ہے مجھے پورا یقین ہے، تم ہر جاؤ گے اور مجھ سے کمزوری معذرت کر کے اپنا راستہ بدل لو گے۔“

”اُسے ایسا ہی کہنا چاہئے۔“ راتھ نے جھٹ سے کہا۔

”تم سے کسی نے بات کی ہے، کھانا کھاؤ اور جاؤ اپنے کمرے میں۔“

”اچھی بات ہے چھوٹی ہوں ناں، اتار لیں سب کا غصہ مجھ پر۔“

”آئی ایم سوری راتھ۔۔۔ بس میں ایسا ہی ہو رہا ہوں، پوچھ لو ماما سے، کئی بار ان کے ساتھ بھی ایسے ہی بول جاتا ہوں۔“

راتھ نے اثبات میں سر ہلا کر اس کی معذرت قبول کر لی۔ کھانا کھاتے ہی وہ ٹیبل سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

”سب کی اپنی اپنی فکریں اور اپنے اپنے بوجھ ہیں مگر وہ ایک دوسرے سے شیر تو کر لیتے ہیں مگر

میں کس سے کہوں، کتنا بوجھ ہے میرے دل میں۔۔۔ شاہ! میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی، آپ دھوکا دے جائیں گے۔۔۔ اُن کے دوست کی گفتگو، نورین کی باتیں۔۔۔ یہ سب سوچتی ہوں تو سر چکرانے لگتا ہے، کیا ہوگا میرے ساتھ۔۔۔“

اُن کے دوست نے اور نورین نے صاف انداز میں ان کے بارے میں رائے دی تھی، سب بتا دیا تھا اور یہ سب جھوٹ تو نہیں ہو سکتا۔

نورین نے کیا کر دیا ہے میرے ساتھ۔۔۔ وہ تو میری دوست ہے، جانتی ہے میں کیسی لڑکی ہوں، پھر کیوں شاہ کو میرے قریب آنے کا موقع دیا۔ میرے گلے کے جواب میں کہتی ہے، مجھے کیا معلوم تھا تم محبت کر بیٹھو گی۔

اُن کے دوست نے کہا تھا۔۔۔ ”آپ تو اچھے گھرانے کی شریف لڑکی لگتی ہیں، حیرت ہے آپ بھی ارد شیر کے جال میں آ گئیں۔“

اور نورین نے سارا الزام مجھ پر ڈالتے ہوئے کہا تھا۔۔۔ ”تم جیسی سات پردوں میں خود کو چھپا کر

رہنے والی لڑکیاں کسی کے چند ٹھٹھے بولوں میں ہی ہار جایا کرتی ہیں۔“

آنسو پہلے پکلوں کی باڑھ پر چپکتے رہے، پھر پھسل کر گالوں پر آ گئے اُسے خود پر غصہ بھی آتا تھا اور

بس بھی۔۔۔ اُسے شاہ سے زیادہ آذر اور نورین کی کبھی ہوئی باتوں پر یقین تھا اُسے یاد تھا ایک بار میڈم

سے گھر وہ کیسے عجیب انداز میں مخاطب ہوا تھا، کتنا خوفزدہ ہوئی تھی وہ اور پھر مجھے ہمیشہ اُن کی آنکھوں میں

دیکھتے ہوئے یہ احساس ہوتا تھا، جیسے کچھ غلط ہے۔ میں ان سے ملتے ہوئے گھبراتی تھی، میرے پاؤں اس

راہ پر چلتے ہوئے لڑکھڑانے لگتے تھے۔

مگر میں ملے بغیر وہ بھی نہیں سکتی تھی۔ اُن کی ذات کا حرحرح پر چھانے لگتا تھا۔ میں بے بس ہو جاتی

تھی، تھکتے تھکتے انداز میں اُس نے سر تکیے پر رکھ دیا۔ اسے ارد شیر کی باتیں یاد آنے لگیں۔

شام کو آذر اس کے پاس سے یہ کہہ کر گیا کہ ایک گھنٹے کے بعد آکر تمہارے سر پر سوار ہو جاؤں گا۔

اتنی دیر تم کی وی دیکھو یا اخبار پڑھو۔۔۔ مگر ارد شیر یونہی لیٹا رہا۔ ارشاد نے اسے نورین کی آمد کی اطلاع دی

اور یہ بھی بتا دیا کہ لوگ روم میں بیٹھی ہیں۔

”یہیں بلاؤ، مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ آنے والوں کے حضور میں حاضر ہو سکوں۔“ اُس نے برا

سامنے بنا کر کہا اور پھر اٹھ بیٹھا۔

یہاں آتے ہی ارشاد نے اسے صاحب کی بیماری کی اطلاع تو دی تھی مگر اس کا یہ حال ہوگا، نورین

کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔

”استے بیمار ہو، ہمیں بتایا کیوں نہیں۔۔۔؟“ اُس نے آتے ہی گلہ کیا اور بیماری کی تفصیل پوچھنے

لگی۔ اس کی بات کے جواب میں ارد شیر نے پوچھا۔۔۔

”نورین۔۔۔ راتھ کیسی ہے۔۔۔؟“ کتنے دنوں بعد اُس نے زندگی کی طرف دیکھا اور آنکھوں میں

برائی اور بے یقینی کے بجائے شوق اُٹھانے لگا۔

”راتھ کو کیا ہوتا ہے، وہ ٹھیک ٹھاک ہے۔“ وہ اس کی حالت کے پیش نظر بتائیں مکی کہ اُداس رہتی ہے

ادھار کی طرف سے بہت بدگمان ہو چکی ہے یا دوسرے لفظوں میں (تمہاری اصلیت جان چکے ہیں)۔

”اُسے لاؤ میرے گھر پر۔۔۔“ اس وقت وہ ہراذیت ناک خیال بھلا کر راتھ کے بارے میں سوچ

نے۔۔۔ تھا اور سرور ہو رہا تھا۔

”اُسے یہاں۔۔۔ مگر تم جانتے ہو شاہ، وہ یوں تمہارے گھر میں تم سے ملنے کے لئے آتا پسند نہیں

رتی۔“

”تم کہو تو اُسے۔۔۔“ ارد شیر نے اصرار کیا۔

”اچھا ٹھیک ہے۔۔۔ میں کوشش کروں گی۔“ نورین نے یونہی کہہ دیا۔ ورنہ یقین تھا اب تو

نہیں مانے گی۔

”نورین۔۔۔ تم بس راتھ سے یہ کہہ دینا کہ میں نے بلایا ہے۔۔۔ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں، وہ

مکی انکار نہیں کر سکتی، وہ ضرور آئے گی۔“

”اتنا بھروسہ ہے خود پر شاہ۔۔۔“ نورین نے ایک دم سے بہت دلچسپی کے ساتھ کہہ دیا۔

بہت غصہ آتا ہے خود پر..... میں تو سب کچھ دیکھ کر بھی انجان بن رہی تھی۔ اُن کا انداز بے باک ہوتا تھا۔ ان کی باتیں اکثر مجھے اُبھن میں ڈال دیا کرتی تھیں، میں گھبرا جاتی تھی۔

اور انہوں نے یہ بھی کہا تھا جو چیز مجھے پسند آجائے پھر میں اسے حاصل کر کے رہتا ہوں، زبردستی اٹھالیا کرتا ہوں، بھلا یہ بھی کوئی بات ہے۔ ایسا بھی کہتا ہے کوئی..... کوئی میری تو نہ حیثیت ہے نہ عزت، شوکیں میں پڑی بے جان گڑیا ہوں۔ انہیں پسند آئی تو حاصل کرنے کی ضد باندھ لی۔ اس کا مطلب تو یہ ہونا کہ اگر میں اُن کی طرف نہ بڑھتی مگر انہیں اچھی لگتی تو حاصل کر لیتے۔“

بہت دکھ تھا اُس کے لہجے میں اردشیر کے ان الفاظ کا.....
آنکھیں چھلک گئیں اور آواز لڑکھڑانے لگی۔

اور یہ جملہ اب ہی نہیں، جب بھی برا لگا تھا، جب وہ اُس کے سر میں بری طرح گرفتار تھی۔ اُس کی اس بات پر اسے خیال آیا تھا، وہ والدین کی عزت کو داؤ پر لگا بیٹھی ہے۔ یہ سامنے بیٹھا شخص صرف کہہ ہی نہیں، کبھی سکتا ہے۔

”یہ جو کچھ لکھی ہے، میں مانتی ہوں کہ غلط ہے، بس وہ ہے ہی ایسا مگر رائج..... وہ بہت بیمار ہے، میں تو اس کی حالت دیکھ کر خدشات کا شکار ہو گئی ہوں، وہم ستانے لگے ہیں مجھے، وہ بہت بدل گیا ہے، اس بیماری نے اسے توڑ کر رکھ دیا ہے، اس قدر شکتی لہجہ اور اُن آنکھوں کی بھی ہوئی جوت..... وہ بہت کمزور دکھائی دے رہا تھا، اُس نے تمہارا پوچھا اور تم سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ اُسے یقین ہے تم ضرور آؤ گی۔ وہ شدت سے تمہارا منتظر ہے رائج.....“

”شاہ بیمار ہے.....“ یہ خبر تیر بن کر دل میں اُتر گئی۔

”ہاں میں صبح سے یہی تو بتانے کی کوشش میں ہوں مگر تم میری کوئی بات سننے پر تیار ہی نہیں ہو۔ تم اس کی طرف ضرور جانا رائج، چند منٹ کے لئے ہی سہی مگر دیکھو شاہ کا مان مت توڑنا۔ اُس نے بہت مان سے، بڑے یقین سے کہا تھا کہ رائج انکار نہیں کر سکتی، وہ ضرور آئے گی۔“

”انہیں کیا ہوا ہے.....؟“ رائج نے فکر مندی کے عالم میں پوچھا۔

”پتا نہیں..... میں نے پوچھا بھی مگر اس نے کچھ بتایا ہی نہیں۔“

”میں چلوں گی اُن کی طرف.....“ رائج جیسی کمزور بزدل لڑکی دل کی آواز پر ہار گئی۔

”پھر تم تیار ہو جاؤ، میں گاڑی لے کر آ رہی ہوں تمہارے طرف.....“

”اس وقت..... نہیں نہیں..... اس وقت میں بھلا کیسے جاسکتی ہوں، دیکھو ناں بیا گھر آنے والے تیا۔“

”اچھا..... مگر صبح تو میں کوئٹہ جا رہی ہوں۔“ نورین نے اس کی بات مان لی مگر اپنی مجبوری بھی بتادی۔

”ٹھیک ہے، میں اُن کے گھر کے ایڈریس سے واقف ہوں، خود ہی چلی جاؤں گی۔“

”چلی..... تو جاؤ گی ناں، ایسا نہ ہو وہ انتظار میں ہی رہے۔“

”نہیں نہیں..... میں ضرور جاؤں گی.....“

نورین نے یہ خبر سنا کر اُسے بے حد پریشان کر دیا تھا۔ وہ بھول ہی گئی تھی کہ کچھ دیر پہلے اس کے خیالات اردشیر کے بارے میں کیا تھے۔ جی چاہ رہا تھا فوراً اس کے پاس پہنچ جائے۔

بے ساختہ کہا۔

”خود پر نہیں، مجھے تو اس پر بھروسہ ہے، وہ ضرور آئے گی.....“ اتنی جھپٹوں کو نفرت میں بدلنے ہوئے دیکھنے کے باوجود اسے رائج کے پیار پر پورا بھروسہ تھا۔ یقین تھا جب اسے پتا چلے گا کہ اس نے بلایا ہے تو فوراً اس کے پاس آئے گی۔

”اتنا یقین بھی اچھا نہیں ہوتا شاہ.....“ اس کی حالت کے پیش نظر نورین پریشان ہو کر اپنے تئیں اسے پہلے ہی تیار کر رہی تھی تاکہ رائج کے نہ آنے پر اسے جھکا نہ لگے۔

”تم اُسے کہہ کر تو دیکھو.....“ وہ اتنے دنوں بعد مسکرایا تھا۔

”اچھا ٹھیک ہے.....“ اُس نے نظریں چرا لیں۔

♦ ♦ ♦

اگلے روز کالج میں نورین کی رائج سے ملاقات ہوئی تو نورین نے حال احوال پوچھنے کے بعد شاہ کا ذکر بھی کر دیا۔ اسے بتانے لگی کہ کل وہ اس کی طرف گئی تھی۔

”پلیز نورین، اب میرے سامنے اُن کا ذکر مت کیا کرو..... میں انہیں بھولنے کی کوشش کر رہی ہوں، پلیز تم میری مدد کرو۔“

”آخر ایسا بھی کیا، تم پہلے بھی تو شاہ سے ملتی رہی ہو اب بھی مل لو، اکیسے نہ سہی میرے ساتھ چلی جانا وہاں.....“

”جب میں اندھیرے میں تھی، اب تو سب کچھ جان گئی ہوں اور یہ سب تم نے ہی مجھے بتایا ہے اور پھر بھی وکالت کرنی ہو ان کی، تم میری کیسی دوست ہو۔“

اردشیر کا نام اُس کا ذکر، رائج کے اندر تک شور ہی شور ہونے لگا۔

”تم میری پوری بات تو سن لو.....“ نورین نے کہا۔

”نہیں، میں نے کہہ دیا ناں، اب مجھے اُن کے بارے میں کچھ نہیں سننا..... ہم دونوں کے درمیان اب کبھی شاہ کا ذکر نہیں ہونا چاہئے۔“ اُس کی آواز یہ فیصلہ سناتے ہوئے کانپ رہی تھی۔

وہ اتنا کہہ کر نورین کے پاس رُکی نہیں کہ اپنی کمزوری کا احساس تھا..... اگر ٹھہر جاتی تو پھر خود ہی اردشیر کے بارے میں پوچھ لیتی۔

وہ فائزہ وغیرہ کے پاس آ بیٹھی، سارا دن ان ہی کے ساتھ رہی۔ پیر پڑ بھی ہوتے رہے۔ ہر کلاس میں بظاہر حاضر مگر ذہنی طور پر غائب تھی، نورین کو بات کرنے کا موقع نہیں مل سکا۔

وہ بہت محنت اور اُداس تھی..... گھر آ کر سیدھی اپنے کمرے میں آئی۔ کہلا بھیجا، کھانا نہیں کھاؤں گی، ہاتھ لے کر بستر پر آئی تھی کہ نورین کا فون آ گیا۔

”میں کالج میں کچھ بات کرنا چاہ رہی تھی مگر رائج تم جان بوجھ کر مجھ سے دُور رہیں، میری بات سننے سے گریز کیا۔“

”وہ سمجھ گئی نورین پھر اسی کی بات کرنا چاہ رہی ہے۔ بولی.....“

”میں نے وہیں صاف صاف منع کر دیا تھا، پھر اس بات کو دہرانے سے کیا فائدہ.....؟ نورین مہما اب اس سحر سے آزاد ہونے کی کوشش میں ہوں۔ اُن کا انداز، ان کی باتیں یاد آتی ہیں تو حیرت ہوتی ہے۔“

جلد ہونے لگا۔

اردشیر نے اسے اب تک دروازے کے قریب ہی کھڑے دیکھا تو خود اٹھ کر اس تک جانے کا ارادہ کیا۔ اسے بند کے کنارے پر ہاتھ رکھ کر اٹھنا پڑا اور اس میں بھی وقت کا سامنا تھا۔ سر پکڑا رہا تھا۔ قدم اس کی جانب بڑھایا مگر اندازہ ہو گیا، وہ چل نہیں سکے گا۔

”آؤ ناں، رک کیوں گئیں؟“ وہ پھر کارپٹ پر بیٹھ گیا اور اسے پکارا۔

رائے کو یقین ہو چکا تھا، وہ ضرور کوئی اُلٹی سیدھی چیز پیئے ہوئے ہے۔ بہت ڈرتے ڈرتے اسے نفروں میں رکھ کر وہ آگے بڑھنے لگی۔

”اُدھر نہیں ادھر.....“ اردشیر نے اپنے بند کی جانب اشارہ کیا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ادھر آئی اور بیڈ پر بیٹھ گئی۔ اردشیر نے اپنا بازو اُس کے ہنسنوں پر رکھ دیا۔ اور لمبی آہ کھینچ کر بولا۔

”مجھے تمہارا بہت انتظار تھا..... اور یقین تھا تم آؤ گی..... تمہیں آنا ہی تھا، آخر سب کے سب تو دھوکا نہیں دے سکتے، جین ناں۔“ وہ ہڈیانی انداز میں ہنسا۔ رائے کا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا۔ خوف کے

احساس سے چور اُس نے بڑی بے چارگی سے اس کے بازو کو دیکھا اور خود کو محصور محسوس کیا۔

”رائے تمہیں پتا ہے، کیا ہوا میرے ساتھ.....“ اُس نے سر اُس کی گود میں رکھ دیا۔

رائے کو تو گویا کرٹ لگ گیا۔ کہاں تو خوف سے مر رہی تھی اور اب اتنی طاقت آگئی تھی..... اس کے کان دھڑپے پر دونوں ہاتھ جما کر پرے دھکیلا اور دوڑتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

باہر آ کر رفتار کم کر دی تاکہ ملازموں کو ٹک نہ ہو سکے۔ پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ تیز قدموں سے چلتی دُور نکل گئی۔

آؤ گھر آیا تو ملازموں نے بتایا، صاحب کی حالت بہت بگڑ گئی ہے۔ وہ جلدی سے اس کے کمرے میں داخل ہوا۔ کہاں تو اردشیر پر یا سیت طاری رہتی تھی، آنکھیں ہر دم کسی غم کا سوگ منایا کرتی تھیں اور اب یہ صورت حال تھی کہ وہ ہر چیز کو کس نہس کرنے کے در پہ تھا۔

”صاحب..... انہیں سنبھالیں..... کہیں یہ خود کو شوٹ نہ کر لیں۔“

ملازم اس کی حالت سے پریشان آؤرے کمرے پر تھے اور آؤر کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کس طرح سنبھالے۔

سارا کمرہ الٹ دیا تھا اُس نے..... آؤ تو سمجھ رہا تھا کہ اب چند روز میں حالت بہتر ہو جائے گی مگر صورت حال تو بہت مایوس کن تھی۔

رائے کے اس عمل نے اسے جنون میں مبتلا کر دیا تھا۔

● ● ●

”پتا نہیں انہیں کیا ہوا ہے، ابھی چند روز پہلے تک جب میں اُن سے ملی تھی بالکل ٹھیک تھے..... کی بیماری کا شائبہ تک نہ تھا اور اب نورین کہتی ہے، بہت بیمار ہیں۔“

وہ اردشیر کی صحت کے لئے دعائیں کرتی رہی۔

صبح کاج جانے کے لئے بہت جلدت میں تیار ہوئی، ٹھیک سے ناشتا بھی نہیں کیا۔

ایک طرف تو اردشیر کی طرف سے پریشانی اور دوسری خیال کہ وہ گھر والوں کو دھوکا دے رہی ہے۔ آؤنگٹنبل پر وہ سب سے نظریں چرائے بیٹھی تھی۔ اردشیر کے ہاں کبھی اکیلے جانے کا اتفاق بھی نہیں ہوا تھا، کاج سے وہ جلدی نکل آئی اور اردشیر کی رہائش گاہ کے سیاہ آئنی گیٹ کے سامنے پہنچ کر جیسے نیند سے بیدار ہوئی، اب تک جیسے خواب کی حالت میں یہاں تک پہنچی تھی۔ اب قدم لڑکھڑا رہے تھے۔

اسلحہ بردار چوکیدار اس کی جانب متوجہ تھا اور وہ سوچ رہی تھی..... اندر چلی جائے یا نہیں سے واپس ہو جائے، پتہ نہیں کتنے لمبے پونہی بیت گئے اور آخر اُس نے اردشیر کا نام لے ہی دیا اور گیٹ سے اندر داخل ہوئی۔

آؤر ابھی ابھی افس گیا تھا۔ اس وقت اردشیر اکیلا تھا۔ اس کے جاتے ہی سوچوں میں ڈوبنے ابھرنے لگا تھا۔ بڑی ماں کی آواز سارے کمرے میں گونج رہی تھی، شعلہ بارنگائیں اس پر جمائے وہ کہہ رہی تھیں.....

”کتنی ہی دشمنیاں نکلتی ہیں تمہاری طرف، بڑی نفرت کی ہے میں نے تم سے، جاؤ چلے جاؤ یہاں سے، چاہے تم مر جاؤ، ہم نہیں روئیں گے تمہیں، ہم میں سے کسی کو تمہاری ضرورت نہیں۔“

”ایسا مت کہیں..... خدا کے لئے ایسا مت کہیں یہ اذیت مجھ سے برداشت نہیں ہو رہی۔“

وہ گڑگڑا رہا تھا..... بے چین ہو کر بیڈ سے اُتر آیا تھا۔ کچھ دیر التجاؤں کے بعد ہانپ گیا تھا اور بیڈ سے ٹیک لگا کر نیچے کارپٹ پر بیٹھا تھا..... بھلا یوں بھی ہوا ہو گا کسی کے ساتھ۔

”پاپا..... کتنا ذلیل کیا آپ نے مجھے اور بڑی ماں نے میرے وجود کو اتنا حقیر کر دیا کہ اب مجھے خود سمجھ نہیں آتی، زندگی کس لئے ہے، کیا مقصد ہے میرے جینے کا۔“

دروازہ کھلنے کی ہلکی سی آواز پر اُس نے سر اٹھا کر بیڑی کے عالم میں ادھر دیکھا۔

”رائے.....“ اسے جھٹکا سا لگا..... ابھی ابھی جس کیفیت میں تھا، فوری طور پر اس سے باہر آنا ممکن نہیں تھا۔ اُس نے بے یقین لئے بغور اسے دیکھا، کل سے منتظر تھا مگر اب تو مایوسی ہوئے گی تھی۔ وہ سمجھا تھا نورین نے اس کا بیغام اسے دیا ہی نہیں ہے۔ ایک لمحہ کے لئے بھی دل رائے سے بدگمان نہیں ہوا تھا۔

ابھی ابھی جس جذباتی کیفیت سے گزر رہا تھا، اس سے اتنی جلدی سنبھل جانا بہت مشکل تھا..... آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں..... چہرے سے وحشت پک رہی تھی..... پیشانی پر بھرے بال.....

قیص کے کھلے ہوئے من وہ بیڈ سے ٹیک لگائے تھکے تھکے انداز میں قالین پر بیٹھا تھا۔

”آؤ ناں..... رک کیوں گئیں.....؟“ اُس کی آواز بہت بھاری ہو رہی تھی اور لفظوں میں روانی نہیں تھی، وہ رُک رُک کر بولا تھا..... پھر لمبا سانس کھینچ کر رائے کو دیکھنے لگا۔

”کیا یہ نشتے میں ہے.....؟“ رائے ہلکی..... ”کہیں نورین نے جھوٹ تو نہیں بولا..... یا پھر ممکن ہے شاہ نے ہی نورین کے ساتھ غلط بیانی کی ہو، مجھے یہاں تک لانے کے لئے جھوٹ بولا ہو۔“ اس پر خوف کا

”کھانا کھا لو، عقل ٹھکانے آئے گی سوچنا.....“ آذر نے مسکرا کر اس اعصاب شکن ماحول کا اثر کم کر دیا اور حیرت ہوئی جب وہ خاموشی سے اُٹھا اور کھانا کھانے کے لئے آ بیٹھا۔
آذر تو اس کی جانب سے خاصا مایوس تھا۔ ڈاکٹر نے کہا تھا، چند روز میں وہ سنبھل جائے گا مگر وہ مارا دن اُس کے ساتھ رہتا تھا، اُس کی کیفیت مسلسل دیکھتا تھا، اسے اعتبار نہیں آیا تھا، اُس کا خیال تھا بشری کی حالت اب کافی دنوں کے بعد جا کر ہی سنبھلے گی کہ اس جیسے لوگ جنہیں ہمیشہ اہمیت اور محبت دی جاتی ہے، جب ٹوٹتے ہیں تو سمٹ نہیں پاتے۔

مگر حیرت ہوئی کہ اگلے دو روز میں ارد شیر پہلے سے بہت بہتر دکھائی دینے لگا تھا۔ اُس نے چننا چاہا بہت کم کر دیا تھا ہاں البتہ بھلایا ہوا، دُنیا سے اُکتایا ہوا، وہ اب بھی تھا۔ کھانا اب بھی بہت کم کر دیا تھا۔ آذر اور دو لڑکے کے بعد ہی راضی ہوتا۔

رات کا آخری پہر تھا۔ ارد شیر کی آنکھ کھل گئی۔ اس وقت وہ کمرے میں اکیلا تھا۔ آذر یقیناً اسے نیند نہ چھوڑ کر اپنے گھر چلا گیا تھا۔ ارد شیر کچھ دیر خالی ذہن کے ساتھ بیڈ پر لیٹا رہا پھر ایک ایک کر کے تمام غات ذہن میں چکرانے لگے مگر شاید یہ نیند کا اثر تھا، وہ بظاہر پرسکون رہا۔ اُس پر غصے اور دکھ کرلی جلی غبت نے حملہ نہیں کیا۔

کچھ دیر بعد وہ بستر سے اُٹھا اور کاپی، بال پوائنٹ لے کر ریمب روشن کر کے بیٹھ گیا۔ دیر تک آدھی جھجک رہی تھی کھینچتا رہا۔ پھر کسی نتیجے پر پہنچ کر اس کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ بہت دنوں کے بعد اُس نے دن کا سانس لیا۔ بال پوائنٹ رکھ کر وہ پھر بیڈ پر آ گیا۔ کاپی اُس کے ہاتھ میں تھی، ان لکیروں کو جن کا اثر کوئی سرخیر دکھائی نہ دیتا تھا، دیکھتا رہا اور سرور ہوتا رہا۔

تقریباً تین منٹ کے بعد اُس نے کاپی رکھ دی اور کھڑکی کا شیشہ ہٹا کر کھڑا ہو گیا پھر کچھ دیر کے بعد کمرے سے باہر آ گیا تمام کمروں میں چکراتا پھرا اور آخر کچن میں آ کر بیٹھ گیا۔ آج کل کھانا تو وہ برائے ہی کھا رہا تھا، وہ بھی آذر کے زبردستی کھلا دینے پر مگر آج فرج کھول کر جوس نکالا اور اتنے سرد موسم میں بن کر پی رہی بیٹھا پیتا رہا۔ اس کے بعد ایک سیب بھی کھایا۔ اُس کو صبح ہونے کا شدت سے انتظار تھا۔

جو بھی اُفتق پر سورج ابھرا، اُس نے چوکیدار کو بلا لیا۔

”کوادرے شادوے کو جگا کر لاؤ..... جلدی کرنا مجھے بہت ضروری کام ہے۔“

چوکیدار نے اپنے صاحب کی جانب دیکھا، آج تو وہ بہت حد تک نارمل دکھائی دے رہے تھے۔

”صاحب! آج تو آپ بالکل ٹھیک دکھائی دے رہے ہیں۔“

”ہاں، میں ٹھیک ہوں..... تم جاؤ اسے بلاؤ۔“ ارد شیر اتنا کہہ کر کاسن روم میں آ بیٹھا۔

ذرا دیر بعد ہی ملازم خاص شادا حاضر تھا۔

”تمہیں صرف یہ معلوم کر کے مجھے بتانا ہے کہ میرے والد صاحب آج کل کہاں ہیں.....؟ گاؤں

نہیں یا شہر آئے ہوئے ہیں۔ اگر شہر میں آئے ہوئے ہیں تو اُن کی گاؤں واپسی کب تک ہوگی۔“

”ٹھیک ہے صاحب، آج بارہ بجے تک سب معلوم کر کے آپ کو بتا دوں گا۔“

”ہوں، اب تم جاؤ۔ اور ہاں سنو، چوکیدار سے کہنا اگر آذر صاحب آئیں تو گیٹ پر سے ہی نال

سہ کہہ دے کہ میں ایک ہفتے کے لئے اسلام آباد چلا گیا ہوں۔ اگر اندر آنے کی ضد کریں تو کہنا سارا

”ارد شیر..... کیا ہو رہا ہے تمہیں.....؟ یوں مت کرو..... سنبھالو خود کو.....“ آذر نے چلا کر کہا..... پھر چیزوں کو اُٹھا اُٹھا کر ادھر ادھر بیٹھے ارد شیر کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لئے، اسے قاف میں کرنے کی کوشش کی۔ مگر اُس پر جنوں سوار تھا، ایک ہی جھٹکے سے اپنے دونوں ہاتھ اس کی گرفت سے آزاد کرالے اور پیچھے ہٹے ہوئے بولا.....

”تم سب نے مجھے سمجھ کیا رکھا ہے، میں کوئی کھلوتا ہوں، کہ جب تک جی چاہتا ہے، کھیلے ہیں اور جب جی بھر جاتا ہے تو توڑ دیتے ہیں، تم سب نے مجھے سمجھنے میں سخت غلطی کی ہے، میں کھلوتا نہیں ہوں، میں بھی توڑنے کی طاقت رکھتا ہوں..... تم دیکھ لینا، سب کچھ ختم کر دوں گا..... میں فنا کر دوں گا سب کو.....“

بولتے بولتے وہ ہانپ گیا اور بیڈ پر گرنے کے انداز میں بیٹھ کر گہرے گہرے سانس لینے لگا۔

”تم کسی کی بات کرتے ہو دوست، کس نے تمہیں ستایا ہے، تم مجھے اُس کا نام کیوں

نہیں بتاتے.....؟“ آذر نے پیار سے اسے اپنے قریب کرتے ہوئے کریدنا چاہا۔

ارد شیر جو ذرا کی ذرا غصے کی کیفیت سے پھر رنج و الم کی عمیق گہرائیوں میں اُترتا اور بے بس دکھائی

دیا تھا، میز پر ہاتھ مار کر گرجنے پر سنے والے انداز میں بولا.....

”کیا ہو اس کر رہے ہو.....؟ کون مجھے ستا سکتا ہے.....؟ ستایا کیسے جاتا ہے، یہ تو اب تم

دکھاؤں گا دُنیا کو، مگر افسوس آذر، تم نہیں دیکھ سکو گے تمہارا دل بہت کمزور ہے، رو پڑو گے تم تو.....“ بات

کے اختتام پر اُس نے تہمت لگایا۔

اس نئی کیفیت سے آذر حد درجہ خوفزدہ تھا..... وہ تو چند روز سے یہ سمجھ رہا تھا کہ ارد شیر سنبھل

ہے..... لیکن اب بات بات پر غصہ اور انتقام کے خوف ناک منصوبے آذر کو بے حد پریشان کر رہے تھے۔

اس وقت وہ چاہ رہا تھا، ارد شیر دوا لے کر سو جائے مگر اس کے ساتھ زبردستی بھی ممکن نہیں تھی۔ اس کی جانب

دیکھتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا، اگر اس کی کیفیت یہی رہی یا مزید بگڑنے لگی تو کیا ہوگا۔ ارد شیر کو دیکھ کر اسے

یہی لگتا تھا، اب یہ کبھی سنبھل نہیں سکے گا۔

”اگر سب سے ناراض ہو تو پھر یہ سوگ کیا، کھانا کیوں نہیں کھاتے تم.....؟“

ارد شیر نے ہاز و آنکھوں سے ہٹایا اور بولا.....

”اپنے دشمنوں کا سوگ نہ مناؤں کیا.....؟“

رابعہ تو آنے والے وقت سے سخت خوفزدہ دکھائی دیتی تھی۔ کئی بار دل اتنا پریشان ہو جاتا کہ وہ سہمی۔ وہ اسے تسلی دینا چاہتا تھا مگر الفاظ نہیں ملتے تھے۔ آنے والے وقت کا خوف اس کے دل میں بھی مزیت کر گیا تھا۔ ایسے میں جی چاہتا، کوئی ہو جو اسے دلاسا دے سکے، اس کا حوصلہ بڑھا سکے، مزیت بہت بڑھاتا تھا۔ وہ اس وقت پاس ہوتا تو بہت تسلی دیتی، حوصلہ مل جاتا مگر وہ نہیں تھا۔ عمر اکیلا ہی حالات سے نہ رہا تھا۔

کئی بار سوچا مزیت کو اطلاع کر دے، اُسے کہہ دے۔۔۔

”بھیا۔۔۔ میں ان حالات میں آپ کی ضرورت بڑی شدت سے محسوس کر رہا ہوں۔“

مگر اماں کی بات یاد آتی تو زک جاتا۔

”پتا نہیں انہوں نے کیوں منع کر دیا ہے۔ پہلے تو وہ بھی بھیا سے اتنا پیار کرتی تھیں۔ صرف مجھے ہی نہیں انہیں بھی مزیت بھائی کی آمد کا انتظار رہا کرتا تھا۔ وہ چند روز نہیں آتے تھے تو مجھ سے پوچھا کرتی تھیں۔ اب نجائے کیا ہو گیا ہے انہیں۔“

رابعہ اور عمر، زیتون کے پاس ہسپتال میں تھے۔ مزیت ایک بار پھر اس کے گھر گیا، تب اسے محلے کے لوگوں نے عمر کی والدہ کی بیماری کے متعلق بتایا اور اطلاع دی کہ وہ تین چار روز سے ہسپتال میں ہیں۔ وہ اُن سے ہسپتال کا پوچھ کر چلا آیا۔

عمر اس وقت دوا میں لینے کے لئے مین گیٹ سے باہر آ رہا تھا جو نئی اس پر نظر پڑی، زیتون سے کیا وعدہ یاد نہیں رہا۔ وہ بے اختیار ہی اس کی جانب لپکا اور آواز بھی دے ڈالی۔

مزیت گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے ہی زیتون کے بارے میں پوچھنے لگا۔

”اماں ٹھیک نہیں ہیں بھائی اور آپ کو اطلاع کس نے دی ہے۔۔۔؟“

”میں تمہارا گھر گیا تھا، وہیں سے پتا چلا ہے مجھے۔“

”بھائی، آپ نے اچھا کیا جو چلے آئے ہیں، میں بہت مس کر رہا تھا آپ کو۔“

”تم نے مجھے اطلاع کیوں نہیں دی، پتا ہوتا تو میں خود ہی چلا آتا۔“

”بس بھائی، خیال ہی نہیں رہا، اصل میں اماں کی طرف سے اتنی پریشانی تھی، میں اور رابعہ تو کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل ہی نہیں رہے تھے۔ دھیان اماں کی جانب سے ہوتا ہی نہیں ہے۔ آپ دُعا کریں وہ جلدی ٹھیک ہو جائیں ڈ۔۔۔ اور ذرا کے لئے اپنی والدہ سے بھی ضرور کہیں گا۔“

”ہاں ہاں تم فکر نہ کرو، اللہ نے چاہا تو ایک دو روز میں وہ بالکل ٹھیک ہو کر گھر آ جائیں گی۔۔۔ اور اُن وقت تم کہاں جا رہے تھے۔“

جواب میں اُس نے دواؤں کی لسٹ اُسے دکھادی۔ مزیت نے نسخہ اس سے لیا اور بولا۔۔۔

”تم یہیں انتظار کرو، میں یہ سب لے کر اچھی آتا ہوں۔“

”مگر بھائی۔۔۔ عمر بچکا یا۔“

مزیت نے پیار بھرے انداز میں گھور کر دیکھا اور بولا۔۔۔

”بھائی بھی کہتے ہو اور تکلف بھی کرتے ہو۔ میں یہ دوائیں لے کر آ جاؤں پھر کرتا ہوں تم سے دودو ہاتھ۔۔۔ شاباش، اچھے بچوں کی طرح یہیں موجود رہنا۔“

گھر بند کر کے گیا ہوں۔“

”ٹھیک ہے صاحب۔۔۔۔۔“

اُسے آذر کے لئے ایسی بات کہنے پر حیرت تو تھی کہ آذر وہ دوست تھا جس نے اردو شریک نکاح کے دنوں میں دن رات ایک کر دیئے تھے مگر وہ صاحب سے کوئی سوال و جواب نہیں کر سکتا تھا۔

زیتون کی حالت سننے کی بجائے گزرتی جا رہی تھی۔ عمر اور رابعہ بے حد پریشان تھے۔ شام کو عمر ان کو کلینک پر لے گیا۔ اس کے جانے کے چندہ میں منٹ بعد مزیت آ گیا۔ رابعہ نے خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ زیتون کی موجودگی میں نہیں آیا ورنہ عمر کے لئے سختی مشکل ہو جاتی، وہ بھلا کیا کہہ کر نکلتا اسے، اُس نے مزیت کو یہ نہیں بتایا کہ اماں بیمار ہیں اور عمر انہیں ڈاکٹر کے پاس لے گیا ہے، بلکہ یہ کہا۔۔۔ ”وہ دونوں کی ملنے والے کے پاس گئے ہوئے ہیں اور اُن کی واپسی خاصی دیر میں ہوگی۔“

ان دونوں کی غیر موجودگی میں مزیت نے بیرونی دروازے سے اندر آتا بھی مناسب خیال نہیں کیا۔ بس پیغام دے دیا۔

”عمر آئے تو اُسے میری آمد کی اطلاع دے دینا اور میری ماما کا پیغام بھی کہ وہ اُسے بہت یاد کرتی ہیں۔ گھر پر بلا رہی تھیں۔ کہنا کسی روز مصروفیت سے وقت نکال کر ہماری طرف ضرور آئے۔“

”ٹھیک ہے مزیت بھائی، میں یہ سب کہہ دوں گی۔“ اُس کے جانے کے بعد دروازہ بند کر کے علی تو سوچ رہی تھی۔۔۔ کتنی تیار کرتے ہیں یہ عمر سے۔۔۔ اماں کو پتا نہیں کیا ہوا جو ملنے سے بھی منع کر دیا۔ یہ سب کچھ سوچتی چولہے کے قریب آنٹنی مکر اماں کی طرف سے طبیعت پریشان تھی۔ کچھ پکا نہیں کل۔

دھیان بیرونی دروازے کی جانب تھا کہ کب عمر اور اماں واپس آتے ہیں۔ ڈاکٹر نے زیتون کو ہسپتال میں داخل کروانے کو کہا تھا۔

”کیا یہ بہت بیمار ہیں، کوئی خطرے والی بات تو نہیں ہے ناں ڈاکٹر صاحب۔۔۔؟“ عمر نے کرب حد پریشان ہو گیا تھا۔

جواب میں ڈاکٹر نے نسخہ تھما دیا تھا، مٹی بہت زیادہ جڑتا تھا مگر اُس نے بھی سوچ لیا تھا، ماں کی خاطر خود کو بیچنا بھی پڑا تو یہ بھی کرنے سے گریز نہیں کرے گا۔

جب کہ زیتون اپنی زندگی سے مایوس ہو چکی تھی، بار بار کہتیں۔۔۔

”سب کچھ مجھ ہی پر خرچ کر دو گے عمر، کچھ اپنے لئے اور رابعہ کے لئے بھرا کھو تمہیں پیسوں کی ضرورت پڑے گی۔“

”اماں۔۔۔ آپ ہمارے ساتھ ہیں تو پھر ہمیں کسی چیز کی ضرورت نہیں۔۔۔ بس آپ اب جلدی سے ٹھیک ہو جائیں۔“

اس کے جیسے نہ کر بجائے خوش ہونے کے اداسی اور بھی گہری ہو جاتی۔۔۔ اکثر تو وہ رونا لگتیں۔۔۔ عمر یہی سمجھتا اپنی بیماری کی وجہ سے پریشان ہیں۔ اسی لئے روری ہیں۔ ہسپتال کے جنرل وارڈ میں انہیں تیسرا دن ہونے کو آیا مگر حالت کسی طرح سنہل نہیں رہی تھی۔ ان دونوں کا برا حال تھا۔ طرح طرح کے دہم ستانے لگے۔

مزید کے جانے کے بعد عمر کو خیال آیا، اگر اُس نے اماں سے ملنے کی خواہش کا اظہار کر دیا تو ہم کیا ہوگا۔ وہ بھلا کیا کہہ کر اسے ملنے سے منع کر سکے گا۔ وہ اندر راجعہ سے بھی مشورہ کرنے کے لئے چلا۔ راجہ کو ریزہ میں ہی مل گئی۔ عمر نے ساری بات اُس سے کہہ دی۔

”اس وقت اماں سو رہی ہیں اور ہم یہی بات مزید بھائی سے کہہ سکتے ہیں۔“

”ہاں چلو یہ بھی اچھا ہوا۔“ اُس نے گہری سنس کھینچ کر کہا کہ سر سے بوجھ اتر گیا تھا۔ مزید سے سامنے کوئی بہانہ کرنا اسے بہت ہی مشکل لگ رہا تھا اور وہ یہ سوچ کر ہی شرمندہ ہو رہا تھا کہ اس سے کچے جھوٹ بولے گا۔

”آپا۔۔۔ بھائی کے ساتھ جب بہانہ کرنا ہوگا تو حری کرنا، میں ایسا نہیں کر سکتا۔“

”ٹھیک ہے اماں کی خاطر میں جھوٹ بول دوں گی۔ وہ بیاریں، ہمیں اس حالت میں ان کی کوئی بات ٹال کر انہیں صدمہ نہیں پہنچانا چاہئے۔“

عمر اثبات میں سر ہلا کر پھر باہر آ گیا اور گیٹ کے قریب ادھر ادھر ٹہل کر مزید کا انتظار کرنے لگا۔

”جی۔۔۔ میں بابا جان سے ملا ہوں، معافی مانگی ہے۔۔۔ بے قصور ہوتے ہوئے بھی اور ساری نیت بھی واضح کی ہے اُن پر۔۔۔ اور اب وہ شرمسار ہیں اپنی جلد بازی پر۔۔۔ انہوں نے ہم دونوں کو حاف کر دیا ہے۔“

”اچھا۔۔۔ زینت خوشی کے بے پایاں احساس میں گہری بے اختیار کہہ اٹھی، پھر بولی۔۔۔

”میں نے تو بار بار قسمیں کھائیں۔۔۔ اتنا یقین دلایا مگر وہ چپ کے چپ بیٹھے رہے۔ بس ایک بار اتنا کہا، تم سے گلہ نہیں ہے۔ مگر میں جانتی ہوں، دل میں بال تو آ گیا ہے۔ آپ بیٹے ہیں، آپ کی بات پڑتین کرنا ہی تھا انہیں۔ وہ بہت پیار کرتے ہیں آپ سے۔۔۔ بہت اچھا کیا آپ نے جو ساری بات رصاحت سے بیان کر دی۔“

”شاہ جی آج کل شہر میں ہیں، پرسوں کسی مقدمہ و فیروہ کی تاریخ ہے۔ آج انہیں اسی سلسلے میں وکیل صاحب سے ملنا ہے اور پھر تاریخ بھٹکانے کے بعد ہی اُن کا گاؤں جانے کا پروگرام ہے۔“

”یہ تو بہت اچھی اطلاع ہے میرے لئے۔“ ارد شیر کہے بغیر نہیں سکا۔

”کیا آپ بڑے صاحب کی طرف جانا چاہتے ہیں؟ میں گاڑی نکلوا دوں صاحب۔۔۔ اور درحکم کریں تو آپ کے ساتھ ہی چلوں۔“

”ہاں، اب تو اُن کا دل ہم دونوں کی طرف سے بالکل صاف ہے۔۔۔ صبح ہم دونوں نے اکٹھے اہٹا کیا ہے۔ پھر وہ وکیل کی طرف چلے گئے۔ کہہ رہے تھے، تاریخ بھٹکا کر گاؤں جائیں گے اور زینت کو ٹہلے کر آئیں گے۔ کچھ روز آپ دونوں ہماری طرف رہیں گے، ہمارے مہمان بن کر۔“

”اچھا۔۔۔ اس کا مطلب ہے اب تو ان کا دل بالکل صاف ہو گیا ہے۔“ زینت کی آواز میں خوشی کی جھلک نمایاں تھی۔

”نہیں نہیں، بس اب تم جاؤ۔“ شاداواہی کے لئے مزہ تو چکیدا آ گیا۔

”ابھی ابھی آؤ صاحب آئے تھے۔ میں نے آپ کے حکم کے مطابق کہہ دیا ہے کہ آپ اعلاء آباد چلے گئے ہیں، سن کر بہت فخر مند ہوئے تھے۔“

”چلو کوئی بات نہیں، کل پرسوں تک میں خود آؤ صاحب سے مل لوں گا۔“ ارد شیر یوں تو اس وقت ٹانگ پر ٹانگ جمائے کرسی پر بیٹھا تھا مگر پھر بھی اُس کے ہر انداز میں غلت محسوس ہو رہی تھی۔ دونوں ملازم باہر چلے گئے۔ جب اُس نے گاؤں بڑی حویلی کا فون نمبر ملایا۔ فون زینت نے ہی ریسو کیا۔ اُس کا نام سن کر وہ چٹکھ نہیں بولی۔

”دیکھئے جی۔۔۔ مجھے بہت افسوس ہے۔۔۔ بابا جان نے اُس روز میرے ساتھ ساتھ آپ کو بھی شرمندہ کیا۔۔۔ وہ بہت اچانیت بھرے انداز میں کہہ رہا تھا۔

زینت نے شاہ جی سے معافی مانگی تھی۔ ان کا دل وہ بہن صاف کرنے کی کوشش کی تھی، بار بار کہا تھا۔

”آپ نے غلط سمجھا شاہ جی، ہماری نیت تو بالکل صاف تھی۔“

جواب میں وہ خاموش ہی رہے تھے اور اگلے روز صبح ہی صبح شہر کے لئے روانہ ہو گئے تھے۔ ان کی خاموشی زینت کو ڈرا رہی تھی۔ وہ دل ہی دل میں بے حد خوفزدہ تھی۔ اب ارد شیر نے اتنے دوستانہ انداز

”ہاں جی کیوں نہیں۔۔۔ ہم دونوں ضرور آئیں گے۔“

”اچھا سنئے۔ آپ اُس روز بیمار تھیں ناں، بخار تھا آپ کو، اب طبیعت کیسی ہے آپ کی؟“

”اُس روز جو کچھ ہوا۔۔۔ پھر شاہ جی جس خاموشی سے شہر چلے گئے تھے، اس بات نے مجھے بہت یار کر ڈالا ہے اور سچ تو یہ ہے زندگی ہی بری لگنے لگی تھی۔ میں نے علاج کروایا ہی نہیں۔“

”بہت برا کیا آپ نے۔۔۔ میں یہ سن کر بہت فخر مند ہوں۔۔۔ آپ کے لئے۔۔۔ ابھی گاڑی بجاتا ہوں اور بابا جان سے میں خود وکیل صاحب کے آفس فون کر کے بات کرتا ہوں۔ بس آپ اب خود ٹھہر آ جائیں۔ دیر نہیں ہونی چاہئے۔“

”لیکن۔۔۔ میں اس طرح۔۔۔ وہ ہچکچائی۔

”کہہ تو رہا ہوں، پہلے بابا جان سے اجازت لوں گا، پھر گاڑی بھجواؤں گا اور ڈرائیور آپ کو بابا جان کی کوئی پرہی چھوڑ کر آئے گا، ادھر تو نہیں لائے گا جو سوچ میں پڑ سکیں۔“

”نہیں جی نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں۔۔۔“ بات تو ایسی ہی تھی مگر اس نے جس خلوص کا مظاہرہ کیا

”ابھی ابھی آؤ صاحب آئے تھے۔ میں نے آپ کے حکم کے مطابق کہہ دیا ہے کہ آپ اعلاء آباد چلے گئے ہیں، سن کر بہت فخر مند ہوئے تھے۔“

”چلو کوئی بات نہیں، کل پرسوں تک میں خود آؤ صاحب سے مل لوں گا۔“ ارد شیر یوں تو اس وقت ٹانگ پر ٹانگ جمائے کرسی پر بیٹھا تھا مگر پھر بھی اُس کے ہر انداز میں غلت محسوس ہو رہی تھی۔ دونوں ملازم باہر چلے گئے۔ جب اُس نے گاؤں بڑی حویلی کا فون نمبر ملایا۔ فون زینت نے ہی ریسو کیا۔ اُس کا نام سن کر وہ چٹکھ نہیں بولی۔

”دیکھئے جی۔۔۔ مجھے بہت افسوس ہے۔۔۔ بابا جان نے اُس روز میرے ساتھ ساتھ آپ کو بھی شرمندہ کیا۔۔۔ وہ بہت اچانیت بھرے انداز میں کہہ رہا تھا۔

زینت نے شاہ جی سے معافی مانگی تھی۔ ان کا دل وہ بہن صاف کرنے کی کوشش کی تھی، بار بار کہا تھا۔

”آپ نے غلط سمجھا شاہ جی، ہماری نیت تو بالکل صاف تھی۔“

جواب میں وہ خاموش ہی رہے تھے اور اگلے روز صبح ہی صبح شہر کے لئے روانہ ہو گئے تھے۔ ان کی خاموشی زینت کو ڈرا رہی تھی۔ وہ دل ہی دل میں بے حد خوفزدہ تھی۔ اب ارد شیر نے اتنے دوستانہ انداز

”ہاں جی کیوں نہیں۔۔۔ ہم دونوں ضرور آئیں گے۔“

”اچھا سنئے۔ آپ اُس روز بیمار تھیں ناں، بخار تھا آپ کو، اب طبیعت کیسی ہے آپ کی؟“

”اُس روز جو کچھ ہوا۔۔۔ پھر شاہ جی جس خاموشی سے شہر چلے گئے تھے، اس بات نے مجھے بہت یار کر ڈالا ہے اور سچ تو یہ ہے زندگی ہی بری لگنے لگی تھی۔ میں نے علاج کروایا ہی نہیں۔“

”بہت برا کیا آپ نے۔۔۔ میں یہ سن کر بہت فخر مند ہوں۔۔۔ آپ کے لئے۔۔۔ ابھی گاڑی بجاتا ہوں اور بابا جان سے میں خود وکیل صاحب کے آفس فون کر کے بات کرتا ہوں۔ بس آپ اب خود ٹھہر آ جائیں۔ دیر نہیں ہونی چاہئے۔“

”لیکن۔۔۔ میں اس طرح۔۔۔ وہ ہچکچائی۔

”کہہ تو رہا ہوں، پہلے بابا جان سے اجازت لوں گا، پھر گاڑی بھجواؤں گا اور ڈرائیور آپ کو بابا جان کی کوئی پرہی چھوڑ کر آئے گا، ادھر تو نہیں لائے گا جو سوچ میں پڑ سکیں۔“

”نہیں جی نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں۔۔۔“ بات تو ایسی ہی تھی مگر اس نے جس خلوص کا مظاہرہ کیا

پھر منظر بدلتا ہے۔

اب ننھے بچے کا ہاتھ اس کی پیشانی پر ہے۔ وہ فکر مندی سے پوچھ رہا ہے۔

”آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے تاں بڑی ماں؟“

اور..... اور پھر آخری منظر.....

جوان خور بڑا لڑکا، بالکل اسی ننھے ارد شیر کی طرح بسورتے ہوئے اپنے باپ کی شکایت کرنے کبریٰ کے پاس آیا ہے۔ اس عورت کے چہرے پر نفرت ہے، سفاکی ہے۔

”ماں تو صرف ماں ہوتی ہے، نہ بڑی ماں، نہ چھوٹی ماں۔ تم کس بڑی ماں کی بات کرتے ہو؟“

اور پھر اس کے خور و چہرے پر، ان چمکدار کانچ جیسی آنکھوں میں کیسا رعب تھا۔ لگا تھا دل میں تیر بزمیا ہے۔ خون کے آنسو روئی ان آنکھوں میں التجا تھی۔ ”مجھے بچالیں“ مگر اُس نے کہا تھا۔

”مجھے تمہاری کوئی پروا نہیں، چاہو تو مر جاؤ۔“ وہ اتنا ٹوٹا، ایسا غدا حال ہوا کہ تھک کر نیچے بیٹھ گیا۔

بکھر گیا۔

بڑی تیز آندھی تھی۔ طوفان جو عرصے سے کبریٰ کے دل میں چھپا ہوا تھا، اُس روز تمام عالم میں بھیل گیا اور اس کی زد میں ارد شیر آ گیا۔ بے قصور، معصوم، بھروسے اور اعتماد کے ہنڈولے میں جھولتا ارد شیر۔

کبریٰ کی پچھلے کئی دنوں سے بے کمال تھیں۔ وہ راتوں کو سو نہیں سکی تھیں۔ کبھی ارد شیر کا بچپن انہیں بندے جگا دیتا اور کبھی کرب میں ڈوبی آواز آنکھوں میں حیرت لئے وہ انہیں پکارتا۔

”بڑی ماں.....“

اور سوتے سے اُن کی آنکھ کھل جاتی، وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھتیں۔ کئی بار کبریٰ نے بے خودی کے عالم میں پوچھ بھی ڈالا۔

”کیا ہوا ارد شیر؟“

نفرت تو شاہ جی سے کی تھی۔ نہیں بلکہ محبت کی تھی۔ نفرت تو انہوں نے کروائی تھی۔ میں نے تو عشق کیا تھا پھر ارد شیر کا قصور کہاں سے نکلا؟ مجھے شاہ جی نے نظروں سے گرایا۔ محبت کا وعدہ وہ بولے، مجھے اپنے دل سے انہوں نے نکالا کہ دل کی خواہش کچھ اور ہونے لگی تھی۔

ارد شیر نے مجھ سے محبت کی تھی۔ ہمیشہ مان دیا اور بدلے میں کیا پایا اُس نے۔ اُس کا جرم تو نہیں بھی نہیں نکلتا۔ تو پھر میں نے سزا اُسے کیوں سنائی؟ بالکل ویسے ہی جیسے مجرم نہ ہوتے ہوئے ٹی، شاہ جی نے مجھے سزا دی۔ دل کے گھر سے بے گھر کرنے کی سزا۔

یہ میں نے کیا کیا۔؟ یہ تو وہی تھا جس کی تمنا میں نے کی تھی۔ مجھے یاد ہے ایک بار نہیں، بار بار میں نے وہ چہرہ ہاتھوں میں لے کر بغور دیکھا اور کہا تھا۔

”کاش تم میرے ہوتے۔ میرے جسم کا حصہ ہوتے۔ میری رُوح، میرا دل ہوتے، میرا فخر، میرا مان ہوتے۔“

میں ندامت سے چور ہوں، مجھے معاف کر دو ارد شیر۔

تھا، دو صاف منع کرتے۔ مئے پچکی رہی تھی۔

”بس ٹھیک ہے..... میں ڈرائیور بھیج رہا ہوں۔ اور اگر آپ مطمئن نہیں ہیں تو میں خود جا کر بابا جان کی خدمت میں حاضر ہو جاتا ہوں اور بات کر لیتا ہوں۔ آپ آجائیں علاج بھی ہو جائے گا اور بابا نے یہ جو کہا ہے کہ آپ دونوں میرے مہمان بنیں گے، یہ بات بھی پوری ہو جائے گی۔“

زینت بھی خوش تھی کہ باپ بیٹے میں صلح ہو گئی ہے اور شاہ جی نے اُسے بھی معاف کر دیا ہے۔ اب لیکن دیکھ کر تھی تو وہ یہی سمجھتا کہ زینت ہی باپ بیٹے کے درمیان دیوار بن رہی ہے اور وہ ایسا کوئی الزام اپنے سر لینے نہیں چاہتی تھی۔

ارد شیر نے ڈرائیور کو بلا کر گاؤں جانے کے لئے کہا۔

”جلدی جاؤ اور جلد از جلد واپس آنے کی کوشش کرنا۔ میں منتظر رہوں گا۔“

ڈرائیور کو گاڑی لے کر گاؤں جانا تھا، پھر آج ہی واپس شہر بھی آتا تھا اور سفر تین گھنٹے کا تھا۔ اس وقت دوپہر کے بارہ بج رہے تھے۔ واپسی رات کو چھ سات بجے سے پہلے کسی طرح ممکن نہیں تھی مگر وہ تو اسے روانہ کرتے ہی واپسی کے انتظار میں نظر آنے لگا تھا۔ کبھی ٹپٹلے لگتا، کبھی ٹائم دیکھتا۔ شادے نے ایک بار ہمت کر کے کہا بھی۔ ”آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، کچھ دیر آرام کر لیجئے۔“ مگر جواب میں وہ کچھ نہیں بولا۔ لگتا تھا اُس نے شادے کی بات سنی ہی نہیں۔ اس وقت اس کے چہرے پر عجب رنگ تھا۔ جیسے شکاری شکار سے بھرے جنگل میں آکھلا ہو۔

♦ ♦ ♦

”بڑی ماں.....“

ایک معصومی آواز، کسی بچے کی پیاری پیاری آواز۔

”بڑی ماں..... میں آپ کا بیٹا ہوں۔ آپ کتنی اچھی ہیں۔ کتنی پیاری ہیں بڑی ماں..... میں وعدہ کرتا ہوں آپ کی ہر بات مانوں گا۔“ لہجے میں سچائی آنکھوں میں محبت لئے وہ بچہ کہہ رہا تھا۔ ”یہ وعدہ یاد رکھنا ہے۔“ کبریٰ کو کئی سال پیچھے کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ ایک ایک حرف واضح تھا۔ وہ ماضی کی تصویر دکھ رہی تھیں۔

کبھی کے بل اُونچا ہو کر وہ چمکدار آنکھوں والا بھولا بھالا بچہ اس کے بہت قریب لیٹا بغور اس کا چہرہ دیکھ رہا ہے۔

”ایسے کیا دیکھ رہے ہو ارد شیر؟“

جواب میں کچھ کہنے سے پہلے اُس نے سر کبریٰ کے سینے پر رکھ دیا، پھر بازو گردن میں حائل کر دیئے پھر کچھ دیر بعد سر اٹھا کر بولا۔

”آپ مجھے بڑی اچھی لگتی ہیں، بہت ہی اچھی۔ کیونکہ آپ میری پیاری بڑی ماں ہیں، جی ناں.....؟ میں ای کا نہیں، صرف آپ کا بیٹا ہوں۔“ گھٹی پلکوں کو وہ اپنی بات کا یقین دلانے کے لئے بار بار جھپک رہا تھا، لب مسکرا رہے تھے۔ سر کے گھنے براؤن بال چمک رہے تھے۔

”اٹھو ارد شیر، میں نے تمہیں پڑھنے کو کہا تھا۔“ راحت کی آواز کہیں بہت قریب سے آ رہی ہے۔ ”بڑی ماں، مجھے ای سے بچا میں۔“ وہ اور بھی شدت کے ساتھ اس سے لپٹ جاتا ہے۔

”شاہ صاحب... میں بول رہا ہوں ارد شیر شاہ...“ اُس نے آج بابا جان نہیں کہا۔ پورا جملہ بڑے خنڈے اور سپاٹ انداز میں ادا کیا۔

”کہو کیسے یا دفتر مایا ہے؟“ ادھر بھی لہجہ ٹھنڈا ہوا تھا۔

”بس سرجی... آپ کی بیگم نے ایک مشکل میں مبتلا کر دیا ہے... میرا مطلب آپ کی چھوٹی بیگم صاحبہ سے ہے، وہی جولا ڈلی ہیں آپ کی، جس کے لئے بڑا دل ہے آپ کے پاس، اُس پر لاکھوں لٹا کر بھی افسوس نہیں ہوتا حالانکہ کبھی چند ہزار بھی اکٹھے مشکل ہی سے دیکھنے کو ملے ہوں گے، اس شادی سے پہلے اے۔“

”تم کہنا کیا چاہتے ہو؟“ وہ ہنر کر بولے۔

”خنانہ ہوں، میں تو جی بس یہ کہہ رہا تھا کہ وہ یہاں میرے غریب خانے پر آئی بیٹھی ہیں... مگر کیا کروں کہ میرے دل میں آپ کا خیال ہے، وہ رشتے جو آپ نے بڑی آسانی سے توڑ ڈالے ہیں، اُن کی حرمت کا پاس ہے، قسم کھاتا ہوں جیسی آئی نہیں، ویسی ہی ہیں۔“

”نوفر... بد معاش...“ شاہ جی جیج اٹھے۔

”لو بھلا... میرا کیا قصور... میں نے تو یونہی فون پر سرسری اعزاز میں دعوت دی تھی، وہ جیج جی چلی آئیں آپ کی چھوٹی بیگم صاحبہ...“ وہ بڑی عیاری سے بولا اور سفاکی سے ہنس پڑا۔

”اور تم... تمہیں جانتیں آئی... تمہیں اتنا بھی احساس نہیں کہ وہ تمہاری ماں کی جگہ ہے۔“

”ہونہہ... ماں کی جگہ... آپ کو یاد ہوگا شاہ صاحب، یہ وہی عورت تو ہے جس کے ساتھ آپ نے مجھے دیکھا تو شک کا شکار ہو گئے۔ کتنا ذلیل کیا آپ نے مجھے... اور اب یاد آیا ہے کہ وہ ماں کی جگہ ہے، تب یہ خیال کیوں نہیں آیا آپ کو، وہ ماں کی جگہ کبھی نہیں ہو سکتی، یہ احساس آپ ہی نے دلایا ہے مجھے...“ وہ بہت اونچی آواز اور سرکش انداز میں بات کر رہا تھا۔

”تم اس قدر بیہودہ، اتنے گھٹیا بھی ہو سکتے ہو، میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا...“ شاہ جی کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اُس کا حلیہ بگاڑ دیں۔

”پھر آپ نے بتایا نہیں، میں کیا کروں چھوٹی بیگم کا... اگر حکم ہو تو ابھی میں خود ڈراپ کر دوں اُسے آپ کی کوٹھی پر اور اگر یہ پسند نہیں، پھر میں انہیں نہایت عزت کے ساتھ گاؤں... بیلو... بیلو...“ فون بند ہو گیا۔

”بس... اتنا حوصلہ تھا...“ وہ ہنس پڑا... اور پھر اپنے کمرے کی جانب بڑھا، دروازہ کھولا تو وہ پورے اطمینان سے کرسی پر بیٹھی اُسے دیکھ کر مسکرائی... اور سلام کیا...۔

ارد شیر پھر ٹھنڈا سے سمجھ نہیں آیا، اس وقت زینت کے ساتھ کیسا رویہ اختیار کرے۔ اس عورت کے ساتھ تو دشمنی کی کوئی وجہ نہیں بنتی تھی۔ اُس نے ہمیشہ اسے عزت دی اور خیال رکھا تھا مگر جو کچھ ارد شیر اس کے ساتھ کر رہا تھا، اس کے بعد یقیناً وہ اسے روئے زمین پر اپنا سب سے بڑا دشمن گردانتی۔

”شاہ جی کہاں ہیں، آپ کی بات تو ہو گئی ہے نا اُن سے؟“ ابھی تک اُس نے آنے والے طوفانوں کی آہٹ کو محسوس نہیں کیا تھا۔

”ہاں میری بات ہو گئی ہے اُن سے...“ ارد شیر گہرا سانس کھینچ کر بولا۔ اور پھر اُس کے سامنے آ

مگر وہ نہیں جانتی تھیں۔ یہ خیال انہیں بہت دیر کے بعد آیا ہے، اب بڑی دیر ہو چکی ہے۔ وہ بڑے سمجھ سکتی تھیں۔ ارد شیر کا ہاتھ ان کے ہاتھ سے پھسلا تو وہ طوفانوں کی زد میں آ کر ڈور، بہت دور نکلا ہے۔ وہ اسے پکارتی ہوئی ہیں مگر اس کے سانس کی آہٹ کو محسوس نہیں کر سکتیں۔ اب بہت فاصلے حاکم ہیں۔

سردی کا موسم تھا، اوائل دسمبر کے دن تھے۔ جب دن بہت جلد رات کی سیاہ شال اوڑھ لیتا ہے ابھی چھ بجے تھے مگر تاریکی نے اپنا دامن پھیلایا تھا۔ ارد شیر کے ہونٹوں پر سفاک مسکراہٹ بھی مگر آنکھوں میں اب بھی یاسیت کا رنگ نمایاں تھا۔ چند روز کی بیماری نے ساری شادابی اس کے چہرے سے چھین لی تھی۔ وہ شکستہ تھا اور دکھائی بھی دیتا تھا مگر اس وقت تو اسے کسی درد، کسی کمزوری کا احساس نہیں تھا۔ وہ پوری شدت کے ساتھ زینت کی اپنے ہاں آمد کا منتظر تھا۔

سات بجے، پھر ساڑھے سات... اُس کے خون کا دورانیہ تیز سے تیز ہونے لگا۔ بار بار رینز واقع پر نگاہ ڈالت اور یو یو آتا۔

”وہ لوگ آئے کیوں نہیں... میں نے ڈرائیور کے بچے کو یہ کہہ کر بھیجا تھا کہ گاڑی تیز چلاتا، جلد از جلد پہنچنے کی کوشش کرنا۔“

پھر خیال آتا “کہیں معاملہ بگڑ نہ گیا ہو... ایسا نہ ہو کہ شاہ جی گاڑی پہنچ گئے ہوں۔“

جھلاہٹ اور غصے کے عالم میں دو گلاس توڑ ڈالے۔ تین ملازموں کا سرو توڑنے کی دھمکی دی۔ شادے کو بے بھاؤ کی پڑیں اور ڈرائیور کے متعلق تو یہ کہہ دیا کہ اگر وہ تا کام لوٹا تو اسے شوٹ کرنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگے گا۔

”خدا خیر کرے، صاحب کا دماغ تو لگتا ہے پھر چل گیا ہے۔“ ملازم آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے۔

شادا آڈر فون کرنے کے بارے میں بھی سوچ رہا تھا کہ وہی تو تھا جو اس کے صاحب کو سنبھال سکتا تھا مگر ساتھ میں یہ دھڑکا بھی تھا۔ صاحب نے منع کر رکھا ہے۔ اگر انہیں علم ہو گیا تو پھر اس کی خیر نہیں۔

رات آٹھ بجے کے قریب گاؤں سے گاڑی واپس آئی اور پچھلی سیٹ پر چہر چادر سے ڈھانپ کر بیٹھی عورت کو دیکھ کر سب کو اطمینان ہو گیا۔

شادا صاحب کو گاؤں سے مہمان آنے کی اطلاع دینے دوڑا۔

ارد شیر اس وقت لابی میں کھڑا تھا۔ یہ خبر اُس کے سارے وجود میں سنسنی سی دوڑا گئی۔ ایک دم سے اُسے لگا، صبح سے جو کیفیت طاری تھی، جو اتفاق، جو ضد اس کے لبہ میں تاج رہی تھی، اب اس کے ساتھ ساتھ ایک اور جذبہ بھی ابھرنے لگا ہے۔ وہ کچھ جھجک گیا، فوری طور پر زینت کے سامنے جان نہیں سکا۔ ملازم کو حکم دیا۔

”انہیں میرے بیڈم روم میں بٹھا دو۔“

وہ خود لابی میں آ بیٹھا۔ یہ نئی کیفیت جو اس پر طاری تھی، اُس کا دورانیہ زیادہ طویل نہیں ہو سکا۔ کچھ دیر وہ بے مقصد بیٹھا رہا پھر اٹھا اور شاہ جی کا نمبر ملانے لگا۔

بجھا مگر اُس کی جانب دیکھنے سے گریزاں، وہ ادھر ادھر بے مقصد ہی نظر دوڑا رہا تھا۔ بظاہر یوں کہ کسی چیز کی تلاش میں ہو۔

”آپ تو بہت کمزور دکھائی دے رہے ہیں۔“ وہ اپنائیت سے پوچھ رہی تھی۔

”کمزور دکھائی دے رہا ہوں..... مگر ہوں نہیں۔“ اردشیر لمبی بات کرنا نہیں چاہ رہا تھا، کہنے کے ساتھ ہی اُٹھ کھڑا ہوا اور ریست واج پر نگاہ ڈالی۔

”کسی کا انتظار ہے کیا؟“ اُس نے اس خیال سے پوچھا کہ شاید وہ شاہ جی کے آنے کا منتظر ہوگا۔

”ہاں.....“ وہ اس کی جانب دیکھے بغیر بولا۔

”مجھے تو آپ کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی، آپ کچھ گھبرائے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں۔“

اور کہنے کے ساتھ ہی زینت کو خیال آیا..... شاہ جی نے جیسا الزام دونوں پر لگایا اور اردشیر کو جس طرح گھر سے نکل جانے کا حکم سنایا۔ کوئی بھی غیرت مند ان حالات میں ٹھیک کس طرح رہ سکتا تھا۔ یقیناً انہیں بہت صدمہ ہوا ہوگا۔

وہ سر جھکا کر بیٹھ گئی اور بازو میں پڑی چوڑیوں کو دیکھنے لگی۔ چند منٹ کے بعد سر اٹھایا تو وہ اب بھی اس کی جانب سے رُخ پھیرے کھڑا تھا۔

”پانی مل جائے گا۔“ زینت نے ہولے سے کہا۔

”کیوں نہیں..... شاہ جی کو آئیے دو..... پانی ہی نہیں، دودھ چائے وغیرہ وغیرہ سب کچھ مل جائے گا۔“

وہ عجیب سی ہنسی ہنسا تھا۔ اس بات سے اُس کا کیا مطلب ہے۔ وہ ایسے کیوں ہنسا ہے، زینت سمجھی نہیں۔

”ڈرائیور جلدی کرو.....“ وہ بار بار کہہ رہے تھے۔ دائیں ہاتھ میں پکڑے ریو الوور پر ان کی گرفت مضبوط ہوئی جا رہی تھی..... اور آنکھوں میں خون اُترا ہوا تھا۔ جب اردشیر کی کٹھی سامنے آئی تو جی چاہا آگ لگا دیں اور اس جگہ پر موجود تمام افراد کو جلا کر رکھ کر دیں۔

گاڑی ڈرائیور دے پرز کو اکروہ بہت عجلت کے عالم میں باہر نکلے، ریو الوور والا ہاتھ کا ندھے پر ڈالی گھرے چادر میں چھپا ہوا تھا مگر تیراٹنے خطرناک تھے کہ جس نے بھی دیکھا، ٹھٹک گیا مگر وہ ان کے صاحب کے والد تھے۔ یہ تو کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ باپ بیٹے کے درمیان نفرت کی بہت اونچی دیوار اُٹھادی گئی ہے۔

”کہاں ہے وہ؟“ رہائشی عمارت کے قارب آکر انہوں نے ایک ملازم لڑکے سے پوچھا۔

”کون؟“ کس کو پوچھ رہے ہیں؟ اور آپ کون ہیں صاحب.....؟“ لڑکا نیا تھا، انہیں نہیں پہچانتا تھا۔

انہوں نے جواب نہیں دیا۔ بہت تیز قدم اُٹھاتے ہوئے وہ آگے بڑھ گئے۔ اُس کے بیڑوم کا رخ کیا دروازہ دھماکے سے کھلا تو اردشیر اور زینت نے بیک وقت ادھر دیکھا۔ جمشید شاہ کی تیور دیکھ کر وہ

گھبرائی اور اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑی ہوئی جبکہ اردشیر کے انداز میں بے گانگی اور ایک طرح کا سکون تھا جیسے اُسے ان کی آمد کی اسی طرح توقع تھی۔

زینت نے کچھ کہنے کے لئے لب کھولے مگر اس کی آواز شاہ جی کی آواز میں دب کر رہ گئی۔

”تم پیدا ہوتے ہی مر کیوں نہیں گئے؟ تم نے یہ جرأت کیسے کی؟“

”شاہ جی، یہ تو مجھے کہہ رہے تھے کہ آپ.....“ زینت چیخ کر بولی۔

”تم بولتے کیوں نہیں کم ظرف انسان.....؟“ انہیں زینت کی فریاد سننے کا ہوش ہی کہاں تھا۔

”کم ظرف..... گھٹیا..... مجھے آپ نے بنا دیا ہے..... اس کے ساتھ میرا نام آپ نے لیا ہے شاہ جی، بہت بے عزت کیا ہے آپ نے مجھے..... میں بھولا تو نہیں تھا..... مجھے خاموش ہو کر نہیں بیٹھنا تھا.....

مجھے آپ کو یہ بتانا تھا، سمجھنا تھا جب تھاب ہٹ جائے تو تاج باقی نہیں رہتا۔“

”خود کو معصوم ثابت کرنے کی کوشش مت کرو۔ میں تمہارے کردار سے بہت اچھی طرح واقف ہوں۔ تم سے جو بھی سلوک کیا جائے، وہ کم ہے۔“

وہ پشت پر ہاتھ باندھے تقریباً دس فٹ کے فاصلے پر کھڑا تھا اور شاہ جی ابھی تک دروازے میں ہی کھڑے تھے۔

”تم اس قابل ہی نہیں تھے کہ تمہیں.....“

”اور اپنے بارے میں کیا کہیں گے؟“ لینے آئے ہیں ناں اپنی منکوحہ کو لے جائیے یقین

کے اپنے زبان بند رکھوں گا، کسی سے نہیں کہوں گا۔“

”شاہ..... شاہ سائیں.....“ زینت زور سے چلائی کہ جمشید شاہ کا چادر کے پیچھے چھپا ہاتھ اب

ریو الوور سمیت سامنے تھا۔ پتا نہیں نشانہ کون تھا وہ جو دُعاؤں کا نتیجہ تھا، جو سب سے بڑی خواہش تھی۔

زینت یا..... وہ انہوں بد صورتی کی تاب نہ لا کر خود کو شوٹ کرنا چاہ رہے تھے۔

اس سے پہلے کہ اس بات کا جواب سامنے آتا، کسی نے پیچھے سے انہیں دھکیلا اور ساتھ ہی

بازو پکڑ کر اُدھر کر دیا۔ لمحوں کی بات تھی، گولی چلی اور سامنے دیوار پر نئے کلاک میں جا لگی۔ ریو الوور اب

اردشیر کے نئے ملازم کے ہاتھ میں تھا..... اور وہ اپنے صاحب کی طرف سے حکم کا منتظر تھا۔

اردشیر کو باپ سے یہ اُمید بے گز نہیں تھی کہ وہ بیٹے کے قتل پر اُتر آئیں گے (اسے پورا یقین تھا، ان

کا نشانہ وہی تھا) اب غصہ کم اور صدمہ زیادہ تھا، اُس کا حال برا تھا۔

دوسری طرف زینت سمجھ رہی تھی، نشانے پر وہی تھی، اردشیر نے جو پتہ کیا، اس کے بعد شاہ جی اُسے

اپنے گھر میں رکھنا کبھی پسند نہ کرتے، موت کے خوف نے اُسے تنگ کر دیا تھا۔ آنکھوں میں آنے لگی

جگر رہ گئے تھے۔

گولی کی آواز پر کئی ملازم دوڑے چلے آئے تھے۔ اردشیر نے اشارے سے انہیں باہر جانے کو کہا، نیا

لڑکا ریو الوور اردشیر کی جانب بڑھا کر خود باہر نکل گیا۔ باقی سب بھی پیچھے ہی تھے البتہ شاہ جی ابھی موجود رہا۔

کیفیت شاہ جی کی بھی عجیب تھی۔

”یہ بیٹا ہے، یہ میرا خون، کیا کیا ہے اُس نے میرے ساتھ..... اور یہ عورت، کتنا بھروسہ کیا میں

نے اس پر، کتنی عزت دی میں نے اسے.....“

تھا۔ وہ کہتا تھا آپ نے اسے معاف کر دیا ہے اور آپ کی اجازت سے ہی مجھے بلارہا ہے۔
وہ یہ نہیں دیکھ رہی تھی کہ شاہ جی سننے سمجھنے کی حالت میں ہیں بھی یا نہیں، بس اپنی کمر جاری تھی۔
ڈرائیور نے ایک بار پھر شہر کا رخ کیا۔ وہ چاہ رہا تھا، جلد از جلد ہاسٹل پہنچ جائیں۔ شاہ جی کی
حالت نے اسے بھی خوفزدہ کر دیا تھا۔ خدا سے خیر کی دعا مانگتا۔ وہ بار بار سر جھٹکتا اور اپنے کسی خیال سے
چھپا چھڑانے کی کوشش کرتا۔ شاہ جی کی حالت نے زینت کے تو اوسان خطا کر دیئے تھے۔



نورین نے کوئٹہ سے واپس آتے ہی رانچ کو فون کیا اور پوچھا۔
”تر شاہ کی طرف مافی تھیں ناں۔؟“
”جہنمیں اتنی فکر کیوں ہو رہی ہے۔؟“ رانچ، نورین سے بدگمان تھی کہ اس کے خیال میں نورین
نے شاہ کی بیماری کے بارے میں اس سے جھوٹ کہا تھا۔
”وہ میرا دوست ہے۔“ نورین کو اس کے انداز پر حیرت ہوئی کہ رانچ کبھی اس انداز میں بات نہیں
کرتی تھی۔

”بونہ دوست! بھلا مہ داور عورت کی دوستی ہو سکتی ہے۔؟“
”مجھے نہیں پتا ہو سکتی ہے یا نہیں۔۔۔۔۔ اور میں یہ بھی نہیں جانتی کہ وہ مجھے کیا سمجھتا ہے مگر میں اسے اپنا
دوست ہی کہتی ہوں۔ تم آج اس قدر بدگمان کیوں ہو مجھ سے۔؟“ نورین یہی کبھی شاید وہ اسے کے اور
ادشیر کے سلسلے میں شک کا شکار ہو گئی ہے۔

”بات ہی ایسی ہے مجھے ناراض ہونے کا حق ہے تم نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا کہ وہ بیمار ہیں۔“
”نہیں نہیں، میں نے بالکل جھوٹ سیں بولا، وہ واقعی بیمار ہے۔“ اس نے جلدی سے صبح کی۔
”مگر جب میں اُن سے ملنے اُن کے گھر گئی تب وہ بیمار نہیں تھے۔ انہوں نے کچھ ایسی ویسی چیزیں
رکھی تھیں، وہ نشے میں تھے۔“

”مائی گاڈ! تم ٹھیک تو ہوناں رانچ۔“ نورین واقعی گھبرا آئی کہ اتنے دن ساتھ رہ کر اسے بھی
رانچ سے انسیت ہو گئی تھی، اس کی معصومیت سے بیمار ہو گیا تھا۔

”ہاں ٹھیک ہوں میں مگر تم نے مجھے مروانے میں کوئی کسر تو نہیں چھوڑی تھی۔“
”بی لیوی رانچ۔۔۔۔۔ وہ واقعی بیمار تھا اور اس نے تم سے ملنے کی خواہش کا اظہار بہت شدت کے
ساتھ کیا تھا۔“

”کیا ہوگا۔۔۔۔۔ گمراہ میں اُن سے کبھی نہیں ملوں گی اور تم سے بھی میری یہ التجاء ہے، کبھی دھوکے
سے نور بھی ان کی بیماری کی اطلاع دے کر مجھے وہاں لے جانے کی کوشش مت کرنا۔“

”مگر رانچ۔۔۔۔۔“ نورین نے کچھ کہنا چاہا۔
”اگر مگر کچھ نہیں۔۔۔۔۔“ اُن نے بات کاٹ دی۔

”کیا تم شاہ کو بھول سکو گی۔؟ جب کہ میں نے محسوس کیا ہے وہ واقعی تم سے محبت کرتا ہے، تم
آزمائو تو رانچ! تم اس کے بغیر بے خوش نہیں رہ سکو گی۔“
”کوئی بات نہیں، زندگی میں خوشی ہر کسی کو نہیں ملتی۔ بہت سے لوگ کسی خوشی۔ امی۔۔۔۔۔ بغیر

وہ ان سے کچھ بھی کہے بغیر نہیں ہوئے مگر اپنی پڑتی، سسکتی زینت بھی اُن کے پیچھے ہوئی۔
”یہ سب کیا ہوا صاحب۔؟“ شاہ اجرت کے عالم میں اس سے پوچھ بیٹھا تھا۔
اس وقت رانچ میں اتنی سکت نہیں تھی کہ جواب میں کچھ بول سکتا۔ کتنا بیمار دیا تھا اس نے،
ہر جوش پوری کرنے کو تیار تھے، اس کے لئے فکر مند ہوا کرتے تھے، بار بار ملنے آتے تھے، سب
کچھ ختم ہو گیا، آج وہ ان پر مگولی چلا بیٹھے۔

”نہیں بابا نہیں۔ آپ ایسا نہیں کر سکتے۔۔۔۔۔ آپ کبھی ایسا نہیں کر سکتے۔ میرے اچھے بابا
کہاں ہیں۔؟ آپ کیوں مجھ سے اتنی ذہر ہو گئے ہیں۔؟“
جذبات کی یورش اسے ہمالے لگی۔ وہ تانہ نہ پھیند گیا۔ بازو آنکھوں پر رکھا اور بچوں کی طرح
رونے لگا۔

شاہ اب تک یہاں موجود تھا۔ وہ عمر میں اردشیر سے دس بارہ برس بڑا تھا۔ پہلے تو سوچا اسے چپ
کرائے، اس کا درد پوچھے، پھر جبکہ کڑک گیا کہ اردشیر کا رویہ ملازموں کے ساتھ ہے تکلفی والا کبھی نہیں
رہا تھا۔ وہ کچھ دیر کھڑا اسے یوں روتے دیکھتا رہا۔ پھر دے قدموں سے باہر نکل گیا۔

گازی میں زینت اور شاہ جی دونوں پچھلی سیٹ پر بیٹھے تھے۔ انہوں نے لرزتی ہوئی آواز میں
ڈرائیور سے گاڑی کاؤں لے جانے کو کہا تھا۔ سانپو پٹی زینت کا وجود پوری طرح لرز رہا تھا۔ اسے یقین
تھا شاہ جی سے ہرگز نہ نہیں چھوڑیں گے۔ اس واسطے گاؤں لے کر جا رہے ہیں۔ ورنہ قیام تو شہر والی
کوٹھی میں بھی کیا جاسکتا تھا۔

”شاہ۔۔۔۔۔ شاہ جی۔۔۔۔۔ اُس نے کچھ کہنے کی کوشش تو کی مگر خوف سے حالت آخر تھی۔ وہ جملہ ادا
نہیں کر سکی، چہرہ چادر میں چھپا کر بے آواز رونے لگی۔

جب شاہ جی اردشیر کی طرف جا رہے تھے تو بار بار گاڑی تیز چلانے کا تقاضا کر رہے تھے مگر اب وہ
کسی لئے پئے بے یار و مددگار مسافر کی طرح نظر آ رہے تھے۔ سر جھکا ہوا تھا، لب خاموش اور آنکھوں میں
ڈکھ اور بے بسی کے گہرے سائے تھے۔ انہوں نے سر ایک بار بھی اوپر نہیں اٹھایا۔ خاموش تو تھے ہی دیکھ کر
محسوس ہوتا تھا۔ کچھ سن بھی نہیں سکتے۔

پھر شہر کا علاقہ ختم ہو گیا۔۔۔۔۔ اب روڈ کے دونوں طرف جنگل تھا جورات کی تارکی میں بہت گھنا اور
خوفناک دکھائی دیتا تھا۔ موسم سرما کی اس آداس ٹھنھری رات میں ٹریفک برائے نام ہی کبھی بس بھی کوئی
ٹرک گزر جاتا تھا۔

”نہیں ان کا ارادہ اسی جگہ پر قتل کا تو نہیں۔“ زینت نے گھبرا کر شاہ جی کی جانب دیکھا۔
”شاہ۔۔۔۔۔ شاہ جی۔۔۔۔۔“ وہ کرائی اور اپنا کانپتا ہوا ہنڈل اُٹھاتا تھا اُن کے بازو پر رکھا۔ جمید شاہ نے
چاہا جھٹکا دے کر اس کا ہاتھ اپنے بازو سے ہٹا دیں مگر وہ ایسا نہیں کر سکے۔

”شاہ جی۔۔۔۔۔ کیا ہو رہا ہے آپ کو۔؟ قریب سے ٹرک گزرا، اُس کی روشنی شاہ جی کے چہرے پر
بڑی تو زینت چونک گئی اور چیخ کر دوسرا ہاتھ بھی اُن کے شانے پر رکھ دیا۔ ڈرائیور نے لائٹ آن کی اور پھر
گاڑی بھی روک دی۔ اُن کی حالت اچھی نہیں تھی۔ وہ آنسوؤں سے تر چرے لئے بار بار یہی کہتی رہی۔
”میں بے قصور ہوں۔۔۔۔۔ آپ یقین کریں، میں بے قصور ہوں۔ اُس نے دھوکے سے مجھے بلایا

میں بھی مطمئن اور خوش دکھائی دیتی ہے۔“ مزید نہ دل میں کہا۔

”ایسے کیا دیکھ رہے ہو.....؟“ سوہانے اُس کی نگاہوں کو اپنے چہرے پر محسوس کر کے پوچھا۔
”سوہا تمہیں دیکھ کر تم سے باتیں کر کے مجھے کس قدر خوشی، کس قدر سکون ملتا ہے، میں تمہیں بتا نہیں سکتا۔“

”کیا بات ہے آج تم پہلے سے کہیں زیادہ اُلجھے ہوئے دکھائی دے رہے ہو.....؟“
”تم مجھ سے ناراض کیوں نہیں ہوتیں.....؟ مجھ سے کیوں نہیں پوچھتیں کہ آخر میں اتنے دن کہاں غائب رہا ہوں تم سے ملنے نہیں آیا، یہاں تک کہ فون تک نہیں کیا میں نے۔“
”اُس نے پورے اطمینان سے اُس کی بات سنی پھر رمان سے بولی۔

”کیا فائدہ.....؟ جسے آتا ہوتا ہے، وہ خود ہی آتا ہے اور جو نہ آتا چاہے، لاکھ پکارے جاؤ، آواز پر کان نہیں دھرے گا۔“

مزید نے اس کے لئے دروازہ کھولا اور پھر گاڑی روڈ پر ڈالتے ہوئے بولا۔

”یہ زندگی اتنی مشکل کیوں ہے آخر.....؟“

مزید کی بات پر پہلے حیرت سے اُس نے اُسے دیکھا، پھر ہنس پڑی اور بولی۔

”ارے تم بھی ایسا کہہ رہے ہو، مجھے یقین نہیں آ رہا۔ لگتا ہے کوئی پرانے تمہارے ساتھ، مجھے نہیں بتاؤ گے.....؟“

”پرانے میری پابلیم، ہر طرز فکر، پریشانیاں، اُلجھنیں..... وہ عمر ہے ناں میرا دوست اور بھائی، اُس کی والدہ سخت بیمار ہیں اور اُن بے چاروں کے پاس علاج کے لئے پیسے بھی نہیں، وہ اور اس کی بہن بہت فکرمند ہیں۔ ہمارے گھر میں آج کل بیانے چپ کاروزہ رکھا ہوا ہے۔ اب تو جی چاہتا ہے، وہ گرج برس ہی لیں، یہ خاموشی تو تو نے مگر پتا نہیں وہ کیا سوچے بیٹھے ہیں۔ ماما بچاری کبھی انہیں منانے کی کوشش کرتی ہیں، کبھی مجھے تسلی دیتی ہیں اور..... اور وہ کاشف کا بچا اپنی سروس کے سلسلے میں پشاور دفن ہو گیا ہے۔“

”اوہ تو ناراض کیوں ہو، یہ تو اچھی بات ہے کہ اُسے سروس مل گئی ہے۔“

”ہاں، مجھ سے تو دور ہو گیا ہے ناں وہ۔“

”اچھے دوست کتنی بھی دور چلے جائیں، دل کے قریب ہی رہتے ہیں ہمیشہ۔“

”آج میرے گھر چلو سوہا..... پلیز انکار مت کرنا۔“

”مگر تمہارے والد محترم..... پتا نہیں وہ اس بات کو کس طرح لیں۔“ سوہا ہچکچائی۔

”وہ اس وقت گھر پر کب ہوتے ہیں.....؟ شام کو چھ سات بجے کے قریب ہی واپسی ہوتی ہے اُن کی۔“

”آئی بھی تو گھر پر میرا انتظار کر رہی ہوں گی۔“

”انہیں تو فون کیا جا سکتا ہے..... صاف کہہ دو کہ تم میرے ساتھ جانا ہی نہیں چاہ رہیں۔“ وہ کچھ بگڑ کر بولا۔

سوہانے پورے اعتماد کے ساتھ اثبات میں سر ہلایا اور بولی۔

”ہاں تم اس بات سے اچھی طرح واقف ہو کہ مجھے یوں جانا پسند نہیں ہے۔“

ندہہ رہتے ہیں اور اچھی بری گزار ہی لیتے ہیں۔ میں بھی اسی طرح گزار لوں گی۔ بس تم اب میرے ارادے کو کمزور مت کرنا، میرے پاؤں مت اکھاڑو۔“ اُس نے مزید کوئی بات سننے بغیر فون بند کر دیا۔

”راختھ.....“ جو یہ اسے پکار رہی تھی، راختھ کو جلدی سے سنبھلنا پڑا۔

”جی ماما.....“ تھکے تھکے سے انداز میں وہ اُن کے پاس چلی آئی۔

”تمہارے پاپا کیا کہہ کر گئے تھے.....؟“ نفس سے کب تک واپس آ جائیں گے۔“

”پتا نہیں..... وہ بیزار کی کے عالم میں اتنا کہہ کر چیخ پڑا بیٹھی۔

”کیا بات ہے بیٹا..... میں محسوس کر رہی ہوں، تم کچھ کھوئی کھوئی رہے ہو، مجھے نہیں بتاؤ گی کیا.....؟“ جو یہ بہت محبت کرنے والی، اولاد کے محسوسات سمجھنے والی ماں تھی۔

راختھ کا جی چاہا، ماں سے سب کہہ دے، اسے بتا دے کہ اس سے ایک قصور ہو گیا ہے۔ اُس نے اُن کے اعتماد کو دھکا دیا ہے، اسی بات کی سزا مل رہی ہے اسے۔ پھر سوچا، اب جب کہ وہ بات ہی ختم ہو چکی ہے تو پھر ماں سے کہنے کا کیا فائدہ.....؟ سر فنی میں بلا کر اُنھ کھڑی ہوئی۔ یہ سوچ کر چپ ہو رہی کہ

مکی بہتر ہے..... اس کے مقدر میں یہی لکھا ہے کہ اندر ہی اندر کھلتی رہے۔

آج کل اُن کے گھر میں اُداسی اور کھچاؤ کی شدت بہت زیادہ تھی۔ کبیر حسن اب مہناؤ کے معاملے میں خاموش تو تھے مگر مزید جانتا تھا کہ وہ جودل میں ٹھان لیں، اس سے ہٹتے نہیں ہیں۔ راختھ بھی خاموش

رہا کرتی اور زیادہ تر وقت اپنے کمرے میں گزارتی۔

جو یہ یہ ان سب کے لئے فکرمند رہتی۔ طبیعت کی خرابی کے باوجود سب کا خیال اور مزید کو بہلانے کے لئے ادھر ادھر کی باتیں بھی کرتی رہتی۔ کئی بار سوہا کا ذکر نکال لیتی۔ تب وہ وقتی طور پر سب کچھ

بھول کر اسے سوہا کے بارے میں بتانے لگتا مگر وہ زیادہ دیر تک ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ یہ خیال کہ پیاہی راضی نہیں ہوں گے، اسے اُداس کر دیتا۔

عمر کی طرف جاتا تو وہاں کی پریشانی، آنے والے وقت کا خوف، اس کی والدہ ابھی تک ہسپتال میں تھیں۔ اور اُن کی حالت سمجھنے میں نہیں آ رہی تھی۔ عمر درالہ ایک دوسرے سے نظریں جمائے تھے

تھکے اُداس دکھائی دیتے تھے۔

”کہیں خوشی کا وجود ہے بھی یا ہر سو دکھ، پریشانیاں اور فکریں ہی ہیں۔“ وہ گھبرانے لگا تھا۔

کاشف آج کل پشاور گیا ہوا تھا۔ وہ اس کی طرف جا کر ہی کچھ ادھر ادھر کی باتوں میں جی کا بوجھ

ہلکا ہو جاتا تھا۔ دادی اماں کے پاس جانا نہیں چاہتا تھا کہ پھوپھو کی فیملی سے ملاقات یعنی تھی اور جس طرح

سے اُن لوگوں نے پیا کو گھیرا تھا تو انہیں دیکھتے ہی اب غصہ آنے لگتا تھا۔ اُس دن وہ سوہا کے افس آ گیا۔

ناؤم آف ہو چکا تھا وہ بس اُنھ ہی رہی تھی۔

”آؤ..... آج تمہیں ڈراپ کر دوں۔“

اُس نے انکار نہیں کیا۔

ساتھ ساتھ چلے دونوں گاڑی تک آئے، مزید نے دیکھا، کتنا اطمینان، کیسا سکون تھا اس کے چہرے

پر حالانکہ وہ صبح سے افس کے کاموں میں جتی ہوئی تھی مگر پھر بھی ایک دم سے فریش دکھائی دے رہی تھی۔

”اس کی زندگی میں دُور دُور تک کسی خوشی کا نام و نشان نہیں ہے۔ کتنی بہادر ہے یہ لڑکی، ان حالات

”تم تو خاموش رہو، میں اپنی بیٹی سے پوچھ رہی ہوں۔“
”خدا کے لئے بیٹی نہ کہیں..... اُدھر رات کو بلانے گیا تو وہ“ ہائے سوہا باجی آئی ہیں“ کہہ کر مجھے ہولا
منی اور آپ بھی بار بار بیٹی کہہ رہی ہیں۔“
”اسنے وہی ہو رہے ہو۔؟“ جویریہ ہنس پڑی۔ سوہانے چہرا نیچے کر لیا، پھر جویریہ، مزرب کو
بھاتے ہوئے شوق سے انداز میں بولی۔
”اچھی سائیس، بہوؤں کو بھی بیٹیوں کی طرح ہی سمجھتی ہیں اور مجھے یقین ہے، میں بہت اچھی
ماں ثابت ہوں گی۔“
”خوش نصیب ہوگی وہ لڑکی جو آپ کی بہو بنے گی۔“ مزرب نے از حد متاثر ہونے کی اداکاری
کرتے ہوئے کہا۔
”مزرب، یہ تو تمہارے پاپا کی گاڑی کی آواز ہے۔“ ہنستی ہوئی جویریہ ایک دم سے خاموش
ہوئی۔ مزرب بھی چونک گیا۔ جلدی سے کھڑکی کا پردہ اٹھا کر جھانکا اور تصدیق کر دی۔
سوہا پہلی بار اُن کے ہاں آئی تھی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہیر حسن اس کے ساتھ کوئی ایسی دلی بات
کریں اور وہ برا دل لے کر یہاں سے جائے۔
کہیر حسن ادھر ہی آئے۔ پہلی نظر مزرب پر پڑی پھر جویریہ پر، دونوں ہی سلام کرنا بھول کر اپنی
جگہ پر جے کھڑے رہے۔ سوہا، جویریہ کی دائیں جانب صوفے پر بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے کا آدھا حصہ
دی کہیر حسن کو دکھائی دے سکتا تھا۔
سوہا کو احساس ہو گیا تھا کہ مزرب کے والد کی اچانک آمد ان دونوں کو بے حد پریشان کر گئی ہے۔ وہ
انہیں کسی مشکل میں ڈالنا نہیں چاہتی تھی۔ جانے کے ارادے سے اُٹھ کھڑی ہوئی اور جیسے ہی نگاہ مزرب
کے والد پر پڑی، وہ ہٹھکی۔
”آپ.....“ بے ساختہ ہی اُس کے منہ سے نکلا۔
”تم اور یہاں.....؟“ وہ بھی حیران تھے۔



جواب میں مزرب نے کہا کچھ نہیں، بس گاڑی اپنے گھر کے راستے پر ڈال دی۔ وہ دیکھ تو رہی تھی
مگر کچھ سوچ کر خاموش ہی رہی، بحث نہیں کی۔
وہ چپ رہی تو مزرب کا موڈ بھی بحال ہو گیا۔
جب وہ گھر پہنچے، مہنا ز اور زہمت بھی کہیں جانے کے ارادے سے نیچے اتر رہی تھیں۔ دونوں اُس
کے ساتھ اس پیاری سی لڑکی کو دیکھا پھر ایک دوسرے کی طرف..... اور مزرب سے بولیں۔
”یہ کون ہے.....؟ تعارف نہیں کراؤ گے.....؟“
”یہ سوہا ہے۔“
مزرب نے سپاٹ انداز میں اتنا کہا، پھر سوہا سے بولا۔
”آؤ اندر چلیں..... ماما تو تمہیں میرے ساتھ دیکھ کر حیران ہی رہ جائیں گی۔“
وہ انہیں نظر انداز کر کے سوہا کو اندر لے آیا۔
جویریہ اس وقت کچن میں تھی۔ سوہا کو لاؤنج میں بٹھا کر وہ خود جویریہ کو بلانے چلا گیا۔
زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا..... جویریہ بہت جلدی آگئی۔
”ارے آج تو میری بیٹی آئی ہے.....“ جویریہ یہ کہتے ہوئے آگے بڑھی اور بہت پیار سے اسے
گلے لگا لیا۔
پھر مزرب سے بولی۔
”رات کو کبھی تو بلاؤ، اس کی تو یہ پہلی ملاقات ہوگی سوہا کے ساتھ۔“
”سوہا، تم اتنی کوفون کر کے بتا دو کہ آج تمہیں واپسی پر کچھ دیر ہو جائے گی۔“ وہ اُسے کہہ کر رات کو
بلانے چلا گیا۔
”ہائے، سوہا باجی آئی ہیں..... آپ نے پہلے بتایا ہوتا، بھیا آج تو میں نے صبح سے بالوں میں برش
بھی نہیں کیا۔“ وہ گھبرا کر جلدی جلدی بالوں کی چوٹی کھولنے لگی۔
”تمہیں برش کرنے، نہ کرنے سے کوئی خاص فرق تو پڑتا نہیں۔ بس جیسی ہو، اب آجاؤ۔“ بڑے
دونوں بعد وہ اپنے پرانے انداز میں بولا تھا۔
”میں بس پانچ منٹ میں آئی..... وہ چوٹی کے بل کھولنے میں مصروف رہی۔ جب وہ واپس آیا تو
سوہا، اتنی کوفون کر رہی تھی۔
”رات کو نہیں آئی.....؟“ اسے اکیلے آتا دیکھ کر جویریہ نے پوچھا۔
”تیار ہوا ہو کر ہی آئے گی اور ابھی تو بالوں میں برش کا آغاز ہوا ہے۔“
جویریہ ہنس پڑی، پھر بولی۔
”پتا نہیں کیا ہو گیا ہے اس لڑکی کو، نہ کپڑوں کا ہوش رہا ہے، نہ کھانے پینے کا، یہ پہلے تو ایسی نہیں تھی
کبھی.....“
”آج پہلی مرتبہ ہمارے ہاں آئی ہو، بولو کیا بناؤں تمہارے لئے.....“ سوہا فون کر کے پلٹی تو
جویریہ یہ پوچھنے لگی۔
”ماما..... یہ بڑی چٹوری ہے، جو بھی بنا نہیں گی، سب چٹ کر جائیں گی۔“ مزرب نے شرارت
بھرے انداز میں سوہا کی جانب دیکھا، خیال تھا، وہ جواب میں کچھ کہے گی ضرور مگر اُس نے صرف مسکرانے

راختہ تیار ہونے کے بعد بہت عجلت میں سوہا سے ملنے اندر داخل ہوئی مگر جونہی نگاہ باپ پر پڑی، ہنست گئی۔ مسکراہٹ کا نور ہوئی اور اب وہ ذرا سامنے کھولے اور آنکھوں میں خوف لئے جہاں کی تہاں بی، ماں اور بھائی کی جانب دیکھ رہی تھی۔

مزید جلدی سے اس کی جانب بڑھا اور اُس کا بازو پکڑے ہوئے بولا۔
”یہ مس سوہا ہیں، وہی جنہوں نے ایکسیڈنٹ کے بعد پاپا کو اپنے ہاں رکھا، اُن کی ڈریسنگ کی تھی، بیچا سے ملنے ہمارے گھر آئی ہیں۔“

”آ..... اچھا..... مگر.....“ راختہ گڑ بڑائی اور اس سے پہلے کہ کچھ کہہ کر اس قدر موافق چویشن برباد کرتی۔ مزید نے آنکھوں ہی آنکھوں میں سرزنش کے ساتھ اس کا بازو بھی زور سے دبایا۔ وہ کچھ سمجھ نہ سکی تھی مگر بازو دبانے سے اُسے غصے سے دیکھا پھر جا کر سوہا کے سامنے بیٹھ گئی مگر پیا کی موجودگی میں اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ سوہا سے کیا بات کرے۔

جویریہ اور مزید بھی خاموش تھے لیکن مزید نے جگہ ایسی منتخب کی تھی کہ وہ کبیر کی نگاہ میں نہیں تھا۔ اور اس کا فائدہ اُٹھا کر وہ سوہا کو شرارت سے دیکھ رہا تھا اور اشارے کر رہا تھا۔ سوہا کی کبیر حسن سے گفتگو کے دوران یہی کوشش تو تھی کہ وہ مزید کی طرف نہ دیکھے مگر جب بھی نگاہ اٹھتی، وہ بچ نہ پاتی۔
جویریہ کچھ دیر یہاں بیٹھنے کے بعد مکن میں چلی آئیں تو مزید بھی اُٹھ کھڑا ہوا اور ان کی دیکھا دیکھی راختہ بھی ساتھ ہوئی۔

”یہ تو کمال ہو گیا ماما.....“ مکن میں آ کر وہ ہنسے جا رہا تھا۔
”کمال کے کچھ لگتے، اتنا خوش ہونے کی ضرورت نہیں..... اپنے پیا کے موڈ پر نگاہ رکھو کہ بدلتے دینے لگتی اور یہ بھی سوچو دوسری جانب اُن کی بھانجی ہے۔“
”اوہ ماما..... ذرا دیر خوش ہو لینے دیتیں تو آپ کا کیا بگڑ جاتا.....“ وہ کرسی کھینچ کر گرنے کے انداز میں دھب سے بیٹھ گیا۔

”میں تو تمہاری تمام عمر کی خوشیوں کے لئے دعا گو ہوں بیٹا، خدا کرے سوہا کا یہ احسان کبیر صاحب کی سوچ کا دھارا موڑ دے، بیٹی کہا ہے انہوں نے سوہا کو، اب لاج بھی نبھانا چاہئے۔“
”ماما..... یہ سوہا باجی ہیں تو بہت ہی پیاری.....“ راختہ نے کھل کر تعریف کی۔
”ظاہر ہے پیاری کیوں نہیں ہوگی، آخر میری پسند ہے۔“ مزید نے شانے اُچکاتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

ان دونوں کو خوش دیکھ کر جویریہ بھی خوش اور مطمئن دکھائی دینے لگیں۔
”چھوٹے صاحب، آپ کو دادی اماں بلارہی ہیں۔“ ملازمہ نے آ کر مزید کو پیغام دیا۔
”ماما..... میں دادی کو سوہا کے بارے میں بتا کر ابھی آتا ہوں۔“ وہ اتنا کہہ کر چلا گیا۔
جویریہ، راختہ کی جانب دیکھ کر ہنس کر بولیں۔
”دادی سے تو ہر بات یوں کرتا ہے جیسے اس کی ہم عمر ہوں۔“
”بھیا بہت اچھے ہیں، ان کی سب سے دوستی ہے۔“ راختہ بھی مسکرائی۔

”بیٹی! تم اچانک کیسے چلی آئیں.....؟ مجھے اطلاع تو دی ہوتی..... عام طور پر تو میں شام چوبیس بجے کے بعد ہی گھر آتا ہوں، یہ تو اتفاق ہے کہ آج جلدی آ گیا ورنہ تمہیں مجھ سے ملے بغیر ہی جانا پڑتا۔“ کبیر حسن کی آواز میں اور چہرے پر پھر پور خوشی تھی۔

بہت محبت اور بے تابی سے وہ سوہا کی جانب آئے تھے اور اُس کے سر پر دست شفقت رکھا تھا۔
یہ صورت حال سب کے لئے نئی اور پریشان کن بھی ہو سکتی تھی مگر کبیر حسن کے روئے نے اب صرف اور صرف اسے حیران کن بنادیا تھا۔ وہ تینوں خاموش تھے۔ سوہا نے یہ بتانا مناسب نہیں سمجھا کہ وہ تو مزید کے ساتھ آئی ہے اور یہ بھی کہ وہ کس ناتے سے اُسے یہاں لے کر آیا ہے۔
اُسے بھی اس اتفاق نے حیران کر دیا تھا..... وہ ابھی جو ایک رات زخمی حالت میں مدد کی درخواست کے ساتھ اس کے ہاں آیا تھا اور جس نے بڑے پیار کے ساتھ بیٹی کہا تھا، وہی مزید کا جابر باپ بھی تھا مگر سوہا بڑی کامیابی سے اپنی حیرت چھپا کر بولی۔

”کیسے ہیں آپ.....؟ میں تو آپ کی منتظر ہی رہی، دوبارہ بیٹی سے ملنے آئے ہی نہیں۔“
”یقین کرو بیٹی، یاد تو تم بہت آتی رہیں، بس مصروفیت ہی ایسی رہی، کچھ گھریلو اُنجھنیں بھی تھیں، خیر چھوڑو، جانے دو ان سب باتوں کو، تم آؤ بیٹھو۔“ پھر وہ جویریہ کی جانب پلٹے اور بولے۔
”جنگیم یہ ہے وہ بیٹی جس نے اُس روز میری ہیلپ کی تھی۔ یہ بہت پیاری، بہت باہمت اور بہادر لڑکی ہے۔“

پھر مزید کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سوہا سے مخاطب ہوئے۔
”یہ میرا بیٹا ہے مزید حسن۔“
سوہا نے مسکرا کر اُس کی جانب دیکھا اور سلام کر دیا، جس کا جواب اُس نے بھی بظاہر بڑی سنجیدگی اور متانت سے دیا پھر بولا۔

”آپ سے مل کر بہت خوش ہوئی مس..... آپ نے میرے پیا کا اتنا خیال رکھا، مجھے تو آپ سے عقیدت ہو رہی ہے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس دُنیا میں آج بھی اتنے ہمدرد اور نیک لوگ باقی ہیں۔“
”جی ہے یہ دُنیا ہی آپ جیسے لوگوں کی وجہ سے ہے۔“
جویریہ کے اوسان بھی بحال ہو چکے تھے اور مزید کی باتوں پر وہ منہ نہ بچا کئے چپکے چپکے مسکرا رہی تھیں۔

جو کچھ اُس نے اپنے باپ کے ساتھ کر دیا تھا، اس کے بعد دل کی کیفیت اور ہی ہو چلی تھی۔ اب وہ بچھتاوے کی آگ میں جل رہا تھا۔ اب اُن کا ظلم بہت کم اور اپنا جرم بہت گھناؤنا دکھائی دینے لگا تھا۔ اُسے ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ وہ کہہ کر یہ خیال اُسے دستا تھا۔

”اچھا تھا وہ شوٹ کر دیتے مجھے..... سارے نے خواہ مخواہ ہاتھ پکڑ لیا اُن کا..... زینت بے قصورتی، پتا نہیں بابا نے کیا حشر کیا ہوگا اُس کا..... اور خود بابا کے دل پر کیسی قیامتیں گزر رہی ہوں گی۔ میرا جرم بہت بڑا ہے۔ میں معاف کئے جانے کے قابل نہیں رہا۔

آف، یہ چند دن قیامت کی طرح گزرے ہیں..... مجھے کیا سے کیا بنا گئے ہیں..... کبھی محبتوں کی گھنٹی جھاؤں ہوا کرتی تھی میرے سر پر، ٹھنڈک، سکون، تازگی، خوشبو اور اعتماد.....

بابا جان..... بڑی ماں اور..... اور رات، آج میں اکیلا ہوں..... سب ساتھ چھوڑ چکے ہیں۔ ریت کی طرح محبت کے سب رشتے میرے ہاتھوں سے پھسل چکے ہیں، مٹی خالی ہے۔

آذر آیا تو وہ بیڑہ پراوندہ لایا تھا..... دن کے گیارہ بجتے کو تھے اور اسے دیکھ کر لگتا تھا اس نے اُنھ کو ابھی ہاتھ بھی نہیں لیا۔

”تمہارا دن کب چڑھے گا.....؟“ آذر نے اس کے شانے پر ہاتھ مارتے ہوئے خوش دلی اور دوستانہ انداز میں اتنی دیر لیئے رہنے کا احساس دلانے کی کوشش کی۔

”میرا دن ابھی نہیں چڑھے گا، رات ہمیشہ کے لئے ٹھہر گئی ہے۔“ وہ اسی طرح لیٹا ہوا تھا اور ایک بار بھی سر اٹھا کر آذر کی طرف نہیں دیکھا۔

”شرم کرو، اتنے جوان جہان ہو کر اتنی مایوسی کی باتیں کر رہے ہو۔“

”تو کیا موت جوانی میں نہیں آسکتی، بہت سے لوگ عین عالم شباب میں بھی تو مر جاتے ہیں۔“

اب وہ سیدھا ہوا اور سر کے نیچے دایاں بازو رکھتے ہوئے پوری سنجیدگی اور تیزی سے کہنے لگا۔

”تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ تم زندہ ہو اور مرنے کی ناکام کوشش کر رہے ہو، اب ہار مان لو، اُنھ بیٹھو اور اپنا حلیہ درست کرو، انسان بن جاؤ۔“

”مت سہکناؤ میرا.....“ ارد شیر نے برا سامنہ بنایا۔

”میں ناشتا بنا تا ہوں تمہارے لئے اور شادے سے کہتا ہوں، ساتھ میں ایک رسی بھی لے آئے، انکار کرو گے تو ہاتھ پاؤں باندھ کر تمہیں کھانا کھلائیں گے۔“

”آذر پلیز..... کیوں ستاتے ہو مجھے.....“ اب ارد شیر کے انداز میں نہ ضد تھی، نہ جھلاہٹ، بس تھکا تھکا ٹھکانا ہوا لہجہ تھا اُس کا.....

”ارد شیر یاد ہے ایک بار میں نے تم سے کہا تھا کہ تم شادی کر لو اور تم نے اس سلسلے میں رضامندی ظاہر کی تھی۔“

”ہاں ہاں مجھے اچھی طرح یاد ہے.....“ وہ ہنس پڑا اور آذر کا جی چاہا، اُس کی منت کرے، اسے کہے.....

”پیارے دوست، تمہاری یہ رنج و الم میں ڈوبی ہنسی خود تمہیں ہی نہیں مجھے بھی اذیت سے دوچار کر رہی ہے۔ کتنے آنسو چھپے ہیں اس ہنسی میں، نہ تو تمہارا چہرہ ساتھ دے رہا ہے اور نہ ہی آنکھیں..... خدا

م کر دو مجھ پر بھی، اور خود پر بھی..... ایسے مت ہنسو۔“

تھوڑی دیر تک دونوں نے کوئی بات نہیں کی۔ ارد شیر ابھی تک بیڈ پر دراز تھا اور آذر سر جھکائے اُس کے قریب بیٹھا تھا۔ پھر آذر گہری سانس کھینچ کر اُنھ کھڑا ہوا اور اس سے بولا۔

”تم اٹھو، واش روم جاؤ، میں تمہارے لئے ناشتا تیار کر داتا ہوں۔“

ارد شیر نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا۔

”پتا ہے تمہارے دوست کی موت میں اُن کا بھی ہاتھ ہے جنہیں میں زندگی کا پیام برکھتا آیا ہوں۔“

آف کاندھری سے زخم لگائے گئے ہیں۔ اس کی تکلیف دہی محسوس کر سکتا ہے جس کے ساتھ جیتی ہو، ہا..... کس کس نے لوٹا ہے اور کس خوبصورتی سے لوٹا ہے ارد شیر کو.....“ وہ پھر ہنسنے لگا۔

”یوں مت ہنسنا ارد شیر، مجھے بہت تکلیف ہوتی ہے۔ کون ہیں وہ تم کس کی بات کر رہے ہو، کھل کر بتاتے کیوں نہیں۔ اگر وہ تم سے دشمنی کر گئے ہیں تو دوستی تو تم نے بھی نہیں رکھی خود سے، تم بھی اپنی جان کے دشمن ہو رہے ہو۔“

آذر کا ہاتھ اب ارد شیر نے تھام رکھا تھا۔ اُس نے بٹھانا چاہا تو آذر کو بیٹھنا پڑا۔ ارد شیر خود بھی لیٹے سے اُنھ کر بیٹھ گیا۔ سر بیڈ بورڈ سے لگا کر اُس نے تھکی تھکی نگاہوں سے آذر کی جانب دیکھا اور بولا۔

”میں مانتا ہوں مجھے اس سے انکار نہیں، میں برا ہوں، میں بہت ہی برا ہوں، مگر خدا کی قسم میں نے اس کے ساتھ کبھی برائی نہیں کی، میں اپنی محبت میں تو بالکل سچا تھا۔ میں نے اپنی رُوح میں اُتارا تھا اُسے..... دل کی تمام تر گہرائیوں سے چاہا تھا مگر یہ میری غم لیبھی ہی ہے کہ وہ مجھے سمجھ ہی نہیں سکی..... یا شاید اُسے میری محبت کی ضرورت ہی نہیں ہوگی۔

جو جذبے میرے دل میں اُس کے لئے تھے، وہ جذبات وہ میرے لئے نہیں رکھتی ہوگی، جیسی تو اتنے آرام سے دامن چھڑا کر چلی گئی۔ ایک بار بھی پلٹ کر نہیں دیکھا۔“

”اچھا..... چھوڑو اسے، اب بھول جاؤ اور لوٹ آؤ زندگی کی طرف، کب تک بے وفا کا ماتم کرو گے۔“ آذر نہیں جانتا تھا۔ وہ کس کی بات کر رہا ہے مگر وہ اسے سمجھا رہا تھا کہ اسے جلد از جلد سنبھلتے ہوئے دیکھنا چاہتا تھا اور دل ہی دل میں وہ حیران بھی تھا۔ آخر کون تھی وہ جو ارد شیر جیسے آکھلے کو محبت آشنا کر گئی تھی۔ اُس کے دل میں محبت کی نہ بجھنے والی آگ لگ گئی تھی۔

”وہ بہت اچھی ہے، بہت پیاری صاف شفاف اور اس کا دل بھی اسی کی طرح خوبصورت ہے وہاں بھلا ارد شیر جیسے شخص کے لئے جگہ کیسے ہو سکتی ہے۔“ اب ارد شیر اپنے آپ سے مخاطب تھا کہ وہ اسے الزام دیتے ہوئے بھی ٹھٹکتا تھا، یہ غلطی وہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔

”کیا نام ہے اس کا تم کس کا ذکر کر رہے ہو.....؟“ آذر نے پھر پوچھا۔

تب اُس نے ہولے ہولے کبھی آنسوؤں کو پی کر اور کبھی دہو سے بے حال ہو کر اسے راتھ کے بارے میں سب کچھ بتا دیا..... سن کر آذر کو جھڑکا سا لگا۔

”آف..... یہ تو پہلے ہی محبتوں کا اعتبار کھو بیٹھا تھا۔ اب جو پتا چلے گا اس لڑکی کو اس سے بدگمان کرنے والا کوئی اور نہیں، اس کا اپنا دوست ہے تو پھر کیا رد عمل ہوگا اس کا، یہ مجھ سے بھی بدگمان ہو جائے گا۔“

مجھے اس لئے زندہ رکھا گیا کہ میری زندگی ہی اُن کے مفاد میں تھی۔ وہ مجھے میرے باپ کے سامنے کھڑا کرنا چاہتی تھیں..... اور پھر جو کچھ میں نے کیا، وہ بھی بہت زیادہ ہے..... اور میں نے بھی ایک بے گناہ کو سزا دی ہے، میں بھی کسی کی زندگی سے کھیل گیا ہوں۔

”چھٹاؤے کا احساس مجھے بچوں کے لگا رہتا ہے..... میں تو پہلے سے کہیں زیادہ بے چین ہوں۔“ اس نے بات کے اختتام پر نچلا لب دانٹوں تلے دبایا اور اذیت کے احساس سے آنکھیں نم ہونے لگیں۔ ”اردشیر! تم کیسی بات کر رہے ہو، کیا کر دیا ہے تم نے؟“ تمہاری باتیں مجھے بے حد پریشان کر رہی ہیں۔“ اب جو کچھ وہ کہہ رہا تھا، یہ بھی اُذر کے لئے حیران کن تھا، وہ فکر مند بھی تھا، آخر کیا گناہ کر بیٹھا ہے اردشیر.....

”سننا چاہتے ہو تو سنو، میرے بابا جان نے مجھے ہمیشہ کے لئے گھر سے نکل جانے کا حکم سنا دیا ہے..... اور میرا جو جرم بتایا ہے، وہ اتنا بڑا ہے کہ لیو پر لاتے ہوئے زبان لڑکھڑاتی ہے..... میں بے تصور ہوں، مگر وہ سامنے کو تیار نہیں اور بڑی ماں.....“ اُس نے اتنا کہہ کر سر کو جھٹکا دیا پھر اُذر کی طرف دیکھ کر بولا.....

”وہی جن کی محبت پر مجھے ناز تھا، جن کے لئے کبھی میں سب کچھ تھا اور جن کے بارے میں کبھی مجھے یہ غلط فہمی تھی کہ وہ تو میری خاطر جان بھی دے سکتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں، ماں تو صرف ماں ہوتی ہے، وہی جو جنم دیتی ہے۔ میں کچھ نہیں ہوں تمہاری، میرا تمہارا رشتہ تو بس نفرت کا ہے۔“

اب بتاؤ اُذر، میں پاگل نہ ہو جاتا تو کیا کرتا، ایک سٹھ اتنی حقبتیں پھڑگنی ہیں مجھ سے..... میرے ہاتھ خالی رہ گئے ہیں..... اور میرے دل میں اب کوئی اُٹنگ باقی نہیں، بس یادیں ہیں، آوازوں کا جھوم ہے میرے چاروں طرف اور بڑی ماں کی نفرت کے زہر میں بھی آنکھیں ہر وقت مجھے کھورتی رہتی ہیں۔“

”اردشیر..... تم ہمیشہ اپنی بڑی ماں کے گن گاتے رہے ہو۔ اُن کی محبت پر نازاں رہے ہو مگر جب میں تمہارے ساتھ گاؤں گیا تھا تو مجھے وہ اس سے بالکل مختلف دکھائی دی تھیں۔ جیسا کہ تم بتاتے رہے تھے، بے شک وہ باوقار ہیں مگر محبت کے وہ جتنے ان کی آنکھوں سے جب بھی نہیں پھونٹتے تھے جن کا ذکر تم اکثر کیا کرتے تھے مگر اردشیر، آخر انہوں نے اچانک تم سے ایسا کیوں کہہ دیا.....؟“ بات کرتے کرتے اسے اچانک یہ خیال آگیا۔

”بتا دوں گا مگر ابھی نہیں..... میں اتنا ہی کہہ کر تھک گیا ہوں..... مجھے لگتا ہے میلوں پیدل چلا ہوں، نفرت کی بات کرنا کتنا مشکل ہے اور ابھی تو وہ جرم کہنا باقی ہے جو میں نے ڈھایا ہے، سوچتا ہوں کیسے کہوں گا میں یہ سب کچھ، اعتراف قیامت کی گھڑی سے کم نہیں۔“

”اچھا چلو، اب اُٹھو، داش روم کا رخ کرو، اپنا حلیہ درست کرو اور پھر سے انسان بن جاؤ۔ سچ تم تو بالکل ہی بھوت بنتے جا رہے ہو۔“ اُذر اس کی توجہ ہٹانا چاہ رہا تھا۔

کیر شام کی جائے کے ساتھ ساتھ فائلوں پر بھی نگاہ دوڑا رہے تھے۔ جو یہ بھی چائے کا کپ تھے اُن کے سامنے بیٹھی تھیں۔ کبھی کبھی نگاہ اٹھا کر اُن کی مصروفیت کو دیکھتیں اور پھر چائے کی جانب متوجہ ہو جاتیں۔ انہوں نے آج مزید سے کہا تھا.....

آذرتا پشیمان ہوا اور ایسی الجھن طاری ہوئی اس پر کہ وہ فوراً ہی جانے کے ارادے کے ساتھ اُٹھ کھڑا ہوا۔

”آذر، کہاں چلے.....؟ بیٹھو.....“

”اردشیر، بہت بڑی بھول ہو گئی ہے مجھ سے..... میں سخت نادم ہوں، پتا نہیں تم مجھے معاف بھی کر گے یا نہیں۔“ وہ اپنی غلطی چھپا نہیں سکا فوراً اعتراف کر لیا۔

اردشیر نے بغور اُس کی باتیں سنیں، وہ اپنی بات مکمل کر چکا تو دیکھا اردشیر کے چہرے پر نہ غصہ تھا اور نہ ہی فکر مندی کے آثار تھے، وہ بالکل ویسے ہی بیٹھا تھا۔ جیسے یہ سب سننے سے پہلے تھا۔

”وہ لڑکی بے وفا نہیں ہے، اسے بھی تم سے محبت ہے، یہ سب کیا دھڑا میرا ہے۔ اصل میں سوا والے واقعے کے بعد جب میں نے رات کو دیکھا اور تمہارے اور اس کے بارے میں پتا چلا تو دل میں یہی خیال آیا، تم سے بھی برباد کر دو گے۔ میں نہیں جانتا تھا، تم اسے اس شدت سے چاہتے ہو، اسے تم سے ملنے بدگمان کیا ہے، اب اسے مٹا کر تمہارے پاس لانا بھی میرا کام ہے اور میں بہت جلد اسے لے کر آؤں گا۔ جب تک اُس کا دل تمہاری طرف سے صاف نہیں ہو جاتا۔ میں سکھ کا سانس نہیں لے سکتا۔ سچ اردشیر، میں اتنا شرمندہ ہوں کہ پتا نہیں سکتا، تم جو چاہو، سلوک مجھ سے کرو، میں تیار ہوں ہر سزا کے لئے۔“

اردشیر نے گہری سانس کھینچ کر اس کی طرف دیکھا، پھر اُس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے بولا.....

”نہیں آذر، مجھے تو تمہارا قصور کہیں بھی دکھائی نہیں دیا۔ مجھے تو تم سے کوئی شکایت نہیں ہے۔“

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو.....؟“ آذر اس وقت ان لفظوں کی توقع کیسے رکھ سکتا تھا، اُسے لگا جیسے سننے میں غلطی کر رہا ہو۔

”سچ ہی تو..... کہہ رہا ہوں، سنو اگر تم سے کوئی یہ کہتا ہے کہ اردشیر تمہیں قتل کرنا چاہتا ہے تو کیا تم مان لیتے..... بتا تحقیق کے مجھ پر دشمنی پراثر آتے۔“ بے اختیار آذر نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”تو پھر اُس نے کیسے یقین کر لیا وہ کیونکر تمہاری بات مان گئی، سچ تو یہ ہے کہ غلط فہمی کا بیج پہلے سے اُس کے دل میں تھا، اُس نے میرا اعتبار کیا ہی نہیں تھا اور محبت تو کبھی بے اعتبار نہیں ہو سکتی۔“

”میں ملوں گا اُس سے، میں اُس کی غلط فہمی دور کر دوں گا، مجھے یقین ہے، وہ مان جائے گی، تم سے دُور رہ کر خوش تو وہ بھی نہیں ہوگی۔“

”میں نے کہا تو ہے آذر، اب اس کی ضرورت ہی نہیں، محبت وضاحتوں کی محتاج نہیں ہوا کرتی اور اب تو میں نے محبتوں کے بنا جینے کا فیصلہ کر لیا ہے، میں ان سب کو بھیر کر دکھاؤں گا۔“

”تو پھر زندگی کی طرف آؤ، تم نے جو حالت بنا رکھی ہے۔ اس سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے، تم ان سب کے بغیر نہیں رہ سکتے۔“

”بس میرے پار، دھچکا ہی ایسا لگا ہے، کرجی کرجی ہو گیا ہوں اور ابھی تک اسی شش و پنج میں جلا ہوں، یہ خواب ہے یا واقعی میرے ساتھ ایسا ہو چکا ہے، اتنی زندگی میں نے دھوکے میں گزار دی۔ میں کسی کے ہاتھوں کھلو نا بنا رہا۔ وہ مجھے ایک مقصد کے لئے پال رہی تھیں، محبت کے پردے میں شدید نفرت کے جذبات تھے۔“

”بس میرے پار، دھچکا ہی ایسا لگا ہے، کرجی کرجی ہو گیا ہوں اور ابھی تک اسی شش و پنج میں جلا ہوں، یہ خواب ہے یا واقعی میرے ساتھ ایسا ہو چکا ہے، اتنی زندگی میں نے دھوکے میں گزار دی۔ میں کسی کے ہاتھوں کھلو نا بنا رہا۔ وہ مجھے ایک مقصد کے لئے پال رہی تھیں، محبت کے پردے میں شدید نفرت کے جذبات تھے۔“

”بس میرے پار، دھچکا ہی ایسا لگا ہے، کرجی کرجی ہو گیا ہوں اور ابھی تک اسی شش و پنج میں جلا ہوں، یہ خواب ہے یا واقعی میرے ساتھ ایسا ہو چکا ہے، اتنی زندگی میں نے دھوکے میں گزار دی۔ میں کسی کے ہاتھوں کھلو نا بنا رہا۔ وہ مجھے ایک مقصد کے لئے پال رہی تھیں، محبت کے پردے میں شدید نفرت کے جذبات تھے۔“

”بس میرے پار، دھچکا ہی ایسا لگا ہے، کرجی کرجی ہو گیا ہوں اور ابھی تک اسی شش و پنج میں جلا ہوں، یہ خواب ہے یا واقعی میرے ساتھ ایسا ہو چکا ہے، اتنی زندگی میں نے دھوکے میں گزار دی۔ میں کسی کے ہاتھوں کھلو نا بنا رہا۔ وہ مجھے ایک مقصد کے لئے پال رہی تھیں، محبت کے پردے میں شدید نفرت کے جذبات تھے۔“

”بس میرے پار، دھچکا ہی ایسا لگا ہے، کرجی کرجی ہو گیا ہوں اور ابھی تک اسی شش و پنج میں جلا ہوں، یہ خواب ہے یا واقعی میرے ساتھ ایسا ہو چکا ہے، اتنی زندگی میں نے دھوکے میں گزار دی۔ میں کسی کے ہاتھوں کھلو نا بنا رہا۔ وہ مجھے ایک مقصد کے لئے پال رہی تھیں، محبت کے پردے میں شدید نفرت کے جذبات تھے۔“

”بس میرے پار، دھچکا ہی ایسا لگا ہے، کرجی کرجی ہو گیا ہوں اور ابھی تک اسی شش و پنج میں جلا ہوں، یہ خواب ہے یا واقعی میرے ساتھ ایسا ہو چکا ہے، اتنی زندگی میں نے دھوکے میں گزار دی۔ میں کسی کے ہاتھوں کھلو نا بنا رہا۔ وہ مجھے ایک مقصد کے لئے پال رہی تھیں، محبت کے پردے میں شدید نفرت کے جذبات تھے۔“

رجب کیوں فنی ہو جاتا تھا۔
واجدہ برابر بنی کی تعریفیں کر رہی تھیں۔ اسی دوران وادی بھی چلی آئیں۔ سلام دعا کے بعد کبیر نے انہیں بیٹھنے کو کہا تو وہ بھی آ بیٹھیں، یہ بات واجدہ کو پسند نہیں آئی مگر مجبور تھیں۔ اب وہ انہیں یہاں سے جانے کو بھی نہیں کہہ سکتی تھیں۔

”یہ تو سچائی ہے آپا کہ نہت کچھ غلط ضرور کر رہی ہے۔“ کبیر نے ان کی اتنی باتوں کے جواب میں پھر کہا۔۔۔۔۔ انہوں نے نفی میں سر ہلایا اور بولیں۔۔۔۔۔

”مہناز سے تو ہر حماقت کی توقع کی جاسکتی ہے مگر نہت تو اور مزاج کی بنی ہے، وہ سمجھدار ہے اور سادہ مزاج بھی رکھتی ہے۔ میں نے پوچھا تو بولی۔۔۔۔۔ ”ایسی تو کوئی بات سرے سے ہے ہی نہیں اور ہو بھی بھلا کیسے سکتی ہے۔ میں نے بچپن سے اس کے ذہن میں یہ بات ڈال دی تھی کہ اس کی شادی ہوگی تو اپنے ہی خاندان میں۔۔۔۔۔ وہ مزید کی امانت ہے۔“

یہ بات اتنی حیران کن تھی کہ کچھ دیر کے لئے وہ بول ہی نہیں سکے۔ حیران لگا ہوں سے اُن کی جانب دیکھنے لگے۔ آج سے پہلے تو وہ مہناز اور مزید کی بات کرتی آئی تھیں اور اب نہت اور مزید کا نام، یہ جاننے کے باوجود کہ نہت عمر میں مزید سے بڑی ہے، وہ دونوں کا نام ایک ساتھ لے رہی تھیں۔ وہ مصلحت خاموش رہے اور ان کی باتیں توجہ سے سنتے رہے۔ وہ کہہ رہی تھیں۔۔۔۔۔

”مہناز کا رشتہ تو میں نے کب سے سوچ رکھا ہے، دلشاد آپا کے ہاں کروں گی، خود مہناز کو بھی اپنی خالہ سے بڑی محبت ہے اور نہت تو ماموں، ماموں کر رہتی ہے۔ مزید مجھے بڑا پیارا ہے اور وہ بھی مجھے بہت چاہتا ہے۔ ماں کی محبت تو اسے ملی نہیں، یہ کہ میں نے ہی پوری کی ہے، جان چمڑکتا ہے مجھ پر۔۔۔۔۔ نہت سے میں نے مزید کے بارے میں رائے لی تو شرما کر سر جھکا لیا۔“

وادی جو یہ ساری گفتگو خاموشی سے سن رہی تھیں، انہیں اور چلی گئیں۔
واجدہ آپا کی یہ گفتگو انہیں میں تو کبیر کو بھی ڈال رہی تھی مگر وہ یوں اٹھ کر جانیں سکتے تھے۔
نہت ادھر آئی، ادب سے ماموں کو سلام کیا اور چائے کے بارے میں پوچھا۔
واجدہ بنی سے بولیں۔۔۔۔۔

”تمہارے ماموں سخت خفا ہیں تم سے، انہیں تمہارا دیرینہ سہیلیوں کے ساتھ گھومنا پسند نہیں۔“
نہت آکر کبیر کے قریب صوفے پر بیٹھ گئی اور بڑی لالچت سے بولی۔۔۔۔۔
”پلیز ماموں جان، مجھے معاف کر دیں۔۔۔۔۔ آپ مجھ سے خفا ہیں گے تو میں اُداس رہوں گی۔ آپ کی ناراضگی میں سہ نہیں سکتی۔ اگر آپ حکم کریں تو میں گھر سے لکنا ہی چھوڑ دوں۔“

نہت کا انداز بالکل نیا تھا۔۔۔۔۔ کہاں تو وہ خود سر لڑکی اور کہاں سعادت مندی کے رپکار ڈٹوڑے جارہے تھے، اُن لوگوں کی باتیں اور یہ حرکتیں کبیر کو سخت غصہ دلا رہی تھیں۔ مگر وہ کچھ کہنا بھی نہیں چاہتے تھے۔ بس خاموشی سے یہ بدلتے ہوئے رنگ دیکھ رہے تھے۔

”آخر چاہتی کیا ہیں آپا، پہلے تو ہمیشہ مہناز اور مزید کی بات کی، اب اچانک فیصلہ کیوں بدل دیا ہے۔ مہناز کی جگہ نہت کا نام۔۔۔۔۔؟“ وہ پریشان ہو گئے۔

”مہناز کہاں ہے۔۔۔۔۔؟“ کچھ سوچ کر انہوں نے پوچھا۔

”میں تمہارے پاپا کو آج بتا دوں گی کہ سوا کون ہے۔۔۔۔۔ میں ان سے صاف صاف بات کر لوں گی۔“ مگر جب وہ اُن کے سامنے آئیں تو ہمیشہ کی طرح زبان لڑکھڑانے لگی۔ اب وہ ابھی ابھی بنی کی تعریفیں اور بولنے کے لئے لفظوں کو ترتیب دے رہی تھیں۔

”کچھ کہنا چاہتی ہو۔۔۔۔۔؟“ کبیر نے اچانک سوال کر کے انہیں حیران کر دیا۔
”نہن۔۔۔۔۔ نہیں تو۔۔۔۔۔“ وہ گڑبڑا گئیں۔

”صاحب۔۔۔۔۔ آپ کو آپا بیگم بلارہی ہیں۔۔۔۔۔“ ملازمہ کی اطلاع پر انہوں نے اثبات میں ہلاتے ہوئے کپ میز پر رکھا، فائل بند کی اور جانے کے لئے اٹھنے لگے۔

”آپ چائے تو پیتے جائیے۔“ جویریہ یہ کہہ بیٹھیں۔
”میں پی چکا ہوں۔۔۔۔۔“ وہ اتنا کہہ کر چلے گئے اور جویریہ لفظوں کو ترتیب دیتی ہی رہ گئی تھیں۔

پتا نہیں اب واپسی کب ہوگی ان کی اور واپس آئیں گے تو کس موڈ میں ہوں گے، عام طور پر واجدہ بیگم کے ہاں سے آنے کے بعد جویریہ کے ہر کام پر اعتراض ہوا کرتے تھے۔

کبیر، واجدہ کے ہاں آئے تو انہیں پانا منظر پایا۔۔۔۔۔ دیکھتے ہی بولیں۔۔۔۔۔
”چائے کا وقت ہو رہا ہے، میں نہت سے کہتی ہوں، چائے بنائے تمہارے لئے۔“

”نہیں آپا، چائے تو میں پی کر رہا ہوں، آپ فرمائیے کیسے یاد کیا ہے۔۔۔۔۔؟“
”بس بھیا، ملنے کو جی چاہ رہا تھا تو بلا لیا اور ایک بات بھی میں کچھ دنوں سے کہنا چاہ رہی تھی۔“ آج

واجدہ کا انداز کچھ زکا زکا سا تھا۔
”کوئی اُلجھن ہے آپا۔۔۔۔۔؟“ وہ پوری طرح متوجہ تھے۔

”نہیں، اُلجھن تو خیر کوئی نہیں۔۔۔۔۔ مگر بات ہے بہت ضروری۔۔۔۔۔ میں چاہتی تو یہ تھی کہ تم خود یہ بات کہو اسی لئے تو اسے برس خاموش رہی مگر میں دیکھ رہی ہوں تمہاری تو اس طرف توجہ ہی نہیں مصروف بھی تو بہن رہتے ہو، یہ باتیں تو عورتوں کے حصیان میں رہتی ہیں، لیکن ہماری بھائی بیگم اپنی ہی سوچوں میں گم رہتی ہیں۔ مزید لاکھ سگائے، جتنا مرضی احترام دے مگر ہے تو وہ سوتیلی ماں، اسے بیٹے کا خیال بھلا کیوں ہوگا مگر ہمارا تو خون ہے، ہم کیسے غافل رہ سکتے ہیں اس سے۔“

”آخر بات کیا ہے آپا۔۔۔۔۔؟“ وہ اتنی لمبی تنہید کے باوجود پرسکون تھے۔

”اب میری بھی بچی جوان ہے اور مجھے اس کے فرض سے سبکدوش ہونا ہے، بڑی سیدی ہے میری نہت، بس ذرا امیر اور ماڈرن لڑکیوں سے دوستی ہو گئی ہے اس کی اور اُس نے بھی ان ہی جیسا بننے کو شش کی، مگر ہماری بیٹی شرافت کی حد پار نہیں کر سکتی۔ لوگ ہیں کہ کچھ اچھا ل رہے ہیں، طرح طرح کی باتیں بنا رہے ہیں۔“

”میرا خیال ہے لوگ ٹھیک ہی کہتے ہیں، نہت آگے جا چکی ہے، آپا! آپ نہت کو بلا کر پوچھتے تو سہی۔“
”ایک بار نہیں، بار بار پوچھا ہے، وہ تو ایسی بات سن کر ہی رونے لگتی ہے، کہتی ہے خاندان کی عزت

و ناموس کا بچھہ بھی اسی قدر پاس ہے جتنا کہ آپ لوگوں کو ہے، کوئی غلط قدم اٹھانے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔“

کبیر کو ان باتوں پر یقین نہیں آیا۔ اگر وہ صرف سہیلیوں سے ملنے جاتی تھی تو ماموں کو دیکھنے کی

ماں بیٹی نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، پھر واجدہ بولیں۔۔۔

”اُس کے سر میں درد ہے، سو رہی ہے۔“

”اچھا، آپا میں چلتا ہوں۔“

”ارے کبیر، ایسی بھی کیا جلدی ہے، کچھ دیر تو بیٹھو۔“

”جب آپ نے پیغام بھیج کر بلوایا، اس وقت میں کام کر رہا تھا، آپ سے ملنے فوراً چلا آیا، اب چلتا ہوں۔“ وہ اُنھ کھڑے ہوئے۔ کارڈور میں تھے کہ ملازمہ نے داوی کا پیغام دیا وہ ان سے ملنا چاہ رہی تھیں اور اپنے کمرے میں بلایا تھا۔

جب وہ اُن کے کمرے میں آئے تو وہ اُن کی منتظر تھیں، دیکھتے ہی بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بولیں۔۔۔

”جو باتیں تمہاری بہن نے تم سے کہی ہیں، وہ میں نے بھی سنی ہیں۔ پتا نہیں تمہاری کیا رائے ہے مگر میں اس رشتے کے حق میں ہرگز نہیں ہوں۔ کبیر بیٹا نہ ہمت میری پوٹی ہے۔ یہ رشتہ بہت پیار کا ہے اور واجدہ تمہاری بہن ہے، تم اس سے محبت بھی کرتے ہو اور اسے احترام بھی دیتے ہو مگر میں اس وقت بات نہ ہمت کی نہیں کروں گی، میں مزید کی بات کروں گی، جس کے ساتھ بظاہر تو میرا کوئی رشتہ نہیں۔ مگر ہر بھی وہ مجھے بہت عزیز ہے اور میں نہیں چاہتی کہ بہن کی محبت میں تم اس بچے کی زدگی برباد کرو۔ کبیر بیٹا! اس گھر کی بنیاد تو دل چکی ہے۔ تمہاری بہن کی بے جا آزادی نے بہت برا رنگ دکھایا ہے، جیسی توکل تک مہناز اور مزید کا نام ایک ساتھ لینے والی آج نہ ہمت کے لئے راہ ہموار کر رہی ہے۔“

”اماں جان، بہت شکریہ آپ کا، میں بھی اُنجھن میں گرفتار ہوں کہ یہ آپا جان آج کیسی خواہش کا اظہار کر رہی ہیں اور نہ ہمت بھی بڑی فرمانبردار بیٹی دکھائی دے رہی ہے۔ مگر اب تو ساری بات واضح ہو چکی ہے۔ پتا نہیں آپا جان نے مجھے اس قدر احمق کیوں سمجھ لیا ہے۔“

”برامت ماننا کبیر بیٹا، تم نے تو ساری عمر واجدہ کی ہر غلط بات پر آنکھیں بند کر کے عمل کیا ہے، اُس نے دن کو رات کہا تو تم نے بھی رات کہہ دیا۔ اپنے گھر کو کبھی اہمیت نہیں دی، بیوی کو عزت دی، نہ محبت، اپنی اولاد تک کو تو جو سے محروم رکھا، اُن پر بہن کے بچوں کو فاقیت دیتے رہے۔ آج اگر واجدہ نے ایسا کہا ہے تو تمہیں حیران نہیں ہونا چاہئے۔ اس کے پیچھے تمہاری سالوں کی سعادت مندی ہے بلکہ میں اسے سعادت مندی نہیں، حماقت ہی کہوں گی۔ اب تم سوچ کچھ کر فیصلہ کرو اور نہ ہمت، مہناز کی فکر نہ کرو، واجدہ بہت ہوشیار ہے، وہ اُن کے لئے جلد ہی اپنے معیار کا رشتہ تلاش کر لے گی۔“

اماں جان اتنا کہہ کر خاموش ہو گئیں، کبیر کچھ اُٹھے اُٹھے سے واپس چلے آئے۔

انہیں واجدہ اور بھانجیوں پر افسوس تھا۔ بہن نے کیوں اتنی ذہیل دی ہے اور نہ ہمت نے اس ذہیل کا اس قدر غلط فائدہ کیوں اُٹھایا۔ پتا نہیں کیا ہوگا۔

وہ واپس چائے کی ٹیبل پر آئے کہ اپنی فائلیں یہیں جمود کر گئے تھے، دیکھا تو جو یہ اب بھی اُسی جگہ اور اسی انداز میں سر جھکائے ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں اُٹھائے کسی سوچ میں غم بیٹھی تھیں۔ کبیر اچنتی سی نظر ان پر ڈال کر سامنے رکھی فائلیں اُٹھانے لگے۔

تب جو یہ نے اُن کی جانب دیکھ کر یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ وہ بہن کے ہاں سے کس موڈ کے ساتھ واپس آئے ہیں۔ اُن کے چہرے پر پریشانی اور اُنجھن کے آثار نمایاں تھے مگر غصے کی جھلک

بالکل نہیں تھی۔

”خیریت تو تھی ناں آپا کے ہاں، آپ کچھ فکر مند دکھائی دے رہے ہیں۔“

وہ فائلیں دوبارہ میز پر رکھ کر سامنے کرسی پر بیٹھ گئے اور بولے۔۔۔

”آپا نے بات ہی بہت عجیب کی ہے، میں واقعی اُلجھ کر رہ گیا ہوں۔“

”خدا خیر کرے، اب کیا کہہ دیا انہوں نے۔۔۔؟“ جو یہ کا دل تیزی سے دھڑکا، وہ سوالیہ انداز

میں اُن کی جانب دیکھنے لگیں۔

کبیر نے اُن کی پریشانی بھانپ تولی مگر خود بڑے آرام سے گویا ہوئے۔

”انہوں نے مزید اور نہ ہمت کے رشتے کی بات کی ہے۔“

”کک۔۔۔ کیا۔۔۔؟“ جو یہ ایک دم سے۔۔۔ کھڑی ہوئیں اور بناء کسی خوف کے مضبوط لہجے

میں بولیں۔۔۔

”یہ ناممکن ہے ایسا تو میں کبھی نہیں ہونے دوں گی انہوں نے یہ بات سوچی بھی کیونکر۔۔۔“

”تم کیا کر سکتی ہو۔۔۔؟“ وہ اب بھی بظاہر پرسکون تھے، بغور اسے دیکھ رہے تھے۔

”آپ کچھ بھی کہیں مگر میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گی۔ آخر آپ سمجھتے کیوں نہیں، مزید اور نہ ہمت،

کیا جوڑ بیٹا ہے، یہ بات آپا نے کیا سوچ کر کی ہے۔“ وہ پہلی بار کبیر کے سامنے یوں غصے کا اظہار کر رہی تھیں۔

”اچھا، اگر وہ مہناز اور مزید کے لئے کہہ دیں، تب تو تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔۔۔؟“

”تب بھی میں انکار کروں گی۔۔۔“ انہوں نے قطعیت بھرے انداز میں کہا۔

وہ مسکرا دیے اور بولے۔۔۔

”جانتا ہوں، تمہیں مزید سے بہت محبت ہے، تم نے اُسے ماں کی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔“

”اور آپ جو کسے باپ ہیں، آپ پھر بھی اُس پر ظلم توڑ رہے ہیں۔“ جو یہ یہ کی آنکھیں سمجھنے لگیں۔

”میں نے یہ کب کہا ہے جو یہ کہ میں آپا جان کے فیصلے سے شفق ہوں، تم نے پوچھا تھا، آپا جان

کیا کہہ رہی تھیں، سو میں نے بتا دیا۔“

”تو کیا آپا انکار کر کے آئے ہیں۔۔۔؟“ جو یہ یہ جلدی سے بولیں۔

”انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔۔۔

”نہیں خیر، انکا تو میں نے نہیں کیا۔“

”فورا کر دیں، ایک ہی تو بیٹا ہے ہمارا، ہمیں اس کی خوشی کا خیال رکھنا چاہئے۔“

”کیا ہے اُس کی خوشی۔۔۔؟“ انہوں نے یونہی کہہ دیا۔

”سو۔۔۔ وہی سو ہا جسے آپ بیٹی کہتے ہیں۔“ کتنی ہی دیر لفظوں کو ترتیب دیتی رہی تھیں، ہمت

نہیں پڑ رہی تھی، اب اچانک ہی کہہ بیٹھیں۔

”بیٹی کہتی ہی نہیں، سمجھتا بھی ہوں مگر وہ مزید کی پسند کب سے ہے، کمال ہے ایک ملاقات میں ہی

فیصلہ کر لیا اور تمہیں بھی سنا دیا۔“

”ایک ملاقات نہیں، وہ دونوں تو ایک دوسرے کو بہت عرصے سے جانتے ہیں، وہ کاشف کی بہن

عالیہ کی دوست ہے۔ بہت اچھی لڑکی ہے۔“

”نہیں.....“ وہ جھوٹ بولتے ہوئے ہچکچاہٹ کا شکار ہوئی مگر ماں کی حالت کے پیش نظر کہہ گئی۔
 ”وہ کیوں نہیں آیا راجہ؟ کیا ایسے وقت میں وہ بھی عمر کا ساتھ چھوڑ گیا ہے۔ اب تو عمر کو اس کی بہت ضرورت ہے۔ میرا عمر بالکل تنہا ہے اس مصیبت کی گھڑی میں۔“
 ”آپ نے خود ہی تو عمر کو منہ کیا تھا کہ وہ غریب بھائی سے نہ ملے۔“ راجہ نے یاد دلایا۔
 ”ہماری زندگی کی کہانی بھی کتنی عجیب ہے۔“ زیتون نے آہ بھری۔
 راجہ ماں کے پاس آ کر بیٹھ گئی اور بولی.....

”کچھ کھاؤ گی ماں.....؟ میں نے تمہارے لئے دلیہ بنا کر رکھا ہوا ہے، کھو تو کچھ ڈی بنا دوں.....؟“
 زیتون نے راجہ کا ہاتھ اپنے کمر دراز کرتے ہاتھوں میں لے لیا اور بولیں.....
 ”تمہیں اپنی ماں تو یاد آتی ہوگی راجہ، یہ خیال آتا ہوگا، اگر ماں زندہ ہوتی تو تمہیں بہت پیار دیتی، تمہارا بہت خیال رکھتی، میں تمہاری غریب خالہ ہوں، میں تو تمہیں کچھ نہیں دے سکی۔“
 ”اماں، میں نے تو بھی ایسا نہیں سوچا، میں تو آپ ہی کو اپنی ماں سمجھتی ہوں اور جتنا پیار آپ نے مجھے دیا ہے، سبکی ماں بھی کیا ہی دیتی..... ایسی باتیں مت کرو اماں.....“
 ”نہیں راجہ..... ماں تو ماں ہوتی ہے، اتنے برس ہم ساتھ رہے ہیں، کبھی نہ کبھی، کہیں نہ کہیں تو زیادتی ہوئی ہوگی مجھ سے..... تم مجھے معاف کر دینا..... بیٹی یہ غریب عورت تم دونوں کے لئے کرنا تو بہت کچھ چاہتی تھی..... مگر غریبی آڑے آتی رہی..... میں تم دونوں کو کوئی سکھ نہیں دے سکی۔“
 ”اماں..... اماں پیاری، ایسی باتیں مت کرو۔“ راجہ نے التجا کی۔

”سنو راجہ، عمر بہت روئے گا، یہ صدمہ اسے بہت تڑپائے گا۔ تم اسے اکیلا مت چھوڑنا، اسے حوصلہ دینا، اسے رونے مت دینا، سمجھا دینا یہ دنیا ہے اور یہاں وہ کچھ ہوتا رہتا ہے، جس کے بارے میں ہم کبھی سوچ بھی نہیں سکتے..... تقدیروں کا مالک خدا ہے..... وہ جو بھی لکھ دے ہمیں صبر کرنا ہے، شکر کرنا ہے، تم اُس کو حوصلہ دیتی رہنا۔“

”اماں، مت کریں ایسی باتیں، میرا دل ڈوب رہا ہے۔“ راجہ رونے لگی۔
 ”ابھی سے رو رہی ہو، تو بعد میں حوصلہ کیسے پکڑو گی..... تم عمر کو کس طرح سمجھا سکو گی..... نہ راجہ نہ، رونا نہیں، حالات کیسے بھی ہوں، تم ہمت نہ ہارنا بیٹی.....“

ابھی وہ راجہ کو سمجھا ہی رہی تھیں کہ عمر آ گیا..... راجہ کو روٹے دیکھا تو گھبرا کر ماں کی جانب لپکا۔
 ”اماں، کیا بات ہے، آپ ٹھیک تو ہیں ناں.....؟ راجہ آیا، کیوں رو رہی ہو تم.....؟“
 ”عمر، اماں کو سمجھاؤ، یہ بیماری سے گھبرا گئی ہیں، پتا نہیں کیسی باتیں کر رہی ہیں۔“ راجہ بے حد خوفزدہ تھی۔
 ”اماں.....“ عمر پھر اُدھر متوجہ ہوا۔

”عمر..... طلال..... میرے بیٹے، میرے لال، انسان زندہ رہے یا مر جائے، رشتے نہیں بدلتے، خون کے رشتے قائم ہی رہتے ہیں مگر مجھے یہ دکھ کھائے جا رہا ہے، چھڑنے والی اس گھڑی میں ہر دو دنوں ہیہ کے لئے چھڑ جائیں گے۔ ہمارے درمیان کوئی رشتہ باقی نہیں رہے گا۔“ زیتون کی آنکھوں سے آنسوؤں ٹوٹ کر گر رہے تھے اور تکیہ بھیک رہا تھا۔
 ”اماں، آپ ٹھیک ہو جائیں گی۔“ وہ اس بات کو کیسے سمجھ سکتا تھا..... اپنے ہاتھوں سے آنسو پونچھتے

اُن کا موڈ خوشگوار تھا..... جو یہ یہ کو اس سے مناسب موقع کوئی اور نہیں لگا، سو کہہ دیا۔
 ”اور مجھے اب بتا رہی ہو.....؟“ انہوں نے گلہ کیا۔

”آپ نے کبھی موقع ہی نہیں دیا، میں تو کب سے کہنا چاہ رہی تھی..... مگر ڈر تھا آپ پوری بات سنیں گے ہی نہیں۔“
 ”غریب گھر پر ہے.....؟“

جو یہ یہ نے اثبات میں جواب دیا تو بولے.....

”اُسے بلاؤ، مجھے کچھ باتیں کرنی ہیں اُس کے ساتھ۔“

”پلیز ڈانٹنے کا نہیں.....“

”اوہو، تم بلاؤ تو، میں بلاؤ کیوں ڈانٹنے لگا۔“

جو یہ یہ خود یہ پیغام دینے غریب کے کمرے میں آئیں، وہ کتاب پر سر جھکائے بیٹھا تھا۔

”غریب..... زیبو.....“ وہ بے تابی سے پکارتی ہوئی آگے بڑھیں اور اس کا سر سینے سے لگا کر چوم لیا۔

”کیا ہوا ماما.....؟“ وہ اُن کے خوشی سے تھمتاے چہرے کو حیرت سے دیکھنے لگا۔

”مجھے یقین ہے تمہارے پیا ماں جائیں گے۔“ انہوں نے غریب کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے

کر دے۔

”کیا ماں جائیں گے.....؟“

”اوہو..... تمہاری اور سوہا کی شادی کے بارے میں بات کر رہی ہوں۔ تم سمجھ ہی نہیں رہے۔“ وہ

بے حد خوش تھیں۔

”کیا ہوا.....؟ کچھ کہہ رہے ہیں پاپا.....؟ کیا آپ نے اُن سے بات کر لی ہے.....؟“ وہ کتاب

بند کر کے جلدی جلدی بول رہا تھا۔

”بلا رہے ہیں تمہیں، سنو گھبرا نا نہیں، وہ اس وقت اچھے موڈ میں ہیں اور میں نے سوہا کے بارے

میں انہیں بتا دیا ہے۔“

”اوکے..... ذرا پست تھپتھپائیں..... حوصلہ دیں تاکہ میں بہادری سے اُن کے تند و تیز سوالات کا

مقابلہ کر سکوں۔“

”اچھا اب جاؤ بھی، شوخیال واپسی پر کر لیتا..... ایسا نہ ہو دیر ہو جائے اور اتنی دیر میں اُن کا موڈ بھی

پرانی روش پر آجائے۔“

”اوہو..... ڈرائیو مت بس جا ہی رہا ہوں۔“

”راجہ! عمر کہاں ہے.....؟“ زیتون کو ہاسپٹل سے گھر آئے تیسرا روز تھا اور آج صبح سے حالت

خراب تھی۔

”عمر تو سودا لینے بازار گیا ہے، بس آتا ہی ہوگا..... کیا بات ہے.....؟ اماں! گھبرا کیوں رہی

ہو.....؟ طبیعت تو ٹھیک ہے ناں.....؟“ راجہ ماں کے لئے بہت پریشان تھی۔

”غریب آیا تھا یا نہیں.....؟“ زیتون نے اُس کی بات سنی ان سنی کر کے پوچھا۔

ہوئے تسلی دے رہا تھا۔

”عمر.....“ زیتون نے پھر کچھ کہنا چاہا۔

”بس آپ خاموشی سے لیٹی رہیں۔“

”بس بیٹا، یہ آخری بات ہے، پھر تو ہمیشہ کے لئے چپ ہو جاؤں گی۔“

راجو سسکیاں بھرے لگی اور عمر کا دل بھی بیٹھ گیا۔

”خدا یا رحم کر..... آج ماں ایسی بات کیوں کر رہی ہے۔ مالک! ایک ہی دولت ہے میرے پاس، اسے مجھ سے جد امت کرنا۔“



شاہ جی کو فالج کا ایک ہوا تھا۔ وہ اس وقت بے ہوش تھے۔ ہاسپٹل میں اس وقت زینت اور ڈرائیور ہی موجود تھے۔ ڈرائیور نے غلطی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اُن کی حالت بگڑتی دیکھ کر شہر کا رخ کیا تھا اور انہیں ہاسپٹل پہنچا دیا تھا۔

زینت رو رو کر خدا سے ان کی زندگی کی دُعائیں مانگتی رہی۔ وہ بے حد پریشان تھی۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔ اسے کچھ سمجھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس مشکل گھڑی میں کوئی ایک بھی نام ایسا نہیں تھا جو اپنا لگتا، جسے وہ اطلاع دیتی..... ارد شیر شاہ جی کا اپنا خون، اُن کا اکلوتا بیٹا، اسی شہر میں موجود تھا مگر جو کچھ ہوا تھا اُس کے بعد وہ اُسے بلانے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی، جس طرح کا انتقام اُس نے باپ سے لیا تھا، سوچ کر ہی زینت کی روح تھرا جاتی تھی۔

کوئی اتنا ظالم، اتنا زہر بھرا بھی ہو سکتا ہے، اسے کسی رشتے کا پاس نہیں، غصے میں وہ بالکل اندھا ہو جاتا ہے۔ پھر اب شاہ جی کی جو حالت ہے، یہ بھی اُسی کی وجہ سے ہے، اُس کا انتقام انہیں اس حال تک لے آیا ہے۔ اگر اسے اطلاع دے بھی دی جائے تو شاید وہ یہاں آنا پسند نہ کرے۔“

اُس نے بہت سوچنے کے بعد ڈرائیور سے کہا تھا.....

”وہ شہر میں شاہ جی کی کوشی پر جو ملازم ہیں، ان میں سے دو تین کو یہاں بلا لو، اور سنو، میں تو کچھ بھی نہیں جانتی ہم ہی ڈاکٹروں سے ملو، ان سے پتا کرو، شاہ جی ٹھیک تو ہو جائیں گے نا، انہیں کب تک ہوش آئے گا۔“

”بیگم صاحبہ، ہمیں سائیں کے رشتہ داروں کو بھی اطلاع کر دینی چاہئے۔ وہ پاس ہوں گے تو آپ کو بھی حوصلہ ہوگا اور ڈاکٹر لوگ بھی پھر زیادہ توجہ سے علاج کریں گے۔ مجھے تو کوئی جواب بھی نہیں دے رہا۔“

”باقی عزیز.....“ زینت کا ذہن سخت الجھا ہوا تھا۔ وہ یوں ڈرائیور کی جانب دیکھ رہی تھی جیسے اُس کی بات سمجھ ہی نہیں سکی۔

”میرا مطلب ہے کہ چھوٹے شاہ جی، ٹھیک ہے باپ بیٹے میں تھوڑی اُن بن ہوئی ہے مگر جی وہ خون ہیں شاہ سائیں کا، ان کی بیماری کا سن کر وہ نہیں سکیں گے پورا چلے آئیں گے۔“

”نہیں نہیں، تم کبھی بھول کر بھی ایسا نہیں کرنا، اس بات کو اطلاع ارد شیر کو نہیں ہونی چاہئے۔“ اُس نے صاف انکار کر دیا۔

ڈرائیور کو یہ بات پسند نہیں آئی مگر مالک سے بحث نہیں کر سکتا تھا۔ کچھ دیر کے لئے رُک گیا۔ پھر بولا.....

”اگر حکم ہو تو میں برادری والوں کو بلا لوں۔“

”نہیں نہیں، اُن سے ہمارے بچھڑے چل رہے ہیں، وہ تو سائیں کو اس حالت میں دیکھ کر خوش ہوں گے، میں کسی کو اپنے سائیں پر بننے نہیں دوں گی۔“ زینت کی آنکھیں بار بار بھیگ رہی تھیں۔

”بیگم صاحبہ، پھر میں بڑی بیگم صاحبہ کو تو اطلاع کر دوں۔“

”ہاں، کبریٰ خاتون.....“ زینت کو بھی خیال آیا..... ”انہیں تو فوراً اطلاع کر دینی چاہئے تھی..... وہ اور اُن کی بیٹیاں یہاں ہاسپٹل آجائیں تو یہ اچھا ہوتا۔“

اُس نے اثبات میں سر ہلا دیا..... ڈرائیور اجازت ملتے ہی فون کرنے چل پڑا۔

زینت کا ریڈیو میں ادھر سے ادھر چکر لگاتی رہی۔ نم ٹپکیں صاف کر رہی اور خدا سے شاہ جی کی زندگی کی دُعائیں کرتی رہی۔

اس نے ابھی سے کبریٰ خاتون کی آمد کا انتظار شروع کر دیا۔ اسے یقین تھا، وہ تو سنتے ہی چلی آئیں گی۔ وہ نہیں جانتی تھی کبریٰ خاتون آج کل کس الجھن میں گرفتار ہیں..... پچھتاوؤں نے انہیں بیمار کر ڈالا ہے۔ وہ خود سے بار بار ایک ہی سوال کرتی ہیں۔

”ارد شیر سے میں نے جو کچھ کہا تھا، کیا وہ سچ ہے.....؟ کیا میں واقعی اس سے محبت نہیں کرتی.....؟“

اور ہر بار جواب انہیں حیران کر دیتا۔

دل کہتا تھا..... انہیں اس سے محبت ہے، اس کو ناراض کر کے اب انہیں کسی پل چین نہیں، بہت بے قرار ہیں وہ.....

”ف، کتنی بڑی غلطی ہو گئی مجھ سے، میں اپنے دل کی بات بھی نہ سمجھ سکی۔ پتا نہیں وہ کس حال میں ہوگا..... اُسے تو ہمیشہ ناز اٹھوانے کی عادت ڈالی گئی تھی۔ یہ ہم نے کیا کر دیا لاڈلے کے ساتھ..... کیسے سہ پائے وہ ہمارے رویے کی بدصورتی کو۔“

جب میں نے اپنی نفرت عیاں کی تو اُس کی آنکھوں میں حیرت اور بے یقینی تھی۔ قدموں کی دھمک سے دھرتی ہلا دینے والا نوجوان اُس روز پاؤں پر کھڑا نہیں رہ سکا۔ لٹا پٹا تھا کاہار، وہ بہت تنہا، بے حد گھبرانے بیٹھ گیا تھا..... مگر میرا پتھر دل نہیں پسچا۔ اُس کی التجا کرتی آنکھوں پر میں نے مسخرانہ نظر ڈالی تھی۔ میں نے نفرتوں کا زہر اس کے وجود پر انڈیل دیا تھا اور ایک شان سے چلی آئی تھی۔

اب اُس دل میں جہاں کبھی میرا احترام تھا، محبت تھی، قدر اور عزت تھی، اب وہاں کیا ہوگا.....؟

شاید میرے لئے بے اندازہ نفرت، اُن آنکھوں میں جہاں میرے لئے محبت کی نرم گرم جگہاٹ تھی، اب وجود کے آ پار ہونے والی سرد مہری ہوگی۔

وہ تو میری صورت بھی دیکھنے کا روادار نہ ہوگا اور میں مستحق بھی تو اسی سلوک کی ہوں، جو بویا ہے دبی کانٹے کو ملے گا۔

میں اُس کے پاس ضرور جاؤں گی، میں ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ لوں گی۔ میں آنسوؤں کے ساتھ فریاد کروں گی، میں اسے کہوں گی۔

”ارد شیر، لاڈلے، میں نے تو خود اپنے بارے میں ہی غلط اندازہ لگایا تھا..... میں تو اپنے دل کو ہی نہیں پہچانتی تھی..... میرا یقین کر لو، یہ دل تو تمہاری ہی یادوں کا مسکن بننے لگا ہے۔ تمہاری آنکھ میں آنسو کیا

ڈھلے چاند دل کے پار.....O.....368

آئے، یہاں طوفان اُٹھ آیا۔ میرے ہر طرف تم ہو..... ارد شیر، تم میرا بھی تو خواب تھے مگر تعبیر کسی اور کی لیکن دل نہیں مان رہا۔ وہ کہتا ہے، تم میرے تھے، میرے رہو گے۔“

انہوں نے کام کرنے والی لڑکی کو بلایا اور کہا.....

”ڈرائیور سے کہو گاڑی نکالے..... مجھے فوراً شہر جانا ہے اپنے بیٹے کے پاس.....“

”خیر تو ہے ناں جی.....؟“ اُن کی غلٹ اور ستا ہوا چہرہ اسے پوچھنے پر مجبور کر گیا۔

”ہاں خیر ہے، بس تم جاؤ۔“

انہوں نے کپکپاتے ہاتھوں سے اپنی آف وائٹ چادر جس کے کناروں پر ریشمی کڑھائی کی مٹی تھی، اوڑھی اور جونہی گاڑی تیار ہونے کی اطلاع ملی، باہر آ گئیں۔

اُن کے جانے کے تھوڑی دیر بعد ہی شاہ جی کی بیماری کی اطلاع بذریعہ فون موصول ہوئی۔ اُس وقت شیریں اور اُس کا شوہر ساتھ کے گاؤں میں کسی کے ہاں گئے ہوئے تھے۔ ملازم نے فون اینڈ کیا اور اُن کا پیغام پہنچانے کو کہہ دیا۔

♦ ♦ ♦

ارد شیر نے جو کچھ اُس پر بتی تھی، وہ سب آذ کو سنادی مگر اپنا جرم کہہ نہیں سکا، کوشش کی مگر لب کپکا کر رہ گئے۔ آذ یہ سب سن کر اس کے لئے افسردہ نظر آتا تھا، اُسے تسلی دینے کے لئے بار بار کہتا۔

”تم فکر کیوں کرتے ہو.....؟ باپ بیٹے سے زیادہ دیر ناراض نہیں رہ سکتا..... وہ ضرور تمہیں منانے آئیں گے، اُن سب کو اپنی غلطی کا احساس ضرور ہوگا۔“

جواب میں ارد شیر خاموش تھا اور اس سے نظر نہ اٹھاتا۔

”تم پھر سے زندگی کی طرف آؤ..... میں تمہارے ساتھ ہوں..... تم جس طرح بھی چاہو میری محبت کی آزمائش کر سکتے ہو.....“

”آذ، اب جب کہ مجھ کو نفرت کا لبادہ اوڑھتے خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے، تب بھی مجھے تمہاری محبت پر یقین ہے، مجھے تم جیسے دوست پُر خیر ہے۔“

ارد شیر کی بات پر ڈھیروں سکون آذ کے دل میں اتر گیا۔ وہ اُس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولا.....

”تو پھر سمجھ لو میرے پیارے کہ میری دوستی تمہیں پھر سے زندگی کی طرف لے آئے گی۔ یہ اعتبار تمہیں پھر سے زندہ دل بنا دے گا۔“

آذ کے جانے کے بعد ارد شیر بے مقصد ادھر ادھر، کبھی لان میں، کبھی کمرے میں پھرتا رہا۔ کچھ دیر ٹیکس پر کھڑے رہنے کے بعد وہ تھک کر اپنے کمرے میں آ بیٹھا.....

وہ مضطرب سا آنکھیں موندے کر سی پر بیٹھا تھا اور دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے پیشانی مسل رہا تھا۔ شاہ اندر داخل ہوا، ہولے سے پکارا مگر وہ یونہی بیٹھا رہا۔

”صاحب.....“ اب کے وہ ذرا قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ ارد شیر نے آنکھیں کھولیں، اُس کی جانب سوالیہ انداز میں دیکھنے لگا۔

”صاحب..... مہمان آئے ہیں.....“

”مجھے کسی سے نہیں ملنا، جو بھی ہے کہہ دو صاحب سو رہے ہیں، طبیعت ٹھیک نہیں ہے اُن کی.....“

ڈھلے چاند دل کے پار.....O.....369

انتا کہہ کر اُس نے پھر آنکھیں موند لیں اور انگلیوں سے پیشانی مسلتے لگا۔

”صاحب..... دگاؤں سے.....“

”دگاؤں سے.....“ اُسے جھٹکا سا لگا۔ ”کون آیا ہے وہاں سے، کون آ سکتا ہے.....؟“ اُس نے

یہ بات بھی پوری نہیں ہونے دی۔

”صاحب، دگاؤں سے بڑی ماں تشریف لائی ہیں۔“ شادے نے بات مکمل کی اور اُس کی جانب

ماکاب کیا غم ہے.....؟“

ارد شیر کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا اور نچلاب دانتوں تلے دبا کر اُس نے جیسے مدد طلب نظروں سے

یہ کی طرف دیکھا۔ بڑی ماں کی آمد کی اطلاع اس کے تمام احساسات فہم کر گئی تھی۔

”انہیں بلا لوں.....؟“ شادے نے پوچھا۔

اُس نے گہرا سانس کھینچ کر سر اثبات میں ہلا دیا اور دروازے کی جانب پشت کر کے کھڑا ہو گیا۔

کبریٰ نے کمرے کا دروازہ کھولا اور وہیں رُک کر اندر کا جائزہ لیا..... وہ بائیں طرف کھڑا تھا اور

ناجانب پشت تھی، ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے اور ہاتھوں میں ہلکی سی جنبش تھی۔

”ارد شیر.....“ اب وہ ذرا آگے بڑھیں اور بڑی ہمت سے کام لے کر کاپٹی آواز میں اُسے پکارا۔

ہاتھوں کی جنبش بڑھ گئی۔ اُس نے دائیں ہاتھ میں بائیں کو مضبوطی سے پکڑا مگر اب بھی پلٹ کر نہیں دیکھا۔ اُس کی خاموشی نے کبریٰ کا حوصلہ پست کر دیا۔ وہ ذرا دیر کے لئے خاموش کھڑی رہیں

اپنی ہوئی آواز میں دوبارہ اُس کا نام لیا اور جواب نہ ملنے کے باوجود بولیں.....

”یوں منہ نہ موڑ مجھ سے، ایسا رویہ مت رکھو، میری بات سن لو، تم نہیں جانتے، یہ دن تمہاری بڑی

ماننے کیسے گزارے ہیں..... میں تو اپنے دل سے بھی واقف نہیں تھی۔ میں نہیں جانتی تھی، تم سے نفرت

میں، محبت ہے مجھے مگر اب مجھے، میرے دل نے بتا دیا ہے ارد شیر، تم میرے ہو، صرف میرے، شاہ جی کا

پروا کوئی حق نہیں ہے، تم پر صرف میں حق رکھتی ہوں..... اور سنو تم جتنا بھی انجان بن جاؤ مجھ سے منہ

ڈٹے کھڑے رہو، میں یہ حق جتنا ہی رہوں گی۔“ وہ رونے لگیں اور اُن سے رُخ موڑے کھڑا ارد شیر

بلکی شدت سے ہونٹ کاٹ رہا تھا۔

”پاؤ کرو اور شیر، تم نے ایک بار کہا تھا مجھ سے، ”بڑی ماں یہ میرا وعدہ ہے، زندگی کا کوئی بھی موڑ ہو،

پ جو بھی مانگیں گی، میں دوں گا، چاہے وہ میری جان ہی کیوں نہ ہو۔ آپ کا بیٹا، آپ کو کبھی مایوس نہیں

کرتا گا۔“ ذرا توقف کے بعد وہ پھر بولیں.....

”جانتی ہوں تمہارے دل میں میرے لئے بہت غصہ ہے، تم ناراض ہو مجھ سے مگر میں یہ بھی سوچ

رہی ہوں، اگر بیٹے کو ممانے کے لئے ماں کو اس کے سامنے ہاتھ بھی جوڑنا پڑے تو اس سے بھی گریز

نہیں کروں گی۔ آج بڑی ماں تم سے تمہاری وہ بیعت مانگنے آئی ہے ارد شیر جو تمہیں مجھ سے ہوا کرتی تھی۔

”مگر، مرد وعدے سے پھر نہیں کرتے۔“

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں.....

وہ پھر بھی نہیں پلٹا.....

♦ ♦ ♦

ہے۔ خدا کے لئے تم لوٹ آؤ۔۔۔۔۔ وہ بہت شدت سے رونے لگیں۔
اردشیر نے۔۔۔۔۔ جھک کر اٹھا کر ان کی جانب دیکھا اور گہری سانس کھینچ کر بولا۔
”میں پچھتاوے کی شدت سے واقف ہوں، میں اچھی طرح جانتا ہوں، اس آگ کی شدت پتھر کو
بھی توڑ کر رکھ دیتی ہے، آج کل میں بھی تو اسی آگ میں جل رہا ہوں۔“
”پچھتاوے کی آگ میں۔۔۔۔۔ مگر کیوں، تمہارا بھلا کیا قصور ہے، تم تو بے قصور ہو میرے لال۔۔۔۔۔“
”آپ کا لال تو کبھی کا مرچکا ہے۔۔۔۔۔ وہ ننھا بچہ جو آپ کو دیکھ دیکھ کر جیتا تھا، جسے تمام دنیا میں اپنی
بڑی ماں جیسی باوقار، باوفا اور محبت کرنے والی، سستی اور کوئی لگتی ہی نہیں تھی، وہ تو مرچکا ہے، حیرت ہے،
آپ کو پتا ہی نہیں چلا۔۔۔۔۔“

”وہ نہیں مر سکتا۔۔۔۔۔“ کبریٰ سر اٹھ کر کے پہلی بار یقین اور اٹل انداز میں بولیں۔

وہ اُن کے اس انداز پر استہزائیہ انداز میں ہنسا پھر زور دے کر بولا۔۔۔۔۔

”وہ واقعی مر چکا ہے، آپ شاید یہ نہیں جانتیں کہ بیمار کرنے والوں کی ذرا سی نفرت بھی وجوہ ہلا
دینے کو کافی ہوتی ہے، وہ بھی جھلس گیا ہے۔ آپ نے مان توڑا تو وہ بچ نہ سکا، اُس کا وجود ٹوٹ پھوٹ
گیا۔۔۔۔۔ وہ بڑے بڑے ہو گیا۔۔۔۔۔“

وہ ٹھٹھکیں، ٹکیں اور پھر آہستگی سے بولیں۔۔۔۔۔

”ہاں، میں واقعی نہیں جانتی تھی مگر آج تمہاری آنکھوں میں جو نفرت ہے میرے لئے، یہ واقعی مجھے
جھلسا رہی ہے۔“

”یہ نفرت۔۔۔۔۔“ وہ جیسے حیران ہوا تھا۔ ”نہیں نہیں، یہ تو وہ نفرت نہیں ہے، آہ آپ اس شدت کو
کیسے محسوس کر سکتی ہیں، کون ہوگا جو آپ کی طرح سفاکی سے قتل کر سکے گا، آپ واقعی دلیر عورت ہیں۔“
اردشیر، اب بس کرو۔۔۔۔۔ میری آنکھوں میں جھانک بیٹھے، دیکھو۔۔۔۔۔ محبت کو جو تمہارے لئے اب بھی
میرے دل میں ٹھانٹیں مار رہی ہے۔“

”آپ کھڑی کیوں ہیں۔۔۔۔۔ بیٹھ جائیے۔“ وہ جیسے بت ٹال کر خود صوفے پر بیٹھ گیا اور
بولا۔۔۔۔۔

”بڑا امان تھا۔۔۔۔۔“ پھر زور دے کر کہا۔ ”اور بڑا امان ہے مجھے اپنی ذات پر میں جانتا ہوں،
بھولنے والی نظر انداز کر دینے والی شخصیت نہیں ہوں میں۔ آپ کو سب کو بلٹ کر تو آتا ہی تھا پشیمان اور
لئے پٹے۔۔۔۔۔ اور میں نے سوچا تھا، سب کو معاف کر دوں گا، سو میں آپ کو معاف کرتا ہوں اور خوش ہو
جائیے کہ وہ سب جو مجھے چھوڑ گئے تھے، ان سب میں پہلے پلٹنے والی آپ ہیں۔“ اُس کا انداز شاہانہ تھا،
غور اور بے گامگی سے بڑے۔

”اردشیر۔۔۔۔۔ صرف معافی نہیں، مجھے تو وہی محبت چاہئے۔۔۔۔۔ اور تم یہ بھی ذہن میں رکھو، بڑی ضدی
ہوں میں جو مانگ رہی ہوں، لے کر بھی جاؤں گی، تمہیں اپنا وعدہ تو نبھانا پڑے گا۔“

اردشیر نے گہری سانس لے کر کہا۔۔۔۔۔

”مجھے تو سب یاد ہے، اپنا وعدہ بھی نہیں بھولا میں۔۔۔۔۔ مگر کہاں سے دوں وہ شے جو اب میرے
پاس ہے ہی نہیں۔۔۔۔۔ اُس روز جب میں آخری بار آپ کے پاس آیا تھا ناں تو وہیں کہیں یہ چیز بھی گر گئی

”ماں تو صرف ایک ہوتی ہے، نہ بڑی ماں، نہ چھوٹی ماں۔۔۔۔۔ آپ کس بڑی ماں کی بات کر رہے
ہیں۔۔۔۔۔؟“ اردشیر نے پشت سے ہاتھ ہٹا کر سینے پر لپیٹ لئے، لہجہ جتانے والا اور شکوہ آمیز تھا۔ آواز میں
دُکھ سے زیادہ انہیں غصہ محسوس ہوا۔

”اردشیر۔۔۔۔۔“ وہ آنسوؤں کی دُھند میں آگے بڑھیں اور اس کے ساتھ لپٹ گئیں۔ اُن کے رونے
میں اور شدت آگئی۔

اردشیر آنکھوں میں کرب لئے مگر ہونٹ بھیٹتے نہیں۔۔۔۔۔ بغیر چھوئے ساکت کھڑا رہا۔۔۔۔۔ پھر کچھ دم
بعد کندھوں پر ہاتھ رکھ کر خود سے الگ کیا اور آہ بھر کر ٹھٹھکیں مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔۔۔۔۔

”گیا وقت لوٹ کر نہیں آتا۔۔۔۔۔ ماں یادیں چھوڑ جاتا ہے۔۔۔۔۔ آوازیں چھپا کرتی ہیں۔۔۔۔۔ آپ
ہم نہ بھی سننا چاہیں مگر ہمیں سنی پڑتی ہیں مگر حقیقت تو حقیقت ہوتی ہے۔ آنسوؤں سے خیر مت نہیں
سکتی۔۔۔۔۔ جو آپ نے کہا تھا، وہ میرے دل پر نقش ہو چکا ہے۔“

”ایسی باتیں مت کرو۔۔۔۔۔ مجھے معاف کر دو۔۔۔۔۔ میرا یقین کرو۔۔۔۔۔ میں وہی بڑی ماں ہوں جن کی
محبت پر تمہیں مان تھا۔۔۔۔۔“

”آپ بیٹھے، پانی پی لیں اور پلیز آنسو پونچھ لیں۔“ اُس کا انداز اور لہجہ وہ نہیں تھا جس کی کبریٰ
عادی تھیں۔ بے شک گزری ساعتوں کا دُکھ اُسے بھی تھا مگر ایک ٹھنڈک اور بے گامگی اُس کے ہر انداز میں
تھی۔ وہی بے گامگی جو کبریٰ کے وجود کو کاٹ ڈالتی تھی۔۔۔۔۔ ہاتھ جو کبریٰ کو شانوں سے تھامے ہوئے تھے۔
آنکھیں جو ان کے وجود پر تھیں اور لہجہ جو ان ہی کے لئے تھا، بے گامگی۔۔۔۔۔ شدید بے گامگی۔۔۔۔۔
”اردشیر، تم جو بھی کہو مگر میں تمہیں منائے بغیر واپس نہیں جاؤں گی۔“ انہوں نے پھر اسے
منانے کی کوشش کی۔۔۔۔۔

اُس نے سردی نگاہ ان پر ڈالی، شانوں پر سے اپنے ہاتھ ہٹا کر کچھ دُور جا کھڑا ہوا اور بولا۔۔۔۔۔
”مجھے اب آپ سے کچھ نہیں کہنا۔۔۔۔۔ اور پلیز آپ بھی کچھ مت کہیں کہ میرے پاس آپ کے لئے
کچھ نہیں رہا اور آپ کے تمام حرف معنی کھو چکے ہیں۔“

”نہیں میرے حرف بامعنی ہیں۔۔۔۔۔ میں جو کہہ رہی ہوں یہی سچ ہے۔۔۔۔۔ اردشیر! تمہارے آنے
کے بعد مجھے احساس ہوا، میں تو اُدھوری رہ گئی ہوں۔۔۔۔۔ میرا دل میرے سینے میں نہیں رہا۔۔۔۔۔ یقین مانو
راتوں کو سو نہیں سکتی، مجھے دن میں چین نہیں آتا۔۔۔۔۔ تم مجھ سے ناراض ہو، یہ احساس رُوح کو چھلنی کر دیتا

میں کچھ نہ تھا، بس وہ میزبانی نبھانے کو کہہ رہا تھا۔
وہ ہاں یا نہ کچھ نہیں کہہ سکیں..... ارد شیر نے کچھ دیر جواب کا انتظار کیا۔ پھر اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے

بولا.....

”اگر آپ یہاں ٹھہرنا چاہیں تو ملازم سے کہہ کر اپنا کمرہ سیٹ کروالیں..... میں جلدی میں ہوں، مجھے آذر کی طرف جانا ہے۔ شاید وہ ابھی دیر میں ہو۔“
وہ سر جھکائے خاموش بیٹھی رہیں تو وہ باہر نکل گیا۔

کبریٰ نے چہرہ اودنوں ہاتھوں میں چھپالیا اور سسکیاں لینے لگیں۔
فون کی تیل مسلسل ہو رہی تھی، انہیں اٹھنا پڑا۔ خیال تو یہی تھا کہ ارد شیر کے لئے فون ہوگا مگر ادھر شیریں بات کر رہی تھی۔

”آپ یوں اچانک شہر چلی گئیں امی.....؟“

”ہاں، ارد شیر کے گھر آئی ہوں.....“ وہ خود پر قابو پا کر آہستگی سے بولیں۔

آپ کو علم ہو چکا ہوگا، بابا سخت بیمار ہیں اور ہسپتال میں ہیں۔“

”کون..... شاہجی.....؟“ انہیں جھٹکا لگا۔

تو کیا ارد شیر نے نہیں بتایا آپ کو، اُس کو یقیناً خبر ہوگی..... میں نے تو یہاں فون آپ کو یہ بتانے کے لئے کیا تھا کہ ہم لوگ بھی شہر آرہے ہیں، سیدھے ہسپتال ہی جائیں گے۔“

”ارد شیر کو تو شاہجی کی بیماری کے بارے میں کچھ علم نہیں، وہ تو اپنے دوست آذر کی طرف گیا ہے۔“

”اچھا..... تو پھر ضرور یہ سازش زینت کی ہے، وہ نہیں چاہ رہی ہوگی کہ بابا کی بیماری کے دوران ارد شیر یا ہم میں سے کوئی اُن کے قریب ہو..... یقیناً ہم لوگوں کو بھی بابا کے ملازموں نے اپنے طور پر اطلاع دے دی ہوگی۔“

”کون سے ہسپتال میں ہیں وہ.....؟“ کبریٰ نے فکر مندی کے عالم میں پوچھا..... جواب میں شیریں نے ایڈریس لکھوایا اور بولی.....

”ہم لوگ بھی بس اب نکل ہی رہے ہیں۔“

فون اٹھینڈ کرنے کے بعد کبریٰ نے شادے کو بلایا اور کہا.....

”ارد شیر اس وقت آذر کی طرف گیا ہے، تم اسے فون پر شاہجی کی بیماری کی اطلاع دے دو اور میں بھی ہسپتال ہی جا رہی ہوں۔“

شادے نے صرف اثبات میں سر ہلادیا۔

یہ نہیں بتا سکا باپ بننے میں سخت جھگڑا ہوا ہے، وہ شاید ہسپتال نہ جائیں۔

ارد شیر آذر کے آفس آیا تھا۔ وہ اپنی اور بڑی ماں کی ملاقات کا ذکر اس سے کرنا چاہتا تھا کہ دل پر بوجھ سا آ پڑا تھا..... جب سب کچھ ختم ہو چکا ہے، پھر وہ کیوں چلی آئی ہیں.....؟ مجھے ڈنرب کیوں کرنی ہیں.....؟ بڑی مشکل سے سمیٹا ہے میں نے خود کو، اب ایک بار پھر وہ سامنے آ کھڑی ہوئی ہیں۔ اس پر غصہ، جھلاہٹ اور بے بسی کی کیفیت طاری تھی۔

تھی..... میں سمجھتا ہوں، مٹی میں ل گئی ہے، اب لاکھ تلاش کریں، بے کاری ہوگا۔“

”نہیں تم جھوٹ بولتے ہو، وہ محبت اب بھی تمہارے پاس ہے..... تمہارے دل کے کسی کونے میں سگری سٹی بیٹھی ہے.....“

اُس نے نفی میں سر ہلایا اور بولا.....

”نہیں نہیں، آپ کو غلط فہمی ہو رہی ہے، ایسا بالکل نہیں ہے۔“

”تم جھوٹ بولتے ہو۔“ وہ آگے بڑھیں..... اور اُس کے بازو پر سختی سے اپنا ہاتھ جمادیا۔

”مت جھوٹ بولو..... مت انجان بنو ارد شیر، بھلا مجھ سے زیادہ تمہیں کون جانتا ہے، تم میرے وجود کا حصہ نہیں ہو مگر میرا خواب ہو، میرا مان ہو، تم وہی ہو جس کی چاہت بے لوث ہے، تم تو میرے جھوٹ پر بھی آنکھیں بند کر کے اعتبار کر لیا کرتے تھے۔ آج سچ کہہ رہی ہوں تو یقین کیوں نہیں کر رہے۔“
وہ اس کے بازو پر چہرہ اٹکا کر بے بسی سے رونے لگیں۔

ارد شیر کو افسوس ہو رہا تھا..... بڑی ماں آج کس رُوپ میں سامنے آئی تھیں۔ وہ تو حکم دیا کرتی تھیں..... وہ تو ہر حالت میں اپنی بات منوایا کرتی تھیں..... کتنی بادقار اور مضبوط تھیں بڑی ماں، وہ تو مالکن تھیں..... آج کیسے بلک رہی تھیں، کتنی شکستہ اور رنجور تھیں وہ..... مگر ارد شیر بھلا کیا کر سکتا تھا..... وہ تو خود بڑا بے بس تھا، جو کچھ وہ طلب کر رہی تھیں، اُس کے پاس تھا ہی نہیں۔

اُس نے جھوٹ نہیں بولا تھا، واقعی محبت گم ہوئی تھی (یا مر گئی تھی) مگر کبریٰ یقین کرنے کو تیار ہی نہیں تھیں۔ بچوں کی طرح ضد کر رہی تھیں۔

”آپ کے جھوٹ پر اعتبار تو اس لئے کر لیا کرتا تھا کہ تب میں بڑا ہو جانے کے باوجود آپ کے سامنے خود کو بچہ تصور کرتا تھا جسے آپ کی محبت پر اندھا اعتماد تھا لیکن آپ ماں لیں میری بات، میں وہ بچہ نہیں رہا، میں اب ایک دم بڑا ہو گیا ہوں۔ جوان مرد جو اپنے وجود سے چھاؤں بنتا ہے، کسی اور کی چھاؤں میں بیٹھنا پسند نہیں کرتا۔ اگر آپ اس سائے میں بیٹھنا چاہتی ہیں تو بعد شوق مگر پلیز اسے بچے کو تلاش مت کریں جس کے لئے آپ کا وجود گھنا سا یا تھا۔ یہ بے کار ہے۔“

کبریٰ نے اُس کے بازو پر ٹکاپ کر اٹھا کر آنسوؤں سے بھری آنکھوں سے اس کے چہرے کی جانب دیکھا اور اتنے قریب سے اُس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے آخر کار انہیں یہ اندازہ ہو ہی گیا۔ واقعی وہ تو بے کار ضد کر رہی تھیں۔ ارد شیر سچا تھا..... اب وہاں ایک بچے کی بے لوث معصوم چاہت نہیں تھی، اُن آنکھوں میں اندھا اعتماد بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ تو جوان بیٹے کی آنکھیں بھی نہیں تھیں کہ احترام اور محبت کے جذبات کی جھلک دکھائی دے جاوی۔

وہ ایک مرد کی آنکھیں تھیں جو اُن کے لئے بے گناہ تھا، نہ سمجھ میں آنے والے نانا نوس سے رنگ تھے، یہاں، یوں لگا چہرہ اپنے ارد شیر کا ہے مگر رُوح کوئی اور ہے..... ہائے جذ بے بدل چکے ہیں..... ان بدلتے جذبوں نے صدیوں کے فاصلے حاصل کر دیئے ہیں۔

”اُف..... یہ کیا کر بیٹھی ہوں میں.....“ اب پچھتاوا شدید پچھتاوا تھا..... انہوں نے اس کے بازو پر رکھے ہاتھ بھی ہٹانے اور سر جھکا کر خاموش ہو کر بیٹھ گئیں۔

”آپ بہت تھکی ہوئی دکھائی دے رہی ہیں، چائے منگوواؤں آپ کے لئے.....؟“ لب دلچہ

ڈھلے چاندول کے پار..... 374

وہ آذر کے آفس آیا تو وہاں سوہا موجود تھی۔ اسکا کئی بلیوسٹ میں کھڑی کھڑی سی وہ لڑکی بڑے اعتماد اور خوبصورت لہجے میں آذر سے بات کر رہی تھی مگر جوئی ارد شیر کو آتے دیکھا، چونک گئی اور بات لیوں میں رہ گئی۔ آذر نے سوہا کے انداز محسوس تو کیا مگر ارد شیر سے بولا.....

”آؤ..... اچھے وقت پر آئے ہو، میں سوچ رہا تھا۔ آفس سے اُنھ کر تمہاری ہی طرف جاؤں گا۔“
سوہا اُنھ کھڑی ہوئی اور بولی..... ”میں چلتی ہوں۔“

”ارے بیٹھو سوہا.....“ آذر نے روکا تو اس نے شاکی نظروں سے آذر کی جانب دیکھا کہ سب جانتا ہے پھر بھی رُکنے کو کہہ رہا ہے جب کہ اتنی دیر میں ارد شیر تھکے تھکے انداز میں دونوں میں سے کسی کی طرف دیکھے بغیر سر جھکا کر بیڑا سا کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔

”ارد شیر کیسے آئے؟“ آذر نے پوچھا۔

اس نے جواب میں کچھ نہیں کہا..... ایسے ہی بیٹھا میز کی سطح پر اُنکی پھیرتا رہا۔ سوہا نے اچھتی سی نگاہ اُس پر ڈالی تو حیران ہوئی۔

”ارے کیا یہ وہی ارد شیر شاہ ہے جس کی آنکھوں میں غرور کی واضح تحریر اور لہجے میں رعونت ہوا کرتی تھی جو اپنے سامنے کسی کو گردانتا ہی نہ تھا جس کا لباس بے شکن اور چہرہ ہلکی سرخی اور بہت چمک لئے ہوتا تھا۔“

کیا جیتتا ہے اُس پر.....؟“ وہ ٹھنک گئی تھی۔

”چائے پیو گے ارد شیر.....؟“ آذر اُس کی چپ سے فکر مند دکھائی دیتا تھا۔ اُس کی توجہ سوہا کی جانب سے ہٹ چکی تھی۔ سوہا نے اب مزید یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں سمجھا اور اُنھ کھڑی ہوئی۔ یہ کہہ کر کہ ”میں پھر آ جاؤں گی۔“

”ڈرگنی ہے تم سے.....“ آذر نے اُس کے جانے کے بعد جتایا۔

”چلو کوئی تو ہے جواب بھی ڈرتا ہے مجھ سے.....“ وہ پھینکی سی ہنسی ہنس کر اپنا ہی مذاق اڑا رہا تھا۔ پھر فوراً اُنھ کھڑا ہوا..... اور بولا.....

”تم اسے بلاؤ، میں چلتا ہوں۔“

”اوہو ارد شیر، رُکو تو.....“

آذر نے روکنا چاہا مگر وہ رُکا نہیں..... آذر کو پیچھے آنا پڑا..... کار میڈور میں انہیں شادا تیز قدموں سے ادھر ہی آتا دکھائی دیا..... جوئی اُس کی نظر ارد شیر پر پڑی۔ تقریباً دوڑتا ہوا، اُس تک آیا اور بولا.....

”صاحب..... شاہ صاحب کی طبیعت بہت خراب ہے۔ وہ ہسپتال میں ہیں..... بیگم صاحبہ نے کہا تھا، فون پر اطلاع کر دوں۔ میں نے سوچا آپ کی تو اپنی طبیعت ٹھیک نہیں، میں ساتھ چلوں تو بہتر ہے۔“

”بابا کی طبیعت اچھی نہیں.....!“ ارد شیر کے تو پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ پہلا خیال ذہن میں بھی آیا وہ اُس کی اس حرکت کی وجہ سے یار پڑے ہیں اگر انہیں کچھ ہو گیا تو اس کا ذمہ دار وہ ہوگا۔

”اللہ اپنا فضل کرے گا وہ ٹھیک ہو جائیں گے۔“ آذر نے تسلی دی۔

”مجھے بابا جان کے پاس لے چلو.....“ وہ بہت ڈسٹرب تھا۔

”ہاں میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں.....“

ڈھلے چاندول کے پار..... 375

آذر نے کہا تو ارد شیر نے نفی میں سر ہلا دیا۔
”وہ لڑکی تم سے ملنے آئی تھی، ممکن ہے اسے تم سے کوئی ضروری کام ہو، تم اسے بلاؤ، میں شادے کے ساتھ جا رہا ہوں.....“

اتنا کہہ کر وہ تیز قدموں سے چلا گیا۔

ہاسپٹل میں وہ کمرٹی سے پہلے پہنچ گیا۔ پرائیویٹ روم میں زینت، شاہ جی کے پاس موجود تھی جب یلازم اسے کمرے کے باہر لے گئے۔

شاہ جی کو آسجین لگی ہوئی تھی، زینت بے حد پریشان اور خوفزدہ..... ایک بک انہیں دیکھ رہی تھی۔ وہی کمرے میں آیا ہے، اسے پتا ہی نہ چل سکا۔

”کیا ہوا ہے بابا جان کو.....؟“ ارد شیر کی آواز پر وہ گھبرا کر پٹلی اور جب نظر اس پر پڑی تو چہرے پر رُف کے سائے رنگ گئے۔

”کب سے یہ حالت ہے ان کی، ڈاکٹر کیا کہتے ہیں.....؟“ وہ فکر مندی کے عالم میں سوال کر رہا تھا۔

زینت نے اُس کی جانب سے چہرہ اموز کرنا ہستہ سے بتایا۔

”فانج کا ایک ہے۔“

”اوہ.....“ ارد شیر نے بے بس بڑے باپ کو بے حد رنج کے عالم میں دیکھا..... کچھ دیر کے لئے ہل نہیں سکا۔ اُن کے بیڈ کے قریب آ کر چپ چاپ انہیں دیکھتا رہا۔ پھر خاموشی کے ساتھ کمرے سے باہر چلا گیا۔

ڈرائیور بتانے لگا..... ”اس رات گاؤں جاتے ہوئے راستے میں اُن کی طبیعت خراب ہو گئی تھی..... میں انہیں واپس شہر لے آیا..... یہاں ہاسپٹل آئے تو ڈاکٹروں نے انہیں ادھر ہی روک لیا۔ کبھی کبھی ہوش میں آتے ہی سخت تکلیف محسوس کرتے ہیں۔“

”ڈاکٹر کیا کہتے ہیں.....؟“ ارد شیر کو اپنا دم گھٹنا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

”پتا نہیں صاحب جی، ہمیں تو کوئی کچھ بتاتا ہی نہیں..... اب آپ آگئے ہیں، خود ہی پوچھ لو۔“

وہ سر اثبات میں ہلا کر آنے والے لمحوں سے خوفزدہ ڈاکٹر سے تفصیل پوچھنے چلا گیا۔

فانج سے دائیں ٹانگ اور بازو پر اترتا ہوا بولنے میں بھی شدید دقت تھی مگر ڈاکٹر تفصیل سے آگاہ کرنے کے ساتھ ساتھ سلی بھی دے رہا تھا۔

ارد شیر کو قرا نہیں تھا.....

”میرے بابا جان کب تک ہوش میں آجائیں گے، پلیز آپ لوگ کچھ کیجئے۔“

باپ سے آخری ملاقات کا منظر اُس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔

وہ ناراض تھے۔

ڈاکٹر کا کہنا تھا، ان کا بی بی بہت ہائی ہو گیا تھا..... ڈاکٹر تو وجہ نہیں جانتے تھے مگر اسے خوب اچھی طرح علم تھا۔

سارا قصور ہی میرا ہے۔

وہ جب واپس شاہ جی کے کمرے میں آیا تو زینت اُن کے بیڈ کے قریب کھڑی آنسو پونچھ رہی تھی۔

ارد شیر خاموش کھڑا نہیں دیکھتا رہا۔ زینت کی ادھر پشت تھی۔ وہ اس کی آمد سے یکسر سب سے غمگین ہو گیا۔ کچھ بولیں، تب وہ مزوی اور ایک طرف ہٹ گئی۔

”ہائے میرے شاہ سائیں.....“ جسد کو اس حالت میں دیکھ کر خود پر قابو نہ رہا، وہ رونے لگیں۔ ارد شیر کی پیشانی پر شکنیں ابھریں، ان کا یوں رونے اسے سخت برا لگا، جی چاہا کہہ دے.....

”اصل تصور وار تو آپ ہیں..... یہ سارا کھیل آپ کا چایا ہوا ہے۔ آپ کے انتقام نے ہم سب آج یہ دن دکھایا ہے، اب کیوں رو رہی ہیں.....؟ خوش ہو جائیے آپ کی مراد پوری ہو رہی ہے۔“ اسے ان کے آنسو سب دکھاوا لگ رہے تھے۔ وہ ان دونوں سے ہٹ کر یوں کھڑا تھا جیسے ان سے کوئی تعلق ہی نہ ہو۔ ان کی آمد سے پہلے تک وہ خود سے شرمسار تھا، مجرم تصور کرتا تھا خود کو۔ اب کبریٰ کے آجانے سے یہ احساس جرم کم ہو گیا۔ اسے اب کبریٰ ہی اصل مجرم دکھائی دے رہی تھی۔

کچھ دیر بعد کبریٰ نے آنسو پونچھتے ہوئے خود کو سنبھالا اور اس کی جانب دیکھ کر بولیں.....

”کیا کہہ رہے ہیں ڈاکٹر.....؟ کیا ہو گیا ہے شاہ سائیں کو.....؟ یہ ٹھیک تو ہو جائیں گے نا.....؟“

”ہوں..... تسلی تو دی ہے، کہہ رہے ہیں جلد ہوش میں آجائیں گے۔“ ارد شیر اُن کے بجائے اپنی رستہ واپس کی طرف دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”جب ہوش میں آتے ہیں تو بہت تکلیف محسوس کرتے ہیں۔“ زینت نے دونوں میں سے کسی کو مخاطب کئے بغیر کہا۔ وہ نہیں جانتی تھی ارد شیر اور کبریٰ ایک دوسرے سے بہت فاصلے پر چاچکے ہیں ان دونوں کی موجودگی میں وہ خود کو بہت اکیلا اور کسی حد تک غیر محفوظ محسوس کر رہی تھی۔ اسے نہ تو اب ارد شیر سے کسی اچھائی کی توقع تھی اور نہ بڑی بیگم سے، وہ تو اسے شروع سے ہی بہت مغرور اور تنگ مزاج لگی تھیں۔ اسے ڈر لگتا تھا ان سے۔ وہ شاہ جی کی زندگی کے لئے دعا گو تھی۔

تینوں ایک دوسرے سے نظریں چرائے کچھ دیر تک خاموش کھڑے رہے پھر ارد شیر باہر آ گیا۔

”انکل کا کیا حال ہے.....؟ کیا ہوا ہے انہیں.....؟“ آڈر ابھی ابھی پہنچا تھا اور پریشانی کے عالم میں پوچھ رہا تھا۔

”تم دعا کرو آڈر، خدا انہیں زندگی دے، صحت عطا فرمائے، ابھی تو مجھے بہت ضرورت ہے اُن کی.....“

”کیا حالت زیادہ خراب ہے.....؟“ اس کی بات پر آڈر فکر مندی سے گویا ہوا، جواب میں اُس نے اثبات میں سر ہلا دیا پھر ہولے ہولے تفصیل بتانے لگا۔

”وہ ٹھیک ہو جائیں گے، ارد شیر تم حوصلہ رکھو۔“

کچھ دیر بعد شاہ جی کے دونوں داماد اور تینوں بیٹیاں بھی چلی آئیں۔ شاہ جی ابھی تک اسی کیفیت میں پڑے تھے اور یہاں موجود ہر چہرہ ابے حد فکر مندی و پریشانی کے عالم میں ڈوبا ہوا تھا۔ کسی خیال سے دل کا پ کا پ جاتے تھے۔

”خدا نہ کرے، خدا انہیں صحت دے.....“ اس خیال سے پیچھا چھڑانے کو وہ دعا مانگنے لگتے۔ ڈاکٹر نے شور سے منع کیا تھا مگر گاؤں سے یہ لوگ آئے اور شاہ جی کو اس حالت میں دیکھا تو شیریں اور ستارہ رونے لگیں..... گل بھی گم سم اور فکر مند تھی۔ مرد، خواتین کو تسلی دے رہے تھے اور کمرے میں شور سا ہونے لگا تھا..... ارد شیر نے ناگواری سے..... ان سب کو دیکھا اور باہر آ کر شاہ جی کے ایک ملازم سے کہا.....

”اندر جا کر ان سب کو منع کرو، بتاؤ ان جاہلوں کو یہاں شور نہ کریں، مریض ڈسٹرب ہوتا ہے۔“

”تم بیٹھ جاؤ.....“ آڈر اس کے قریب آ کھڑا ہوا۔

”میں ٹھیک ہوں.....“ وہ دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا تھا۔ شیریں شاید اسے دیکھنے ہی کمرے سے باہر آئی تھی۔ نظر اس پر پڑی تو قریب آئی اور اس کے بازو پر ہاتھ رکھ کر بولی.....

”تم باہر کیوں آ گئے.....؟ اندر آؤ نا، ہم سب کے پاس.....“

”آپ لوگ بھی باہر تشریف لے آئیں تو بہتر ہوگا۔ ڈاکٹر نے شور سے منع کیا ہے۔“

ارد شیر نے اُس کی اہانت کا جواب بڑے کھردرے انداز میں دیا۔ وہ واپس نہیں گئی، وہیں اُس کے پاس ہی کھڑی ہو گئی۔

کبیر حسن نے جو یہ یہ سے کہا تھا..... ”وہ سوہا کے مگر جانا چاہتے ہیں۔“

”تو کیا آپ راضی ہیں اس رشتے پر.....؟“ اُس نے بے یقینی اور خوشی کی ملی جلی کیفیت کے ساتھ، سوال کیا۔

”اسے بنی کہا ہے میں نے، بڑا احسان بھی ہے اُس کا مجھ پر مگر سب سے بڑی بات یہ کہ وہ اچھی لڑکی ہے، مزید کو بھی پسند ہے تو انکار کا کوئی جواز نہیں بنتا.....“

”اوہ..... تو پھر کیوں نہ آج ہی ہم ان کے ہاں چلیں، میں فون پر سوہا کی آنٹی کو اطلاع دے دیتی ہوں۔“

”ٹھیک ہے جیسی تمہاری مرضی..... میں چار بجے کے قریب آفس سے آ جاؤں گا۔ تم چھ بجے کا ٹائم دے دیتا۔“

وہ آفس چلے گئے تو جو یہ یہ مزید کے کمرے میں چلی آئی۔ وہ رات دیر سے سویا تھا اور ابھی تک بستر میں تھا۔

”اوہو مزید، اٹھو بھی..... یہ کوئی وقت ہے سونے کا.....“ انہوں نے جاتے ہی مبل کھینچ لیا۔

”مما پلیز..... سونے دیں۔“ اُس نے آنکھیں نہیں کھولیں۔

”ہاں بھی ہے ٹائم کیا ہو رہا ہے.....؟“

”مجھے نہیں پتا، بس میں بڑا اچھا خواب دیکھ رہا ہوں اس وقت.....“ اُس نے تکیہ اٹھا کر منہ پر رکھ لیا۔

”خواب حقیقت بن گیا ہے میری جان..... میں اور تمہارے پاپا آج شام جا رہے ہیں سوہا کی طرف.....“

ڈھلے چاندول کے پار.....O.....378

”ہیں..... سچ.....“ اُس نے تکلیف ایک طرف پھینکا اور ایک دم سے اٹھ بیٹھا۔
”اب کہاں گئی تمہاری نیند.....؟“

”اوہو..... تو جگانے کے لئے ایسا کھڑی تھیں۔“ وہ پھر لیٹ گیا۔

”ارے نہیں زیو، یہ سچ ہے، تمہارے پاپا مان گئے ہیں۔“

”اوہ ماما..... یہ سچ کئی سہانی ہے۔“

وہ پھر اٹھ بیٹھا اور چھلانگ لگا کر بستر سے اُتر۔

”اس کا مطلب ہے، میں سچے خواب دیکھنے لگا ہوں، مجھے پہلے ہی پتا تھا میری نیکیاں مجھے کسی اور نچی منزل تک لے جائیں گی۔“

شام کو جویریہ تیار ہو رہی تھیں، کبیر بھی بیڈروم میں تھے اور اور مزید کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ان دونوں کو کچڑ کرا بھی اسی وقت سوہا کے گھر روانہ کر دے۔

ان لوگوں کی تین گھنٹے کے بعد واپسی ہوئی اور اُس نے یہ عرصہ بس ادھر ادھر چکر لگاتے ہی گزارا۔
جویریہ اور کبیر معہ مٹھائی کے واپس آئے تھے۔ مزید گاڑی کی آواز سنتے ہی لاؤنج سے باہر آ گیا اور جویریہ کے مسکراتے چہرے کو دیکھ کر سمجھ گیا، کامیاب لوٹے ہیں وہ۔

جویریہ، کبیر سے پہلے تیز قدموں سے تقریباً دوڑتی ہوئی اُس تک آئیں، چہرا ہاتھوں میں لے کر پیشانی چوم لی اور مبارکباد دے ڈالی۔

”اوہ شکر ہے، مان گئیں آئی یا سمین، میرا خیال تھا کہیں بیا کو دیکھ کر وہ انکار نہ کر دیں کہ ایسا مغرور، غصہ ورابا..... یقیناً بیٹے پر بھی اثر ہوگا۔“

”بکومت، تمہیں تو اپنے پاپا کا شکر گزار ہونا چاہئے۔“ وہ ہنسی دبا کر ہولے سے بولیں۔
کبیر حسن قریب آئے تو مزید نے بڑے ادب اور خجیدگی سے سلام کیا۔ انہوں نے بھی گلے لگا کر مبارکباد دی۔

ملازم مٹھائی کے ڈبے اٹھائے چلا آیا۔ وجہ نہیں جانتا تھا، مالکوں کو دیکھ کر مسکرائے جا رہا تھا۔
”یہ بہن میں لے جاؤ.....“ جویریہ نے اُسے کہا اور تینوں لاؤنج میں آ گئے۔

”کیا ہوا، کب آئے آپ لوگ.....؟“ رانچہ نے آکر پہلا سوال یہی کیا۔

”ابھی ابھی آئے ہیں اور باہر ادولٹے ہیں۔“ جویریہ نے بتایا۔

”بہت مبارک ہو بھائی.....“ وہ مزید کے پاس آئیں اور سر اُس کے شانے سے ٹکا دیا۔
”تمہیں بھی بہت مبارک ہو، آخر بھائی بھی تو تمہاری آ رہی ہے، ہم بے چاروں کا کیا ہے۔“ کبیر

کی وجہ سے وہ آہستہ سے بول رہا تھا۔ رانچہ کوئی جواب نہیں دے سکی۔ باپ کی موجودگی میں وہ خاموش ہی رہا کرتی تھی۔

”ہم لوگ مٹھائی کی تاریخ بھی دے آئے ہیں، صرف ایک ہفتے بعد تمہاری اور سوہا کی مٹھائی ہوگی۔“
جویریہ نے خوشی سے مٹھائی آواز میں کہا۔ کبیر حسن نے اثبات میں سر ہلایا اور بولے.....

”ہم نے اور سوہا کی آئی نے حکم طے کیا ہے کہ رسم سادگی سے ہوگی، تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں

ڈھلے چاندول کے پار.....O.....379

”نہیں پاپا، آپ کا فیصلہ ہی میرا فیصلہ ہے، مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔“

”بہت سعادت مند ہیں آپ.....“ رانچہ نے سرگوشی کی۔

”چپ کرو، تم نے کیا بڑبڑانا شروع کیا ہوا ہے۔“ وہ یوں بولا جیسے بہن کی بات سمجھ ہی نہ سکا تھا۔

”مزید، تم عمر کو ضرور بلانا.....“

جویریہ کے کہنے پر وہ بولا.....

”اُس کی والدہ کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں رہتی۔ میں کہہ تو دوں گا مگر وہ آنہ سکے شاید.....“

”کیا ہوا اُس کی والدہ کو.....؟“

”وہ تو کافی عرصے سے بیمار ہیں، بہت محنت بھی تو کی ہے انہوں نے رابعہ اور عمر کی پرورش کے

سلسلے میں۔ اب تو لگتا ہے اُن کی ہمت جواب دے گئی ہے۔“

”اللہ انہیں صحت دے، مٹھائی کی رسم کرویں پھر میں چلوں گی تمہارے ساتھ عمر کے گھر، اس کی والدہ

سے ملنے۔“

”ٹھیک ہے ماما، ضرور چلیں گے.....“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

• • •

شاہ جی ابھی تک ہسپتال میں ہی تھے۔ ہوش میں ضرور آچکے تھے مگر ان کی بیماری ایک دو دن یا ماہ میں ٹھیک ہونے والی تو نہ تھی۔ ارد شیر کا سارا وقت ہسپتال میں ہی گزارتا تھا۔ باقی سب بھی آتے جاتے

رہتے تھے۔ کبریٰ اور زینت تو دن کا بیشتر حصہ ادھر گزارتیں جب کہ بیٹیاں دن میں ایک چکر لگا لیا کرتی تھیں۔

ارد شیر موجود تو نہیں ہوتا تھا مگر جب سے وہ ہوش میں تھے، ایک بار بھی اُن کے سامنے نہیں گیا تھا

کمرے میں تب ہی جاتا، جب وہ سو رہے ہوتے تھے، ان کے چہرے کی جانب دیکھتا رہتا، بے آواز ان سے معافی مانگتا رہتا۔ وہ شرمسار تھا۔ باپ کا سامنا کرنے کا حوصلہ خود میں نہیں پاتا تھا۔ یہ خیال کہ کہیں

اسے دیکھ کر مرنے نہ پھیر لیں، اسے اُن کے سامنے جانے سے روک دیتا تھا۔

وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو چکے تھے۔ بول نہیں سکتے تھے۔ انہیں ارد شیر اس طرح بے بس پڑے دیکھتا تو دل کٹ کے رہ جاتا۔ کیا اب یہ باقی زندگی یونہی گزاریں گے اور ساتھ ہی یہ احساس کہ انہیں اس

حال تک پہنچانے میں اُس کا بڑا ہاتھ ہے، اسے شدید پچھتاوا ہونے لگتا۔

”کاش میں نے عقل سے کام لیا ہوتا، اتنا نہ آگے گیا ہوتا۔ اصل قصور بڑی ماں کا ہے، سزا باپا کو دی

میں نے، کتنا برا ہوں میں، میں تو ان کے قدموں پر سر رکھ کر معافی مانگنے کے لئے تیار ہوں مگر بابا شاید مجھے

کبھی معاف نہ کریں۔“

زینت یہاں ہسپتال میں شاہ جی کے پاس اُسی پرائیویٹ روم میں ہوا کرتی تھی، کم سم، خاموش..... ارد شیر سے بھی اس کی کوئی بات نہیں ہوتی تھی۔ وہ چادر سے چہرا چھپائے رکھتی تھی جیسے ان سب لوگوں سے اور خاص طور پر ارد شیر سے اس کا پردہ ہو۔

.....، یہ چھوٹی بیگم صاحبہ بھی ہر وقت بابا کے پاس ہسپتال میں موجود رہتی ہیں۔“ ستارہ نے کبریٰ کو احاس دلاتا چاہا۔

باب کا دل تھاناں اس کی اتنی بڑی خطا بھلا کر پھر اسے نکار رہا تھا۔
ابھی کبریٰ اور دونوں بیٹیاں ملاقات کے بعد واپس گئی تھیں۔ ستارہ کا بچہ بیمار تھا۔ وہ ماں سے اس کے بارے میں باتیں کرتی رہی۔ کبریٰ اسے مشوروں سے نوازتی رہیں، کئی ایک نسخے بھی بتائے اور ڈاکٹر کو دکھانے کا مشورہ بھی دیا۔

وہ چپ چاپ لیٹے سنتے رہے حالانکہ ان کی آوازیں بے حد شرب کر رہی تھیں۔

وہ تینوں چلی گئیں..... شاہ جی کمرے میں اکیلے رہ گئے۔ انہوں نے آنکھیں موند لیں۔ کچھ ہی دیر بعد محسوس ہوا کوئی کمرے میں آیا ہے مگر آنکھیں کھول کر نہیں دیکھا کہ بہت تھک چکے تھے اور شاید مایوس بھی ہو چکے تھے۔

کوئی ان کے پیروں کے قریب آ کر ٹھہر گیا..... اور اب ہولے ہولے سسک رہا تھا۔

”کون..... کون ہو سکتا ہے.....؟“ انہوں نے آنکھیں کھول دیں۔

”ارد شیر.....“

اُن کی آنکھیں ایک دم..... پانیوں سے بھر گئیں..... اور لب مسکرانے لگے تو آخر وہ آگیا اور آیا بھی تو یوں کہ شرمسار اور معافی کا خواستگار ہے۔ انہیں یہ علم نہیں تھا جب وہ نیند میں ہوتے ہیں تو ارد شیر اس طرح دبے پاؤں ان کے پاس آتا ہے اور اپنے قصور کی معافی مانگتا ہے۔

وہ بول نہیں سکتے تھے۔ ہاتھ اوپر اٹھایا اور منہ سے آواز نکالی، ارد شیر نے چونک کر سر اٹھایا، بیٹکی آنکھوں سے ان کی جانب دیکھا۔ بابا کی آنکھوں میں..... محبت اور لبوں پر بھی اس کے لئے نرم مسکراہٹ تھی، وہ اور شدت سے رونے لگا اور ہاتھ جوڑ دیئے۔

”مجھے معاف کر دیں بابا..... مجھے معاف کر دیں، میں بہت برا ہوں، میں بہت شرمندہ ہوں آپ سے.....“

انہوں نے اشارے سے قریب بلایا.....

ارد شیر آگے بڑھا، ان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور بے تحاشا چومنے لگا۔ ان کی آنکھوں سے بھی آنسو رواں تھے اور لب کپکپا رہے تھے۔

”بابا میں سخت شرمندہ ہوں، آپ کا سامنا کرنے کی سکت خود میں نہیں پاتا تھا۔ میں یہیں موجود تھا مگر آپ کے کمرے میں تب ہی آتا تھا، جب آپ سو رہے ہوتے تھے۔“

وہ جیسے سالوں کے بعد ملا تھا۔ کسی میلے میں پھڑ گیا تھا۔ ننھا بچہ تھا اور بابا ملا تو یوں بلک بلک کر رو رہا تھا..... ارد شیر کو سامنے پا کر وہ جیسے اپنی معذوری کا دکھ بھول گئے۔ وہ شرمسار ہوا تو سارے گلے (جو معاف تو پہلے ہی کر دیئے تھے) سرے سے بھول ہی گئے۔ انہیں تو یہ بھی یاد نہیں تھا۔ ان حالوں کو پہنچانے والا بھی یہی بیٹا ہے، وہ اس کے ہاتھ لبوں سے لگاتے چومتے اور پھر اس کے آنسو پونچھنے لگتے۔

آذر کمرے میں آیا اور ارد شیر کو یوں روئے دیکھا تو شانے پر نرمی سے ہاتھ رکھ دیا۔

”انکل پریشان ہو جائیں گے، ایسے مت کرو۔“

”آذر میرے بابا نے مجھے معاف کر دیا ہے، میرا تاتا بڑا جرم بھلا دیا ہے انہوں نے.....“ وہ آذر کے گلے لگ گیا۔

”ہاں میں دیکھ رہی ہوں، یہ بہت حق جتا رہی ہے، واقعی خود کو بیگم ہی سمجھنے لگی ہے کی کمین کی اولاد.....“

”تو اور کیا، بڑے آدمی سے شادی کا یہ مطلب تو ہوا ہی ہے کہ لوگ اس کے خاندان کو بھول گئے، سب کو پتا ہے یہ ایک مزارع کی بیٹی ہے، قسمت سے شاہ کے نکاح میں آگئی تو خود بھی بیگم بن بیٹھی۔“ ستارہ کے لہجے میں حقارت ہی حقارت تھی۔

”میں بھی نظروں میں رکھے ہوئے ہوں، اس کو دیکھ رہی ہوں، اس کے انداز، تھوڑے دنوں کے لئے میں حویلی سے باہر کیا گئی، یہ تو ہر شے پر قبضہ ہی جانتی تھی مگر جانتی نہیں ہے یہ مجھے دُور دُور سے دیکھا ہے، کبھی قریب آنے کا موقع نہیں ملا۔ اب میں بتا دوں گی اسے مالکن کون ہے اور اس کی کیا اوقات ہے۔“

شاہ جی کی بیماری نے انہیں ایک بار پھر شاہ جی اور مگر کے قریب کر دیا تھا۔ وہ اب کسی دوسری عورت کا وجود بھی اپنے ساتھ برابری کرتے ہوئے برداشت نہیں کر پارہی تھیں۔

یہاں شہری ملازم نہ تو کبریٰ کو زیادہ اہمیت دے رہے تھے اور نہ ہی اُن کے اس رُجے سے واقف تھے جو گاؤں میں انہیں حاصل تھا۔ ان لوگوں کے لئے تو زینت اور کبریٰ برابر تھیں جبکہ کبریٰ کو زینت سے سخت نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ شاید اس لئے کہ فاطمہ اور راحت کے ہوتے ہوئے بھی حکمرانی کبریٰ کے پاس ہوتی تھی جب کہ زینت نے حویلی پر اکیلے ہی راج کیا تھا۔

”اماں، آخر یہ یہاں کیا کر رہی ہے، کیا کام ہے اس کا یہاں پر.....؟ اسے گاؤں بھیج دیں۔“

”ہاں، میں بھی یہی سوچتی ہوں..... تم ڈرائیو کو بلاؤ، نیک کام میں دیر کیسی.....“

زینت کو اطلاع ملی، وہ کبریٰ کے پاس آئی اور اس سے انتقام کی۔

”آیا جان، مجھے گاؤں نہ بھجوائیں، میں یہیں رہنا چاہتی ہوں شاہ جی کے پاس، میں انہیں اس

حال میں چھوڑ کر کیسے جاسکتی ہوں۔ میرا دل تو ادھر ہی لگا رہے گا۔ میں بے چین و پریشان رہوں گی۔“

”تمہاری رائے کس نے پوچھی ہے زینت بی بی، میں نے تمہیں گاؤں بھجوانے کا فیصلہ کر لیا ہے اور

تمہیں ہر حال میں یہ فیصلہ ماننا ہے۔“

”نہیں بڑی آپا نہیں، میں نہیں جاؤں گی خدا کے لئے مجھے یہیں پڑا رہنے دیں۔“ وہ روتے ہوئے

اتجاہ کرتی رہی۔

”جو کہہ دیا بس کہہ دیا، نہ سننے کی تو میں عادی نہیں ہوں، نہیں جاؤ گی تو زبردستی ہوگی اور ملازموں کو

بھی پتا چل جائے گا کہ تمہاری کیا حیثیت ہے۔ بہتر ہے عزت کے ساتھ ہی چلی جاؤ، سب کے سامنے

تمہاں نہ بنو.....“ اور زینت خاموشی سے پلٹ آئی اور اسے اسی روز گاؤں بھیج دیا گیا۔

شاہ جی نے بڑی خاموشی اور صبر کے ساتھ اپنی اس حالت سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ وہ خود کو بہت تنہا

محسوس کر رہے تھے۔ وہ اپنا دکھ کس سے کہیں، کون ہے جو اُن کے ساتھ تھکس ہے، اتنے لوگ تھے اُن کے

پاس، مگر ان کی پیاسی نگاہ بچے کو ڈھونڈتی تھی..... اور چہروں میں وہی چھڑاؤ نہیں دکھائی دیتا تھا۔

وہ تو اتنے مجبور ہو چکے تھے کہ کسی سے پوچھ بھی نہیں سکتے تھے، جب بھی دروازہ کھلا اس امید پر

دیکھتے کہ شاید اب ارد شیر آیا ہوگا۔ کیا اب بھی ناراض ہے مجھ سے۔

”اب اپنے بابا کو بھی دکھ نہ دینا..... انہیں اس معذوری کا احساس بھی نہ ہونے دینا۔ جوان بیٹے بوڑھے والدین کا سہارا ہوتے ہیں، فخر ہوتے ہیں ان کا تم ان کے خواب کبھی نہ توڑنا۔“

”بابا کے لئے میری جان حاضر ہے، میں بابا کے ساتھ ساتھ ہوں، یہ جو چاہیں گے، میں ویسا ہی کروں گا۔ اب ہم کسی کی بات پر کان نہیں دھریں گے۔ کسی سازش کا شکار نہیں ہوں گے۔“

”میں نے ڈاکٹر سے بات کی ہے، ان کا کہنا ہے، ہم ایک دور دراز تک انکل کو گھر لے جاسکتے ہیں، اور پھر انہیں دیکھ بھال کی توجہ کی بہت ضرورت ہوگی۔“

”بابا، اگر شہر میں رہنا چاہیں گے تو میں ان کے ساتھ ادھر شہر میں رہوں گا، اگر یہ گاؤں جانا چاہیں گے تو میں بھی ان کے ساتھ گاؤں چلا جاؤں گا۔“

”ہاں اردشیر، تمہیں اب انکل کے ساتھ ساتھ رہنا ہے، اس کے ساتھ ہی اب وہ سب کام تمہاری ذمہ داری ہیں جو پہلے انکل دیکھا کرتے تھے، تمہیں بہت ہوشیاری کے ساتھ سب معاملات دیکھنے ہیں۔ مہر علیا سیاست بھی زوروں پر رہے گی اور باہر بھی حالات اس سے مختلف نہیں ہوں گے مگر تم خود کو اکیلا مت سمجھنا، تم جہاں بھی ہو گے، میں تمہارے ساتھ ہوں، تم سے ملنے آتا رہوں گا۔“

”تمہاری دوستی پر مجھے فخر ہے آؤ.....“

کبریٰ ہاسپل میں ہی تھیں۔ اردشیر بھی یہیں موجود رہتا تھا مگر ان دونوں کے درمیان زیادہ بات چیت نہیں ہو سکی۔ کبریٰ نے کوشش بھی کی مگر وہ زیادہ تر آؤر کے ساتھ ہوتا یا کوئی ملنے والا آجاتا بھی..... شاہ جی کی بیماری کے موضوع کے علاوہ کسی موضوع پر بات نہیں ہوتی تھی۔

ہاسپل سے شاہ جی کو گاؤں لے کر جانا تھا کہ یہ اُن کی خواہش تھی، وہ گاؤں میں رہنا چاہ رہے تھے۔ جب یہ لوگ جانے کی تیاری کر رہے تھے، جب اردشیر کو زینت کا خیال آیا۔ اُس نے شیریں سے زینت کے بارے میں پوچھا۔

”وہ تو بہت پہلے گاؤں چلی گئیں۔“

”اچھا..... مگر کیوں.....؟“ اسے حیرت ہوئی۔

”ہاں نہیں.....“ شیریں واقعی کچھ نہیں جانتی تھی۔

ان کی آمد سے پہلے اطلاع بھجوا دی گئی۔

وہ لوگ دوپہر کے قریب گاؤں پہنچے۔ اس وقت تک زینت آنے والے وقت کے خوف اور کام کی زیادتی کے باعث تھک کر چور ہو چکی تھی۔ اُن کے آتے ہی اُس نے خود کو پچھلی سائیز پر بنے کمروں میں سے ایک میں مقید کر لیا۔

برادری کے بہت سے لوگ، گاؤں کے افراد اور شاہ جی کے جاننے والے دوست احباب، دُورو نزدیک کے گاؤں سے یہاں پہنچ چکے تھے۔ اردشیر ان سے مل رہا تھا۔ آؤر اس کے ساتھ ساتھ تھا جب کہ دونوں بہنوئی قریب ہونے کی کوشش میں ناکام ہو چکے تھے۔ اردشیر ان سے ملتا تو اچھے طریقے سے تھا مگر ان کے مشوروں کو کوئی خاص اہمیت دینے کے لئے تیار نہیں تھا۔ وہ سمجھ گئے تھے لڑکا سیدھا سادا اور باتوں میں آنے والا نہیں ہے۔ یہ اپنی ہی مرضی کرے گا۔

شاہ جی کو کمرے میں پہنچایا جا چکا تھا۔ حویلی میں آتے ہی کبریٰ نے تنقیدی نظروں سے ہر چیز کا

جائزہ لیا اور ملازموں کو ڈانٹ ڈپٹ کی۔ اب وہ باورچی خانے میں موجود تھیں۔

”کیا پکا یا ہے، کتنے لوگوں کے لئے کافی ہوگا، بیٹھے میں کیا بنا ہے.....؟“ وہ پہلے کی طرح چپک کر رہی تھیں۔ ”جتنے بھی مہمان آئے ہیں ان سب کو کھانا کھلایا جائے گا اور شاہ جی کے لئے کھانا میں اپنے ہاتھ سے تیار کروں گی۔ باورچی خانے میں مجھے صفائی دکھائی نہیں دے رہی۔ فوراً ہر چیز صاف کرو۔ چند روز کے لئے حویلی سے باہر کیا گئی، یہاں تو ہر چیز برباد کر کے رکھ دی تم لوگوں نے۔“

اردشیر کو کہیں شام کو ہی ملنے ملانے سے فراغت ہوئی۔ اُس نے منشی کو بلا بھیجا اور آؤر سے کہا.....

”میں چاہتا ہوں، تم چند روز کے لئے یہیں میرے پاس رُک جاؤ، میں ان تمام معاملات میں بالکل کورا ہوں اور برادری کے کسی شخص کی مدد لینا مجھے کوارا نہیں۔“

”جانتا تو میں بھی کچھ نہیں مگر ایک سے دو بھلے، میں یہیں ہوں تمہارے ساتھ..... واقعی یہ لوگ مجھے مخلص نہیں لگتے..... تم سے ملتے ہیں تو سمجھ جاتے ہیں مگر جب ادھر ادھر ہوتے ہیں تو گفتگو کا انداز ہی بدل جاتا ہے، تمہیں بہت محتاط ہو کر سوچ سمجھ کر ہر قدم اٹھانا ہوگا اور پھر تمہارے والد بے شک بہت بیمار ہیں، معذور ہیں مگر وہ تمہارے سر پر موجود ہیں، وہ سمجھ سکتے ہیں، تمہاری بات سن سکتے ہیں، تم ان سے مشورہ ضرور لو اور ڈاکٹر نے امید ظاہر کی ہے۔ ذرا سی کوشش سے وہ بول سکتے ہیں۔“

”ہاں آؤر عا کرو، بابا ٹھیک ہو جائیں، میں تو اُن کے بغیر کچھ بھی نہیں ہوں۔“

رات کے آٹھ بجے وہ بیرونی احاطے سے اُٹھ کر اندر آیا۔ یہاں اس وقت بھی گہما گہمی کا عالم تھا۔ موسم سردیوں کا تھا۔ صحن میں کوئی نہیں تھا لیکن برآمدے اور بڑے کمرے میں مہمان اور ملازم لڑکیاں موجود تھیں۔ برآمدے کی میز چوڑی پر اسے اُکنا پڑا کہ تین لڑکیاں سرور پر بہت سے بستر اُٹھائے آہستہ آہستہ چلی جا رہی تھیں۔

”یہ بستر بچھا کر خالہ صغریٰ کو بتا دینا۔“ کبریٰ بھی شاید نگرانی کے لئے ان لوگوں کے پیچھے پیچھے تھیں حالانکہ یہ کوئی ایسا کام نہیں تھا جس پر نگرانی اشد ضروری ہو۔ جونہی ان کی نگاہ اردشیر پر پڑی، اس کے قریب آئیں اور بولیں.....

”کھانا نکلاؤں تمہارے لئے.....؟“

”نہیں.....“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”کہاں رہے سارا دن.....؟ شاہ جی تمہاری عدم موجودگی کو محسوس کر رہے تھے، بے چین تھے تمہارے لئے.....“

”بابا جان جاگ رہے ہیں یا سو گئے ہیں.....؟“

”وہ ابھی ابھی سوئے ہیں..... میں اُن کے پاس ہی تھی، تم تھکے ہوئے دکھائی دیتے ہو، چائے بنواؤں تمہارے لئے.....؟“ وہ اہانت سے پوچھ رہی تھیں، شاید وہ اس کوشش میں تھیں، ان نئے حالات میں اردشیر کی کچھ بات بھول جائے گا۔

”میں سوئے جا رہا ہوں.....“ وہ آگے بڑھ گیا مگر اپنے کمرے میں نہیں گیا، ادھر ادھر ٹھٹھکا رہا۔ ملازمہ کوڑے اُٹھائے پچھلے حصے کی طرف جاتے دیکھا تو پوچھ لیا۔

”ادھر ویرانے میں کون ٹھہر گیا ہے.....؟“

”اعتبار تو میں نے کھو ہی دیا ہے مگر پھر بھی التجا ہے، اب یقین کر لیں کہ جو ہو چکا، وہ میرے لئے بھی بے حد بھیا تک ہے۔“

اتنا کہہ کر آگے بڑھا تو زینت کو بھی قدم بڑھانے پڑے۔

وہ اسے ساتھ لے کر شاہ جی کے کمرے میں آیا۔ پہلی آواز پر ہی اُن کی آنکھ کھل گئی۔

”بابا، آپ دیکھ رہے ہیں، میں اس وقت انہیں لے کر آیا ہوں، بابا بڑا بوجھ تھا مجھ پر صبح تک انتظار مشکل تھا، اسی لئے نیند سے جگا دیا آپ کو۔۔۔ میں وعدہ کرتا ہوں، آپ کی ہر امانت کی حفاظت کروں گا۔ جب تک آپ صحت یاب نہیں ہو جاتے، میں ہر ذمہ داری اپنی خوشی سے اٹھاؤں گا۔ یہ آپ کی بیگم ہیں، میرے لئے پہلے بھی قابل احترام تھیں اور اب بھی ہیں۔“

زینت نے شاہ جی کے پاؤں پر ہاتھ رکھ دیئے اور رونے لگی۔

شاہ جی نے ارد شیر کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر پیار سے دبا یا اور اشارے سے سمجھایا کہ زینت کو رونے سے منع کرے۔

”آنسو پونچھ لیں، بابا آپ سے ناراض نہیں ہیں، آپ کا رونا انہیں تکلیف دے رہا ہے۔“

وہ جلدی سے دوپٹے سے آنسو پونچھنے لگی۔ ارد شیر نے اپنے شانے سے گرم شال اُتار کر زینت کے سر پر رکھ دی۔

”آپ میری ماں کی جگہ ہیں، آپ ذمہ داری ہیں میری، اس گھر سے آپ کو کوئی بے دخل نہیں کر سکتا۔ اچھا بابا، اب آپ آرام کریں، میں بھی چائے کا ایک کپ لے لوں پھر سوتا ہوں، سچ سارا دن کرسی پر بیٹھ کر گزارا ہے۔“



عام طور پر وہاں اتنا ج وغیرہ ہی رکھا جاتا تھا، وہ کمرے اسی مقصد کے لئے بنوائے گئے تھے۔

”چھوٹی بیگم صاحبہ ادھر ہی ہوتی ہیں۔“

”چھوٹی بیگم صاحبہ، تمہارا مطلب ہے زینت بی بی.....؟ کہاں ہیں وہ میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔“ اس نے ٹرے ملازمہ کے ہاتھ سے لے لی۔

”وہ سب سے کٹ کر ادھر کیوں رہ رہیں ہیں.....؟“

”ہاں نہیں جی، پہلے تو ادھر ہی تھیں، جب سے شہر سے سب لوگ آئے ہیں، وہ پیچھے چلی آئی ہیں۔“

”اچھا ٹھیک ہے، تم جاؤ۔۔۔۔۔“

وہ ٹرے اٹھا کر اس کمرے میں آیا تو بلب کی زردی روشنی میں دیوار سے ٹیک لگا کر بان کی چار پائی پر بیٹھی زینت سخت اُداس اور مضطرب دکھائی دے رہی تھی۔

اس کمرے میں اس چار پائی کے علاوہ دو پرانی کرسیاں اور ایک چھوٹی سی میز موجود تھی، نہ کھڑکیوں پر پردے اور فرش پر قالین چھوڑ فرنگی دری تک نہیں تھی۔

ارد شیر نے دروازے پر رُک کر جائزہ لیا اور دوسری طرف وہ اسے یہاں موجود دیکھ کر ایک دم ہی خوفزدہ اور پریشان دکھائی دینے لگی، اپنی جگہ سے اٹھی اور دوپٹے پر ڈال کر کھڑی ہو گئی۔

ارد شیر نے ٹرے میز پر رکھ دی اور بولا۔۔۔۔۔

”آپ بہت ناراض ہیں مجھ سے اور آپ حق پر ہیں، میرا قصور واقعی بہت بڑا ہے مگر آپ تو سزا خود کو دے رہی ہیں، سب سے الگ تھلک یہاں کیوں آگئی ہیں.....؟“

”چھوٹے شاہ صاحب، یہ آپ کا گھر ہے، یہ سب لوگ بھی آپ کے ہیں، میں تو ایک بے سہارا غریب عورت ہوں، اگر آپ اپنے گھر کے اس چھوٹے سے کمرے میں رہنے کی اجازت دے دیں تو بڑی عنایت ہوگی، آپ بڑے لوگوں کے نزدیک ہماری حیثیت چوٹی کے برابر ہی مگر پھر بھی التجا ہے، مجھے زندگی کے باقی دن عزت سے گزارنے کی خواہش ہے، مجھے اس حویلی سے دُور مت کیجئے گا۔“

”کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ.....؟ جو کچھ ہوا ہے مجھے اس پر معاف کر دیں، میں نے بابا سے بھی معافی مانگی ہے، آپ کے سامنے بھی ہاتھ جوڑتا ہوں، آپ میرے لئے عزت کی جگہ ہیں، میں احترام کرتا ہوں آپ کا۔۔۔۔۔“

ارد شیر نے واقعی ہاتھ جوڑ دیئے، وہ حیران رہ گئی اور بولی۔۔۔۔۔

”خدا کے لئے ایسا مت کریں چھوٹے شاہ جی، بھلا میری حیثیت ہی کیا ہے۔“

”آپ میرے والد کی بیوی ہیں، آبرو ہیں ہمارے خاندان کی، اور سچ تو یہ کہ آپ کی ذات بھی اس قابل ہے کہ آپ کی عزت کی جائے۔“

وہ ڈکھ سے ہنس پڑی اور بولی۔۔۔۔۔

”آپ کی بڑی ماں اور بہنیں کہتی ہیں، میں نیچ ذات کی جاہل عورت ہوں اور شاہ جی کے نکاح میں آنے کے باوجود عزت کے لائق نہیں۔“

”آپ آئیے میرے ساتھ۔۔۔۔۔“

”کہاں.....؟ وہ ایک قدم بھی نہ بڑھا سکی۔“

وہ کچھ کہنے لگی تھیں کہ اردشیر نے موقع نہیں دیا، زینت سے بولا.....
”ذرا چائے بنا کر میرے کمرے میں بھیج دیں۔“ اور آگے بڑھ گیا۔

زینت، کبریٰ کے تیسرے کمرے پر اندر ہی اندر ڈر رہی تھی۔ اسے کبریٰ کی طاقت کا بخوبی اندازہ تھا...
ستارہ کا چہرہ غصے کی شدت سے سرخ ہو رہا تھا مگر کبریٰ نے اسے کچھ بھی بولنے سے اشارے سے منع کر دیا۔
زینت چائے بنانے باورچی خانے میں چلی گئی۔

”تو یہ ہے آپ کا لاڈلا اردشیر، کتنا پیار کیا اسے آپ نے اور یہ سہل دیا۔ احسان فراموش،
بد مزاج لڑکا نہ جانے کیا سمجھتا ہے خود کو.....“ ستارہ اس بات سے واقف تھی کہ کبریٰ اردشیر کو اپنی اصلی
صورت دکھا چکی ہیں۔ یہ بات صرف اردشیر، شاہ جی اور کبریٰ کو ہی معلوم تھی۔
”تم نہ تو اردشیر سے کچھ کہو گی، نہ شیریں کو بتاؤ گی۔“ کبریٰ اتنا کہہ کر تھکے تھکے انداز میں اندر
کمرے میں چلی گئیں مگر ستارہ کا غصہ تھا کہ بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔

♦ ♦ ♦

راجہ اور عمر کو پاس بٹھا کر زیتون نے اکھڑی سانسوں کے درمیان آج وہ راز افشا کر دیا جسے وہ ایک
عرصے سے سینے میں چھپائے ہوئے تھیں۔

”مزید کی والدہ عمر کی ماں ہے۔ اس عورت نے دوسری شادی کی خاطر اپنا بچہ زیتون کے حوالے
کر دیا تھا۔“

”آف! یہ کیسا دل ہلا دینے والا انکشاف تھا۔“ عمر تو سن ہو کر رہ گیا۔

”تمہارا اصل نام عمر نہیں طلال ہے، میں تمہیں ساتھ لے کر بار بار اس کوٹھی پر جاتی رہی کہ شاید وہ
عورت واپس آجائے مگر وہ نہیں آئی اور اُس کی جس رشتے دار نے تمہیں میرے حوالے کیا تھا، اس نے یہ
بھی کہا تھا بچہ تم رکھ لو۔“

عمر! میں نے تمہیں بتایا کہ بالائے..... مجھے تم اپنے اُس عمر کی طرح لگے تھے جو بہت تھوڑی
زندگی لے کر آیا تھا..... پھر بھی اگر کوئی غلطی ہو گئی ہو، اگر کبھی تمہیں مجھ سے کوئی شکایت ہوئی ہو تو معاف کر
دینا..... راجہ تمہاری بہن نہیں ہے مگر ایک بھائی کی طرح اس کا خیال رکھنا۔ اس کی بات آپ راحت کے بیٹے
سے چل رہی ہے، ڈر اچھا لڑکا ہے، تم اس کا رشتہ پکا کر دینا۔“

عمر نے آنسوؤں کی غلطی میں بہتے ہوئے یہ سب سنا، اس انکشاف سے اس کا دل ہل ہوا اور ہوا ہوا تھا۔
وہ چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا کر رو رہا تھا۔

”یہ کیا کہہ دیا اماں، آپ نے، میں آپ کا بیٹا ہی نہیں..... نہیں نہیں اماں میں آپ ہی کا بیٹا ہوں،
میرا کسی اور سے کیا تعلق، مجھے آپ نے پالا ہے، میرے لئے مصیبتیں آپ نے اٹھائی ہیں۔ اماں ہم یہ شہر
چھوڑ دیں گے، ہم اُن لوگوں سے کوئی واسطہ نہیں رکھیں گے، کبھی نہیں ملیں گے۔“

”اماں اماں.....“ راجہ جینیں سن کر اس نے چہرے سے ہاتھ ہٹائے اور زیتون کے بے جان وجہ
سے لپٹ کر پکارنے لگا۔

”اماں مت جائیں، سیں سیں ناں، میں تو آپ کا ہوں..... اماں پیاری اماں۔“

♦ ♦ ♦

”میں چائے بنواتی ہوں آپ کے لئے.....“

”ہاں ضرور، اور سنئے صبح شہر سے میرے دوست آئیں گے، باہر کے دو کمرے سیٹ ہونے
چاہئیں، اور وہاں کھانا لے کر کوئی بد تمیز، جاہل لڑکی نہ آئے، کسی سمجھدار ملازم کے ہاتھ بھجوا دیے گا، یہ تو ہر کسی
کو دیکھ کر خواہ مخواہ دانت نکالنے لگتی ہیں۔ باقی کاموں سے فارغ ہو کر ایک نظر میرے کمرے پر بھی ڈال لیا
کیجئے کہ مالکن توجہ نہ دے تو ملازم کاموں میں سستی کرنے لگتے ہیں۔“

وہ مسکرا دی اور اثبات میں سر ہلا کر چائے بنانے چلی گئی۔ وہ بہت خوش تھی، شاہ جی نے اسے معاف
کر دیا تھا اور اردشیر نے اتنی عزت دی تھی کہ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اسے تو ہر دم یہی اندیشہ لگا رہا تھا
وہ حویلی سے نکال دے گا مگر آج سارے خوف دم توڑ گئے تھے۔

صبح ایک بار پھر وہ گھر کے کام کر رہی تھی۔ کبریٰ تک اطلاع پہنچی تو چہرے پر رعونت اور
نا پسندیدگی کے تاثر کے ساتھ پہنچ گئیں۔

”یہ کیا ہو رہا ہے.....؟“ آنکھیں اس پر جمائے وہ بخنی کے ساتھ گویا ہوئیں۔ ستارہ اُن کے ساتھ
تھی، وہ بھی محو رگور کر زینت کو دیکھ رہی تھی۔

”مردانے میں دو کمروں کی صفائی کروانی ہے، مہمانوں کے لئے تیار کرنے ہیں۔“ زینت نے
آہستگی سے بتایا۔

”میں خوب جانی ہوں کیا کرنا ہے اور کیا نہیں، تمہیں تکلیف کرنے کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔“
”ہونہ! دو کمروں میں عمر گزارنے والی آج حویلی کی مالکن بن بیٹھی ہے، اوقات بھول گئی ہے۔“

ستارہ نے ناک چڑھا کر خنوت سے کہا۔

اردشیر اسی وقت اندر آیا تھا۔ گفتگو تو نہیں سن سکا مگر ستارہ اور بڑی ماں کے انداز، زینت کا یوں سر
جھکا کر کھڑے ہونا اسے بہت کچھ سمجھا گیا۔ وہ ادھر ہی چلا آیا..... اور زینت کو مخاطب کر کے بولا

”باہر کے دو کمرے تو سیٹ کروادیے ہیں ناں آپ نے.....؟ اگر یہ کام ہو چکا تو لڑکیوں سے کہہ
کر میرا کمرہ بھی سیٹ کروادیں۔ رات فالکس دیکھتا رہا ہوں اور وہ ایسے ہی بھڑکی پڑی ہیں بلکہ انہیں سینے
کا کام آپ خود کریں اور سنبھال کر رکھیں، جب ضرورت پڑے گی، میں آپ سے لے لوں گا۔“

کبریٰ نے حیرت اور افسوس کے ساتھ اردشیر کی جانب دیکھا۔ یہ ساری باتیں وہ ان سے بھی کہہ
سکتا تھا، تو کیا اُس کی نظر میں اب مالکن میں نہیں، زینت ہے جی تو یہ سب اُس سے کہا ہے۔

”کیا طلال بالکل عمر جیسا تھا؟“ مزید نے گہری دلچسپی سے پوچھا۔
”وہ اپنے ابو کی تصویر تھا اور عمر کی شکل ناصر سے بہت ملتی ہے، نہ صرف صورت بلکہ چال ڈھال بھی وہی ہے۔“

”آپ نے پہلے کبھی اس بات کا ذکر نہیں کیا تھا۔“
”کیا فائدہ جب عمر وہ نہیں۔ مگر پھر بھی اپنا سبب محسوس کرتی ہوں۔“
”میں ملوں گا اس سے اور کہوں گا میری ماما کہیں بہت یاد کرتی ہیں۔“
”بیگم صاحبہ۔ نورین بی بی آئی ہیں۔“ ملازمہ نے آکر اطلاع دی۔
”اچھا، تم ڈرائنگ روم میں بیٹھا دو اور رات آئے کمرے میں ہوگی، اسے بھی بتا دو۔“ پھر مزید سے

بولیں

”میں بھی مل کر آتی ہوں، تم ذرا یہ چیزیں تو سمیٹ لو۔“
”رہنے دیں، ایسے ہی اچھی لگ رہی ہیں، میں کاشف کو فون کر لوں، بدترین تین روز سے آیا ہوا ہے اور صرف ایک چکر لگا گیا ہے ہمارے گھر کا۔“
وہ چلی گئیں تو مزید سوچنے لگا، کہاں تلاش کروں، میں عمر کو۔ اور کیا ماما کو بتا دوں کہ اس کی والدہ کا انتقال ہو چکا ہے۔ انہیں سن کر بہت ڈکھ ہوگا۔

جوریرہ جلد ہی واپس آگئیں۔ اُسے یوں پیشانی پر ہاتھ رکھے اور سچ میں گم بیٹھے دیکھا تو بولیں۔
”سوہا تو تمہیں مل گئی ہے، اب یوں بیٹھے کس مسئلے پر اُٹھے ہو؟“
”آپ کب واپس آئیں؟“ وہ پیشانی سے ہاتھ ہٹاتے ہوئے بولا۔
”ارے تمہیں پتا ہی نہیں چلا۔“

”مما بات یہ ہے کہ میں سوچ رہا تھا، آپ کو بتاؤں یا نہ بتاؤں۔“
”کیا بات ہے، تم کچھ فکر مند دکھائی دے رہے ہو۔“
”ہاں وہ میں آپ کو کئی روز سے یہ بتانا چاہ رہا تھا کہ میں عمر کی طرف گیا تھا۔ وہ لوگ اپنی والدہ کی وفات کے بعد نجانے کہاں چلے گئے ہیں۔“

”اوہ۔“ جوریرہ کا چہرہ پیکا پڑ گیا۔ ”اُس کی والدہ فوت ہو گئیں، وہ بہت معصوم سا لڑکا ہے، کتنا اُسا، کتنا اکیلا محسوس کر رہا ہوگا خود کو، اسے تمہاری ضرورت ہے۔ پلیز اُس تلاش کرو۔“ انہیں افسردہ دیکھ کر مزید کو غلطی کا احساس ہوا کہ اسے یہ بات نہیں بتانی چاہئے تھی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ کس قدر خوش تھیں۔

رات آڈرائنگ روم میں آئی تو نورین اسی کے انتظار میں بیٹھی تھی، اُسے دیکھ کر مسکرائی اور بولی۔
”میں تو لڑائی کرنے آئی تھی کہ کالج میں چھٹیاں ہوئیں تو تم بھول ہی گئیں، نہ کبھی گھر آئیں، نہ فون کیا۔ مگر یہاں آکر رہتا چلا ہے۔ تمہارے ہاں تو تقریب ہونے والی ہے۔ بھابی بتا رہی ہو کسی بہت پیاری سی لڑکی کو۔ بھی میری طرف سے بہت بہت مبارکبادیں قبول کرو۔“
”شکر ہے۔“ رات آڈرائنگ روم میں اُس کے قریب آکر بیٹھ گئی۔

”کیا بات ہے تم خوش نہیں ہو کیا؟“

مزید، عزیز کے پرانے والے گھر پر گیا تھا، سب اسے پتا چلا، اُس کی والدہ کا انتقال ہو چکا ہے اور یہ بھی کہ وہ دونوں بہن بھائی یہ گھر چھوڑ کر جا چکے ہیں۔ کہاں گئے ہیں، اس کا جواب کوئی نہ دے سکا۔ وہ افسردہ تو ہوا ہی تھا، حیران بھی بہت تھا۔

”عمر نے مجھے خالہ جی کی وفات کی اطلاع کیوں نہیں دی۔ حالانکہ فون نمبر اس کے پاس موجود تھا اور پھر گھر بھی تبدیل کر لیا، اس بارے میں بھی مجھے نہیں بتایا۔“
اُس نے عمر کو تلاش کرنا تو چاہا مگر کہاں جائے، کس سے پوچھے، کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ اُس کے کالج بھی گیا مگر وہاں سے بھی پتا چلا کہ وہ کئی روز سے نہیں آ رہا۔

مزید کو اندازہ تھا۔ جوریرہ، عمر کو بہت چاہتی ہیں، اس کی ماں کے انتقال کی خبر انہیں بہت دکھی کر دے گی، بہتر یہی سمجھنا تو ان کی وفات کے بارے میں بتایا جائے اور نہ ہی یہ بات کہ وہ گھر چھوڑ کر کہیں اور چلا گیا ہے۔ یہی سوچ کر اپنے طور پر عمر کو تلاش کرتا رہا۔

چند دنوں اس کی کتنی کی رسم ادا کی جاتی تھی۔ جوریرہ آج کل بہت خوش، مصروف اور مگن تھیں مگر پھر بھی عمر کو نہیں بھولیں۔ کئی بار پوچھا۔

”مزید، تم عمر کی طرف تو گئے تھے۔ وہ آئے گا ناں۔؟ تم اس کی بہن اور والدہ کو بھی ضرور انوائٹ کرنا۔“

وہ اثبات میں سر ہلا دیتا اور آج کل پرتا لٹا رہا۔
”مما۔۔۔ ہم ماموں اور ماما کو کبھی بلائیں گے ناں۔؟“ جوریرہ، مزید اور رات آڈرائنگ میں بیٹھے تھے۔ جوریرہ انہیں آج کی شاپنگ دکھا رہی تھیں، جب رات آڈرائنگ نے اچانک سوال کر دیا۔

مزید نے پہلے بہن اور پھر ماں کی جانب دیکھا۔ جوریرہ نے بڑی سختی سے نفی میں سر ہلا دیا۔
”مگر کیوں۔؟“ دیکھتے ناں، یہی تو موقع ہوتا ہے زونے ہوئے رشتے داروں کو منانے کا۔“
”تم بڑوں کی باتوں میں مت پولا کرو۔“ جوریرہ نے ٹوک دیا۔

”میں نے تو بس ایک بات کہی تھی، آپ لوگوں کی مرضی نہیں ہے تو نہ سمی۔“ وہ اپنی چیزیں سمیٹ کر کمرے سے چلی گئی۔

”مزید! عمر کی والدہ کا کیا حال ہے۔؟ تم گئے ان لوگوں کی طرف۔؟“
”نہیں مما۔۔۔ نا تم ہی کہاں ملتا ہے۔“

”ایسے نہ کہو، وہ بچہ اس وقت اکیلا ہے۔ ماں بیمار ہے، اسے سہارا چاہئے، کوئی تو ہو جو اس کڑے وقت میں اس کے ساتھ رہے، تم نا تم نکالو بیٹے۔“

”مما۔۔۔ یہ عمر بہت اچھا لگتا ہے آپ کو، میرے اور بھی تو بہت سے دوست ہیں مگر جتنا پیارا آپ عمر سے کرتی ہیں، کسی اور سے نہیں کرتیں۔“

جوریرہ نے سر دھڑکھڑکھٹا کر بھرا، پھر کچھ دیر کے بعد آہستگی سے بولیں۔
”زیو۔۔۔ تم سچ کہتے ہو، عمر واقعی مجھے اپنا نانا سا لگتا ہے۔ اسے دیکھتے ہی مجھے طلال یاد آ جاتا ہے۔

مجھے یقین ہے میرا طلال جہاں کہیں بھی ہوگا، ہو بہو عمر جیسا ہی ہوگا، اگر تم مجھے عمر کی بڑی بہن کے بارے میں نہ بتاتے تو میں اسے طلال ہی سمجھ لیتی۔“

”جہاں نہیں، مجھے کیا ہو گیا ہے..... گھر میں ماما، ماما اور بھیا سب بہت خوش اور مطمئن ہیں۔ میں خوش رہنا تو چاہتی ہوں مگر کوئی بے چینی، کچھ اُداسی میرے اندر کہیں بیٹھ گئی ہے۔ ابھی ابھی سی رہتی ہوں۔ کبھی کبھی جی چاہتا ہے دنیا کے ہنگاموں سے دُور کسی صحرا میں نکل جاؤں اور اُدھی آواز میں خوب جیتوں، چلاؤں، کیوں وہ رہا ہے میرے ساتھ ایسا، آخر کیا تصور کیا ہے میں نے.....؟“

نورین نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور گہری سنجیدگی سے بولی.....
”جو ہوا سو ہوا، اب اُسے بھول جاؤ، اسی میں تمہاری بہتری ہے۔“

”کیسے بھول جاؤں، یہ آسان تو نہیں ہے۔ میں تو روز جیتی اور روز میرتی ہوں..... وہ بہت زور آور ہیں، میں تو بار جاتی ہوں اُن کے خیال کے آگے۔ میں انہیں کھوپچکی ہوں۔ یہ خیال میرے دل کو کچھ چھری سے کاٹتا ہے اور درد، اُف وہ درد بیان سے باہر ہے۔“
”راکھ کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ وہ بے بسی سے ہونٹ کاٹنے لگی۔
”پلیز راکھ رو رو نہیں، دیکھو اگر اس وقت تمہاری ماما آگئیں تو کیا سوچیں گی، ہم کوئی بات نہیں بنا سکیں گے۔“

”بہت بوجھ ہے میرے دل پر، میں یہ سب کہہ دینا چاہتی ہوں۔“
”میں تمہاری دوست ہوں، راز دار بھی ہوں، تم یہ سب مجھ سے کہہ سکتی ہو، تم مجھ پر پورا اعتماد کر سکتی ہو۔“

”مگر کیا کہوں، میرے پاس تو کچھ کہنے کو بچا ہی نہیں۔“ اک آہ اُس کے لبوں پر دم توڑ گئی۔
”ہائے راکھ، یوں تو نہ کرو، تمہاری یہ حالت مجھے بہت دکھ دے رہی ہے۔ میں تو خود کو مجرم سمجھنے لگی ہوں۔“

”نہیں نہیں نورین، بھلا تمہارا کیا تصور، میں ہی نادان تھی، بنا سوچے سمجھے آگے بڑھتی چلی گئی۔“
”راکھ..... تم میرے گھر آؤ کسی روز ہم دونوں وہاں اطمینان سے باتیں کر سکیں گے۔ وہ سب باتیں جو تم میرے سوا کسی سے نہیں کر سکتیں۔“
”راکھ نے اثبات میں سر ہلا دیا اور بولی.....
”ہاں، میں خود بھی آنا چاہ رہی تھی۔“

”ٹھیک ہے پھر کل شام تم میرے ہاں آ جانا، میں انتظار کروں گی۔ بس یوں سمجھ لو، کل میں نے تمہیں ڈنر پر بلایا ہے اور دیکھو عین کھانے کے ٹائم پر تم آنا بلکہ شام کو ہی آ جانا، کھانا ہم دونوں مل کر تیار کریں گے۔“

”کھانا رہنے دو، میں تو صرف باتیں کرنا چاہتی ہوں۔“

”اوہو باتیں بھی ہوں گی..... بس تم آ جانا، میں انتظار کروں گی۔“

جیب جس عمارت کے سامنے آ کر رکھی تھی، اُسے شاہ اماں کا ڈیرہ کہا جاتا تھا۔ اُس عمارت کی چار دیواری جتنی بھی جب کہ کمرے کے کچے تھے۔ بیرونی دروازہ لکڑی کا تھا اور اس کے آس پاس چار دیواری کے اندر بھی اور باہر بھی ٹیکر اور شیشم کے درخت خاصی تعداد میں تھے۔

چار دیواری سے باہر درختوں کی چھاؤں میں بہت سے بچے گلی ڈنڈا اور کچے کھیل رہے تھے۔ کچھ انہیں دیکھنے کو جمع تھے۔ اچھا خاصا شور برپا کر رکھا تھا۔ ان بچوں..... سے کچھ فاصلے پر چند عورتیں میلے میلے کپڑوں میں بلوس نیچے بیٹھی تھیں۔ پہلے تو آپس میں باتوں میں مشغول تھیں مگر جوبی جیب آ کر زکی۔ آپس کی باتیں بھول کر ادھر متوجہ ہو گئیں۔

”کیا۔ یہی شاہ اماں کا ڈیرہ ہے.....؟“ اُس نے لکڑی کے دروازے پر بیٹھے دیہاتی سے پوچھا.....
جوبی قہقہہ ہنسنے لگی۔

جواب اثبات میں ملا تو بولا.....

”جاؤ شاہ اماں سے کہو بیٹا ملنے آیا ہے، اندر آنے کی اجازت چاہتا ہے۔“

”بیٹا.....!“ دیہاتی نے حیرت سے دہرایا۔

اس گاؤں میں فاطمہ شاہ کا میکا تھا۔ یہاں اُن سے بھانجے بھینچے تو کبھی کبھار ملنے آ جاتے تھے اور دروازے پر بیٹھا پہرے دار انہیں پہچانتا بھی تھا مگر یہ کون تھا جو تھا تو بڑی آن بان والا اور اس کا ہر انداز اسے خاندانی بتا رہا تھا کہ یہ تو بیٹا کہہ..... رہا ہے جب کہ اس سے پہلے اسے کبھی نہیں دیکھا۔
”جاؤ ناں، کہو جا کر بیٹا آیا ہے ارد شیر شاہ.....“ اس کا انداز نرم اور سادہ تھا۔ جب دیہاتی اثبات میں سر ہلا کر کھلے دروازے سے اندر چلا گیا۔

اس چار دیواری کے اندر دائیں طرف لائن میں کمرے بنے ہوئے تھے اور نسبتاً بڑے کمرے میں فاطمہ شاہ کا پلنگ لگا ہوا تھا۔ چار موڑھے، ایک میز اور فرش پر گہرے سرخ رنگ کی دری تھی جس پر کالے پھولے بنے ہوئے تھے۔

یہاں اس کمرے میں فاطمہ شاہ کبھی فرزا لگی اور کبھی دیو لگی میں ملتی تھیں۔ اس وقت بھی اپنے آپ میں نہیں تھیں۔ لنگی سے ہواؤں میں دائرے بنا رہی تھیں اور اپنے آپ سے باتیں کئے جا رہی تھیں۔
”شاہ اماں..... باہر ایک جوان آیا ہے، کہتا ہے اماں سے کہہ دو، بیٹا آیا ہے۔“
”کون بیٹا.....؟“ فاطمہ تو یونہی دائرے بناتی رہیں، ساتھ کے کمرے سے ادھر آتی، گل رخ نے پیشانی پر سلوٹیں ڈال کر اور آنکھوں میں تحیر لئے سوال کیا۔

”میں نے انہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ وہ اپنا نام ارد شیر شاہ بتاتے ہیں۔“

”اوہ تو وہ تشریف لائے ہیں.....“ گل کے چہرے اور انداز سے بیزاری فک رہی تھی۔

”بیٹا آیا ہے، ارد شیر شاہ آیا ہے۔“ فاطمہ نے جیسے ابھی ابھی دھیان کی واوی میں قدم رکھا تھا اور

بے تابی سے پوچھا.....

”آپ کا کوئی بیٹا نہیں ہے اماں.....“ گل رخ نے سختی کے ساتھ باور کرانا چاہا۔

”تو پھر میں کون ہوں.....“ ارد شیر دروازے پر زیادہ انتظار نہیں کر سکا۔ اندر چلا آیا۔ دروازے پر

رک کر گل کی جانب دیکھا پھر قدم فاطمہ کی جانب بڑھائے..... اور اُن کے پیٹ کے قریب نیچے دری پر بیٹھتے ہوئے بولا.....

”میں سلام کے لئے حاضر ہوا ہوں اماں.....“

فاطمہ شاہ نے ناگوں پر ڈالا کبھی کسی قدر عجلت میں پرے ہٹایا۔ پیر پلنگ سے نیچے لٹکا دیئے اور پر

شوق انداز میں اسے دیکھ گئیں۔ لب مسکرا رہے تھے مگر آنکھوں میں صرف پیاس تھی۔ صدیوں کی پیاس، جیسے یہ احساس ہوا اس شے کی شدید چاہت تو رکھتی ہیں مگر یہ دسترس سے دور ہے۔
”اماں! دعا نہیں دیں گی مجھے؟“ ارد شیر نے گل رُخ کی بیزاری کو محسوس کرنے کے باوجود مکمل طور پر نظر انداز کر دیا تھا۔ وہ ایک سعادت مند بیٹا دکھائی دے رہا تھا۔

”تم ارد شیر ہو۔ ہے ناں۔ اتنے سالوں کے بعد دیکھ رہی ہوں مگر پہچان گئی ہوں۔ کتنے بڑے ہو گئے ہو تم، کیسے شاندار جوان ہو۔ شاہ کا فرخ جو بلی کا مان..... واہ ری راحت، جواب نہیں تیرا، کیسا میرے جیسا پتر دیا ہے تو نے شاہ جی کو، ہم تو اُمیدوں سے گئے تھے اور راکھ ہو کر لوٹ آئے۔“
”اماں، میں آپ کا بھی بیٹا ہوں..... آپ بھی تو میری ماں ہیں۔“

”نہیں پتر، ایسا بخت میرا کہاں، میں تو شاہ اماں ہوں، سارے گاؤں کی مگر میرا بیٹا کوئی نہیں۔“
”کیا کرنے آئے ہو یہاں.....؟“ آخر گل نے کہہ دیا۔
”اپنوں سے ملنے آیا ہوں۔“ وہ گل کے لیے جو نظر انداز کر کے نرمی سے بولا۔ پھر دردی سے اٹھ کر پٹنگ پر فاطمہ کے قریب بیٹھ گیا۔

”ہونہ۔ اتنے سالوں بعد..... جناب شاہ صاحب، جب دیر ہو جاتی ہے تو راستوں پر گھاس اُگ آتی ہے، راستہ جنگل بن جاتا ہے اور دلوں سے یاد مٹ جاتی ہے۔“
”مگر یہاں تو یاد داتی ہے، تم نے دیکھا نہیں اماں نے مجھے پہچان لیا ہے۔“
”پہ آنکھوں کی ماری عورت، اس کی کیا بات کرتے ہو اور یہ محبت نہیں، اس کی پیاس بول رہی ہے۔ ساری جوانی صحرا کے سفر میں گزری ہے میری ماں کی۔“
”جانتا ہوں..... مگر قصور وار میں نہیں ہوں۔“

”واہ کیسے نہیں ہو قصور وار، تمہاری چاہ نے تنہی عورتوں کو برباد کیا، کچھ اندازہ ہے تمہیں.....؟“ وہ چبا چبا کر بولتی مین سامنے آکھڑی ہوئی۔
”میری چاہ میرا نہیں، ہمارے باپ کا جرم ہے مگر آپ سب لوگ اس کی سزا مجھے کیوں دینا چاہ رہے ہیں۔“

”سزا.....؟“ وہ استہزائیہ انداز میں مہمی، پھر بولی.....
”سزا تو ہم نے جھیلی ہے، تمہیں کیا پتا، سزا کہتے کسے ہیں.....؟“
”میں تو سب کو مٹانے آیا ہوں، آپ کو اسے گھرا پس جانا ہے، چلیں گی ناں اماں.....؟“
”نہیں، میری اماں کہیں نہیں جائے گی۔“ گل رُخ نے ”میری پرزور دے کر کہا۔
ارد شیر کی آنکھوں کی جوت بجھی گئی اور وہ کچھ دیر سر جھکا کر بیٹھا رہا۔

”آج میں سب سے زیادہ گھائے میں ہوں، تمہارے پاس اماں ہیں، ستارہ اور شیریں کے پاس بڑی ماں ہیں مگر میرے پاس کچھ بھی نہیں، اپنوں کے ہوتے ہوئے بھی میں اکیلا ہوں۔ گل میں خود چل کر آیا ہوں، معاف کر دو میرے جرم۔“

”ماں تم جیسے چل کر آ جاؤ، معافی مانگ لیں، واقعی بات عجیب ہی لگتی ہے مگر میرا فیصلہ اٹل ہے۔“
”اوہ..... ماں یہیں..... گئے، یہ ہماری اپنی مین۔“ میرے نانا کی جائیداد میں سے میری ماں کوئی

ہے۔“

”بیٹا..... میں ادھر ہی ٹھیک ہوں۔“ فاطمہ بیٹی سے اختلاف نہیں کر سکیں مگر لہجے میں تحسن تھی۔
ارد شیر اٹھ کھڑا ہوا۔ سر اُچکا کر کے گہری سانس بھینچی اور بولا.....

”ٹھیک ہے اماں، اگر آپ کی بھی یہی مرضی ہے تو..... مگر میں یہاں آتا جاتا رہوں گا اور ہ ماہ آپ دونوں کے حصے کی آمدن آپ کو بھجواتا رہوں گا۔ اب جائیداد کی ذمہ داری مجھ پر ہے، پاپا..... رہے سر پر سلامت ہیں۔ جائیداد ان ہی کے نام ہے مگر آپ لوگ چونکہ یہاں بالکل الگ تھلگ پڑی رہتی ہیں تو میں حق پہنچاتا رہوں گا، ڈاکا نہیں ماروں گا۔“

”ہمیں تو کچھ بھی نہیں چاہئے پتر، بس تم آتے جاتے رہنا۔ بیٹھ جاؤ، اتنی جلدی واپس تو نہ جاؤ۔“
فاطمہ کا انداز معصوم تھا، التجائیہ تھا۔

وہ مسکرایا، جھکا اور پٹنگ پر ہاتھ رکھ کر بولا.....
”میں آؤں گا اماں، میں اب ادھر گاؤں میں ہی آ گیا ہوں، آپ سے ملنے ضرور آیا کروں گا۔“ وہ ان سے پیار لے کر سیدھا ہوا، گل کے قریب آ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور پھر چلا گیا۔
”میں جتنا سب کو سمیٹنے کی کوشش کر رہا ہوں، اُنتا ہی سب دور ہو رہے ہیں۔“

شیریں ادھر بہت کم آتی تھی، ستارہ تو اکھڑی اکھڑی سی ہی رہتی تھی جب کہ زینت شاہ جی کے پاس اُن کے کاموں میں مصروف اور کبریٰ کی جانب سے خود ارد شیر کا دل صاف نہیں تھا۔ اسے تو پوری اُمید تھی وہ فاطمہ کو پھر ایک بار حویلی لے آئے گا مگر گل نے بہت بے زنی کا مظاہرہ کیا تھا۔

موسم سرما کی اس شام وہ بہت اُلجھا ہوا، اُداس اور خود کو تنہا محسوس کر رہا تھا۔ حویلی کا بڑا پھاٹک کراس کر کے چپ سے اُترا، چابی یا محمد کو دی اور چھوٹا گیٹ کراس کر کے اندر دھکی دیا۔
وہ سیدھا اپنے کمرے میں ہی آیا۔ کرسی پر بیٹھ کر سردیوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ زینت چائے کا پوچھنے آئی، تب وہ ذرا سنبھلا، چادر کندھوں سے اُتار کر صوفے پر پھینکی اور ریٹ واپ آتارنے لگا۔
”آپ کا فون بھی آیا تھا آج، نورین نام بتایا تھا اُس لڑکی نے، کہہ رہی تھی شاہ سے کہنا کل شام پانچ بجے میرے ہاں پہنچ جائے، بہت ضروری کام ہے، بار بار آنے کی تاکید کر رہی تھیں وہ۔“

”کل بابا کی دواؤں کے سلسلے میں شہر جانا تو ہے ہی نورین سے بھی مل لوں گا۔“
شہر پہنچتے ہی اُس نے نورین کو فون کیا اور یہ بھی پوچھا کہ آخر اس قدر اصرار سے کیوں بلا رہی ہے.....؟“ مگر اس نے کچھ بھی بتانے سے انکار کر دیا۔ بس بار بار وقت پر آنے کی تاکید کرتی رہی۔
سارے کام نشا کر وہ شام کو ٹھیک سو پانچ بجے نورین کے ہاں موجود تھا، وہ بھی خطرہ لے۔
”ارے شاہ، یہ واقعی تم ہو.....؟“ اُس کا سنجیدگی سے سلام کرنا اور خاموشی سے اس کے ساتھ سنتنگ روم تک آ جانا، نہ نظر سے گفتگو نہ لبوں سے، نورین کا حیران ہونا لازمی تھا۔

”نورین میں لیٹ ہو گیا نورین.....“
اُس کی بات کے جواب میں اتنا کہہ کر وہ تھکے تھکے انداز میں صوفے پر بیٹھ گیا اور دایاں بازو مونغ کی پشت پر پھیلا دیا۔
”اوہ شاہ..... ان چند دنوں میں تم کتنا بدل گئے ہو، یوں لگ رہا ہے ہم کئی سال کے، قفقے سے مل

رہے ہیں۔ اُس کی حیرانی ختم نہیں ہو رہی تھی۔

”کیا مطلب.....؟“ وہ مسکرا دیا۔

”مطلب یہ شاہ کہ جو شخص بات بات پر قہقہہ لگاتا تھا، فقرے اُچھالتا تھا جس کی آنکھیں گفتگو کرتی تھیں اور جو اپنے سامنے کسی کو گردانتا ہی نہیں تھا، اب کتنا نرم خو، سنجیدہ دکھائی دے رہا ہے۔“

وہ بڑی توجہ سے اس کی بات سن کر مسکرا دیا۔ اور بولا.....

”دیکھ لو، انقلاب اسی کو کہتے ہیں۔“

”آخر کیسے آگیا یہ انقلاب، یہ بھی تو بتاؤ ناں.....؟“

”تمت پوچھو، بات لمبی تو ہے مگر اس سے زیادہ افسوس ناک ہے، چوٹ پر چوٹ، دھوکے پر دھوکے..... تمہیں سننا مشکل ہوگا اور میرے لئے سنا نا بہت ہی مشکل، کیا کرنا ہے سن کر.....؟“ اُس نے سوچنے لہجے میں کہا اور افسوس کے عالم میں سر کو جھکا دیا۔

”کے سے کب ملاقات ہوئی تھی.....؟“ نورین جلد اس بات پر آمئی۔

”ہاں نہیں.....“ ارد شیر کے لہجے میں بے زنجی اُترنے لگی۔

”کیسے کہنے، ہاں ہی نہیں..... ویسے کیا ملنا چاہو گے.....؟“ وہ خوشی سے بولی۔

”نہیں.....“ ارد شیر نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”کیوں بھی، اس بپاری سے کیا خطرہ سزد ہوئی.....؟“ نورین کا اس جواب پر حیران ہونا یقینی تھا، وہ تو یہی سمجھ رہی تھی کہ شکایت صرف رات کو ہے۔ ارد شیر واقعی اسے چاہتا ہے، اس جواب نے اسے کافی پریشان کر دیا تھا۔

”نورین، میں اس نام کو بھلا چکا ہوں، اب وہ میری یادداشت میں نہیں ہے۔“ ارد شیر نے بڑی سنجیدگی سے جھوٹ بولا۔

”شاہ..... تو کیا تم نے اتنی معصوم لڑکی سے بھی کھیل کھیلنا، تم نے جھوٹ کہا اس سے اور مجھے بھی یہ خط فنی ہو چلی تھی کہ تم واقعی اس سے محبت کرتے ہو۔ جب تم بیمار تھے اور میں تم سے ملنے کے لئے تمہارے گھر گئی تھی تو تم نے کتنی محبت سے اس کا ذکر کیا تھا۔ اس سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ میں تو یہی سمجھی کہ وہ پیاری سی لڑکی تمہارے دل تک جانے والا راستہ کھوج چکی ہے، وہ تمہیں پا چکی ہے، شاہ میں سچ کہتی ہوں، ایسی لڑکی تمہیں پھر نہیں مل سکتی۔“

”وہ نورین، پلیز اب ختم کرو اس قصے کو۔“ ارد شیر نے زچ ہو کر کہا۔

”نہیں شاہ، اتنی جلدی یہ قصہ ختم نہیں ہو سکتا، رات کو بڑی معصوم لڑکی ہے، بڑی مہربانی۔ دل کے معاملے میں آپ بار جسے دے دیا سو دے دیا والی لڑکی ہے، ایسی لڑکیاں قدر کے لائق ہوتی ہیں، تم اسے کھو کر پچھتاؤ گے۔“

”قدر تم کر لو، میرے لئے پچھتاوا ہی رہنے دو۔“ وہ بہت کشور ہو رہا تھا۔

نورین نے افسوس سے اُس کی جانب دیکھا۔ پھر بولی.....

”وہ تو بہت محبت کرتی ہے تم سے.....“

”اف..... تم موت لو میرے سامنے محبت کا نام۔“ ارد شیر کی آواز بلند اور لہجہ اٹھا رہا تھا۔

نورین اب ذرا حیران ہو کر اس کے چہرے کی جانب دیکھ رہی تھی جہاں الجھن، تھکن اور شکستگی تھی۔

”میں جائے بنا کر لاتی ہوں تمہارے لئے.....“

یہ سوچ کر شاید ابھی یہ اپنے ساتھ کوئی الجھن لے کر آیا ہے، کسی سے جھگڑا ہوا ہے یا کوئی ایسا ہی دوسرا معاملہ ہے، وہ اُنھ کھڑی ہوئی۔ یہ بات چائے کے بعد کے لئے اُٹھا رہی۔

وہ حیران تھی، اُس روز تھی چاہے اس کے لہجے میں، رات کو کے لئے..... آج کیسا انکار ہے اور سچ تو یہ کہ اسے آج کے اس انکار پر یقین ہی نہیں آیا۔ دل کہتا تھا ارد شیر نے جو پہلے کہا تھا، وہ سچ ہے، وہ واقعی رات کو سے محبت کرتا ہے۔

نورین کچن میں چلی گئی تو وہ تھوڑی دیر ہی وہاں بیٹھا، پھر اُنھ کر میز پر آ گیا۔ پھر وہی ذکر، اُسی کا نام اور کتنے اچھے لفظوں میں..... ہاں وہ ہے بھی تو بہت اچھی، بس میں ہی اس کے قابل نہیں تھا بھی تو مجھے چھوڑ گئی اور الزام آ گیا میرے سر، چلو تھیک ہے، تمہاری خاطر یہ بھی سہی، میں بھی تمہیں با وفا ہی رہنے دوں گا سب کی نظر میں، کسی سے یہ نہیں کہوں گا، میں نے نہیں تم نے مجھے چھوڑا ہے۔“

نورین نے چائے بنا کر سنگ روم میں رکھی اور اسے بلانے اُدھر آ گئی۔

”ابھی میں کچھ دیر یہیں رہنا چاہتا ہوں۔“

”چائے بنا چکی ہوں کہو تو یہیں لے آؤں.....؟“

اس سے پہلے کہ جواب میں وہ کچھ کہتا، گیٹ سے اندر داخل ہوتی رات کو پر نظر چلی گئی۔

”اوہ..... رات کو آ گئی۔“

نورین کہہ کر تیزی سے واپس چلی گئی..... اور ارد شیر نے..... گہری نظر اس لئے اس دشمن جاں پر ڈالی کہ ہمیشہ کے لئے دل میں اُتار لے..... وہ سخت ناراض تھا اس سے، مگر اپنا ہی دل بغاوت بھی کر رہا تھا، وہ خود کو واپس سنگ روم میں جانے سے باز نہیں رکھ سکا۔

دل میں لاکھ خوشی سہی مگر ناراضگی تھی تو اظہار بھی ضروری تھا سو اس نے پوری توجہ چائے کی جانب کر لی۔ جان و دل سے کپ میں انڈیلنے کا فریضہ انجام دیا اور ہونٹوں سے لگالی۔

”آ..... آ..... آ.....“ رات کو نورین نے ارد شیر کی آمد کے بارے میں قصد انہیں بتایا تھا، وہ اندر آئی نورین باہر ہی اڑک گئی..... اور اب وہ دروازے کے قریب کھڑی جیسے خواب اور حقیقت کا فیصلہ کر رہی تھی۔

ارد شیر نے بالکل توجہ نہیں دی۔ چائے کا ایک اور سپ لیا۔

”شاہ یہ آپ.....؟“ اُس نے ایک بار پھر کہا اور جیسے خواب کی کیفیت میں آگے بڑھنے لگی۔

ارد شیر نے بے گامگی سے پرگاہ اُنھا کر اُس کی جانب ذرا ہی دیکھا پھر توجہ کپ پر مبذول کر لی۔

بے چارگی، ڈکھ اور بے بسی ایک ساتھ حملہ آور ہوئے تھے رات کو پر.....

”ہائے کیسے مناؤں، کیا بات کروں.....؟ اور آخر یہ خفا کس بات پر ہیں.....؟ کیا قصور ہوا ہے مجھ سے، جرم تو ان کا تھا اور ناراض بھی خود ہی ہیں اور میں گلہ کرنے کو تیار بھی کہاں ہوں۔ پتا نہیں کیسے سارے جرم بھول جاتے ہیں، میری مرضی کے خلاف، میرے دل میں کس شان سے برا جمان ہیں۔“

میں تو فکر مند تھی تمہاری طرف سے، اور ایسی حالت میں کوئی الٹی سیدی چیز تم ہی لو۔۔۔ جب کہ میں تو دکھ چکی تھی تمہیں اس وقت۔۔۔“

نورین نے بات کرتے کرتے رانچ کی جانب دیکھا اور اسے غلج دیکھ کر پھر زور سے ہنسنے لگی۔ رانچ نے سر نیچے جھکا لیا۔۔۔ نورین کو جیسے بے حد ترس آ گیا، بولی۔

”بس شاہ! اب تم اے معاف کر دو، یہ تم سے مخلص ہے، بس بیوقوف، بزدل اور سب سے بڑھ کر مشرق کی شرمیلی باجیا بنی ہے، دل میں تم ہو مگر کیا کرے، اظہار کی جرأت تو ہے ہی نبی اس میں۔“

”ہم نے تو اپنا خون بھی انہیں معاف کر رکھا ہے، بات تو ان کی ہے، پوچھ لو یہ بھی مجھ سے بے قصور کو معاف کرنے پر تیار ہیں یا نہیں۔“

ارد شیر کے سر سے جیسے منوں بو جھ اتر گیا تھا۔ کتنے دنوں کے بعد کوئی خوشی ملی تھی۔

رانچ چھپنی بیٹھی تھی مگر دل میں اطمینان ہلکورے لے رہا تھا اور خود پر غصہ بھی آ رہا تھا۔ آخر وہ اتنی بیوقوف کیوں ہے کہ اس کو اتنا غلط سمجھا، خود بھی پریشان رہی اور اُسے بھی کیا۔

”بس اب کچھ نہ بولنا شاہ، ورنہ اس کا سر ضرور میز سے جا کھرائے گا۔“

”اب مجھے زیادہ دیر نہیں کرنی، بہت جلد پابند کرنا چاہتا ہوں اسے، دیکھو ناں، اتنی بیوقوف سی تو ہے، کیا ہتا کب پھر کسی شک میں پڑ جائے اور میں رسک لینے کے لئے تیار نہیں۔“

”ٹھیک کہتے ہو تم، میں متفق ہوں۔۔۔ اور جہاں تک رانچ کی بات ہے، اس کی رائے چھوڑو، بس اس کے ہاں جاؤ اور گھر والوں سے مانگ لو اسے۔“

”پھر کب تک آؤں۔۔۔؟“ ارد شیر نے شوخ سی نگاہ رانچ پر ڈال کر مشورہ نورین سے چاہا۔

”تین چار روز تک تو یہ صاحبہ اپنی بھابی جان کو انگوٹھی پہنانے جاری ہیں، اس کے بعد آپ لے آئیے گا اپنے اہل خانہ کو۔“ نورین نے مشورہ دیا اور رانچ کے قریب آ بیٹھی۔

”اچھا۔۔۔ بھائی کی بات سنی ہو رہی ہے، کہاں۔۔۔؟“ ارد شیر کو سوہا یاد آگئی۔ غلج میں سوال کیا۔

”سوہا نام ہے اس کی بھابی کا، وہ مشہور گلوکارہ یا سمین بیگم کی بھانجی ہے۔ بہت اچھی لڑکی ہے۔“

نورین بڑے آرام سے تفصیل بتا رہی تھی مگر یہ سن کر ارد شیر کو سخت دھچکا لگا۔

”کیا وہی ایک رہ گئی ساری دنیا میں بھابی بنانے کو۔“ وہ بڑبڑایا۔

”یہ کیا کہہ رہے ہو۔۔۔ سوہا تو بہت پیاری لڑکی ہے، ویسے کیا تم جانتے ہو اُسے۔۔۔؟“

”میں۔۔۔“ وہ چونکا، پھر سنبھل کر بولا۔۔۔

”نہیں نہیں، میں بھلا کہاں جانتا ہوں، میں نے تو یوں ہی مذاق میں کہا تھا۔“

”وہ میرے بھائی کی پسند ہیں، ماما اور پیا کی بھی اور مجھے بھی بہت پیاری لگتی ہیں۔ ہم سب بہت خوش ہیں۔“

رانچ اپنی ذات کو موضوع گفتگو بنے دیکھ کر گہرائی بیٹھی تھی، اب جو موضوع بدلا تو بولنے لگی۔

”جی ابھی تو اور بھی پیاری لگیں گی۔“ ارد شیر نے سرشات میں ہلاتے ہوئے دل میں سوچا کہ اب یہ بات یقینی تھی۔ سوہا اس رشتے کی مخالفت ضرور کرے گی۔ وہ مزید کو ارد شیر کے بارے میں سب بتا دے گی۔ کیا تب بھی وہ لوگ رانچ کا ہاتھ اسے تھمانے پر راضی ہو جائیں گے۔

رانچ کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ لب کائناتے ہوئے، کچھ ڈرتے ڈرتے، رکتے جھپکنے، بولے ہوئے قدم اٹھاتی وہ آگے اور آگے بڑھی اور لرزتا ہوا مومی ہاتھ بڑی ہمت کر کے اُس کے مضبوط شانے پر رکھ دیا۔

ارد شیر تب بھی بھر پور بے گانگی کے تاثرات کے ساتھ بیٹھا رہا۔ وہ صوفے کے قریب قالین پر بیٹھ گئی۔۔۔ اور دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رونے لگی۔

”کیا لگا رہا ہے میں نے آپ کا۔۔۔؟ کیوں کر رہے ہیں میرے ساتھ ایسا۔۔۔؟“ آنسوؤں کے درمیان وہ بار بار گھبر کر رہی تھی۔ اور ادھر ارد شیر حیران تھا کہ گلہ اس سے کیوں۔۔۔؟ تنہا تو وہ خود اسے کر رہی تھی۔

اُس نے جائے کاپ میز پر رکھ دیا اور دونوں شانوں سے پکڑ کر اسے صوفے پر بٹھالیا۔

”میں تمہیں سمجھ نہیں پا رہا۔۔۔ کیا گلہ کر رہی ہو تم مجھ سے۔۔۔“

رانچ نے آنسو بھری آنکھوں سے اس کو دیکھا اور شاکی لہجے میں بولی۔

”میں جان گئی ہوں، آپ تو کبھی بھی دل سے میرے نہیں تھے، بس آپ نے مجھے ہی دھوکے میں رکھا، کھیل کھیلا ہے مجھ سے۔۔۔“ وہ پھر رونے لگی۔

”شکایت تو مجھے تم سے ہے، تم نے کبھی مجھ سے محبت نہیں کی، میری بے تابیوں کا لطف اٹھاتی رہی ہو۔۔۔“

”کیا میں۔۔۔؟“ اس الزام پر رانچ نے حیرت کے عالم میں کہا۔

”ہاں، تم نے۔۔۔“ اُس کا لہجہ اہل تھا۔

”رانچ۔۔۔ تمہیں پتا ہی نہیں محبت کسے کہتے ہیں، تمہیں تو اندازہ ہی نہیں قیامت کیسے ٹوٹی ہے۔“

”آپ۔۔۔ آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں۔۔۔؟ کیوں ایسا کہہ رہے ہیں مجھ سے۔۔۔؟“

”تو کیا غلط کہہ رہا ہوں۔۔۔؟“ اب کے شدید ناراضگی سے سوال کیا۔

”ہاں غلط، بالکل غلط۔۔۔“ رانچ کے آنسو ایک تو اتر سے نہ جا رہے تھے۔

”میرا خیال ہے اب مجھے اندر آ جانا چاہئے۔“

نورین دروازے پر رک گئی تھی اور ذرا سا کھول کر اندر ہونے والی ساری گفتگو سن رہی تھی۔

دونوں چونک گئے۔ رانچ آنسو پونچھے لگی۔ ارد شیر نے پھر جائے کاپ ہونوں سے لگایا۔

”میں تو اس نتیجے پر پہنچی ہوں، تم دونوں ہی کسی شدید قسم کی غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہو۔ اپنی اپنی جگہ سچ اور محبت میں کھرے۔“

وہ آکر سامنے بیٹھ گئی اور پہلے ارد شیر کی غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے اُس روز کی بات سنادی، جب رانچ بیماری کے دنوں میں اس کے گھر اُس سے ملنے گئی تھی۔

”سبحان اللہ۔۔۔ میں مر رہا تھا اور یہ محترمہ کیسی غلط فہمی پال رہی تھیں۔“ وہ سن کر ہلکا بھلکا ہوا مگر گلہ ضرور کر دیا۔

نورین کھٹکھٹائی

”میں تو پہلے ہی جانتی تھی کہ اب میں تم سے ملنے کے لئے تمہارے ہاں گئی تو تم بہت پرستھے۔“

”مجھے ہر صورت میں سہا سے ملنا چاہئے، ورنہ پھر بہت دیر ہو جائے گی۔“

اردشیر کو سہا سے ملنا تھا۔ یہ سنتے ہی کہ وہ رات کو کی ہونے والی بھابی ہے، اسے فکر مندی نے آگھیرا تھا۔

”وہ تو کبھی بھی مجھے اور رات کو ایک نہیں ہونے دے گی۔ وہ یقیناً رات کو گھر والوں کو منع کر دے گی۔ اس سے پہلے مجھے اس سے ملنا ہے اور بتانا ہے اب میں وہ پہلے والا اردشیر نہیں ہوں اور یہ یقین بھی دلانا ہے کہ رات کو سے کچی محبت کرتا ہوں، میں اسے کھوتا نہیں چاہتا۔“

نبی سب سوچتا ہوا وہ سہا کے فلیٹ تک آیا۔ اور کال بیل پر انگلی رکھی، دروازے جلدی کھل گیا اور کھولنے والی ہی ملازمہ تھی جسے پہلے بھی اردشیر نے اس گھر میں دیکھا تھا۔

”سہا بی بی تشریف رکھتی ہیں۔“ بڑے دھیمے اور نرم لہجے میں دریافت کیا۔

اردشیر کو خدا نے بڑے دلکش قد بت سے نوازا تھا، لاکھوں میں ممتاز نظر آتا تھا۔ سرداراں کی اس سے ایک ہی ملاقات ہوئی تھی اور وہ بھی بہت مختصر مگر پھر بھی اسے دیکھا تو پہچان گئی اور پہلی ملاقات کی تمام تر جزئیات جو ذہن میں ابھریں تو اس روشنی میں اسے اردشیر کے چہرے پر بھٹکنے والی موجودہ شرافت، دھوکا اور فریب دکھائی دینے لگی۔

• • •

”سہا بی بی تو اب یہاں نہیں رہتیں، وہ یہاں سے چلی گئی ہیں۔“ وہ دروازے میں ان کی کھڑی تھی اور پوری طرح نظروں میں رکھے ہوئے تھی اُسے۔

”کہاں چلی گئیں.....؟ دیکھئے میرا اُن سے ملنا بہت ضروری ہے، مجھے کام ہے اُن سے، آپ مجھے اُن کا ایڈریس دے دیں پلیز.....“ وہ سخت بے چین دکھائی دینے لگا تھا۔

”میں تو نوکر ہوں، اب میرے کو کیا معلوم کہ وہ کہاں چلی گئی ہیں۔“ سرداراں نے بے نیازی سے کندھے اُچکائے۔

”تو اندر جا کر یا سکین بیگم سے پوچھ آؤ..... وہ تو گھر پر ہی ہوں گی ناں.....؟ دیکھو میرے پاس وقت کم ہے، مجھے چند گھنٹوں کے بعد اس شہر سے اپنے گاؤں واپس جانا ہے اور میں جانے سے پہلے سہا سے ملنا چاہتا ہوں۔“

”وہ نیند کی دوا لے کر سوئی ہیں..... اتنی جلدی تو نہیں جاگیں گی۔“ سرداراں کی بے نیازی ہنوز قائم تھی۔

”ماسی کون آیا ہے.....؟“ سہا کا کمرہ قریب ہی تھا اور سرداراں کی آواز تو اتنی ہوا کرتی تھی کہ برابر کے فلیٹ میں بھی بخوبی سنی جاسکتی تھی۔

”اوہ، وہ گھر پر ہی موجود ہیں۔“ اردشیر نے سکون کی سانس لی..... اور شکایت طلب نظروں سے سرداراں کی جانب دیکھا۔

”آپ اندر نہیں آسکتے.....“ سرداراں نے خوف تھی..... اور لہجہ اٹل تھا۔

”ماسی میں نے پوچھا تھا، کون آیا ہے.....؟ آخر کس سے باتیں کر رہی ہو تم.....“ سہا کہتی ہوئی خود دروازے پر آگئی۔ جونہی نگاہ اردشیر پر پڑی، چھٹی اور پھر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

”السلام علیکم.....“ وہ سامنے آئی تو اردشیر کو پہلی بار یاد آیا تھا، وہ کیا تھا اور اب کس بے چارے۔ احساس کے ساتھ اس لڑکی کے پاس درخواست کرنے آیا ہے۔ لہذا سلام خاصا ڈگمگاتا ہوا سا تھا۔ جس کا جواب حیران و پریشان کھڑی سہا بھی نہیں دے سکی۔ سرداراں نے راستہ چھوڑ دیا۔ یہ فیصلہ اردشیر کے سلام نے کروایا تھا۔

وہ دروازہ پار کر کے اندر آیا اور بولا.....

”سہا، میں آپ کے پاس ایک ضروری کام سے آیا ہوں، بس یوں سمجھئے ایک درخواست ہے آپ

سہانے حیرت بھری نگاہ اٹھائی..... اور اسے وہ بالکل ویسا اور شیر دکھائی دیا جیسا چند روز پہلے آؤر کے آفس میں دیکھا تھا۔ تھوڑا مزید حوصلہ ہوا اور اسے ڈرائنگ روم میں آنے کو کہا۔
”آپ نے جو بھی کہنا ہے پلیز جلدی کیجیے۔“ وہ ابجھن تو بہر حال محسوس کر رہی تھی۔
”یہ کارشتہ طے ہو چکا ہے ناں، میں اُس لڑکے کو تو نہیں جانتا، اُس کی بہن کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔“

”آپ اسے کیسے جانتے ہیں.....؟“ سوہا کا ایک دم سے پوچھنا یقینی تھا۔ وہ پریشان ہو گئی تھی۔
”میں.....“ وہ کسی زک اور کہاں یہ ارد شیر شاہ.....
”وہ گہری سانس کھینچ کر مسکرایا اور بولا.....
”یقین کریں، کبھی بھی ہم جیسے دلوں سے کھیلنے والے بھی دل ہار جایا کرتے ہیں، کوئی ایسا آنکرنا ہے کہ پھر اس کے بغیر زندگی زندگی نہیں لگتی۔“

”دیکھئے، میں تو ایک گلوکارہ کی بھانجی ہوں، اس لئے آپ میری شرافت کو قبول نہیں کرتے، میری حیثیت آپ کے نزدیک کچھ بھی نہیں۔ مگر وہ باعزت خاندان کی باکردار لڑکی ہے۔ آپ اُس کے متعلق اس انداز میں بات نہ کریں تو اچھا ہوگا۔“

”یہ سچ ہے..... بخدا میں واقعی چاہتا ہوں اُسے، شدید محبت کرتا ہوں اُس سے، میں تو شادی کرنا چاہتا ہوں..... چند روز میں میرے گھر والے جارہے ہیں اُس کے ہاں۔“

سوہا بولی کچھ نہیں، منہ ایسے بنایا جیسے ارد شیر کی بات پر بالکل یقین نہیں ہے۔
”اُس کی محبت مجھے سیدھے راستے پر لے آئی ہے، وہ ساتھ ہوگی تو بھٹکنے سے بچ جاؤں گا۔“
وہ اُس کی کسی بات پر یقین کرنے کو تیار نہیں تھی۔

”آپ رحم کریں، چھوڑ دیں ہمارا پوچھا.....“ سوہا کا انداز اُکتایا ہوا اور اس سے زیادہ ڈرا ہوا تھا۔
”اوہ میں کس طرح یقین دلاؤں آپ کو.....“ ارد شیر کے انداز میں بے بسی تھی۔
”مجھے کبھی یقین نہیں آئے گا۔“

”کیا آپ اس پر یقین کر لیں گی کہ وہ بھی مجھ سے محبت کرتی ہے، وہ بھی میرے گھر آنا چاہتی ہے میری بن کر.....“

اب کے سوہانے حیرت سے پلکیں جھپکائیں۔
”کیجئے، اب میں پہلے والا ارد شیر نہیں رہا، اور مجھے احساس ہے کہ میں بہت غلط تھا، میں آپ سے معذرت چاہتا ہوں۔“

”یہ کوئی نیا جال تو نہیں ہے.....؟“ سوہا کی پریشانی کم ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔
”آپ آؤر سے پوچھ لیں، وہ بھی جانتا ہے کہ میں راکھ کو اپننا چاہتا ہوں، اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اب میں زندگی کی حقیقت کو سمجھنے لگا ہوں۔ پلیز آرام سے بیٹھ جائیں، آپ میری پوری بات سن لیں۔“

ایک گہما گہما کا عالم تھا، آج شام انہیں سوہا کو انگوٹھی پہنانے جانا تھا۔ کبیر حسن اور جویریہ خود جا کر

واحدہ کو منالائے تھے۔ نزہت کی بات انہوں نے کچی کر دی تھی اور مہنا ز ماں اور بہن سے سخت خفا تھی، جن کی وجہ سے اس کا رشتہ مزید سے ہوتے ہوتے رہ گیا تھا۔ نہ ماں نزہت کا مسئلہ اٹھاتیں، نہ ہی ماموں بچڑ کر بیٹے کی بات کہیں اور طے کرتے۔

دادی کو مزید خود لے کر آیا تھا، وہ کہتی ہی رہیں.....
”بھلا میں جا کر کیا کروں گی، مجھے تو یہیں رہنے دو۔“
”دادی آپ کے بغیر بھلا کیا خاک رونق لگے گی۔“

”اے جل باتیں نہ بنا۔“
”دادی مجھے تو لگتا ہے آپ کو میری خوشیوں سے کوئی غرض نہیں۔“ اُس نے منہ چھلایا۔
”کیسی احمقوں والی بات کی ہے بچے تم نے، گھر میں بیٹھ کر تمہارے لئے بہت دُعا کروں گی

میں۔“
”دُعا وہاں جا کر بھی تو ہو سکتی ہے، جاؤ نماز پر بیٹھنا چاہیں گی تو وہ بھی مل جائے گی، کوئی غیر مسلموں میں منگتی نہیں ہو رہی ہے میری۔“

”اچھا ٹھیک ہے، چلی چلوں گی.....“ واپسی پر تم ہی ٹانگیں دبا نا میری.....“ آخر انہوں نے ہتھیار ڈالا دیئے۔

”نیچے لاؤنج میں خوب رونق تھی۔ جویریہ مصروف سی پھر رہی تھیں..... مٹھائی کے ٹوکے گاڑی میں رکھوا کر اندر آئیں تو مزید تیار ہو کر اپنے کمرے سے نکلا۔“

”دیکھئے تو حاضرین کیسا لگ رہا ہوں میں.....؟“ مخاطب سب سے تھا اور دیکھ جویریہ کی طرف رہا تھا، وہ آگے بڑھیں، مسکراتے ہوئے اس کا چہرہ ہاتھوں میں تھا اور پیشانی چوم کر دُعاؤں سے نوازا۔
”اسمارٹ تو لگ رہا ہوں ناں میں ماما.....“

”ماما سے کیا پوچھتے ہیں، ہم سے بات کریں سچ بتا دیں گے۔“ عالی شرارت سے کہتی قریب آکھڑی ہوئی۔
”مجھے کچھ ڈر..... لگ رہا ہے، دیکھو ناں وہاں سوہا کی سہیلیاں بھی آئی ہوں گی اور تمہیں تو پتا ہے یہ سہیلیاں بڑی چڑیلیں ہوتی ہیں۔“

”یاد رہے زبجو بھائی، میں بھی سوہا کی سہیلی ہوں، صرف آپ کے اذد اصرار پر ادھر سے شریک ہو رہی ہوں۔“ عالی نے آنکھیں دکھائیں۔
”میرے اصرار پر، مگر کب کیا تھا میں نے اصرار، مجھے تو کچھ یاد نہیں۔“

”چلو جی، لوگوں کی صدمے کے باعث یادداشت جواب دے جاتی ہے۔ یہاں مارے خوشی کے سب بھلا بیٹھے ہیں، ویسے سوہا بھی یاد ہے یا نہیں۔“

”یاد ہے اچھی طرح یاد ہے ارے وہ بھی کوئی بھولنے والی شے ہے بھلا۔“
”اوہ..... یہاں تو شاید کوئی تقریب ہے.....“ وہ لاؤنج میں آیا اور چلتی سی نگاہ وہاں موجود لوگوں پر ڈال کر اُنچی آواز میں کہا۔

عمر یہاں آنا تو نہیں چاہتا تھا مگر ایک جلن تھی..... آگ بھڑک رہی تھی۔ اس کے اندر وہ جویریہ سے

نائب چاہتا تھا۔ اس کی آواز پر وہاں موجود سبھی لوگ متوجہ ہوئے۔

”ارے عمر تم.....“ جویریہ کی آواز اور انداز میں بے پناہ خوشی تھی۔ وہ تیزی سے اس کی جانب پلکیں اور ہاتھ پکڑ کر بولیں.....

”کہاں چلے گئے تھے تم، کتنا یاد کیا میں نے تمہیں۔ مزید سے بار بار تمہارے بارے میں پوچھتی رہی۔“

”مجھے کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں، آپ کے کہے پر پورا یقین ہے۔“ اُس کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ تھی۔

”تم بہت اچھے وقت پر آئے ہو بیٹا، ہم لوگ سوہا کی طرف جا رہے ہیں انگوٹی پہنانے۔“

پھر آگے کو جھک کر رازداری اور شرارت سے بولیں.....

”یاد ہے ناں، وہی لڑکی ہے جسے زبویہ کی جان سے چاہتا ہے۔“

”عمر تم ٹھیک تو ہونا.....؟“ مزید نے اُس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور اس کی اُداس آنکھوں کو بغور دیکھا۔

”مزید کئی بار تم لوگوں کے گھر گیا کہ شاید کچھ پتا مل جا۔ مگر تم گھر ہی چھوڑ گئے۔ اس نے مجھے تو تمہاری والدہ کی وفات کے بارے میں بتایا ہی نہیں تھا۔ ابھی دو روز پہلے ہی پتا چلا ہے مجھے، اور بہت افسوس ہوا ہے، یہ ہمیں اطلاع دے دیتے، ایسے وقت میں ہم تمہارے پاس ہوتے۔“

”وہ بہت عظیم عورت تھیں، آپ کو تو یہ سن کر بہت ہی حیرت ہوگی کہ انہوں نے اپنی جوانی دوسروں کی اولاد کے لئے برباد کر دی جب کہ یہاں تو لوگ اپنی خوشی کی خاطر اولاد کو کسی بے قیمت شے کی طرح کانٹوں سے برے راستوں پر پھینک جاتے ہیں۔“

”پرائی اولاد.....؟“ مزید نے حیران ہو کر کہا۔

”ہاں پرائی اولاد.....“ عمر نے طنزیہ مسکراہٹ اور سلکتی نظروں سے جویریہ کو دیکھا اور بولا.....

”بہت اچھا گھر ہے آپ کا..... یقیناً ایسا ہی گھر آپ کا خواب رہا ہوگا..... تو اتنا یہ خواب حقیقت بنانے کے لئے کچھ نہ کچھ تو قیمت ضرور ادا کی ہوگی آپ نے.....“

”عمر.....“ جویریہ کو اس کم گو، سادہ سے لڑکے کی باتیں حیران کر رہی تھیں..... وہ آج کس انداز میں بات کر رہا تھا۔

”میرے لئے سب کچھ دی تھیں..... بہت محبت دی انہوں نے مجھے..... اتنا پیار، اتنی چاہت کہ اب مجھے کسی اور محبت کی آرزو ہی نہیں رہی..... بس میں تو یہ دیکھنے چلا آیا کہ قیمت کچھ زیادہ تو ادا.....“

”تنت..... تم..... تم طلال ہو..... ہاں تم طلال ہو..... میں کتنی بھی ناں زبویہ، یہ میرے طلال جیسا ہے..... یہ ناصری تصویر ہے..... میرے دل کی گواہی جی تھی..... میں نے اسے پہچان لیا تھا.....“

وہ طلال کا چہرہ ہاتھوں میں لئے آنسوؤں میں پھیلے لہجے میں جذبات کی شدت سے بھرائی آواز میں بول رہی تھیں۔

مزید بھی بہت خوش اور بے یقین سا تھا۔

”تم طلال ہو..... اوہ ہم نے کتنا تلاش کیا تمہیں..... ہم یہ جان ہی نہیں سکے، تم تو ہمارے اتنے

قریب ہو۔“

مزید کو یہاں موجود لوگوں کی پروا تھی، نہ جویریہ کو جو بے تحاشا بیٹے کو پیار کر رہی تھیں۔ کتنی پیاسی تھیں وہ، کتنی گھماں اور کس قدر اُداس۔

”مجھے جانا ہے.....“ طلال کا انداز سپاٹ تھا..... اسے یہ سب ذرا بھی متاثر نہیں کر رہا تھا..... وہ سوچ رہا تھا شاید اتنا عرصہ دُور رہ کر جرم کا احساس بیدار ہوا ہے، اسے اپنے فیصلے پر پچھتا رہی ہیں۔ سچائی وہی ہے جو امان نے بتائی تھی..... اُس نے ہاتھ جھڑا کر جانا چاہا۔

”تم نہیں جاسکتے..... اب تم کہیں نہیں جاسکتے.....“ جویریہ نے اُس کا بازو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

”مجھے جانا ہے..... میری ماں نے بہت محبت دی ہے مجھے، اب میرے اندر کوئی پیاس نہیں ہے۔“

”اتنے کٹھور کیوں بن رہے ہو.....؟ طلال، تمہیں ماما کے جذبات کا ذرا بھی احساس نہیں، کیا تم نہیں سمجھ سکتے تمہارے بغیر کیسے یہ عرصہ کاٹا ہوگا انہوں نے، میرے بھائی یہ تو ہر بل تمہیں یاد کرتی رہی ہیں۔ بہت تلاش کیا ہم نے تمہیں، پہلے کیوں نہیں بتا دیا، تم خالہ کی حقیقی بیٹی نہیں ہو۔“

”ہونہہ..... کیا مجبوری تھی انہیں، کیوں جدا کیا ننھے بچے کو، یوں پھینک کر چلی گئیں جیسے میں جیتا جاگتا بچہ نہیں بے جان تھلوتا تھا۔“ طلال غصے اور رنج کی شدت سے سسکنے لگا۔

”ایسا نہیں ہے، تم غلط سمجھ رہے ہو۔“ مزید نے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے اپنی بات پر زور دے کر کہا۔

”کیا بات ہے، کون ہے یہ.....؟“ واجدہ ابھی کچھ دیر پہلے سیزھیان اُتر کر ادھر آئی تھیں اور کبیر صحن کو زہت بلالائی یہ کہہ کر کہ.....

”ماموں..... جلدی آئیں ادھر تو نجانے کیا ہنگامہ ہو رہا ہے۔“

وہ ادھر آئے تو جویریہ، طلال کو چھوڑ کر تیزی سے ان کی جانب پلکیں۔

”کبیر..... میں نے بھی آپ سے کچھ نہیں مانگا..... اپنے لئے کبھی کچھ نہیں چاہا، مگر آج مجھے اجازت دیں کہ میں اپنے بچے کو اپنے قریب اپنی آنکھوں کے سامنے رکھ سکوں، کبیر! مجھے ہر حال میں آپ کی اجازت چاہئے۔“

”جویریہ، یہ تم کیا کہہ رہی ہو.....؟ میں بالکل نہیں سمجھ رہا۔“ وہ بہت حیران تھے۔

”کبیر..... خدا کے لئے آپ مجھے اجازت دے دیں.....“ بولتے بولتے وہ کھانسنے لگیں۔ چہرے پر شدید نقاہت کے آثار تھے..... وہ جھنجھکیں اور پھر اپنے قدموں پر کھڑی نہ رہ سکیں۔

رائحہ ماں کی حالت دیکھ کر رونے لگی۔ باقی مہمان بھی حیران و پریشان کھڑے تھے۔ مزید تیزی سے آگے بڑھا اور جویریہ کو بازوؤں سے اٹھا کر بیڈروم میں لے گیا۔ انہیں بیڈ پر لٹا کر ڈاکٹر کو فون کرنے لگا۔

طلال ابھی تک لاؤنج میں تھا، اس کے لئے یہ صورت حال حیران کن تھی، وہ کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ کبیر کو بیڈروم میں جویریہ کے پاس بھیج کر مزید، طلال کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے کمرے میں لے گیا کہ وہ جلد از جلد اسے حقیقت سے آگاہ کرنا چاہتا تھا۔

ڈھلے چاندل کے بارے.....O.....405

جویریہ کی حالت کافی دیر بعد سنبھلی، ایک عمر کا سہا آس و نراس میں ڈوباد اس اچانک مل جانے والی خوشی کو برداشت نہیں کر پا رہا تھا..... وہ زرد چہرے کے ساتھ اور سفید پڑتے لمبوں کے باوجود آنکھوں میں اُمند آنے والی چمک سے اس بے پایاں خوشی کا اظہار کر رہی تھیں۔

طلال اُن کے قریب تھا، اب وہ حقیقت جان چکا تھا اور بے پناہ محبت کے ساتھ اُن کے ہاتھ بار بار چوم رہا تھا، آنکھوں سے لگا رہا تھا۔

”مما..... آپ نے بھائی کو تو ساری باتیں بتا دیں مگر مجھے کبھی نہیں بتایا کہ تمہارے دو بھائی ہیں۔“ راتھ تلال کی جانب دیکھتے ہوئے ماں سے شکایت کر رہی تھی۔

”ایک کی کون سی قدر کر لی تم نے، جو دوسرے کے بارے میں بتایا جاتا.....“ مزید نے منہ بنایا..... وہ جویریہ کی حالت سے پریشان تھا۔ چاہتا تھا جلدی سے سنبھل جائیں۔

”اے مزید تم لوگ اندر آ کر بیٹھ رہے اور وہ باپ کہاں ہے تمہارا.....؟“ کسی خاتون نے دروازے سے جھانک کر بڑے غلط وقت پر پوچھا۔ جویریہ شاید ایک اور امتحان کو فراموش ہی کر بیٹھی تھیں، اب خوفزدہ دکھائی دینے لگیں۔

”پیاؤ اکثر صاحب کے ساتھ باہر نکلے ہیں.....“ اُس نے بات بنائی جب کہ کبیر تو اسٹڈی میں جا بیٹھے تھے۔ جویریہ کی اتنی بری حالت ہوئی تھی، وہ تب بھی باہر نہیں آئے۔

”مما..... آپ ٹھیک ہیں ناں.....؟“ پایاں ہاتھ بیڈ پر رکھے مزید جھکا، جویریہ سے پوچھ رہا تھا۔ جویریہ نے دایاں ہاتھ اٹھا کر اُس کے گال پر رکھا اور دھیرے سے مسکرائیں۔ اُس نے اُن کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور بولا.....

”میں آنٹی یا سمین کے ہاں فون کر دوں کہ ہم لوگ ذرا لیٹ آئیں گے۔“ بیڈروم سے باہر آ کر پہلے اُس نے فون کیا پھر عالیہ سے کبیر کے بارے میں پوچھا اور اسٹڈی میں آ گیا۔

”مزید، یہ کیا مذاق ہے.....؟“ جونہی وہ اندر داخل ہوا..... انہوں نے بہت کھردرے لہجے میں پوچھا۔

”پیا..... یہ مذاق تو تقدیر نے ماما کے ساتھ کیا ہے۔“ ”ہونہہ..... وہ اتھان کی مکار عورت ہے..... میں اسے کبھی معاف نہیں کر سکتا۔“ کبیر کے لہجے میں غصے سے زیادہ نمایاں رنج کی کیفیت تھی۔ اب آ کے تو وہ یہ محسوس کرنے لگے تھے کہ جویریہ ان کے لئے اہم ہے اور مگر کی ہر خوشی اُسی سے وابستہ ہے۔

”مکار عورت..... یہ کس طرح کہہ دیا آپ نے.....؟ چھوٹی سی عمر میں بیوہ ہوئیں، بچے کے ساتھ بھائی کے گھر آ گئیں جہاں بھائی نے آپ کو علم میں لائے بغیر کہ وہ ایک بچے کی ماں بھی ہیں، آپ سے شادی کر دی، اور بچہ ایک غریب بیوہ اور بے اولاد عورت کے سپرد کر دیا۔ ماما اپنے بچے کے لئے روتی رہیں، تڑپتی رہیں مگر کسی سے کہہ نہیں سکیں..... یہی روگ تو دل کا روگ بن گیا۔“

”اُس نے مجھے کیوں نہیں بتایا.....؟ اتنی بڑی بات مجھ سے کیوں چھپائی.....؟“ ”پیا..... آپ کے رویوں نے اس کی اجازت ہی کب دی ہے، وہ تو آپ سے اتنا ڈرتی ہیں، آپ

سے کچھ کہنا ہو تو سو بار سوچتی ہیں، یہ بات کہہ دیتیں تو آپ شاید انہیں اس گھر میں برداشت ہی نہ کرتے مگر مجھے انہوں نے بہت پہلے یہ سب بتا دیا تھا۔ پیا اگر ماما آپ کے بیٹے کو قبول کر سکتی ہیں۔ اسے اتنا پیار دے سکتی ہیں تو کیا کچھ فرض آپ کا بھی نہیں بنتا.....“

”اب اتنے برس کے بعد وہ چلا آیا ہے، میں کیا کہوں گا لوگوں سے.....؟ کس کس کے سامنے اپنی کہانی دہراؤں گا۔“ ”لوگوں سے مت ڈریں پیا..... ہمیں تو ماما کی خوشی عزیز ہونی چاہئے۔ کتنے برس انہوں نے اپنے بچے کے لئے ترستے ہوئے گزار دیے ہیں۔ وہ بیمار ہیں انہیں آپ کی توجہ اور سہارے کی ضرورت ہے پیا، اگر آپ نے تلال کو قبول نہ کیا تو ماما نہیں بچ سکیں گی۔ ہم سب کی خاطر آپ مان جائیں۔“

”اُسے قبول کرنا ہے یا رد کرنا ہے، اس کا فیصلہ بعد میں ہوگا، فی الحال تم لوگ چلنے کی تیاری کرو..... یا سمین بہن خطر ہوں گی۔“ ”میں نے فون پر انہیں کہہ دیا ہے کہ ماما کی طبیعت ٹھیک نہیں، ہم لوگ کچھ لیٹ ہو جائیں گے۔“

”اوہو..... یہ سب کہنے کی کیا ضرورت تھی، جویریہ تو شاید کچھ دیر بعد بھی نہ جاسکے۔ میرا خیال تھا ہم لوگ جا کر رسم کر آتے.....“

مزید کے کچھ کہنے سے پہلے راتھ چلی آئی، دروازہ کھول کر دیکھا اور مزید کو موجود پا کر ذرا حوصلہ ہوا، باپ سے بولی.....

”مما روری ہیں..... وہ آپ کا پوچھ رہی ہیں..... پلیز بہ انہیں ڈانٹنے کا نہیں، ہمیں اپنی ماما سے بہت پیار ہے، ہم انہیں خوش دیکھنا چاہتے ہیں.....“ اس کی آواز بھر گئی اور وہ اُنکھوں کی پوروں سے پلکوں پر چمکتے آنسو پونچھنے لگی۔

کبیر بہت سنجیدہ اور کسی سوچ میں گم دکھائی دے رہے تھے، لگتا تھا کسی اہم فیصلے پر پہنچنا چاہتے ہیں، مزید چپکے سے جائزہ لے رہا تھا۔ پھر کسی نتیجے پر پہنچ کر راتھ کو اشارہ کیا، دونوں باہر آ گئے۔

”ہائے بھیا..... پیا بہت خفا ہیں، اب کیا ہوگا.....؟“ ”تم یہ رونا دھونا بند کرو، پیا مان جائیں گے۔ جیسے بھی سہی، بہر حال ایک لمبا سفر ان دونوں نے ایک ساتھ طے کیا ہے، کنوارہ کشی آسان نہیں، اور مجھے یقین ہے وہ ماما کے حق میں بہت جلد فیصلہ دینے والے ہیں.....“ مزید نے راتھ سے کہا۔

”بابا جان، میں شادی کرنا چاہ رہا ہوں، وہ اچھی فیملی کی بہت اچھی لڑکی ہے، مجھے اُمید ہے بابا کہ آپ مجھے اجازت دے دیں گے۔“ شاہ جی بول نہیں سکتے تھے لیکن اشاروں میں اپنی بات واضح کر دیا کرتے تھے۔ ارد شیر نے جو کچھ راتھ اور اس کی فیملی کے بارے میں بتایا، اس کے بعد انہوں نے کسی قسم کا اعتراض نہیں کیا، انہیں خوشی تھی، بیٹا ان راہوں پر آ گیا اسے جن پردہ اسے دیکھنا چاہتے تھے۔ بس اور کیا چاہئے تھا انہیں۔

”ٹھیک ہے پھر میں بڑی ماں اور چھوٹی امی سے بات کر لیتے ہوں، بڑی ماں کا تو کچھ نہیں کہہ سکتا،

ساتھ جانے پر راضی ہوں گی یا نہیں، چھوٹی امی، میرا خیال ہے ضرور چلیں گی۔ بابا ڈعا کریں، وہ لوگ بھی مان جائیں۔ وہ لڑکی آپ کے بیٹے کی خواہش ہے بابا جان۔“
”آپ کی دوا کا وقت ہو گیا ہے شاہ جی۔“ کبریٰ نے کمرے میں داخل ہو کر کہا۔

انہوں نے حویلی میں آتے ہی جہاں باتوں پر توجہ دی اور پھر سے اپنی گرفت مضبوط کرنے کی کوشش کی وہاں جسدِ شہید کے تمام کام بھی اپنے ذمے لے لئے مگر اردشیر کے رویے، اس کے انداز..... انہیں لگ رہا تھا سلطنت کی جتنی بنیادیں بس اب گرا ہی چاہتی ہیں۔

شوہران پر تین بیویاں لایا مگر اپنی عقل کے زور پر وہ حاوی رہیں، گھر کی راجدھانی پر انہوں نے اپنا مقام بلند رکھا، دل پر آنسو گرتے رہے، محبت کے پھول ان کے آجکل میں نہیں آئے، مگر وہ باوقار رہیں، جو شوہر نے ان کے ساتھ کیا، اس کا بدلہ انہوں نے سونکوں سے لیا، انہیں اس گھر میں مہمان ہی بنائے رکھا حالانکہ اس گھر پر اتنا ہی اُن کا بھی حق تھا جتنا کہ کبریٰ کا تھا۔

مگر اب معاملہ کچھ اور ہونے لگا تھا..... اب محبت کے ساتھ ساتھ دقار بھی مٹی ہونے والا تھا اور دل کہتا تھا، بڑی عمر بڑا ہوں محبت کے لئے..... یہ مصنوعی رعب و دبدبہ، یہ آن بان کچھ نہیں چاہئے۔ پہلے شوہر کی محبت چاہی، تیس لی، اب بیٹا بیٹا پکاریں ہوں، وہ بھی دُور ہے، ناراض ہے مجھ سے، معاف نہیں کیا اُس نے مجھے.....

وہ دوا پلا کر فارغ ہوئیں تو اردشیر نے یہ بات اُن کے سامنے رکھی اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا.....
”اگر آپ جانا چاہیں تو ٹھیک ہے، مجبور نہیں کروں گا میں۔“
”تم کہو اور میں نہ مانوں..... آخر کب تک بدگمان رہو گے اردشیر.....“ دُکھ سے اُن کی آواز کپکپا مئی۔

”ٹھیک ہے، پھر میں چھوٹی امی سے بھی چلنے کے لئے کہہ دوں، انہیں بھی آپ کے ساتھ جانا ہے۔“

وہ اُٹھ کھڑا ہوا، آگے بڑھا، پھر رُک گیا اور بولا.....
”اب بھی بتادیں، وہ ساتھ ہوں گی، اگر کوئی اعتراض ہے تو.....“
انہوں نے شکایت طلب نظروں سے اسے دیکھا اور گہری سانس کھینچ کر بولیں.....
”میں نے شکست تسلیم کر لی ہے تم سب سے، اور نہ لگہ ہے نصیب سے، نہ زمانے سے شکایت ہے۔“

اُس نے سنائیں باہر نکل گیا۔
”شاہ جی! کچھ کھانا چاہیں گے آپ.....؟“
انہوں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”میں جانتی ہوں آپ ناراض ہیں، آپ میرا اپنے کمرے میں آتا بھی پسند نہیں کرتے۔ آپ کو ریت کا انتظار ہوتا ہے اور شاہ جی، میں نے سوچا ہے، اب آپ کے تمام کام سوئپ دوں اُسے۔ جب آپ مجھے دیکھ کر ریزاری محسوس کرتے ہیں تو کیا فائدہ آنے کا۔“
شام کو اردشیر نے نورین کے ہاں فون کیا اور اسے اپنے پردگرم سے آگاہ کر دیا۔

”ٹھیک ہے میں کل صبح ہی رات کی ماسے بات کروں گی۔“
”ہم لوگ پرسوں آئیں گے نورین، تم انہیں قائل کرنے کی کوشش ضرور کرنا، ایسا نہ ہو، وہ لوگ انکار کر دیں۔“

”ڈونٹ وری شاہ، میرا خیال ہے، تم ابھی تک خود کو جان ہی نہیں سکے، ورنہ انکار کی بات ہی نہ کرتے۔“ وہ ہنس کر شوخی سے کہہ رہی تھی۔

”میرا مطلب ہے، وہ شریف لوگ ہیں، بیٹی کا رشتہ بغیر چھان بین کے نہیں کریں گے اور میرا ماضی تو تم جانتی ہو کہ.....“

”نہیں نہیں شاہ..... وہ انکار نہیں کریں گے..... میں رات کی والدہ سے بات کروں گی، اور بعد میں بھی اُن کی طرف جانی رہوں گی۔ رائے معلوم کروں گی، اگر انہوں نے کوئی ایسی بات کی تو سمجھا لوں گی۔“

”نورین..... سوہاب رات کی بھابی بن رہی ہے، میں ملا تھا اُس سے، اُسے یقین دلایا ہے کہ میں اب پہلے والا اردشیر نہیں رہا مگر یہ کہہ نہیں سکتا، کہ اُس کی رائے بدلی ہے یا نہیں۔“
”کون سوہاب.....؟“

وہ سمجھی نہیں، جواب میں اردشیر نے تفصیل سے بتا دیا۔
”میں خود ملوں گی اُس سے۔“

”ٹھیک یونورین، تم بہت ساتھ دے رہی ہو میرا۔“
”ایسی بات نہیں کرو شاہ، ہم دوست ہیں اور رات کو مجھے بہنوں کی طرح عزیز ہے۔ میں دل سے چاہتی ہوں، تم دونوں ایک دوسرے کے بن جاؤ۔“

”میری والدہ حیات نہیں ہیں، دونوں سوتیلی ہیں..... پتا نہیں کس طرح بات کریں، چھوٹی امی تو یوں بھی کم گو اور سیدھی سادی ہیں، تم وہیں موجود رہنا۔“

”اوہوشاہ.....“ نورین ہنس پڑی پھر بولی..... ”فکر نہ کرو بابا، میں سب سمجھتی ہوں۔“
کبریٰ خاتون اور زینت کے ان کے ہاں آنے سے پہلے نورین وہاں موجود تھی، جو یہ کہ ان کے بارے میں بتانے کے بعد رات کے پاس آئی تھی اور خوب ہی ستایا اُسے۔
”ہائے نورین، تم کچ کہہ رہی ہو، کیا واقعی وہ ساتھ آ رہے ہیں.....؟“ رات کو اس کی باتوں پر ایمان لے آئی۔

”تو اور کیا..... اسے بھلا چین ہی کب ہے..... ارادہ ہے کہ ہاں کروا کر ہی واپس جائے گا۔“
”تم ہی سمجھاؤ ناں، دیکھو ماما یوں ایک دم سے تھوڑی بات کہی کر دیں گے۔“
”کر تو دینا چاہئے..... اور یہ آخر تم کس لئے ہو، منالو ناں اپنی ماما کو، کہہ دو میں تو نہیں رہ سکتی اُس کے بغیر۔“

”ہا..... میں تو کبھی نہیں کہہ سکتی ایسی بات، کیا میں کوئی ایسی ویسی لگتی ہوں تمہیں۔“
”جیسی بھی ہو، اسے بڑی پسند ہو۔“
”نورین، اُن کی بڑی ماں بہت رُوڈ ہیں، مجھے خود انہوں نے ہی بتایا تھا، اور یہ بھی کہ ان لوگوں کی

ڈھلے چاندل کے پار.....O.....408

مہمانداری میں کوئی کسر نہیں ہونی چاہئے۔ بہت عزت و احترام دینا ہوگا انہیں۔ تم کہہ دو یہ سب مماسے۔“
”جی ہاں، پلکسین بچائیں ان کی راہوں میں، پھول چٹاں بچھا دو کرکریں اُن پر..... ارے وہ رشیرہ لینے آرہے ہیں یا رعایا کو ایک جھلک دکھانے۔ لڑکی والوں کے ہاں تو ادب اور ملائمت سے ہی بات بنتی ہے، تم سمجھا دو یہ بات اپنے ارد شیر کو، ہمارے انکل اور آئی کی بھی تو آخر کوئی عزت ہے۔“
”مجھے بڑا ڈر لگ رہا ہے، پتا نہیں ان کی بڑی ماں کس طرح ملیں گی.....؟ کیسے مزاج کی ہوں گی.....؟“

”کھا نہیں جائیں گی تمہیں ڈر پوک لڑکی۔“

”تم میرے ساتھ ہی رہنا، جہاں کسی سوال کے جواب میں گڑ بڑ کروں، تم سنبھال لینا۔“

”اور مجھے یقین ہے تم بہت زیادہ گڑ بڑ کرو گی۔“

جونہی ان لوگوں کی آمد کی اطلاع ملی، نورین اسے چھوڑ کر ڈرائنگ روم میں چلی گئی۔ کچھ دیر کے بعد جویریہ خود رانچہ کو بلانے آئیں، وہ خوش دکھائی دے رہی تھیں، یقیناً انہیں ارد شیر کے گھر والے اچھے لگے تھے۔

رانچہ دھڑکتے دل کے ساتھ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ڈرائنگ روم تک آگئی، جہاں پایا اور مزید موجود تھے جب کہ طلال رابعہ کو لینے گیا تھا، اب تک اسے واپس آ جانا چاہئے تھا، دیر ہوئی تھی اور جویریہ دل میں فکرمند تھیں۔

رانچہ نے آ کر دھیرے سے سلام کیا پھر نورین کے برابر بیٹھ گئی۔

دونوں خواتین نے سرسری سی نگاہ ڈالی اور زینت بولی.....

”بہت پیاری بیٹی ہے آپ کی، خدا نصیب اچھا کرے۔“

”انکل، میں ارد شیر کو بہت اچھی طرح جانتی ہوں، ہمارے فیملی فرینڈ ہیں..... وہ بہت اچھے اور ذمہ دار انسان ہیں اور میں سمجھتی ہوں ان کے گھر کو بھی رانچہ جیسی لڑکی کی ضرورت ہے۔“ نورین کبیر حسن سے مخاطب تھی۔

”بھائی صاحب، آپ چاہیں تو گاؤں آ کر بیٹے سے مل لیں اور اگر کہیں تو ہم ایک دوروز تک شہر میں رُک جاتے ہیں۔ آپ یہاں ہمارے گھر آ جائیں۔“ کبیرٹی نے کہا۔ اور زینت بھی متفق تھی۔
ملازمہ ٹرائی لے کر آئی تو رانچہ چائے بنانے لگی، اس دوران ان کی گفتگو بھی سنتی رہی۔ کبیر کہہ رہے تھے.....

”آپ لوگ شہر آئے ہوئے ہیں، ہم یہیں پر صاحبزادے سے مل لیں گے، اس کے بعد اگر ضروری سمجھا تو گاؤں بھی آ جائیں گے۔“

چائے پیتے ہی وہ لوگ جانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”ہم پھر آئیں گے۔“ زینت نے رانچہ کو گلے لگا کر پیار کرتے ہوئے کہا..... جب کہ کبیرٹی صرف گال چھتچہا کر آگے بڑھ گئیں۔ ہاں یہ ضرور کہا.....

”آپ لوگوں سے مل کر خوش ہوئی۔“

”اوہ..... کتنا ڈرا رکھا تھا مجھے بڑی ماں سے، یہ تو اتنی اچھی ہیں۔“ نہ صرف رانچہ بلکہ نورین بھی

ڈھلے چاندل کے پار.....O.....409

حیران تھی، دونوں پھر رانچہ کے کمرے میں آ بیٹھیں۔ کبیر کو کہیں جانا تھا، وہ جلد ہی چلے گئے۔ جویریہ اور مزید لاؤنج میں بیٹھ کر مہمانوں کے بارے میں باتیں بھی کر رہے تھے اور طلال، رابعہ کا انتظار بھی تھا۔
میں پچیس منٹ بعد وہ دونوں آئے جویریہ نے آگے بڑھ کر رابعہ کو گلے لگایا اور مزید سے ہر
”رانچہ کو بلا کر لاؤ۔“

جب دونوں لڑکیاں آئیں، تب بھی جویریہ اسے ساتھ لگائے کھڑی تھیں۔

”رابعہ باجی آگئیں۔“ رانچہ نے بھی اپنائیت سے کہا۔

”رابعہ..... یہ تمہاری چھوٹی بہن ہے، رانچہ..... اور یہ اس کی دوست نورین ہے۔“

”اور رانچہ، یہ رابعہ بی بی ابھی اس وقت جو کچھ دکھائی دے رہی ہیں، اس پر مت جاؤ، اصل میں تو یہ بے حد باتونی اور تیز لڑکی ہے، خالہ نجانے کس سے چارے کی قسمت چھوڑ گئی ہیں، اس کے ساتھ..... وہ بھی ایسا بونگا کہ جھٹ مان گیا، یہ نہیں دیکھا کہ زبان نکلتی بی بی ہے۔“ مزید کی کوشش تھی، وہ ان سب نے درمیان خود کو اجنبی محسوس نہ کرے۔

”زبان تو تمہاری بھی بہت لمبی ہے زیو، مگر دیکھ لو، سوہا کی آنٹی نے بھی تو دے دی اپنی اتنی پیاری بیٹی.....“ جویریہ کی بات پر رابعہ کے ساتھ ساتھ بھی ہنس پڑے۔

”رانچہ، تم بڑوں کی باتیں کیوں سن رہی ہو، کچن میں جاؤ، ابھی جو خاص الخاص قسم کے مہمان آئے تھے، وہ اپنے ساتھ ایک عدد مٹھائی کا ٹوکرا بھی لائے تھے۔ ذرا پلیٹ میں لے کر آؤ۔ میں مٹھائی چیک کروں۔ ویسے بندہ پوچھے، ہم نے کیا بھی مٹھائی نہیں کھائی جو ٹوکرا سجا کر لے آئے۔“

”کیوں، آپ سوہا کے ہاں لے کر نہیں گئے تھے.....؟“ نورین نے ارد شیر کی حمایت کی۔

”وہ تو چند دن پرانی بات ہے..... اب ان فضول رسموں کا خاتمہ ہو جانا چاہئے۔ مجھے تو ابھی سے اپنی صحت کی فکر پڑ گئی ہے۔ کھا کھا بیمار ہو جاؤں گا۔“

رانچہ مٹھائی لے کر آئی تو نورین نے اپنے قبضے میں کر لی۔ یہ کہہ کر کہ..... ”میں آپ کی صحت برباد نہیں ہونے دوں گی۔“

”یہ زیادتی ہے..... طلال، تم دانت نکال رہے ہو، پکڑو اس پلیٹ کو۔“
”تمہیں پتا ہے، ارد شیر میری آنٹی کا بھی دوست ہے اور میرا تو بھائی ہے، میں تو برداشت نہیں کر سکتی اس کا مذاق۔“

”مذاق کس نے اڑایا ہے، ہم تو مٹھائی کی بات کر رہے تھے۔“

”مٹھائی بھی تو اُس نے پیٹی ہے۔“

اُس نے پلیٹ رابعہ کی جانب بڑھائی۔

”دیکھا رانچہ، یہ ہوتی ہیں بہنیں.....“

”تو کیا میں آپ سے پیار نہیں کرتی بھائی.....؟“ وہ چیخی یہ کہنے پر۔

”ایسے پیار کا اچار ڈالوں..... ایک زمانہ ہم پر باتیں بنا رہا ہے، آپ کھڑی معصومیت سے مسکرا رہی ہیں۔“

”کتنی خوشیاں ایک ساتھ ملی ہیں مجھے.....“ جویریہ احساسِ تشکر سے بھیگی پلکوں کے ساتھ کہہ رہی

تھیں۔

گھر ڈر اور نورین انہیں قائل کرتے رہے اور ان ہی کے سنبے پر وہ دونوں گاؤں گئے اور وہاں پر جا کر قہقہے رائے بدلنا پڑی۔ بیار باپ کی تیار داری، لوگوں سے ملتا ملتا اور جائیداد کے معاملات سنبھالتا ہوا وہ بہت ذمہ دار اور سنجیدہ دکھائی دیتا تھا۔ انہیں ہاں کرنا پڑی۔

ار، شیر کو شادی کی جلدی تھی اور انہیں کوئی اعتراض بھی نہیں تھا۔ ہاں مزید شور کر رہا تھا۔
”مما، پیسے معنی تو میری ہوئی تھی، انصاف کے تقاضے کے تحت شادی بھی میری ہونی چاہئے تھی۔ کیوں رابعہ تمہارا کیا خیال ہے؟“ وہ اپنا جھیر تیار کرتی رابعہ کو جان کر چھیڑتا۔ اس سے پہلے کہ جواب میں کچھ وہ کہتی، پوچھنے لگتا۔

”یہ کیا بنا رہی ہو لڑکی، اتنی محنت مت کیا کرو، نظر کمزور ہو جائے گی، اور وہ تمہاری ہونے والی ساس وہ کہتی ہیں، لڑکی گوئی بہری ہو، اعتراض نہیں، مگر اندھی نہ ہو، سنا ہے، اندھی اُن کی چھیر ہے۔“
”زیو، کہاں سے سن آتے ہو ایسی اُلٹی سیدھی باتیں؟“ جو یہ یہ کوس کی باتوں پر بہت ہنسی آیا کرتی تھی۔

”مما، اپنی دونوں بہنوں سے مجھے بڑا پیارا ہے، ان کے سسرال کی جاسوسی کرتا رہتا ہوں۔“
”راکھ کے سسرال کے بارے میں کیا رائے ہے؟“ طلال بھی دلچسپی لیتا تھا ان باتوں میں۔
”بلاؤ راکھ کو، اُس کے سامنے بتاؤں گا، ہائے ویسے ترس بڑا آتا ہے مجھے اُس بر، تین تین ساسیں مائی گاڈ، کیا بنے گا اس لڑکی کا، ویسے میری ایک ساس ان تین پر بھاری ہیں ہاں..... آئی تینیں ظلم کا نشان، ہونہہ..... صاف کہہ دیا جب تک لڑکے کو سروس نہیں ملتی، میں تو لڑکی رخصت نہیں کروں گی..... اور بے چاری سوہا، دل ہی دل میں آنسو بہاتی رہی..... ہارٹ ایک ہوتے ہوتے بچا ہے اُسے۔“

”آپ کوئی ترکیب لڑائیں بھائی.....“
”ہائے طلال، کیا ترکیبیں لڑانی ہیں، وہ آئی بڑی ہوشیار ہیں، اب ہر کوئی رابعہ کی ساس کی طرح مصوبہ تھوڑی ہوتا ہے۔“

”مجھے تو بخش دیں، اپنی آنٹی کو ہی یاد کریں تو بہتر ہوگا۔“ رابعہ نے ہنس کر کہا۔

راکھ کی بارات گاؤں سے آرہی تھی اور رخصت کروا کر بھی انہوں نے گاؤں ہی جانا تھا۔ خوف تو صرف بڑی ماں کا تھا اس کے ذہن پر جوان سے ملنے کے بعد دور ہو چکا تھا اور وہ گاؤں جانے میں کوئی الجھن محسوس نہیں کر رہی تھی۔

ارد شیر اکیلا تھا، بہت سے کام اُس کی ذمہ داری تھے۔ ایسے میں بھی آذر بہت ساتھ دے رہا تھا۔ وہ فون پر مستقل رابطے میں تھا اور اب گاؤں آ گیا تھا۔

جس وقت ارد شیر فاطمہ شاہ اور گل رخ کے لئے کارڈ اور جوڑے لے کر شاہ اماں کے ڈیرے پر پہنچا تو آذر بھی اُس کے ساتھ تھا۔

آج بھی اُس نے دروازے پر بیٹھے پہرے دار سے اطلاع بھجوائی اور جلد ہی اندر بلوا لیا گیا۔ وہ آذر کو ساتھ آنے کا اشارہ کر کے آگے بڑھ گیا۔

”آؤ پتر.....“ آج فاطمہ اس کی آمد کا سن کر کمرے کے دروازے پر کھڑی تھیں۔
”کیسی ہیں آپ.....؟“ اُس نے ہاتھ میں پکڑے پکٹ آذر کو تھما دیئے اور آگے بڑھ کر انہیں بازوؤں میں لے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے محبت بھرے انداز میں کہا۔
”بڑے دنوں بعد آئے ہو تم.....؟“

”آپ کو انتظار تھا میرا.....؟“ اُس نے اشتیاق سے پوچھا۔
”تم پھر یہاں آگئے ہو.....؟“ فاطمہ کے کمرے میں گل رخ بھی موجود تھی، اب سامنے آ کر بیزار سے کہہ رہی تھی۔

”اماں، میں آپ دونوں کو لینے آیا ہوں۔“ وہ بات فاطمہ سے کر رہا تھا اور دیکھ گل رخ کی طرف رہا تھا۔

”پہلے بھی کہا تھا، کہیں نہیں جائیں گے ہم.....“
”آؤ آ جاؤ یار، رک کیوں گئے.....؟“ اُس نے گل کی بات جیسے سنی ہی نہیں..... اور اندر آتے ہوئے آذر سے پکٹ لے لئے اور فاطمہ سے بولا.....

”اماں، شادی ہے آپ کے بیٹے کی، یہ سوٹ آپ کے اور گل کے لئے ہیں۔“
”ہمیں تم سے کچھ نہیں چاہئے۔“ گل نے رخ موڑ لیا اور سخت لہجے میں کہا۔
فاطمہ نے بیٹی اور پھر ارد شیر کو دیکھا، ان کی آنکھوں میں، چہرے پر بے بسی تھی، وہ کچھ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھیں۔

”یہ کارڈ ہے..... پروگرام تفصیل سے لکھا ہوا ہے..... اماں اگر آپ آج چلنا نہیں چاہ رہیں تو شادی سے تین چار روز پہلے ضرور آجائے گا۔“

”تم آخر بار بار کیوں آتے ہو.....؟ گل اُس کے چہرے پر سختی سے نگاہ جما کر لفظ چہا چہا کر بولی۔
”گھر آئے مہمانوں سے اس طرح بات کرتے ہیں کیا.....؟“ ارد شیر کو بے بس دیکھ کر آذر نے اس نازک سی مگر ہر بات اٹل لہجے میں کرنے والی لڑکی کو مخاطب کیا۔

”مہمان.....“ اُس نے دانت پیسے پھر تیوری چڑھا کر بولی۔ ”بن بلائے مہمانوں سے یہ سی سلوک ہوا کرتا ہے۔“

”تم دونوں اندر آ جاؤ..... پتر، تم نے بتایا نہیں، یہ کون ہے.....؟“ فاطمہ کا رویہ گل سے بالکل مختلف تھا۔

”یہ میرا دوست ہے آؤ..... اور دیکھ لیں اماں، اس کے سامنے میری یہ عزت افزائی فرم رہی ہیں۔“ ارد شیر اب بھی بد مزاج نہیں ہوا تھا۔

گل سر جھٹک کر کرسی پر جا بیٹھی۔
”تم لوگ اندر آ جاؤ، یہ تو جھلی ہے۔“

”نہیں اماں ہم چلتے ہیں، مگر آتے جاتے رہیں گے۔“ گل کے رویے نے مایوس بہت کیز تھا مگر اُس نے خاموش نہیں ہونے دیا۔

”میں انتظار کروں گی۔“ انہوں نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

نے کچھ نہیں لینے دیا، آج وہ مجھ سے بھی چھن رہا ہے، میرا بیٹا مجھ سے دُور جا چکا ہے، وہ نفرت کرتا ہے مجھ سے، میں اب ایک قابلِ رحم عورت ہوں، اور اپنا تمام درد تم ہی سے کہہ سکتی ہوں۔
مگر انہیں سہارا دے کر تو وہ ہی لایا تھا۔

”تو گویا اب تمہاری جھولی بھری ہوئی ہے، محبت کے خزانے اب تمہارے لئے ہیں۔“
”اوہ ارد شیر..... تم مجھے بار بار کیوں آزماتے ہو، تم میرے نہیں ہو، یہ احساس کیا کم اذیت ناک ہے، مگر تم کسی اور کے اب بھی ہو، یہ خیال تو میرے تن بدن میں آگ لگا دیتا ہے۔“
وہ ستون سے ٹیک لگائے بظاہر یہ منظر بغور دیکھ رہی تھیں۔

گل قریب آئی، گلے لگی اور مبارک باد دی۔
”مبارک باد تو مجھے دینی ہے تمہیں بھی، فاطمہ کو بھی کہ اس کے قریب تو تم ہو۔“ وہ مسکرائیں، گل بھی ہیں مگر فاطمہ کو ادھر ہی لاتے ارد شیر نے بخوبی سنا مگر بظاہر نہیں سنا۔

رات دیر تک ڈھولک پر تھاپ پڑتی رہی۔ لڑکیاں بھی گاتی رہیں۔ ہنسی مذاق بھی چلتا رہا۔ کبریٰ سہرا بندی کی رسم کے بعد باہر نہیں آئیں، ذہن کا کمرہ اپنی نگرانی میں تیار کرواتی رہیں۔
رات کے دو بج رہے تھے، اب تو ہنگامے بھی سوچے تھے مگر وہ نہیں سوئیں ان طویل برآمدوں کے چکر لگاتی بیڑھیوں اور دالانوں میں پھرتی رہیں اور سالوں پہلے لائی جانے والی ذہن بڑی شدت سے یاد آتی رہی۔

صبح بارات لے کر جاتی تھی۔ سب ہی تیار یوں میں گلے ہوئے تھی۔ فاطمہ سے ارد شیر شاہ نے کہا تھا۔

”آپ ضرور چلیں گی.....“
اور وہ مان گئی تھیں..... زینت نے کہا تھا۔
”بھی جائیں گے تو میرا شاہ جی کے پاس ٹھہرنا ہی مناسب ہے۔“
”تھوڑی دیر کی بات ہے، اتنے ملازم موجود ہیں، کوئی بھی دیکھ بھال کر لے گا۔ کیوں بابا جان، میں ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں.....؟“

شاہ جی نے بھی رضامندی دے دی تو وہ مان گئی۔
کبریٰ سے ناراد شیر نے کہا اور نہ کسی نے ان سے پوچھا، شاید اپنے اپنے طور پر یہی سمجھے بیٹھے تھے، وہ ضرور شامل ہوں گی۔

وہ اپنے کمرے میں بیٹھی رہیں، اس انتظار میں کہ شاید وہ آئے، کہے.....
”آپ بھی چلئے.....“

اُس محبت کے ساتھ نہ سہی، رسمی طور پر ہی سہی۔
مگر انتظار، انتظار ہی رہا، بارات چلی گئی اور آنکھوں میں تیرتے آنسو بہہ کر چہرے پر آ گئے۔ یہ آنسو بڑی بے رحمی سے پونچھ کر وہ شاہ جی کے کمرے میں آ گئیں۔

”شاہ جی..... میں جانتی ہوں، آپ ناراض ہیں مجھ سے، آپ کے خیال میں، میں مکار فریبی عورت ہوں، جس نے آپ کے بیٹے کو آپ کے خلاف بھڑکایا ہے، جس نے آپ کے بیٹے سے جھوٹا بیار

”اماں انتظار تو میں کروں گا، سچ کہتا ہوں اگر آپ دونوں نہیں آئیں تو بہت افسوس ہوگا مجھے۔“
آذر نے گل رُخ کی جانب دیکھا، وہ ادھر ہی متوجہ تھی، نظری تو چہرے کا رُخ موڑ لیا۔
”محببتوں کی قدر کرنا چاہئے، یہ بار بار نہیں ملا کرتیں۔“ بلاشبہ آذر کی مخاطب وہی تھی پھر دونوں واپس آ گئے تھے۔

سہرا بندی کی رات تھی، ایک گہما گہمی، شور ہنگامہ تھا..... مگر کے کینوں سے زیادہ مہمان اور ملازم لڑکیاں خوش تھیں جب کہ کین بظاہر ایک دوسرے کے قریب مگر بہت دُور تھے۔ زینت ہر کام سنبھال کر کر رہی تھی۔ ستارہ ناک بھوں چڑھائے ایک جانب بیٹھی تھی، شیریں بظاہر کچی بنی رسوں میں بھر پور حصہ لے رہی تھی مگر بار بار یہی سوچ رہی تھی کہ بھائی اب بیوی لے آئے گا تو وہ لوگ تو بالکل علیحدہ ہو جائیں گی، اب اُن کی امی کا راج ختم ہو چاہتا ہے۔ یہ کب کسی کو خاطر میں لائے گا۔
اور کبریٰ بظاہر ہر طرف نظر رکھتی نگرانی کرتی مبارکباد وصول کرتی ہوئی، مگر سوچ میں گم خالی جھولی، خالی ہاتھ اور خالی دل کے ساتھ.....

ارد شیر، آذر اور شہر سے آئے چند دوسرے دوستوں کے ہمراہ گیٹ کے قریب کھڑا تھا جب ایک گاڑی بڑا گیٹ کراس کر کے بیرونی احاطے میں آ کرکی۔ پہلے گل گاڑی سے اُتری پھر فاطمہ شاہ کو سہارا دے کر اُترنے میں مدد دی۔

وہ کچھ کہہ رہا تھا، خاموش ہو گیا اور یوں ادھر دیکھنے لگا جیسے یقین نہیں آ رہا ہو۔
”تمہاری اماں اور بہن آ گئی ہیں ارد شیر.....“ آذر بھی خوش تھا، اُس نے اثبات میں سر ہلایا اور استقبال کو آگے بڑھا۔

”اماں..... آپ نے مان رکھ لیا میرا..... تھینک یو گل، بہت خوش ہوں میں تم لوگوں کے آجانے سے۔“

”مان رکھنے والے کا مان نہ رکھتی، اب ایسی بھی کھڑ نہیں۔“ کچی بنی نرم مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے وہ واقعی خوشی کی اس تقریب کا حصہ بننے والی ہی دکھائی دے رہی تھی۔
”تم چلو گل، اماں کو میں لا رہا ہوں۔“ اُس نے فاطمہ کو سہارا دیا۔

گل اثبات میں سر ہلا کر آگے بڑھ گئی۔
”مجھے تو پہلے ہی یقین تھا، آپ اتنی سنگدل ہرگز نہیں ہو سکتیں۔“ آذر کی آنکھوں میں پسندیدگی اور ہونٹوں پر شوخی سی مسکراہٹ تھی۔

گل نے اس سرگوشی پر چونک کر اپنے ساتھ چلنے والے کو دیکھا، کچھ حیرت بھی ہوئی مگر اچھا بھی لگا۔ مسکرا کر اندرونی گیٹ کی جانب تیز قدموں سے بڑھنے لگی۔
”گل بی بی آ گئیں..... شاہ اماں آ گئیں.....“

اُن کی آمد پر پہلی سی جگہ گئی، ہر کوئی استقبال کو لپکا، یہاں تک کہ کبریٰ جو رسم کے لئے مٹھائی کا تھا ل سجا رہی تھیں، سب چھوڑ کر باہر آ گئیں۔ مگر سامنے کا منظر دیکھ کر قدم رک گئے۔ وہ تو فاطمہ کے گلے لگنا چاہ رہی تھیں، مگر کتنا جاہل تھا کہ..... جو راج مر رہا تھا، جس میں برابر کی حصے دار ہونے کے باوجود تمہیں میں

”جی نہیں، میں دلہن کے ساتھ آئی ہوں۔“ اُس نے شانے اُچکائے۔
”چلے بھائی، باہر واقعی لوگ آپ کا پوچھ رہے ہیں، اب میں یہ کیسے کہوں کہ بھائی پہلے ہی روزن مرید ہو گیا ہے۔“ یہ گل بھی۔ ارد شیر نے تارکسی سے منہ بنایا اور اُنھ کھڑا ہوا۔
”بڑے ظالم ہیں لوگ.....“ آذر کا انداز معنی خیز تھا، ارد شیر نے اسے دیکھا اور دونوں ہنس پڑے۔

وہ گاؤں کے سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی اور آئینہ سن رہی تھی۔ باہر سے بہت دھیمی آوازیں کمرے میں آرہی تھیں، لڑکیوں کی ہنسی مذاق اور باتوں کی مگر اس کا دھیان ان آوازوں پر نہیں، قدموں کی آس، جھک پڑتا جسے اسی کمرے تک آنا تھا۔

دروازہ کھلا، رات کا دل تیزی سے دھڑکا۔
اُس نے آنے والے کو دیکھنے کی کوشش نہیں کی، مگر یہ وہ تو نہیں ہے، اس کا احساس آنے والی کی چوڑیوں نے کروایا اور پھر اُس نے ذرا اچھلیں اٹھا کر دیکھ بھی لیا۔
آنے والی بڑی ماں تھیں۔

وہ قریب آئیں، گھونکھٹ اٹھا کر اُس کا چہرہ بغور دیکھا اور گہری سانس کھینچ کر بولیں.....
”بہت خوبصورت ہو..... مگر یاد رکھو خوبصورتی قسمت کو بنانے اور بگاڑنے میں معاونت نہیں کرتی، قسمت تو مرد بناتا ہے اور بگاڑتا ہے۔“ مرخو کو ہمیشہ اُس کے دل میں دیکھنا چاہتی ہو، تو وجود اُس کے پیروں میں رکھنا، اس کی ہر خواہش کو ایمان بنالینا، ضروری نہیں تم ہر خواہش پوری کر سکو، اگر ایسا نہ ہو تو مری جاؤ۔

یہ توقع ہی فضول ہے کہ ایک بار جو نظر سے اُتر جائے، وہ پھر سے اس کی نظر میں بس نہیں سکتی۔ بس یہ کھیل اُسی وقت ختم ہو جاتا ہے، اور سنو تصور ہمیشہ تمہارا لٹکے گا، جرم اُسی کا ہی کیوں نہ ہو، احتجاج مت کرنا، قبول کر لینا کہ یہی تقدیر ہے، وہ دوبار بار آزمانے گا، تم آزمائش پر پوری اُترتی رہنا اور یہ کبھی مت سوچنا کہ اس صبر کے صلے میں، اس کے جرم اپنے سر لینے کی وجہ سے اس کی ہر جائز و ناجائز خواہش ماننے رہنے کی صورت میں تم ایک روز انعام پاؤ گی، نہیں نہیں یہ تو خیال بھی دل سے نکال دو۔

سب ناز میکے کی دلہن پر دھرے رہ گئے ہیں، اب تم عورت ہو، صرف عورت، دلہن اور بیوی کا لفظ ایک دھوکا ہے ورنہ اب تم کچھ بھی نہیں، اپنے دل کو خالی کرلو، خواہش کیسی ہیں، کتنی بھی ہیں، سب مال بچھینکو، یہاں وہی سب رکھتی رہنا، جو تمہارا شاہ آئندہ سانوں میں تم سے کہتا رہے گا۔ یاد رکھو، ہمیشہ یاد رکھو۔
اب تم پر خاوردادی میں بیٹھے پیر کھڑی عورت ہو، بظاہر جاندار گھر ہے جان بجوم میں بھی تنہا۔

میں دُعا کروں گی کہ تم بیوی ہی رہو، بڑی بیوی اور بڑی ماں نہ بنو۔ اس کمرے کی قیمتی چیزیں.....
کبھی بے قیمت نہ لگنے لگیں، کبھی یہاں برف کی سی ٹھنڈک نہ ہو..... اس دروازے پر جی کی فدا والی کی دھمک ہمیشہ ابھرتی رہے۔“

وہ رات کو حیران چموز کر باہر آئیں، گھر اُدھر ہی آتے ارد شیر سے ہوا، کبری تھکے تھکے انداز میں۔
جھکائے قریب سے گزر گئیں..... اور ارد شیر آگے بڑھ گیا۔
وہ شاہ جی کے کمرے کی جانب بڑھیں، دروازے پر رک گئیں۔ زینت انہیں کھانا کھلا رہی تھی۔

جتایا، جو ہمیشہ دھوکے، فریب سے کام لیتی رہی۔ مجھے دیکھ کر آپ کے چہرے پر ہزاری کی لہر آ جاتی ہے کیوں شاہ جی، کیوں.....؟ کیا سارے تصور میرے ہیں.....؟ کیا آپ برابر کے مجرم نہیں ہیں.....؟ آپ کی محبت نے مجھے یہ دن دکھایا ہے، مجھے مکار فریبی آپ نے بتایا ہے۔“
”بیگم جی، کھانا لے آؤں.....؟“ ملازمہ دستک دے کر پوچھ رہی تھی۔

کبری کے گلے شکوے اُدھورے رہ گئے۔ وہ واپس آئیں اور دلہن کے لئے سجائے گئے کمرے میں صوفے پر آ بیٹھیں، وہیں بیٹھے بیٹھے آنکھ لگ گئی۔

جب بارات واپس آئی تو انہیں کسی ملازمہ نے آ کر جگایا۔
”کہاں ہے دلہن.....؟“ وہ بڑبڑا کر اُدھر اُدھر دیکھنے لگیں۔

”وہاں، کمرے میں..... سب لوگ اُدھر ہی ہیں جی، بڑی ہی پیاری دودھی آئی ہے۔“ ملازمہ کی خوشی دیدنی تھی۔

کبری اُنھ کر ہال میں آئیں۔ ارد شیر اور دلہن صوفے پر بیٹھے تھے۔ وہ رشتے داروں سے تعارف کروا رہا تھا۔ چنانچہ کیا کہہ رہا تھا..... دُور سے سن نہیں سکیں۔ بہر حال ہال میں قہقہے گونج اُٹھے تھے۔
وہ دروازے سے ذرا آگے جا کر ہی رُک گئیں۔

”یہ گل ہے..... میری چھوٹی بہن، بہت دلیر لڑکی ہے۔“
”ہاں بھائی، یہ تو آپ کے شوہر کو بھی کچھ نہیں سمجھتی۔“ صوفے کے پیچھے کھڑے آذر نے کہا۔
گل نے اُس کے مسکراتے چہرے کو دیکھا تو ہنس کر سر جھکا لیا۔

”یہ ستارہ اور شیریں آپا ہیں اور وہ جو سامنے کرسی پر بیٹھی ہیں، شاہ اماں ہیں..... بہت صابر اور نیک عورت ہیں۔“

”یہ تعارف کا سلسلہ کسی اور وقت کے لئے اٹھا رکھو۔“ آذر نے جھک کر سر گھٹکی کی۔

”نہیں، گھر کے افراد سے تعارف تو بہت ضروری ہے۔“

”تو گھر کے افراد کہیں بھاگے نہیں جا رہے۔“ یہ نورین بھی جو رات کے برابر میں کھڑی تھی۔

”دلہن کو بابا جان کے کمرے میں لے چلتے ہیں، اُن سے دُعا لیں۔“ گل نے ارد شیر سے مشورہ طلب انداز میں کہا۔

”وہ اس وقت سو رہے ہیں تقریباً ایک گھنٹے بعد جاگیں گے۔“ زینت نے بتایا۔

”اچھا تو شاہ تم تو فی الحال مردانے میں جا کر بیٹھو، جب تمہاری ضرورت ہوگی، بلوالیں گے۔“

نورین نے رات کو اُٹھاتے ہوئے کہا۔

”یہاں ساتھ بیٹھے ہم دونوں کیا برے لگ رہے ہیں.....؟“ اُس نے منہ بتایا۔

”زیادہ مت پھیلو، ایک تو رومنائی میں کچھ دیا نہیں، اوپر سے ضد کر رہے ہو۔“

”رومنائی دینے کی نوبت ہی نہیں آنے دی حضرت نے، آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر بھائی کو دیکھ جا رہے ہیں۔“ آذر بھی مخالفوں میں شامل ہو گیا۔

”آذر تمہیں تو ابھی پوچھتا ہوں..... اور نورین تم بھول رہی ہو، میری دوست کی حیثیت سے یہاں موجود ہو۔“

”یہاں تو میرے لئے جگہ نہیں ہے، چنانچہ میں یہ بات بھول جاتی ہوں“
وہ دروازے سے ہی پلٹیں اور فاطمہ کے کمرے کی جانب آئیں۔ وہاں گل، نورین اور آذر موجود تھے اور شاہ اماں سے باتیں ہو رہی تھیں۔ وہ چپکے سے واپس ہو گئیں۔ ہر کمرے میں لوگ ہنستے مسکراتے باتیں کر رہے تھے..... کوئی بھی تو اکیلا نہیں تھا۔
تھک کر وہ پچھلے صحن میں آ گئیں۔

رات کی کالی چادر پر اکیلا چاند اپنی تمام تر خوبصورتی کے باوجود تنہا اور مٹلاشی ہے۔
وہ سیڑھیوں میں بیٹھ گئیں اور دیکھتی رہیں۔ خاموشی کی زبان میں اپنی زیادتوں کا اعتراف کیا اور اس سزا کو قبول بھی کیا۔
مگر کس دل کے ساتھ.....

آنسو تو اتر سے بہہ رہے تھے..... اور ان آنسوؤں میں ڈوبتے دل کے ساتھ چاند بھی ڈوبتا ابھرتا تھا۔

”محبت! تو بڑی نامراد شے ہے۔
کاش تیرا کوئی تمنائی نہ ہو..... رول دیتی ہے، ماردیتی ہے..... بڑا ترپاتی ہے، ترساتی ہے، مگر لاتی ہے، سرچڑھ کر بولتی ہے..... کیا سے کیا بنا دیتی ہے..... روپ ہی بدل دیتی ہے، قبضہ کر لیتی ہے، دل و دماغ پر اور ماری ڈالتی ہے۔

محبت! مجھے تجھ سے نفرت ہے..... جا اب جا، چلی جا،..... ابھجا چھوڑ دے..... مجھے آزاد کر دے..... میں ہر سزا کے لئے تیار ہوں..... میں نے شاہ جی کی آنکھوں میں نفرت..... دیکھی ہے اپنے لئے..... اور اراد شیر تو مکمل بے گانہ بن گیا ہے میرے لئے، مگر میرا دل پھر بھی تجھ سے آباد ہے۔

اور میں آزمائش میں ہوں.....
اے محبت! بڑی ظالم ہے تو اور مجھے تجھ سے نفرت ہے۔“

جا..... اب چلی جا.....
”اختتام“